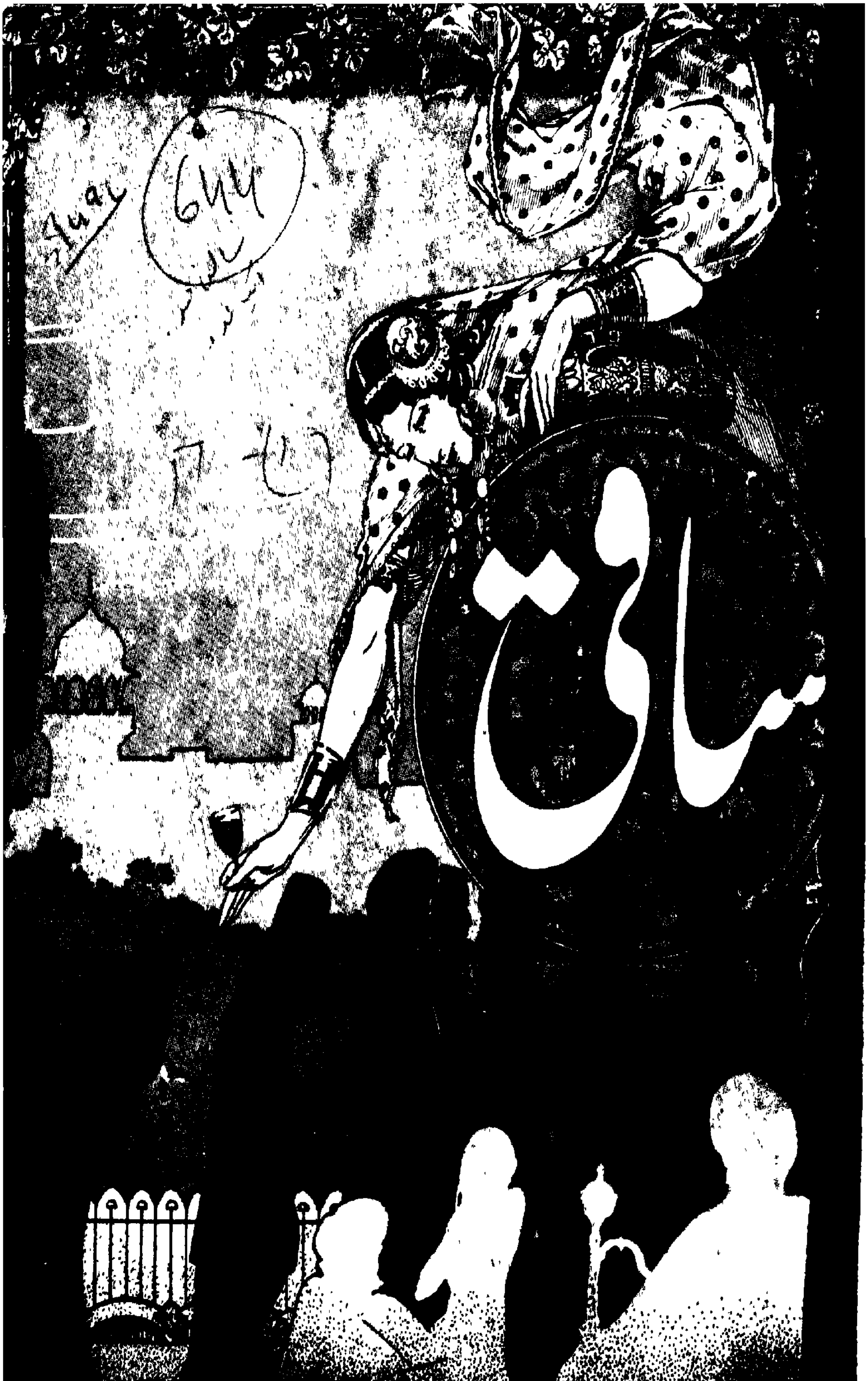

ساقی


کتب مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد
اُردو لٹریچر کی پاکیزہ کتابیں
ملنے کا پتہ
ساقی بکڈپو دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سالنامہ

ساقی دہلی

جنوری ۱۹۳۸ء

ایڈیٹر

شاہد احمد بی۔اے (آنرز) دہلوی

قیمت: ایک روپیہ چار آنے

چندہ سالانہ
پانچ روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ چھ آنے

جُرعات

ممالک غیر سے
بارہ شلنگ
نمونہ کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد | سالنامہ ساقی دھلی بابت جنوری ۱۹۳۸ء | نمبر (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خدا کا شکر ہے کہ ساقی اپنی زندگی کے آٹھ سال پورے کرکے اب نویں کی ابتدا کر رہا ہے۔ اس سالگرہ کے موقع پر ساقی کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے۔ اس سال بھی حسبِ معمول سالنامہ آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ مگر اب کے ناظرینِ ساقی کو ایک نمایاں فرق نظر آئیگا۔ ساقی میں اب کے غیر متعلق رنگین تصویریں شائع نہیں کی گئیں۔ صرف چند مضامین سے متعلق اور مشہور شخصیتوں کی تصاویر شامل کی گئی ہیں۔ اس کسر کو ساقی کی ضخامت بڑھا کر پورا کر دیا گیا ہے۔ خوشنما رنگین تصاویر شائع کرنیکی بجائے عمدہ مضامین کا اضافہ امید ہے کہ ساقی کے خوش ذوق ناظرین میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائیگا۔ مضامین جس پایہ کے یکجا کئے ہیں ان کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا جب آپ انہیں مطالعہ فرمائیں گے۔ اور مقابلہ کرکے دیکھیں گے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انہیں بعض برسوں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اور بعض ساری ساری عمر کے مشاہدے اور مطالعے کا حاصل ہیں۔ اگر علیحدہ علیحدہ ان مضامین پر مختصراً بھی کچھ لکھا جائے تو کئی صفحے درکار ہوں گے۔ یوں بھی ہم خود ان کی تعریف کرکے آپ کا لُطف کیوں کرکرا کریں۔

مندرجہ ذیل حضرات کے ہم شکر گزار ہیں کہ ۳۷ء میں انہی کی عنایات سے ساقی مُرتّب ہوتا رہا:-

مولانا عنایت اللہ دہلوی۔ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ جناب ایم۔ اسلم۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ مسٹر صادق الخیری دہلوی۔ امینِ حزیں۔ ثواقب شاہجہانپوری۔ نشتر کانپوری۔ نفیس رامپوری۔ سیّد امتیاز علی تاج۔ سیّد ابوطاہر ل۔ احمد۔ بادشاہ حسین۔ پریم پُجاری۔ اختر حسین رائے پوری۔ محترمہ حجاب امتیاز علی۔ اسرار الحق مجاز۔ تابش دہلوی۔ محترمہ خجستہ اختر بیگم۔ ساغر جعفری۔ حسن عباس۔ دلفگار۔ ثاقب کانپوری۔ مرزا سیف علی خاں۔ سیّد علی منظور۔ انصار ناصری۔ اشرف صبوحی۔ فضل حق قریشی۔ ماہر القادری۔ کاوش حیدرآبادی۔ ناصر۔ پروفیسر احمد علی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ سیّد علی شاکر۔ محمد محسن عظیم آبادی۔ ن۔ م۔ راشد۔ ممتاز مفتی۔ طاہر قریشی۔ جاں نثار اختر۔ غلام عباس مولوی۔ اسد عباس۔ محترمہ صالحہ عابد حسین۔

ان حضرات کے علاوہ ہم دلی ریڈیو اسٹیشن کے لائق ڈائرکٹر مسٹر زیڈ۔ اے بخاری کے بہت شکرگذار ہیں کہ ہم نے جس مضمون کے شائع کرنیکی اُن سے خواہش ظاہر کی اس کی اجازت انھوں نے بخوشی دیدی۔ اس طرح ساقی کو چند اعلےٰ درجہ کے مضامین پیش کرنیکا موقع ملا ورنہ یہ نایاب مضامین ایک دفعہ نشر ہونے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتے۔

آخر میں ہمیں یہ اور عرض کرنا ہے کہ کاغذ کی اس گرانی کے زمانہ میں عمدہ سفید کاغذ پر پاکیزہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہونا اور سال بھر میں پندرہ سو صفحے کے منتخب مضامین پیش کرنا ساقی کو روز بروز زیر بار کر رہا ہے۔ اس نقصان کی تلافی کی صرف دو صورتیں ہیں، یا تو ساقی کی سالانہ ضخامت پندرہ سو صفحات سے گھٹا کر ساڑھے سات سو صفحات کر دی جائے۔ یا ساقی کی اشاعت دُگنی ہو جائے۔ پہلی صورت ہمیں منظور نہیں اور دوسری صورت ہمارے اختیار کی نہیں۔ اگر ہر خریدار صرف ایک اور خریدار بہم پہنچا دے (جو بہت مُشکل نہیں ہے) تو ساقی کو اپنی مالی حالت سنبھالنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ساقی کو کسی رئیس کی سرپرستی کا فخر حاصل نہیں، کسی ریاست سے ماہانہ امداد ملنے کا شرف اسے میسّر نہیں، فحش اشتہارات شائع کرنیکی سعادت سے محروم۔ مذہب کے نام پر بھیک مانگنے کا مُستحق نہیں، قوم کا حوالہ دے کر چندہ اُگانے کا اہل نہیں۔ اور سرمایہ دولت مدار کو تو علم و ادب گویا عار ہے۔ لے دیکر مستقل خریدار ہی ساقی کیلئے کچھ کر سکتے ہیں۔ باقی سب خیریت ہے۔

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے بذریعہ منی آرڈر اور پانچ روپے چار آنے بذریعہ وی۔ پی ہے۔ اگر خریدار حضرات منی آرڈر سے چندہ بھیجدیا کریں تو انہیں چار آنے کی کفایت ہو جائیگی۔ کوپن میں نام اور پتہ صاف لکھدیں تو بہتر ہے +

شاہد

اُردو کی کہاوتیں اور اُنکی کہانیاں

این ہم بر سرِ علم۔ فارسی کی ضرب المثل ہے۔ معلوم نہیں ایران میں بنی یا ہندوستان میں۔ مگر بولتے اُردو میں بھی ہیں۔ ترجمہ اسکا ہے۔ یہ بھی جھنڈے پر سہی۔ مطلب یہ کہ جہاں سو ہیں وہاں سوا سو سہی۔ جہاں ہزاروں گُناہوں کی پوٹ سر پر ہے۔ ایک گُناہ اور سہی۔ قصّہ اس مثل کا یوں ہے۔ کہ کہیں کی مسجد میں کوئی عالم وعظ فرما رہے تھے۔ اور نیکی و بدی دوزخ کا نقشہ دکھا رہے تھے۔ اسی ذیل میں امانت و خیانت، ایمانداری و بے ایمانی کا مذکور آ گیا۔ مولوی صاحب نے بڑی بڑی موشگافیاں کیں۔ خوب خوب دادِ تحقیق دی۔ چوری کی ایک ایک کر کے ساری صورتیں بیان کیں۔ ہر ہر پیشہ اور ہنر والوں کے کرتوتوں کو گنوایا۔ اُن کی کُھلی ڈھکی چوریوں کو کھول کھول کر دکھایا۔ یونہی ہوتے ہوتے کہیں درزیوں کا ذکر آ گیا۔ جناب نے اُن کے خوب لتے لئے۔ ایسے بخیے اُدھیڑے کہ کوئی ٹانکا لگا نہ رہنے دیا۔ گاہکوں کی بے اعتباری اور اُس کے نتائج دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی خرابی کو پھیلا پھیلا کر دکھایا۔ عقبیٰ کے عذاب، قیامت کے حساب کتاب سے ڈرایا۔ اور یہاں تک فرمایا کہ یہ درزی چھوٹی بڑی چوریاں جتنی کرتے ہیں۔ دنیا میں اگر چھُپ بھی جائیں۔ قیامت کے دن سب الم نشرح ہو کر رہینگی۔ یہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوں گے۔ ایک بڑا سا علم ہر ایک درزی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اُس پر عمر بھر کے چُرائے ہوئے کپڑے، حتیٰ کہ ذرا ذرا سی کترنیں بھی، لٹکتے ہوں گے۔ ساری خدائی ان کی چوری کا یہ تماشا دیکھے گی۔ اور درزیوں کی بڑی رسوائی ہوگی۔ جزا و سزا کا وقت آئے گا تو وہی سوئیاں، قینچیاں جن سے چوری کا کپڑا کاٹا اور سی سلا کر خود پہنا۔ بیچا یا اہل و عیال کو پہنایا تھا۔ عذاب و ایذا کا آلہ بنجائیں گے۔ اتفاق ہے۔ اس مجلس وعظ میں کسی طرف کوئی درزی بھی بیٹھا تھا۔ اور ممکن ہے کہ جناب مولوی صاحب نے اُسی کو دیکھ دیکھ کر اپنی تقریر کا یہ پردہ ڈالا ہو۔ اس نے جو یہ چبھتی ہوئی حق لگتی ہوئی باتیں سُنیں۔ دل ہی دل میں بہت کٹا اور اُسی وقت توبہ کی کہ چوری کے پاس نہ جاؤنگا۔ اور بہت دنوں تک وہ اپنے اس عہد پر قائم بھی رہا۔ گاڑھا گزی، ململ لٹھا۔ نینو نین سکھ معمولی کپڑوں کا کیا ذکر ہے۔ اچھے اچھے ریشمی کپڑے، مخمل، اطلس، کامدانی، گلبدن کے تھان کے تھان اُس کی دُکان پر آتے۔ مگر کتر بیونت کے وقت کبھی اس کو اُن میں سے کچھ کتر لینے کا خیال بھی نہ آتا۔ اتفاق کی بات ایک دن ایک گاہک آیا۔ اور ایک بڑھیا سا تھان کپڑے کا لایا۔ دولھا کا جوڑا بننا تھا۔ وہ ناپ تول دے کر اپنی راہ گیا۔ اُستاد تھان لے کر بیٹھے اُلٹ پلٹ کر دیکھا جی للچایا۔ مُنہ میں پانی بھر آیا۔ رال ٹپکنے لگی۔ دل نے کہا۔ اس میں تو کچھ بچانا ہی چاہیئے۔ ایمان پُکارا، خبردار کیا کرتا ہے۔ توبہ نہیں کر چکا ہے۔ اُستاد نے تھان اُٹھا کر ایک طرف کو رکھدیا۔ مگر کپڑا ابھی کر دینا تھا جلدی، اسلیئے پھر اُٹھایا اور پھر وہی کشمکش شروع ہوئی۔ آخر پُرانی عادت نئی توبہ پر غالب آئی۔ اور اُستاد نے کپڑا بچا لینے کا ڈھب نکال کر فرمایا این ہم بر سرِ علم۔ جہاں ہزاروں ٹکڑے کپڑے کے قیامت کے دن علم پر ہوں گے ایک یہ بھی سہی، یہ حکایت خُدا جانے سچی ہے یا جھوٹی۔ مگر یہ بالکل سچ ہے۔ کہ عادت خاص کر بُری عادت موقعہ پا کر یونہی عود کرتی ہے۔ اور یہ مثل ہمیں یہی سبق دیتی ہے۔

سخن فہمی عالم بالا معلوم، یہ مثل بھی فارسی کی ہے۔ مگر اُردو میں بولی جاتی ہے۔ معنی اس کے یہ ہیں۔ کہ فلاں کی سمجھ بوجھ کا اندازہ ہوگیا۔ کہ کچھ بھی نہیں۔ یہ محض خیال ہی خیال تھا۔ کہ وہ بڑے دانشمند ہیں۔ عقل و تمیز میں بے بدل ہیں۔ مگر ڈھول ہیں۔ پول ہی پول نکلا کہتے ہیں یہ فقرہ ایک شاعر کی زبان سے نکلا۔ چُست و برمحل تھا۔ ضرب المثل ہوگیا۔ شعرا اپنے آپ کو تلامیذ الرحمٰن کہتے اور سمجھتے آئے ہیں۔ یعنی خُدا کے شاگرد۔ اللہ تعالیٰ سے۔ بے واسطہ غیر فیض پانے والے۔ اسی لئے اُستادوں سے انکی اکثر نہیں بنتی۔ جلدی ہی اُن سے بگڑ بیٹھے۔ یا اُن سے مُنکر ہوجاتے ہیں۔ اور اپنے کلام کو صدائے غیب و نوائے سروش تصوّر کرنے لگتے ہیں۔ غرض خود بینی، خود پسندی، تعلّی و خود نمائی شاعری کا لازمی خاصّہ ہے۔ سعدی جیسا بے نفس حکیم بھی اِس سے نہ بچ سکا۔ اور شاعری کی ترنگ میں آکر کہہ گیا۔ ؎

گہہ گہہ خیال در سرم آید کہ این منم ؛ ملک عجم گرفتہ بہ تیغ سخنوری

کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے۔ کہ میں ہی تو ہوں۔ جس نے شاعری کی تلوار سے سارا ایران فتح کرلیا ہی۔ جب سعدی یہ کہہ گزرے۔ تو پھر اور شعرا کا کیا ذکر ہے۔ بہرحال یہ سچ ہی کہ شاعر عموماً خود پسندی، خود نمائی کے مریض ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کوئی جناب تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ فیضی فیاضی کا قصّہ ہے کہ ایک دن اتفاق سے کہیں سعدی کا یہ شعر زبان سے نکل گیا۔ یا کہیں نظر آگیا ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ؛ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

شعر کو پڑھا اور مکرر پڑھا۔ غور کیا نکتہ چیں نگاہ میں نہ جچا۔ از معرفت کردگار کی جگہ معرفت کردگار پسند نہ آیا۔ مُنہ بنایا۔ ناک بھوں چڑھائی۔ معاوضہ کا خیال آیا۔ مقابلہ کا شعر سوچا۔ فکر کی دیر تھی۔ کہ خیال عالم معنی کے عرش پر تھا۔ فوراً شعر ہوا ؎ ہر گیاہے کہ از زمین روید ؛ وحدہٗ لاشریک لہ گوید

سمجھے کہ حضرت قدس سے وحی اُتری ہے۔ بہت پھولے بہت اترائے۔ تن کر شعر کو با آواز پڑھا۔ اور بار بار پڑھا۔ اور جھوم جھوم کر پڑھا۔ اور اس طرح پڑھا کہ آس پاس کے درو دیوار تک سب گونج اُٹھے آپنے تصوّر کرلیا کہ ہر طرف سے صدائے داد و تحسین بلند ہوئی ہی۔ مگر جناب کی تشفی اس سے بھی نہیں ہوئی چاہتے تھے کہ آسمان سے ملائک داد دیں۔ اور ملا اعلیٰ سے سبحان اللہ اور احسنت کی صدائیں آئیں۔ اسی یقین سے سر اُٹھایا۔ کہ داد کی آواز آسمان سے آئے گی ضرور آئیگی۔ اتفاق کی بات آپ کہیں بیٹھے تھے۔ زیر سما، اور فضائے آسمانی میں چیلیں اُڑ رہی تھیں۔ ادھر سے ان حضرت کا سر نخوت بلند ہوا۔ اُدھر سے کسی چیل نے بیٹ کی، وہ بیٹ سے ان کے مُنہ میں پڑی، بہت جز بز ہوئے، بہت بگڑے کہ خیال کیا تھا اور پیش کیا آیا۔ اسی وقت فوراً فرمایا۔ سخن فہمی عالم بالا معلوم، عالم بالا کی سخن فہمی معلوم ہوگئی۔ ہم سے پوچھیئے تو خود بینی کی داد خوب ملی۔ "رو میں رواہے" اُردو کی مثل ہے۔ پہلے پہل کسی مُلّا کی زبان سے نکلی اور ایسی کوٹھے چڑھی کہ اُردو زبان کی ساری دُنیا میں پھیل گئی۔ قصّہ اسکا یوں ہی کہ کہیں کوئی مُلّاجی رہتے تھے۔ بہت نیک متقی پرہیزگار ہر وقت ہاتھ میں تسبیح، زبان پر قال اللہ و قال رسول۔ محلہ میں جہاں رہتے تھے۔ کسی کی مُرغیاں بھی پلی ہوئی تھیں، وہ اکثر مُلّاجی کے گھر میں گھس آتیں۔ کہیں زمین کُرید تیں۔ کہیں بیٹ کرتیں۔ برتنوں اور پانی کے گھڑوں کو خراب کرتیں۔ دال چاول جو

کچھ انگنائی میں پاتیں بکھیرتیں اور کھا جاتیں۔ مُلا جی تو دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ان مُرغیوں کا دُکھ اُٹھانا پڑتا مُلانی جی کو۔ مگر کہاں تک برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب مُرغیوں سے وہ بہت تنگ آگئیں تو سوچیں ان نامُرادوں کو پکڑ پکڑ کر اور کاٹ کاٹ کر کھانا چاہیئے۔ جب کم ہونے لگیں گی۔ تو ہمسائے آپ بند کر کے رکھیں گے۔ اب جو حسبِ عادت مُرغیاں دوسرے دن مُلا جی کے گھر میں آئیں تو مُلانی جی نے کپڑا ڈال ایک مُرغی کو دبوچ ہی تو لیا۔ اور پھر جھٹ سے اللہ اکبر کہہ کر اُسے ذبح کر ڈالا، چونچ، پنجے پَر دور انگنائی میں گڑھا کھود کر دبا ئے۔ کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اور مُرغی کا گوشت بنا مسالہ پیس جھٹ سے دیگچی پکنے کو چولھے پر چڑھا دی۔ روز مُرغیاں ان کو جلاتی تھیں۔ آج وہ مُرغی بھونے بیٹھیں تو کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ اور ہنڈیا بڑے اہتمام سے پکی۔ شام کو مُلا جی گھر میں آئے۔ تو گھر میں گوشت کی بُو باس ہی کچھ اور تھی۔ بیوی سے پوچھا۔ کیوں صاحب آج کیا پکا ہے۔ وہ مسکرا کر بولیں، مُرغی، یہ سُنکر مُلا جی چونکے، اور گھبرا کر بولے۔ ارے کوئی شیخ سدّو کے نام کا تو مُرغا نہیں دے گیا ہے۔ وہ تو حرام اور قطعی حرام ہے۔ بیوی نے کہا۔ ہماری مُرغی بھلا شیخ سدّو کا مُرغا کیوں ہونے لگی ہے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ وہ حرام ہے۔

مُلا جی :- تو پھر یہ مُرغی کہاں سے آئی۔

مُلانی جی :- تو ذرا آہستہ تو بولو۔ محلہ کو سر پر کیوں اُٹھائے لیتے ہو۔ ہمسائے سُنیں گے۔ اُنہیں کی ایک مُرغی میں نے آج پکڑ لی تھی۔ اُسی کا آج قورمہ پکا ہے۔

مُلا جی :- ہے ہے۔ توبہ توبہ۔ یہ کیا غضب کیا۔ پرایا مال اور پھر ہمسایہ کا۔ حرام در حرام۔ بالکل حرام۔ یہ تم نے کیا کیا۔ ہمسائے کا بڑا حق ہے۔ تم نے بڑا ستم کیا۔

مُلانی جی :- جی ہاں اُنہیں کا تو حق ہے۔ وہی ہمسایہ ہیں۔ ہم تو ان کے گویا ہمسایہ نہیں۔ ہمارا کوئی حق اُن پر کیوں ہونے لگا ہے۔ اُنکا حق ہے کہ اپنی مُرغیاں ہمارے گھر میں چھوڑ جائیں۔ وہ نامُرادیں ہمارا ناک میں دم کر دیں۔ مگر ہم دم نہ ماریں۔

مُلا جی :- تم اپنا دروازہ بند رکھو۔

مُلانی جی :- ہاں ہم اپنا دروازہ بند رکھیں۔ وہ اپنی مُرغیاں بند نہ رکھیں۔ ہمارا دروازہ بند ہی رہنے کے لئے بنا ہے۔ اور اُنکی مُرغیاں ہمارے گھر آنے اور ہمیں ستانے کے لئے۔

مُلا جی :- اچھا تم اپنا دروازہ بند نہ رکھو۔ لیکن اُن کی مُرغیاں پکڑ کر اُن کا قورمہ تو نہ پکاؤ۔

مُلانی جی :- ہم نے کون سی اُن کی دس بیس مرغیاں پکڑ کر اُن کا قورمہ پکا کھایا ہے۔ وہ برسوں ہمارے گھر آئیں۔ اور ہمیں ستاتی تھیں۔ کھرے۔ برتن۔ چٹائیاں۔ چارپائیاں سب خراب اور نجس کرتی تھیں۔ ساری انگنائی میں گڑھے ڈال دئے۔ ...نوں دال چاول چٹ کر گئیں۔ کیا یہ سب چیزیں ایک دو چار مُرغیوں کے بھی برابر نہیں۔ وہ ہمیں برسوں ستائیں روز ...ہمارا نقصان کر جائیں۔ محلہ والے بالکل بے گناہ اور ہم ایک مُرغی پکڑ کر کاٹ لیں تو گنہگار۔ یہ اچھا انصاف اور خوب مسئلہ ہے۔ اچھا ایسا ہی ہے تو مُرغی نہ کھانا۔ آج چٹنی روٹی ہی سہی۔ ابھی نمک مرچ اور لہسن کی چٹنی پیسے دیتی ہوں۔

...جی :- خوب تم مرغی کا قورمہ کھاؤ۔ اور ہم چٹنی روٹی، اجی مُرغی پرایا مال ہے۔ تو گھی تو اُس میں ہمارے داموں کا پڑا ہے۔ مسالہ ہمارا لگا ہے۔ لکڑیاں ہماری جلی ہیں۔ حرام ہیں اِسکی بوٹیاں۔ شوربا بنا ہے ہمارے مال کا وہ ہمارے لئے حلال ہے۔

بس شوربا شوربا ہمیں نکال دو۔ بلکہ انڈیل دو۔ رہی بوٹیاں سو وہ اپنی ستانے والی مُرغی کی تم چباؤ۔ اب جو مُلّانی جی پیالے میں شوربا اُنڈیلنے بیٹھیں تو مُرغی کی بوٹیاں بھی شوربے کے ساتھ ساتھ آنے لگیں۔ مُلّانی جی نے اُنہیں چمچے سے روکنا چاہا۔ تو سُرخ سُرخ بُوٹیاں دیکھکر مُلّا جی کا جی للچایا۔ فرمانے لگے بیوی جو بوٹی اپنے آپ رو میں آتی ہے اُسے آنے دو۔ رو میں جو آتے رواہے۔ یہ سُنکر مُلّانی جی کو تو ہنسی آئی۔ اور مُرغی کی بُوٹیاں پیالے میں آپڑیں۔ اور مُلّا جی نے شوربا اور بوٹیاں دونوں خوب مزے سے کھائیں۔ اور "رو میں رواہے" نے کچھ ایسی قبولیت پائی کہ ایک ضرب المثل ہوگئی۔

صحیح یا جھوٹ یہ مسئلہ تو کسی مُلّا نے اپنے لئے نکالا تھا۔ لیکن اب بہت سے ناکردہ گناہ بھی اِس ضرب المثل کی لپیٹ میں آجاتے ہیں ؛

عبدالرحمٰن

کسی کی یاد

سکوں ہوتا نہیں طائر کو جب اپنے نشیمن میں
کہ جب ہوتی ہیں آسودہ بہاریں صحنِ گلشن میں
گھٹائیں جھوم کر اُٹھتی ہیں جب مشرق کے گوشوں سے
کہ جب دلکش مناظر ہوتے ہیں صحرا کے دامن میں
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

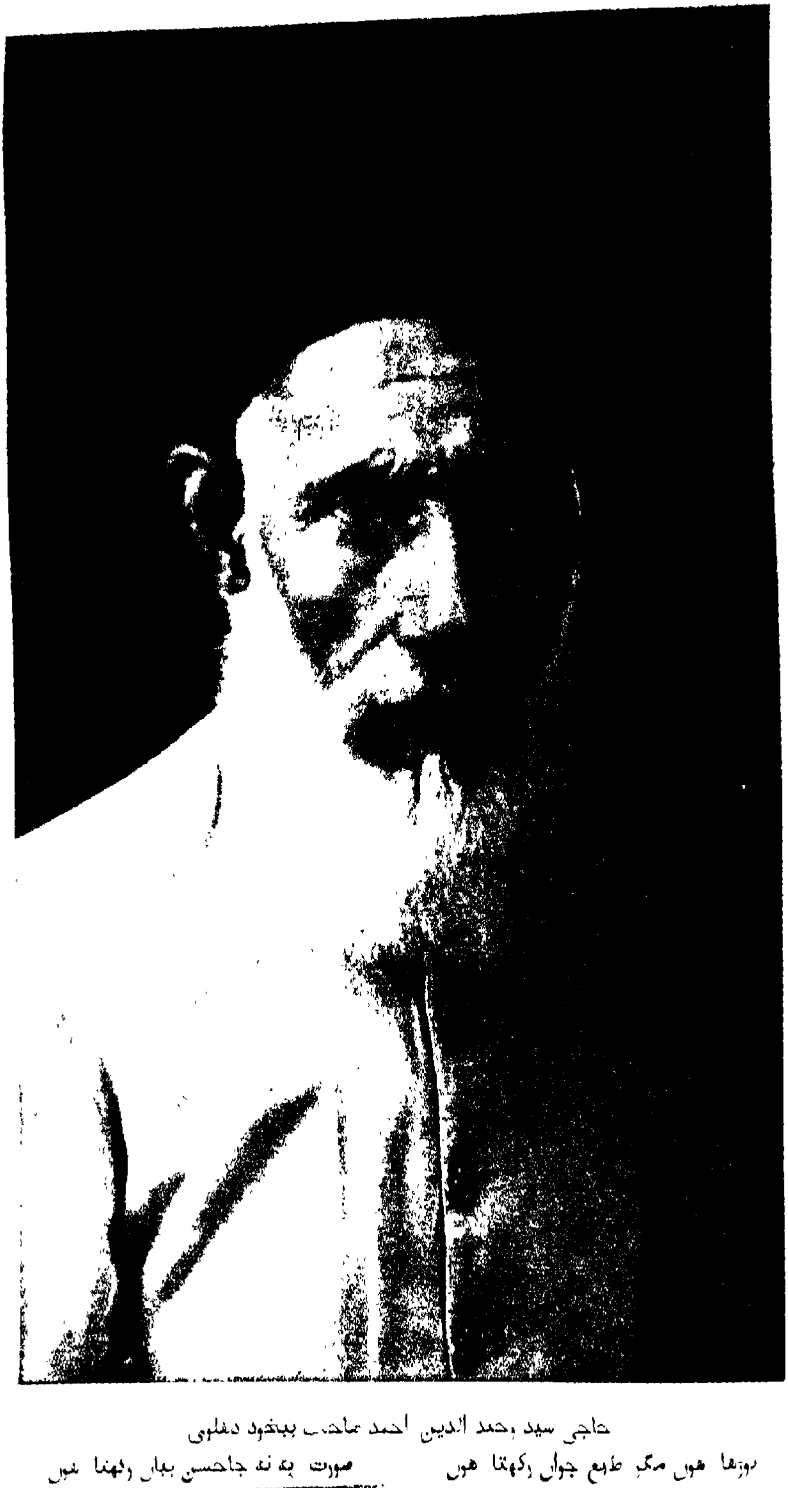
شفق گوں شام کے سائے میں دریا کی روانی میں
تمنا رنگ جب بھرتی ہے الفت کی کہانی میں
جُدائی سے تمہاری جب فضا تاریک ہوتی ہے
نظر آتی نہیں رنگینیاں نقشِ جوانی میں
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

مجھے یہ چاندنی بے کیف سی معلوم ہوتی ہے
کہ ہر شے بے تمہارے حسن سے محروم ہوتی ہے
میں بنجاتا ہوں جب اک پیکرِ یاسِ غم و حسرت
کہ جب تخیلِ راحت، دہر سے معدوم ہوتی ہے
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

اضافہ ہوتا ہے میرے جنونِ حشر ساماں میں
یہ ظالم کوئلیں جب کوکتی ہیں صحنِ بستاں میں
مجھے جب واقعاتِ عہدِ ماضی یاد آتے ہیں
تلاطم سا بپا ہوتا ہے جب خوابیدہ ارماں میں
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

مرے دل کا ہر اک ذرّہ سراپا جوش ہوتا ہے
کہ جب دریا سکوتِ شام میں خاموش ہوتا ہے
مری وارفتگیٔ شوق کا عالم معاذاللہ
مری ہستی کا ہر رُخ مجھ سے خود روپوش ہوتا ہے
وہ اک تم ہو کہ ایسے وقت مجھکو یاد آتے ہو

ثاقب کانپوری



حاجی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی

بوڑھا ہوں مگر طبع جواں رکھتا ہوں　　　صورت پہ نہ جا حسن بیاں رکھتا ہوں



مولانا عنایت اللہ دہلوی

شیکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل

میکبتھ

مترجمہ

مولانا عنایت اللہ دہلوی بی۔اے

(سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن)

ڈراما کے اشخاص

ڈنکن۔ بادشاہ اسکاتستان۔

میلکم۔ } بادشاہ کے فرزند۔
دونل بین۔ }

میکبتھ۔ } بادشاہ کے سپہ سالار۔
بینکو۔ }

میکڈف۔ }
لینکس۔ }
راس۔ }
منٹیتھ۔ } اسکاتستان کے بڑے رئیس۔
اینگس }
کائیتھنس۔ }

فلی نس۔ بینکو کا بیٹا۔

سیورڈ۔ امیرِ نورتھمبرلان انگریزی فوجوں کا افسرِ اعلیٰ

جوان سیورڈ۔ سیورڈ کا فرزند۔

سیٹن۔ ایک فوجی افسر جو میکبتھ کی خدمت میں حاضر رہتا ہے۔

ایک لڑکا۔ میکڈف کا بیٹا۔

ایک انگریز ڈاکٹر۔

ایک اسکاچ ڈاکٹر۔

ایک سارجنٹ۔

ایک حمّال۔

ایک بڈھا آدمی۔

لیڈی میکبتھ۔

لیڈی میکڈف۔

خواصیں جو لیڈی میکبتھ کے پاس حاضر رہتی ہیں۔

اُمرا۔ شرفا۔ فوجی سردار۔ سپاہی۔ قاتل۔ ملازمین

اور قاصد۔

ہیکیٹی۔

تین چڑیلیں۔

کچھ ہوائی صورتیں۔

منظر:۔ اسکاتستان اور انگلستان۔

میکبتھ

جزوِ اوّل

پہلا منظر:- ایک ویران مقام۔ آسمان پر بجلی اور گرج ہے۔ تین جادوگرنیاں سفلی عمل میں مشّاق، تقدیر کا حال بتانے والیاں آتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی:- کہو بہن۔ اب پھر کب ملنا ہوگا۔ کیا گرجتے بادل، چمکتی بجلیوں یا برستے مینہ میں ملاقات ہوگی؟

دوسری جادوگرنی:- نہیں نہیں۔ جب یہ غُل غپاڑہ شور شغب ہو لیگا۔

تیسری جادوگرنی:- یہ تو سُورج چھُپنے تک سب ختم ہو جائیگا۔

پہلی جادوگرنی:- اچھا تُو، یہ تو بتاؤ کہاں ملنا ہوگا؟

دوسری جادوگرنی:- اُسی کیچڑ پانی جھاڑیوں والی زمین پر۔

تیسری جادوگرنی:- ہاں، وہیں تو میکبتھ سے ملنا ہے۔

پہلی جادوگرنی:- اری میری ہمزاد کالی کرنجی بِلّی تو کیوں چیخے جاتی ہے؟ ذرا دم لے، ابھی آتی ہوں۔

دوسری جادوگرنی:- اور تُو میرے ہمزاد مینڈک تو کیوں اتنا ٹرٹر کرکے مجھے بلائے جاتا ہے؟ ٹھیر، ابھی آئی۔

تینوں جادوگرنیاں:- ہمارے نزدیک بُرائی بھلائی ہے اور بھلائی بُرائی۔ آؤ چلو۔ کُہر اور گندی ہوا میں گشت لگائیں۔

دوسرا منظر:- فورس کے قریب ایک لشکرگاہ۔ بادشاہ ڈنکن، اسکے دونوں فرزند میلکم، ڈونل بین۔ لی نکس معہ چند خادموں کے آتے ہیں۔ ایک سپاہی کو دیکھتے ہیں کہ زمین پر پڑا ہے۔ زخموں سے خون جاری ہے۔

ڈنکن:- یہ خُون میں آلودہ آدمی کیسا پڑا ہے؟ اس کی حالت سے ظاہر ہے کہ آخری بغاوت کا حال وہ خوب کہہ سکیگا۔

میلکم:- حضور یہی شخص ہے جسنے ایک وفادار و جاں نثار سپاہی کی طرح مجھے دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہونے سے بچایا تھا۔ اے بہادر دوست اُٹھ اور بادشاہ کی حضور میں بیان کر کہ آخری لڑائی کو تُونے کس حال میں چھوڑا تھا۔

زخمی سپاہی:- حالت ایسی مُشتبہ تھی جیسے دو ڈوبتے آدمی آپس میں لپٹ جائیں، اور ایک دوسرے کو تیرنے نہ دے۔ باغیوں کے اُس بے رحم سرغنے میکڈن ولڈ نے، جسے بغاوت و سرکشی ہی زیب دیتی ہے، دُنیا بھر کے شریر اور مُفسد اپنے پاس جمع کر لئے ہیں۔ چُنانچہ مغربی جزیروں سے ہلکے اور بھاری دونوں قسم کے ہتھیار رکھنے والے سپاہی اس کے پاس چلے آتے ہیں۔ اور تقدیر اس ناپاک لڑائی پر کچھ ایسی نظرِ مہر سے مُتبسّم ہے جیسے کوئی بیسوا ہو کہ کبھی اس آشنا کو دیکھکر مُسکرا دی، کبھی اس یار کو دیکھکر ہنس پڑی پھر بھی میرے خیال میں باغیوں کی حالت اس وقت کمزور ہو چلی تھی۔ کیونکہ بہادر میکبتھ نے، جس کی شُجاعت میں کسکو کلام ہو سکتا ہے، شکست یا پسپائی کی مطلق پروا نہ کی اور تلوار پھراتا ہوا دُشمن میں گھُس پڑا۔ تلوار سے خون کی بھاپ اُٹھ رہی تھی اور اسی حال میں دلیری اور جوانمردی کا محبوب بنا دُشمن سے رستہ نکالتا ہوا باغیوں کے سرغنے کے سامنے

جا پہونچا۔ بات تک نہ کی اور بلا تامل اُس کی ناف میں تلوار بھونک کر ہونٹوں تک اُسے چیرتا چلا گیا اور اُس کا سر کاٹ کر فصیل پر جا لٹکایا۔

ڈنکن :۔ بیرن نہ ہو۔ بڑا بہادر بھائی ہے اور طبیعت کا بھی نہایت شریف ہے۔

زخمی سپاہی :۔ اب اُس سمت سے جہاں سے سُورج اپنی روشنی دنیا پر پھیلاتا ہے اور سمندر میں سفینہ شکن گرداب اور آسمان پر خوفناک کڑک بجلیاں نظر آتی ہیں غرض جہاں سے راحت و آرام پانے کی توقع ہو سکتی تھی وہاں سے رنج و اذیت کا سامان پیدا ہوا۔ بادشاہ سلامت غور فرمائیں کہ جونہی عدل و انصاف نے ہمّت و مردانگی کے ہتھیار لگائے دشمن کے سپاہی جو میدان میں ہر طرف پھیلے تھے انہیں اپنی خیر و سلامتی اسی میں نظر آئی کہ جس قدر جلد ممکن ہو میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن جب چمکتے ہوئے ہتھیار اور کمک آن پہونچی تو ناروے کے بادشاہ نے اپنا فائدہ اسی میں سوچا کہ لڑائی از سرِ نو شروع کر دے۔

ڈنکن :۔ تو کیا اس نئے ساز و سامان کو دیکھکر ہماری فوج کے سپہ سالار میکبتھ اور بینکو ڈرے نہیں ؟

زخمی سپاہی :۔ حضور ڈرے تو مگر اس طرح جیسے عقاب چڑیوں یا شیر خرگوش کو دیکھکر ڈرے۔ سچ عرض کرتا ہوں کہ حضور کے ان دونوں سرداروں نے دشمن پر وہ دوہری چوٹیں پہونچائی ہیں کہ گویا توپوں میں دو دو مرتبہ مصالح بھر کر داغا جا رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ خون میں نہانا چاہتے ہیں، یا خون و خرابے کی کوئی دوسری یادگار مثل گلگوتھا کے قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ نہیں عرض کر سکتا کہ اُنکا واقعی ارادہ کیا تھا لیکن

اب مجھے ضُعف سے غش آ چلا ہے اور میرے زخم مرہم کے مُحتاج ہیں۔

ڈنکن :۔ تیرا یہ بیان اور تیرے زخم دونوں تیری عزت و شرافت پر گواہی دے رہے ہیں۔ دونوں سے پاسِ عزت اور قومی غیرت ٹپک رہی ہے۔ دیکھو۔ اس کے علاج کیلئے فوراً جرّاح حاضر کئے جائیں (زخمی سپاہی کو چند آدمی اُٹھاکر باہر لیجاتے ہیں۔)

یہ کون آ رہا ہے ؟

میلکم :۔ حضور۔ یہ راس کا لائق امیر ہے۔

لینکس :۔ مُلاحظہ ہو کہ اس کی نگاہوں سے کس غضب کا اضطراب اور عُجلت پائی جاتی ہے۔ آنکھوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ کوئی عجیب بات کہنے کو ہے۔

(راس آتا ہے)

راس :۔ خُدائے ذوالجلال بادشاہ کو زندہ سلامت رکھے۔

ڈنکن :۔ میرے لائق امیر تم کہاں سے آ رہے ہو ؟

راس :۔ جہاں پناہ بندہ فائف سے آتا ہے۔ وہاں ناروے کے جھنڈے اور پھریرے بلند ہو کر آسمان تک کو مُنہ چڑاتے ہیں۔ اور ہماری سرد مزاج رعایا کو بھی ایک آگ کا شُعلہ بنا دیا ہے۔ شاہِ ناروے بذاتِ خود اس باغی و بدخواہ یعنی امیر کاڈر کی پُشت گرمی سے بڑی سختی اور شدّت سے حملہ آور ہوا۔ لیکن ہمارا میکبتھ جو اس وقت لڑائی کی دیوی کا دُولھا بنا ہوا ہے ناروے کی فوجوں کے مقابلے پر اس طرح آیا جیسے فریقین میں ہر فریق دوسرے فریق کا پورا جوڑ اور جواب بن کر آئے۔ مگر میں یہی کہونگا کہ پھر بھی میکبتھ نے ضبط سے کام لیا۔ اور لڑائی کا انجام یہی ہوا کہ ہمیں فتح ہو گئی۔

ڈنکن :۔ اس سے بڑھکر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔

راس :- اب بادشاہ ناروے ساونیو مصالحت کی گفتگو کرنی چاہتا ہے۔ مگر تا وقتیکہ شنٹ کلمی کے ٹاپو میں ہمارے مصارفِ جنگ کے لئے دس ہزار ڈالر جمع نہ کردے ہم اُس کے مُردے دفن نہ ہونے دینگے۔

ڈنکن :- بس اب یہ کاوڈر کا امیر ہمارے کسی نفع میں نقصان کا مُوجب نہ ہوسکیگا۔ جاؤ۔ اُسے قتل کا حکم ہماری طرف سے سُنادو۔ اور اب تک امیر کاوڈر کا جو خطاب وہ رکھتا تھا اُسے ضبط کرکے یہی خطاب ہم میکبتھ کو عطا کرتے ہیں۔

راس :- فدوی ابھی جاکر حضور کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہُو۔

ڈنکن :- جو کچھ کاوڈر نے کھویا ہے وہ میکبتھ کو دیا جاتا ہے۔ (سب چلے جاتے ہیں)

تیسرا منظر :- کیچڑ۔ دلدل اور جھاڑیوں والی زمین۔ بادل گرجتا ہے تینوں سفلی عمل کرنے والی جادوگرنیاں نمودار ہوتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی :- بہن تم کہاں تھیں ؟

دوسری جادوگرنی :- کسانوں کے مویشیوں کی جان نکال رہی تھی۔

تیسری جادوگرنی :- اور بہن تم کہاں تھیں ؟

پہلی جادوگرنی :- ایک ملاح کی جورو گود میں اخروٹ کی گری بھرے پھینکے مار کر چبائے چلی جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ تھوڑی سی مجھے بھی دے۔ اسپر وہ موٹی مُسٹنڈی جورو کہتی کیا ہے "دُور ہو چڑیل" یہ خبر سُنتے تو میں نے سُن لیا مگر میں پہلے سے جانتی ہوں کہ اُس کا مرد جہاز کا ناخدا بن کر کہیں دُور گیا ہے تو بُوا سُنو میں بھی چھلنی میں بیٹھکر جادو کے زور سے وہیں پہونچتی ہوں۔ اُس کے جہاز کے پیندے میں دُم کٹے چوہے کی طرح کُتر کُتر کر چھید نہ ڈالے ہوں تو بات نہیں۔

دوسری جادوگرنی :- بہن گھبراتی کیوں ہو، میں بھی بڑے زور کی ہوا چلاؤنگی۔

پہلی جادوگرنی :- ہاں بُوا۔ تم تو مجھ پر ہمیشہ سے مہربان ہو۔

تیسری جادوگرنی :- اور میں بھی اس زور کی آندھی اُٹھاؤنگی کہ جہاز تِنکا بنا اُڑتا پھرے۔

پہلی جادوگرنی :- اور میں اپنی طرف سے بھی وہ جھکڑ چلاؤنگی کہ ساری حقیقت کُھل جائے گی اور ناخدا کی کتاب میں جتنے بندرگاہ لکھے ہونگے اُن میں وہ وہ آندھیاں اور طوفان برپا کردونگی کہ سب حیران رہ جائیں گے۔ اور جتنے ملاح ہونگے اُن کا خون چوس کر اُنہیں پھوک بنا دونگی۔ دن اور رات میں کسی وقت بھی کسی کو نیند نہ آنے دی۔ نَو مرتبہ نَو اٹھواڑوں تک ہر آدمی تھکا ہارا بیجان رہے گا اور سبکی زبان پر یہی ہوگا کہ ہائے گرا، ہائے مرا۔ یہ سچ ہے کہ جہاز غارت نہ ہوگا مگر ہوا کے زور اور موجوں کے تھپیڑوں سے اُس کی وہ گت ہوگی کہ کیا پوچھنا ہے۔ ذرا دیکھو تو میرے پاس یہ کیا چیز ہے۔

دوسری جادوگرنی :- اچھی دکھاؤ، دکھاؤ۔

پہلی جادوگرنی :- ایک مسافر کا انگوٹھا کُتر لائی ہوں۔ جو کشتی کے سُکان پر بیٹھا گھر آرہا تھا کشتی ڈانواڈول ہوکر پانی میں ڈوبنے لگی۔

(نقارے اور طبل بجنے کی آواز آتی ہے)

تیسری جادوگرنی :- اہا جی۔ ڈھول بجے۔ ڈھول۔ اب تو میکبتھ آتا ہوگا۔

تینوں جادوگرنیاں :- ہم تو سب خشک و تر کی رکھوالیاں ہیں۔ [illegible] دُنیا بھر میں گشت کرتی ہیں۔ تین میرے، تین تین

تم دونوں کے، یہ سب تو ہوئے۔ چلو منتر پورا ہوا۔

میکبتھ :- فتح کے لحاظ سے ایسا اچھا دن اور موسم کے لحاظ سے اتنا بُرا دن کبھی پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ ارے یہ وحشت زدہ سوکھی چمرخ صورتیں کس کی ہیں؟ ان کے تن پر پھٹے پُرانے چیتھڑوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین کی رہنے والیاں نہیں ہیں مگر یہ کہنا بھی مشکل ہے کیونکہ زمین ہی پر وہ پلی ہیں۔ اری بھیانک صورتو، بتاؤ کیا تم جیتی جاگتی جانیں ہو۔ کیا کوئی آدم زاد تم سے کوئی بات پوچھ سکتا ہے۔ شکلوں سے تمہاری تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم ہماری بات سمجھتی ہو۔

(اتنا سُنتے ہی ہر جادوگرنی اپنی جھُرّیاں
پڑی سردی سے پھٹی ایک ایک اُنگلی اپنے
سوکھے پپڑیاں جمے ہونٹوں پر رکھتی ہے۔)

تم ظاہر میں تو عورتیں معلوم ہوتی ہو۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ تم سب کے مُنہ پر ڈاڑھیاں ہیں۔ اگر بات کرسکتی ہو تو بتاؤ تم کون ہو؟

پہلی جادوگرنی :- میکبتھ مُبارکباد۔ امیرِ گلیمس مُبارکباد۔

دوسری جادوگرنی :- میکبتھ مُبارک مُبارک امیرِ کادور مُبارکباد۔

تیسری جادوگرنی :- میکبتھ اب تم بادشاہ ہوجاؤ گے۔ بادشاہی مُبارک ہو۔

بینکو :- میکبتھ۔ تم اتنے چونکے کیوں ہو؟ اگر اِن کی کوئی بات بھلی معلوم ہوتی ہے تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میرے شریف ساتھی تم اتنے گُم سُم کیوں ہوگئے۔ کیا واقعی وہم وخیال کے پُتلے بن گئے یا بنتے ہو۔ امیرِ گلیمس ہونے کی عزت تو تمہیں اِس وقت بھی حاصل تھی۔ اب اِس سے بھی بڑھکر یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ امیرِ کادور بھی ہوجاؤ گے۔ بلکہ اِس سے بھی زیادہ یعنی مالکِ تاج وتخت ہونے کی تمہیں اُمید دلائی گئی ہے۔ کچھ سُنا بھی آپنے؟ لیجئے وہ تو کسی خیال میں ایسے محو ہوئے کہ کچھ سُنتے ہی نہیں۔ اری چڑیلو، مجھ سے تم نے کچھ نہیں کہا۔ زمانے کے کشت زار میں جو بیج ڈالے جاتے ہیں اگر تم انہیں دیکھکر بتا سکتی ہو کہ کونسا تخم جمیگا کونسا نہ جمیگا تو پھر میری قسمت کا حال بھی تو کچھ بتائیں۔ میں تو نہ تمہاری مہربانیوں کا محتاج ہوں اور نہ تمہاری دُشمنی سے ڈرتا ہوں۔ مجھ سے کیوں نہیں کچھ کہتیں؟

پہلی جادوگرنی :- مُبارکباد۔

دوسری جادوگرنی :- مُبارکباد۔

تیسری جادوگرنی :- مُبارکباد۔

پہلی جادوگرنی :- بینکو تم میکبتھ سے کم مگر اُس سے بڑھے رہوگے۔

دوسری جادوگرنی :- میکبتھ کی طرح خوش مگر اس سے زیادہ خوش تر ہوگے۔

تیسری جادوگرنی :- تم سے بادشاہ پیدا ہونگے۔ مگر خود کبھی بادشاہ نہ ہوگے۔

پہلی جادوگرنی :- بس میکبتھ اور بینکو دونوں کو مُبارک ہو۔

میکبتھ :- اری پہیلیوں میں بات کرنے والیوں ذرا ٹھیرو۔ دم لو۔ صبر کرو۔ کچھ اور باتیں بھی بتاتی جاؤ۔ جب سے میرا باپ سینل مرا ہے امیرِ گلیمس تو میں اُسی وقت سے ہوگیا ہوں۔ لیکن امیرِ کادور میں کیسے ہوسکتا ہوں۔ یہ امیر تو ابھی زندہ ہے اور روز افزوں ترقی پر ہے۔ بتاؤ کہ یہ عجیب خبریں تمہیں کہاں سے ملیں۔ اور تم کیوں اِس اُجاڑ اور ویران زمین پر ہمارا راستہ روک کر ایسی خبریں سُنانے لگیں جن سے آنے والی باتوں پر حکم لگایا جاسکتا ہے۔ میں

حکم دیتا ہوں کہ میرے ان سوالوں کا جواب دو۔

(جادوگرنیاں سب کی سب ایکدم غائب ہو جاتی ہیں۔)

بینکو:۔ پانی کے بُلبُلے تو بہت دیکھے ہونگے۔ اس وقت جو کچھ آپنے دیکھاہے یہ مٹی کے بُلبُلے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غائب ہوکر یہ سب کدھر چلی گئیں۔

میکبتھ:۔ فضا میں غائب ہوگئیں۔ اگرچہ وہ گوشت پوست رکھتی تھیں مگر وہ ایسی تحلیل ہوگئیں جیسے ہوا میں ہمارا سانس ملکر ہوا ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر اور ٹھیرتیں۔

بینکو:۔ جو باتیں ان کی زبانی آپکی نسبت سُننے میں آئی ہیں کیا ان کا واقعی پیش آنا آپ ممکن سمجھتے ہیں؟ اگر انکے صحیح ثابت ہونے کا آپکو یقین ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ اس وقت وہ بُوٹی کھاتے ہیں جس کے کھانے سے آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میکبتھ:۔ بینکو۔ تمہاری اولاد بادشاہ ہوگی۔

بینکو:۔ اور آپ بھی تو بادشاہی کرینگے۔

میکبتھ:۔ اور کاڈور کا امیر بھی تو سمجھو۔ کیا اُنہوں نے یہ نہیں کہا تھا؟

بینکو:۔ ہاں، یقینی۔ اُنکے الفاظ یہی تھے۔ یہ کون آرہا ہو؟

(راس اور اینگس آتے ہیں)

راس:۔ میکبتھ، بادشاہ سلامت نے تمہاری فتح کا حال سُنکر اظہار خوشنودی فرمایاہے اور جب بغاوت کو فرو کرنے میں بادشاہ نے تمہاری شجاعت و مردانگی کے کام سُنے تو اُس وقت حیرت و تعریف میں یہ بحث چھڑی کہ حیرت زیادہ ہے یا تمہاری تعریف۔ اس بحث میں خاموش و گنگ رہکر دیگر امور پر غور ہو رہا تھا کہ اُسی دن دریافت ہوا کہ بادشاہِ ناروے کی زبردست فوجوں میں جتنا کشت و خون ہوا وہ سب تمہارا کام تھا۔ دُشمن سے تم مطلق ڈرے نہیں۔ اب بادشاہ کے پاس قاصد پر قاصد اس طرح آنے شروع ہوئے جیسے آسمان سے اولے گریں۔ ہر قاصد جو خبر لاتا تھا تمہاری تعریف میں اس کی زبان خشک ہوتی تھی۔ اور وہ کہتے تھے کہ مُلک کو دُشمن سے بچانے میں تم نے حیرتناک جاں نثاری سے کام لیاہے۔ یہ کُل خبریں بادشاہ سلامت کے گوش گذار ہوتی تھیں۔

اینگس:۔ اب جہاں پناہ کی طرف سے ہم تمہارا شکریہ ادا کرنے بھیجے گئے ہیں۔ اور اس لئے کہ بادشاہ کی نظر میں تمہاری وقعت کے بڑھنے کا مژدہ تمہیں سنائیں نہ یہ کہ انعام و اکرام جو تمہیں ملنے والا ہو وہ تمہیں پیش کریں۔

راس:۔ جو کثیر انعام آپکو ملنے والا ہے ہمیں حکم ہوا ہو کہ اُسی میں سے بطور رقم پیشگی ہم آپکو امیر کاڈور کے لقب سے خطاب کریں۔ اور اے لائق امیر ہم آپکو امیر کاڈور کے خطاب پر دلی مُبارکباد دیتے ہیں اور آج سے یہی خطاب آپ کا رہے گا۔

بینکو:۔ تو کیا جو کچھ اُن شیطان کی خالاؤں نے کہا تھا وہ سچ نکلا۔

میکبتھ:۔ مگر امیر کاڈور تو ابھی زندہ ہیں۔ اُنکے لقب سے آپ مجھے کیسے خطاب کرسکتے ہیں۔ کیا مانگے تانگے کا خلعت آپ مجھے پہناتے ہیں؟

اینگس:۔ امیر کاڈور ابھی زندہ ہے مگر سزائے موت کا حکم اُس کے بارے میں صادر ہو چکاہے۔ اب وہ زیادہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہا۔ اُس کا قصور کیا تھا یہ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں۔ دو ہی باتیں معلوم ہوتی ہیں یا تو ناروے کے بادشاہ سے مل گیا تھا یا باغیوں سے سازش کرکے انہیں

خفیہ مدد پہنچائی۔ یا دونوں باتیں کیں۔ بہرکیف ملک کو تباہ کرنے میں اُس نے کوئی کسر نہ رکھی۔ مجھے ٹھیک نہیں معلوم مگر بغاوت کا جُرم اُس پر ثابت ہو چکا ہے اور اس جُرم کا اقبال بھی اُس نے کرلیا ہے۔ چونکہ جُرم ثابت ہو چکا ہے بس یہی بات اُسکی تباہی کا سبب ہوئی ہے۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہے) گلیمس اور کاڈور کا امیر۔ مگر سب سے بڑی بات بعد کو آتی ہے۔ (راس اور اینگس سے کہتا ہے) آپکی اِس تکلیف کا بیحد منّت گزار ہوں (بینکو سے) کیوں کیا اب بھی تمہیں توقع نہیں کہ تمہاری اولاد بادشاہ ہوگی؟

بینکو:۔ اگر وہ پیش خبری لپٹے پورے مفہوم میں دُرست سمجھی جائے تو پھر آپ کے دل میں تاج و تخت ملنے کی تمنّا پیدا ہونی لازمی ہوجائیگی، کیونکہ امیر کاڈور تو آپ ہو ہی چکے ہیں۔ یہ بات بھی کچھ عجیب ہوئی ہے۔ لیکن اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ اِس قسم کی باتیں انجام کار میں موجب نُقصان ہوا کرتی ہیں۔ ظلمت و تاریکی کی یہ ذرّیات بظاہر ہم کو سچّی باتیں بتاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو سچ دکھا کر بڑی باتوں میں دھوکا دیدیتی ہیں۔ ذرا مہربانی کرکے ایک بات سُن لیجئے۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہے) دو باتیں جو سچ نکلی ہیں وہ آخری بات کے سچ نکلنے کا بھی یقین دلاتی ہیں۔ (راس اور اینگس سے) آپ دونوں صاحبوں کا بیحد ممنون ہوں (علیحدہ) یہ خرقِ عادت صورتیں جو ظاہر ہوئی تھیں نحس نہیں ہوسکتیں اور نہ انہیں سعد کہا جا سکتا ہے۔ اگر نحس ہوتیں تو کامیابی کی مجھے کیوں اُمید دلاتیں۔ اور ایک سچّی بات یعنی مجھے امیرِ گلیمس کہہ کر مجھے امیر کاڈور ہوجانے کی اُمید دلائی۔ لیکن جو خبر اُنہوں نے مجھے دی ہے اگر وہ سعد ہوتی تو پھر اس سے میرا دم کیوں فنا ہوا جاتا ہے اور جو شکل ذہن میں پیدا ہوئی ہے اُس سے بدن کے رونگٹے کیوں کھڑے ہوتے جاتے ہیں اور میرا دل جو خاموش چین سے اپنی جگہ بیٹھا تھا اب وہ تڑپ تڑپ کر کیوں پسلیوں سے ٹکّریں کھانے لگا۔ اِس خیال سے کہ آئینِ فطرت کے خلاف کوئی کام کرنا پڑیگا مجھ پر اتنا خوف کیوں طاری ہوا جاتا ہے۔ جس خوف کا انسان کو فوراً مقابلہ کرنا ہو وہ اتنا آزار دہ نہیں ہوتا جتنا کہ وہ خوف جو آئندہ کسی پیش آنے والے واقعے کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ بادشاہِ وقت کو قتل کرکے خود بادشاہ بن جاؤں اِس وقت تک محض ایک خیال ہی خیال ہے جس کے آتے ہی مُلکِ دل کے نظم و دستور میں فتور پڑجاتا ہے اور کسی بات کو اُس کی صحیح شکل میں سوچنا بے سُود و ہوائی تصوّرات سے مغلوب ہوجاتا ہے اور بجُز ایک وہم و خیال کے کوئی چیز اصلی و حقیقی نہیں معلوم ہوتی۔

بینکو:۔ واہ واہ۔ دیکھئے تو ہمارے یہ دوست لپنے کسی خیال میں کس قدر محو و مستغرق معلوم ہورہے ہیں۔

میکبتھ:۔ اگر بخت و اتفاق مجھے بادشاہی دینگے تو وہی میرے سر پر تاج بھی رکھیں گے۔ خود مجھے کچھ نہ کرنا پڑے گا۔

بینکو:۔ نئے نئے خطاب، نئے نئے اعزاز اُسے مل رہے ہیں۔ مگر نئی پوشاک بدن پر اُس وقت تک ٹھیک نہیں آتی جب تک کچھ دنوں پہن نہ لی جائے۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ) جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہوکر رہیگا۔ دن یا وقت کیسی ہی مشکلوں اور مصیبتوں کا ہو مگر زمانہ اُن میں سے گزرتا ہوا اپنا دورہ ہر حال میں پورا کرہی لیتا ہے۔ سخت سے سخت مصائب اور آفات بھی ایک نہ ایک

دن ختم ہو ہی جاتے ہیں۔

بینکو۔ لائق میکبتھ، ہم اب تک آپ کے فرمانے سے یہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔

میکبتھ:۔ معاف فرمائیگا۔ میرا یہ کُند دُشست دماغ اس وقت کسی خیال میں محو تھا اور خیال بھی ایسا تھا جس میں کبھی کی بھُولی بسری باتیں یاد آرہی تھیں۔ میرے مہربان شریفو، آپ نے جسقدر تکلیفیں اس وقت میرے لئے گوارا فرمائیں ہیں وہ میرے دل کی کتاب میں نقش رہینگی اور میں اس کے اوراق کھُول کر ہمیشہ پڑھتا رہونگا۔ اب مجھے بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہونا ہے (بینکو سے کہتا ہے) جو باتیں بخت و اتفاق سے اِس وقت پیش آرہی ہیں اُن پر آئیندہ غور کرنا ہے، اس بیچ کے زمانے میں ہم تم کسی وقت تنہا بیٹھکر آزادی سے غور کریں گے۔

بینکو:۔ نہایت خوشی سے۔

میکبتھ:۔ اِس وقت جو کچھ گزرا ہے وہی کافی ہے۔ دوستو آؤ چلیں۔ (چلے جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر:۔ فیرِوس۔ شاہی قصر

باجے بجتے ہیں۔ بادشاہ ڈنکن اور اُس کے دونوں فرزند میلکم اور دونل بین آتے ہیں۔

ڈنکن:۔ کہو امیرِ کاڈور قتل کر دیا گیا۔ جو لوگ اِس کام پر مُقرر تھے وہ واپس آگئے؟

میلکم:۔ حضور، وہ ابھی تک واپس نہیں آئے لیکن ایک شخص سے باتیں ہوئی تھیں جس نے امیرِ کاڈور کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ موت کے وقت اُس نے اپنے باغی ہونے کا اقبال کیا۔ اور حضور سے عفوِ تقصیر چاہا اور بے انتہا ندامت و پشیمانی ظاہر کی، زندگی میں کوئی بات اتنی لیاقت کی نہ کی تھی جیسے کہ مرتے وقت کی۔ وہ اس طرح مرا گویا جان دینے کا تصّور پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ اور جانِ عزیز جو مُستعار رکھتا تھا وہ اس طرح پھینک دی کہ گویا اس چیز کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔

ڈنکن:۔ افسوس دُنیا میں کوئی علم کوئی فن ایسا نہیں جس سے کہ دل کی اندرونی کیفیت چہرے سے معلوم کرلی جائے۔ وہ نہایت نجیب و شریف تھا۔ میں نے اپنے اعتماد و اعتبار کا قصر اُسی پر قائم کر رکھا تھا۔

(میکبتھ، بینکو، راس اور اینگس آتے ہیں)

اے میرے لائق عزیز بھائی۔ احسان فراموشی کا گُناہ اب تک میرے سینے پر بارِ گراں ہو رہا تھا۔ تم مکارمِ خُسروانہ کے اس قدر جلد جلد مُستحق ہوتے رہے کہ میں اتنی ہی عُجلت سے تمہاری خدمتوں کا انعام تمہیں نہ دے سکا۔ صرف اِتنا اور کہنا ہے کہ جو کچھ صلہ میں دُوں اُس سے کہیں زیادہ کے تم مُستحق ہو۔

میکبتھ:۔ جو کچھ وفاداری اور خدمت گزاری اِس نمک خوار نے کی وہ خود فدوی کی جاں نثاری اور خدمت کا سب سے بڑا صلہ ہے۔ حضور کو ہم جاں نثاروں پر حق حاصل ہے کہ ہم جہاں پناہ کی خدمت بجالاتے رہیں۔ اور حضور ہماری اطاعت گزاری کو بنظرِ التفات و پرورش دیکھیں۔ حضور میں اور ہم میں وہی تعلق ہے جو ماں باپ کو بچوں سے اور آقا کو اپنے مُلازموں سے ہوتا ہے۔ آقا کی جان اور مال، عزت اور نام کے لئے جو خدمتیں ہم پر فرض ہیں اُن پر ہمیشہ عمل رکھنا ہمیں لازم ہے۔

ڈنکن:۔ ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم تمہیں اپنے باغ میں مثل ایک پودے کے لگائیں گے اور خدمت کرتے رہیں گے کہ وہ پروان چڑھے۔ شریف بینکو تم نے بھی اپنے تئیں کچھ کم

لیاقت کا آدمی ثابت نہیں کیا۔ تمہاری نیک نامی بھی دوسروں سے کم نہیں۔ ہم تمہاری پرورش اور ترقی میں بھی مثل ایک باغبان کے آبیاری کرینگے اور تم ہمیشہ ہمارے دل سے نزدیک رہوگے۔

بینکو:۔ حضور اگر میں پھلا پھولا تو پھل پھول سب حضور کے ہونگے۔

ڈنکن:۔ اس وقت مسرت و شادمانی نے کچھ ایسا دل پر اثر کیا ہے کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھرے چلے آتے ہیں۔ اے میرے فرزندو، عزیزو، امیرو اور میرے مقربو! سُنو۔ ہمارا قصد اپنے سب سے بڑے فرزند میلکم کو وارثِ سلطنت بنانے کا ہے اور ایسا ہی انتظام تمہیں کرنا ہوگا۔ اور آج سے ہم اپنے ولی عہد کو "شہزادہ کمبرستان" کے لقب سے خطاب کیا کریں گے۔ اور ہم صرف اُسے ہی عزت نہیں بخشتے بلکہ اپنے دربار کے دیگر اعیان و اکابر کو بھی جو اپنے حسنِ لیاقت سے اس وقت ہمارے آسمانِ اقبال کے چمکتے تارے ہیں مُوردِ عنایات و نوازشات کرتے رہینگے۔ اب ہم میکبتھ کے قصرِ انورنس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ ہم اپنے اس عزیز کے اور بھی مرہونِ منت ہوں۔

میکبتھ:۔ اب اُس مصروفیت کا وقت آیا جو حضور کے لئے نہیں بلکہ اپنے حصولِ سعادت کے لئے ہوگا۔ میں خود قاصد بن کر یہ مژدہ اپنی بیوی کے پاس پہونچاؤنگا کہ حضور تشریف لا رہے ہیں۔ اب فدوی رُخصت چاہتا ہے۔

ڈنکن:۔ اچھا، میرے نہایت لائق امیر کادور۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہے) واہ واہ۔ یہ شہزادہ کمبرستان تو راہ میں ایک اور ٹھوکر ہوگئی۔ اب یا تو میرا خاتمہ ہوا یا ایک چھلانگ میں دوسری پار پہونچا۔ میلکم کا وارثِ سلطنت قرار پانا میرے حق میں سدِراہ ہوگا۔ آسمان کے ستارو، اپنی روشنیاں گُل کر دو، تاکہ تمہارا نور میری سیاہ کاریوں اور گہری خواہشوں کو نہ دیکھ سکے۔ اس ہاتھ کو دیکھنے سے تو میری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ سوچا ہے وہی ہونے دو۔ جب وہ ہو چکیگا تو یہی آنکھیں اُسے دیکھکر سہم جائیں گی۔

ڈنکن:۔ بینکو، جو کچھ تم اُس کی نسبت کہتے ہو وہ بالکل دُرست ہے۔ وہ حقیقت میں ایسا ہی بہادر ہے جیسا کہ تمہارا بیان۔ اس کی تعریفیں تو میرے لئے ایک ضیافت ہوتی ہیں۔ اچھا آؤ۔ اب اس کے پیچھے چلیں جو ہماری خاطر و مدارات کا سامان کرنے آگے گیا ہے۔ میکبتھ مجھے بیحد عزیز ہے۔

پانچواں منظر:۔ میکبتھ کا قصرِ انورنس
لیڈی میکبتھ ایک خط پڑھتی اسٹیج پر آتی ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ "جس دن لڑائی میں فتح ہوئی اُسی دن اُن سے مُلاقات ہوئی۔ مجھے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ انسان سے کہیں بڑھکر اُنہیں ہر بات کا علم رہتا ہے۔ جب ارادہ ہوا کہ کچھ اور پُوچھوں تو وہ سب ہوا ہوگئیں۔ میں ابھی اسی عالمِ حیرت میں تھا کہ بادشاہ کے قاصد آئے اور اُنھوں نے مجھے امیر کادور کے لقب سے خطاب کیا۔ اور یہی وہ لقب تھا جسے اُن تینوں جادوگرنیوں نے پُکار کر مجھے سلام کیا تھا۔ اور وہ بات بھی جو آئیندہ پیش آنے والی ہے کہی تھی۔ بلکہ اُنہوں نے تو یہانتک کہا تھا کہ مُبارک ہو اُسے جو بادشاہ ہونے والا ہے۔ اے میری شریکِ عزت و ناموس یہ کُل باتیں میں تیرے علم میں لے آیا ہوں تاکہ تو بھی اس خوشی میں شریک رہے اور جو بزرگی اور عزت مجھے ملنے والی ہے اُس سے بے خبر رہکر

خوشی سے محروم نہ رہے۔ یہ کُل باتیں دل میں مخفی رکھنا۔ اچھا خُدا کو سونپا۔"

لیڈی میکبتھ:- امیر گلیمس تو تم پہلے ہی تھے، اب امیر کاوڈر بھی ہوگئے۔ اور جس بات کا تم سے آخیر میں وعدہ کیا گیا ہے وہ بھی ہو جاؤ گے۔ مگر میں تمہاری طبیعت سے ڈرتی ہوں تم میں انسانی ہمدردی اور محبت کا شیرِ مادر اتنا ہے کہ تم کوئی قریب تر راستہ اِس مقصد کے لئے نہ نکال سکو گے۔ بزرگی تمہیں نصیب ہونے والی ہے۔ حُبِ جاہ و دولت تم رکھتے ہی ہو مگر جو چیز حاصل کرنی چاہو گے اُسے ایمانداری سے حاصل کرنے کی نیت رکھو گے۔ دغا و فریب دینا گوارا نہ کرو گے مگر اے امیر گلیمس تم دغا و فریب ہی سے اپنی مراد کو پہنچ سکتے ہو۔ اور وہ آواز بھی یہی کہتی ہے جو کچھ تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ تم اس پر عمل کرنے سے ڈرو نہیں اور اسکے ساتھ ہی تم یہ بھی نہ چاہو گے کہ وہ چیز تمہیں نہ ملے یہاں جلد آؤ کہ میں اپنی ہمت و عزم کا جوش و خروش تمہارے کانوں میں بھر دوں اور اپنی دلیر زبان سے تمہاری جسارت و ہمت کو بڑھا کر تمہارے دل سے وہ تذبذب دُور کر دوں جس میں باوجودیکہ خرقِ عادت ذرائع اور تقدیر تمہارے سر پر تاجِ شاہی رکھنا چاہتی ہے، تم اس وقت مُبتلا ہو۔

(ایک قاصد آتا ہے)

کہو کیا خبر ہے؟

قاصد:- بادشاہ سلامت آج شب کو یہاں قیام فرمائینگے۔

لیڈی میکبتھ:- کچھ دیوانے تو نہیں ہوگئے ہو۔ کیا تمہارا آقا میکبتھ بادشاہ سلامت کے ہمراہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انتظام کی غرض سے وہ مجھے پہلے اطلاع کر دیتا۔

قاصد:- یہ حضور نے بجا فرمایا۔ ہمارے آقا امیر گلیمس بھی آرہے ہیں۔ لیکن ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے جلدی کی اور اُن سب سے پہلے وہ یہاں پہونچ گیا۔ وہ اِتنا دوڑتا ہوا آیا ہے کہ دَم پھُول کر اُس کی نوبت مرنے کو پہونچی ہے۔ چنانچہ بجز اسکے اُس کے مُنہ سے کچھ نہ نکلا کہ "بادشاہ سلامت آرہے ہیں"۔ اس کے سوا اور کوئی پوری بات وہ نہ کہہ سکا۔

لیڈی میکبتھ:- اچھا جو آدمی آیا ہے اُسے تکلیف نہ ہو۔ اُس کے آرام کا خیال رکھا جائے۔ جو خبر وہ لایا ہے وہ اچھی ہے۔ (قاصد چلا جاتا ہے)

ظُلمت و نحوست کا شب رنگ پرندہ کریہ آواز میں چیخ رہا ہے کہ ڈنکن کی اجل اُسے یہاں لا رہی ہے۔ چیختے چیختے اُس کا گلا بیٹھ چلا ہے۔ اے خبیث روحو۔ جو انسان کے دل میں کُشت و خُون کے خیالات حلول کرتی ہو عورت کی شریف و نیک فطرت مجھ سے دُور کر دو۔ ظُلم و سفاکی سر سے پاؤں تک مجھ میں بھر دو۔ اور قلب کے وہ تمام راستے مسدود کر دو جن سے ندامت یا پشیمانی داخل ہو کر رنج و افسوس پیدا کرتی ہیں کہ کہیں وہ خونی مقصد سے مجھے باز نہ رکھیں۔ اور جب تک مقصد پورا نہ ہو میری فطرت کو چین سے نہ بیٹھنے دو۔ اور اے خونِ ناحق کے کار پردازو، میری چھاتیوں میں دُودھ کی جگہ زہر بھر دو۔ تم وہ ہو جو کسی کو نظر نہیں آتے۔ دُنیا کی تمام شرارتوں میں تم برُوں کے معاون و مددگار ہوتے ہو۔ اے اندھیری رات تو جہنم کے دُخانی پردوں میں چھپی بیٹھی رہ تاکہ نوکِ خنجر بھی اپنے لگائے ہوئے زخم کو نہ دیکھ سکے۔ اور اس شب تیرہ و تار میں فرشتے بھی آسمان سے جھانک کر آواز نہ لگا سکیں:- خبردار خبردار۔!

(میکبتھ اندر آتا ہے)

اے امیر گلیمس اور اے امیرِ والاشان کاوڈر اور ان سے

بھی بالاتر جو کچھ آئندہ ہونے والے ہو، تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے خطوں نے حالتِ لاعلمی سے نکال کر ایک آن میں مستقبل کا سارا نقشہ میری نظر کے سامنے پیش کر دیا۔

میکبتھ:- پیاری بیوی۔ آج شب کو بادشاہ ڈنکن یہاں آنے والے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- واپسی کب ہوگی؟

میکبتھ:- کل واپس ہونے کا ارادہ ظاہر فرماتے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- سورج وہ کل کبھی نہ لائیگا۔ میرے امیر آپ کا چہرہ تو ایک کتاب بنا ہوا ہے کہ جس کا جی چاہے دل بہلانے کو نہایت عجیب عجیب حالات اس میں پڑھ لے۔ اب دوسروں کو آپ ایسے ہی نظر آئیں جیسے کہ زمانہ کے اور لوگ نظر آتے ہیں۔ اور موقع چاہتا ہے کہ آنکھوں سے ہاتھوں سے زبان سے اطمینان و مسرت ظاہر ہوتی رہے۔ ایک معصوم پھول بن کر در پردہ مارِ قاتل بنجائیے۔ وہ جو آ رہا ہے اُس کے لئے ضروری سامان بہت کچھ کرنا ہے، اور آج شبکو جو کچھ ہونے والا ہے وہ میرے سپرد کر دیجئے۔ اور یہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ آنے والے لیل و نہار میں آپکو بادشاہ بنا کر سب کا مالک کر دیگا۔

میکبتھ:- اس معاملۂ خاص میں پھر کسی وقت ضروری گفتگو ہوگی۔

لیڈی میکبتھ:- چہرہ صاف رکھئے۔ اس کے متغیر رکھنے سے لوگ سمجھیں گے کہ کوئی خوف طاری ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

چھٹا منظر:- میکبتھ کے قصر کے سامنے۔

شہنائی بجانے والے اور ملازم ہاتھوں میں مشعلیں لئے ساتھ ہیں۔ ڈنکن، میلکم، ڈونل بین، بینکو، لی نکس، میکڈف، راس، اینگس، اور بہت سے ملازم ساتھ آتے ہیں۔

ڈنکن:- دیکھو وہ ہماری عزیز اور مہربان میزبان آ رہی ہیں۔ ہمارے ساتھ اظہارِ خلوص و محبت میں بعض وقت بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ اِسے خلوص و محبت سمجھکر ہم آپ کے شکر گذار ہوتے ہیں اور اس بات کا سبق دیتے ہیں کہ خدا سے آپ اپنی اِن تکلیفوں کا اجرِ نیک حاصل کریں اور اس طرح جو تکلیفیں آپ نے اُٹھائی ہیں اُن کے لئے آپ ہمارے بھی شکر گزار رہوں۔

لیڈی میکبتھ:- حضور ہم اپنی خدمتوں کو دو دو مرتبہ ادا کر کے اگر اُن کو دوچند بھی کر دیں تب بھی وہ اس اعزاز و اکرام کے مقابلے میں بے حقیقت ہونگی جو حضور والا نے ہمارے خاندان کو بخشا ہے۔ پُرانا اعزاز و وقار یہ جو لطف و کرم اب اضافہ ہوا ہے اس کے لئے ہم ہمیشہ حضور کے دُعا گو رہیں گے۔

ڈنکن:- امیر کاڈور کہاں ہیں؟ میں تو اُن کے پیچھے جیسے تازی کتا ہرن کے پیچھے دوڑتا ہے دوڑتا ہوا آیا ہوں کہ پہلے پہونچ کر خود اُن کا استقبال کروں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ میری خاطر و مدارات کے لئے حاضر ہوں میں اُن کی خاطر و مدارات کے لئے حاضر رہوں۔ شہسواری میں اُن کا مثل نہیں۔ پھر اُن کا خلوص و ارادت ہمارے ساتھ ایسا ہے کہ تیز مہمیز لگا کر انہیں یہاں لا رہا ہے۔ لئے عزیز و مہربان میزبان آج شبکو ہم آپ کے مہمان رہیں گے۔

لیڈی میکبتھ:- ہم حضور کے خادم اور ہمارے خادم بھی حضور ہی کے نمک خوار ہیں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب حضور کا دیا ہے، اور جو کچھ حضور کا ہے وہ سب حاضر ہے۔

ڈنکن :- اپنا ہاتھ دیجئے اور ہمیں ہمارے میزبان کے پاس لے چلیئے۔ ہم کو اُن سے بڑی محبت ہے اور ہم اپنے مکارمِ شاہی سے ہمیشہ ان کو سرافراز کرتے رہیں گے۔ اچھا اب اجازت ہو، اے میری عزیز و مہربان میزبان۔

(چلے جاتے ہیں)

ساتواں منظر :- میکبتھ کا قصر۔

شہنائی بجانیوالے۔ چند مشعلچی۔ ایک کارپرداز اور بہت سے نوکر قابیں رکابیاں چمچے وغیرہ وغیرہ لئے ہوئے اسٹیج پر سے گزرتے ہیں۔ میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ :- جو کچھ ہونا ہے جب تک نہ ہو جائیگا چین نصیب نہ ہوگا۔ اچھا ہے اگر وہ جلد ہو جائے اور اس کے نتیجے بھی ظہور میں آجائیں، اور اُس کی موت کے بعد بادشاہی کا ملنا بھی قطعی ہو جائے۔ تو پھر قتل کے سوا دوسرا کیا مقصود ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ قصد پورا ہو گیا تو پھر یہ کُل قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن افسوس، جب اس زندگی کے ساحل سے کُود کر ہم آنے والی زندگی میں قدم رکھینگے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ اس قسم کے معاملات میں جو چیز اصلی اور حقیقی ہوتی ہے وہ نہیں ملا کرتی۔ ہم جو یہاں خون اور قتل کی تدبیریں کرتے ہیں اور وہ چل بھی جاتی ہیں تو پھر وہی تدبیریں ہم پر پلٹ پڑتی ہیں، یہ بادشاہ بڑا ہی عادل و منصف مزاج ہے اور اسکا عدل و انصاف بھی اس درجہ ہے کہ اگر کوئی زہر کا پیالہ بھی اس کے لئے تیار کرے تو وہ تیار کرنے والے ہی کے لبوں کے لائق ہوتا ہے۔ وہ ہم پر دو گونہ اعتبار و اعتماد کر کے ہمارے قصر میں آیا ہے۔ اوّل تو میں اُس کا قرابت مند، دوسرے اُس کی رعیت۔ یہ دونوں باتیں اُس کے خلاف ہیں کہ میں اُس کی جان کا خواہاں ہوں۔ پھر اس سے بھی بڑھکر یہ کہ میں اُسکا میزبان اور وہ میرا مہمان ہے۔ میرا فرض تو یہ ہے کہ اگر کسی کو کینہ پر آمادہ پاؤں تو اُس پر دروازہ بند کردوں، نہ یہ کہ خود خنجر ہاتھ میں لیکر اُسے قتل کرنے اُٹھوں۔ علاوہ اس کے یہ بادشاہ نہایت نیک اور حلیم الطبع ہے اور باوجود ایسا عالی مرتبہ ہونیکے ایسا صاف باطن اور منصف ہے کہ اس کی نیکیاں فرشتہ بن کر اُس کی حامی اور مددگار ہو جائینگی۔ اور اگر اسے قتل کر دیا تو پھر اس کی یہی نیکیاں نقارۂ خدا بن کر میرے اس جُرم کا تمام دُنیا میں ڈھنڈورا پیٹتی رہینگی اور رحم اور افسوس ایک نوزائیدہ برہنہ بچے کی طرح اس نقارے کی آواز پر سوار ہو کر ہمارا یہ گناہ اطرافِ عالم میں مشتہر کریگا۔ اور آسمان پر ملائکہ اپنے مرکبوں پر سوار ہو کر جو کسی کو نظر نہ آئیں گے فضا میں گشت لگا کر ہمارے اس ظلم و بے دردی کے کام کو تمام دُنیا کی نظروں کے پیش کرینگے۔ اور یہ کُل فضا آنسوؤں کے سیلاب میں غرق ہو جائیگی۔ اپنے توسنِ عزم کو آگے بڑھانے کے لئے میرے پاس کوئی مہمیز نہیں ہے۔ جاہ و مرتبہ کی طمع اُچک کر اس توسن پر سوار ہونا چاہتی ہے مگر بجائے نشست پر آنے کے دوسری طرف گرتی نظر آتی ہے۔

(لیڈی میکبتھ آتی ہے)

کہو کیا خبر ہے؟

لیڈی میکبتھ :- بادشاہ خاصہ تناول فرما چکے ہیں۔ تم کیوں باہر نکل آئے۔

میکبتھ :- کیا مجھے وہ پوچھتے تھے؟

لیڈی میکبتھ :- ہاں دریافت تو کرتے تھے۔

میکبتھ :- جو بات سوچی تھی میں اب اُس میں کچھ نہ کرونگا۔ ابھی ابھی تو مجھے بادشاہ نے اعزاز بخشا ہے اور ہر شخص میری نسبت اعلیٰ درجہ کی رائے رکھتا ہے۔ اب اور بھی ترقی اور تعریف کی اُمید ہے۔ اُس خیال کو ذہن سے جسقدر جلد ممکن ہو دُور کر دو۔

لیڈی میکبتھ :- جس وقت تاج و تخت کی آرزو ہوتی تھی اُس وقت کیا پھولی رکھی تھی، یا وہ آرزو پیدا ہوتے ہی سو گئی تھی اور جب جاگی تو دیکھتی کیا ہے کہ صورت زرد ہے اور طبیعت پر نامردی اور بزدلی چھائی ہے۔ آج سے میں تمہاری محبت والفت کو بھی ایسا ہی سمجھونگی۔ افسوس، جیسے مضبوط ہاتھ پاؤں کے تھے ویسے ہی دل کے نہ نکلے۔ دل کا ارمان نکالنے سے ڈرتے ہو۔ جسے زندگی کا زیور سمجھ رہے تھے یا تو اُسے واقعی حاصل کرنا چاہتے ہو یا خود دل میں ذلیل اور بزدل رہنا پسند کرتے ہو۔ یہ کہنا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں اور اُسے بغیر انجام دیتے دل میں اُس کی حسرت بھی رکھنا تو وہی مثل ہوئی کہ "بلّی کا کھانے کو جی تو چاہتا ہے مگر ڈرتی ہے کہ پاؤں گیلے ہو جائیں گے۔"

میکبتھ :- بیوی، خدا کے لئے خاموش رہو۔ جو بات مرد کو زیب دیتی ہے وہ سب کچھ میں کر سکتا ہوں اور اُسکے لئے اتنا تیار ہوں کہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔

لیڈی میکبتھ :- وہ کون موذی بدخواہ تھا جس نے تمہیں اپنے اِس مقصد کو مجھپر ظاہر کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ جس وقت تم نے ایسا قصد ظاہر کیا تھا اُس وقت تمہارے مرد ہونے میں کسکو شبہ ہو سکتا تھا لیکن جسقدر مرد تم اُس وقت تھے اُس سے بھی زیادہ مرد اُس وقت ہو گے جبکہ اپنی مُراد حاصل کر لوگے۔ اُس وقت مقام اور وقت تجویز نہ ہوا تھا۔ اِس وقت دونوں چیزیں موجود ہیں، بلکہ وقت اور مقام نے خود اپنے تئیں پیش کر دیا ہے۔ اور جب یہ سب کچھ ہو لیا تو تم ہمت ہارنے لگے۔ میں نے اپنے بچّوں کو دُودھ پلایا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ دُودھ پیتے بچّے کی مامتا ماں کو بہت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ شیر خوار میری گود میں پڑا ہنستا بھی ہوتا تو دُودھ اُس کے مُنہ سے چھُڑا کر اِس زور سے اُسے زمین پر پٹختی کہ اُس کا بھیجا نکل پڑتا۔ بشرطیکہ میں نے بھی اِس کام پر ایسی ہی قسم کھائی ہوتی جیسے کہ تم نے کھائی تھی۔

میکبتھ :- اگر ناکام رہے ؟

لیڈی میکبتھ :- بس یہی ہوگا کہ ناکام رہیں گے۔ لیکن جو ارادہ کیا تھا اُس پر تو ثابت قدم اور اپنی ہمت پر قائم رہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ناکام رہیں۔ ڈنکن دن بھر کے سفر سے تھکا ماندہ ہو رہا ہے۔ پڑتے ہی غافل سو جائیگا۔ دو ملازم جو اُس کے قریب ہونگے اُن کو میں شراب پلا کر اتنا مدہوش کر دونگی کہ اُن کا حافظہ جو دماغ کا سردار ہے محض ایک انجرہ رہ جائے گا۔ اور دماغ کے جس خانے میں عقل رہتی ہے وہاں حافظ کا عمل نہ رہے گا۔ جب یہ دونوں آدمی نیند میں غافل اور نشے میں بیہوش مُردوں کی طرح پڑے ہونگے تو پھر تو کیا چیز ہے جو تم باہر آ کر ڈنکن کے حق میں، جس حال میں کوئی اُس کا محافظ نہ ہو، نہیں کر سکتے۔ پھر اِنہی دونوں ملازموں کو قتل سے مُتہم کرنا بھی کچھ مشکل نہ ہوگا۔

میکبتھ :- بیوی تم تو ایسی ہو کہ سوائے بہادر مرد بچّوں کے تم سے دوسرا پیدا نہ ہو۔ تمہاری طبیعت تو بہت ہی دلیر اور نڈر واقع ہوئی ہے۔ اگر تم نے اِن دونوں ملازموں

بچھڑوں کو جو بادشاہ کے خوابگاہ میں سوتے ہونگے خون سے
رنگ بھی دیا اور ارتکاب قتل بھی انہی کے خنجر سے کیا تو کیا کوئی
اس بات کا یقین کریگا کہ ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔
لیڈی میکبتھ۔ پھر سوائے اس کے اور کس بات کا یقین کیا
جائے گا۔ ہم خود تو اس موقع پر وہ وہ شور و غل، فریاد و فغاں
کرینگے کہ ہم پر کسی کو شبہ نہ گزریگا۔
میکبتھ۔ اچھا میں نے قصد کر لیا۔ اور اب جسم کے کل اعضاء
کو اس سخت کام کیلئے آمادہ کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور
جتنا وقت باقی ہے انہیں مہمانوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہو۔
جھوٹا دل جو کچھ اندر رکھتا ہے جھوٹا چہرہ اسے چھپا سکتا ہے۔

جزوِ ثانی

پہلا منظر۔ میکبتھ کے قلعہ انورنس کا صحن۔
بینکو اور اسکا فرزند فلی انس باپ کے آگے
مشعل لئے چلتا ہے۔
بینکو۔ برخوردار، ذرا بتاؤ تو رات کتنی گئی ہوگی؟
فلی انس۔ چاند چھپ چکا ہے۔ گھنٹہ میں نے سنا نہیں۔
بینکو۔ چاند تو آج بارہ بجے غروب ہوتا تھا۔
فلی انس۔ میرے خیال میں تو رات زیادہ گئی ہے۔
بینکو۔ ٹھہرو۔ میری تلوار تم اپنے پاس رکھو۔ آسمان نے
بھی کفایت شعاری پر کمر باندھی ہے۔ اپنی کل روشنیاں
گل کر دی ہیں۔ مشعل تو تمہارے پاس موجود ہے، دوسرے
ہاتھ میں یہ تلوار بھی رکھو۔ میرے دل پر کچھ ایسی غم کی
گھٹا چھائی ہے کہ کسی طرح آنکھ نہیں جھپکتی۔ اے رحمت
باری کے فرشتو! مجھے برے اور موذی خیالات سے
جو فطرت عالم خواب میں دکھایا کرتی ہے اپنی پناہ میں رکھو۔
فلی انس ذرا تلوار مجھے دینا۔ کون ہے؟
(میکبتھ آتا ہے۔ ایک نوکر مشعل لئے ساتھ ہے)
میکبتھ۔ میں ہوں تمہارا دوست۔
بینکو۔ ہائیں۔ کیا ابھی تک سوئے نہیں۔ بادشاہ سلامت
خوابگاہ میں استراحت فرمانے چلے گئے ہیں۔ آج تو وہ
بیحد خوش تھے اور تم سب کے لئے بڑی بڑی رقمیں عطا کی
ہیں۔ تمہاری بیوی کو "میری بڑی مہربان میزبان" کہکر
تحفے میں یہ الماس دیا ہے۔ غرض ہر چیز سے بیحد مطمئن
اور خوش نظر آتے تھے۔
میکبتھ۔ کیا عرض کروں۔ آقا کی تشریف آوری پر افسوس
ہے، دل کے ارمان نہ نکل سکے۔ اگر پہلے سے اطلاع ہو
جاتی تو انتظام میں ہرگز کوئی کمی نہ ہوتی۔
بینکو۔ نہیں۔ کل باتیں نہایت خیر و خوبی سے ہوگئیں۔ ہاں
رات کو میں نے خواب میں اُن تینوں تقدیر بتانے والیوں
کو دیکھا۔ تمہاری نسبت جو باتیں انہوں نے کہی تھیں ان
میں کچھ تو سچ نکلیں۔
میکبتھ۔ مجھے تو اُن کا اب کچھ خیال تک نہیں ہے۔ لیکن
ذرا اس کام سے فراغت پالوں تو پھر اس امر خاص میں
دل کی باتیں کہنے کیلئے آپ کچھ وقت ضرور دینگے۔
بینکو۔ جب مرضی ہو میں حاضر ہوں۔
میکبتھ۔ اگر آپ نے میری رائے سے اتفاق کیا تو پھر جب
کبھی وہ بات ہوئی پھر عزت و دولت آپکے سامنے ہاتھ
باندھے کھڑی ہوگی۔
بینکو۔ آپ سمجھ لیں کہ زیادہ عزت کی مجھے ہوس نہیں جو

عزت اس وقت رکھتا ہوں اُسے کھونا نہیں چاہتا۔ اپنا دل پاک صاف اور بادشاہ کی اطاعت و وفاداری میں مضبوط رکھنا میرا بڑا مقصد ہے۔ اگر ان چیزوں میں فرق نہ آئے تو میں آپکا مشورہ سُننے کو تیار ہوں۔

میکبتھ:۔ اچھا شب بخیر۔ خدا حافظ۔

بینکو:۔ شکریہ۔ رات زیادہ آئی۔ اب آپ آرام فرمائیں۔

(بینکو اور فلی انس چلے جاتے ہیں۔)

میکبتھ:۔ (نوکر سے) جاؤ۔ ذرا بیگم صاحبہ سے کہدو کہ جب پینے کی دوا تیار ہو جائے تو گھنٹی بجا دیں (نوکر چلا جاتا ہے) ارے میری آنکھوں کے سامنے یہ کیا ہے؟ یہ تو خنجر معلوم ہو رہا ہے۔ اس کا قبضہ میرے ہاتھ کی طرف ہے۔ آ خنجر تجھے پکڑلوں۔ ہائیں تو ہاتھ میں نہیں آیا۔ مگر نظر ابتک آرہا ہے۔ کیا تو واقعی کوئی چیز نہیں ہے اصرف موت کا ایک تصور ہے جسے ادراک اور واہمہ دونوں محسوس کر رہے ہیں۔ یا تو محض وہم اور ایک بے سود خیال ہے جو میرے مزاج کی حدت و حرارت کی پیدا کی ہوئی ایک شکل ہے۔ میں ابھی تک تجھے دیکھ رہا ہوں۔ تیری صورت شکل تو بعینہ ایسی ہے جیسے اُس خنجر کی جسے میں اب نیام سے نکالتا ہوں۔ تو تو مجھے وہ راستہ بتاتا ہے جسپر میں اب چلنے والا ہوں۔ اور تو اُسی وضع کا خنجر ہے جس سے میں اب کام لینے والا ہوں۔ کیا میری بصارت کو باقی حواس نے احمق بنا رکھا ہے۔ اور انہی باقی حواس نے یہ شکل میرے سامنے پیدا کر کے اُسکا مجھے یقین دلا رکھا ہے۔ میں ابھی تک تجھے دیکھ رہا ہوں اور اب تو تیری دھار اور قبضے پر خون کے قطرے بھی نظر آتے ہیں جو پہلے نہ تھے۔ نہیں، خنجر وخجر کچھ نہیں ہے۔ یہ محض خون کرنے کا قصد ہے جو خنجر بنکر آنکھوں میں گھس بیٹھا ہے۔ کائنات میں اس وقت نصف دُنیا سے زیادہ مر چکی ہے اور فتنہ و فساد کے خواب پردوں کے پیچھے نیند کے ماتوں کو نظر آرہے ہیں۔ جادو اور سحر جن کی صورتیں زرد ہو رہی ہیں ہیکیٹی کے دربار میں نذریں پیش کرنے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ اور قتل و خون ریزی کا گرگ سیاہ فام جو پاسبانی کرتا تھا جب اپنا پہرا ختم کر کے کتے کی طرح بھونکتا ہے تو وہ خون ناحق کے ارادے کو پیدا کرتا ہے اور تارکوان سفاک کی مثال شہوت پرستی کے جوش میں تیز قدم اُٹھاتا ایک خبیث روح کی طرح اپنے شکار کی طرف اُڑا چلا جاتا ہے لیکن میرے قدم جس طرف بھی اُٹھتے ہیں ہر سنگ راہ زبان حال سے کہکر میرا نشان بتاتا ہے کہ میں کہاں ہوں مگر میں نے اس خوف و خطر کی فضا سے وہ وقت علیحدہ کر لیا ہے جو قتل کے لئے مناسب ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے مجھ پر خوف طاری رہیگا۔ حدت کارکردگی میں جو الفاظ زبان پر آتے ہیں وہ سفاک و سرد مہر ہوتے ہیں۔ اب میں جاتا ہوں اور اُمید ہے کہ یہ کام جلد ختم ہو جائیگا (ایک گھنٹی کی آواز سُنتا ہے) گھنٹی بج رہی ہے جو اس کام کے لئے اشارہ کرتی ہے۔ ڈنکن تو اس آواز کو نہ سُنیو۔ کیونکہ یہ تیری موت کا گھنٹہ بجا ہے جو تجھے جنت یا دوزخ میں طلب کرتا ہے۔

دوسرا منظر:۔ مقام وہی ہے۔

لیڈی میکبتھ آتی ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ جس چیز سے میں نے انہیں بیہوش کیا ہے اُس نے میری ہمت بڑھا دی ہے۔ جس چیز نے انہیں ٹھنڈا کیا اُسی نے مجھے آگ بنایا ہے۔ سُنو خاموش۔ یہ موت کا جرس بجانے والا تو اُلو ہے جس کی منحوس آواز کانوں میں آرہی ہے۔ رات کا رخصتی سلام اس سے بدتر اور کیا ہوگا۔

میکبتھ قتل کے قصد سے اب خوابگاہ کے دروازے تک پہونچا ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور دونوں ملازم خراٹوں کی آواز سے گویا آقا کی توہین کرتے ہیں۔ میں نے تو شراب میں ایک دوا ایسی ملا کر انہیں دی ہے کہ موت اور زندگی دونوں اُن میں باہم دست و گریباں رہیں۔ اس سے مجھے مطلب نہیں کہ وہ زندہ رہیں یا مر جائیں۔

میکبتھ :۔ (میکبتھ کی آواز اندر سے کہتی سنائی دیتی ہے) وہاں کون ہے۔ بتاؤ؟

لیڈی میکبتھ :۔ خوف ہے کہ جاگ ہوگئی اور وہ بات نہ ہوسکی جس کا اقدام ارتکاب سے کہیں زیادہ روح فرسا ہے۔ سنو! میں نے ان کے دونوں خنجر درست کر کے اُنکے پاس رکھدیئے تھے۔ کہیں میکبتھ انہیں بھول تو نہیں گیا۔ جب میں نے دنکن کو دیکھا ہے تو کیا اُس کی صورت مجھے اپنے باپ کی صورت نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اگر ایسا نہوتا تو یہ کام میں اپنے ہاتھوں کر دکھاتی۔

(میکبتھ اندر آتا ہے)

شوہر!

میکبتھ :۔ میں نے وہ کام ختم کر دیا۔ کیا تم نے آواز نہیں سنی؟

لیڈی میکبتھ :۔ ہاں میں نے اُلو اور جھینگر کی تیز آواز سُنی تھی۔ تم نے تو کچھ نہیں کہا تھا۔

میکبتھ :۔ کب؟

لیڈی میکبتھ :۔ اب۔

میکبتھ :۔ اچھا اُس وقت جب خوابگاہ کی سیڑھیاں اُترتا تھا؟ سنو کس کی آواز ہے۔ پاس کے کمرے میں کون سوتا ہے؟

لیڈی میکبتھ :۔ دونل بین سوتا ہے۔

میکبتھ :۔ (اپنے ہاتھوں کو دیکھکر) یہ داغ قتل کے نشان ہیں۔

لیڈی میکبتھ :۔ اِنکو قتل کے نشان کہنا حماقت ہے۔

میکبتھ :۔ دونوں ملازم جو وہاں سوتے تھے اُن میں سے ایک نیند میں ہنسا، اور دوسرا چیخا کہ "خون ہو رہا ہے" پھر دونوں جاگ اُٹھے۔ میں کھڑا اُن کی باتیں سنتا رہا۔ پھر دونوں نے کوئی دُعا پڑہی اور سو گئے۔

لیڈی میکبتھ :۔ دونوں پاس پاس سو رہے تھے۔

میکبتھ :۔ ایک نے کہا "خدا ہم پر رحم کرے" دوسرے نے کہا "آمین" مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ مجھ قاتل کے ہاتھ اُنہوں نے دیکھ لئے ہیں۔ اور جب میں نے اُنہیں "خدا رحم کرے" کہتے سنا تو میں نے بھی آمین کہنا چاہا۔ مگر میرے مُنہ سے کچھ نہ نکلا۔

لیڈی میکبتھ :۔ اسکا اتنا خیال نہ کرو۔

میکبتھ :۔ مگر "آمین" کیوں مُنہ سے نہ نکلی۔ مجھے تو خدا سے رحم طلب کرنے کی اُس وقت بہت ضرورت تھی مگر "آمین" حلق میں اٹک کر رہگئی۔

لیڈی میکبتھ :۔ ان باتوں کو اس طرح سوچنے کی ضرورت نہیں ورنہ ہم دونوں دیوانے ہو جائیں گے۔

میکبتھ :۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے ایک آواز یہ کہتے سُنی تھی کہ "بس اب تجھ پر نیند حرام ہوئی" میکبتھ نے ایک سوتے بے گناہ کو جس کی نیند معصوم تھی قتل کیا ہے۔ نیند بھی وہ جو دن بھر کے افکار و آلام کے اُلجھے سُوت کو سُلجھا دیتی ہے۔ جو دن بھر کی زندگی کی موت ہے۔ محنت و مشقت کے بعد کا غسل ہے جو تازگی بخشتا ہے۔ زندگی کی ضیافت میں سب سے مقوی غذا ہے۔

لیڈی میکبتھ :۔ کیا مطلب ہے؟

بکبتھ:- وہ آواز برابر یہی کہتی رہی "اب تجھپر نیند حرام ہوئی"
ب تو سو نہیں سکتا" سارے گھر میں یہی آواز گونجتی تھی۔
یمس نے سوتے کا خون کیا ہے" کا دور کو اب نیند
ہیں آئے گی" "میکبتھ کو اب نیند کبھی نہ آئیگی"

یڈی میکبتھ:- وہ کون تھا جو یہ کہتا تھا۔ آپ ایک
یض دماغ کی طرح اس طرح خیال کرکے اپنی قوت
تل نہ کریں اور جاکر اپنے ہاتھ کے ان داغوں کو جو
ن کرنے پر گواہی دیتے ہیں پانی سے دھو ڈالیں۔ یہ
دنوں خنجر وہاں سے کون اٹھا لایا۔ جاؤ اور ان کو
ہیں جاکر رکھدو۔ اور دونوں ملازموں کے چہروں پر
ن لگا دو۔

یکبتھ:- اب میں وہاں ہرگز نہ جاؤنگا۔ جو کچھ میں نے
ا ہے اب اس سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔ اس چیز کو
ھر دیکھنا میری قدرت سے باہر ہے۔

یڈی میکبتھ:- پست ہمت ہوگئے۔ خنجر مجھے دو سوتا
ر مرا تو مثل ایک بیجان تصویر کے ہوتا ہے شیطان
ی تصویر میں رنگ بھر کر اگر بیجا بنا لی جائے تو بچے البتہ
س سے ڈرتے ہیں۔ اگر لاش سے اب تک خون جاری
ہے تو نوکروں کے منہ پر خون مل دونگی۔ اس سے
علوم ہوگا کہ قاتل وہی ہیں۔ (لیڈی میکبتھ خوابگاہ
یں جاتی ہے۔ اندر سے کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز
تی ہے۔)

میکبتھ:- یہ آواز کدھر سے آئی۔ یہ میری کیا حالت ہے
کہ ہر آواز پر چونک پڑتا ہوں۔ ہر آواز مجھے کیوں
اس قدر خوفزدہ کر دیتی ہے۔ اے میرے ان ہاتھوں
کو کیا ہوا؟ انہیں دیکھنے سے تو میری آنکھیں نکلی پڑتی
ہیں۔ تمام سمندروں کا پانی بھی ان داغوں کو چھڑانے
ہیں کافی نہیں ہو سکتا۔ اور دھویا بھی تو وسیع سمندروں کا کل
پانی لالہ رنگ ہو کر اس کی سبزی کو سرخی بنا دے گا۔

(لیڈی میکبتھ پھر آتی ہے)

لیڈی میکبتھ:- میرے ہاتھ تم جیسے ہو گئے، لیکن دل
تم جیسا کمزور نہیں۔ (اندر سے کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے)
یہ آواز تو جنوبی دروازے سے آتی سنتی ہوں۔ آؤ ہم
دونوں اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ تھوڑا سا پانی ان
خون کے داغوں کو دھو دیگا۔ دیکھا، یہ کل معاملہ کیسا
آسان نکلا۔ تمہاری طبیعت پائے استقلال پر نہ رہی۔
(پھر وہی کھٹ کھٹ سنائی دیتی ہے) سنو۔ (پھر کسی
کے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے) سنو، پھر وہی آواز
آرہی ہے۔ آؤ جلدی سے کچھ الٹے سیدھے کپڑے
پہن لیں تاکہ ضرورت ہو تو باہر نکل سکیں۔ یہ نہ معلوم
ہو کہ ہم جاگ رہے تھے۔ کیوں کس خیال میں محو ہو کر
گم سم سے ہوئے جاتے ہو؟

میکبتھ:- کاش کہ ہر چیز کا علم ذہن سے دور ہو جائے
اور طبیعت پر اتنی غفلت طاری ہو جائے کہ جو کچھ کیا
ہے اس کی یاد دل میں مطلق نہ رہے (کھٹ کھٹ
ہوتی ہے) دنکن اس کھٹ کھٹ سے تو کب جاگنے والا
ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا کہ زندہ ہوتا اور جاگ اٹھتا۔

تیسرا منظر:- ایک دربان آتا ہے۔

(اندر پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔)

دربان:- یہ کیسی عجیب کھٹ کھٹ ہے۔ اگر کوئی دوزخ کا دربان
بھی ہوتا تو قفل میں کنجی ڈال کر اسے برابر پھیر لئے جاتا۔
ارے موذی کھٹکھٹائے جا۔ شیطان کا نام لیکر پوچھتا
ہوں کہ بتا تو کون ہے؟ کیا تو کوئی کسان ہو جس نے
ارزانی کے انتظار میں بیقرار ہو کر اپنے تئیں پھانسی دے لی ہو۔

میرے پاس بہت سے رُومال ہونے چاہئیں کہ پسینہ پونچھتا رہوں (اندر پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے) کھٹکھٹائے جا۔ تجھے ابلیس کی قسم بتا کہ تو کون ہے ؟ واللہ۔ کہیں اُن میں سے تو نہیں ہے جو سرکشی اور بغاوت کر کے کہتے ہیں کہ ہم تو خُدا کے حکم سے دشمن بنے تھے۔ اور جن کا ہر فریق دوسرے فریق کے خلاف شہادت دینے کو تیار رہتا ہے۔ یہ وہ ہیں جو کُفر و بدعت خُدا کی راہ میں کرتے ہیں۔ لیکن جب خُدا کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو اپنی اس حرکت کا جواز ثابت نہیں کر سکتے۔ آ، اے کافر باغی اندر آ۔ (پھر کھٹکا ہوتا ہے) کھٹ کھٹ کئے جا۔ یہ کون ہے ؟ واللہ! یہ تو کوئی انگریز خیاط معلوم ہوتا ہے جو فرانسیسی کپڑا چرانے کی سزا میں دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔ وہاں آگ کی کیا کمی ہے۔ خوب اپنی استری گرم کر تارہ۔ (پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے) کھٹ کھٹ کئے جا، چُپ نہ بیٹھیو۔ آخر تو ہے کون ؟ یہ جگہ تو اتنی ٹھنڈی ہے کہ دوزخ نہیں بن سکتی۔ اب میں شیطان کے گھر کی دربانی ختم کرتا ہوں۔ اور اُن لوگوں کو اندر بلائے لیتا ہوں جو اپنے پیشے کے ذوق و شوق میں گُناہ کی طرف راغب ہو کر دوزخ کا راستہ دیکھتے ہیں۔ (پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے) اچھا لو۔ ابھی لو۔ دربان کو دُعائیں دیتے رہنا (دروازہ کھول دیتا ہے)

(میکڈف اور لینکس اندر آتے ہیں)

میکڈف:۔ کہو دوست، کیا بہت دیر کر کے سوئے تھے۔ بڑی دیر میں اُٹھے۔

دربان:۔ بخدا، حضور ہم دو بجے رات تک تو شراب ہی پیتے رہے۔

میکڈف:۔ کیا بادشاہ سلامت بیدار ہو گئے ہیں ؟

(میکبتھ باہر آتا ہے)

لینکس:۔ شریف میکبتھ کو سلام۔

میکبتھ:۔ دونوں صاحبوں کو سلام۔

میکڈف:۔ اے لائق امیر بتایئے بادشاہ سلامت بیدار ہوئے یا ابھی آرام فرماتے ہیں ؟

میکبتھ:۔ نہیں، ابھی تک بیدار نہیں ہوئے۔

میکڈف:۔ کل حکم دیا تھا کہ ٹھیک وقت پر حاضر ہونا مجھے کسی قدر دیر ہو گئی۔ وقت یاد نہ رہا۔

میکبتھ:۔ میں آپکو خوابگاہ تک لئے چلتا ہوں۔

میکڈف:۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تکلیف آپکے لئے موجبِ مسرت ہے مگر تکلیف ہونے میں کیا شُبہ ہے۔

میکبتھ:۔ جس تکلیف میں مسرت ہو وہ تکلیف نہیں رہتی۔

لینکس:۔ کیا بادشاہ سلامت کا قصد آج ہی یہاں سے مُراجعت کا ہے ؟

میکبتھ:۔ ہاں فرماتے تو یہی تھے۔

لینکس:۔ رات نہایت طوفانی تھی۔ جس کمرے میں ہم تھے طوفان کے زور سے آتشدانوں کے دُخان کش اُوپر سے نیچے آن پڑے۔ سُنا ہے کہ رونے پیٹنے کا غُل، مرنیوالوں کی چیخیں بھی سُنائی دی تھیں۔ کہیں آگ لگنے کا شور تھا، کہیں اور آفات کے برپا ہونے کا غُل کریہہ اور ہیبتناک آوازوں میں لوگوں نے اس طرح سُنا جیسے کہ اکثر پُرآشوب زمانوں میں سُنا جاتا ہو۔ ظلمت کا پرندہ رات بھر برابر چیختا رہا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زمین کو لرزہ بُخار چڑھا تھا۔ کئی بار زلزلہ بھی آیا۔

میکبتھ:۔ حقیقت میں رات بڑی اندھیاری بھیانک اور خوفناک تھی۔

لینکس:۔ میری یاد میں، گو زیادہ عُمر نہیں رکھتا، ایسی خوفناک رات پہلے نہ آئی تھی۔

(میکڈف آتا ہے۔)

میکڈف:۔ ارے غضب! ارے ستم! ارے مصیبت! زبان پر

دل میں ایسا خیال کب گزر سکتا تھا کہ یہ کچھ ہو جائیگا۔ جو کچھ ہوا ہے زبان کو یارا نہیں کہ کہہ سکے۔

لینکس:۔ کیوں خیر تو ہے؟ کیا ہوا؟

میکڈف:۔ مصائب و آفات نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ ایسا خون ہوا ہے جو دین و ایمان سب کو غارت کردیتا ہے۔ اس قتل نے اُس بادشاہ کو اُس کے گھر سے نکالا ہے جو خود خدا نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ وہ گھر تو رہ گیا مگر اس کی جان خانہ ویران ہوئی۔

میکبتھ:۔ کیا کہہ رہے ہو، جان کیسی؟

لینکس:۔ کیا تمہارا مطلب بادشاہ سلامت سے ہے؟

میکڈف:۔ آؤ کمرے میں چلکر اپنی آنکھیں پھوڑ لو۔ اندھے ہو جاؤ۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو، جو ہوا ہے خود جاکر دیکھ لو۔ اور پھر خود ہی کہو کہ کیا ہوا ہے۔ (میکبتھ اور لینکس اندر جاتے ہیں۔) جگاؤ جگاؤ۔ قلعہ کا گجر بجاؤ۔ قتل ہوا ہے۔ دغا اور فریب، سرکشی اور بغاوت برپا ہوئی ہے۔ دونل بین میلکم، نیند سے ہوشیار ہو۔ نیند تو موت کی شکل رکھتی ہے۔ اب خود آکر موت کو دیکھ لو۔ اُٹھو۔ قیامت آگئی اور اُسے دیکھ لو۔ میلکم اور بینکو اس طرح اُٹھو جیسے کوئی قبر سے اُٹھے۔ روحوں کو بیدار کرو کہ وہ بھی اس ہولناک منظر کو دیکھیں۔ گھنٹہ بجاؤ۔ (قلعہ کا گجر سب کو خبردار کرنے کو بجتا ہے)

(لیڈی میکبتھ اندر آتی ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ یہ گجر کیسا سوتے آدمیوں کو جگا کر بلا رہا ہے۔ کہو۔ کچھ بتاؤ۔

میکڈف:۔ اے نیک دل خاتون۔ جو کچھ کہنا ہے وہ آپکے سننے کی بات نہیں۔ عورت کے کان میں قتل کی خبر سنانا خود اس عورت کا خون کرنا ہوگا۔

(بینکو آتا ہے۔)

بینکو، بینکو، ہمارا بادشاہ قتل ہوگیا۔

لیڈی میکبتھ:۔ ایسے غضب! کیا ہمارے گھر میں ایسا ہوا۔

بینکو:۔ یہ سانحہ تو کہیں بھی پیش آتا ظلم و سفاکی میں کم نہ ہوتا۔ میکڈف خدا کے لئے جو کچھ کہتے ہو کہ ہوا اُسے کہو کہ نہیں ہوا۔

(میکبتھ اور لینکس کمرے میں جاتے ہیں)

میکبتھ:۔ کاش اس واقعے سے ایک گھنٹے پہلے میں مرگیا ہوتا۔ تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرتا وہ اچھا ہوتا۔ بس اس وقت سے زندگی میں کچھ نہ رہا۔ دنیا کی سب چیزیں بازیچہ ہیں۔ خیر و برکت، نام و شہرت آج دنیا سے رخصت ہوئے۔ ہائے شراب لنڈھ گئی۔ تلچھٹ رہ گئی۔ اب اُس کی تعریفیں آسمان کے گنبد میں گونجیں گی۔

(میلکم اور دونل بین آتے ہیں۔)

میلکم:۔ کیا ہوا، کیا ہوا؟

میکبتھ:۔ زندہ ہو اور پوچھتے ہو کہ کیا ہوا۔ زندگی کا منبع خون کا وہ سرچشمہ بہتے بہتے بند ہوگیا۔ اور اس کی تمام شاخیں اور رہگزر مسدود ہوئے۔

میکڈف:۔ آپکے والد بزرگوار یعنی بادشاہ ذی شان کو کسی نے قتل کردیا۔

میلکم:۔ کس نے ایسا کیا؟

لینکس:۔ وہ ملازم معلوم ہوتے ہیں جو خوابگاہ میں بادشاہ کے قریب سوتے تھے۔ اُن کے ہاتھ اور چہرے سب خون میں آلودہ تھے، اور یہی کیفیت ان کے خنجروں کی تھی۔ خنجروں کا خون اُنہوں نے اپنے سرہانے کے تکیوں سے پونچھا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور بدحواس تھے۔ کسی جان کا بھروسا اُن پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میکبتھ:۔ پھر بھی مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کیوں حالتِ غیظ و غضب

میں میں نے انہیں قتل کر دیا۔
میکڈف:۔ آپ نے کیوں ایسا کیا؟
میکبتھ:۔ خیال کیجئے۔ انسان کیسے آن واحد میں حیرت زدہ، معتدل اور غضبناک رہ سکتا تھا۔ خیر خواہ بھی ہوتا اور بے پروا بھی۔ کوئی شخص بھی جسے اپنے بادشاہ سے تعلق تھا ایسے وقت میں عقل سے، جو تامل و غور کی ہدایت کرتی کام لے سکتا تھا۔ ایک طرف ڈنکن اپنے بستر پر پڑا تھا۔ اُس کی چاندی کی مثل چمکتی جلد پر زخموں کے گرد خون کے ہالے تھے۔ اس کے زخم صرف ایک شخص کے زخم نہ تھے بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ کل کائنات میں شگاف دیئے گئے ہیں تاکہ غارتگری اُن کی راہ سے اندر گھسے۔ دوسری طرف دونوں قاتل خون میں رنگے، خنجر خون میں آلودہ پڑے تھے۔ اس حالت میں کون ایسا تھا جس کے دل میں بادشاہ کی محبت ہوتی اور اُس میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ اپنی محبت کا ثبوت دے۔
لیڈی میکبتھ:۔ ارے رحم کرو۔ کوئی مجھے یہاں سے اُٹھا کر لے چلو۔ مجھ سے یہ حال نہیں دیکھا جاتا۔
میکڈف:۔ لوگو، لیڈی میکبتھ کی حالت کو دیکھنا چاہیئے۔
میلکم:۔ (دونل بین سے علیحدہ کہتا ہے) ہم یہاں کیوں خاموش کھڑے ہیں۔ اس قتل کا اثر تو ہم پر پڑتا ہے۔
دونل بین:۔ (میلکم سے علیحدہ کہتا ہے) ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ قتل تو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ خود ہماری جان معرض خطر میں ہے۔ ممکن ہے کوئی ہمیں گرفتار کر کے قتل کر دے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے کہیں چلے جائیں۔ باپ کی موت پر ہمارے آنسو ابھی تک نہیں نکلے ہیں۔
میلکم:۔ اور نہ ہمارے رنج و الم کو حرکت ہوئی ہے۔
بلینکو:۔ لیڈی میکبتھ کا حال تو دیکھئے۔ (لوگ لیڈی میکبتھ کو اُٹھا کر لیجاتے ہیں۔)
اس وقت ہم سب سردی میں کھڑے ہیں۔ بہتر ہے کہ کپڑے پہن کر اور ہتھیار لگا کر اس واقعے پر غور کرنے کے لئے جمع ہوں اور دیگر حالات متعلقہ تحقیق کریں۔ اس وقت خوف اور طرح طرح کے شکوک نے ہم پر لرزہ ڈال رکھا ہے۔ انصاف خدا کے ہاتھ ہے۔ دراصل اس بغاوت اور جو بدگمانیاں اُس نے پیدا کی ہیں اُن کے مقابلے کے لئے تیار ہوں۔
میکڈف:۔ اور یہی حال میرا ہے۔
سب ملکر:۔ اور یہی کیفیت ہم سب کی ہے۔
میکبتھ:۔ ہمیں چاہیئے کہ درستی سے لباس پہن کر بڑے کمرے میں یکجا ہوں (سب چلے جاتے ہیں، سوائے میلکم اور دونل بین کے۔)
میلکم:۔ تم کیا کرو گے؟ میں تو اس مجمع میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ ایسا رنج و الم جس کی اصلیت نہ ہو ایک جھوٹے آدمی کے لئے آسان کام ہوتا ہے۔ میں تو انگلستان جاتا ہوں۔
دونل بین:۔ میں آئرستان جاتا ہوں۔ جب ہم دونوں جُدا جُدا مقام پر ہونگے تو ہمیں زیادہ حفاظت میسّر رہے گی۔ جہاں اس وقت ہم ہیں وہاں تو ہر شخص کا تبسّم بھی خنجر بُرّاں معلوم ہو رہا ہے۔ خون کا رشتہ جتنا قریب ہو اتنا ہی خون ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہ قتل و غارت کا تیر جو چھوڑا گیا ہے ابھی تک اپنے ہدف پر نہیں پہونچا ہے۔ بہتر طریقہ یہی ہے اس نشانے سے ہم ہٹ جائیں۔ ہمیں کسی سے رخصت ہونے کی ضرورت نہیں۔ چلو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔ جہاں کسی کے دل میں خُدا کا

خوف اور رحم باقی نہ ہو تو پھر وہاں سے خفیہ طور پر نکل جانا ہی بہتر ہے۔ (یہ کسی کی چوری نہیں۔ (چلے جاتے ہیں)

چوتھا منظر:- میکبتھ کے قصر سے باہر

(راس اور ایک بڈھا آدمی آتا ہے۔)

بُڈھا:- زمانے کے دور میں تین بیسی دس برس زندہ رہکر بڑے بڑے سخت حادثے اور عجیب عجیب واقعات نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن شب گزشتہ کے واقعات نے سبکو مات کر دیا۔

راس:- اے مردِ نیک و معمر! آسمان و زمین کے درمیان انسان کے ہاتھوں جو جو خون خرابے آپکی زندگی میں پیش آئے وہ تو آپکی نظر سے گزرے ہی ہونگے، مگر آج کچھ کیفیت عجیب ہے۔ خیال کیجئے تو وقت دن کا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ راہ گیروں کو پریشان کرنے کے لئے ظلمت نے رات کی روشنیاں گل کر دی ہیں۔ یا پھر تاریکی نے دن کی روشنی کو شرمندہ کرنے کیلئے روئے زمین پر اندھیرا ڈال رکھا ہے۔ حالانکہ وقت ایسا تھا کہ سورج کی روشنی پھیل جاتی۔

بُڈھا:- یہ جو کچھ دیکھ رہے ہو اور جو قتل کیا گیا ہے یہ سب امور خلافِ قدرت و فطرت ہیں۔ گذشتہ دوشنبہ کو ایک شکرہ جسے اپنی بلند پروازی پر ناز تھا اُس کا تعاقب ایک موش خور اُلّو نے کیا اور شکرے کو پکڑ کر مار ڈالا۔

راس:- اور سب سے عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ بادشاہ ڈنکن کے گھوڑے جن کے برابر حسین و سبک رَو جانور دُنیا میں نہ ہونگے وہ سب وحشی اور دیوانے ہوگئے۔ اصطبل توڑ کر باہر نکل آئے۔ اُچھلنا کودنا ہنہنانا شروع کیا۔ کسی کا حکم نہ مانا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نسل آدم کے دشمن بنکر سب سے لڑنے کو نکلے ہیں۔

بُڈھا:- ابھی مجھ سے کسی نے کہا ہو کہ یہ گھوڑے ایک دوسرے کو مار کر کھا رہے ہیں۔

راس:- بالکل صحیح ہے۔ میری حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے بھی اُنھوں نے یہی کیا۔

(میکڈف اندر آتا ہے)

کہیئے کیا حال ہے؟

میکڈف:- کیوں کیا تمہیں نہیں معلوم؟

راس:- کچھ پتہ چلا کہ قاتل کون تھا؟

میکڈف:- اُنہی کو سمجھیئے جنہیں میکبتھ نے قتل کر دیا۔

راس:- خدارا فرمایئے کہ اِس فریب و دغا سے کیا بھلائی نکلی؟

میکڈف:- سُنا گیا ہے کہ میلکم اور ڈونل بین کو اسی کام کیلئے روپیہ دیا گیا تھا۔ یہ دونوں بادشاہِ آنجہانی کے فرزند ہیں، اور اب کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں یا پھر اُنکو کسی نے غائب کر دیا ہے، اِس وجہ سے اِن دونوں شہزادوں پر لوگوں کو زیادہ شُبہ گزرنے لگا ہے۔

راس:- یہ خیال بھی انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ مگر لالچ اور طمع بُری بلا ہے۔ یہ تو اُنہیں بھی نگلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو دُنیا میں اُنہیں لائے تھے۔ تو اب گمان غالب یہی ہے کہ بادشاہی میکبتھ کو مل جائیگی۔

میکڈف:- بادشاہی پر وہ نامزد ہو بھی گیا ہے اور شہر اسکون میں تاجپوشی کیلئے گیا ہے۔

راس:- ڈنکن کا جنازہ کہاں لے گئے؟

میکڈف:- اُسے تو کولمی کل میں لے گئے ہیں جہاں اُسکے بزرگوں کا گورستان ان کی ہڈیوں کی حفاظت کرتا ہے۔

راس:- کیا آپکا قصد بھی جشن تاجپوشی میں شرکت کے لئے

سکون جانے کا ہے؟

بیکدف:- نہیں بھائی، میں تو اپنے علاقے فائف کو جا رہا ہوں۔

اس:- لیکن مجھے تو اسکون جانا ہے۔

بیکدف:- اچھا ہے، تاجپوشی کے جلسے میں شریک ہو سکوگے و۔ خدا حافظ۔ اور وہاں یہ بھی دیکھنا کہ بدن پر پرانی پوشاک ہی ٹھیک آئی ہو، یا یہ نیا لباس کہیں چست ہوتا ہے۔

راس:- (بڈھے سے) خدا حافظ۔

بڈھا:- خدا تم پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ اور اُن پر بھی جو برائی میں بھلائی پیدا کرتے ہیں، اور اُن پر بھی جو ہمارے دوستوں کے دشمن ہوں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔)

جزوِ ثالث

پہلا منظر:- فورِس۔ شاہی محل

بینکو داخل ہوتا ہے۔

بینکو:- میکبتھ گلیمس اور کاڈور کا امیر تو ہو ہی گیا تھا۔ اب اُن جادوگرنیوں کی پیشینگوئی کے مطابق بادشاہ بھی ہو گیا۔ مجھے خوف ہو کہ تُو نے یہ بادشاہی دغا اور فریب سے حاصل کی ہے۔ مگر ان جادوگرنیوں نے تجھ سے یہ بھی تو کہا تھا کہ تیری اولاد میں بادشاہی نہ جائیگی بلکہ میں بینکو ایک بڑے سلسلے کا مورثِ اعلیٰ ہونگا۔ اگر ان جادوگرنیوں کی باتیں جیسے تیری شان میں صحیح نکل کر درخشندہ و نمایاں ہوئیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ میرے حق میں وہ کیوں صحیح نہ ثابت ہوں۔ اور میرے دل میں اپنی اولاد کے بادشاہ ہونے کی آرزو پیدا نہ ہو۔ لیکن خاموش، اب کچھ نہ کہو۔

(گانے بجانے کی آواز آتی ہے۔ میکبتھ بادشاہ اور لیڈی میکبتھ ملکہ بنکر آتے ہیں۔ سردار لینکس، راس، اور دیگر اُمرائے دربار بیگمات، ملازمین اور خدام داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ:- لیجئے۔ ہمارے یہ معزز و مقتدر مہمان تشریف لاتے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- اگر کہیں انکو بلاوا دینا بھول جاتے تو ہماری اس ضیافت میں کچھ رونق ہی نہ ہوتی۔

میکبتھ:- بینکو۔ آج شب کو ہمارے ہاں ضیافت ہے۔ پس آپ سے درخواست ہو کہ آپ ضرور شریک ہوں۔

بینکو:- درخواست نہیں۔ شاہِ عالیجاہ حضور تو شرکت کے لئے حکم فرما سکتے ہیں پھر میرا حاضر ہونا فرضِ منصب ہوگا۔ وابستگانِ دولت کا تعلق تو حضور کے ساتھ وہ ہو جو ہمیشہ قائم رہے گا۔

میکبتھ:- کیا تیسرے پہر آپ گھوڑے کی سواری کرتے ہیں۔

بینکو:- حضور۔

میکبتھ:- ہمیں آپ سے ایک خاص امر میں مشورہ کرنا تھا۔ آج کی مجلس میں وہ اہم مسئلہ بڑی کامیابی سے پیش ہو چکا ہے، مگر کل پھر اس پر گفتگو ہوگی۔ کیا آپ کو بہت دُور جانا ہے؟

بینکو:- حضور۔ فاصلہ اتنا ہی ہے کہ اگر اس وقت روانگی ہو تو ضیافت کے وقت تک طے ہو جائے۔ اگر گھوڑا تیز نہ چلا تو پھر فدوی گھڑی دو گھڑی رات گئے یہاں پہونچیگا۔

میکبتھ:- مگر ضیافت میں بہر کیف آپکا شریک ہونا ضروری ہے۔

بینکو۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ تعمیل ارشاد میں فرق آئے۔

میکبتھ:۔ سُننے میں آیا ہے کہ ہمارے یہ دونوں برادر زادے باپ کے قاتل انگلستان اور آئرستان میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے ہیں۔ اور باپ کے قتل کا جُرم جو اُنسے سرزد ہوا ہے اُس کا اقبال نہیں کرتے۔ اور جب کبھی تقریر کرتے ہیں تو سُننے والوں کے سامنے عجیب غریب من گھڑت قصے بیان کرتے ہیں۔ بس اب اسکے بعد کو گفتگو ہوگی۔ آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور آج ہی شب کو ضیافت کے وقت پھر ملاقات ہوگی۔ خدا آپکو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا فلی انس بھی آپ کے ساتھ ہی جا رہا ہے؟

بینکو:۔ حضور، وقت کم رہگیا ہے۔ شام تک جلد واپس آنا ہے اجازت چاہتا ہوں۔

میکبتھ:۔ خدا سے اُمید ہے کہ آپکے گھوڑے تیز رو اور چال کے سچے ہونگے، اور اب آپکی روانگی پر خدا سے دُعا کرتا ہوں۔

(بینکو چلا جاتا ہے۔)

ہر شخص کو اپنے وقت کا مالک رہنا چاہیئے۔ میں بھی ضیافت کے وقت تک آزاد ہوں۔ اور اس خیال سے کہ ضیافت بہترین طریقے پر انجام پائے اُس وقت تک میں بشاش اور ہنستا رہونگا۔ (سوائے میکبتھ کے سب چلے جاتے ہیں۔ چند خادم حاضر رہتے ہیں) خادم اِدھر آؤ، اور سُنو، جو دو آدمی آئے ہیں جب تک ہم حکم دیں اُنہیں ٹھہرائے رکھو۔

خادم:۔ حضور، وہ محل کے باہر حاضر رہینگے۔

میکبتھ:۔ اچھا، اُنہیں یہاں حاضر کرو۔

(خادم باہر جاتا ہے۔)

حالت اس وقت خیر و سلامتی کی نہیں ہے۔ اِس بینکو کے خوف سے دل بیٹھا سا جاتا ہے۔ اس کی اولاد اس وقت سریر آرائے سلطنت ہے جس سے خوف کرنا لازمی ہے۔ تہوّر و مردانگی کے ساتھ عقل بھی اس کے عزم و ہمّت کی ہادی و رہنما ہے۔ بجُز اِس بینکو کے کوئی دوسرا نہیں جس کے زندہ رہنے سے مجھے خوف ہو سکتا ہو۔ اس کے کوکبِ اقبال کے سامنے میرا ستارہ اِس طرح محجوب ہو جاتا ہے جیسے اگلے وقتوں میں انطونی کا ستارہ قیصر (اغسطس) کے ستارے کے سامنے بے نُور ہو گیا تھا۔ جب وہ تینوں جادوگرنیاں اُس ویران مقام پر نظر آئی تھیں اور جب اُنہوں نے بادشاہ کہہ کر مجھے مُبارکباد دی تھی تو بینکو کیسا بگڑا تھا۔ اور کیسی ڈانٹ بتا کر اُن سے پُوچھا تھا کہ وہ اُسکی نسبت بھی کوئی اچھی خبر دیں۔ چنانچہ اُنہوں نے بینکو کو بھی یہ کہکر مُبارکباد دی کہ وہ ایک سلسلۂ شاہی کا مُورثِ اعلیٰ ہوگا۔ غرض یہ تقدیر کی باچنے والیاں میرے سر پر ایک تاج بے ثمر اور میرے ہاتھ میں ایک عصائے بے سُود رکھکر چلی گئیں تاکہ یہی چیزیں وہ لوگ جو میرے صلب سے نہ ہوں مُجھ سے چھین لیں۔ اور میری اولاد میں کوئی وارثِ تاج و تخت نہ ہو۔ گویا بینکو کی اولاد کے لئے میں نے اپنی طبیعت کو غارت کیا اور انہی کے لئے میں نے ڈنکن کا خون کیا۔ انہی کے لئے اپنے قلب میں سکون و اطمینان کی جگہ بُغض و عناد کو جگہ دی۔ تو کیا میں نے انہی کے لئے اپنے روح کے گوہرِ ازلی کو شیطانِ ملعون کے حوالے کیا ہے۔ تاکہ بینکو کی اولاد بادشاہ ہوکر حکومت کرے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اے تقدیر آ اب میدان میں اُتر اور میرے لئے جان پر بازی لگا کر لڑ۔ کوئی ہے؟

(خادم اندر آتا ہے۔ اسکے ساتھ دو قاتل ہیں۔)

اچھا خادم۔ جب تک کہ ہم آواز دیں تم دروازے کے پاس کھڑے رہو (قاتلوں سے کہتا ہے) کیا تم ہی سے کل اس معاملے میں گفتگو ہوئی تھی۔

پہلا قاتل:۔ حضور کل ہی ارشاد ہوا تھا۔

میکبتھ:۔ پھر جو کچھ ہم نے کہا تھا اُس پر تم نے غور کیا۔ تمہیں معلوم رہنا چاہیئے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے گزشتہ زمانے سے تمہیں اتنا مُحتاج و مفلوک الحال کر رکھا ہے۔ اور تم اِس غلط خیال میں رہے کہ تمہاری خستہ حالی کا باعث ہم ہیں۔ نہیں، ہم داقعی اِس معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں۔ اور پچھلی مرتبہ جو گفتگو ہوئی تھی اُس میں ہم نے اِس بات کو نہایت واضح اور صاف طریقے پر تمہارے سامنے بیان کر دیا تھا۔ اور تم کو سمجھا بھی دیا تھا کہ کس طرح ہم پر کوئی گرفت پا کر وہ ہماری مخالفت کے درپے رہنا چاہتا ہے، اور وہ کون سے وسائل اور کون سے لوگ ہیں جن کو کام میں لا کر وہ ہمیں غارت و تباہ کرنے پر آمادہ ہے۔ ایک نادان بھی جس میں عقل نہ ہو دیکھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کیا کرایا بینکو کا ہے۔

پہلا قاتل:۔ یہ کُل حال تو حضور ہی نے ہم پر کھولا تھا۔

میکبتھ:۔ اور اب اِسکا تذکرہ بھی تم ہی سے چاہتا ہوں۔ اور یہی بات تم سے دوسری مُلاقات کی وجہ ہوئی۔ کیا تمہاری طبیعت میں صبر اتنا غالب ہے کہ تم اپنی اِسی حالت میں رہنا گوارا کر سکتے ہو۔ کیا تمہاری مذہبی تعلیم اتنی ہے کہ تم اُسے ایک نیک بخت اور پارسا شخص سمجھکر اُس کی خیر و سلامتی کی دُعا مانگو۔ جس کے ظلم و ستم سے تم قبر تک پہونچ گئے ہو اور جس نے تمہیں مفلس و فاقہ کش بنا دیا ہے۔

پہلا قاتل:۔ حضور انسان تو ہم بھی ہیں۔

میکبتھ:۔ ہاں فہرستوں میں تو تم آدمی ہی لکھے جاتے ہو مگر شُمار تمہارا کتّوں میں ہوتا ہے۔ اس میں چاہے شکاری ہوں چاہے تازی، چاہے جھبرے چاہے پلّے۔ چاہے وہ ہوں جو شکار کے لئے پانی میں کُود پڑتے ہیں۔ یا بھیڑیئے اور کتّے کی مخلوط نسل کے ہوں۔ مگر بہر کیف سبکو کُتّا ہی کہا جاتا ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ خصلت و عادت جو فطرت سے تمہیں عطا ہوئی ہے مثلاً تیز رفتاری یا سُست چال۔ تیزیٔ گھر کی چوکیداری میں ہوشیاری یا کوئی اور خصوصیت کا لحاظ کرکے تم میں تمیز کی جاتی ہو۔ بہر حال تمہیں کہتے کُتّا ہی ہیں۔ پس اِس قسم کی خصوصیتوں میں اگر تمہیں امتیاز حاصل ہے اور اِس فہرست میں تم کوئی درجہ رکھتے ہو، اور انسان کی بدترین قسم سے نہیں ہو تو کہو تاکہ میں خُفیہ طور پر تمہارے کان میں وہ بات ڈالوں جس سے تمہارا دُشمن دُنیا ہی سے چل بسے۔ اور یہ کام وہ ہوگا کہ اگر تم نے اُسے بخوبی انجام دیا تو ہمارے دل میں تمہاری جگہ ہوگی اور ہم تم سے ہمیشہ مہربانی و محبّت سے پیش آیا کرینگے۔ اِس وقت تو اُس کی زندگی نے تمہیں اپنی جان ہی سے اتنا بیزار کر رکھا ہے کہ اگر وہ مارا گیا تو تمہیں چین اور آرام نصیب ہو جائیگا۔

پہلا قاتل:۔ حضور میں نے دُنیا میں وہ وہ صدمے اُٹھائے اور ایسی ایسی چوٹیں کھائی ہیں کہ ہر وقت دل جلا بُھنا رہتا ہے۔ اور کسی کو نقصان پہونچانے میں مطلق تامل یا دریغ نہیں ہوتا۔

دوسرا قاتل:۔ اور حضور میں دوسرا شخص ہوں جس نے ناکامیاں سہتے سہتے اور تقدیر سے ہر وقت کشمکش میں رہتے رہتے اپنا دل ایسا پتھر کر لیا ہے کہ کسی بات پر جان جانے یا رہنے کی مطلق پروا نہیں رہتی۔

میکبتھ:۔ تم دونوں کو اس بات کا علم ہے کہ بینکو تمہارا دشمن ہے۔

دونوں قاتل:۔ حضور بجا فرماتے ہیں۔

میکبتھ:۔ اور یہی حال اُس کا ہمارے ساتھ ہے اور پھر یہ دشمن جان ہم سے اتنا قریب ہے کہ اُس کے زندہ رہنے سے ہمیں کسی نہ کسی طور پر نقصان پہونچنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ہم چاہیں تو بلا تکلف علی الاعلان یہ کہہ کر کہ یہی ہماری مرضی ہے اُسے اپنی نظروں سے دُور کر دیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اُس کے بھی دوست ہیں اور ہمارے بھی۔ اور اُن کی دوستی و محبت کو ہم ترک نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نے اپنے ہاتھ سے اُسے قتل کر دیا تو پھر ہمیں اُس کی موت پر اظہار افسوس کرنا پڑیگا۔ اور یہی بڑی وجہ ہے کہ ہم نے اس کام میں تم سے مدد چاہی ہے تاکہ کُل معاملہ عام نظروں سے چھپا رہے۔ کیونکہ چند وجوہ ایسے ہی سخت ہیں۔

دونوں قاتل:۔ جو کچھ حکم حضور دے رہے ہیں حسب الارشاد ہم اُسے بجا لائیں گے۔

پہلا قاتل:۔ ہمیں چاہے ہماری جانیں ہی ......

میکبتھ:۔ اس کام میں تمہاری خوشی اور رضامندی تمہارے چہروں سے ظاہر ہے۔ بس اس کام کو اسی وقت انجام دو۔ وہ مقام جہاں تمہیں اُس کی تاک میں بیٹھنا ہوگا ہم بتائیں گے۔ اور جو کچھ بھی اُس کی نقل و حرکت کے متعلق جاسوسوں سے معلوم ہوتا رہے گا اُس سے تمہیں مُطلع کریں گے۔ اور ٹھیک وہ وقت بھی تمہیں بتادیا جائیگا جس وقت یہ کام کرنا ہوگا۔ یعنی آج ہی رات کو یہ مرحلہ طے ہوجانا چاہیئے۔ موقع یہاں سے قریب ہے۔ مگر دیکھو ہماری طرف سے کسی بات کا ہونا ہرگز ظاہر نہ ہو۔ اور ہم اس امر سے بالکل پاک صاف رہیں۔ اور دیکھو کوئی کسر کسی بات میں رہ نہ جائے۔ فلی انس اُس کا بیٹا بھی اُس کے ہمراہ ہوگا۔ اُس کا عدم میں پہونچنا بھی ہمارے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ اُس کے باپ کا۔ جو حال اُس کے باپ کا ہو وہی اُس کا بھی ہو۔ اور ایک ہی وقت میں دونوں کا کام تمام کیا جائے۔ اچھا اب تم دونوں باہم مشورہ کر لو۔ میں ابھی پھر آتا ہوں۔

دونوں قاتل:۔ حضور والا۔ ہم ارادہ کر چکے ہیں۔

میکبتھ:۔ اچھا ذرا باہر ٹھیرو۔ میں پھر تمہیں ابھی بلاؤنگا۔

(قاتل چلے جاتے ہیں)

بینکو تیرا کام تو تمام ہوا۔ اگر جسم سے نکل کر تیری رُوح جنت کی تلاش میں روانہ ہو تو یہ روانگی آج ہی پیش آجانی چاہیئے۔

دوسرا منظر:۔ میکبتھ کا قصر۔

لیڈی میکبتھ اور ایک مُلازم اندر آتا ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ کیا بینکو دربار سے چلا گیا؟

مُلازم:۔ حضور۔ مگر شب کو پھر واپس آئیگا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اچھا، بادشاہ کے پاس جاکر کہو کہ میں تخلیئے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

مُلازم:۔ بہت بہتر۔ ابھی جاکر عرض کرتا ہوں۔

(مُلازم چلا جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ حاصل کچھ نہ ہوا۔ کھویا سب کچھ۔ جب ہماری کوئی خواہش ناقابلِ اطمینان طور پر پوری ہوتی ہے تو وہ ہمیں غارت کرنے میں اتنی آزاردہ نہیں ہوتی جسقدر کہ اُس کے بعد کا خوف دلمیں طرح طرح کے وہم پیدا کرکے ہماری مسرتوں کو خاک میں ملاتا رہتا ہے۔

(میکبتھ آتا ہے)

فرمایئے آقا، آپ اتنے اکیلے اکیلے کیوں رہنے لگے؟ اس سے آپکے ملنے والوں میں عجیب عجیب شکوک آپکی نسبت پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ شکوک ایسے ہوتے ہیں جنہیں اب تک قطعی معدوم ہوجانا چاہیئے تھا۔ اِنہی شکوک کی وجہ سے وہ آپکی طرف سے بدگمان ہوتے ہیں۔ جو چیز لا علاج ہوچکی ہو پھر اُس کا تدارک عبث ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہولیا۔

میکبتھ:۔ سانپ چوٹ تو کھا گیا مگر مرا نہیں۔ جہاں زخم اچھا ہوا پھر جیسا تھا ویسا ہی ہوجائیگا۔ اور جو زہر اس میں پہلے تھا پھر اُس کے پیدا ہوجانے کا خطرہ قائم رہیگا، یعنی روٹی کھانے جب بیٹھیں تو ڈرتے رہیں اور جب سوئیں تو نیند میں وہ ہیبت ناک خواب نظر آئیں کہ تن بدن پر لرزہ پڑجائے۔ بہتر ہوتا کہ زمین و آسمان کی سب چیزیں درہم برہم ہوجائیں۔ اور کاش ہم بھی اُنہی رفتگانِ عدم میں جا پہونچتے جنہیں ہم نے اپنے اطمینان کے لئے عالمِ بالا میں آسودہ کردیا ہے۔ بجائے اس کے کہ زندہ رہکر حالتِ اضطراب و پریشانی میں رہیں۔ اور سخت سے سخت تکلیفیں اور عذاب اُٹھائیں۔ دُنیا کی مکروہات و آلام سے قطعی آزاد ہوجانے پر ڈنکن اپنی قبر میں آرام سے سوتا ہے۔ اب نہ بغاوتیں نہ بلوے، نہ تلوار نہ زہر نہ خانہ جنگی نہ دشمن کی سرکشی یا ایسی ہی اور خرابیاں اُس کی نیند اُچاٹ کرسکتی ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ پیارے شوہر ان خیالات کو دل میں راہ نہ دیجئے۔ آپ اپنی یہ پریشان نظریں دُور کریں۔ آج تو مہمان آرہے ہیں۔ اُن کے سامنے خوش اور خنداں پیشانی رہیئے۔

میکبتھ:۔ ہاں پیاری بیوی! ایسا ہی ہوگا۔ تم بھی خوش و بشاش رہو۔ بینکو کی خاطر و تواضع میں کمی نہ ہو۔ نظر اور زبان دونوں سے اُس کی مدارات بہت کرنا۔ کیونکہ غصبِ دولت میں اپنی اِس نئی شان کے داغوں کو خوشامد اور خوش خلاقی سے دھونا اِس وقت ہمارے لئے محفوظ ترین طریقہ ہوگا۔ اور چہرے کے پردے میں دل کے اصلی خیالات کو چھپائے رکھنا بھی ضروری ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ ان سب باتوں کو تو آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔

میکبتھ:۔ پیاری بیوی! اس کلیجے میں تو سانپ اور بچھو بھرے ہیں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بینکو اور فلی انس ابھی تک جیتے بیٹھے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ تو کیا خُدا کی بنائی ہوئی ان صورتوں کو خدا کی طرح ہمیشگی حاصل ہے؟

میکبتھ:۔ ہاں، بس اتنا ہی تو اطمینان ہے کہ اُنپر حملہ کرکے اُنہیں غارت کیا جاسکتا ہے۔ بس اب خوش رہو۔ شام ہونے دو۔ جس وقت شپرک پُرانی عمارتوں، چھتوں چھجوں اور برجوں میں اپنے آشیانوں سے نکل کر ہوا میں اُڑیں اور جب تک کہ بڑا جھینگر اپنے سخت خول سے پرنکالکر اندھیرے میں زور سے زفیل دیتا سُنائی دے، اُس وقت ایک کام ایسا کیا جائیگا جو خوفناک ہوگا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اچھا پھر کیا کرنا ہوگا؟

میکبتھ:۔ جو کچھ اِس وقت سوچا ہے جب تک وہ نہ ہولے کوئی بات کسی پر ظاہر نہ ہو۔ بینکو کی تعریف و توصیف میں مصروف رہکر اور کوئی بات مُنہ سے نہ نکلے۔ آ، اے اندھیری رات جلد آ۔ اور اس واجب الرحم دن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دے۔ اور اپنے خونی ہاتھوں سے جو کسی کو نظر نہ آئیں اُن مجبوریوں کو دُور کردے جنہوں نے میرا رنگ زرد کر رکھا ہے۔ روشنی کم ہوتی جاتی ہے اور کوے جنگل کا رُخ کرکے اپنے

آشیانوں کی طرف اُڑنے لگے ہیں۔ دن بھر کی چلتی پھرتی صورتیں کسل مند ہو کر نیند کی ماتی ہو چلی ہیں۔ اور رات کی سیاہ بلائیں درندوں کو شکار کے لئے جگا رہی ہیں۔ تم میری ان باتوں کو حیرت سے سُنتی ہوگی۔ لیکن خاموش رہو کسی سے کچھ کہنا نہیں۔ جن باتوں کی ابتدا خراب ہوتی ہے انہیں او خرابیاں پیدا ہو کر انہیں خوب پکا اور مضبوط کر دیتی ہیں۔

تیسرا منظر:۔ محل کے قریب ایک باغ۔

تین قاتل آتے ہیں۔

پہلا قاتل:۔ تم سے کس نے ہمارا شریک بننے کو کہا ہے؟

تیسرا قاتل:۔ میکبتھ نے حکم دیا ہے۔

دوسرا قاتل:۔ ہماری اتنی بے اعتباری اُسے نہ ہونی چاہئے تھی۔ اس کام کے لئے اُس نے ہر قسم کی ہدایت ہمیں خود کر دی تھی۔ اور بتا دیا تھا کہ کن طریقوں سے یہ کام ٹھیک طور پر انجام دیا جائے۔

پہلا قاتل:۔ اچھا اب آ گئے ہو تو ساتھ رہو۔ پچھم کی طرف ابھی تک روشنی کی ایک تحریر باقی ہے۔ اور وہ وقت ایسا ہے کہ اگر کسی مسافر کو منزل پر پہونچنے میں دیر معلوم ہوتی ہوگی تو وہ جلدی کر کے کسی سرائے میں پہونچنا چاہتا ہوگا۔ اور لو وہ چیز بھی قریب آتی جاتی ہے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔

تیسرا قاتل:۔ سُنو۔ گھوڑوں کے قدموں کی آواز آنے لگی ہے۔

بینکو:۔ (کی آواز اندر سے آتی ہے) ارے کوئی ہے ہمیں روشنی دکھائے۔

دوسرا قاتل:۔ یہ آواز تو یقینی اُسی کی ہے۔ اور جتنے مہمان بلائے گئے تھے وہ تو محل کے صحن میں پہونچ چکے ہیں۔

پہلا قاتل:۔ گھوڑے تو سڑک سڑک محل تک جاتے ہیں۔

تیسرا قاتل:۔ سڑک سے جانے میں تقریباً ایک میل کا پھیر پڑتا ہے۔ بینکو تو اکثر یہیں گھوڑے سے اُتر کر باقی فاصلہ پیادہ پا طے کرتا ہے۔

دوسرا قاتل:۔ روشنی، روشنی۔

تیسرا قاتل:۔ ہاں، یہی ہے، یہی ہے۔

پہلا قاتل:۔ ٹھیرو۔ کون ہے۔

(بینکو اور فلی انس ایک مشعل لئے آتے دکھائی دیتے ہیں۔)

بینکو:۔ آج رات کو مینہ آتا معلوم ہوتا ہے۔

پہلا قاتل:۔ برسنے دیجئے۔

(بینکو پر حملہ کیا جاتا ہے)

بینکو:۔ ارے دغا۔ فریب۔ پیارے فلی انس بھاگ بھاگ بھاگ۔ تجھے میرا انتقام لینا ہوگا۔ ارے غلام بے ایمان

(بینکو مر جاتا ہے۔ فلی انس فرار ہوتا ہے)

تیسرا قاتل:۔ روشنی کس نے بجھا دی؟

پہلا قاتل:۔ یہی تھا جسے بتایا گیا تھا۔

تیسرا قاتل:۔ ایک گرا ہے مگر اسکا بیٹا نکل گیا۔

دوسرا قاتل:۔ تو پھر یہ سمجھو کہ شکار کا بہتر نصف ہاتھ سے نکل گیا۔

پہلا قاتل:۔ جو کچھ بھی ہوا۔ اب یہاں سے چلو۔ اور بتاؤ کہ کتنا کام ہوا اور کتنا رہ گیا (چلے جاتے ہیں)

چوتھا منظر:۔ محل کا ایک بڑا کمرہ۔ ضیافت کا سامان آراستہ ہے۔ میکبتھ، لیڈی میکبتھ، راس، لینکس، دربار کے اُمرا اور خدام موجود ہیں۔

میکبتھ:۔ آپ سب اپنے اپنے درجے اور مرتبے سے خود واقف ہیں۔ اُسی کے مطابق تشریف رکھیئے۔ آپکا قدم رنجہ فرمانا ہمارا

موجب مسرت ہے۔

اُمرا:۔ بادشاہِ ذی جاہ کے ہم سب منت گزار ہیں۔

میکبتھ:۔ ہم تو سب ملے جُلے بیٹھکر آپکی میزبانی کریں گے اور ہماری ملکہ باضابطہ طریقے پر فریضۂ میزبانی ادا کریگی۔ وہ ابھی آنے والی ہیں۔ ہم سب ملکر انکو مُبارکباد دینگے۔

لیڈی میکبتھ:۔ میری طرف سے آپ حاضرین کو مُبارکباد دیں۔ اُن کے یہاں تک تکلیف فرمانے پر تو میری زبان سے نہیں بلکہ دل سے تشکّر و امتنان ظاہر ہو رہا ہے۔

میکبتھ:۔ دیکھئے وہ بھی تہِ دل سے آپکا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ دونوں پلڑے برابر ہوئے۔ اس لئے میں بیچ میں بیٹھتا ہوں۔

(دروازے سے پہلا قاتل اندر آتا ہے)

سب خوش رہو۔ کاسۂ شراب کو میز کے گرد ہر مہمان کے سامنے لاؤ۔ (دروازے کے قریب آکر قاتل سے کہتا ہے)

تیرے چہرے پر خُون لگا ہے۔

قاتل:۔ غالبًا بینکو کا خُون ہوگا۔

میکبتھ:۔ اُس کا خُون تیرے چہرے پر باہر اتنا اچھا معلوم ہو۔ چاہے کہ اگر وہ جسکا خُون تیرے چہرے پر ہے اندر ہوتا تو اتنا اچھا نہ معلوم ہوتا۔ کہو اُسے ختم کر دیا؟

قاتل:۔ حضور ہاں گلا کاٹ دیا۔ اور اُسے یہاں تک آنے کی تکلیف سے بچا دیا۔

میکبتھ:۔ کیا بات ہے۔ تُو تو گلا کاٹنے والوں میں سب کا اُستاد ہے۔ مگر وہ بھی جس نے فلی انس کا گلا کاٹا ہوگا تجھ سے کم نہ ہوگا۔ اگر اُس کا گلا کاٹنے والا بھی تو ہی ہے تو پھر تیرے مثل دوسرا قاتل دُنیا میں نہ نکلیگا۔

قاتل:۔ حضورِ پُرنور۔ فلی انس بھاگ گیا۔

میکبتھ:۔ تو پھر مجھ پر وہی حالت عود کریگی جو پہلے تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سنگِ مرمر کا ایک سالم ٹکڑا ہوتا جس میں کہیں بال تک نہ ہوتا اور چٹان کی طرح مضبوط ہوتا۔ پھر میں ایسا آزاد ہوتا جیسے ہوا جو ہمارے چاروں طرف بہتی ہے۔ اب میں ہر طرف سے بندھا جکڑا زنجیروں میں کسا ہوں۔ اب پھر طرح طرح کے شکوک اور طرح طرح کے خوف دل میں اپنا گزر کرتے رہیں گے۔ لیکن جو کچھ ہو بینکو کی طرف سے تو اب اطمینان ہو گیا۔

قاتل:۔ حضور۔ اُس کی لاش اب تک خندق میں پڑی ہے۔ اُس کے سر پر بیس زخم ہمارے خنجر کے ہیں اور وہ سب اتنے کاری ہیں کہ اگر اُس میں سے ایک بھی پہونچتا تو جان باقی رہنی ممکن نہ تھی۔

میکبتھ:۔ اس تکلیف کا شکریہ۔ پُرانا سانپ تو مارا گیا مگر سنپولیا نکل گیا۔ اور کیا عجب ہو کہ وقت آنے پر اس سے اور سانپ پیدا ہوتے رہیں اگر اس وقت اس میں اس کی قابلیت نہیں۔ اچھا اب جاؤ۔ کل کسی وقت کل واقعات تفصیل سے سنیں گے۔ (قاتل چلا جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ بادشاہ، میرے آقا، آپ نہ خود خوش نظر آتے ہیں اور نہ مہمانوں کو خوش کرتے ہیں۔ ضیافت کے وقت میزبان کی طرف سے لُطف و مدارات، خاطر و تواضع کا نہ ہونا ایسا ہے جیسے ضیافت نہ ہوئی، قیمت دے کر لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ ضیافت میں میزبان کی طرف سے خاطر داری اور خوش خلقی کا ظاہر ہونا لوازماتِ میزبانی سے ہے۔ ورنہ کھانا تو سب اپنے گھر بھی کھاتے ہیں۔ مگر تپاک و مدارا کھانے میں چاشنی کا کام دیتا ہے بغیر اسکے ضیافت ایک بیکار شے ہے۔

میکبتھ:۔ اے میری پیاری رفیق۔ بھول چوک میں بات کی یاد دلانے والی بیوی۔ ہاضمہ درست ہو تو اشتہا بھی ہوتی ہے۔

تندرستی کیلئے دونوں ضروری ہیں۔

لینکس:۔ حضور تشریف رکھیں۔

(بینکو کی روح داخل ہوتی ہے اور میکبتھ کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

میکبتھ:۔ آج ملک کے تمام اکابر اور شرفاء ایک چھت کے نیچے جمع ہیں۔ کاش اس وقت شریف بینکو بھی موجود ہوتا۔ اس کے نہ آنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وعدہ خلافی کی۔ دوسرے سوءِ اتفاق۔ سوءِ اتفاق پر اتنا افسوس نہیں جس قدر کہ وعدہ خلافی کی شکایت ہے۔

لینکس:۔ حضور، بینکو کی غیر حاضری اسے وعدہ شکن قرار دیتی ہے۔ اب حضور یہاں رونق افروز ہو کر ہمیں شرفِ حضوری بخشیں۔

میکبتھ:۔ لیکن میز کے گرد تو سب مہمان بیٹھے ہیں۔ میرے لئے جگہ کہاں ہے؟

لینکس:۔ حضور کے لئے یہ جگہ ہے۔

میکبتھ:۔ کہاں؟

لینکس:۔ حضور یہاں۔ وہ کیا چیز ہے جس سے حضور کی حالت متغیر ہوئی جاتی ہے؟

میکبتھ:۔ تم میں سے کس نے یہ کام کیا ہے؟

اُمراء:۔ کیا کام۔ حضور کا کیا مطلب ہے؟

میکبتھ:۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے ایسا کیا ہے۔ تم کیوں اپنے سر کی خون آلودہ لٹیں میری طرف جھٹکتے ہو؟

راس:۔ حاضرین اُٹھئے۔ بادشاہ سلامت کا مزاج نادرست ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ میرے معزز مہمانوں۔ بادشاہ کو اکثر اس قسم کا دورہ اُٹھا کرتا ہے۔ بلکہ ابتدائے جوانی سے یہی حال ہے۔ آپ سب صاحب اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں۔ یہ دورہ صرف تھوڑی دیر رہتا ہے۔ اگر آپ صاحبوں میں سے کسی نے ان کی طرف زیادہ توجہ کی تو دورہ سخت ہو جائیگا اور انہیں سخت تکلیف پہونچے گی۔ آپ سب کھانے میں مصروف رہیں اُنکا خیال نہ کریں۔

(میکبتھ سے علیحدہ کہتی ہے) آپ بھی کیا آدمی ہیں۔

میکبتھ:۔ ہاں آدمی ہوں اور بڑا بہادر ہوں۔ اور اُس چیز سے آنکھیں ملا سکتا ہوں جسے شیطان بھی دیکھکر ڈر جائے۔

لیڈی میکبتھ:۔ ارے غضب۔ یہ تو خوف وہم کی ویسی ہی کوئی صورت ہے جیسے کہ وہ خنجر تھا جسے ہوا میں دیکھا تھا۔ اور میکبتھ اُسے دیکھتا ہوا ڈنکن کے خواب گاہ تک گیا تھا۔ یہ دفعتاً چونکنا، جھجکنا کسی اصلی خوف کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ خوف تو اس قسم کا ہے جیسے جاڑے کی رات میں کوئی بڑھیا اپنی دادی نانی کی کہی ہوئی کہانی سنائے اور سننے والے چونک چونک پڑیں۔ شرم شرم۔ ایسے بُرے بُرے چہرے کیوں بناتے ہو۔ سب کچھ کہنے سننے کے بعد بھی تم اُسی کرسی کی طرف دیکھے جاتے ہو۔

میکبتھ:۔ اچھی، ذرا ادھر دیکھو، اور دیکھکر بتاؤ کہ یہ کون ہے۔ میں تیری کب پروا کرتا ہوں۔ چاہے تو سر ہلائے چاہے گردن۔ چاہے بات کرنی چاہئے چاہے چپ رہے۔ ہم دشمن کو قتل کر کے اُسے زمین میں دبا دیتے ہیں۔ اگر نہ خانوں میں رکھے تابوتوں سے بھی مُردے نکل آئیں تو پھر قبریں بیکار ہیں۔ مُردے آسمان کے نیچے رکھدیئے جایا کریں تاکہ چیل کوّے انہیں نوش کریں۔

(روح چلی جاتی ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ کیا اس حماقت نے آپکو بالکل ہی نامرد و بزدل بنا دیا۔

میکبتھ:- جب میں یہاں کھڑا تھا تو میں نے اُسے دیکھا تھا۔

لیڈی میکبتھ: بھلا ہیں شرمندہ تو ہوتے نہیں، زبان چلی جاتی ہے۔

میکبتھ:- اگلے وقتوں میں بھی آدمیوں کے خون ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کے وضع کئے ہوئے قوانین نے دُنیا سے ظلم وستم دُور کر کے امن وسلامتی پیدا کی تھی۔ اسکے بعد بھی ایسے ایسے قتل وخون ہوئے جنکو سُنکر کان بہرے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا کہ جہاں دماغ معطل ہوا آدمی مرکر قصہ ختم کر دیتا تھا۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ مر کر بھی جی اُٹھتے ہیں۔ سر میں بیس بیس زخم ہوتے ہیں جن میں سے ہر زخم مہلک ہوتا ہے، پھر بھی وہ ہمیں ہماری کرسیوں سے اُٹھا دیتے ہیں۔ یہ قتل وخون تو کچھ عجیب طرح کے قتل وخون ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- میرے آقا۔ ضیافت میں آپکے مہمان آپ کی عدم موجودگی سے سخت پریشان ہیں۔

میکبتھ:- خوب یاد دلایا۔ میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔ میرے عزیز ولائق دوستو، میری وجہ سے آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ یہ عجیب مرض مجھے مدت سے لاحق ہو گیا ہے۔ جو لوگ واقف ہیں اُن کے لئے مجھے اس حال میں دیکھنا ایک معمولی بات ہے۔ آیئے، میں اب سب کے ساتھ بیٹھکر سب کے لئے خلوص ومحبت کا جامِ شراب پیتا ہوں۔ اور یہ جام اپنے دوست بینکو کے لئے ہے جسے ہم اس وقت یاد کرتے ہیں۔ کاش وہ یہاں ہوتا۔ سب کے لئے اور اُس کی یاد میں یہ جامِ صحت پیتا ہوں، اور کل مہمانوں کے حق میں دُعائے خیر کرتا ہوں۔

اُمراء:- ہم حضور کے خدامِ جاں نثار ہیں۔

(بینکو کی رُوح پھر اندر آتی ہے)

میکبتھ:- دُور ہو بدبخت میری نظر سے دُور رہ۔ کاش زمین تیرا مُردہ ڈھک دیتی۔ تیری ہڈیوں میں اب گُودا نہیں۔ تیرا خُون سرد ہو چکا ہے۔ تیری آنکھوں میں زندگی کا نُور نہیں، پھر کیوں گھُورے جاتا ہے۔

لیڈی میکبتھ:- معزز حاضرین اس حال کو معمولی چیز سمجھئے۔ اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس سے بزمِ لُطف ومسرت مکدّر ہو جاتی ہے۔

میکبتھ:- انسان جس بات کی ہمت کر سکتا ہے میں بھی ہمت وارادہ کر سکتا ہوں۔ اس میں چاہے روس کے جنگلوں کا کوئی خونخوار ریچھ یا گرگستان کا کوئی شیر یا کوئی اور چیز مہیب شکل اختیار کیوں نہ کرے بلکہ وہ شکل بھی جو اس وقت میری نظر کے سامنے ہے میرے اعصاب میں مطلق ضُعف پیدا نہیں کر سکتی۔ یا اگر تو پھر زندہ ہو کر تلوار ہاتھ میں لئے صحرا میں کسی تنہا جگہ مجھ سے لڑنے آئے اور پھر میرے ہاتھ میں لرزہ پیدا ہو تو سمجھ لے کہ میں مرد نہیں۔ بلکہ ایک کمزور لڑکی کا دودھ پیتا بچہ ہوں۔ لے ہیبت ناک رُوح یہاں سے چلی جا۔ اے ڈرانے والی خیالی صورت دُور ہو۔

(رُوح چلی جاتی ہے)

اب چلی گئی تو میں پھر آدمی کی جُون میں آگیا۔ صاحبو آپ خاموش بیٹھے رہیں۔

لیڈی میکبتھ:- آپ نے اس وقت کا لُطف توڑ کر کرا کر دیا۔ اور اس مُبارک مجمع کو اس طرح پراگندہ کیا کہ ایک ایک کرکے سب چلے گئے۔

میکبتھ:- کیا ایسی صورتیں دُنیا میں موجود ہیں جو موسمِ بہار کے ایک بادل کی طرح ہمارے سر سے گزر جائیں اور ہمیں کچھ تعجب نہ ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بڑا جری اور دلیر ہوں لیکن دیکھتا ہوں کہ ہم سب کے چہروں پر سُرخی ہے اور میری صورت پر زردی کھنڈی ہے۔

راس:- آقا کس کی صورتوں سے آپکا مطلب ہے۔

لیڈی میکبتھ:- خدا کے لئے کچھ نہ بولو۔ دیکھتے نہیں کہ بات کرنے سے اُن کی حالت اور بگڑتی ہے۔ سوال کرنے سے اور زیادہ غصہ بڑھتا ہے۔ اچھا، اب خدا حافظ۔ رخصت ہونے میں درجے اور مرتبے کا خیال نہ کیا جائے۔ بلکہ جملہ معززین یکلخت رخصت ہوں۔

لینکس:- آداب بجالاتا ہوں۔ خدا حضور کو صحت تندرستی بخشے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

لیڈی میکبتھ:- میں بھی سب کے لئے دعا کرتی ہوں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔ میکبتھ اور لیڈی میکبتھ رہ جاتے ہیں۔)

میکبتھ:- وہ تو خون مانگتی ہے۔ خون کا بدلہ خون ہی ہوا کرتا ہے۔ سُنا گیا ہے کہ پتھر بھی جنبش میں آتے ہیں اور درختوں کو قوت گویائی ملی ہے۔ اور اُن آیندہ کی خبریں کہنے والے لوگوں نے جو دنیا میں اشیا کے تعلقات سے واقف ہیں بلکہ زاغ و زغن نے بھی ایسے قاتل کا پتہ بتادیا ہے جسنے اپنے جرم کو غایت درجے پوشیدہ رکھا تھا۔ رات کا وقت ہے۔ کیا بجا ہوگا؟

لیڈی میکبتھ:- صبح ہونے کو ہے۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ ابھی رات باقی ہے یا صبح ہوگئی۔

میکبتھ:- یہ تم نے کیا کہا تھا کہ میکڈف جشن تاجپوشی میں شرکت سے انکار کرتا ہے؟

لیڈی میکبتھ:- کیا آپ نے اُسے مدعو کیا تھا؟

میکبتھ:- اتفاق سے میرے کان میں یہ بات پڑگئی ہے۔ میں نے تو اُس کے گھر میں اپنا ایک جاسوس لگا رکھا ہے۔ کل میں میکڈف کو طلب کرونگا۔ اور اگر وقت ملا تو جنگل کی اُن جادوگرنیوں سے بھی ملاقات کرونگا تاکہ اُن سے کچھ اور حالات دریافت کروں۔ اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ بدترین ذرائع سے بدترین خبریں اپنے متعلق دریافت کرنے کی کوشش میں رہوں اور اپنے ذاتی نفع کے سامنے دوسرے کی کچھ حقیقت نہ سمجھوں۔ میں تو اس وقت خون کے دریا میں سر تک ڈوبا ہوا ہوں۔ کسی طرح تیر کر دوسرے کنارے پہونچ سکتا ہوں۔ واپس جانا بھی اب اتنا ہی دشوار ہے جسقدر کہ یہاں تک پہونچنا دشوار تھا۔ میرے دماغ میں تو اس وقت عجیب عجیب خیالات سمائے ہیں اور سردست وہی کرنا پڑیگا جو بے سوچے سمجھے دل میں آئیگا۔

لیڈی میکبتھ:- اب تمہیں نیند نہیں آتی؟ افسوس اُس چیز سے تم محروم ہوگئے جو ہر ذی حیات کے لئے موجب راحت ہوتی ہے۔

میکبتھ:- اچھا آؤ چلکر سو رہیں۔ میری تکلیفیں خود میری طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور میرا خوف وہ ہے جو پہلے جرم پر پیدا ہوکر آیندہ جرائم کے لئے دل کو سخت پتھر کردیتا ہے۔ ابھی تو ہم جرائم میں مبتدی سمجھو۔

(سب چلے جاتے ہیں)

پانچواں منظر:- کیچڑ پانی اور جھاڑیوں والی زمین۔ گرجتے بادل میں تینوں جادوگرنیاں ہیکیٹی کے دربار میں حاضر ہوتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی:- اے ساحروں اور بلیات کی سردار ہیکیٹی آج تو کیوں خفا معلوم ہوتی ہے؟

ہیکیٹی:- خفا ہونے کی وجہ کافی ہے۔ اری چڑیلوں تم بڑی گستاخ اور بے باک ہو چلی ہو۔ تم نے میکبتھ کے ساتھ خود ہی بات چیت کی اور موت زیست کی باتیں چیستان بناکر اُس سے کہیں۔ اور میں جو تم سبکی سردار ہوں اور جسکا کام دنیا پر طرح طرح کی بلائیں اور آفتیں نازل کرنا ہے اُسے

خبر تک نہ کی کہ میں بھی اِس کام میں شریک ہوتی۔ اور اپنے فن و مہارت کا پورا کمال دکھاتی۔ اور اِس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ جو کچھ تم نے کیا ایک ایسے شخص کے لئے کیا جو خود غرض اور مغلوب الغضب آدمی تھا اور صرف اپنا مطلب نکالنا چاہتا تھا۔ ہمارے سحر اور طلسم کی اُسے خبر نہ تھی۔ جاؤ دُور ہو۔ اور کل صبح اکیرون کے غار کے قریب مجھ سے ملو۔ وہاں میں میکبتھ کی تقدیر کا حال معلوم کرونگی۔ سحر اور طلسم کے کل ظروف اپنے ساتھ لانا۔ جادو اور سحر کا کُل سامان جنتر منتر یا جسقدر چیزیں ایسے موقع پر درکار ہوتی ہیں ساتھ ہوں۔ اب میں فضا میں گشت لگانے نکلتی ہوں۔ اور آج کی رات نہایت پُرہیبت اور مُہلک معاملات میں بسر کرنے والی ہوں۔ اور آج ہی دوپہر سے پہلے یہ کام کرنا ہے کہ کُرۂ ماہتاب کے کنارے بخارات کا ایک عظیم الشان قطرہ نیچے کو جھکا دکھائی دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زمین پر گرنے سے پہلے اُسے لپک لُوں۔ اور پھر ان بُخارات کو جادو کے زور سے مُقطّر کرکے اُن سے وہ روحیں پیدا کروں جو اپنی دہشت سے میکبتھ کو خود غارت ہونے کی طرف مائل کریں۔ پھر وہ تقدیر کو بُرا نہ کہے گا۔ موت کی اُسے پروا نہ ہوگی۔ اور اپنی توقعات ایسی چیزوں پر قائم کریگا جو عقل، مرّوت اور خوف سے بالاتر ہونگی۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کا یہ کمزور خیال کہ وہ ہر طرح پر محفوظ ہے اور احتیاط غیر ضروری ہے جیسا ہلاک کرنے والا ہے دوسری چیز نہیں۔

(باجے اور ساز بجتے ہیں اور ایک گیت کے گانے کی آوازیں اندر سے آتی ہیں)

سُنو، مجھے کوئی بُلا رہا ہے۔ دیکھو وہ میری ہمزاد کُہر کے بادل پر بیٹھی میرا انتظار کرتی ہے۔

پہلی جادوگرنی:- آؤ بہنوں جلدی کریں۔ ہیکیٹی تھوڑی دیر میں پھر آتی ہوگی۔

چھٹا منظر:- فورلیس۔ لینکس اور ایک امیر آتا ہے۔

لینکس:- میری گزشتہ تقریروں پر تو آپ نے غور کیا ہوگا اور اُنکا اصل مفہوم آپکے خیال میں آگیا ہوگا۔ مجھے اب صرف اتنا کہنا ہے کہ حالات کچھ عجیب و غریب شکل میں ظاہر ہونے لگے ہیں۔ بادشاہ ڈنکن کی موت پر میکبتھ کو کیا کچھ افسوس اور رنج نہ ہوا ہوگا۔ واللہ ڈنکن کیا قتل ہوا دُنیا کا بادشاہ مارا گیا۔ اور یہ بہادر بینکو پیادہ پا ہونے کی وجہ سے ضیافت میں دیر کر پہونچا۔ اور اگر آپ چاہیں تو فلی انس کی نسبت بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنے باپ کا قاتل ہے۔ کیونکہ وہ بھی موقع قتل سے فرار ہوا ہے۔ انسان کو چلنے میں دیر نہ کرنی چاہیئے کیونکہ لوگوں کے دماغ اِس خیال سے خالی نہیں رہ سکتے کہ میلکم اور دونل بین کی یہ کس درجہ ناشائستگی تھی کہ اُنہوں نے اپنے مُعزز و مُحترم باپ کو قتل کرڈالا۔ یہ بڑی ہی نالائقی کی حرکت تھی۔ اور آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ میکبتھ کو اِس حادثہ سے کس درجہ صدمہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ اُن دو آدمیوں کو جو ڈنکن کے خوابگاہ میں سوتے تھے قتل کی خبر سُنتے ہی کس طرح میکبتھ نے رنج اور غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ دونوں آدمی شراب کے نشے اور نیند کے خمار میں چُور تھے۔ خیال فرمائیں کہ یہ کام میکبتھ نے کیسی شرافت کا کیا۔ اور پھر اس کام میں عقل و ہوشیاری کو بھی کچھ کم ملحوظ نہ رکھا۔ کیونکہ اگر وہ دونوں آدمی سب کے سامنے اِس قتل سے انکار کرتے تو پھر سُننے والے جو دل رکھتے تھے کیسے اس انکار پر اپنی طبیعتوں پر ضبط رکھ سکتے

ں مجھے یہی کہنا ہے کہ جتنے کام میکبتھ نے کئے بڑی
فائی اور خوبی سے کئے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ اگر آج کو
کن کے فرزند میکبتھ کی قفل کنجی میں ہوتے تو انہیں
لوم ہوتا کہ باپ کا قتل کرنا کیا چیز ہوتا ہے۔ مگر
ا کو ایسا منظور نہ ہوا۔ اور فلی انس بھی ایسی ہی مصیبت
ں گرفتار ہوتا۔ لیکن ہمیں زبان نہ کھولنی چاہیئے کیونکہ
لدف اپنی صاف گوئی کے باعث ضیافت میں شرکت
انکار کی وجہ سے معتوب ہو رہا ہے۔ کچھ آپکو معلوم
، کہ آجکل وہ ہے کہاں؟
بر:۔ ڈنکن کا فرزند، جسکے حقوقِ سلطنت پر اس وقت
ں ظالم کا قبضہ ہے، آجکل شاہِ انگلستان کے دربار
ں رہتا ہے۔ اور وہاں کا بادشاہ ایڈورڈ اس کی
ت خاطر و مدارات کرتا ہے۔ تقدیر کی اس گردش
ان دونوں شہزادوں کی عزت و بزرگی میں کسی
سم کی کمی نہیں آنے دی۔ میکدف بھی وہیں چلا گیا
، اور وہاں جانے کی غرض یہ ہے کہ فوراً بادشاہ
ڈورڈ سے اس بات کی تحریک کرے کہ وہ بادشاہ
برستان اور جنگجو بادشاہ سیورڈ کی مدد سے اگر خدا
، مدد بھی شامل حال رہے تو ملک کی حالت درست
ادے۔ اور پھر ہم اس قابل ہو جائیں کہ ہمارے دسترخوان
کھانے کو روٹی میسر اور رات کو چین سے سونا نصیب ہو
در جب ہمارے ہاں ضیافتیں ہوں تو آنے والے مہمان
قاتل کی چھریوں اور خنجروں سے محفوظ رہیں اپنے بادشاہ
کے جان و دل سے مطیع رہکر اس سے انعام و اکرام
کے بطریقِ جائز متوقع رہیں، جس کے حاصل ہونے کی
اس وقت حسرت سے آرزومند ہیں۔ یہی باتیں ہیں جنہوں
نے ظالم میکبتھ کی اس درجے غضبناک کر رکھا ہے کہ
وہ لڑائی کے قصد سے تیاریاں کر رہا ہے۔
لینکس:۔ کیا میکبتھ نے میکدف کو اپنے جشنِ تاجپوشی
کے جلسے میں مدعو کیا تھا؟
امیر:۔ جی ہاں۔ مگر میکدف نے شرکت سے صاف
انکار کر دیا اور کہدیا کہ "مجھے افسوس ہے کہ میں شریک
نہیں ہو سکتا۔" قاصد اتنا سنکر پلٹا اور کہنے لگا کہ
جب ایسا جواب دیکر مجھے واپس کیا جاتا ہے تو اس کا
خمیازہ میکدف کو اٹھانا پڑیگا۔"
لینکس:۔ یہ بات تو ایسی ہے جس سے میکدف ہوشیار
رہیگا۔ اور میکبتھ سے وہ اتنا ہی دور دور رہیگا جسقدر کہ
عقل اسکی رہنمائی کریگی۔ اے کاش کوئی مبارک فرشتہ
اڑکر انگلستان پہونچتا اور اس ملک کو ہمارے حال کی
خبر کر دیتا کہ وہ کسطرح ایک ظالم و جابر کے ظلم و تشدد
سے ہلاکت کے قریب پہونچا ہے۔ خدا کی رحمت اس پر جلد
سے جلد نازل ہو۔
امیر:۔ میں بھی میکدف کے حق میں دعا کرتا ہوں۔
(چلے جاتے ہیں)

جزو رابع

پہلا منظر:۔ ایک تاریک غار۔ غار کے
بیچوں بیچ ایک دیگ آگ پر چڑھی جوش
کھاتی ہے۔ آسمان پر بادل گرجتا ہے تینوں
جادوگرنیاں آتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی :- چتکبری بلّی تین مرتبہ میاؤں میاؤں کر چکی ہے۔

دوسری جادوگرنی :- جھاڑی کے چوہے نے تین دفعہ دانت نکوسے ہیں۔

تیسری جادوگرنی :- دوزخ کے پرندے بھی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ "ہاں وقت یہی ہے۔ وقت یہی ہے"

پہلی جادوگرنی :- آؤ آؤ۔ اُبلتی دیگ کے گرد چکر لگائیں اور زہر بھری آنتیں اُس میں ڈال دیں۔ زہریلا مینڈک۔ جو اکتیس دنوں اور راتوں پتھر کے نیچے زمین پر بیٹھا اپنا زہر پھیلاتا رہا ہے سب سے پہلے اُسے اِس جادو کی دیگ میں ڈالکر جوش دو۔

سب جادوگرنیاں :- دوہری دوہری محنت، دوہری دوہری مشقّت۔ آگ جلتی رہے، دیگ اُبلتی رہے۔

دوسری جادوگرنی :- کیچڑ دلدل کے سانپ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیگ میں جوش دو۔ بامنی کی آنکھ، مینڈک کی ران، چمگادڑ کے روئیں کتّے کی جیب، اژدہے کی دوشاخہ زبان، چھپکلی کی ٹانگ، اُلّو کے پر، دیگ میں ڈال کر ابالو، تاکہ دوہری دوہری بلائیں نازل ہوں۔ اور دوزخ کا یہ قلیہ خوب پکے۔ اور خوب بلبلے اُٹھیں۔

سب ملکر :- دوہری دوہری محنت دوہری دوہری مشقّت، آگ جلتی رہے دیگ اُبلتی رہے۔

تیسری جادوگرنی :- اژدہے کے فلس۔ بھیڑیے کے دانت، چڑیل کا مُردہ، ہلوک کی مسموم جڑ جو اندھیری رات میں کھودی گئی ہو، بکرے کا پتا، کُفر بکنے والے یہودی کا جگر، سدا بہار درخت کی شاخیں جو چاند گرہن میں چاندی کی طرح چمکتی ہوں، تُرک کی ناک، حبشی کے ہونٹ، کسی بدکار عورت کے حرامی بچے کی اُنگلیاں جس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ اور سڑک کے کنارے کسی نالی میں پیدا ہوا ہو، یہ سب دیگ میں ڈالدو تاکہ شوربا خوب گاڑھا ہو جائے۔ اور اس میں ایک شیر کی اوجھڑی اور ملا دو تاکہ سب ضروری مصالحے دیگ میں پڑ جائیں۔

سب ملکر :- دوہری دوہری محنت، دوہری دوہری مشقّت، آگ جلتی رہے، دیگ اُبلتی رہے۔

دوسری جادوگرنی :- دیگ میں جو کچھ پکا ہے اُسے بندر کے خون سے ٹھنڈا کرو۔ تو پھر ہمارا جادو پکا اور پورا ہو۔

(ہیکیٹی جادوگرنیوں کی سردار آتی ہے)

ہیکیٹی :- میں تمہاری اس محنت و تندہی پر شاباش کہتی ہوں اور تمہاری اس تکلیف کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ اور اس محنت کی مزد میں ہم سب شریک رہیں گے۔ اور اب اِس دیگ کے گرد سب چڑیلیں پریوں کی طرح چکر باندھ کر ناچیں اور گائیں۔ تاکہ جو کچھ تم نے دیگ میں ڈالا ہے اُس پر جادو اپنا عمل کرے۔

(ساز بجنے کے ساتھ گانے کی آواز آتی ہے
کالے کالے مُنہ والی روحیں نظر آتی ہیں وغیرہ
وغیرہ)

(ہیکیٹی چلی جاتی ہے)

دوسری جادوگرنی :- میرے ہاتھ کے انگوٹھے کھجا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خبیث چیز اِدھر آ رہی ہے۔ دروازہ جو کھٹکھٹائے اُس پر قفل کنڈیاں فوراً کھل جائیں۔

(میکبتھ اندر آتا ہے)

میکبتھ :- اری تم کلموہی، آنکھ مچولی کھیلتی آدھی رات کی چڑیلو، کہو تمہارا کیا حال ہے اور کس کام میں مصروف ہو؟

سب ملکر :- ہمارا کام وہ ہے جسکا کوئی نام نہیں۔

میکبتھ :- جس کام میں بھی تم مصروف ہو اُس کی قسم دیکر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں پوچھوں اُس کا جواب دو۔ اس میں چاہے تمہیں چاردانگ عالم سے ہوائیں چلاکر، طوفان اُٹھاکر

گر جاؤں ہی کو کیوں نہ ڈھانا پڑے۔ اور چاہے سمندر پران طوفانوں سے بلا خیز موجیں اُٹھا کر جتنے جہاز اُس پر چلتے ہوں اُنہیں غرق ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چاہے کھیتوں میں اناج بھرے خوشے ٹوٹ جائیں، یا جنگل میں درخت گر جائیں۔ اور خواہ سر بفلک قلعوں کے اُونچے اُونچے دروازے اُن کے دربانوں کے سروں ہی پر کیوں نہ گر پڑیں، اور چاہے مرتفع میناروں اور بلند اہرام کے سر جھک کر اُن کے قدموں ہی سے کیوں نہ جا لگیں۔ اور خواہ فطرت کے کُل جاندار شدتِ بارش سے اس طرح غارت ہی کیوں نہ ہو جائیں جس پر غارتگری کا دل بھی شرمندہ ہو۔ غرض یہ جو کچھ بھی ہو مگر جو کچھ میں پوچھوں اُس کا جواب دو۔

پہلی جادوگرنی:۔ کہو کیا پوچھتے ہو؟

دوسری جادوگرنی:۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔

تیسری جادوگرنی:۔ جو کچھ پوچھو گے اُسکا جواب دیا جائیگا۔

سب کہتی ہیں:۔ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھو تاکہ ہم سے یا ہماری ہمزاد روحوں کی زبان سے اپنے سوالوں کا جواب سُنو۔

میکبتھ:۔ اپنی ہمزاد روحوں کو بلاؤ تاکہ میں اُنہیں دیکھوں۔

پہلی جادوگرنی:۔ سُورنی کا خون دیگ میں ڈالو۔ اور سُورنی بھی وہ ہو جسنے اپنے ایک جھول کے پورے نو بچوں کو کھایا ہو۔ اور وہ چربی آگ میں ڈالو جو خُونی مجرم کی پھانسی میں لٹک کر جھونکے کھانے سے تختے پر جم جاتی ہے۔

سب ملکر:۔ چھوٹی بڑی ہمزاد روحو سب حاضر ہو۔

(گرج ہوتی ہے۔ پہلی صورت جو نظر آتی ہے وہ ایک چہرہ ہے جسکے سر پر خود رکھا ہے)

میکبتھ:۔ اے نامعلوم طاقت بتا......

پہلی جادوگرنی:۔ تمہارے دل میں جو کچھ ہے اُسکا حال اسے معلوم ہے۔ جو کچھ وہ کہے اُسے سُنو۔ خود کچھ نہ بولو۔

پہلی صورت:۔ میکبتھ، میکبتھ، میکبتھ، میکڈف سے ہوشیار رہ۔ فائف کے امیر سے ہوشیار رہ۔ بس میں کہہ چکا۔ اب مجھے جانے دو۔

(وہ چہرہ غائب ہو جاتا ہے)

میکبتھ:۔ جو کچھ بھی ہو میں تیری اس ہدایت کا ممنون ہوا۔ جس بات سے میں خود ڈرتا تھا اُسے تُو نے خوب پہچانا۔ لیکن ایک بات اور بتا دے۔

پہلی جادوگرنی:۔ ہم اُسے کسی بات کا حکم نہیں دے سکتے۔ لو یہ دوسری صورت نمودار ہوئی جو پہلی سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔

(گرج ہوتی ہے۔ خُون میں لتھڑا ہوا ایک بچہ نظر آتا ہے۔)

دوسری صورت:۔ میکبتھ، میکبتھ، میکبتھ،

میکبتھ:۔ اگر میرے تین کان ہوتے تو بھی میں تیری بات سُن لیتا۔

دوسری صورت:۔ اے خُونی قاتل۔ بڑی ہمت والے جوانمرد، جانباز انسان کی طاقت پر تُو حقارت کی ہنسی ہنسا کر۔ کیونکہ کوئی آدمی جو عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے میکبتھ کو ضرر نہیں پہونچا سکتا۔

(صورت غائب ہو جاتی ہے)

میکبتھ:۔ ذرا ٹھہر۔ میکڈف جتنے دن چاہے زندہ رہے۔ مجھے اب اُس کا کیا ڈر۔ پھر بھی میں اس یقین کو پختہ کر لونگا۔ اور تقدیر کو اس امر میں ضامن بنانے کے لئے کہتا ہوں کہ میکڈف کو میں زندہ نہ چھوڑونگا۔ تاکہ اس زرد رُو خوف کی جو ہر وقت دل میں رہتا ہے تسکین کر دوں اور خواہ کتنی ہی کڑک اور گرج ہو میں آرام کی نیند سوتا رہوں۔

(گرج ہوتی ہے۔ تیسری صورت ظاہر ہوتی ہے۔)

(یہ صورت ایک بچے کی ہے جس کے سر پر تاج
رکھا ہے۔ اسکے ہاتھ میں ایک درخت ہے۔)
یہ صورت کس کی ہے جو ایک بادشاہ کے فرزند کی
شکل میں نمودار ہوئی ہے اور سر پر تاج رکھے ہے۔

سب جادوگرنیاں:۔ جو کچھ وہ کہے اُسے سُنو۔ خود کچھ نہ بولو۔

تیسری صورت:۔ شیر کی طرح دل مضبوط رکھ۔ بے پروا اور مغرور رہ۔ کسی طرح کی فکر یا حفاظت کی ضرورت نہیں۔ خواہ کوئی کچھ کہے۔ کیسا ہی غصہ اور طیش دلائے۔ تیرے خلاف خواہ کیسی ہی سازشیں ہوں مگر کوئی تجھے اُس وقت تک مغلوب نہ کر سکیگا۔ جب تک کہ برنام کا جنگل حرکت میں آکر ڈنسی نین کی پہاڑی پر تیرے مقابلے میں نہ آئیگا۔ (صورت غائب ہو جاتی ہے۔)

میکبتھ:۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کون ہے جو ایک جنگل کو نقل مکان پر مجبور کرے۔ اور جنگل کے درختوں کو حکم دے جن کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں کہ تم دوسری جگہ جاؤ۔ یہ فالیں سب نیک ہیں۔ میرے خلاف بغاوت اُس وقت تک سر نہ اُٹھا سکے گی جب تک کہ برنام کا جنگل اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ میکبتھ جس بلند درجے پر اس وقت ہے جب تک فطرت اُسے زندہ رکھے گی اسی درجے اور منزلت پر قائم رہے گا۔ اور اسی حالت میں اُس وقت تک جیئے گا جب تک کہ موت کا آنا اس کی قسمت میں لکھا ہوگا لیکن ایک بات ایسی ہے جس پر اب تک دل دھڑکتا ہے۔ بتاؤ، اگر بتانا ممکن ہو کہ کیا بینکو کی اولاد اس مُلک میں کبھی صاحبِ حکومت ہوگی؟

سب جادوگرنیاں:۔ بس اب زیادہ کچھ سوال نہ کرو۔

میکبتھ:۔ جب تک یہ نہ بتاؤ گی مجھے چین نصیب نہ ہوگا۔ اگر تم نے نہ بتایا تو خدا کا غضب تم پر نازل ہوگا۔ بس اتنا ہی مجھے اور پوچھنا ہے۔ ارے یہ دیگ کیسی زمین میں دھنسی جاتی ہے۔ یہ شور وغل کیسا ہے؟

(باجے بجتے ہیں)

پہلی جادوگرنی:۔ دکھا دو۔

دوسری جادوگرنی:۔ دکھا دو۔

تیسری جادوگرنی:۔ دکھا دو۔

سب ملکر:۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرو اور اس کے دل کو رنج پہونچاؤ۔ پرچھائیوں، آؤ اور اپنی صورت دکھا کر چلی جاؤ۔

(آٹھ بادشاہوں کی صورتیں نظر آتی ہیں
اور آخری صورت کے ہاتھ میں ایک آئینہ
ہے، بینکو کی روح پیچھے پیچھے آرہی ہے۔)

میکبتھ:۔ تو تو بینکو کی روح معلوم ہوتی ہے۔ دور ہو۔ یہ سروں کے تاج میری آنکھوں کو جلائے ڈالتے ہیں جس پیشانی پر تاج ہے اس کے بال پہلی صورت کی مثل ہیں۔ اور تیسری صورت پہلی صورت سے مُشابہ ہے۔ اری ناپاک جادوگرنیوں، چڑیلیوں تم نے مجھے یہ صورتیں کیوں دکھائی ہیں۔ لو چوتھی صورت بھی نظر آنے لگی۔ آنکھوں حلقوں سے نکل پڑو۔ کیا بادشاہوں کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ لو اور صورت نظر آئی۔ یہ ساتویں ہے۔ میں اب اور زیادہ کچھ نہ دیکھونگا۔ اس پر بھی آٹھویں صورت اور دکھائی دینے لگی۔ اس کے ہاتھ میں آئینہ ہے اور آئینہ میں یکے بعد دیگرے بہت سی صورتیں نظر آرہی ہیں۔ ان میں سے بعض کو دیکھتا ہوں کہ اُن کے ہاتھ میں دو دو کرُے اور تین تین عصاءِ سلطنت ہیں۔ یہ منظر

نہایت ہولناک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کُل باتیں صحیح نکلنے والی ہیں۔ کیونکہ خُون آلودہ بینکو میری طرف دیکھ دیکھکر مُسکراتا ہے اور اشارے سے بتاتا ہے کہ گویا یہ سب اُس کی اولاد ہیں۔ کیا واقعی یہی ہونے والا ہے ؟

پہلی جادوگرنی:۔ ہاں جناب واقعی یہی ہونے والا ہے۔ لیکن میکبتھ آپ اتنے خوفزدہ کیوں کھڑے ہیں؟ بہنو آؤ، ہم ان کا دل خوش کریں۔ اور ہم اپنی مسرت کا بہترین سازوسامان اُنکے سامنے پیش کریں۔ میں اپنا جادو ہوا پر چلاتی ہوں جس سے بڑی مُہیب آواز فضا میں پیدا ہوگی۔ اور تم سب ناچتی کُودتی چکر لگاتی رہو تاکہ بادشاہ وقت ہم پر مہربان ہوکر کہے کہ ہم سب نے اپنی خدمتیں بڑی خیر و خوبی سے ادا کیں۔ (ساز بجتے ہیں جادوگرنیاں رقص کرتی مع ہیکیٹی کے غائب ہوجاتی ہیں)

میکبتھ:۔ ارے تم کہاں گئیں۔ کیا سب غائب ہوگئیں۔ یہ بُرا دن تو وہ ہے جو جنتریوں میں نحس و ملعون لکھا جائے۔ ارے باہر کوئی ہے؟ اگر ہو تو اندر آئے۔

(لینکس اندر آتا ہے۔)

لینکس:۔ حضور کیا ارشاد ہے؟

میکبتھ:۔ کیا تم نے ان جادوگرنیوں کو جاتے دیکھا ہے؟

لینکس:۔ نہیں حضور۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔

میکبتھ:۔ کیا وہ تمہارے پاس سے نہیں گزریں؟

لینکس:۔ نہیں مطلق نہیں۔

میکبتھ:۔ کاش جس ہوا میں سے وہ گزریں وہاں وبا اپنا گزر کرے اور وہاں ان سب کو غارت کردے جو اُنکی باتوں پر یقین کریں۔ لینکس میں نے ابھی ابھی ایک گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سُنی تھی۔

لینکس:۔ حضور۔ ایک نہیں کئی آدمی خبر لائے ہیں کہ میکدف انگلستان بھاگ گیا ہے۔

میکبتھ:۔ کیا بھاگ کر انگلستان پہونچا ہے۔

لینکس:۔ حضور واقعہ صحیح ہے۔

میکبتھ:۔ اُس کے فرار ہونے کے قصد پر اُس وقت تک گرفت نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ اپنے عمل سے اپنے فرار ہونے کی غایت ثابت نہ کرے۔ اس وقت سے جو خیال پہلے دل میں آئیگا وہی میرا پہلا کام ہوگا۔ اور اپنے قصد کو عمل میں لانے کے لئے خیال کا آنا اور اُس پر عمل کا ہوجانا ایک بات ہوگی۔ میں میکدف کے قلعہ پر اچانک حملہ کرونگا۔ اُس کی ریاست پر اپنا قبضہ جماؤنگا۔ اُس کی بیوی بچّوں کو تلوار کی دھار سے کاٹ ڈالونگا اور اُن سب بدنصیبوں کو بھی تہ تیغ کرونگا جو اُس کی نسل سے ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اِسے کسی احمق کی ڈینگ نہ سمجھنا۔ جب تک انہیں غارت نہ کرونگا دل ٹھنڈا نہ ہوگا۔

دوسرا منظر:۔ مقام فائف۔

لیڈی میکدف اندر آتی ہے۔ اُسکا کمسن لڑکا ساتھ ہے۔ راس بھی موجود ہے۔

لیڈی میکدف:۔ اُس نے خطا کیا کی تھی کہ مُلک سے بھاگنا پڑا۔

راس:۔ خاتون آپ صبر کریں۔

لیڈی میکدف:۔ مگر میکدف نے تو صبر نہیں کیا۔ اُسکا بھاگنا تو ایک قسم کی دیوانگی سمجھنا چاہیئے۔ گو کسی دغا یا فریب سے ہمارے کان آشنا نہ ہوں۔ لیکن خوف وہ بدبلا ہے کہ بے گناہوں کو بھی دغاباز اور فریبی بنادیتا ہے۔

راس:۔ آپکو علم نہیں کہ اُسکا فرار ہونا ایک ہوشیاری کی بات ہے۔ خوف اُس کی وجہ نہیں۔

لیڈی میکدف:۔ واہ یہ بھی کیا عقل کی بات تھی کہ بیوی

بچوں کو تنہا چھوڑکر خود چلا گیا۔ اپنا سارا گھر بار وہیں چھوڑا جہاں سے خود فرار ہوا اُسے ہم سے محبت نہیں اُس کے دل کو وہ لگاؤ ہمارے ساتھ نہیں جو ایک قدرتی بات ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا پرندہ بھی جبکہ اُس کے آشیانے میں بچے ہوتے ہیں جب کوئی قریب آتا ہو تو وہ اُس سے لڑتا ہے۔ یہ محض خوف تھا جس کی وجہ سے وہ بھاگا ہے۔ عقل یا محبت کا اس میں شائبہ بھی نہیں۔ اِسکا فرار ہونا بالکل عقل و مصلحت کے خلاف تھا۔

راس:۔ میری نہایت عزیز بہن۔ اپنی طبیعت کو سنبھالے رکھو تمہارا شوہر نہایت عاقل و ہوشیار، موقع و محل کو پہچاننے والا ہے۔ اِس سے زیادہ میں کچھ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ زمانہ بُرا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہم نے کیا کیا جو ہم باغی و سرکش سمجھے جاتے ہیں۔ اِس افواہ کا ہمیں ضرور یقین ہے کہ ہماری حالت خوف و وہم کی ہو۔ ہمارا حال تو یہ ہو رہا ہے جیسے سمندر کی پُرشور اور طوفانی موجوں پر کوئی چیز اِدھر کی اُدھر ماری ماری پھرے۔ اِس وقت میں تم سے رُخصت چاہتا ہوں۔ چند روز کے بعد میں پھر یہاں آؤنگا۔ اُس وقت تک جو بُری حالت آجکل ہے یا تو یہ نہ رہے گی یا پھر پہلا سا زمانہ امن و سلامتی کا آجائیگا۔ پیاری بہن خدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

لیڈی میکدف:۔ یہ بچہ تو باپ کے ہوتے ساتے بن باپ کا ہو گیا۔

راس:۔ بہن تمہاری اِن باتوں سے تو مجھے رونا چلا آتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے سامنے رو کر میں اپنے کو کمزور ثابت کروں اور تمہارے دل کو بھی رنج پہونچاؤں۔ لوا میں جاتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

لیڈی میکدف:۔ (بیٹے سے) بیٹا تیرا باپ تو مرگیا۔ تو کیونکر جیئے گا۔

بیٹا:۔ امّاں اس طرح جیونگا جس طرح چڑیاں درختوں میں جیتی ہیں۔

لیڈی میکدف:۔ کیا کیڑے مکوڑے کھا کر جیئے گا۔

بیٹا:۔ جو چڑیوں کو کھانے کو ملتا ہو وہی کھا کر جیونگا۔

لیڈی میکدف:۔ خدا کرے کہ تجھے خوف نہ کسی جال کا ہو اور نہ پھندے کا۔

بیٹا:۔ امّاں مجھے اِن چیزوں کا ڈر کیوں ہو؟ غریب چڑیوں کو کون پکڑتا ہے۔ امّاں تم کہتی تو ہو کہ میرا باپ مرگیا مگر یہ بات نہیں ہے۔

لیڈی میکدف:۔ بیٹا تیرا باپ تو مرچکا۔ اب تو اپنا باپ بن۔

بیٹا:۔ میں اپنا باپ بنوں تو کیا آپ اپنی شوہر بنینگی؟

لیڈی میکدف:۔ بازار میں بیسیوں بکتے ہیں کہیں سے خرید لاؤنگی۔

بیٹا:۔ تو پھر کیا بیچنے کو اُسے خریدیں گی؟

لیڈی میکدف:۔ بیٹا۔ تو تو بڑی دل سے اُتار کر باتیں کرنے لگا ہے۔ اتنی سمجھ تیرے لئے بہت ہو۔

بیٹا:۔ کیوں امّاں۔ کیا میرا باپ بادشاہ سے باغی ہو گیا ہو؟

لیڈی میکدف:۔ ہاں یہ بالکل سچ ہے۔

بیٹا:۔ امّاں۔ باغی کسکو کہتے ہیں؟

لیڈی میکدف:۔ بیٹا۔ جو قسم کھاکر کسی بات کا وعدہ کرے اور پھر وعدہ خلافی کرے۔

بیٹا:۔ تو کیا جتنے باغی ہوتے ہیں وہ یہی کرتے ہیں؟

لیڈی میکدف:۔ کوئی جو ایسا کرے وہ باغی گنا جاتا ہو۔ اور بغاوت کی سزا پھانسی ہوتی ہے

بیٹا :- تو کیا جتنے آدمی قسمیں کھا کر وعدہ کرتے ہیں اور پھر وعدہ خلافی کرتے ہیں ان سب کو پھانسی دی جاتی ہے ؟

لیڈی میکڈف :- ہاں سب کو۔

بیٹا :- اُنہیں پھانسی کون دیتا ہے ؟

لیڈی میکڈف :- وہ لوگ جو ایماندار ہوتے ہیں — سچے ہوتے ہیں۔

بیٹا :- تو کیا قسمیں کھا کر وعدہ کرنے والے اور پھر وعدہ خلافی کرنے والے سب بیوقوف ہوتے ہیں۔ کیونکہ جھوٹوں کی تو وہ کثرت ہے کہ وہ سچوں کو مار کر بیٹھا کر دیں یا پھانسی پر چڑھا دیں۔

لیڈی میکڈف :- بچے خدا تجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ باپ نہ ہوگا تو خود اپنا باپ بن کر تو کیا کر لیگا۔

بیٹا :- اگر وہ مر گیا ہے تو تم اُس کے لئے روتی اور اگر نہ روئیں تو پھر میرے لئے ایک نیا باپ جلد موجود ہو جائیگا۔

لیڈی میکڈف :- اے چھوٹی سی جان، تو کیسی باتیں کرتا ہے۔

(ایک قاصد آتا ہے)

قاصد :- معزز خاتون۔ خدا آپکو اپنی امان میں رکھے۔ آپ مجھے نہیں جانتیں مگر میں حضور کے جاہ و منصب سے واقف ہوں۔ اِس میں مطلق شُبہ نہیں کہ آپکو عنقریب کوئی سخت خطرہ پیش آنے والا ہے۔ اگر آپ ایک سیدھے سادے آدمی کا مشورہ مانیں تو کوئی صورت ایسی پیدا کیجئے کہ آپ یہاں کسی کو نہ ملیں اور آپ اپنے بچوں سمیت یہاں سے چلی جائیں۔ آپ یہ تصور نہ کریں کہ محض ڈرانے کے لئے میں اپنے تئیں ایک وحشی نالائق ثابت کرنا چاہتا ہوں نہیں، جو ظلم و ستم آپ پر ٹوٹنے والا ہے وہ آپکے بہت قریب پہونچ گیا ہے۔ خُدا آپکو اپنی پناہ میں رکھے۔ میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ (چلا جاتا ہے)

لیڈی میکڈف :- بھاگ کر کہاں جاؤں۔ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہونچایا ہے مگر اب خیال آتا ہے کہ میں اُس خاکدانِ ہستی میں ہوں جہاں دوسروں کو نقصان پہونچانا قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے اور بھلائی کرنا بسا اوقات خطرناک ہوتا ہے۔ پھر ایک عورت کی طرح میرا اپنی حمایت میں یہ کہنا کہ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہونچایا ہے ایک افسوسناک بات ہے۔

(قاتل اندر آتے ہیں)

یہ کون لوگ ہیں ؟

پہلا قاتل :- تمہارا شوہر کہاں ہے ؟

لیڈی میکڈف :- خدا سے اُمید ہے کہ وہ ایسی جگہ نہ ہوگا جہاں تم جیسے خبیث اور ناپاک آدمی اُسے پا جائیں۔

پہلا قاتل :- وہ باغی ہے۔

بیٹا :- اے کن کٹے بدمعاش تو جھوٹ بولتا ہے۔

پہلا قاتل :- ارے تخم ذرا اتنا کہہ کر بچے کے چھُری مارتا ہے) جو ابھی دغا اور فریب کا پُورا پُودا بھی نہیں بنا ہے۔

بیٹا :- اماں اس نے مجھے مار ڈالا۔ (مر جاتا ہے)

(لیڈی میکڈف چیختی ہوئی کہ اُسے مار ڈالا، خون ہو گیا، بھاگتی ہے۔ قاتل اُس کے پیچھے دوڑتے ہیں)

تیسرا منظر :- انگلستان۔ شاہی قصر کے سامنے میلکم اور میکڈف آتے ہیں۔

میلکم :- آؤ کہیں سایئے میں بیٹھکر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں شاید رونے سے کچھ دل ہلکا ہو جائے۔

میکڈف :- نہیں، ہمیں اپنے غارت شدہ مُلک کی لاش پر بہادروں کی طرح دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ کوئی صبح ایسی نہیں ہوتی کہ رانڈوں کی چیخیں، یتیموں کی آہ و زاری

طرح طرح کے آزار و آلام کی صدائیں زمین سے اُٹھ کر آسمان پر نہ گونجتی ہوں کہ ہمارے مُلک والے کسی طرح جاگیں، اور آسمان پر بھی وہی آہ و فغاں پیدا ہو جو زمین پر ہے۔

میلکم :- جن باتوں کا یقین ہوتا ہے اُن پر رونا آتا ہے کیا کیا سُنوں اور کس کس بات کا یقین کروں۔ میں تو کسی مرض کی دوا نہیں۔ اور اگر وقت مساعد ہوا تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔ جو کچھ آپ نے بیان کیا ممکن ہو کہ وہ سب دُرست ہو۔ یہ ظالم و سفاک جس کا نام لیتے زبان پر چھالے پڑتے ہیں، جو پہلے کبھی ایماندار اور سچا آدمی سمجھا جاتا تھا اور جسے آپ بھی پسند کرتے تھے ابھی تک اُس نے آپکو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ میں تو جوان ناتجربہ کار ہوں۔ ممکن ہو اسی وجہ سے آپ فائدے میں رہیں اور یہ بات آپکی ہوشیاری اور ذہانت پر دلیل ہوگی کہ ایک معصوم بھیڑ کو ایک خبیث دیو پر جبکہ وہ حالتِ قہر و غضب میں ہو آپ قربانی کر ڈالیں۔

میکڈف :- میں مکّار یا فریب دینے والا آدمی نہیں ہوں۔

میلکم :- مگر میکبتھ سے فرمان حاصل کرکے تو ایک نیک اور اچھی طبیعت بھی بدل سکتی ہے۔ مجھے معاف فرمائیگا۔ جو کچھ آپ واقعی ہیں میں آپکو ویسا نہیں سمجھ سکتا۔ فرشتوں کی شکلیں بڑی نورانی اور تابندہ ہوتی ہیں، مگر ان میں بھی جو بڑی چمکتی اور پاکیزہ صورتیں رکھتے تھے عرش سے نیچے جہنّم میں گرائے گئے تھے۔ سچ ہے ہر چیز اپنا ظاہر اچھا دکھا کر نیکی اور معصومیت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

میکڈف :- افسوس میری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

میلکم :- غالباً آپکی اُمیدیں بھی وہیں غارت ہوئی ہیں جہاں میرے شکوک خاک میں مِل رہے ہیں۔ یہ تو فرمائیے کہ ایسے پُر آشوب زمانے میں آپ اپنے بیوی بچّوں کو تنہا چھوڑ کر، اور اُن پیاروں سے جو محبّت و اُلفت کی گرہ میں بندھے تھے، بغیر ملے کیسے چلے آئے۔ آپ سے التجا ہے کہ میرے ان شکوک کو آپ ہرگز اپنی توہین خیال نہ فرمائیں ان سے صرف اپنی ذاتی حفاظت منظور ہے۔ میرا خیال جیسا کچھ بھی ہو مگر جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسمیں کلام نہیں۔

میکڈف :- اے میرے مفلوک و مظلوم مُلک زخمی پڑا رہ۔ اور اپنے زخموں سے خُون بہنے دے اور جو کچھ جور و جفا تجھ پر ہو اُس کی بُنیادیں اور گہری کرے تاکہ کوئی بھلائی تیری خرابیوں کی ترقی میں مزاحم نہ ہو سکے۔ جسقدر ظلم و ستم تجھ پر ٹوٹیں اُنہیں سہے جا۔ میکبتھ کا استحقاقِ حکمرانی اور پختہ ہو گیا۔ آقا خدا حافظ۔ بندہ رُخصت چاہتا ہے۔ میں وہ خبیث مکّار نہیں ہوں جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ تمام مُلک اُس ظالم شیطان کے پنجۂ غضب میں ہے۔ اور اسپر طرّہ یہ ہے کہ بلادِ مشرق بھی اُسکی مدد پر تلے ہیں۔

میلکم :- آپ ناراض نہ ہوں جو کچھ میں نے عرض کیا وہ آپسے خائف یا بدگمان ہوکر نہیں کہا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ اس ظالم و جفاکار کے جُوئے کے نیچے دب کر مُلک مر رہا ہے۔ اُس کے لبوں پر آہ و فغاں اور اُس کے زخموں سے خُون جاری ہے۔ اور اُس کے اُن زخموں کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اُن پر اور چرکے دیئے جاتے ہیں۔ یہ کل باتیں مجھے معلوم ہیں۔ اور ممکن ہے کہ میری حق رسانی کے لئے کوئی ہاتھ اُٹھے۔ اِس مُلک کے لائق بادشاہ نے مجھے کئی ہزار فوج دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن باوجود اسکے جب میکبتھ کا سر میرے پاؤں کے نیچے ہوگا اور میری تلوار اُسکا سر تن سے جُدا کر چکی ہوگی، اُس وقت بھی

ہمارے مفلس اور آفت رسیدہ ملک کو اُنہی آفات و مصائب کا سامنا ہوگا جو سابق میں برپا ہو رہے ہیں۔ اُس کا بادشاہ جو کوئی بھی وہ ہوگا۔ اِس کے حق میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کرتا رہے گا۔

میکدف:۔ وہ بادشاہ کون ہوگا؟

میلکم:۔ اگر مجھی کو سمجھیے تو میں جانتا ہوں کہ مجھ میں کیسی کیسی سخت برائیاں موجود ہیں۔ اور جب وہ کھلیں گی تو آپ میرے مقابلے سیاہ رو میکبتھ کو بھی برف سے زیادہ اُجلا اور پاکیزہ کہیں گے۔ اور میرے عیوب کے مقابلے میں اُسے ایک بُز مسکین کی طرح معصوم و بے گناہ سمجھنے لگیں گے۔

میکدف:۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ شیاطین جہنم میں بھی کوئی شیطان میکبتھ سے برائیوں میں بڑھا ہوا نہ نکلے گا۔

میلکم:۔ میں جانتا ہوں کہ میکبتھ خون کا پیاسا عیش پرست، حریص، جھوٹا، مکار اور دغا باز ہے۔ مغلوب الغضب ہے، کینہ توز ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جو اُس نے نہ کیا ہو، لیکن مجھ میں ہوائے نفس اور شہوانیت اِس شدت سے ہے کہ اُس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اگر بادشاہ ہونیکی صورت میں کسی نے میری مرضی کے خلاف کچھ کیا تو پھر میری زیادتی اور ظلم کی کوئی حد نہ رہے گی۔ بہتر یہی ہوگا کہ ایسے شخص کی جگہ میکبتھ ہی صاحب تخت و تاج رہے۔

میکدف:۔ جس شخص میں شہوانیت اور لذت پرستی کی شدت ہو وہ فطرت میں ایک قسم کا ظلم ہوتا ہے۔ یہ وہ بلا ہے جس کی وجہ سے بہت سے تخت نشینوں کو اپنے تخت خالی کرنے پڑے ہیں اور اکثر تاجداروں پر زوال آیا ہے۔ مگر باوجود اسکے جو چیز آپکی ہے اُس کے لینے کے لئے آپ دوڑیں۔ لذائذ شہوانی سے آپ تخلیہ میں لطف اندوز ہوسکتے ہیں، یا ظاہر کرسکتے ہیں کہ ان چیزوں سے آپکی طبیعت سرد ہے۔ یا آپ یقین دلاسکتے ہیں کہ ان چیزوں میں آپ اعتدال پسند کرتے ہیں۔

میلکم:۔ علاوہ اِس کے میری خبیث طبیعت میں حرص مال و طمع زر اِس شدت سے ہے کہ اگر مجھے بادشاہی ملی تو میں اعیان ملک کو انکی زمینوں اور املاک پر دست تصرف دراز کرنے کے لئے قتل کرادونگا۔ کسی کے مال پر نظر رہے گی، کسی کی جائداد پر، اور جسقدر زیادہ مال لوگوں کا ضبط کرونگا اتنی ہی اشتہا اس بات کی تیز ہوتی جائے گی۔ اپنے خیرخواہوں اور جاں نثاروں کے ساتھ طرح طرح کے جھگڑے اور نزاع پیدا کرکے انکی دولت و مال پر تصرف کی غرض سے انہیں تباہ و برباد کرتا رہونگا۔

میکدف:۔ جوانی کے ولولے موسم بہار کی طرح دیرپا نہیں ہوتے۔ طمع زر اور حرص دولت البتہ طبیعت میں ہمیشہ کو جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ یہی زر و دولت کی طمع اکثر بادشاہوں کی موت کا سبب ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ہر چیز کی وہ کثرت ہے کہ جتنا اور جیسا آپ حاصل کرنا چاہینگے آپکو ملے گا۔ آپکی طبیعت میں بادشاہی کے وہ قدرتی جوہر موجود ہیں کہ یہ کل باتیں جو آپ اپنی نسبت فرما رہے ہیں گوارا کرلی جائیں گی۔

میلکم:۔ لیکن مجھ میں بادشاہ بننے کی قابلیتیں نہیں ہیں۔ مثلاً انصاف، حق پسندی، اعتدال، مستقل مزاجی، فیاضی، ثابت قدمی، ترحم، انکسار، التفات، درگزر، صبر، ہمت، ان خوبیوں کا مجھ میں پتہ نہیں، بلکہ ہر گناہ ہر مذموم فعل

کی مختلف شاخوں کو مختلف طریقوں سے انجام دینے میں میں
بڑا مشتاق ہوں۔ اگر کہیں میں صاحبِ حکومت ہوگیا تو یگانگی
و یکجہتی کی شرابِ شیریں کو جہنم میں پھینک کر دُنیا کا حفظ و
امن میں ایک شور بے ہنگام پیدا کر دونگا۔ اور دُنیا سے
موافقت و اتحاد قطعاً مفقود ہو جائیں گے۔

میکڈف:۔ اے بدنصیب وطن، بدنصیب مُلک۔

میلکم:۔ اگر مجھ جیسا شخص جیسے کہ میں نے اپنا حال بیان کیا ہے بادشاہی کرنے کے قابل آپکی سمجھ میں آتا ہو تو فرمایئے کہ میں تو وہی ہوں جیسا کہ میں نے بیان کیا۔

میکڈف:۔ ایسا شخص حکومت کرنے کے قابل تو کُجا وہ تو زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ افسوس اے مُصیبت زدہ قوم جس پر ایک غیر مُستحق شخص بادشاہِ سابق کو قتل کرکے مُسلّط ہوگیا ہو کیا تجھے کبھی اچھے دن دیکھنے نصیب ہونگے۔ جس حالت میں کہ تخت و تاج کا صحیح وارث خود اپنی زبان سے اپنے تئیں نالائق اور مجرم قرار دے رہا ہو اور اپنے خاندان اور اپنی نسل کو داغ لگا رہا ہے۔ آپکا باپ بادشاہوں میں ولی تھا۔ اور ملکہ آپکی ماں جس کے بطن سے آپ پیدا ہوئے ہیں کوئی دن زندگی کا ایسا نہ تھا کہ خدا کی جناب میں سربسجود نہ رہی ہوں۔ گویا زندگی میں ہر آن یہی سمجھتی رہیں کہ موت نزدیک ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ جو عیب آپنے اپنی طبیعت کے بیان کئے ہیں وہ مجھے وطن سے بے وطن کرتے ہیں۔ اور اس قلبِ مُضطر میں جس قدر توقعات پیدا ہوئی تھیں وہ سب خاک میں مل جاتی ہیں۔

میلکم:۔ تمہارے اس شریفانہ سچائی اور صفائی کے جذبے نے میرے دل کے تمام تاریک شکوک رفع کر دیئے۔ اور میرے خیالات تمہاری غیرت اور صدقِ طبیعت سے مُتفق ہوگئے۔ اس زمانے میں میکبتھ نے بہت سی تدبیریں کیں کہ مجھے کسی طرح اپنے دام میں پھنسائے۔ پس عقل نے ہوشیار کیا کہ کسی کی بات کا جلد یقین نہ کروں، لیکن اب خُدا جو ہم سب کے سر پر ہے جو کچھ مجھ میں اور تم میں پیش آئیگا اُس کا نگراں رہیگا۔ اور اب جو کچھ ہدایت کروگے اُس پر چلنا اپنا فرض سمجھونگا۔ میں نے اپنی جتنی بُرائیاں بیان کی ہیں وہ غلط تھیں اور جو داغ دھبے میں نے اپنے چلن اور طریقے پر لگائے تھے انہیں واپس لیتا ہوں۔ یہ جتنی باتیں میں نے اپنی نسبت کہی تھیں وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں۔ نہ مجھے ابھی تک کسی سے عشق ہوا ہے اور نہ میں نے کبھی اپنے عہد کو توڑا ہے۔ جو چیز میری تھی اس کی طمع بھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ آج تک کبھی اپنے قول سے پھرا نہیں۔ میں تو ایک شیطان کو بھی دوسرے شیطان کے حوالے دہوکا دیکر نہیں کرسکتا۔ اور نہ ایسے کسی کام پر خوش ہو سکتا ہوں۔ پہلا جھوٹ جو آج تک کبھی بولا تھا وہ یہی اپنی نسبت تھا۔ جو کچھ میں حقیقت میں ہوں وہ تمہارے اور اپنے مُصیبت زدہ مُلک کی بہتری چاہنے کے لئے ہوں۔ اور اسی مُلک میں تمہارے آنے سے کچھ پہلے سیورڈ دس ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہونے کو تیار ہو چکا ہے۔ اب ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں اور خدا سے اُمید رکھتے ہیں کہ ہمیں فتح بھی اسی طرح حاصل ہو جیسے کہ ہمارا نزاع حق بجانب ہے۔ تم خاموش کیوں ہو؟

میکڈف:۔ ایسی مُبارک اور نامُبارک باتوں نے ایکدم سے پیش ہو کر مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے۔ کیسے ان متضاد باتوں میں مصالحت پیدا کروں۔

(ایک طبیب آتا ہے)

میلکم:۔ اچھا اب پھر باتیں ہونگی۔ طبیب کیا بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں؟

طبیب:۔ جی ہاں۔ بہت سے سخت مریض اُنکے انتظار میں

بڑی دیر سے کھڑے ہیں۔ علاج کرنا طبیب کا کام ہوتا ہے لیکن ہمارے بادشاہ کے ہاتھ میں خدا نے کچھ ایسی شفا دے رکھی ہے کہ جہاں اُنھوں نے ہاتھ لگایا مریض فوراً تندرست ہو گیا۔

میلکم:۔ طبیب میں آپکا شکر گذار ہوا۔ (طبیب چلا جاتا ہے)

میکدف:۔ وہ کونسا مرض ہے جسکا بادشاہ علاج کرتا ہے؟

میلکم:۔ کنٹھ مالا ایک سخت بیماری ہے۔ بادشاہ کو اسکے علاج میں قدرت بدرجہ کمال حاصل ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں میں نے اکثر بادشاہ کو اس بیماری سے مریضوں کو اچھا کرتے دیکھا ہے۔ ہر مریض کے لئے پہلے خدا سے دُعا مانگتا ہے۔ وہ خود بڑا خدا رسیدہ ہے۔ دُور دُور سے لوگ سُوجے پھوڑے گردن کے گرد زخموں میں لدے ایسے آتے ہیں جنہیں دیکھا تک نہیں جاتا۔ اور بڑے بڑے جرّاح بھی جن کے علاج سے عاجز ہوتے ہیں بادشاہ کے پاس آتے ہی اچھے ہو جاتے ہیں۔ مریض کی گردن میں وہ ایک سونے کی مُہر لٹکا دیتا ہے اور لٹکاتے وقت خدا سے دُعا مانگتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہی علاج اُس نے آنے والے بادشاہوں کو بھی بتا دیا ہے اور آیندہ کے حالات بتانے کی قُدرت بھی خُدا کی طرف سے اُسے ملی تھی۔ علاوہ اس کے اور طرح طرح کی برکتیں اور حسنات اس کے تخت کے گردو پیش موجود رہتے تھے۔ جن سے بادشاہ کی نیکیاں ظاہر ہوتی تھیں۔

میکدف:۔ دیکھیے یہ کون آرہا ہے؟

میلکم:۔ آدمی تو ہمارا ہموطن معلوم ہوتا ہے مگر میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

(راس آتا ہے)

میکدف:۔ میرے شریف بھائی آؤ۔ تم نیک قدم ہو۔

میلکم:۔ اچھا۔ اب میں نے اِنہیں پہچانا۔ خدایا وہ چیز دور کردے جو ہموطن کو ہموطن سے اجنبی رکھتی ہے۔

راس:۔ آمین۔

میکدف:۔ کہو ہمارا مُلک وہیں ہے جہاں تھا؟

راس:۔ افسوس صد افسوس۔ اب تو وہ بد نصیب مُلک خود اپنے تئیں پہچاننے سے ڈرتا ہے۔ اب ہم اُسے اپنی ماں نہیں کہہ سکتے۔ اگر اپنی قبر کہیں تو زیبا ہے۔ جہاں ہر شخص کا یہ حال ہو کہ کچھ اپنی خبر تک نہ ہو، جہاں کوئی صورت بھی ایسی نہیں جس کے چہرے پر ہنسی ہو، جہاں فضا میں بجز نالہ وزاری یا درد و اذیت کی چیخوں کے دوسری آواز نہ سُنائی دیتی ہو اور سوائے اِن چیزوں کے دوسری چیز نہو، اور اب ان کی بھی کسی کو پروا نہ رہی ہو، اور حال یہ ہو گیا ہو کہ شدید رنج و الم میں بھی زخموں میں راحت سکون محسوس ہونے لگی ہو۔ مُردہ دفن ہوتے وقت گرجا کا گھنٹہ جب بجتا ہے تو کوئی اتنا پُوچھنے والا نہیں ہوتا کہ کون مرا ہے۔ اور شریفوں کی زندگی کا خاتمہ اُس وقت ہوتا ہے کہ اُن کی ٹوپیوں کے پھول مرنا تو کیسا مُرجھاتے تک نہیں۔ تو پھر ایسے مُلک کو اپنی قبر نہ کہیں تو کیا کہیں؟

میکدف:۔ اے عزیز! جو کچھ تم کہتے ہو سب سچ ہے۔

میلکم:۔ کوئی غمگین خبر جو حال میں پیش آئی ہو وہ کہو۔

راس:۔ حالت تو یہ ہے کہ واقعہ کے ایک گھنٹہ بعد بھی اگر کوئی بُری خبر سُنائی جاتی ہے تو سُننے والا کہتا ہے کہ کیسی پُرانی خبر سُناتے ہو۔ وہاں تو منٹ منٹ پر سخت درد انگیز حادثے پیش آتے رہتے ہیں۔

میکدف:۔ میری بیوی کیسی ہے؟

راس:۔ اچھی ہے۔

میکدف:۔ اور میرے بچے؟

راس :- وہ بھی سب اچھے ہیں۔

میکدف :- ظالم میکبتھ نے اب تک اُنکے امن و امان کو غارت نہیں کیا ؟

راس :- جب وہاں سے چلا ہوں تو سب صحیح سلامت تھے۔

میکدف :- دیکھو صحیح بات کہتے ہوئے نہ ہچکچاؤ۔

راس :- جب میں یہاں وہ خبریں لیکر آرہا تھا جو مجھ پر گراں گزر رہی تھیں تو اُس وقت افواہ سُنی تھی کہ بڑے بڑے لائق آدمیوں نے میکبتھ سے بغاوت کر دی ہے۔ اس خبر کا یقین اس وجہ سے اور ہوا کہ میں نے اس ظالم بادشاہ کی فوجوں کو بغاوت کو مٹانے کے لئے کوچ کرتے دیکھا۔ میلکم، اب وقت مدد کرنے کا ہے۔ آپکی ایک نگاہ میں ہزاروں سپاہ جمع ہو جائے گی عورتیں تک آجکل کی مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے سپاہی بن کر لڑنے کو تیار ہو جائینگی۔

میلکم :- ہم آپکے چین و آرام کیلئے وہیں جا رہے ہیں۔ مہربان بادشاہِ انگلستان نے ہمیں سیورڈ اور دس ہزار فوج مستعار دی ہے۔ سیورڈ سے زیادہ پرانا اور اعلیٰ درجے کا سپاہی عیسوی دُنیا میں نہیں ہے۔

راس :- کاش ایسا ہوتا کہ میں اس اچھی خبر کے بدلے میں کوئی خوشخبری سُناتا۔ مگر جو وحشتناک خبر میں سُنانے لایا ہوں وہ تو ایسی ہے کہ کسی صحرائے لق و دق میں اُس کا سُنانا بہتر ہوتا کسی انسان کے کان تک وہ نہ پہونچے۔

میکدف :- کیا وہ خبر کسی ملکی معاملے سے متعلق ہے یا کسی شخصِ خاص کے درد و الم سے ؟

راس :- ہمارے ملک میں تو کوئی نیک شخص ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی تکلیف، کوئی نہ کوئی آزار نہ پہونچا ہو۔

میکدف :- اگر وہ خبر مجھ سے متعلق ہے تو مجھ سے چھپاؤ نہیں۔ فوراً کہو کہ وہ کیا ہے۔

راس :- میری زبان سے اپنے کانوں کو متنفر نہ کرو جو کچھ میں کہونگا وہ ایسی درد انگیز آواز ہوگی جو تمہارے کانوں نے کبھی نہ سُنی ہوگی۔

میکدف :- اچھا میں سمجھ گیا۔

راس :- تمہارے محل پر اچانک حملہ کیا گیا اور بڑی بے رحمی سے تمہارے بیوی بچّوں کو قتل کر دیا گیا۔ جس طریقے سے انہیں ہلاک کیا گیا اور جس طرح ان معصوم غزالوں کو ذبح کیا اُس کا بیان کرنا تمہاری موت کا بلانا ہے۔

میلکم :- خُدا ہم پر رحم کرے۔ میکدف کیوں اپنی ٹوپی کھینچکر آنکھوں پر لاتے ہو ؟ رنج میں چُپ نہ رہو۔ مُنہ سے بولو، کیونکہ بات نہ کرنے سے رنج اندر ہی اندر دل سے کہتا ہے کہ ٹوٹ جا۔

میکدف :- کیا میرے بچّے بھی قتل کر دیئے گئے ؟

راس :- ہاں، بیوی بچّے، نوکر چاکر، جو کوئی بھی ملا اُسے زندہ نہیں چھوڑا۔

میکدف :- افسوس میں وہاں نہ تھا۔ میری بیوی بھی قتل کر دی گئی ؟

راس :- ہاں۔

میلکم :- میکدف صبر کرو۔ ہمیں انتقام کی تدبیریں سوچنے دو تاکہ تسکین اور اس درد کا کوئی درماں ہو۔

میکدف :- میکبتھ بچّے نہیں رکھتا۔ کیا میرے سب بچّے مار ڈالے گئے۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ وہ سب قتل ہو گئے۔ اے جہنم کے گِدھ، تو نے سبکو ایک ہی جھپٹے میں ختم کر دیا۔ میرے پیارے بچّوں اور اُنکی ماں کو بھی۔

میلکم :- میکدف مرد بن کر بات کرو۔

میکڈف: بہتر ہے۔ مگر ایک مرد ہی کی طرح میں اِس دردناک خبر سے متاثر بھی رہونگا۔ اِس وقت تو یہی یاد آرہا ہے کہ اُنسے عزیز تر دوسری کوئی چیز نہ رکھتا تھا۔ کیا خدا یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر بھی اُنکی جان نہ بچائی۔ اے گنہگار میکڈف اُن کی ہلاکت کا باعث تو ہوا۔ اُن کا کچھ قصور نہ تھا۔ جو کچھ قصور تھا وہ میرا تھا۔ خدا اُن پر اپنی رحمت کرے۔

میلکم: اس روح فرسا خبر کو اپنی تلوار کیلئے سان رکھنے کا پتھر بناؤ۔ اور اپنے اس رنج کو غصّے اور قہر میں تبدیل کرو۔ اِس غم کو سوچ سوچکر دل میں جذب نہ ہونے دو۔

میکڈف: نہیں۔ عورتوں کی طرح میں بھی اِس صدمے پر آنکھوں سے آنسو بہا سکتا ہوں اور اپنی زبان سے بہت کچھ نوحہ کر سکتا ہوں۔ پر اے خدائے رحیم وکریم اِس انتظار کے وقت کو کم کردے۔ اور اُس ظالم شیطان سے مجھے دوچار کرکے اُسے میری تلوار کی زد میں لے آ۔ اگر میرے ہاتھ سے وہ بچ جائے تو پھر خدا اُس کے گناہ بھی معاف کردے۔

میلکم: ہاں، یہ بات تم نے مردانگی کی کہی۔ آؤ بادشاہ کے پاس چلیں۔ فوجیں کوچ کرنے کو تیار ہیں۔ صرف بادشاہ سے رُخصت ہونا باقی ہے۔ میکبتھ کی حالت اب یہ ہے کہ ہم اُسے ہلاکر زیروزبر کردیں۔ آسمان پر فرشتے بھی ہمارے لئے ہتھیار باندھ رہے ہیں۔ میکڈف ہمت نہ ہارو۔ لمبی راتیں بھی جب نُور کا تڑکا ہوتا ہے تو انسان کے غمزدہ دل کو خوش کردیتی ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جُزوِ خامس

پہلا منظر: ڈنسی نین محل میں عقب کا ایک کمرہ۔ ایک طبیب اور اُسکے ہمراہ ایک شریف زادی خواص آتی ہے۔

طبیب: میں نے دو رات برابر آپکے ساتھ جاگ کر مریضہ کی کیفیت دیکھی ہے۔ مگر آپ نے جو حالت بیان کی تھی وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ فرمایئے کہ آپ نے مریضہ کو آخری مرتبہ کب چلتے پھرتے دیکھا تھا؟

شریف زادی: اُس زمانے میں جبکہ بادشاہ سلامت میدانِ جنگ کو تشریف لے گئے تھے۔ جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ ملکہ سلامت اپنی پلنگڑی پر سے اُٹھی ہیں۔ شب خوابی کی عبا جلد گلے میں ڈال الماری کے پاس پہونچتی ہیں۔ الماری کھول کر اُنھیں سے کاغذ نکالا، کاغذ کو موڑ کر اُس پر کچھ لکھا۔ پھر پڑھا۔ پھر اُسے بند کرکے لفافے پر مُہر لگائی۔ اور جب یہ سب کچھ ہولیا تو پھر فوراً اپنی پلنگڑی پر جالیٹیں۔ مگر اس کُل زمانے میں وہ غافل سورہی تھیں۔

طبیب: مگر یہ حالت تو قلب میں سخت اختلال و اضطراب کی ہوگی کہ حالتِ خواب میں جو راحت میسّر ہوتی ہے وہ بھی نصیب ہے اور عالمِ بیداری کے کام کاج بھی جاری ہیں۔ کیا آپ نے اس حالتِ خواب میں علاوہ چلنے پھرنے کام کاج کرنے کے کچھ باتیں کرتے بھی سُنا تھا؟

شریف زادی: جنابِ والا جو کچھ کہتے اُنہیں سُنا وہ ملکہ سلامت کی عدم موجودگی میں کسی کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔

طبیب:- لیکن آپ مجھے تو بتا سکتی ہیں۔ اور مناسب بھی یہی ہو کہ آپ مجھ سے جو کچھ سنا ہو وہ کہدیں۔

شریف زادی:- وہ باتیں نہ میں آپکو اور نہ کسی اور سے کہہ سکتی ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کہونگی اُسپر گواہی یا شہادت دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ لیجئے وہ ملکہ سلامت خود تشریف لا رہی ہیں۔

(لیڈی میکبتھ ہاتھ میں شمع لئے آتی ہے)

بس یہی وضع جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں ہمیشہ رہتی ہے۔ مگر وہ غافل سو رہی ہیں۔ اُدھر چھُپ کر کھڑے ہو جایئے اور غور سے دیکھتے رہیئے۔

طبیب:- یہ جلتی ہوئی شمع انہیں کیسے مل گئی۔

شریف زادی:- روشنی ہر وقت پاس رکھی جاتی ہے۔ یہی حکم ہے۔

طبیب:- دیکھیئے تو آنکھیں کھُلی ہیں۔

شریف زادی:- یہ بالکل درست ہے۔ لیکن وہ دیکھتی کچھ نہیں۔

طبیب:- یہ اس وقت کیا کر رہی ہیں۔ دیکھیئے تو اپنے ہاتھوں کو کس طرح بار بار ملتی ہیں۔

شریف زادی:- یہ تو کچھ عادت سی ہوگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ دھو رہی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ پاؤ پاؤ گھنٹے تک برابر یہی کرتی رہتی ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- ابھی یہ داغ موجود ہے۔

طبیب:- سُنو کچھ کہہ رہی ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ جو کچھ کہیں اُسے لکھ لوں۔ تاکہ آیندہ حافظے کو اس سے پوری مدد ملے۔

لیڈی میکبتھ:- ارے کمبخت داغ تو چھوٹتا کیوں نہیں مٹ جا۔ دُفعہ ہو۔ ایک، دو۔ اب تو اُس بات کا وقت آگیا۔ دوزخ، تجھ سے تو دم گھُٹا جاتا ہے۔ آقا، شرم و غیرت کیا ہوئی؟ سپاہی ہو کر ڈرتے ہو۔ ڈرنے کا کیا موقع ہے۔ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کس نے کیا جبکہ کوئی ہمارے اختیارات پر معترض نہیں ہو سکتا۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس بُڈھے میں اتنا خون ہوگا۔

طبیب:- سُنتی ہو کیا فرما رہی ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- امیر فائف کی ایک بیوی بھی تو تھی۔ وہ کہاں گئی۔ ارے کیا ہاتھوں کے یہ داغ دھبے کبھی نہ چھوٹینگے؟ جانے دیجئے آقا۔ ایسا خیال نہ کیجئے۔ آپکے اس طرح چونک چونک پڑنے ہی نے تو یہ ساری خرابی پیدا کی ہے۔

طبیب:- جاؤ بھی۔ تمہیں تو وہ سب حال معلوم ہے جو معلوم نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے تو ان کل باتوں کا یقین ہے۔ لیکن جو علم اُسے ہے وہ خدا ہی کو معلوم ہے۔

لیڈی میکبتھ:- سونگھو تو۔ ان داغوں میں سے تو خون کی بُو ابھی تک آ رہی ہے اور ایسی سخت ہے کہ عرب کے تمام عطریات بھی اُسے خوشبو نہیں بنا سکتے۔ ہائے ہائے۔

طبیب:- دیکھو تو اس آہ میں کیسا درد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دل پر کوئی بڑا بوجھ ہے۔

شریف زادی:- میں تو کبھی ایسا دل سینے میں رکھنا پسند نہ کرونگی جس سے جان، عزت و حُرمت سب ہی کو آزار پہونچے۔

طبیب:- ہاں ہاں، بالکل درست کہتی ہو۔

شریف زادی:- خدا ہی ہے کہ یہ مرض دُور ہو۔

طبیب:- اِس مرض کا علاج میرے قابو کی بات نہیں۔ ایسے مریض میں نے دیکھے ہیں جو حالت خواب میں چلتے پھرتے تھے۔ مگر جب موت آئی تو اپنے بستر پر سکون اور خاموشی کی حالت میں مرے۔

لیڈی میکبتھ:- ہاتھ دھولو۔ شب خوابی کی عبا پہنو۔ اِتنے زرد نہ معلوم ہو۔ پھر یہی کہتی ہوں کہ بینکو دفن ہوچکا ہے۔ وہ قبر سے باہر نہیں نکل سکتا۔

طبیب:- ظاہر ہے۔

لیڈی میکبتھ:- چلو سو رہیں۔ دروازہ کون کھٹ کھٹا رہا ہے؟ آؤ آؤ۔ ہاتھ میں ہاتھ دو۔ جو کچھ ہوا وہ اَن ہوا نہیں ہوسکتا۔ چلو سو رہیں۔ سو رہیں۔ (چلی جاتی ہے)

طبیب:- کیا یہ اب اپنے خوابگاہ میں جاکر سو رہینگی؟

شریف زادی:- ہاں فوراً۔

طبیب:- باہر بڑی بڑی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں اُڑ رہی ہیں۔ اِنسان جب اپنی فطرت کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے بعد بھی وہ خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں جو فطرت کے خلاف ہوتی ہیں طبیعتیں جو گناہوں میں آلودہ ہوچکی ہیں وہ اپنے دل کا پوشیدہ حال اُن بے جان اور بہرے تکیوں سے بھی کہتی ہیں جو سر کے نیچے ہوتے ہیں۔ ملکہ سلامت کو طبیب کی اتنی ضرورت نہیں ہے جس قدر کہ کسی روحانی ہادی و مُصلح کی وہ محتاج معلوم ہوتی ہیں۔ اے خُدا۔ تو ہم سب کے گناہوں کو معاف کر۔ ملکہ کی خبر رکھو۔ اسکی تکلیفوں کو دور کرنے کی کوشش میں رہو۔ اور برابر اُس پر نظر رکھو۔ اچھا شب بخیر۔ میں جاتا ہوں۔ ملکہ کا حال دیکھکر میرا دل ایسا پریشان اور میری نظر ایسی حیرت زدہ ہوئی کہ خیال سب کچھ کرسکتا ہوں مگر زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

شریف زادی:- اے نیک طبیب میرا سلام بھی قبول ہو۔

(چلی جاتی ہے)

دوسرا منظر:- ڈنسی نین کے قریب ایک موقع۔

منٹیتھ، کاینتھ نس، اینگس، لینکس، اور سپاہی دکھائی دیتے ہیں۔ طبل و عَلَم نظر آتے ہیں۔

منٹیتھ:- انگریزی فوجیں قریب آگئی ہیں اور وہ سب میلکم اور اُس کے نانا سیورڈ اور میکڈف کی سرکردگی میں ہیں۔ اور ان سب کے دلوں میں آتشِ انتقام مُشتعل ہے اور انتقام کی وجہ بھی ذاتی ہے۔ بس کشت و خون اس کثرت سے ہوگا کہ جو مر گئے ہیں وہ بھی لڑنے اور خون کرنے کو جی اُٹھیں گے۔

کاینتھ نس:- کیا خبر ہے کہ ڈونل بین بھی اپنے بھائی کے ساتھ آیا ہو۔

لینکس:- ڈونل بین یقینی اپنے بھائی میلکم کے ساتھ نہیں ہے۔ اُس کے کل ہمراہیوں کی فہرست میرے پاس موجود ہے۔ اس میں سیورڈ کا فرزند اور بہت سے لڑکے ہیں جنکے مُنہ پر ڈاڑھیاں تک نہیں نکلی ہیں، بالکل نوجوان ہیں۔ لڑائی کے شوق میں ساتھ ہوگئے ہیں۔

منٹیتھ:- کہو میکبتھ کس حال میں ہے؟

کاینتھ نس:- ڈنسی نین کا قلعہ اُس نے خوب مضبوط کرلیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ اور جنہیں اُس سے کم نفرت ہے اُن کا قول ہے کہ اُسکی کل حرکتیں محض غیظ و غضب کا ایک جوش و ولولہ ہیں۔ اور اس کا بھی اُنہیں یقین ہے کہ اُس کی اِس عداوت و مخاصمت کی کوئی وجہ بھی ایسی معقول نہیں ہے کہ اُس کے ساتھی اُس کا ساتھ دینے میں کسی قاعدے یا ضابطے سے مجبور ہوں۔

اینگس:- یہ تو فرمائیے کہ خفیہ قتل و خون کے جو داغ اُسکے ہاتھوں پر لگے ہیں اُن سے بھی وہ کچھ متاثر ہے یا نہیں۔ اسکے خلاف جو بغاوتیں ہو رہی ہیں اُنہی سے ظاہر ہے کہ

اس کی عہد شکنی پر سب اُسے مطعون کر رہے ہیں جن پر وہ حکم چلاتا ہے وہ دل سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ حکم کے پابند ہوتے ہیں۔ اب تو بادشاہی کرنا اُسے ایسا ہی ناز یبا و بدنما ہے جیسے ایک قوی ہیکل دیو کی پوشاک ایک پستہ قد سارق کے جسم پر ڈھیلی ڈھالی اور بدنما معلوم ہو۔

منٹیتھ:۔ اُسے الزام دینا مشکل ہے۔ جو کچھ قصور ہے وہ اس کے جنون و وحشت زدہ حواس کا ہے جو اُس سے دیوانگی کی حرکتیں سرزد کراتے ہیں، اور اس کے ذمہ دار اُس کے وہی گناہ ہیں جن کا خیال بار بار دل میں آ کر اُسے ستاتا ہے۔

کائیتھنس:۔ اچھا۔ اب ہم اُس کی اطاعت ترک کرتے ہیں اور اُس شخص کے مطیع ہو کر آگے بڑھتے ہیں، جو فی الحقیقت ہماری اطاعت گزاری کا مستحق ہے اور اپنے بیمار اور نیم جاں ملک اور وطن کی دوا کرتے ہیں۔ اور اُسے تندرست کرنے کے لئے اِس دوا میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ ملانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

لینکس:۔ ایک ایک قطرہ ہی نہیں بلکہ جس قدر خون اس درماں کے لئے درکار ہو سب بہانے کو تیار ہیں۔ تاکہ اِس گلشنِ شاہی کے پھول کو طراوت پہونچے اور اِس سے خس و خاشاک دُور ہوں۔ بس اب ہم برنام کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

دوسرا منظر۔ قلعہ ڈنسی نین میں قصر کا ایک کمرہ۔ میکبتھ، طبیب اور ملازمین آتے ہیں۔

میکبتھ:۔ بس اب کوئی خبر ہمارے پاس نہ لائی جائے۔ ان بدخواہوں کو بھاگ کر دشمن سے ملجانے دو۔ مجھے کوئی وجہِ خوف اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ برنام کا جنگل ڈنسی نین تک نہ پہونچ جائے۔ کیا یہ لڑکا میلکم عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا؟ چند روحوں نے جن پر ان کے کل حالات روشن ہوتے ہیں مجھ سے کہا ہے کہ "میکبتھ ڈر نہیں، کوئی شخص جو عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے تجھے گزند نہیں پہونچا سکتا"۔ بس اے میرے دغاباز سردارو، امیرو، تم جب چاہے بھاگ کر میرے دشمنوں یعنی اِن بسیار خوار انگریزوں سے جا ملو۔ میری طبیعت جو مجھ پر قابو رکھتی ہے اور جو دل سینے میں رکھتا ہوں اُس میں شک یا خوف کی کبھی گنجائش نہ ہوگی۔

(ایک نوکر آتا ہے)

شیطان تجھے اُلٹے قدم یہاں سے پلٹا دے۔ ارے زرد رُو احمق، یہ اُلو کی سی صورت تو نے کیوں بنائی ہے؟

نوکر:۔ دس ہزار سپاہ آ رہی ہے۔

میکبتھ:۔ ارے بے وقوف سپاہ نہ ہوگی۔ چیختی چلاتی بطخیں ہونگی۔

نوکر:۔ نہیں حضور، سپاہی ہیں۔

میکبتھ:۔ بدبخت جا کر اپنے چہرے کو زخمی کر کے اس سے خون نکال تاکہ زردی کی جگہ سُرخی پیدا ہو۔ ارے بزدل احمق بکتا کیا ہے؟ سپاہی کیسے، خوف سے تجھ پر تو وہ زردی کھنڈی ہے کہ تو مر کیوں نہیں جاتا۔ ارے خوفزدہ نامُراد بکتا کیا ہے۔ سپاہی کیسے۔ کیسے سپاہی؟

نوکر:۔ حضور انگریزی فوجیں آن پہونچی ہیں۔

میکبتھ:۔ دُور ہو خبیث۔ (نوکر چلا جاتا ہے)

ارے علمدار سیٹن تو سنتا ہے۔ یہ معرکہ جو پیش آنے والا ہے یا تو مجھے کرسئ حکومت پر مستقل یا تخت سے معزول کر دیگا۔ بہت دن جی لیا۔ اب تو بہارِ زندگی ختم ہو خزاں آ چلی ہے۔ ہرے پتے زرد ہو چلے ہیں جو چیزیں عالمِ ضعیفی میں ساتھ ہونی چاہیئے تھیں مثلاً عزت، محبت

دوسروں کی اطاعت، دوستوں اور بہی خواہوں کے گروہ، اب ان کا متوقع ہونا عبث ہے۔ ان کی جگہ لعنت و ملامت، وہ بھی بلند آواز سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا ہے۔ محض ظاہری طور پر لوگوں سے عزت کے جملے اپنی نسبت سنتا ہوں مگر وہ سب اس لئے ہوتے ہیں کہ اگر ہمت ہو تو ان کی نفی کر کے غریبوں کا دل خوش کر دیا جائے۔ ارے سیٹن سنتا ہے؟

(سیٹن اندر آتا ہے)

سیٹن:۔ حضور کیا حکم ہے؟

میکبتھ:۔ کہو کچھ اور خبر آئی؟

سیٹن:۔ جو خبریں اب تک سننے میں آئی ہیں وہ سب درست ہیں۔

میکبتھ:۔ تو پھر میں لڑونگا۔ اور لڑونگا بھی اس وقت تک کہ ہڈیوں پر سے گوشت قیمہ بنا کر کھرچ لیا جائے۔ زرہ بکتر مجھے دو۔

سیٹن:۔ حضور ابھی اسکی ضرورت نہیں۔

میکبتھ:۔ نہیں نہیں۔ ہتھیار زرہ بکتر ابھی لگانا چاہتا ہوں۔ کچھ سوار ادھر ادھر دشمن کا کھوج لگانے دوڑاؤ۔ جن کی زبان پر خوف کی کوئی علامت ہو انہیں فوراً پھانسی چڑھا دو۔ میرے ہتھیار زرہ بکتر مجھے دو۔ اے طبیب مریضہ کا کیا حال ہے؟

طبیب:۔ حضور مرض اتنا سخت نہیں ہے جس قدر کہ خیالات پریشان کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ نیند نہ آنے کی ہے۔

میکبتھ:۔ پھر اس کا علاج کر کے مریضہ کو تندرست کر دو۔ کیا کسی بیمار دماغ و طبیعت کا علاج نہیں کر سکتے؟ اگر کسی رنج نے طبیعت میں گھر کر لیا ہے تو حافظے سے اسکا تنقیہ کر دو۔ دماغ میں جو تکلیفیں اور اذیتیں نقش ہو چکی ہیں انہیں مٹا دو۔ مفرح دواؤں سے خفیہ طور پر اسکے قلب کو صاف کر دو جس میں خطرناک اور فاسد مواد نے جمع ہو کر دل پر ایک بوجھ پیدا کر دیا ہے۔

طبیب:۔ حضور یہ مرض تو ایسا ہے کہ خود مریض اپنا علاج کر سکتا ہے۔

میکبتھ:۔ پھر تو آپ اپنی دوا دارو، علاج معالجے سبکو کتوں کے سامنے ڈال دیں۔ میں کچھ علاج نہیں چاہتا۔ سیٹن ادھر آ۔ مجھے زرہ بکتر پہنا۔ اور میرا نیزہ مجھے دے۔ باہر کی خبر رکھ۔ طبیب تم سنتے ہو؟ ملک کے تمام امیروں اور سرداروں نے مجھ سے سرکشی اختیار کی ہے۔ ملکہ کے مرض کی تشخیص اچھی طرح کرو۔ اور بیماری دفع کر کے پھر اسے توانا و تندرست کر دو۔ پھر تمہاری تعریفوں میں میری آواز آسمان تک گونجیگی۔ اور جب آواز وہاں سے پلٹیگی تو بھی تمہاری تعریف اس سے بہتر ہوگی۔ مرض کو کسی طرح دور کر دو۔ راوند دوا سنا دوا غرض جو دوا مرض کو مٹا دے وہی دو۔ کاش یہ انگریز جلد یہاں سے چلے جائے۔ تم نے بھی کچھ ان کا حال سنا ہے؟

طبیب:۔ حضور کی تیاریاں دیکھکر کچھ معلوم تو ہوا ہے

میکبتھ:۔ ہاں یہیں سب چیزیں لے آؤ۔ میں غارتگری یا موت سے ڈرتا نہیں ہوں۔ جب تک مجھے کچھ خوف نہیں کہ کہ برنام کا جنگل ڈنسی نین تک نہ آ جائے۔

(سب چلے جاتے ہیں صرف طبیب رہ جاتا ہے)

طبیب:۔ کاش اس قلعہ سے میں صحیح سلامت نکل جاتا۔ اب کسی قسم کے فائدے کا خیال مجھے یہاں نہ لائے گا۔

(چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر:۔ ڈنسی نین کے قریب ایک میدان۔ سامنے جنگل کھڑا ہے۔ میلکم، ہٹیہ باپ سیورڈ

اور اُس کا فرزند، میکدف، منٹیتھ، کا ئیتھ نس

انگس، لینکس، راس، اور بہت سے سپاہی

آتے ہیں طبل و عَلم کے ساتھ کوچ کرتے نظر آتے ہیں۔

میلکم:۔ دوستو، عزیزو۔ وہ دن قریب آرہا ہے کہ لوگوں کے گھروں میں امن و عافیت کا دور دورہ ہو۔

منٹیتھ:۔ اس میں اب کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے۔

سیورڈ:۔ اس جنگل کا کیا نام ہے؟

منٹیتھ:۔ اسے برنام کا جنگل کہتے ہیں۔

میلکم:۔ ہر سپاہی درخت کی ایک ایک شاخ توڑ کر ہاتھ میں لے لے۔ اس سے لشکر کی پوری تعداد دشمن کو نہ معلوم ہو سکیگی۔ اور اگر اس کا کچھ اندازہ یہاں بھی کیا جائیگا تو اس میں غلطی ہوگی۔

سپاہی:۔ حضور ہم یہی کرتے ہیں۔

سیورڈ:۔ جہاں تک خبر ملی ہے یہی ہے کہ ظالم میکبتھ جسے اپنے اوپر بہت کچھ بھروسا ہے ابھی تک قلعہ ڈنسی نین میں ہے، اور وہ اس کے لئے تیار ہے کہ ہم قلعہ کا محاصرہ کریں۔ محصور ہو کر وہ ہمارا مقابلہ کریگا۔

میلکم:۔ اس کی تمام اُمیدوں کا حصر اسی پر ہے۔ کیونکہ جب بھی کوئی اچھا موقع اس کے فائدے کا آیا اس کے ساتھیوں نے اُس سے بغاوت کی۔ اور کوئی شخص بھی اس کے ساتھ اس وقت ایسا نہیں ہے جسے قطعاً مجبور ہو کر اُسکا ساتھ نہ دینا پڑا ہو۔ اور ان کے دل بھی اس سے پھرے ہیں۔

میکدف:۔ اپنی شکایتوں کو بدستور قائم رکھکر لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور بڑے جفاکش بہادر آزمودہ کار سپاہیوں کی طرح کام کرنا چاہیئے۔

سیورڈ:۔ لڑائی کے تصفیہ کا وقت قریب آرہا ہے۔ اُس وقت ہم کہیں گے کہ کہاں تک ہمیں فتح ہوئی اور کس حد تک شکست ہوئی۔ قیاسات تو محض ایسی توقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مشتبہ ہوتے ہیں۔ تلوار کے ہاتھ البتہ کہیں کہیں بتا دینگے کہ اس لڑائی کی اصلی و حقیقی وجہ کیا ہے۔

(سب مارچ کرتے چلے جاتے ہیں)

پانچواں منظر:۔ قلعہ ڈنسی نین میں میکبتھ۔

سیٹن اور سپاہی طبل و جھنڈے لئے آتے ہیں۔

میکبتھ:۔ باہر والی فصیل پر ہمارے جھنڈے اور پھریرے نصب کرو۔ غل یہی ہے کہ وہ آرہے ہیں۔ لیکن ہمارے اس قلعہ کے برج اور فصیلیں ایسی مستحکم و مضبوط ہیں کہ دشمن کے اس محاصرے پر وہ خندہ زن رہینگی۔ قلعہ کے گرد دشمن کی فوجیں پڑی رہیں حتیٰ کہ فاقے اور وبائیں اُن کا کام تمام کردیں۔ دشمن کی طاقت تو اُنہی لوگوں نے بڑھائی ہے جو کبھی ہمارا دم بھرتے تھے۔ ورنہ ہم دشمن سے کھلے میدان تیغ آزمائی کرتے۔ اور اُنہیں مار بھگا دیتے۔

(اندر سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے)

سیٹن یہ آواز کیسی ہے؟

سیٹن:۔ حضور عورتوں کے رونے کی آواز ہے۔

(باہر جاتا ہے)

میکبتھ:۔ مجھے تو اب خوف و بیم کا حس تک نہیں رہا۔ ایک زمانہ تھا کہ اگر رات کے وقت کسی کے چیخنے کی آواز سنتا تھا تو از سرتا قدم لرز جاتا تھا۔ اور جب کوئی خوف اور ہیبت کا قصہ سنتا تھا تو بدن کے تمام رونگٹے اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے کہ گویا اُن میں جان ہے لیکن اب تو خونی خیالات کے ساتھ خوف و خطر کی اتنی چیزیں مجھ میں بھر گئی ہیں کہ کسی بات پر بھی نہیں چونکتا۔

(سیٹن پھر اندر آتا ہے)

کہو وہ کس کی چیخ تھی؟

سیٹن:۔ حضور، ملکہ سلامت گزر گئیں۔

میکبتھ:۔ ایک نہ ایک دن تو موت آنی ہی تھی۔ امروز نے نہ فردا، پھر فردا، اور فردا، اور اسی طرح دن پر دن گزرتے جائینگے حتیٰ کہ موت کا مقررہ وقت آ پہونچیگا۔ اور دن گزر رہے ہیں وہ ہر احمق کو قبر کی خاک اور تاریکی تک پہنچانے کے لئے روشنی دکھاتے تھے۔ بجھ، بجھ، اے زندگی کی مختصر شمع گل ہو جا۔ یہ زندگی تو ایک چلتی پھرتی چھائیں ہے۔ اس تماشا گاہ میں ایک تماشاگر کی طرح م و غصہ کھا کر ایسی غائب ہوتی ہے کہ پھر نظر نہیں آتی۔ زندگی تو کسی بے وقوف کی کہی ہوئی کہانی ہے جس میں ت کچھ شور و شغب، رنج و غم ہے مگر حاصل کچھ نہیں۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے)

قاصد تو کچھ کہنے آیا ہے۔ بس جو کچھ کہنا ہے جلدی ہدے۔

قاصد:۔ حضور۔ مجھے صرف وہی کہنا ہے جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے۔

میکبتھ:۔ جو کچھ بھی ہو، منہ سے تو پھوٹ۔

قاصد:۔ حضور، میں پہاڑی پر کھڑا پہرا دے رہا تھا۔ برنام کی طرف میری نظر تھی کہ یکایک میں نے اس جنگل کو حرکت کرتے دیکھا۔

میکبتھ:۔ جھوٹے، کاذب، غلام، کیا بکتا ہے؟

قاصد:۔ حضور کا عتاب میرے سر آنکھوں پر، مگر واقعہ یہی ہے جو عرض کیا۔ تین میل سے حضور دیکھ سکتے کہ برنام کا جنگل اس طرف جنبش میں ہے۔ سارا جنگل چلتے درختوں کا ایک جھنڈ سا معلوم ہو رہا ہے۔

میکبتھ:۔ اگر تو جھوٹا نکلا تو پاس سے پاس درخت پر تجھے زندہ لٹکا دونگا تاکہ فاقوں سے سوکھکر تیرا دم نکل جائے۔ اور اگر تو سچا ہے تو پھر اگر تو میرے ساتھ ایسا ہی کرے گا تو مجھے مطلق پروا نہ ہوگی۔ اب تو ہمت ٹوٹ سی چلی ہے۔ اُن جادوگرنیوں نے کہا تھا کہ جب تک برنام کا جنگل ڈنسی نین تک نہ آئے موت سے نہ ڈر۔ اُس وقت ان کے کہنے کا یقین آ گیا تھا مگر اب تو اس میں شبہ معلوم ہوتا ہے۔ برنام کا جنگل تو اب ڈنسی نین کی طرف آ رہا ہے۔ ہتیار لگاؤ۔ ہتیار لگاؤ۔ یہاں سے چلو۔ اگر یہ قاصد جو کچھ کہتا ہے وہ سچ ہے تو پھر یہاں سے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اب تو میں اپنی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ کُل کائنات درہم برہم ہو جاتے اور میں بھی اُسی میں دب کر مروں۔ فوراً گجر بجاؤ۔ طوفانو اُٹھو۔ غارتگری تو اپنا کمال دکھا۔ کم سے کم ہم ہتیار باندھے تو مریں۔ (سب چلے جاتے ہیں)

چھٹا منظر:۔ ڈنسی نین۔ طبل و علم لئے آدمی قلعہ کے سامنے آتے ہیں۔ میلکم، سیورڈ۔ میکڈف وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ان کا لشکر ساتھ ہی ہر سپاہی کے ہاتھ میں درخت کی ایک ایک شاخ ہے۔

میلکم:۔ اب ہم کافی طور پر قلعہ کے پاس آ گئے ہیں۔ سپاہیو۔ اپنے ہاتھوں کا بوجھ پھینک کر دشمن پر اپنی پوری تعداد ظاہر کر دو۔ سیورڈ مع اپنے بہادر اور شریف فرزند کے پہلا حملہ شروع کرتا ہے۔ باقی جو کچھ ہونے والا ہو اُسے ہم اور میکڈف اپنے اپنے درجے کے مطابق دیکھ لینگے۔

سیورڈ:۔ اچھا خدا حافظ۔ آج شب کو ہم اس ظالم کی قوت کا اندازہ کرکے اس سے تیغ آزمائی کرتے ہیں اگر کچھ نہ

کر سکے تو پھر شکست میں کلام نہیں۔

میکڈف:- جس قدر نفیر ساتھ ہیں ایکدم پھونکے جائیں۔ اور یہی چیزیں خون اور موت کی پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

(چلے جاتے ہیں۔)

ساتواں منظر:- میدانِ جنگ کا ایک موقع۔

گجر بج رہے ہیں۔ میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ:- مجھے تو دشمنوں نے گویا ایک ستون سے باندھ دیا ہے۔ کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ بہرکیف ایک خرس وحشی کی طرح مجھے تو لڑنا ہے۔ وہ کون ہے جو عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا؟ سوائے ایسے شخص کے مجھے کسی دوسرے کا خوف نہیں۔

سیورڈ:- تمہارا کیا نام ہے؟

میکبتھ:- سنکر ڈر جاؤ گے۔

سیورڈ کا فرزند:- نہیں نام بتاؤ۔ ہمیں پروا نہیں چاہے وہ جلتی ہوئی چیزوں میں دوزخ ہی سے تپتا ہوا کیوں نہ نکلا ہو۔

میکبتھ:- سنو۔ میرا نام میکبتھ ہے۔

سیورڈ کا فرزند:- اس سے زیادہ قابلِ نفرین نام تو شیطان کی زبان پر بھی نہیں آسکتا۔

میکبتھ:- یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس سے زیادہ ہیبت ناک نام تو شیطان بھی نہ لے سکتا تھا۔

سیورڈ کا فرزند:- اے خونی ظالم تو جھوٹا ہے اور اس تلوار سے تیرا جھوٹ کھولے دیتا ہوں۔

(دونوں لڑتے ہیں اور سیورڈ کا فرزند مارا جاتا ہے)

میکبتھ:- عورت کا جنا تھا نا۔ میں تو اُن لوگوں کی تلواروں پر ہنستا اور اُن لوگوں کو نظرِ تحقیر سے دیکھتا ہوں جو عورت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ (چلا جاتا ہے۔)

(گجر بجتے ہیں۔ میکڈف آتا ہے۔)

میکڈف:- غل اُدھر ہو رہا تھا۔ اے جہنمی ظالم، سامنے آکر اپنی صورت دکھا۔ اگر تو مارا گیا مگر میری تلوار سے قتل نہ ہوا تو میرے بیوی بچوں کا خون بھوت بن کر مجھے لپٹیگا۔ میں غریب اُجرت لیکر لڑنے والوں کو نہیں مارنا چاہتا۔ میکبتھ یا تو تو میرے مقابل آ۔ ورنہ میں اپنی تلوار بغیر اس کی دھار کو کُند کئے نیام میں رکھے لیتا ہوں۔ جہاں اس وقت شور ہو رہا ہے وہیں وہ ملے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا بہادر مارا گیا ہے۔ مجھے تو میکبتھ کی تلاش ہے۔ بس تقدیر! اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔

(چلے جاتے ہیں۔ گجر بج رہے ہیں۔)

(میلکم اور بڈھا سیورڈ آتا ہے۔)

سیورڈ:- میلکم! آپ ادھر آئیں۔ قلعہ آہستہ آہستہ فتح ہو رہا ہے۔ میکبتھ کے آدمی دونوں طرف سے لڑتے ہیں۔ کچھ ہماری طرف ہو گئے ہیں اور کچھ اُس کی طرف ہیں۔ شریف والیانِ ملک بڑی جوانمردی سے دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ آج کا دن ہماری فتح کا ہے۔ اور اب کچھ زیادہ کام باقی نہیں ہے۔

میلکم:- لڑائی میں فریقِ مخالف کے لوگ بھی ہمارا ساتھ دیکر لڑائی میں مصروف ہیں۔

سیورڈ:- آپ قلعہ میں داخل ہوں۔

(چلے جاتے ہیں۔ گجر بجتے ہیں۔)

آٹھواں منظر:- میدانِ جنگ کا دوسرا حصہ۔

میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ:- میں خود کیوں ایک رومانی بے وقوف کی طرح تلوار مار کر خودکشی کروں۔ جب تک کہ آدمی میری تلوار سے

قتل ہونے کیلئے موجود ہوں۔

(میکدف آتا ہے۔)

میکدف:۔ اے دوزخ کے خونی کتے۔ سامنے آ۔ سامنے۔

میکبتھ:۔ میں تجھ سے ہمیشہ بچتا رہا ہوں۔ لیکن اب تو بھی آ۔ سامنے آ۔ میرے سر پر تیرے بیوی بچوں کا خون سوار ہے۔

میکدف:۔ میں منہ سے بولنا نہیں چاہتا۔ اس وقت تلوار میری زبان ہے۔ اے خونی خبیث، زبان کا یارا نہیں کہ تجھے کوئی نام دے سکے۔ (دونوں لڑتے ہیں۔)

میکبتھ:۔ بے فائدہ محنت کرتا ہے۔ مجھ پر تلوار چلا کر زخمی کرنے کا قصد ایسا ہی بے سود ہے جیسے ہوا کو تلوار سے زخمی کرنا۔ تلوار ان پر چلا جو مغلوب ہو سکیں۔ میری جان تو ایک طلسم نے محفوظ کر رکھی ہے۔ اور کوئی اسے نہیں لے سکتا بجز اس کے جو عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا ہو۔

میکدف:۔ لعنت ہو تجھ پر۔ اپنی جان اور اس کے طلسم کی طرف سے مایوس ہو جا۔ شیطان جس کا تو ہمیشہ سے تابع رہا ہے وہی تجھے بتائیگا کہ میکدف عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا بلکہ شگاف دیکر رحم مادر سے قبل از وقت دنیا میں لایا گیا تھا۔

میکبتھ:۔ لعنت ہو اس زبان پر جس نے مجھے یہ بتایا تھا۔ کیونکہ اب میری ساری جوانمردی اور دلیری، بزدلی میں منتقل ہوئی جاتی ہے۔ ان شعبدہ باز چڑیلوں کا اب کوئی یقین نہ کرے جو ایک ہی بات کو دو دو مطلبوں سے کہتی ہیں۔ اور جب ان کے پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو ان وعدوں کو وہ توڑ دیتی ہیں۔ میکدف اب میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔

میکدف:۔ تو پھر اے نامراد بزدل ہار مان اور دنیا کی نظروں میں ایک عجیب تماشا بنکر زندہ رہ۔ اور ہم تجھے ایک پنجرے میں بند کر کے اس طرح رکھیں گے جس طرح ایک وحشی درندے کو رکھا جاتا ہے اور پنجرے پر ایک رنگین تختی لگا کر اس پر لکھیں گے کہ "جسے ایک ظالم و سفاک خونی کو دیکھنا ہو وہ اسے دیکھے۔"

میکبتھ:۔ میں ہار ہرگز نہ مانونگا۔ اس لئے زندہ نہ رہونگا کہ میلکم کے قدم چوما کروں، اور اس کے ہوا خواہوں کے منہ سے لعنت ملامت سنا کروں۔ چاہے برنام کا جنگل ڈنسی نین ہی تک کیوں نہ آ جائے اور تو جو عورت کے بطن سے نہیں ہے میرے مقابل ہو مگر میں تلوار سے آخری آزمائش کرونگا۔ لے میں اپنی سپر سے اپنے تئیں ڈھکے لیتا ہوں۔ میکدف اب تلوار چلا۔ اور لعنت ہو اس پر جو کہے کہ "بس کر۔"

(لڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ گجر بجتے ہیں۔)

(بھاگڑ، باجوں کی آواز، طبل و علم کے ساتھ میلکم، بڈھا سیورڈ، راس، لینکس، اینگس، کاتھنس اور بہت سے سپاہی آتے ہیں۔)

میلکم:۔ خدا سے چاہتا ہوں کہ جو دوست اس وقت نظر نہیں آتے وہ زندہ سلامت یہاں تک آ جائیں۔

سیورڈ:۔ بعض ان میں ضرور کام آئے ہونگے پھر بھی معلوم ہو رہا ہے کہ فتح ہمکو بہت کم نقصان کے ساتھ نصیب ہوگئی ہے۔

میلکم:۔ میکدف اور آپکا فرزند نظر نہیں آتا۔

راس:۔ سیورڈ آپکے فرزند نے سپاہی کا قرضہ ادا کر دیا۔ (یعنی وہ کام آگیا) اور آخری دم تک بڑی جوانمردی سے لڑتا رہا۔

سیورڈ:۔ تو کیا وہ لڑائی میں مارا گیا؟

راس:۔ حضور، ہاں۔ اس کی لاش ہم لڑائی کے میدان سے

اُٹھائے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے فرزند کا غم اس کی خوبیوں اور اوصاف کے حساب سے کیا تو پھر آپ کے غم کی انتہا نہ ہوگی۔

سیورڈ:۔ زخم سامنے آنے تھے یا پُشت کی طرف؟

راس:۔ حضور زخم سب سامنے کے رُخ تھے۔

سیورڈ:۔ تو پھر وہ خُدا کا سپاہی تھا اور خدا ہی کے ساتھ وہ رہگیا۔ اگر میرے اتنے فرزند ہوتے جتنے کہ سر پر بال ہیں تب بھی اس سے بہتر موت میں ان کے لئے نہیں چاہ سکتا تھا۔ غرض اس طرح اس کی موت کا گھنٹہ بج چُکا۔

میلکم:۔ نہیں۔ میدانِ جنگ میں کام آنا اُسے کہیں زیادہ تعزیت کا مستحق کرتا ہے۔ میں اسکا پورا انتظام کرونگا۔

سیورڈ:۔ نہیں۔ لڑائی میں اسکا مارا جانا کافی داد کہا جاتا ہے کہ وہ جوانمردی کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور اس طرح دُنیا میں جینے کا حساب اُس نے بے باق کیا۔ بس وہ خدا کی حضوری امن وسلامتی کے ساتھ زندہ وشاد ہے۔ اور دیکھو یہ اور اچھی خبر آ رہی ہے۔

(میکڈف میکبتھ کا کٹا ہوا سر ہاتھ میں لئے آتا ہے)

میکڈف:۔ مُبارک ہو میلکم، اب آپ بادشاہ ہیں۔ مُبارک ہو۔ دیکھئے اس ظالم وسفاک کا سر نیزے پر ہے، اور اب خلقت ایک جفاکار کے ظلم وستم سے آزاد ہوئی۔ اِس وقت سلطنت کے بڑے بڑے دریشہوار حضور کے گرد حلقہ کئے ہیں۔ جن کے دلوں میں حضور کی وہی ثنا وصفت ہے جو میری زبان پر ہے۔ اور میں دلی مسرّت کے ساتھ بآوازِ بلند کہتا ہوں کہ اے بادشاہ تجھے تخت مُبارک ہو۔

میلکم:۔ ہمیں انتظار میں زیادہ وقت صرف کرنا منظور نہیں۔ حاضرین کو ان کی محبت اور قدردانی کا صلہ دیکر اظہارِ خوشنودی و احسانمندی کرکے اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ اے میرے عزیزو اور مُلک کے رئیسو، میں آپ کو "نواب" کا خطاب دیتا ہوں، اور یہ عزت سب سے پہلے آپکو اس مُلک کی سلطنت میں عطا کی جاتی ہے اور مزید لُطف وکرم جو منظور ہوگا وہ آیندہ عمل میں آئیگا۔ مثلاً جو لوگ میکبتھ کے ظلم وستم اور اس کے دغا وفریب سے بچنے کیلئے مُلک چھوڑ کر چلے گئے ہیں وہ پھر وطن میں واپس بلائے جائیں اور اس ظالم قصائی اور شیطان ملکہ کے جس قدر کارکُن ہیں وہ حاضر کئے جائیں، اِس ملکہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاک کیا۔ غرض یہ اور کُل ایسے ہی امور جو خُدا کے فضل وکرم سے ہمارے لئے ضروری ہونگے وہ اپنے اپنے طریقے وقت اور مقام کا لحاظ کرکے ہم انجام دینگے۔ بس ہم سبکے اور ہر شخص کے فرداً فرداً منت گزار ہیں اور سبکو اپنی تاجپوشی کے جلسے میں جو شہرِ اسکون میں ہوگا مدعو کرتے ہیں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

ختم شُد

عنایت اللہ دہلوی

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
ہوتے ہوتے درد سہنے دیجئے
دیجئے اپنی اجازت دیکھ لیں
حالِ دل چاہے نہ کہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
خونِ دل آنکھوں سے بہنے دیجئے
لطف آ جائے گا سننے تو سہی
داستاں اپنی ہی کہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
بے بسی سے اشک بہنے دیجئے
ہم علاجِ درد کے قائل نہیں
داستانِ درد کہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
بحرِ بے پایاں میں بہنے دیجئے
منہ میں جو آیا کہا اب آہ کر بھی
دردِ دل آنکھوں سے کہنے دیجئے

امین حزیں سیالکوٹی

یادِ ایامِ عشرتِ فانی

میری کالج کی زندگی

یہ دلی ہے۔ یہ دلی کا ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اور یہ دلی کا پرانا رہنے والا فرحت اللہ بیگ ہے۔ بہت دنوں کے بعد دہلی آیا ہوں۔ خداوندانِ ریڈیو نے اپنی عنایت سے مجھے آپ کو مخاطب کرنے کا موقعہ دیا۔ مگر غضب یہ کیا کہ تقریر کے لئے صرف پندرہ ہی منٹ دیئے۔ اس لئے میرے مضمون کے حق میں رمضان کی عید گویا بقرعید ہوئی۔ آخر یہ سوجھی کہ سری پائے الگ کر کے صرف دھڑ کا کچھ حصہ ملاحظہ میں گذران دوں۔ مضمون ایسا لیتا ہوں کہ جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ اور مرتے دم تک رہیگی۔ اور اُس زمانہ کے واقعات بیان کرتا ہوں جب دہلی ہماری تھی اور ہم دہلی کے تھے۔

یہ کچھ انسانی فطرت ہے کہ ہر شخص اپنے زمانہ طالبعلمی کو اچھا سمجھتا ہے۔ میں بھی اسی فطرتِ انسانی سے مجبور ہوں۔ اور آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ کالج کی زندگی کا جو مزا ہمارے زمانہ میں تھا۔ وہ اب نہیں رہا۔ پڑھائی، لکھائی پہلے بھی ہوتی تھی۔ اور اب بھی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے ایک جماعت میں گنتی کے چند طالبعلم ہوتے تھے۔ اور اب پڑھنے والوں کی زیادتی مدرسہ اور کالج کے بڑے بڑے کمروں کو سکیڑ کر چھوٹا کر دیتی ہے۔ پہلے مدرسہ اور کالج میں اتنے طالبعلم ہوتے تھے کہ اُستاد اور پروفیسر نہ صرف ان کی ترقی تعلیم کو دیکھ سکتے تھے بلکہ انکے ساتھ میل جول رکھ کر ان کے عادات و اطوار کو بھی درست کر سکتے تھے۔ اور اب؟ اب طالبعلم اور اُستاد دیسے بیگانے ہوگئے ہیں کہ انکا ایک دوسرے کے پاس سے گزرنا ہی مشکل ہے اور خدانخواستہ پاس سے گزر بھی جائیں تو انکے ٹکرا جانے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔

میں نے مشن کالج دہلی میں تعلیم پائی ہے۔ پہلے اس کالج کے پرنسپل مسٹر رائٹ تھے۔ مگر خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ باوجود بے انتہا شریف اور ہمدرد شخص ہونے کے دہلی والے ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اُنہوں نے اس کالج اور خاصکر کالج کے فیلڈ کے لئے جو کچھ کیا وہ مشن کالج کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ان کا انتقال کچھ ایک دفعہ ہی ہوگیا اور ان کی جگہ مسٹر ہیبرٹ دیر پرنسپل ہوئے۔ اور مسٹر ڈے انگریزی کے پروفیسر ہو کر ولایت سے آئے۔ اگر کسی کو دیکھنا ہو کہ ہم ہندوستانی محبت کے کتنے بھوکے ہیں تو وہ مسٹر ڈے کے حالات دیکھے۔ راستے کے بچے جنہوں نے شاید انکی شکل بھی پوری طرح نہ دیکھی ہوگی۔ ان کے نام کو اس طرح جوشِ دلی سے لیتے تھے گویا مسٹر ڈے اُن کے بڑے پُرانے دوست ہیں۔ جو انگریز اِن دہلی کے بچوں کے سامنے سے گزرا اور مسٹر ڈے ہوگیا۔ ان کو پڑھانے میں کوئی خاص مہارت نہ تھی۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کی محبت اور ان کا برتاؤ لڑکوں کو خود شوق سے پڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور اِس کا وہ نتیجہ ہوتا تھا کہ شاید اچھے سے اچھا پروفیسر بھی وہ نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ حضرات۔ محبت کی مار بڑی سخت مار ہوتی ہے۔ جو کام محبت سے نکل سکتا ہے وہ سر مغزنی سے نہیں نکل سکتا۔

مسٹر ڈے میں دوسری خاص قوت تقریر کی تھی۔ وہ اپنے زورِ بیان سے اپنے دلی منشا کو دلوں میں اُتار دیتے تھے۔ ان کو اپنی ں قوت پر ناز بھی تھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ میں (Orator) ہوں (Speaker) نہیں ہوں۔ اور کیوں نہ ہوں ر میں آئرلینڈ کا رہنے والا ہوں۔

مسٹر ڈے کی تیسری خصوصیت اُن کا شوقِ تعلیم جسمانی تھا۔ وہ کیمرج کے مشہور کھلاڑی تھے۔ کرکٹ، فٹ بال، کشتی رانی ض بہت کھیلوں میں انعام پا چکے تھے۔ وہ ہم کو بھی اپنا ہی جیسا بنانا چاہتے تھے۔ کوئی کھیل نہ ہوگا جس میں وہ شریک نہ وتے ہوں۔ ان کے جوش کا یہ حال تھا کہ ریل میں کالج کی ٹیم کہیں میچ کھیلنے جا رہی ہے۔ کسی بڑے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری۔ وہ ٹ بال لیکر اُترے اور پلیٹ فارم ہی پر کھیل شروع کر دیا۔ مسافر ہیں کہ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ نئے مسافروں کو گاڑی ں جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ سودا بیچنے والے پریشان ہیں۔ گارڈ سٹیوں پر سیٹیاں بجا رہا ہے۔ لیکن یہاں برابر دنا دن ہو رہی ہے۔ لج کے کمروں میں مسٹر ڈے ضرور پروفیسر بنے رہتے تھے۔ اور بڑا رعب داب دکھاتے تھے۔ مگر فیلڈ میں آنے اور اس طرح ں گھل گئے گویا وہ بھی ایک طالبعلم ہیں۔ وہ کپتان کی اتنی عزت کرتے تھے کہ کوئی لڑکا بھی کیا کرے گا۔

ہمارے کالج کے پرنسپل مسٹر ہیبرٹ ویر تھے۔ یقین مانئے کہ ان سے سب کا دم نکلتا تھا۔ وہ زبان سے نہیں پڑھاتے تھے آنکھوں سے پڑھاتے تھے۔ آپ سمجھے کہ آنکھوں سے پڑھانے کا کیا مطلب ہے۔ حضرات۔ وہ حضرت مسمریزم جانتے تھے۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ خدا کی پناہ۔ جہاں کسی دن کوئی تیار ہو کر نہیں آیا اور انھوں نے ذرا گھورا۔ بس سمجھ لیجئے کہ س لڑکے کا تو خاتمہ بالخیر ہوگیا۔ اس کے بعد مجال نہ تھی کہ وہ صاحب آیندہ تیار ہوئے بغیر کمرہ میں قدم رکھیں۔

ہے یہ۔ کہ عام طور پر انسان کا وزن دو۔ پونے دو من ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لمبان اور چوڑان کے لحاظ ے اس وزن کی تقسیم انسانی جسم میں مختلف طریقہ سے ہو جاتی ہے۔ بعض چوڑے ہوتے ہیں تو لمبان کم ہو جاتی ہے۔ اور بعض لمبے ہوتے ہیں تو چوڑان گھٹ جاتی ہے۔ چونکہ مسٹر ہیبرٹ ویر کی چوڑان کچھ تھی ہی نہیں۔ اس لئے اندازہ کر لیجئے کہ ان کی لمبان کیا ہوگی۔ تمام دُنیا میں پیدل پھر آئے تھے۔ اور ہے بھی یہ۔ کہ اتنی لمبی ٹانگیں ہونے پر دُنیا کا چکر کاٹ نا کیا بڑی بات ہے۔ ایک دفعہ اُن کی تیز رفتاری سے ہم بھی مار کھا چکے ہیں۔ ہوا یہ۔ کہ ہماری فال سٹاف سوسائٹی ں (Meeting) ہوئی۔ قرار پایا تغلق آباد چلو۔ سوسائٹی کے سارے ممبر ایک دن پہلے ہی چل دیئے۔ رہ گئے کون کہ یں اور مسٹر غلام یزدانی (یہ وہی حضرت ہیں جو حیدر آباد کے ناظم آثارِ قدیمہ ہیں۔ اور اپنے فن کے ماہر مانے جاتے ہیں) وہاں۔ ہم دونوں میں ٹھیری کہ رات کے تین بجے نکل چلو۔ صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچ جائیں گے۔ وہاں ناشتہ کریں گے۔ ہاں سے نکل کر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹہ میں تغلق آباد پہنچ جانا کیا بڑی بات ہے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سردی اس بلا کی پڑ رہی تھی کہ خدا کی پناہ مگر ہم اُس زمانہ میں دہلی والے تھے۔ اس سردی کو بھلا کب خاطر میں لاتے۔ دلّی سے نکلے اور رات کے تین ہی بجے نکلے۔ موٹے موٹے اوور کوٹ پہنے۔ کانوں سے گلوبند لپیٹے۔ کوٹ کی جیبوں میں چبینا بھرا۔ اور چل میرے بھیّا قطب کو۔ شہر میں تو کچھ ایسی سردی معلوم نہیں ہوئی۔ مگر اجمیری دروازے سے نکل کر مزا آ گیا۔ کان تو خیر چھپے ہوتے تھے۔ پہاڑ گنج سے نکلتے نکلتے ناک غائب ہوگئی۔ وہاں سے ذرا سرپٹ بھاگے۔ اور خدا خدا کرکے منصور کے مقبرے

پہنچ گئے مقبرے کے سامنے گاڑیبان گاڑیاں کھولے الاؤ جلائے مزے سے بیٹھے حقے اُڑا رہے تھے۔ ہم دونوں بھی انہی میں دھنس گئے ان لوگوں کے اصرار سے حقے کے دو چار دم لگائے۔ جب کہیں جا کر ذرا سر دی دبی۔ ابھی آدھا راستہ باقی تھا۔ اور صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچنا تھا۔ اس لئے پھر اُٹھے اور جیسا اُڑاتے آگے بڑھے۔ کچھ کچھ صبح ہو رہی تھی، کہ قطب کی لاٹ کے پاس پہنچ گئے، یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھی ابھی آرام خاص میں ہیں طبیعت گرمائی ہوئی تھی۔ صلاح ہوئی کہ بڑھے چلو اور سب سے پہلے تغلق آباد پہنچ جاؤ۔ یہ خیال آنا تھا کہ اسپر عمل ہونے لگا۔ کوئی ساڑھے سات بجے ہوں گے کہ ہم دونوں نے یہ مہم بھی سر کر لی۔ نو بجے کے قریب ہمارے سب ساتھی بھی آ گئے۔ سہ پہر تک سب تغلق کی قبر پر اُدھم مچاتے رہے۔ کوئی چار بجے ہوں گے کہ مسٹر ہیبرٹ ویر نے کہا کہ مجھے آج ۶ بجے ایک ضروری کام ہے۔ میں تو جاتا ہوں۔ کوئی میرے ساتھ چل سکتا ہے۔ اس فقرے میں لفظ "سکتا" بہت طعن کا لفظ تھا۔ ہم دونوں کیا دبنے والے تھے۔ ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ اُس اللہ کے بندہ نے قلعہ سے نکلتے ہی جو لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے تو میرا اور میاں غلام یزدانی کا ناستا رہ گیا۔ ہم دونوں بھاگتے تھے مگر وہ حضرت ہم سے دو چار قدم آگے ہی رہتے تھے۔ پسینہ ناک سے ٹپکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں جواب دے گئے۔ آخر بھاگتے دوڑتے اُچھلتے کودتے کالکاجی تک آ ہی گئے۔ یہاں صاحب نے فرمایا "میں جانتا ہوں تمہاری وجہ سے میری منزل کھوٹی ہوئی ہے اب تک تو میں دہلی کے قریب پہنچ چکا ہوتا"۔ ہم نے کہا "بسم اللہ کیجئے۔ اب ہم میں چلنے کا دم نہیں ہے"۔ وہ تو یہ کہہ روانہ ہوئے اور ہم نے کنوئیں کے پاس آ کر ادور کوٹ اُتارے۔ پانی پیا۔ ذرا دم لیا۔ جب کہیں جا کر اوسان درست ہوئے۔

ہمارے فارسی کے پروفیسر مولوی شاہجہاں تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے۔ فارسی بہت اچھی تھی۔ پڑھاتے بہت اچھی طرح تھے۔ لیکن تھے "دہلی والے" جانتے تھے کہ ان لوگوں کو ذرا شہ دی اور یہ چڑھتے گئے۔ محبت کرتے تھے اور سب کو اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر کسی کو حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ اُس زمانے میں شیشے پر پھول پتے بنانے کا شوق مجھے ہوا۔ شیشے پر میں نے ایک تصویر بنائی تھی۔ وہ ان کو بہت پسند آئی۔ کہنے لگے "فرحت ہم کو بھی کوئی چیز بنا کر لادے۔ تیری یادگار رہے گی۔ مگر بھئی تصویر نہ بنانا۔ کوئی شعر لکھ دینا۔" دوسرے یا تیسرے دن میں ایک گلاس بنا کر لے گیا۔ اُسپر حافظ کا یہ شعر لکھا تھا ؎

مئے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ ؛ ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

مولوی صاحب نے گلاس دیکھا۔ بہت پسند کیا۔ اس کے بعد جو شعر پڑھا۔ تو بس بگڑ ہی تو گئے۔ کہنے لگے "واہ میاں صاحبزادے اپنے دادا کے برابر اُستاد کی اچھی قدر کی ہے۔ میرے لئے تجھے یہ شعر لکھتے شرم نہیں آئی۔ ذرا مجھ ستر برس کے بڈھے کو دیکھ اور اس شعر کو دیکھ۔ صاحب بہادروں کی صحبت میں رہ کر یہ نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا......" اور کیا کیا کہا۔ بس یہ نہ پوچھو۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے یہ شعر لکھ دیا تھا۔ مولوی صاحب کی باتیں سُنکر جب غور کیا تو اُس وقت معلوم ہوا کہ لاحول ولا قوۃ کیا بیہودگی ہوئی ہے۔

میں بی۔ اے کے ابتدائی سال میں تھا کہ "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" یعنی مشن کالج میں ایک ایسا شخص آیا جسپر نہ صرف

مشن کالج بلکہ تمام ہندوستان کو فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ کون کہ ریورنڈ سی۔ ایف۔ اینڈ روز۔ انھوں نے آتے ہی کالج کا رنگ ہی بدل دیا۔ اور بتا دیا کہ دُنیا میں خود داری بھی ایک چیز ہے۔

ان کے زمانے کے اتنے واقعات ہیں کہ اگر میں کہنے بیٹھوں تو دنوں میں ختم نہ ہوں۔ وقت کم ہے اس لئے ایک واقعہ سُن لیجئے۔ ہوا یہ کہ ہم لاہور جا رہے تھے۔ دوسرے روز یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں کرکٹ میچ کھیلنا تھا۔ مسٹر اینڈ روز بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمارے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہم نے زبردستی انکو سیکنڈ کلاس میں بٹھایا تاکہ ہماری آزادی میں کھنڈت نہ پڑے۔ انٹر کی صرف ایک ہی گاڑی تھی۔ ساری کی ساری پر ہم ۱۳۔۱۴ لڑکوں نے قبضہ کرلیا۔ خوب پھیل پھیل کر بیٹھے۔ ایک درجے میں ہم ۳ لڑکے تھے۔ میں۔ بلند اقبال اور حسین مرزا۔ کوئی ایک بجے رات کو گاڑی بھٹنڈہ پہنچی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ انگریزی باجہ بج رہا ہے۔ اور ایک زبردست برات سوار ہوئے کو پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ بلند اقبال نے حسین مرزا سے کہا "مرزا ذرا دروازہ روک کر کھڑے ہو جاؤ۔ کسی کو آنے نہ دینا" چونکہ ہمارا ہی درجہ بالکل سامنے تھا۔ اس لئے اسی پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سخت حملہ ہوا۔ مگر حسین مرزا کیا ماننے والی آسامی تھا۔ اُس نے دروازے کو اینچ بھر نہ کھلنے دیا۔ اسی کشمکش میں کسی نے اسکو گالی دیدی۔ گالی کا دینا تھا کہ حسین مرزا فلانچ مار بھوکے شیر کی طرح اُس گالی دینے والے پر جا پڑا۔ اس کا اس طرح گرنا اور سب لڑکوں کا درجے کھول کھول کر کے باہر نکلنا! خوب چلی۔ مگر لڑکوں کے مقابلے میں بھلا یہ برات والے کیا ٹک سکتے تھے آخر بھاگے اور "ملا کی دوڑ مسیت" پر عمل کرکے اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے۔ وہ صاحب بہادر چند سپاہیوں کو لیکر گاڑی کی طرف آئے اور آتے ہی گڑبڑ مچادی۔ پولیس والوں کو حکم دیا کہ سب لڑکوں کو گاڑی سے اُتار دو۔ اِدھر پولیس والوں سے ہماری چل رہی تھی اُدھر مسٹر اینڈ روز گاڑی سے اُترے۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے آئے۔ اسٹیشن ماسٹر کے گلے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا اور کہا "چلے جاؤ یہ میری ٹیم ہے" اسٹیشن ماسٹر صاحب چکرائے کہ یہ کون حضرت ہیں۔ جو مجھ وردی پہنے ہوئے افیسر سے بھی اس گستاخی کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ انھوں نے ذرا پیچھے ہٹ کر بلند اقبال سے پوچھا جب انکو معلوم ہوا کہ یہ مسٹر اینڈ روز ہیں تو وہ اپنے سپاہیوں کو لے رخصت ہوتے۔ وہ تو اُدھر گئے اور اِدھر مسٹر اینڈ روز نے پلیٹ فارم پر غصّہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ وہ ٹہل ہی رہے تھے کہ ایک بڑے میاں نے مجھ سے آکر کہا "میاں ہمارے پاس انٹر کے ٹکٹ ہیں۔ ہم تھرڈ میں بیٹھ جاتے ہیں دولھا کو اپنے پاس انٹر میں بٹھالو" میں نے کہا "کیا ہرج ہے۔ ہماری تمہاری خدانخواستہ کوئی لڑائی تھوڑی ہے۔ زبردستی اس وقت بات بڑھ گئی" اُن بڑے میاں نے دولھا میاں کو بلا ہمارے درجہ میں بٹھا دیا۔ ہم نے بھی اس کے لئے اپنا پورا بنچ خالی کردیا، دولھا میاں کو وہاں بیٹھے کچھ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ مسٹر اینڈ روز ٹہلتے ہوتے ہمارے درجہ کی طرف آئے جُھک کر کیا دیکھتے ہیں کہ دولھا میاں نہایت ٹھاٹھ سے ایک بنچ پر بلا شرکت غیرے قابض۔ ہنسکر ذرا اُونچی آواز میں کہا "شریروں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ گاڑی چلنے کے بعد تم اس کی گندی کر دگے" شادی والوں میں بعض لوگ انگریزی جانتے تھے۔ وہ ...ے سر ہوگئے کہ دولھا کو اُتار دو۔ ہم نے بہت سمجھایا۔ مسٹر اینڈ روز نے بھی ہماری تائید کی اور کہا کہ لڑکے کو

بیٹھا رہنے دو۔ میں نے صرف اس وجہ سے دخل دیا تھا کہ ہیڈ ماسٹر اپنا زور دکھانے آیا تھا۔ اگر سیدھی طرح کہتا تو میں خود جگہ دلا دیتا۔ مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ آخر دولو کو ہمارے درجہ سے اُتار کر تھرڈ کلاس میں ٹھونس دیا۔

مسٹر اینڈرروز کی ہمیشہ سے یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کی خودداری کو صدمہ پہنچایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے دل عہدہ داروں سے صاف نہیں رہتے۔ اگر ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے تو ہندوستان امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ وہ اب سیاسیات میں پڑ گئے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا نقطۂ نظر اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر ہندوستانی ان سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ کرے گا۔

مسٹر اینڈرروز کا پڑھانا غضب کا پڑھانا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ بہہ رہا ہے۔ ٹینی سن کی "اِن میموریم" کا پڑھانا ان کے ذمہ تھا۔ ان کی پڑھائی کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کتاب کے شروع میں ایک صفحہ کی جو افتتاحی نظم ہے اس کو انھوں نے سو دن میں پورا کیا تھا۔ تصوف اور وجدانیت کے اصول بیان کر کے۔ اور حضرت امام غزالی، ابن عربی، مولانا روم اور گیتا کے حوالے دے کر جب وہ ان کا مقابلہ ٹینی سن کے مصرعوں سے کرتے تھے۔ تو آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ان کی واقفیت عامہ کس قدر ہے اور ٹینی سن نے کس محنت سے ان چیزوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اور کس خوبی سے اپنی کتاب میں داخل کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ان باتوں میں ابھی یورپ والے ہم ایشیا والوں سے کتنے پیچھے اور ہمارے کس قدر خوشہ چیں ہیں۔ اس طرح پڑھاتے ہوئے میں نے دو ہی شخصوں کو دیکھا ہے۔ ایک مسٹر اینڈرروز اور دوسرے مولوی نذیر احمد مرحوم۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ وہ حماسہ، معلقات اور متنبی کے ہر شعر کے ساتھ یورپ کے مختلف ادیبوں کے مقولے بیان کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ دیکھو اس مضمون کو یورپ والوں نے ہم سے لے کر اس طرح ادا کیا ہے۔ ان دونوں کا پڑھانا صرف امتحان پاس کرانے کے لئے نہیں تھا۔ عالم بنانے کے لئے تھا۔ اور ان سے پڑھنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان دونوں کی عزت انکی علمیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی وجہ سے۔

الغرض ہمارے تین طرح کے پروفیسر تھے۔ مسٹر ہیبرٹ وہ کہتے تھے کہ دماغی ترقی کرنے کے لئے "پڑھو۔ پڑھو۔ اور پڑھو"۔ مسٹر ڈ... کہتے تھے کہ جسمانی ترقی کے لئے "کھیلو۔ کھیلو۔ اور کھیلو"۔ اور مسٹر اینڈرروز فرماتے تھے کہ اپنی عزت قائم کرنے کے لئے "لڑو۔ لڑو۔ اور لڑو"۔

غرض کہاں تک سناؤں وقت کم اور داستان بڑی ہے اس لئے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک پڑھانے والے پڑھنے والوں سے محبت کا برتاؤ نہ کریں گے جب تک انکی خودداری کو قائم نہ کریں گے جب تک ان کے اطوار و عادات کا خیال نہ رکھیں گے۔ اور انکی جسمانی ترقی کو بھی تعلیم کا ایک جزو نہ سمجھیں گے اسوقت تک کبھی یہ نہ کہا جائیگا کہ انھوں نے اپنے فرض کو پوری طرح انجام دیا۔ اور جب تک پڑھنے والے ان پڑھانے والوں کی محبت کی قدر نہ کرینگے۔ جب تک اپنی دماغی تعلیم کے ساتھ اپنی صحت جسمانی کا خیال نہ رکھیں گے اور جبتک یہ نہ سمجھیں گے کہ خودداری بھی ایک بڑا جوہر انسانی ہے اسوقت تک نہ دنیا میں کبھی انکی قدر ہوگی اور نہ یہ کہا جاسکے گا کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

(باجازت اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب دلّی ریڈیو اسٹیشن دہلی)

بی ہمسائی

بحسن خلق توان کرد صید اہل نظر ؛ بہ بند و دانہ نہ گیرند مرغ دانا را

یہ وہی بی ہمسائی ہیں جنہوں نے مولوی افراسیاب بیگ کے ہاں بدیع الزماں اور ان کی بیوی کی کیمیلی بدلنے کی خبر پہنچائی تھی جس دن سے سرتاج بانو بدیع الزماں کے ہاں بیاہی آئی تھی اور شادی کے موقع پر بی ہمسائی کی بات تک بھی نہ پوچھی گئی تھی۔ اسی دن سے بی ہمسائی خفا ہو گئی تھیں اور زیادہ خفگی کا باعث انکے بے تکے چال چلن ہوئے تھے۔ یہاں نری بی ہمسائی ہی نفرت کرنے والی نہ تھیں بلکہ سارا محلہ خفا سا ہو گیا تھا۔ یہ زیادہ تران لوگوں کی بے پردگی کی وجہ تھی۔ محلہ میں جو لوگ آباد تھے وہ غیر تعلیم یافتہ تھے۔ اور پرانے رسم و رواج کے پابند تھے۔ ان کی نظر میں بے پردگی۔ چوری اور دوسرے بے حیائی کے کاموں سے بھی زیادہ ناقابلِ معافی گناہ تھا۔ خیر ہم کو اس سے کیا غرض۔ ہم کو تو بی ہمسائی کا قصہ کہنا ہے۔ بی ہمسائی کے مکان کی ایک طرف کی دیوار بدیع الزماں کے مکان سے ملحق تھی۔ کوٹھے پر سے دیوار پر کھڑے ہو کر ان کے مکان کا اچھا خاصہ حصہ نظر آتا تھا۔ بی ہمسائی کے گھر میں چار آدمی تھے اور ایک شیر خوار بچہ۔ دو میاں بیوی۔ اور ماں بہن۔ میاں چھتریوں کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ دکان نئی سڑک پر تھی۔ روزانہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ کما لیتے تھے۔ اس میں گھر کا خرچ بمشکل چلتا تھا۔ مکان اور دکان کا کرایہ نکلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ بی ہمسائی پہلے تو بدیع الزماں کے گھر میں آیا جایا کرتی تھیں۔ اور دیوار پر کھڑے ہو کر بھی بات چیت کرتی تھیں۔ مگر وحید الزماں کی شادی کے بعد سے انہوں نے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ یہ کبھی ان کی پیسے دھیلے کی شرمندہ نہ تھیں۔ ہاں حصہ بقدر حسبِ حیثیت دونوں طرف سے جاری تھا۔ اب بھی کبھی وہ دیوار پر کھڑی ہو جاتی تھیں اور ان کے گھر میں جھانکتی تھیں اور برے برے منہ بنایا کرتی تھیں اور بڑبڑاتی جاتی تھیں۔ خصوصاً سرتاج بانو پر جب نظر پڑتی تھی تو بہت چراغ پا ہوتی تھیں۔ مگر ادھر سے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا تھا اور انکی بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بی ہمسائی حسبِ معمول دیوار پر کھڑی گھریاں گھونٹ رہی تھیں۔ ان کی پشت پر جو دیوار تھی اس پر بندر آن بیٹھا۔ جب انہوں نے ادھر منہ اٹھا کر دیکھا تو اس کمبخت نے دانت نکال کر خیں کی اور ان کی طرف بھپکا۔ بی ہمسائی کے تو آتے اوسان جاتے رہے۔ بے تحاشا زینہ کی طرف بھاگی پاؤں میں ایک برکے پائنچہ کا پاجامہ تھا وہ الجھا اور یہ دھڑام سے ساری سیڑھیوں پر سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا پڑیں۔ سر دہلیز سے ٹکرا کر پھوٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ انھوں نے ہائے ویلا کا شور مچایا۔ رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ گھر والے دوڑے اور ان کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے گئے۔ لیجا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ علاج معالجہ کی فکر کی۔ مگر ان کا رونا پیٹنا نہ تھمنا تھا نہ تھما۔ اتنا پیٹیں کہ باہر گلی والے جمع ہو گئے۔ یہ کہہ کہہ کر روتی تھیں۔ "ہائے میں مر گئی۔ میرا دم نکل گیا میرا سر پھوٹ گیا۔ ہائے کوئی خدا کا بندہ جا کر ننھے کے باپ کو خبر کر دے۔ مرتے وقت میری صورت تو دیکھ لیں"۔ ایک لڑکے نے باہر سے جو یہ سنا تو یہ سمجھا کہ واقعی بی ہمسائی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان کے میاں کی دکان جانتا تھا۔ سرپٹ ادھر دوڑ پڑا۔

اب یہاں کا قصہ یہاں چھوڑیئے اور سرتاج بانو کی طرف متوجہ ہو جیئے۔ جب سرتاج بانو نے یہ غل غپاڑہ سنا تو بے چین



خواجہ عبدالمجید (دہلوی)



بہزاد لکھنوی

Calcutta Art Press Delhi

ئی۔ ماما سے کہا کہ جلدی جا اور بی ہمسائی کی خبر لا۔ اس نے آکر کہا۔ ہمسائی کوٹھے پر سے گر پڑی ہیں اُن کا سر پھٹ گیا ہے خون
بہہ رہا ہے۔ یہ سُنتے ہی سرتاج بانو بیتاب ہوگئیں۔ وحیدالزماں سے کہا ڈارلنگ تم ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو اور کہہ دو کہ
ں کام کے متعلق سامان لے کر فوراً آجائیں۔ موٹر بھیجدو۔ میں ہمسائی کے ہاں جاتی ہوں اور ان کی خبر لیتی ہوں۔ یہ یوڈی کولون
ا بوتل ہاتھ میں کپڑا کوٹن وول ساتھ لے ہمسائی کے گھر جا پہونچیں۔ وہاں سب کے سب ششدر رہ گئے کہنے لگی رونے پیٹنے
سے کچھ فائدہ نہیں میں نے ڈاکٹر کو موٹر بھیجی ہے وہ ابھی آتے ہونگے۔ اتنے میں ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں۔ جلدی سے روئی نکال
نی میں بھگوئی اور زخم کو دہو یا۔ پھر یوڈی کولون میں روئی بھگو کر زخم کو خوب صاف کیا اور روئی وہاں رکھدی کسکر کپڑے
، پٹی باندھ دی۔ خون اسی وقت رک گیا۔ زخم کچھ گہرا نہ تھا۔ بالکل سطحی تھا۔ خود ان لوگوں کے پاس بیٹھی رہی تسلی تشفی کرتی
اتی تھی اور ایک ہاتھ سے مریضہ کو پنکھا جھلتی جاتی تھی۔

اب بی ہمسائی کے میاں کا حال سُنیئے۔ میاں دُکان پر ٹوپی اُتارے بے فکر بیٹھے ہتوڑی ہاتھ میں لے دھڑا دھڑ جھپتر پونکی
رمت کر رہے ہیں۔ اتنے میں لڑکے نے آن کر ایک بھیانک آواز میں یہ کہا۔ میاں کیا بیٹھے ہو تمہاری بیوی تو کوٹھے پر سے گر
پڑیں سر پھٹ گیا اور مرگئیں۔ بھلا ان کو یہ سُننے کی کہاں تاب تھی۔ بے چین ہو گئے۔ ہتوڑی ہاتھ کی ہاتھ ہی میں رہی اور
وہی اپنی جگہ۔ جوتی بھی پاؤں میں نہیں ڈالی۔ بے تحاشہ دوڑتے ہوتے گھر کی طرف ہو لئے۔ سر پر پٹھے ہیں ہاتھ میں ہتوڑی
ہے اور ہاتھ اوپر کو اُٹھا ہوا ہے۔ اور یہ بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ سر کے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ عجب تماشا نظر
آتا ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ مگر ان کی توجہ کسی طرف نہیں ہے۔ بیوی کے
غم میں بیتاب ہیں۔ مُنہ اُٹھا ہوا ہے۔ سینہ نکلا ہوا ہے اور بھاگ رہے ہیں۔ راستہ میں بیچ سڑک پر دو سانڈ لڑ رہے تھے۔
آدمیوں کی سڑک کے دونوں طرف بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اِدہر اُدہر سے بچکر گذرنا ناممکن تھا۔ لوگ لاکھ روکتے رہے مگر
ان کو اپنے آپے کی بھی خبر نہ تھی۔ بلا تامل بچاروں کے بیچ میں گھُس گئے ایک سانڈ کے ریلے میں آکر دُور جا پڑے ہتوڑی
جو ہاتھ میں تھی وہ کھٹاک سے ماتھے پر جا لگی اور خُون بہنے لگا۔ کیوں نہ ہو جب لیلیٰ کے فصد کھلی تھی تو مجنوں کے اپنے آپ
خُون جاری ہو گیا تھا۔ یہ کوئی مجنوں سے کم تھوڑی ہیں۔ لوگ ہزار روکتے رہے اور خُون پوچھنا چاہا۔ مگر ان پر تو بیوی کی محبت
کا بھُوت سوار تھا۔ پھر دوڑ پڑے، خُون میں کُرتہ کیا پاجامہ تک تر ہو گیا۔ مگر کسی طرح گھر لے لیا۔ گھر میں جو گھُسے تو بیوی اچھی خاصی
بھلی چنگی۔ زندہ سلامت پلنگ پر پڑی ہوئی ہنس رہی تھیں۔ میاں نے جو یہ حال دیکھا تو جان میں جان آگئی۔ مگر بیوی نے میاں
کو جو خون میں نہایا ہوا پایا تو چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔ بی ہمسائی کی مرہم پٹی کر چکے تھے اور ان کی
بابت سرتاج بانو کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ یہ ماجرا دیکھکر ڈاکٹر صاحب اور سرتاج بانو پریشان ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے
سمجھا بجھا کر گھر والوں کا رونا پیٹنا بند کرایا اور بی ہمسائی کے میاں کی مرہم پٹی کر کے ان کو دوسری چارپائی پر ڈالدیا۔
مگر خدا کا شکر ہے کہ اُن کا زخم بھی کچھ شدید نہ تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب یہاں سے روانہ ہونے لگے۔ بی ہمسائی کو ان کے
دینے لینے کی فکر ہوئی۔ گھر میں ٹکا نہ تھا۔ سرتاج بانو سمجھ گئیں۔ ان سے کہا۔ یہ تو ہمارے گھر کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کو
دینے لینے کا خیال نہ کرنا۔ یہ پہلے ہی سے گھر کی حالت دیکھ جان گئی تھیں کہ وہ سب بہت مفلوک الحال ہیں اُسنے

خیال کیا کہ جب گھر کا کماؤ بیمار پڑا ہوا ہے تو یہ کہاں سے خرچ چلائیں گے۔ یہ سوچکر گھر آئی اور پچاس روپے کے نوٹ لیکر پھر جا پہنچی اور چپکے سے بی ہمسائی کے ہاتھ میں دیدیئے۔ وہ انکار بھی کرتی رہیں مگر اُس نے ان کو سمجھا دیا اور کہہ دیا کہ روپیہ واپس کرنے کی فکر نہ کرنا۔ اب بی ہمسائی سمجھیں کہ جس لڑکی سے یہ نفرت کرتی تھیں۔ وہ کس اعلیٰ خوخصلت کی ہے۔ اور وقت پڑے پر کس طرح غریبوں کے کام آتی ہے۔ اب ان کی ساری نفرت محبت میں مبدّل ہوگئی۔ تھوڑے دنوں میں دونوں میاں بیوی بھلے چنگے ہوگئے اور بی ہمسائی سرتاج بانو کے پاس آنے جانے لگیں۔ سرتاج بانو نے ان کی فلاکت کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ ایک دن ان سے بہت احتیاط سے کہ ان کو ناگوار نہ گزرے ان کے گھر کا حال دریافت کرنے لگیں۔ بی ہمسائی نے کہا۔ بیوی کیا پوچھتی ہو۔ بڑی مصیبت سے گزران ہوتی ہے۔ ہم چار دم ہیں اور ایک کمانے والا۔ کماتے کماتے ہارا جاتا ہے مگر پوری نہیں پڑتی۔ خیر خدا کا شکر ہے دال روٹی کھا لیتے ہیں اور بُرے بھلے حال تن ڈھک جاتا ہے۔ مگر میری نند سیانی ہوگئی ہے۔ اُس کی شادی کا ہم سب کو بڑا فکر ہے۔ نسبتیں جگہ جگہ سے آتی ہیں۔ مگر ہم ٹال دیتے ہیں۔ شادی کریں تو کیونکر کریں۔ آخر چار برتن اور چار جوڑے تو ہونے چاہئیں۔ عمر بھر کنبے قبیلے والوں کا کھایا ہے۔ چار آدمیوں کے ہاتھ بھی دُھلانے پڑیں گے۔ اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو یہ کنواری بیاہی جائے۔ رات دن اِسی فکر میں ہمارا خون خشک ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ سرتاج بانو چپکی بیٹھی سُنا کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمسائی سے پوچھا تو یہ پوچھا کہ کیا تمہارے میاں کو کچھ لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ اس نے جواب دیا کچھ تھوڑی بہت اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں مگر انگریزی کا حرف بھی نہیں جانتے۔ یہ باتیں کرکے بی ہمسائی رُخصت ہوئیں۔ سرتاج بانو اسی وقت بدیع الزماں کے پاس گئیں۔ اور کہا کہ ابّا جان بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارے پڑوس میں لوگ فقر و فاقہ میں گزران کریں اور ہم پیٹ بھر کے روٹی کھائیں اور اُن کی کچھ بھی فکر نہ کریں۔ کیا خدائے تعالیٰ کی نعمت کا اسی طرح شکر ادا کرنا چاہیئے۔ بدیع الزماں بولے کہ دُلہن آخر بات کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ آپ کے پڑوس میں جو بی ہمسائی رہتی ہیں۔ ان کے پاس کھانے پینے کو بھی نہیں ہے۔ بولے آخر میں کیا کروں۔ جو کہو میں اُن کے واسطے کرنے کو موجود ہوں۔ سرتاج بانو نے کہا۔ آپ کے ہاں بیسیوں منشی ٹھیکہ داری کے کام میں نوکر ہیں۔ آپ ان کو بھی نوکر رکھ لیجئے۔ کہنے لگے وہاں تو لکھنے پڑھنے کا کام ہے۔ یہ بولی وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتے ہیں کام چلا دیں گے۔ بدیع الزماں نے کہا۔ دُلہن مجھے ایک آدمی کی ضرورت بھی ہے۔ بُلا لو ابھی نوکر رکھے لیتا ہوں۔ اُس نے ماما کو بھیج اُسی وقت ہمسائی کے میاں کو بُلا لیا اور بدیع الزماں نے تھوڑا بہت پوچھ گچھ کر ان کو پچاس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ ہمسائی نے جب یہ سُنا تو خوشی کے مارے پھولی نہ سمائی اور عمر بھر کے واسطے اِس لڑکی کی ممنونِ احسان ہوگئی اور دُعائیں دیتی رہا کی۔ اِسی طرح سرتاج بانو کے ہاتھ سے ایک غریب خاندان کے دلدّر پار ہوگئے۔

خواجہ عبدالمجید دہلوی

رفتارِ زمانہ:۔ خواجہ عبدالمجید صاحب کے ایسے ہی چھ دلکش افسانوں کا مجموعہ اِس نام سے شائع ہوا ہے۔ ہر افسانہ بجائے خود مکمّل اور سلسلہ کی دلچسپ کڑی بھی ہے۔ زبان دلّی کی ٹکسالی اور ستھری ستھری ہے۔ آٹھ آنہ قیمت ہے۔ نو آنے کے ٹکٹ بھیج کر ساقی بکڈپو، دہلی سے طلب کیجئے۔

ترقی پسند مصنفین

پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ترقی پسند ادب پر حسب ذیل تقریر کی تھی۔

ادب پر رائے دینے کا مجھے حق تو نہیں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ مجھ سے بھی کم حق رکھنے والے لوگ رائے دے رہے ہیں تو مجھے بھی جرأت ہوتی ہے کچھ کہنے کی۔ مجھے دو تین کتابیں لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے لیکن میرے پاس ان کاموں کیلئے اب وقت نہیں ہے۔ میری طاقت زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوتی ہے جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ ترقی پسند ادب کیا ہے؟ ادیب کن لوگوں کیلئے لکھتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب ہر شخص دے سکتا ہے ان کو بار بار دُہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سوالوں کو سن کر میرا جی چاہتا ہے کہ پوچھوں آپ زندہ کیوں ہیں؟ کیا مقصد ہے زندگی کا؟ زندگی کا مقصد ایک ہے اور دوسری باتیں اس کے جزو ہیں۔ یا زندگی کے ہر بات کے خانے الگ الگ ہیں؟ لوگ وکیل ہوتے ہیں ڈاکٹر ہوتے ہیں، پروفیسر ہوتے ہیں یہ سب الگ الگ ہیں یا کہ زندگی کی تصویر ایک مکمل تصویر ہے اور یہ سب اس کے حصے ہیں؟ اگر یہ سب تصویر کے جزو ہیں تو ان کو زندگی کی تصویر میں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم ان میں سے کسی چیز کو زندگی کی تصویر سے الگ ہو کر سوچنا چاہیں گے تو ہم بھٹکتے رہیں گے۔ اور کوئی سیدھا راستہ نہ مل سکے گا۔

تم کیوں لکھتے ہو؟ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روٹی کھانے کو یہ جواب صحیح ہے۔ اور بہت سے لوگ یہی کہیں گے لیکن یہ جواب کوئی بنیادی جواب نہیں ہے۔ کچھ لوگ جواب یوں دیں گے کہ ہم صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر اسی لئے لکھتے ہیں یہ جواب بھی ٹھیک ہے۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ ہم لکھتے ہیں تاکہ لوگوں کی طبیعت بہلائیں۔ طبیعت بہلانے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو مصیبت میں پھنسا ہو کچھ دیر کیلئے اس کو بھلاوے میں ڈال دیں اس کے دل سے درد دُکھ کچھ دیر کیلئے نکالیں۔ جب پڑھنے والا ایسے ادیب کی چیز کو پڑھتا ہے تو اس میں کھو جاتا ہے اور کچھ دیر کیلئے اپنی پریشانیوں کو بھول جاتا ہے گویا ایسے ادب کا دوسرا نام بُھلاوا ہے۔ جب ہم موجودہ پریشانیوں سے بہت گھبرا جاتے ہیں تو سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر کیلئے دُنیا کو بھول جاتے ہیں، اور ہمارا تھکا ماندہ دماغ بہل جاتا ہے۔ ایسا بھی سب ہوتا ہے لیکن یہ کچھ بڑا کارنامہ نہیں ہے معقول آدمی کا کام ہے کہ وہ دُور تک دیکھے۔ ایسا ادب بہت جلد ختم ہو جاتا ہے جیسے سینما میں ہم تماشہ دیکھتے ہیں اس وقت بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس وقت کہانی پوچھے تو بتا بھی دیں گے۔ لیکن دس روز کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح لکھنے والے کے لئے جب تک کوئی بڑی بات کوئی نئی بات نہ ہو پڑھنے والے کے دل پر کوئی گہرا اثر نہیں کر سکتی۔ دُنیا میں بہت سے لکھنے والے گذرے ہیں۔ لیکن ان کی وہی کتابیں باقی رہیں جن میں کوئی بڑا مسئلہ تھا جن میں دُنیا کے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

اب میں پھر اُسی سوال کو دُہراؤں گا کہ آپ کے سامنے دُنیا کی تصویر کیا ہے؟ اگر وہ ایک مکمل تصویر ہے تو وہ کیسی ہے؟ آپ کہاں ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ کہاں لیجانا چاہتے ہیں؟ یہ تصویر اگر صاف ہے اور لکھنے والے کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں اور پڑھنے والے کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں تو اس کی لکھی ہوئی چیز زیادہ اچھی ہوگی۔ انسان کا دماغ موجودہ دُنیا سے نکل کر پرواز کرتا ہے۔ اس کے عجیب و غریب خیالات۔ اس کی عجیب عجیب خواہشیں اس کو ایک دوسری دُنیا میں لے جاتی ہیں۔ جو آجکل کی دُنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ اور جہاں وہ تمام مسئلے حل ہوتے ہیں جو اس دُنیا میں نظر آتے ہیں۔ انسان کا تخیل عجب چیز ہے وہ اِس دماغی دُنیا کو رنگ دیکر ایک مکمل تصویر بنا دیتا ہے۔ اور آدمی بے چین ہوتا ہے کہ وہاں پہنچ جائے۔

انسان میں سوچنے کی قابلیت تو زیادہ لیکن کرنے کی کم ہے۔ اس لئے بہت سے لکھنے والے دماغی دُنیا کو پسند کرتے ہیں۔ اسی میں گم رہتے ہیں۔ لیکن ان کو نہ وہاں پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے اور نہ وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی دماغی دُنیا ایک خانے میں رہتی ہے۔ اور واقعی دُنیا دوسرے خانے میں۔

زیادہ ہمت ور لکھنے والے ان دونوں دُنیاؤں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دُنیا وہ نہیں ہے جو اُن کے دماغ میں ہے یعنی وہ نہیں کر سکتے جو اُن کے دماغ میں ہے تو اُن کے دماغ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے؟ اگر پہنچ سکتے ہیں تو اس کا کیا راستہ ہے؟

یہ سوال پہلے زمانہ کے لکھنے والوں کے ذہن میں بھی اٹھا۔ لیکن ان کو دماغی دُنیا تک پہونچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس وقت انھوں نے اپنی کتابوں کو خیالی دُنیا "یوٹوپیا" (Utopia) بنایا۔ یعنی اگر کرنے کی طاقت ہوتی تو ہم ایسا ایسا کرتے، ایسی ایسی دُنیا بساتے۔ ان دُنیاؤں کو بسانے کے لئے کبھی الہ دین کا چراغ نکالا اور کبھی اُڑن کھٹولا تیار کیا۔ یہ لوگ مجبوراً اصلی دُنیا سے الگ تھلگ رہے۔ اور خیالی دُنیا میں زندگی بسر کرتے رہے۔

لیکن اب دُنیا نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اس دماغی دُنیا تک پہونچنے کی صورتیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً پہلے کے لکھنے والوں کو نظر آتا تھا کہ غریبی اور امیری کی تفریق ہمیشہ رہنے والی ہے۔ کیونکہ دُنیا میں اتنی دولت ہی نہیں تھی جو اس تفریق کے دُور کرنے کی کوشش کرتی تک ذہن پہونچتا۔ لیکن اب سائنس، صنعت وحرفت اور اسباب نقل وحرکت نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ یہ مصیبتیں دُور ہو سکتی ہیں، اور ایسی دُنیا بنا سکتے ہیں جہاں ہر انسان کو ترقی کے یکساں موقعے میسر ہوں۔ جب ایسی کوشش ہو سکتی ہے تو کیوں نہ کی جائے، کیوں ایسی صورتیں نہ نکالیں جو دماغی دُنیا کو موجودہ دُنیا کے قریب لے آئیں۔ اب ہم ان دونوں دُنیاؤں کے بیچ میں پُل بنا سکتے ہیں۔ ہم اس اچھی دُنیا تک کیوں نہیں پہونچتے۔ وہاں تک پہونچنے میں زیادہ تر لوگوں کا قصور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اکیلے وہاں تک نہیں جا سکتے۔ اور زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو وہاں جانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ انھوں نے ابھی اس دُنیا کو محسوس نہیں کیا ہے۔

ہم دماغی دُنیا تک نہیں پہونچ سکتے۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ دُنیا کا نہیں۔ مجموعی طاقت ہمارے پاس ہے کہ ہم وہاں تک پہونچ سکیں، سماج کے ہاتھ اتنے پھیل سکتے ہیں کہ وہ دُنیا ہمارے قبضے میں آجائے۔ لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ ترقی پسند مصنف وہ ہے جو اس ہونے والی دُنیا اس "نو زائیدہ" دُنیا تک پہونچ گیا ہے، اب اس دُنیا کو واقعی دُنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے چاہتا ہے کہ اوروں کو بھی اپنے ساتھ وہاں تک کھینچ لے جائے۔

موجودہ دُنیا کو اس خیالی دُنیا تک لیجانے کی اور لوگ بھی کوشش کرتے ہیں مثلاً سیاسی حضرات ہیں انکی بھی یہی کوشش ہوتی ہے لیکن سیاسی حضرات اور اسی قسم کی کوشش کرنیوالے دوسرے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ بڑی باتوں پر زیادہ توجہ دے نہیں سکتے۔ ایک آرٹسٹ ایسی چھوٹی باتوں سے الگ رہتا ہے۔ اس کی سیاسی زندگی اور ماحول سیاسی لوگوں کی زندگی اور ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ بڑی بڑی باتوں کو روزمرہ کی چھوٹی باتوں کے جنگل سے الگ کرکے سماج کو دکھا سکتا ہے۔

مثلاً آج کل ایک سوال اُردو ہندی کا ہے، یہ جھگڑا ایسا ہے جس نے ملک کی نگاہوں کو پھنسا لیا ہے۔ لوگ بڑی باتوں کو بھول کر اس میں رہ گئے ہیں۔ اگر اس سوال کے حل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تو نئے نئے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جذبات اس قدر برانگیختہ ہو جاتے ہیں کہ لوگ اس پر صفائی سے غور نہیں کر سکتے اگر کوئی اس کو حل کرنا چاہتا ہے تو شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی چالبازی ہے۔

ادیب کی پہونچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاستداں کی نہیں، اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے اس سے مدد لیکر وہ خیالی دُنیا اور موجودہ دُنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہوکر عام لوگوں کے دماغ خیالی دُنیا تک پہونچ جاتے ہیں۔ جب لوگ دماغی طور پر وہاں پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہونچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

آرٹسٹ اور ادیب میں انفرادیت ہوتی ہے۔ اگر کسی آرٹسٹ میں انفرادیت نہیں ہے تو میں اس کو آرٹسٹ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر اسکی انفرادیت ایسی ہے کہ وہ سماج سے الگ ہے اور جو چیزیں سماج کو ہلاتی ہیں ان سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ ادیب بیکار ہے اس کی اکیلی طاقت سماج کو آگے نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن اگر اس کے برخلاف اس کی انفرادیت میں سماج کو دخل ہے یعنی وہ انفرادیت سماج کا نمائندہ کہی جا سکتی ہے تو وہ بڑی چیز ہے۔ اس میں قوم کی طاقت آجاتی ہے اور وہ دُنیا کو ہلا دیتی ہے۔ گذشتہ دَور میں جتنے بھی بڑے بڑے لکھنے والے ہوئے ہیں شیکسپیر وغیرہ وہ سب کسی نہ کسی طرح اپنے دَور کے سماج کے نمائندہ تھے۔

آجکل کی دُنیا میں انفرادیت دبائی جارہی ہے۔ اس زمانہ میں انفرادیت ترقی نہیں پاسکتی۔ کیونکہ ہر ایک کو ترقی کرنے کے موقعے نہیں میسّر آتے۔ جب کھانا پینا، رہنا سہنا میسّر نہیں، تعلیم نہیں، سوچنے کیلئے وقت نہیں تو انفرادیت کیسے ترقی پائیگی۔

پچھلی دُنیا میں پھر بھی ان لوگوں کو موقع حاصل تھا جو روپیہ رکھتے تھے اور اختیارات رکھتے تھے لیکن اب زمانہ ایسا ہو گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جکڑے ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں خیالات کی ترقی کا اور انفرادیت کی ترقی کا موقع ہے غلط ہے۔

لکھنے والا کیوں لکھتا ہے، اس لئے کہ اس کے دماغ میں ایک دُنیا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس دُنیا تک پہونچ ہو سکتی ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ اوروں کو بھی یہ دُنیا دکھائی جائے۔ اپنی خیالی دُنیا اور موجودہ دُنیا کے درمیان ایک پُل باندھا جائے۔ زمانہ کے شاہکار اسی طرح کے پُل ہوتے ہیں۔ پہلے تو پڑھنے والے حسرت سے خیالی دُنیا کو دیکھتے رہتے ہیں اور پھر اُدھر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بات۔۔۔ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے، خاص خاص نعرے دُہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ایک زبردست خیال پیدا کر دیا۔ لیکن معقول لکھنے والے کیلئے یہ دُنیا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات اور نہ کوئی خاص پیغام، ایسی چیزوں کی جگہ صرف سیاست میں ہے۔

ہندوستان کی انجمن ترقی پسند کی ایسی انجمنیں یورپ میں متعدد ہیں اور انھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں حالانکہ ان کاموں کو ناپا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ لوگوں کے دماغوں میں ہے۔ انقلاب فرانس میں والٹیر کے ایسے ادیبوں کا بڑا دخل ہے۔ اس کا اثر انقلاب کے بعد سو برس تک باقی رہا۔

آنیوالے انقلاب کیلئے ملک کو تیار کرنا، اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلہ کو حل کیجئے ان کو راستہ بتایئے۔ لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ جانا چاہئے نہ کہ منطق کے ذریعہ آپ کی بات ان کے دل میں اُتر جانا چاہئے۔ آرٹ کی منطق الگ ہوتی ہے وہ آدمی کو پکڑ لیتا ہے۔ پھر منطق اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں بھی ادیبوں نے بڑا اثر پیدا کیا ہے۔ مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے ہیں، جو ملک کو زیادہ آگے لے جا سکیں اسی لئے انجمن ترقی پسند کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کا پورا ہوتا ہے۔ اور اس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

جواہر لال نہرو

دامنِ بہار

کارپردازانِ قدرت نے اپنے اپنے چولے بدل ڈالے۔ درخت سرسبز ہوئے۔ کونپلیں پھوٹیں، شگوفے کھلے اور دامانِ بہار پر قدرت نے اتنے گل بوٹے کھینچے کہ چپہ چپہ آئینہ حسن بن گیا۔

زمین کی گود سے پھل پھول اُبل پڑے۔ سبزۂ نوخیز مستانہ وار انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھا۔ اور اپنے چاروں طرف زنگار رنگ کی گلریزی دیکھکر خوشی سے جھومنے لگا۔

شفاف ندیاں چپ چپ کرتی پھولوں کے گلدستے اُچھالتی۔ اَیلی گیلی بہنے لگیں۔ چھوٹے چھوٹے خوشنما پرند پھولوں کی پنکھڑیاں اپنی ننھی ننھی سی چونچوں میں لئے ایک دوسرے سے گل بازیاں کرنے لگے۔ جو کلی آنکھ کھولتی ہے اپنے آپ کو پھولوں بسی دولت سے مالامال پاکر بے اختیار ہنس پڑتی ہے، غنچے غنچے کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ گذرگاہیں تک معطر ہیں اور خوشبو کے قافلے لدے پھندے ہواؤں کے کندھوں پر ہوا جھکتے مہکاتے اُڑے چلے جاتے ہیں۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی

سچی کہانی

وہ شوقِ ناشکیب کی گستاخ دستیاں
اُٹھنا وہ درمیان سے پردۂ حجاب کا
وہ حسنِ شرمگیں کی ادائے سپردگی
وہ ارتعاشِ کیفِ لبِ کامیاب کا
ارماں بھرے دلوں کی وہ خاموش گفتگو
وہ ہمدگر فشارِ علاجِ اضطراب کا
وہ چاندنی سی چاکِ گریباں سے ضو فگن
وہ نوشِ لب میں کیفِ بہشتی شراب کا
چھایا ہوا حواس پہ وہ کیفِ بےخودی
تکمیلِ ہر ہوس وہ تقاضا شباب کا

سب واقعات ہیں مگر اللہ رے انقلاب
اب اِن پہ ہے گماں کسی رنگین خواب کا

پریم پجاری

جنانہ

(۱)

جنوری کی ایک سرد رات باہر آسمان پر بادل ایک خاموش استقلال سے مسلط تھے۔ چمن کے سوکھے پتے دریچے کے باہر خنک ہوا سے رہ رہ کر بے قرار رہتے اور شور مچا رہے تھے۔ ایسے وقت میں اپنی حسین نشست گاہ میں ایک اونچے برقی لیمپ کے نارنجی رنگ ...کے نیچے ایک مخمل آرام دہ کرسی پر بیٹھی تھی اور "بغداد ٹائمز" کے بڑے بڑے صفحے کھولے مختلف عنوانوں پر نظر ڈال رہی اور بیرونی دُنیا کے دہشت خیز اثر کو مطالعہ کی دلچسپی میں محو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے آتشدان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔

اتنے میں میری بوڑھی قدیم حبشن زوتاش اندر آئی اور میری رفاقت کیلئے ایک چھوٹی سی میز پر قہوہ کا سامان رکھ کر آہستہ سے پھر باہر چلی گئی۔ رفتہ رفتہ برامدے سے اس کی نقرئی چوڑیوں کی جھنجھناہٹ اور عمر خیام کے اشعار کی گنگناہٹ بند ہوگئی۔ خاموشی جس میں عناصر کی بے چینی کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی دمبدم ایک بوجھ کی طرح روح پر بیٹھی جا رہی اور دل میں طرح طرح کے اوہام وسواس بیدار کر رہی تھی۔

یک لخت دروازے پر ایک محتاط دستک نے مجھے چونکا دیا۔ آپ جانتے ہیں، میں ایک بہت کمزور دل کی عورت ہوں اور عام مشرقی لڑکیوں کی طرح بیحد اوہام پرست، یہی وجہ ہے کہ میں اخبار ہاتھ سے دُور پھینک کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس ویران اور وحشت ناک رات میں ہوا کے جھونکوں کے سوا اور کیا شے دروازے کے کواڑ کو دھکیل سکتی تھی۔ میں گھبرا کر نشست گاہ سے باہر نکل آئی اور دروازہ کی طرف نظر اُٹھائی۔ اس کے شیشوں میں سے ایک دہکتے ہوئے سگار کو دیکھ کر میرا تردد رفع ہوگیا۔ کسی انوکھے وقت محتاط دستک کے ساتھ سگار کا نظر آجانا سب کا سب صرف بوڑھے ڈاکٹر گار کی آمد کی علامات ہیں۔ میں ایک روحانی اطمینان سے دروازے کی طرف لپکی اور چٹخنی کھول دی۔

"سلام شوق ڈاکٹر!" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا "کیا شہر میں امراض کی بہت کثرت ہے جو آپ عید کا چاند بن گئے ہیں"

ڈاکٹر اپنے چہرے پر سے مفلر اتارتا ہوا بولا "ڈاکٹر کبھی اپنے وقت کا مختار نہیں ہوتا بیٹی روحی!"

"روحی" میرا افسانوی نام ہے۔ میں اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگی "آپ کی اس بے اختیاری نے اسوقت بڑا فائدہ پہونچایا۔ اس طوفانی رات کی تنہائی سے گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی، آپ اندر آیئے۔ آگ دہک رہی ہے۔ قہوہ تیار ہے۔ سگاروں کا ذخیرہ آپ کی جیب میں موجود ہی ہوگا۔ بس اس کے سوا اور کس بات کی کسر رہ گئی؟ کہ آپ اطمینان سے بیٹھ کر مجھے اپنے قصے سُنائیں کہ آپ کی ان دنوں کی ساری غیر حاضری کی کسر نکل جائے"

ڈاکٹر گار ایک لذت اندوزی کی آہ کے ساتھ آتشدان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ آگ کی طرف بڑھا کر بولا "میں کیا قصے سناؤں بیٹی، ڈاکٹر ۔۔۔ پھر بوڑھا ۔۔۔ تم سناؤ اپنی سیاحت کے افسانے"

میں ہنس پڑی "کئی دنوں سے میرے سر میں درد ہے ڈاکٹر۔ میرے صنوبری (ہوائی جہاز کا نام) کی تباہی کا حال تم نے اخبار میں پڑھا ہوگا۔ اس حادثہ نے میرے دماغ پر بُرا اثر ڈالا طبیعت متوحش سی رہنے لگی ہے۔ مہینوں سے کوئی چیز نہیں لکھی، کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی" یہ کہہ کر میں نے قہوہ دان اٹھالیا اور ڈاکٹر کیلئے قہوہ پیالی میں ڈالتے ہوئے بولی "آپ کے پاس قصے کہانیوں کی کمی ہے؟ یوں کہیئے کہ ان دنوں انھیں بیان کرنے کیلئے آپ کو وقت نہیں ملتا ہے"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے پاس قصے کہانیوں کی کمی نہیں، انسان کی عمر جب بڑھ جاتی ہے تو مختلف تجربات اس کی زندگی کو بجائے خود ایک طویل داستان بنا دیتے ہیں۔ مگر مجھے تامل ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ یہ قصے تم نوجوانوں کے دل کو کیا لبھا سکتے ہیں۔ کہ ان واقعات میں محبت اور افسانے کی رنگینیاں ہوتی ہیں نہ حسن اور شوخی کی دلفریبیاں"

میں بولی "بس آپ انھیں کو بیان کیجئے"

بھاپ اُڑاتی ہوئی قہوہ کی پیالیاں ہاتھ میں لے کر ہم نے

سرگرمیوں کی پشت سے لگا دیئے۔

آتشدان میں لکڑیاں پٹ پٹ چٹخ کر شرارے نکال رہی تھیں۔ باہر چھت پر بارش کی دھیمی دھیمی ٹپ ٹپ شروع ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی سمند پر بادلوں کے گرجنے کی خوفناک آواز آتی تھی۔

ڈاکٹر شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولا "تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنے ایک تازہ مریض کی کہانی سناؤں جو پرسوں شام میرے پاس لایا گیا اور آج صبح ——"

"ضرور ——" میں اشتیاق سے اس کا منہ تکنے لگی۔

(۲)

ڈاکٹر اکاّر نے قہوہ کا ایک گھونٹ لے کر کہا "پرسوں ایک عجیب کیس میرے پاس آیا تھا۔ بوڑھے احمد کو جانتی ہو؟ —— گاؤں کی مسجد کا مجاور ہے۔ اس مسجد کے احاطہ میں ایک چھوٹا سا قبرستان ہے وہ اس کا بھی نگران تھا"۔

"میں نے تو کبھی اس شخص کا نام نہیں سنا"۔

ڈاکٹر کہنے لگا "اس کی موت کی وجہ نہایت عجیب ہے پرسوں صبح وہ میرے پاس بیہوش لایا گیا۔ اور آج صبح اس غریب کا انتقال ہو گیا"۔

"خدا غریق رحمت کرے" میں نے کہا "کیا ہوا تھا ڈاکٹر اسے؟"

"تم جانتی ہو کہ آجکل دیہات میں وبا بہت شدت سے پھیلی ہوئی ہے۔ دن کے وقت سڑکوں پر میّت بردارں کے ہجوم گذرتے نظر آتے ہیں۔ بازار میں جدھر نظر ڈالو اُدھر دو چار آدمی ایک جنازہ اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رات آتی ہے تو دن سے زیادہ خوفناک مناظر پیش کرتی ہے۔ لوگوں کی خاموش ٹولیاں لالٹین لئے ہوتے قبرستان کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بوڑھا مجاور پرسوں رات کی سرگذشت اس طرح بیان کر رہا تھا:۔

"دن بھر لوگوں کی تجہیز تکفین میں لگا رہتا تھا۔ پرسوں رات تھک کر مسجد کے صحن کے ایک کونے میں پڑ رہا۔ دفعتہً کچھ آواز آئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ لالٹین لئے ہوئے مسجد کے صحن میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ جنازہ ہوگا۔ رات اندھیری تھی، دور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جنازہ کی نماز ختم بھی نہ کی تھی کہ بوندا باندی ہونی شروع ہوئی۔ تب میں نے اُن سے کہا کہ اب دفنانے کا انتظام کرنا بڑا مشکل ہے میّت کو یہاں رکھ دیجئے میں سرہانے کلام مجید پڑھوں گا۔ صبح جب مینہ تھم جائے تو واپس آکر لاش کو دفنا دیجئے گا۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ایسے واقعات پیش آیا ہی کرتے ہیں کہ رات میں میں تنہا لاش کے سرہانے کتاب مقدس پڑھنے میں صرف کر دیتا۔ کبھی کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا جو مجھے خوفزدہ کرتا۔

غرض ان لوگوں نے جنازہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ اور مجھے کلام مجید پڑھنے کی تاکید کر کے مسجد کے صحن کے دروازے سے باہر سے لگا کر چلے گئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دروازہ ان لوگوں نے باہر سے لگا دیا ہے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں کتاب کھول کر جنازے کے سرہانے بیٹھ گیا۔ رات بھیانک تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف کاجل کی سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی دور سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں خوف کے مارے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ مجھ پر اب تک کوئی ایسا حادثہ نہیں گذرا تھا جیسا اس شب گذرا۔ ہولناک اور جان لیوا۔

تھوڑی دیر تو میں کتاب مقدس پڑھتا رہا۔ پھر یکایک میری نظر سامنے کو اٹھی اور میری روح کانپ گئی —— میں نے دیکھا جنازے پر جو سفید چادر پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ دل کو سمجھایا —— ممکن ہے ہوا کا جھونکا ہو۔ یہ کہتا ہوا میں پھر کتاب مقدس پڑھنے لگا مگر قدرتی طور پر میری نگاہ بار بار اٹھتی تھی۔ چادر برابر متحرک تھی۔ میں نے سمجھا ضرور کوئی بلی جنازہ میں گھس گئی ہے۔ باوجود اس یقین کے میں جنازہ کے قریب نہ جا سکا۔ ایک نامعلوم خوف دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں اپنی عمر میں کبھی نہیں ڈرا۔ یہ پہلا ہی موقع تھا۔ اور پہلا ہی حادثہ! —— کچھ دیر بعد یہ حالت ہو گئی کہ چادر کا کونہ زور زور سے ہلنے لگا۔ جیسے کوئی جھنجوڑ رہا ہو۔ اب تو میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا میرا اٹھنا ہی تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لاش پر پڑی ہوئی چادر سرک گئی اور پھر —— ایک کفن پوش سر آہستہ آہستہ جنازے میں سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ میں ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ یکلخت لاش جنازے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل دو لمحے کھڑے رہے —— میں اس کے

کفن آلود چہرے کو تک رہا تھا ۔۔۔ وہ میرے لرزتے ہوئے مجسّے کو ۔۔۔ پھر وہ جنازے سے زمین پر کود پڑا ۔

یہ دیکھکر میری چیخیں نکل گئیں ۔۔۔ میں دروازے کی طرف بھاگا تاکہ سڑک پر نکل بھاگوں ۔ مگر وہاں جاکر دیکھا تو دروازہ بند پایا ۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اندر صرف ہم دونوں مقید ہیں ۔ قدموں کی آہٹ پاکر میں نے مڑکر دیکھا تو وہ میرے تعاقب میں چلا آرہا تھا اور چونکہ اس کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ آہستہ آہستہ کودتا ہوا میرے پیچھے چلا آرہا تھا ۔

صحن میں امرود کا ایک درخت تھا میں اس کی طرف بھاگا مگر اب شاید اس میں بھی تیزی آگئی تھی ۔ وہ میرے تعاقب میں تیزی سے کودتا ہوا آرہا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد یہ حالت تھی کہ ہم دونوں مسجد کے صحن کا چکر لگا رہے تھے ۔ میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے خوف نے میری تمام طاقتیں سلب کر لی تھیں ۔ میں نہ چیخ سکتا تھا نہ درخت پر چڑھ سکتا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب ! میری حالت مُردے سے بدتر تھی ۔ میں پاگل ہو رہا تھا مسجد کے صحن کی ہر دیوار کے قریب جاکر اُسے پھاندنے کی کوشش کرتا ۔ اور جب لاش میرے قریب آجاتی تو میں چیخ مار کر وہاں سے بھاگ نکلتا !

اسی وقت دفعتاً مجھے خیال آیا کہ پیچھے کنویں کے قریب کی دیوار کچھ گر پڑی ہے ۔ اس کو پھاندنا نسبتاً آسان ہوگا ۔ میں پچھلے حصے میں جہاں دیوار کی چند اینٹیں گر پڑی ہیں بھاگ آیا اور اپنی پوری قوت اور کوشش سے دیوار پر سے پھاند گیا میں ہانپ رہا تھا ۔ اسی عالم میں پلٹ کر دیکھا تو لاش میرے تعاقب میں نہایت تیزی سے چلی آرہی تھی ۔ آخر اس نے دیوار پھاندنے کی کوشش کی مگر اینٹوں میں کفن الجھ گیا ۔ اور مُردہ جسم دیوار پر نصف ادھر نصف اُدھر لٹکنے لگا ۔ اب وہ بے جان معلوم ہو رہا تھا ۔ میں باہر سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا پہونچا ۔"

اس دن صبح آنے جانے والوں نے مسجد کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر ایک لاش کو لٹکتا ہوا دیکھا اور مجاور کو انھوں نے دیوار کے نیچے بے ہوش پایا ۔

مجاور کا بھائی اُسے اٹھاکر میرے پاس لایا ۔ وہ تیز بخار میں پھنکا جا رہا تھا ۔ اور بے ہوش تھا ۔ کل رات کے تین بجے اس نے مجھے اپنی داستان سنائی اور آج صبح چل بسا ۔ صبح دس بجے کے قریب وہ لاش دفن کی گئی ۔ اور دوسرے دن صبح دس بجے مجاور کی لاش بھی سپُردِ خاک کر دی گئی ۔

میں دم بخود ہوکر سُن رہی تھی ۔ باہر آندھی زوروں پر تھی ۔ آتشدان کی لکڑیاں ختم ہو چکی تھیں ۔ مینٹل پیس پر رکھا ہوا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا ۔

جب ڈاکٹر قصہ ختم کر چکا تو میں لرزتی ہوئی اٹھی اور اس کے پہلو میں جا بیٹھی ۔۔

حجاب امتیاز علی

افسونِ سحر

مری چشمِ مشتاق سے کیوں نہاں ہے — ہر اک بزم میں جب تری داستاں ہے
کہاں دیکھئے مجھ کو لیجائے وحشت — قفس اِس طرف ہے اُدھر آشیاں ہے
اب آباد کر چاہے برباد کر دے — مرا دل نہیں یہ ترا آستاں ہے
نہ پوچھو مآلِ غمِ سوزِ فرقت — کہ صورت سے میری حقیقت عیاں ہے
عجب بلبلوں کا ترے حال دیکھا — نہ ہے زخم کوئی نہ کوئی نشاں ہے
پلا ایک ہی جام للہ ساقی — بہت تشنہ لب یہ ترا خستہ جاں ہے
چلو سیر کو ہمسفیرو! خدارا!!! — نہیں کچھ یہ فردوس کہئے بتاں ہے
مجھے ہوش آیا تو اے سحر دیکھا
نہ بانگِ جرس ہے نہ وہ کارواں ہے

مقصود حسن سحر
(رہبا نیوی)

بزمِ شوق

ذرّوں میں حُسنِ مہرِ درخشاں لئے ہوئے
فطرت ہے ایک جلوۂ عریاں لئے ہوئے

نرگس ہے کیفِ دیدۂ خوباں لئے ہوئے
سنبل ہے بوئے گیسوئے جاناں لئے ہوئے

آشفتگیٔ قلب کا امکاں لئے ہوئے
آئی بہارِ حُسن کا طوفاں لئے ہوئے

کلیاں چٹک کے دیتی ہیں پیغامِ رنگ و بو
پھولوں کی آڑ میں رُخِ تاباں لئے ہوئے

شبنم لٹا رہی ہے بہارِ رُخِ گہر
صد ہا ہزار انجمِ رخشاں لئے ہوئے

موسم اُٹھا رہا ہے نقابِ رُخِ بہار
ذرّے ابھر رہے ہیں گلستاں لئے ہوئے

نازاں ہے برگِ گل بمتاعِ جنونِ شوق
دامن میں چاک چاکِ گریباں لئے ہوئے

کرنوں میں گندھ رہی ہیں گہرہائے آبدار
شبنم جو اُڑ رہی ہے گلستاں لئے ہوئے

ہر شاخِ نخلِ طوبیٰ و سدرہ کی ہم نشیں
ہر نخلِ باغ، شوکتِ رضواں لئے ہوئے

موتی پروتے آتے ہیں نسرین و لسترن
آرائشِ بہارِ گلستاں لئے ہوئے

شبنم ہے برگِ گل پہ مئے رنگ و بو لئے
جامِ شراب، بادۂ غلطاں لئے ہوئے

بادِ نسیم آتی ہے مستی سے چور چور
جھونکوں میں روحِ نرگسِ ریحاں لئے ہوئے

شاخیں مچلتی ہیں کہ مچلتی ہیں شوخیاں
کیفِ شبابِ حُسن کا ساماں لئے ہوئے

کلیوں میں کمسنی کی لطافت بسی ہوئی
دوشیزگی، شباب کا عنواں لئے ہوئے

پھولوں میں بوئے بادۂ صافی کی شورشیں
کیفیتِ شراب کا ساماں لئے ہوئے

ہر گل ہے محوِ رقص برنگِ نسیمِ صبح
کیفیتِ تصوّرِ جاناں لئے ہوئے

سامانِ حشرِ شوق، بہ آہنگِ برہمی
لائی بہار مژدۂ باراں لئے ہوئے

موجوں میں کمسنی کی لطافت بہ ہر ادا
دریا تمام شوخیٔ ارماں لئے ہوئے

آتا ہے آبِ نہر برنگِ شبابِ حُسن
جوش و خروشِ طفلِ ناداں لئے ہوئے

ہونٹوں پہ اک تبسمِ رخشاں لئے ہوئے
آنکھوں میں سحرِ چشمِ غزالاں لئے ہوئے

آتا ہے کوئی بزمِ تخیل میں بے حجاب
رُعبِ جمال و شوکتِ شاہاں لئے ہوئے

ہر جنبشِ نظر سے ٹپکتا ہے کیفِ عشق
ہر لغزشِ خرام گلستاں لئے ہوئے

غمزہ ہر ایک جانِ تمنا بنا ہوا
ہر اک ادا شکوہِ سلیماں لئے ہوئے

تقویٰ گداز کفرِ جوانی کی شورشیں
آشفتگیٔ شوق کا ارماں لئے ہوئے

جھلکی شبابِ حُسن کی دُنیائے کیفیات
جنبش نظر کی فتنۂ دوراں لئے ہوئے

فرحتؔ یہ بزمِ شوق ہے سونی ترے بغیر
افسردگیٔ شمعِ شبستاں لئے ہوئے

فرحت کانپوری

"فنِ فسانہ"

ذیل کے چار مضمون "فنِ فسانہ" کے سلسلہ میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے اگست ستمبر میں براڈ کاسٹ ہوئے تھے۔ یہ عنوانات خود ریڈیو اسٹیشن کے تجویز کردہ ہیں۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ ان تقریروں کو ازسرِ نو ڈھال کر اور ضروری عنوانات پر چند مضمون اور لکھ کر اسکو کتابچے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ اسی دوران میں مکرمی ایڈیٹر صاحب ساقی کی طرف سے مطالبہ ہو گیا۔ اور ان کی تعمیلِ ارشاد میں یہ تقریریں اپنی اصلی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ بشرط مہلت انکو کتابی صورت میں بھی پیش کیا جائیگا۔

لطیف الدین احمد

افسانے کا پلاٹ

فنِ فسانہ کے تحت آج میری گفتگو کا موضوع افسانے کا پلاٹ ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اصل موضوع کے متعلق کچھ کہوں میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح افراد کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے مزاج بھی مختلف و مخصوص ہوتے ہیں، اور ہر قوم کا ادب اُس قوم کے مزاج کے سانچے میں ڈھلتا، اور خود اپنا ایک مزاج رکھتا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ادیب و انشا پرداز دوسری زبانوں سے استفادہ کرنے میں اُس حد کو پہچاننا نہیں چاہتے جس حد تک کہ ہماری زبان و ادب کا مزاج استفادے کی اجازت دے سکتا ہے، اور آنکھ بند کر کے انگریزی ادب کے اصول اختیار اور انکی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ ہماری یہ روش، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ادب کو اپنی ذات میں مکمل ہو جانے کے درجے تک پہنچنے میں کوئی مدد نہ دیگی۔

میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے ادیب اصولِ فن کے مرتب و مدون کرنے میں اندھی تقلید کو چھوڑ کر اپنے ادب کے مزاج کے مطابق ہی اس کے اصول بھی مرتب کریں۔ اس پہلو پر توجہ دلانے کی ضرورت مجھے اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ حال ہی میں فنِ فسانہ کے متعلق اُردو کی ایک کتاب میری نظر سے گزری جس کا نام ظاہر کرتا ہے کہ اس فن کے متعلق اس کتاب کے اندر سب کچھ ہے۔

اس کتاب کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مختصر قصّوں میں قصے کا پلاٹ اور اُن کے افراد جب تک نہایت ڈرامائی نہ ہوں قصہ بے لطف رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ صاحب کتاب نے طویل ناول اور مختصر افسانے کے "ٹکنیک" اور اصول میں کوئی بین فرق بھی قائم نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک اندھی تقلید اسی کا نام ہے۔

مغربی ممالک میں طویل ناولوں کا آغاز اُس وقت ہوا جب کلیسا نے ڈراما کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ چنانچہ ڈراما کے اصول و عناصر بادنیٰ تغیر ناول میں بھی برقرار رہے۔ لیکن جہاں تک مختصر فسانے کا تعلق ہے خود یورپ میں اُسے ناول سے جُدا

ایک شے مانا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ڈراما یا ناول کے اصول و عناصر مختصر فسانے میں جوں کے توں کیونکر روا رکھے جاسکتے ہیں؟ مختصر فسانہ آج ایک نہایت ترقی یافتہ اور مستقل بالذات صنف ادب ہے، اس لئے اُس میں ڈراما اور ناول کی تمام خصوصیات کھپ بھی کب سکتی ہیں۔ اس کی ایک زبردست دلیل تو یہ ہے کہ ناول کے برخلاف مختصر افسانے میں ایک ہی کردار پیش کیا جاتا ہے، اور اگر کردار متعدد بھی ہوں تب بھی ان کی تعداد چند افراد سے آگے نہیں بڑھائی جاسکتی۔ ایسی صورت میں اس کے اندر نہ تو پلاٹ کی پانیدگی کا کمال دکھانا ممکن ہوسکتا ہے اور نہ ڈرامائی کشاکش پیش کرسکنے کا موقعہ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ڈرامائی انداز کیلئے مُبالغہ ایک لازمی چیز ہے۔ مگر آج جبکہ صناعت کا یہ نظریہ عالمگیر ہوتا جاتا ہے کہ اُسے زندگی کے مطابق ہونا چاہیئے تو ایسی صورت میں صناعت، اور بالخصوص صناعت ادب، مُبالغے کو کیونکر برداشت کرسکتی ہے۔ ہیں اس حقیقت سے خالی الذہن نہیں کہ خود زندگی میں تصادم موجود ہے، اور اس تصادم ہی کا دوسرا نام ڈرامائی انداز بھی ہے، لیکن زندگی کا یہ تصادم جو ہمیں قدم قدم پر پیش آتا ہے مُبالغہ کے بغیر بھی اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ اُس میں دلچسپی پیدا ہوسکے۔

آج بیسویں صدی کی ـــــ ترقی یافتہ ذہنیت واقعیت نگاری (ـــــ realism) کا مطالبہ کرتی اور صناعت ادب کو آورد و تصنع سے بالکل پاک دیکھنا چاہتی ہے۔ اس ذہانت کا فیصلہ تو یہ ہے کہ وہ ادب پارے جن میں ڈرامائی سرعت واقعات پیش کی جائے ہر امتیاز سے عاری ہیں، رومانیت ناقابلِ التفات ہے، اور فسانے کے پلاٹ کا دروبست ایک طفلانہ حرکت ہے، اور ہم اگر چاہیں تو بادنٰے تامل اندازہ بھی کرسکتے ہیں کہ اُس ادب میں جس کا مقصود قاری کو اس کے لبطون سے متعارف کردینا یا آسان لفظوں میں انسان کو اسکی اپنی آتما کو پہچنوا دینا ہو، ڈراما کے مفروضات و مسلمات کی پیروی کرنا اس ادب کے حصولِ مقصد کے یقیناً خلاف ہوگا۔

ہر مُلک و قوم کے عصری ادب میں نہ صرف مختصر فسانوں بلکہ طویل ناولوں کا بھی موضوع و مقصد انسانی نفسیات کا تجزیہ و تحلیل قرار پاگیا ہے، اس لئے اکثر و بیشتر، اور اعلیٰ درجے کے فسانے ڈرامائی اصول کی پابندی سے معرّا پائے جاتے ہیں، مگر ان کی دلچسپی و اثر آفرینی میں کوئی کمی نہیں آتی۔

مغربی ادیبوں نے پلاٹ کی جس قدر تعریفیں قائم کی ہیں اُن کا نچوڑ یہ ہوسکتا ہے کہ افراد قصہ کو جو واقعات پیش آئیں اور اُن سے جو افعال سرزد ہوں، جن کو دلچسپ بھی ہونا چاہیئے، مجموعی حیثیت سے پلاٹ کہلائینگے۔ یہ تعریف اپنی جگہ مکمل ہے لیکن مختصر فسانے کی یہ تعریف زیادہ عصری اور جامع معلوم ہوتی ہے کہ کسی ایک واقعہ یا جذبے کی تاریخ بیان کردینا مختصر فسانہ ہے۔

الحاصل افسانے کی اس تعریف کے تحت، جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مختصر فسانے میں "فطری پلاٹ" کا ہونا تو ناگزیر ہے۔ لیکن "فنی پلاٹ" مُستلزم نہ ہونا چاہیئے۔ "فطری پلاٹ" سے میرا مفہوم یہ ہے کہ آپ فسانے نام سے جو کچھ بھی کہیں گے، یا جو واقعہ بھی بیان کیا جائیگا اس کے اندر خواہی نخواہی ایک پلاٹ موجود ہوگا۔ اور "فنی پلاٹ" میں اُس کو کہتا ہوں جس کے لئے "قابلِ یافندگی" ضروری بتائی جاتی ہے۔ پلاٹ کا مشجر کی طرح بافیدہ ہونا اس بات کو چاہتا ہے کہ انھیں

افرادِ قصہ متعدد ہوں۔ لیکن مختصر افسانے میں افرادِ فسانہ کی تعداد ایک مناسب حد سے آگے نہیں بڑھائی جاسکتی، ورنہ پلاٹ کا سُبک رہنا دُشوار ہوجائیگا، جو پلاٹ کا سب سے بڑا حُسن ہے۔ اسکے ماسوا ایسا فسانہ مختصر فسانے کی تعریف سے بھی نکل جائیگا۔ کیونکہ افرادِ قصہ کی کثرت زمان ومکان کی وحدت کے منافی ہے۔ اور جس پلاٹ میں سبک ہونے کے عوض بھدا پن آجاتا ہے اس میں آورد و تصنع کا عیب محسوس ہونے لگتا ہے۔

مختصر فسانے کے بُنیادی عنصر پانچ ہیں۔ پہلی چیز تو فسانے کا مقصود ہے جسے بُنیادی خیال بھی کہا جاسکتا ہے، اسکو ہمیشہ مجرد ہونا چاہیئے۔ دوسرا نمبر مرکزی کردار فسانہ کا ہے، جس سے اُس مقصود کی تکمیل کرائی جائے گی۔ پھر ذرا سی تخیل کی ضرورت ہے جو رنگ آمیزی کریگی۔ اسکے بعد پلاٹ کا درجہ ہے کہ وہ تکمیل مقصود ہوگی کس طرح۔ اور آخر میں وحدتِ اثر قائم رہے کہ پڑھنے والا ایک وقت میں اُسی ایک اثر سے متاثر ہو جو مصنف کا مقصد ہے۔ ان پانچ عناصر اولیہ کے بعد اختصارِ بیان، زمان ومکان، فضائے فسانہ، اور طرزِ بیان وغیرہ ہیں جنکو میں عناصر نہیں بلکہ اس کے ٹکنیک میں داخل سمجھتا ہوں۔

کسی ایک کردار کے بھی محض ذہنی تاثرات اور قلبی کیفیات کا بیان یعنی "یادِ ایام" یا "محویتِ خیال" وغیرہ بیان کرنا بھی مختصر فسانے کی تفہیم میں شامل ہے، اس لئے میرے خیال میں ایک فسانہ نگار کا طریق کار (method) یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فسانے کا مقصود جسے آپ غایتِ تصنیف بھی کہہ سکتے ہیں، قائم کر لینے کے بعد ایک مناسب و خصوصی کردار وضع کرکے فسانہ سُنانا شروع کردے، اور پلاٹ کا بروز (development) فطری طریق پر ہوتا رہے۔ یعنی جہاں ضرورت کا تقاضا ہو دوسرے ذیلی کردار اور نئی صورت واقعہ (situation) پیدا ہوتی رہے۔ جو پلاٹ اس طرح بنے گا، میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ قرینِ فطرت ہوگا۔ کیونکہ ایسا پلاٹ مصنف کے مشاہدے اور تخیل کا ماحصل ہوگا، اور واقعیت نگاری کی حدود کے اندر رہے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے بنیادی خیال قائم کیا جائے اور اس کی مناسبت وضرورت کے اعتبار سے جملہ کردار مقرر کر دئے جائیں، اور پھر دو چار ایسی صورت واقعہ ترتیب دے لی جائیں جو اصل مقصود کے ساتھ غیر متناسب بھی نہ ہوں اور کردار کے لئے غیر فطری بھی معلوم نہ ہوں۔ جب یہ خاکہ تیار ہوجائے تو فسانہ لکھنا شروع کیا اور اُس میں تخیل کی رنگ آمیزی کی جائے۔ لیکن اس طریق کار میں اکثر اوقات بناوٹ کا رنگ جھلک آتا ہے۔ کیونکہ مصنف کا خیال پابند ہوچکتا ہے اور اس کی تخیل کا فطری رُجحان اپنی گلکاریاں دکھانے کے لئے آزاد نہیں رہتا۔

میں اِس سے بے خبر نہیں کہ پلاٹ کا مکمل خاکہ پہلے سے طیار نہ کرنے بلکہ پلاٹ کو فسانے کے دورانِ بیان میں بروز دینے کو ترجیح دینے کو ناپسند کیا جائیگا اور ممکن ہے کہ کسی کی نظر میں مضحکہ خیز بھی ہو۔ لیکن میں معذور ہوں کیونکہ میں طبیعت وفطرت کا جلوہ زندگی کے ہر شعبے میں دیکھنا چاہتا ہوں، اور تقلید و تصنع، مکر وریا سے طبیعت کو بیزاری ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہی ہے کہ اگر پہلے سے کوئی خاکہ بنا لیا ہے تو دقت محسوس ہوئی اور گفتنی ناگفتہ رہگئی ہے۔ آورد و تصنع بقول اناطول فرانس صداقت کے منافی ہے۔

وہی ڈرامائی اصول کو آنکھ بند کرکے اختیار کر لینے کی تقلیدی ذہنیت ہے جو مختصر فسانے میں بھی "پیچیدگی" پیدا

کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مختصر فسانے میں زبردستی "پیچیدگی" پیدا کرنے سے مقصود فسانہ دھندلا پڑ جاتا ہے لیکن اگر خود اُس واقعے کے اندر جو بیان کیا جا رہا ہے، کوئی پیچیدگی موجود ہے تو وہ فسانہ یقیناً زیادہ دلچسپ ہوگا۔ بہرحال پیچیدگی پیدا اسی فسانے میں کی جا سکے گی جس میں کردار متعدد ہونگے۔ مگر پیچیدگی پیدا کرنے میں یہ فیصلہ کہ وہ کہاں فطری اور کہاں غیر فطری معلوم ہوگی، تمام تر مصنف کی سلامتی ذوق پر منحصر ہے۔ میں ذاتی طور پر پلاٹ کو پیچیدہ بنانے بغیر نتیجے کو توقف یا تعویق (suspense) میں ڈال دینے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس طرح پڑھنے والے کی دلچسپی آخر تک برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

پلاٹ اور عمل (action) دراصل ایک ہی چیز ہے۔ پلاٹ کا بہت بڑا انحصار اس فضا، و ماحول پر ہے جس میں مُصنف اپنے کردار کو پیش کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ پلاٹ، فضا، اور کردار، یہ تینوں ایک دوسرے پر حصر رکھتے ہیں۔ ان تینوں کے مابین اگر کسی وقت بھی خفیف سا عدم تناسب رُونما ہو جاتا ہے تو فسانے کی صناعت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

مختصر فسانے کے پلاٹ میں سب سے زیادہ مُشکل موقعہ جس میں فسانہ نگار کے ذوق و وجدان کا امتحان ہوتا ہے وہ نئی صورت واقعہ (situation) کا پیدا کرنا ہے۔ اس کی صورت اور صناعت ہمارے ادب میں قصیدے کی گریز سے بہت مماثل ہے۔ واقعات کے بیان میں جب بھی نئی صورت واقعہ پیش کی جائے تو پڑھنے والے کو یہ محسوس ہونا چاہیئے کہ وہ صورت حال، بیان ماقبل کا فطری نتیجہ ہے، اور اس صورت کے سوا کوئی دوسری صورت ہو ہی نہ سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ پلاٹ جس چیز کا نام ہے وہ مختلف واقعات سے ترتیب پاتا ہو، اور یہ مختلف واقعات ایک بُنیادی واقعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان ذیلی واقعات کو پیدا کر کے اُنہیں ایسے سلسلے میں لے آنا کہ وہ ایکدوسرے کا منطقی نتیجہ معلوم ہوں، اسی کا نام پلاٹ کی سادگی اور یہی اس کا سب سے بڑا حُسن ہے۔ ترتیبِ واقعات میں، میرے نزدیک، مصنف کی توجہ اسپر زیادہ صرف ہونا چاہیئے کہ ہر واقعہ اپنی جگہ اس طرح پیش آئے کہ باوجود متوقع ہونیکے پڑھنے والیکو مُنہمک رکھ سکے۔

ایک فسانہ نگار کو جو صورت اکثر پیش آ سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ کسی واقعہ یا جذبے سے متاثر ہو کر اسکو ایک فسانے کی صورت دینے لگتا ہے تو اُس کا تحت الشعور یا حافظ بعض ایسے واقعات پیش کر دیتا ہے جو اُس کے مشاہدے میں پہلے آ چکے اور اس واقعہ یا جذبے سے فطری لگاؤ یا مناسبت رکھتے ہیں۔ ان واقعات کو اس طرح مربوط کر دینا کہ وہ آپس میں جان و جگر معلوم ہونے لگیں، بس یہی فسانہ نویسی کا فن ہے۔ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ مُصنف کے سامنے ایک کردار کی زندگی یا اس کی زندگی کے کسی خاص واقعے کا پورا علم ہوتا ہے اور وہ اسے بجنسہٖ یا معمولی اور خفیف تبدیلیوں کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ اس صورت میں فسانہ نگار کی تخلیقی قابلیت کو کم اور انتخابی صلاحیت کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اسکے برخلاف پہلی صورت میں مُصنف کو واقعات و تخیل کی مرصع سازی کرنا پڑتی ہے۔

افسانے کا انداز بیان بھی دو نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ مُصنّف نے جو کچھ دیکھا یا سُنا ہے بس اُسی کو بیان کر دے، یعنی خارجی طور پر جو زندگی جس طرح بسر کی جاتی ہے، وہ اُسے خارجی شکل ہی میں پیش کر دے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ

جس زندگی کا بیان ہو اس میں مصنّف یا تو اپنے تاثرات شامل کرتا جاتا ہے یا کردار فسانہ کے نفسیات کا تجزیہ و تحلیل کرتا ہے۔ اس عہد میں اسی نوع کی افسانہ نویسی زیادہ مقبول ہے۔

خارجی زندگی کو خارجی طریق ہی پر بیان کر دینے میں بالعموم ابتدا سے ابتدا کی جاتی ہے جو ایک سپاٹ کہانی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسمیں ادیب کو دخل کم ہوتا یا ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن جس فسانے میں کردار کی داخلی زندگی بیان کی جاتی ہے وہ بالعموم پلاٹ کے کسی اہم نقطے سے شروع کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت افسانہ سمجھانے اور بیان کو واضح کرنیکے لئے اُس نقطے سے قبل کے بعض ضروری واقعات ضمناً بیان کر دئے جاتے ہیں۔ اس پیرایۂ بیان میں ادبی صناعت پیش کئے جانیکے لئے بہت گنجائش ہوتی ہے اور اسی انداز کو قبولیت بھی حاصل ہے۔

ہمارے اہلِ قلم نے افسانے کو شعر کی طرح ایک الہامی چیز سمجھ لیا ہے، اور ایسے ہی دعووں کے ساتھ اپنی تصانیف کو پیش بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ فسانے اور الہام کے درمیان دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ البتہ افسانے کی عبارت میں شعریت پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ بھی ایک مناسب حد تک۔ بہت زیادہ ادبیت پیدا کر دینے سے فسانے کا مقصود اور اُسکی وحدت اثر بلاشبہ غارت ہو جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فسانہ جب لکھا جاچکے اور اُس کی مرصع کاری جملہ پہلوؤں سے مکمل ہو تو شاید ہم اُسے بحیثیت مجموعی ایک شعر کہہ سکیں۔ لیکن وہ شعر بھی مشاہدہ و مکالمہ کے اظہار کی تکمیل کا شعر ہوگا، الہام نہ ہوگا۔

ابھی میں نے آپ سے کہا ہے کہ پلاٹ کا سُبک ہونا اُس کا سب سے بڑا حسن ہے جو افراد قصہ کی کثرت سے باقی نہیں رہتا لیکن افسانے کے پلاٹ کو سُبک رکھنے کیلئے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کردار میں تنوع اور تضاد پیدا کیا جائے۔ اور وہ تنوع آخر فسانہ تک قائم رہ سکے۔

محض پلاٹ کی خاطر سے پلاٹ اختراع کرنا خامکاری سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف پلاٹ سازی کی صناعت اس میں ہے کہ واقعہ متعلقہ ایک اوسط طبیعت کے انسان میں جو مختلف انداز مزاج پیدا کر سکتا ہے، پلاٹ کی بناء اُس انداز پر رکھنا چاہیئے۔ پلاٹ اگر اس طرح بنایا جائیگا تو اُس میں کردار کی وانمود کے ساتھ مرکزی و بنیادی خیال کی وانمود کو بھی پورا موقعہ ملے گا۔

افسانے کے کردار

میری آج کی گفتگو کا موضوع افسانے کے کردار ہے۔ پچھلی گفتگو میں میں نے عناصر فسانہ کی تعداد پانچ بتائی تھی جسمیں مقصود فسانہ کو پہلے نمبر پر رکھا تھا۔ آج میں بتانا چاہتا ہوں کہ یورپ کے بعض ناقدوں کی رائے ہے کہ فسانے کے عناصر میں خود مصنّف بھی شامل ہے، کیونکہ اُن کی رائے میں مقصود فسانہ، مصنّف کی ذات سے الگ کوئی چیز نہیں یا یہ کہ مقصود اور مصنّف ہم معنی الفاظ ہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے کہ مقصود، فسانے کا اصل اصول اور وہ نقطۂ آغاز ہے جس کے بغیر نہ کوئی خط کھینچا جاسکتا ہے اور نہ کوئی دائرہ بنایا جاسکتا ہے، تو پھر فسانے میں اس کے کردار کو پہلی جگہ حاصل ہو جاتی اور کردار اہم ترین عنصر فسانہ بن جاتا ہے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ کردار کشی مصنّف کی کتنی گہری توجہ اور کسقدر غور و فکر کا مرکز ہونا چاہیئے۔

کردار فسانہ کے متعلق بڑی آسانی سے کہدیا جاتا ہے کہ ان کو جیتی جاگتی تصویریں ہونا چاہیئے لیکن یہ جیتی جاگتی تصویریں بنائی کیسے جاسکتی ہیں، اس کے قاعدے اور قانون کسی نے وضع نہیں کئے۔ تجویزیں جو پیش کی گئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر محض اُنہیں پر عمل کیا جائے تو جیتی جاگتی تصویروں کی جگہ کٹھ پتلیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ غالباً آپ اسکا سیدھا سادا جواب دینگے کہ مصنف اگر اپنے مشاہدے کے تاثرات پورے طور پر ادا کرسکے تو وہ جیتی جاگتی تصویریں بنا سکیگا۔ مگر میرا خیال ہے کہ صرف یہ مشورہ بھی جیتی جاگتی تصویریں بنانے کا اصول نہیں سکھاتا۔

کردارنگاری کے ذیل میں مجھے "تخلیق کردار" کی اصطلاح سے بھی اتفاق نہیں، کیونکہ یہ اصطلاح مجھے کچھ مبہم نظر آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک مصنف دراصل کردار تخلیق نہیں کرتا، وہ زندگی کی نقل اُتارتا ہے۔ انسانی کردار کی صحیح نقل ہی جیتی جاگتی تصویر ہوسکتی ہے۔ اگر ایک کردار زندگی کی صحیح نقل نہیں بلکہ ایک "تخلیق" ہے تو میرے خیال میں وہ گوشت پوست کا انسان نظر آنے کے عوض ایک مطمحی اور مثالی بن کر رہ جائیگا۔ "تخلیق" کی اصطلاح سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ وہ کردار ایک ایسا انسان ہے جیسا کہ مصنف انسان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فسانے کا موضوع وہ انسان ہے جو اس دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ آپکو شاید میری اس رائے سے اختلاف نہ ہوگا کہ اگر زندگی کی نقل کا خیال نظرانداز ہوجائے تو مصنف کی ذہنی پیداوار عام انسانی مخلوق سے جداگانہ ہوگی۔ اس میں خود مصنف کی نفسی کیفیات جلوہ فرما ہونگی۔ لیکن کردار نویسی میں اگر "زندگی" مصنف کے سامنے ہے تو وہ "تخلیق" نہیں بلکہ "نقل" ہوگی۔

کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کا مشاہدہ اُسے ایک کردار کی تخلیق پر قادر کردیتا ہے۔ لیکن مصنف واقعی زندگی میں جس ایک انسان کو دیکھتا ہے اور اُسی کو بیان کردیتا ہے، یا پھر وہ مختلف واقعات زندگی کو جو اس کے دماغی خزانے میں محفوظ ہوتے ہیں، ترتیب اور ربط دیکر ایک انسانی کردار تیار کردیتا ہے۔ بہرصورت وہ انسانی زندگی کی نقل ہوتی ہے۔ صاحب کمال کردار نویس وہی مصنف سمجھا جاتا ہے جو نقل کو اصل کر دکھائے۔ یہ نکتہ ہمیشہ یاد رہنا چاہیئے کہ واقعات کردار کو اُبھارتے ہیں، یہ قانون فطرت ہے۔

رہگیا یہ سوال کہ نقلی کردار کو اصلی انسان کیونکر بنایا جاتا ہے، تو اسکے متعلق میرا عقیدہ یہ ہے کہ افسانہ نگاری کی دوسری تمام خصوصیات حاصل ہونیکے باوجود ایک مصنف اپنے کرداروں کو صرف اندازِ بیان کے کمال سے جیتی جاگتی تصویریں بنا سکتا ہے۔ اُس کا اندازِ بیان ہی وہ چیز ہے جس سے قلمی تصویریں بولنے لگتی ہیں۔ اندازِ بیان ایک ہی کردار کو کاٹھ کا پتلا بھی بنا سکتا ہے اور اسے ایک زندہ انسان بھی دکھا سکتا ہے۔

ابھی تک ہمارے افسانوی ادب میں عبارت آرائی پر زور صرف کیا جاتا ہے، جسے میں لفاظی سے تعبیر کرتا ہوں، اور مشاہدہ اور مطالعہ کی کردارنگاری عام نہیں ہوئی ہے۔ ایک دہقانی کا کردار پیش کرتے وقت عام طور پر ہم نے اسکو کافی سمجھ لیا ہے کہ اس کے مُنہ سے حضور کو ہجور اور وقت کو بکھت کہلوا دیا جائے۔ حالانکہ ایک دہقانی کے سوچنے کا طریقہ اور بیان کا انداز، ایک شہری سے جُدا ہوتا ہے۔ اور دہقانی ہی پر کیا منحصر ہے، سماج کے ہر طبقے اور فرقے کا پردازِ فکر مختلف ہوتا ہے۔ خود دیہات میں زمیندار کی ذہنیت جُدا ہوتی ہے اور کاشتکار کی جُدا۔ کردارنگاری کا کمال چاہتا ہے کہ اگر کسی کسان

کا کریکٹر پیش کیا جا رہا ہے تو اس کی ایک ایک بات اور اس کے ہر ہر انداز سے مٹی اور اراضی کی بو آتے۔

میں نے اپنی پہلی گفتگو میں بتایا ہے کہ یہ عہد واقعیت نگاری (Realism) کا عہد ہے، اور نظر آ رہا ہے کہ مستقبل میں اسی رجحان کا غلبہ ہوگا۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں نے کسان اور مزدور کی زندگی کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ میں نہ تو واقعیت نگاری پر معترض اور کسان، مزدوروں کی زندگی کے موضوعِ ادب بننے کا مخالف۔ بلکہ مجھے واقعیت نگاری کی ادبی وقعت تسلیم ہے، اور سماج کے پست طبقوں کی زندگی کو موضوعِ قلم بنانے کو مفید و کارآمد سمجھتا ہوں لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ واقعیت نگاری کے جوش میں نہ صرف رومانیت بلکہ صناعت، ادب کی صداقت کو بے کار شے سمجھا جا رہا ہے۔ اس پر مجھے اعتراض ہی نہیں بلکہ اس سے مجھے تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اناطول فرانس کے خیال میں صداقت نام شعریت کا ہے، صناعت کا ہے! اور الفریڈ نوئس کی رائے ہے کہ انتہائی نقطے پر پہنچ کر رومانیت، واقعیت، اور واقعیت، رومانیت بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارا رجحان ادبی صداقت کو پسِ پشت ڈالتا نظر آ رہا ہے۔ اور واقعیت یعنی اظہارِ صداقت کے نام سے صناعت ادب یعنی صداقت کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

میں اپنی زبان کے ادیبوں کی پُرزور تائید کروں گا کہ آپ سماج کے پست طبقوں کی زندگی کے مرقعے ضرور پیش کیجئے لیکن آپ سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ ان طبقوں کی زندگی حُسن کی صداقت سے عاری ہے؟ کیا ایک دہقانی کی سوگوار سنجیدگی یا گمبھیرتا حسین نہیں؟ کیا اس کے بدن کی کرختگی میں جو مسلسل مشقت کا نتیجہ ہے ایک تقدّس محسوس نہیں ہوتا؟ کیا ایک کسان اور اس کی آراضی کے مابین ایک رشتہ، ایک ہم آہنگی نظر نہیں آتی؟ اس کے فاقوں میں عظمت نہیں؟ کیا اس کے افلاس اور صبر و شکر میں ایک جلال موجود نہیں؟ کیا ایک مزدور کی جانکاہیاں پریشان دکھائی نہیں دیتیں؟ پست طبقوں کی زندگی میں حُسن بھی ہے اور تقدّس بھی، ہم آہنگی بھی ہے اور عظمت بھی، جلال بھی ہے اور شان بھی! لیکن ہمارے ادیب جب ان کردار کو پیش کرتے ہیں تو ان کے اندر ان میں سے کوئی خوبی موجود نہیں ہوتی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہمارا عصری ادب صداقت یعنی صناعت سے معرا ہوتا جا رہا ہے۔

کردار نگاری میں وہ مصنف زیادہ کامیاب ہیں جو انفرادی انسان کی نہیں بلکہ انسان کی نفسیاتی قسموں (types) کی کردار کشی کرتے ہیں۔

ہر کردار کشی میں ایک انسان کی فطرت کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ یہ انکشاف دو طریق پر ہو سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ مصنف کی طرف سے کردار کی معرفی کیجائے، اور وہ اس کردار کی مزاجی خصوصیات خود بیان کر دے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ کمزور کردار نگاری ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کردار کی فطرت، واقعات کے ذیل میں وانمود پائے۔ یہ طریقہ حسنِ صناعت کے اعتبار سے مکمل سمجھا جاتا ہے۔

کردار کا بروز، پلاٹ کے بروز، اور افسانے کی رفتارِ ترقی کے ساتھ ہو تو میرا خیال ہے کہ زیادہ قرینِ فطرت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں فسانہ نگار کو نہایت دقتِ نظر سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ آغازِ فسانہ میں کردار کو جس طرح کی اٹھان دی گئی ہے اسکے خلاف باتیں بیان ہو جانا دشوار نہیں ہوتا اور تضاد و تخالف کو بڑی آسانی سے دخل مل جاتا ہے جو

بعض وقت نظر میں بھی نہیں آتا۔

ڈراما کی روایات کے تحت پرانی ناول نویسی میں یہ بات بھی ضروری سمجھی گئی تھی کہ جو فرد فسانہ ایکبار داخل قصہ ہو گیا اسے خواہ مخواہ آخر تک نبھانا چاہیئے لیکن مختصر افسانہ اسکو بھی روا نہیں رکھتا۔ ایک فسانے میں کسی فرد فسانہ کا جتنا کام اور جب تک ضرورت ہو اسی حد تک اسے فسانے میں داخل رہنا چاہیئے۔ اور اس کے کردار کو بروز بھی اسی حد تک ملنا چاہیئے کہ وہ مرکزی کردار کو ابھارتا ہو۔ اور جیسے ہی اسکا کام ختم ہوا اسے فسانے سے خارج ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ ہر کردار کو فسانے کے رنگ، فسانے کے عمل، اور فسانے کی زندگی کا حقیقی جزو بن جانا لازمی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جب تک ایک کردار داخل فسانہ ہے اسکے فعل و عمل کا حصہ، قصے کا ناقابل ترک جزو معلوم ہو، اور یہ نظر آئے کہ اس کی شرکت کے بغیر پلاٹ اور افسانہ ناقص ہوتا، اس کا داخل فسانہ ہونا کسی وقت بھی برائے بیت محسوس نہو گا۔

ایک فسانہ نگار کیلئے، بالخصوص اس صورت میں کہ وہ نفسیاتی انداز کے فسانے لکھتا ہو، یعنی اپنے کردار کا ذہنی تجزیہ پیش کرے، میری رائے میں مناسب موقعے پر اس کی تورائی اور اسکے قیافے کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کر دینا بہتر ہوتا ہے۔ اس سے اس کردار میں ایک قسم کا تشخص آ جاتا، اور پڑھنے والے کو اس کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور غالباً کردار کشی بھی مکمل ہو جاتی ہے۔

کردار کی صحیح نقاشی کے لئے فسانہ نگار کو یہ حقیقت ہر وقت سامنے رکھنا چاہیئے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں ہر لحظہ سے تبدیل ہوتے رہنے کے باوجود تبدیل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک افسانہ نویس کے لئے اس دنیا کا جاننا ازبس ضروری ہے جس میں اسکے کردار پلتے بڑھتے ہیں۔ ایک کاشتکار کا کردار اسی وقت کامل سمجھا جائیگا جب پڑھنے والے کو اناج کی بھس اور گھی کی بھکراند آنے لگے۔ اس لئے کہ کردار نگاری معطل مادے کو ذی روح کر دینے کا نام بلکہ اس کا کام ذی روح کو زندگی گزارتے دکھا دینا ہے۔

ایک خاص اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مختصر فسانے میں کسی کردار کی زندگی کے تمام پہلو پیش کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے جب کبھی ایسا کیا جائیگا، قاری کے ذہن میں اس کردار کی داخلی کیفیت کی تصویر کبھی قائم نہ ہو سکے گی۔ صاحب کمال فسانہ نگاروں کے یہاں ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایک کردار کی زندگی کے بعض خاص اور وسیع المعنی پہلو منتخب کر لیتے ہیں، اور انہیں خصوصیات کو روشن کرتے ہیں جو روشن کئے جانیکے قابل ہوتی ہیں۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو جاتا ہے تو اس کردار کی عمومی فطرت کا دھندلا سا خاکہ پڑھنے والے کی نظر خیال کے سامنے از خود قائم ہو جاتا ہے۔ کردار کی پوری زندگی کی تفصیل کرنا سے مقصود فسانہ چک نہیں سکتا جو مختصر فسانہ کے عناصر خمسہ میں سے ہے۔ فوکس سے ایک ذرا باہر ہو کر تصویر زیادہ دلکش ہو جاتی ہے۔ اور خاکے کو ذرا سا دھندلا رکھنا بجائے خود ایک نزاکت فن، ایک صناعانہ فعل ہے میرے اندازے کے مطابق اس مقصد میں کامیاب ہو جانا فسانہ نگار کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

ایک کردار کش فسانہ نویس کو یہ بات کبھی فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ ہم بالطبع شکل ہی کو دیکھتے ہیں، یہ دیکھنا نہیں چاہتے کہ اس شکل کی تعمیر کن اجزا سے ہوئی ہے۔ ہمیں تو شکل کی بھی ایک ہی جھلک اس کا شیدا بنا دیتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے

صناعت کو خوردبین سے واسطہ نہیں، چنانچہ کردار نویس کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ کردار کی صرف نمایاں اور جامع خصوصیات ہی پیش کرنے پر توجّہ صرف کرے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ کردار کی دُنیا کا علم ہونا فسانہ نویس کے لئے لازمی چیز ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے، کہ اُس کے کردار اپنی سماج سے پوری مُناسبت اور اپنے احول سے کُلّی مطابقت رکھتے ہوں۔

انسانی زندگی کے مطالعہ نے فلسفیوں سے کہلوا دیا کہ زندگی ایک معمّہ ہے۔ انسان زندگی چلاتا ہے یا زندگی انسان کو چلاتی ہے، بہرحال یہ جینے کا فعل بجائے خود ایک مجبوری ہے، اور یہ مجبوری فی نفسہٖ زندگی کا استہزا ہی۔ چنانچہ ہمارے چاروں طرف زندگی مُنہ بناتی نظر آتی ہے۔ کردار نگار کی صناعت اِس میں ہے کہ وہ اپنے کردار کے اندر زندگی کے اس مُنہ بنانے کی نقاشی کر سکے۔ فاقہ کش کسان، پھٹے حال مزدور، کھولو کا بیل کلرک، آبرو باختہ کسبی، خون آشام مہاجن، ظالم و بے رحم زمیندار، مُسرف و عیاش سرمایہ دار، غرض زندگی کے جُملہ مظاہر میں زندگی مُنہ بنا رہی ہے، اور وہ مظاہر فسانہ نویس کی زنبیل شعور و تحت الشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو زندگی بیان کی جائے گی وہ واقعیت نگاری ہوگی۔ واقعیت نگاری محض پست طبقوں کی زندگی کے بیان تک محدود نہیں۔ کردار نگاری کا فرض ہے کہ پست طبقوں کی زندگی کا حُسن و قبح بھی بیان کرے اور اعلیٰ طبقوں کی زندگی کی دلفریبی و کراہت بھی۔ ہبوطِ آدم نے اولادِ آدم کو جیسا کچھ بنایا یا بگاڑا ہے، اُس بننے یا بگڑنے کو جیتا، سانس لیتا ہوا دِکھا دینا کمالِ فن ہے۔

ایک مُصنّف اگر حیاتِ انسانی کا صحیح مطالعہ کرتا اور زندگی کے ابتذار و آفات اسے مُتاثر کرتے ہیں، تو یہ تو ناممکن ہے کہ اُس کا دل دُنیا کی بے رحمیوں پر دُکھ نہ جاتا ہو، اور بیچارہ و مجبور انسان کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کے بادل نہ اُمنڈتے ہوں۔ بلکہ حقیقت میں اس کے یہی محسوسات و جذبات اُسے زندگی کی نقاشی پر اُکساتے اور زندگی کے یہی پہلو اس کے فسانے کا مقصود قرار پاتے ہیں لیکن کردار نویسی کی کامیاب صناعت کا راز یہ ہے کہ وہ متاثر ہونے کے باوجود اپنے کردار کے افعال و اعمال پر جج بن کر فیصلہ صادر نہ کرے، اور ایسا ہی بے تعلق رہے جیسے کہ فطرت انکو خلق کرکے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ یہ کسی وقت معلوم نہ ہونا چاہیئے کہ مُصنّف اپنے کردار سے نفرت کر رہا ہے یا محبّت، اُسے غصّہ ہے یا رحم۔ کیونکہ اس کا کام حقیقی زندگی کو روشنی میں لانا ہے، اسپر جرح و تعدیل کرنا نہیں۔ اس مدعا کو حاصل کرنیکے لئے مُصنّف کی طبیعت میں کسی قدر تفلسف کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ بات کہ دُنیا بہرحال رہنے کے قابل جگہ ہے، اس لئے کہ اس میں ناقص خلقت اور بد ردّیہ انسانوں کی کمی نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو افسانے کا مسالہ اور اُس کا عمدہ موضوع ہے۔ فسانہ نویس میں اگر یہ خوبی نہیں، تو آپ اکثر دیکھیں گے کہ فسانہ نگار صاحب ہیروئن کے ساتھ خود عشق فرماتے ہیں اور اپنے رقیب کو جی بھر کے گالیاں دے رہے ہیں۔

ایک فسانہ کے اندر جتنے کردار بھی ہوں، ان کا فرضِ منصبی یہ ہونا چاہیئے کہ فسانے کی فضا کو برقرار رکھیں اور وہ فی المعنی مرکزی کردار کو اُبھارتے ہوں۔ یعنی فسانے کے واقعات کی پیچیدگی کے اندر سے (بشرطیکہ اس پلاٹ میں کوئی پیچیدگی ہو بھی) فسانہ کے پلاٹ کا بروز ہو اور مرکزی کردار کا بروز باقی کردار کے اختلافی یا تائیدی فعال سے ہوتا ہو۔

مصنف کے خیال میں اگر اُلجھن ہوگی تو نہ صرف اس کا بیان ژولیدہ ہوگا بلکہ کردار کشی بھی صاف و صریح نہ ہو سکے گی بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ افسانہ نگار کو اپنے مشاہدے کی مدد سے کردار کا تصور نہایت قطعیت کے ساتھ قائم کرنا پڑتا ہے اور اُسے پیش کرتے وقت اُس کی حس تناسب اور قدرت تنظیم سے کام لینا ہے۔ اعلیٰ کردار کشی کے لئے ایک مصنف کے ذہن و ذکاء کا صحیح و تندرست ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ یعنی اس کا محض تخیلی یا نرا شاعر ہونا حقیقی کردار کشی کے منافی ہے۔

اس عہد کی کردار کشی کے لئے مصنف کا مابعد الطبیعاتی رجحان بھی فن و صناعت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھے اُسی کو مانے، جسکو چھوئے اُسی کو تسلیم کرے۔

ایک فسانے میں جب متعدد کردار نقش کرنے ہوں تو یہ احتیاط بھی لازم ہے کہ اُن میں تنوع اور تضاد ہو، کیونکہ تنوع پلاٹ کو دلکش بنانے میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ تنوع کے بغیر پلاٹ یقیناً بھدا ہو جاتا ہے۔ لیکن متعدد کردار میں تنوع پیدا اور قائم رکھنے کے لئے مصنف کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہونا لابدی ہے۔

کردار کشی کا یہ طریقہ زیادہ اثر آفریں سمجھا جاتا ہے کہ ان کے اعمال بلا واسطہ صادر ہوں۔ جو مصنف اپنے کردار کو بالواسطہ عمل کا عادی بناتے ہیں ان کو حصول مقصد میں دقت پیش آتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو وہ ناکام رہتے ہیں یعنی کردار کے افعال بعید الفہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔

آخر میں، میں مکرر کہونگا کہ کردار کشی منحصر ہے فسانہ نویس کے مشاہدے کی گہرائی اور افعال انسانی کے نفسیات مطالعے کی عادت پر۔ اور چونکہ مشاہدہ و مطالعے کے مدارج ہیں اس لئے ایک فسانہ نویس کی کردار کشی اُسی مناسبت سے کامل یا ناقص ہو سکتی ہے۔ مشاہدے اور مطالعے کے ساتھ طریق کار (method) اور طرز بیان وہ چیزیں ہیں جن سے کردار میں جان پڑتی ہے۔ کردار کو نمایاں کرنے یا اس کی فطرت کو دانمود دینے کا احسن طریق بحث اور تقابل ہے، اور ناقص پیرایہ خود مصنف کا تعارف۔ کردار نگاری کے لئے کردار کا تقابل فطرت کے رازوں میں سے ایک راز ہے دولت و افلاس، مادیت و روحانیت، محبت و نفرت وغیرہ اور اس تقابل کے اندر تناسب و توازن پیدا کرنا وہ چیز ہے جو مصنف کے اندر عقیدۂ حسن کی دلیل ہے۔ انسان ناقص ہونے پر عقیدہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ مصنف کو فطرت یعنی حسن بسیط پر عقیدہ ہے!

فسانے کی فضا

فن فسانہ کے تحت، آج کی گفتگو کا موضوع فسانے کی فضا ہے۔ مگر فضائے فسانہ کے متعلق یہ بتا سکنا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح وجود میں لائی جا سکتی ہے، نہایت دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس موضوع پر انگریزی زبان میں بھی، جو ہماری علمی ترقیوں کا ذریعہ ہے، میری نظر سے کوئی ایسی جامع تحریر نہیں گزری جس میں کسی کامل فن نے فضا پیدا کرنے کے اصول بہ لحاظ فن بتاتے ہوں، بجز اس کے کہ مختلف ادبی تنقیدوں میں جستہ جستہ، فضائے فسانہ کی خوبی یا اس کے نقص کے متعلق ناقدوں کی قلم سے نکلے ہوئے چند فقرے

نظر سے گزرے ہوں۔ اس لئے میں اپنے خیال کے مطابق یہ بتانے کی کوشش کرونگا کہ فسانے کی فضا کا تعلق کن باتوں سے ہے۔ لیکن اس اصولی بات کو پہلے ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ فضا پیدا کرنا فی نفسہٖ یہ معنی رکھتا ہے کہ مصنف ایک نوع کی صناعانہ چالاکی سے کام لیتا ہے۔

بہرصورت، میرے خیال میں فضائے فسانہ کا تعلق کردار فسانہ کی داخلی کیفیات سے ہوتا ہے، اور یہ فضا حسب موقعہ و ضرورت ایک منظر نقش کرکے بنائی جاتی ہے۔ یعنی جس موقعے کا بیان ہو، اور کردار کی جس ذہنی حالت اور دماغی کیفیت کو پیش کرنا مقصود ہو، اس کے مناسب حال گردوپیش کی بعض ایسی چیزوں کی طرف چند ایسے اشارے کئے جائیں جس سے ایک ذی حیات اور اثر آفریں تصویر یا مرقعہ، پڑھنے والے کی نگاہ خیال کے سامنے آجائے۔ اور یہ مُرقع اپنے اثر کے لحاظ سے اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ جو کردار متعلقہ کی داخلی حالت و کیفیت سے کلی طور پر ہم آہنگ و ہمنوا ہو، اس کے افعال و اعمال کا محرّک اور ممد ہو، اور اس کی رُوح یا نفس سے آمیز ہوتا ہو۔

جس قسم کی زندگی فسانے کا موضوع ہے اُس کے تفصیلی بیان (description) کے لئے اگر جزئیاتی اور طویل تشریح کی جائے گی تو فضا پیدا ہونے کے عوض غارت ہوجائے گی۔ کیونکہ مقصود تو کردار کی نفسیاتی حالت کو واضح و نمود دینا ہوتا ہے، اور تفصیلات کا طویل بیان ظاہر ہے کہ کردار کو قاری کی نگاہ خیال کے سامنے سے ہٹا دے گا۔ مختصر فسانے میں اختصار بیان بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ضرورت صرف اتنی ہوتی ہے کہ مختصر فقروں میں، پُرمعنی الفاظ کے استعمال سے، ایک طریق پر (آس پاس) کے منظر کے چند ایسے مخصوص اور نمایاں خط و خال پیش کئے جائیں کہ پڑھنے والے کی توجہ کا مرکز خود وہ منظر نہ بن جائے، بلکہ اس منظر کا اثر اس کے ذہن میں قائم ہوجائے، اور وہ کردار کو اُس اثر ہی کی روشنی میں یا اس اثر کی عینک سے دیکھ سکے۔ اور چونکہ کردار کی حالت اُس منظر کے اثر سے مطابقت رکھتی ہے، کردار فسانہ اور فسانے کا پڑھنے والا ایک ہی اثر سے متاثر ہونگے۔ ان کے مابین اشتراک حال پیدا ہوجائیگا اور قاری کو کردار کے ساتھ ہمدردی ہوجائے گی۔ وہ اس کے جذبات اور حسیات کو کامل طور پر سمجھ سکے گا۔ مگر یہ بات اُسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے کہ فسانہ نویس نے اس منظر کے مخصوص خط و خال کو اس طرح چھوا ہو کہ پورا منظر نقش کئے بغیر اثر تو پورے منظر کا پیدا ہو، مگر کردار اور قاری کے سامنے چند ہی چیزیں آئی ہیں۔

اس قسم کی منظر کشی ہر ایک کے لئے دُشوار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا تمامتر مدار خود مُصنّف کے مزاج اور طبیعت پر ہوتا ہے کہ کسی قدرتی منظر کو دیکھ کر وہ خود کس طرح متاثر ہوتا ہے، اُسے کس شوق و انہماک کے ساتھ دیکھتا ہے اور اُس سے کس حد تک لطف اندوز یا منغص ہوتا ہے، مظاہر فطرت کو وہ کس احساس انبساط یا کس احساس الم کے تحت سمجھتا ہے۔

ایک کامیاب فسانہ نویس کے لئے ضروری ہے کہ اُسے مظاہر قدرت سے دلی لگاؤ ہو۔ وہ ہزار در ہزار وضع و قطع کے برگستان و بوستان، مرغزار و گلزار کی رُوحوں سے آشنا ہو۔ گُنگُناتے ہوئے چشموں کے بول سمجھتا ہو، بادلوں کے نیرنگ کو دیکھ سکتا ہو۔ اُسے ان ہزار در ہزار شکلوں سے شناسائی ہونا چاہیئے جو کائنات میں جا رو نظرف

بکھری ہوئی ہیں، اور اس کی تخیل و فکر اسے یہ سمجھنے کے قابل بنا دے کہ یہ بے شمار اور رنگارنگ شکلیں اور جسم بالآخر دو ہی صورتوں میں ختم ہوتے ہیں — محبت اور موت کی صورتوں میں!

ایک افسانہ نگار جب فطرت اور اس کے مظاہر سے، اسکے تضاد اور ہم آہنگی سے اور خود اس تضاد کی ہم آہنگی کے رازوں سے آشنا ہوگا تو بلاشبہ وہ اپنے مقصود کو صحیح طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوسکے گا۔

فسانے کی فضا پیدا کرنے میں سب سے بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ کردار اپنے آس پاس کی طرف سے بے خیال معلوم ہو، اس سے گہری دلچسپی لیتا محسوس نہ ہو، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ کردار، فسانہ اور منظر متعلقہ کو باہمدیگر، داخلی طور پر، ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اور فسانہ نگار کی صناعت کا ہم راز اس بات میں ہے کہ وہ اس ہم آہنگی کے صحیح اظہار پر قدرت رکھتا ہو۔ اُس کے اندر اس امر کا صحیح اندازہ کرسکنے کی استعداد ہو کہ ماحول پیدا کرنے کے لئے صرف وہ باتیں انتخاب کرے اور اُسی حد تک بیان کرے جتنا کہ خود اس میں اور اس کے کردار فسانہ میں، نیز اسکے کردار میں اور منظر متعلقہ میں اشتراک ہو۔ اس کی مزید توضیح کے لئے یوں سمجھیئے کہ فضا کے اندر سے کردار اور کردار کے اندر سے اُس کے افعال اس طرح صادر ہوں جیسے ایک متناسب الاعضاء، ایک سڈول جسم کے جوان چہرے سے زندگی ہویدا ہوتی ہے — یعنی اس میں حُسن تناسب بدرجۂ اتم ہونا چاہیئے۔

غالباً میں یہ واضح کرسکا ہوں کہ فسانے کی فضا کے لئے خود مصنف، منظر متعلقہ، کردار فسانہ، اور فسانہ پڑھنے والے کی داخلی کیفیات کا ایک ہونا فضائے فسانہ کی تکمیل ہے۔

حسن تناسب کا کامل ہونا وہ اصول اور حقیقت ہے جو کردار فسانہ کے عنوان میں بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی کہ فضائے فسانہ کے بیان میں۔ میں نے اپنی پچھلی گفتگو میں کہا ہے کہ فسانہ اگر یہی زندگی کا مرقعہ ہے تو اس کے بیان میں کردار کی اٹھان ایسی ہو کہ ہمیں اناج کی بھس اور رکٹی کی بھکراند آنے لگے۔ فضائے فسانہ کے ذیل میں بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنیکا صناعتی پہلو یہ ہے کہ بھس اور بھکراند تو محسوس ہو مگر ناج اور رکٹی کا نام نہ لیا جائے۔ یعنی یہ اثر بالواسطہ پیدا کیا جائے۔

پلاٹ کے ضمن میں میں نے آپکو بتایا ہے کہ پلاٹ، کردار، اور ماحول فسانہ باہمدیگر حصر رکھتے ہیں۔ اس لئے آپنے محسوس بھی کیا ہوگا کہ مجھے بعض ان باتوں کی طرف مکرر اشارہ کرنا پڑا ہے جو میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہ ناگزیر بھی تھا۔ بہر صورت ان تینوں عناصر فسانہ سے متعلق، فسانہ نگار کے لئے اُس کا طریق کار (method) ہی ایک وہ چیز ہے جسکی خوبی یا خرابی کے ساتھ فضائے فسانہ کی تخلیق وابستہ ہے۔ فسانہ نگار کے طریق کار کے متعلق میں اپنی آئندہ گفتگو میں مزید اظہار خیال کرونگا جو طرز بیان پر ہوگی۔

زندگی کے نیرنگ کا مطالعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا مدار بھی مدارج پر ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ موسیقی کا مدار اسکے زیروبم پر ہے یا نقاشی کا مدار ہلکے اور گہرے رنگوں کے امتزاج پر۔

چنانچہ جب سازوں کے تار کامل طور پر مل جاتے ہیں تو ایک ایسی فضا وجود میں آجاتی ہے جس کے اثر سے سُننے

والا داخلی طور پر عالم لطیف سے باہر پہنچ جاتا ہے۔ اور ایک تصویر میں جب ہلکے اور گہرے رنگ صحیح طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو دیکھنے والا تصویر کی فضا کے اندر داخل ہو کر اپنے بطون سے ہمنوا ہو جاتا ہے۔ یہی حال شاعر اور ادیب کی صناعت کا ہے کہ جب وہ صحیح فضا پیدا کر لیگا، پڑھنے والا کردار فسانہ کے تاثر سے متاثر ہو جائیگا جو در اصل خود مصنف کا تاثر ہوگا۔ میرے نزدیک صاحب کمال فسانہ نویس کی کامیابی کا راز یہی ہے۔

اس لئے، فسانے کی فضا پیدا کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ مصنف جو کچھ دیکھتا ہے وہ قاری کو بھی دکھا دے، جس طرح خود متاثر ہوتا ہے پڑھنے والے کو بھی محسوس کرا دے۔ اور یہ کہ فسانہ نویس جس قماش کی بھی مخلوق وضع کرتا ہے، اُسے ایسے ماحول میں پیدا کرے جہاں اس کا خلق ہونا قرینِ فطرت ہو، اور جب وہ فسانہ پڑھا جائے تو پڑھنے والے کو بھی وہ سب کچھ نظر آنے لگے، وہ سب کچھ محسوس ہونے لگے۔

فسانے کی فضا، فسانے کے آغاز میں پیدا کر کے سے آخر تک برقرار رکھنا اور نبھائے جانا مقصود فسانہ کو کبھی دُھندلا نہ ہونے دیگا، اور ہر نئی صورت واقعہ کے شمول سے کردار چمکتا جائیگا۔ لیکن اگر شروع ہی میں فضا تیار نہیں کی گئی ہے تو فسانے کا ناکام رہنا یقینی ہوتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ فضائے فسانہ کے باب میں میرا مافی الضمیر بخوبی واضح ہو جائے۔ اسلئے میں انگریزی کے ایک رومانی فسانے کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس اقتباس کو پڑھکر آپ میری گفتگو کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ سُنیئے:-

"ایک دوشیزہ باغ کے وسط میں بیٹھی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں گہرے رنگ کے پھول ہیں، پُشت پر ایک پتلی ندی بل کھاتی ہوئی بہہ رہی ہے، کنارے پر کہیں کہیں بانس کے جھنڈ ہیں، اور ایک عجیب قسم کا پرند کھڑا ہے۔ ...."

اس مختصر تصویر میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکی ہے، کچھ شوخ رنگ پھول ہیں، بل کھاتی ہوئی پتلی سی ندی ہے، نیستان کے دو چار جھنڈ ہیں، اور کنارے پر ایک تنہا پرند کھڑا ہے۔ مگر منظر کے ان چند خط و خال میں مجھے وہ سارا منظر اپنی تفصیلات کے ساتھ نظر آ رہا ہے جو اس تصویر کے آس پاس ہو سکتا ہے۔ اور اس منظر کی ساری فضا جو اس نقاشی سے پیدا ہے میری روح میں پیوست ہوتی جا رہی ہے۔ اسی اقتباس کا آگے کا ٹکڑا یہ ہے:-

"لڑکی کے قریب ایک درخت ہے جس میں بڑے بڑے پھل لٹک رہے ہیں۔ یہ درخت طرفہ طریق پر عام درختوں کے خلاف متناسب ہے۔ لیکن عام درختوں کی طرح اس میں بھی وہ بے نام شے موجود ہے جو ہمیں محسوس کرا دیتی ہے کہ درختوں میں جان ہے اور وہ انسان کے دوست ہیں۔ وہ لڑکی ٹکٹکی باندھے ہم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مدور اور نیلگوں آنکھیں، اور وہ پھول بھی جو اس کے ہاتھ میں تھے، ہمیں گھورتے معلوم ہوتے تھے۔"

پہلے ٹکڑے میں تنہا پرند اور دوسرے میں تنہا درخت، اس لڑکی کی تنہائی کی طرف اشارہ ہے۔ یقیناً آپ محسوس

کر رہے ہونگے کہ اس مختصر بیان سے اُس لڑکی کی حیران نظری اور حیران خیالی، دونوں کا اظہار مقصود ہے۔ لڑکی کی گول آنکھوں اور اُن پھولوں کو بھی گھورتا ہوا دکھانا، لڑکی کے گھورنے کو صناعت ادب کے منتہائے کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ اسکے ٹکٹکی باندھکر دیکھنے سے اُس کی معصومیت اور الھڑپن کا علم ہو جاتا ہے۔ درخت کا غیر معمولی تناسب اور اس میں نورس پھلوں کا ذکر اُس دوشیزہ کی جوانی و جمال سے استعارہ ہو۔ درخت کی طرفگی و ندرت دوشیزہ کی نادر شخصیت کی رمز ہے۔ اور پھر درخت کے اندر اس شے خاص کی موجودگی کا اشارہ ہے جو تمام درختوں میں مشترک ہوتی ہے۔ لڑکی کے اندر اجتماعی زندگی کی آرزو پروری، شوق، اور روح کا نکتہ ہے۔

مختصر لفظوں کے اس جامع اقتباس سے شعریت و ادبیت اور اس کی صناعت کے ساتھ منظر کشی کا کمال، کردار کشی کی معراج، اور افسانہ نویسی کا معجزہ پیش کر دیا گیا ہے۔ دوشیزہ کی جو تصویر اور اس کی فطرت اساس جوان مختصر جملوں میں دکھادی گئی ہے، اس میں اسقدر امکانات مخفی ہیں کہ اس کا کردار خود بخود بروز پا سکتا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتی ہو، معصوم ہے، لیکن محبت کی پزیرائی کے لئے طیار ہے۔ جس ماحول کے اندر یہ لڑکی پیش کی گئی ہے، وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی محبت پاکیزہ ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں روشن پھول ہیں، یعنی وہ اپنے گلہائے محبوبی کا تحفہ محبت کے شوالے پر چڑھانے کے لئے تیار ہے۔

ادب کے اس پُرصناعت نمونے میں آپنے دیکھا کہ مختلف قسم کی چیزیں بے ربط ہونے کے باوجود کتنی باربط ہیں؟ ایک ہی حالت کا اثر دوسری کے ساتھ کس درجہ ہم آہنگ ہے، ہر شے منفرد ہے لیکن اثر آفرینی نے اُن کو پانی کی موجوں کا ایک سلسلہ بنادیا ہے۔ اِس منظر نگاری کا مجموعی اثر فضا پیدا کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نقاشی میں اثر کی تکمیل و یکرنگی ہے اور موضوع کے مفہوم میں تسلسل اور اس کے ساتھ حسی و کیفیاتی سلسلہ و ربط بھی ہے۔

افسانے کا طرزِ بیان

افسانے کے پلاٹ، کردار، اور فضا، کے بعد میری آج کی گفتگو کا موضوع فسانے کا طرزِ بیان ہے۔ ادبیات میں تخیل کو رُوح اور طرزِ بیان کو جسم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ادب کی تحسین اور ادیب کا کمال اس میں سمجھا جاتا ہے کہ اُس کی ہر تحریر، بالنظم ہو یا نثر، حشو و زوائد سے پاک ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی لفظ یا کوئی بات بھرتی کی نہ ہو۔ چونکہ مختصر فسانہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں قلیل وقفے کے اندر مختصر الفاظ میں ایک فسانیکے مقصود کو مکمل طور پر پیش کرنا، اور وسیع مفہوم کو سمجھا دینا پڑتا ہے، اور چونکہ اس میں تمام تفصیلات بیان نہیں کی جا سکتیں اور مفہوم و مطلب کی طرف اشارہ سازی سے کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ دعوے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ یعنی فسانہ پڑھنے والے کو اپنے مقصود کا یقین دلا سکتا ہے۔ مختصر فسانہ ایک قاری کو متحرک کر سکتا ہے، اس سے شورش کرا سکتا ہے، لیکن اس کے اندر اپنے مقصود کا یقین پیدا کرنیکا مدعی نہیں ہو سکتا۔

الغرض کسی تحریر کو بھرتی سے پاک رکھنے کے لئے فسانے کے طرزِ بیان کا نادر ہونا ضروری ہے۔ طرزِ بیان کا حُسن اسی میں ہے کہ تحریر میں ایک لفظ، ایک فقرہ، یا ایک صورت واقعہ (situations) ایسی نہ ہو جسکو اگر نکال دیا جائے تو عبارت بے ربط یا مطلب خبط ہو جائے۔

کم سے کم الفاظ کا استعمال فصاحت کا اصول ہے، بشرطیکہ مفہوم میں الجھاؤ پیدا نہ ہو لیکن مختصر فسانے میں فصاحت کے خیال سے قطع نظر زیادہ سے زیادہ مفہوم بیان کرنیکے لئے محذوفات و مقدرات سے خاص طور پر کام لینا پڑتا ہے۔ ایک ایک پیرے اور صفحے کا کام لفظوں اور فقروں سے لیا جانا از بس لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے فسانہ نویس کو بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مقدرات و محذوفات سے عبارت ایسی مبہم نہ ہو جائے کہ مفہوم خبط اور جملے بے ربط نظر آئیں۔

فسانے کا یہ طرزِ بیان، میرے خیال میں، زیادہ دلکش ہوتا ہے کہ کردارِ فسانہ کے جن حالات اور واقعات کا تعلق اصل قصہ اور مقصودِ فسانہ سے نہ ہو، لیکن قصے کو سمجھانے یا کردار کو اُبھارنے کے لئے اُن کا بیان ناگزیر ہو جائے تو اُن میں سے صرف وہ حصے ضمنی طور پر بیان کئے جائیں، اور اس طرح بیان کئے جائیں کہ وہ اصل فسانے میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے ہوں، پلاٹ کو واضح، اور کردار کو سریع الفہم بناتے ہوں۔

ہر عمدہ انشاء کے لئے زورِ بیان لازمی چیز ہے۔ طرزِ بیان کمزور ہوگی تو فسانہ یقیناً غیر دلکش ہوگا اور غیر حقیقی نظر آئیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بیان کا پھیکا ہونا یا فسانے کا غیر حقیقی نظر آنا اسکا سب سے بڑا نقص ہے۔

زورِ بیان کے علاوہ طرزِ بیان میں زبان کی گھلاوٹ اور روانی جس قدر زیادہ ہوگی، الفاظ کا انتخاب جتنا متناسب، اور فقروں کا دروبست جتنا چُست ہوگا، اس کا حُسن اسی قدر بڑھ جائیگا۔ حسین طرزِ بیان میں انداز کی قطعیت بھی اس کے لازمی اجزاء میں سے ہے۔ لیکن طرزِ بیان میں زور اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ موقعہ کی مناسبت کے اعتبار سے اس میں جذبات کی کثرت و شدّت ہو، اثرات گہرے اور نازک حسیات بیان کئے گئے ہوں اور جہاں تک ممکن ہو خیال و بیان، دونوں میں انتہا کی صفائی ہو۔

افسانے کے بروز میں اگر کسی وقت مقصودِ فسانہ مبہم ہوگا تو اُس کا سبب طرزِ بیان کا نقص یا اس کی کمزوری ہوگا۔ اس کے برعکس مقصودِ فسانہ کو، ہر تائیدی صورت واقعہ کے شمول اور ضروری تفصیلات کے اضافے سے صاف اور واضح تر ہوتے رہنا چاہیئے۔

مختصر فسانے کی غایت ایک مجرد اثر پیدا کرنا ہے؛ اور یہ اثر مترتب ہو سکتا ہے ضروری تفصیلات کے صناعانہ بیان اور تائیدی صورت واقعہ کے صحیح انتخاب سے۔ ایسے تفصیلات وہ مخصوص و مختصر تفصیلات ہوں جو فسانے کی فضا بناتی ہوں، کردار کو بروز دیتی ہوں، اور اثر میں اضافہ کرتی ہوں۔ فضا کو غیر ہم آہنگ کریں کردار کے بروز کو نہ روکیں، اور اثر کو زائل کرنے والی نہ ہوں۔ اور تائیدی صورت واقعہ وہی منتخب کی جائیں جو اصل اثر آفرینی میں ممد ثابت ہوں، اُس کو ابہام میں نہ ڈالیں۔

ہر مُصنّف کا طریقِ کار (method) جُدا ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کی ذاتی اور خصوصی چیز ہے۔ افسانے میں مطلوبہ اثر ایک مُصنّف اپنے طریقِ کار سے پیدا کرتا ہے، اور اس اثر کے پیدا ہونے سے فضا بھی بنتی چلی جاتی ہے اور یہی وہ موقعہ بھی ہوتا ہے جب افسانہ نویس کو زمان و مکاں پر قدرت ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی فضا کی تکمیل یا اسکا ناقص ہونا مُصنّف کے طریقِ کار کی خوبی یا خرابی پر منحصر ہے۔ افسانہ نگار کا طریقِ کار جو اس کے طرزِ بیان کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے کردار کو بولتی چالتی تصویریں، گوشت و پوست کے انسان بنا دیتا ہے، اسکے پاس تنہا ذریعہ یہی ہے جس پر کہ زندگی کا سچا نقش کھینچنے کا مدار ہے۔

طرزِ بیان میں بالواسطہ اثر آفرینی زیادہ بہتر طریقہ ہے۔ بے واسطہ اور براہِ راست اثر پیدا کرنے میں ایک افسانہ نگار کو حتیٰ الامکان تامل ہونا چاہیئے۔ اور جہاں تک طرزِ بیان کی تزئین اور آرائش کا تعلق ہے، اسے محض ہلکے پن تک محدود رکھنا مناسب ہے۔ بالواسطہ اثر آفرینی اور اشاراتی آرائش کلام سے افسانہ پڑھنے والے کو افسانہ حقیقی معلوم ہونے لگے گا۔ اگر اثر آفرینی کا طریقہ بے واسطہ اور تزئین عبارت بھدی ہے تو افسانہ پہلی نظر میں غیر حقیقی معلوم ہوگا۔

ایک اور چیز جو طرزِ بیان کے لئے ضروری ہے وہ عبارت کی صوری و معنوی ہم آہنگی ہے یعنی الفاظ کا انتخاب و ترتیب مفہوم کی نوعیت کے لحاظ سے ہوتی ہو۔ الفاظ کا باہمی ربط و توازن مفہوم کے مناسب حال ہو۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ شروع کرنے کے بعد سے آخر تک قاری کی توجہ اس میں جذب رہے اور دلچسپی اگر بڑھتی نہ رہے تو قائم تو ضرور رکھی جاسکے۔

قاری کی توجہ اور دلچسپی قائم رکھنے کے لئے پہلے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ صورت واقعہ کا انتخاب نہایت صحیح ہو۔ پھر طرزِ بیان کی شگفتگی اور طریقِ کار کی ندرت کام دیتی ہے۔ فطری صورت واقعہ کا صحیح انتخاب اور طرزِ بیان و طریقِ کار کی شگفتگی و ندرت طویل ناول کے مقابلے میں مختصر افسانے میں بآسانی حاصل کی جاسکتی ہے۔ طویل ناول میں ان باتوں کو تا بہ آخر نبھا سکنا کامل فن ہی کا کام ہوتا ہے۔

میں نے اپنی پچھلی گفتگو میں بتایا ہے کہ افسانے کے بروز میں ایک صورت واقعہ بیان کرنیکے بعد نئی صورت واقعہ کی طرف گریز قصیدے کی گریز سے مماثل ہے۔ یعنی جب نئی صورت واقعہ بیان ہونے لگے تو واقعات کا باہمی ربط ایسا ہو کہ پڑھنے والا اس گریز کو محسوس نہ کرسکے۔ طرزِ بیان جو اختیار کیا جاتے وہ موضوع افسانہ کے رُتبے کے موافق ہونا چاہیئے۔ اسکو انگریزی میں (scale of values) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

افسانے کی کامیابی صرف طرزِ بیان پر موقوف ہے۔ طرزِ بیان میں کسی موقعہ پر ابہام پیدا نہ ہو، اسے چشمے کے پانی کی طرح صاف و شفاف ہونا چاہیئے اور اس میں اُسی پانی کی سی روانی بھی ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک چشمے کی طرح جس کا پانی کہیں گہرا ہوتا ہے اور کہیں اُتھلا، لیکن اس کی روانی اور بہاؤ ہر جگہ حسین نظر آتا ہے اسی طرح طرزِ بیان بھی گہرا اور اُتھلا ہوسکتا ہے، مگر اس کی روانی ہر جگہ حسین نظر آنا چاہیئے۔ آپ کے مُشاہدے میں آیا ہوگا کہ صاف و شفاف چشمے کی تہ میں بلور کے رنگین ٹکڑے اس پانی کو بھی رنگین دکھلاتے ہیں، اور کسی چشمے میں تو کہیں واقعی سچے جواہر بھی چمکتے مل جاتے ہیں۔

بالکل یہی صورت طرزِ بیان کی ہے۔ اس کے مفہوم کہیں گہرے ہونگے کہیں سطحی، مگر جابجا بلور پاروں کی سی رنگینی جھلکتی دکھائی دیگی، اور کسی وقت جواہر ریزوں کی آب و تابش بھی دکھائی دیجاتی گی۔

زمان و مکان کی وحدت اور اسکا ہم آہنگ رہنا، طرزِ بیان سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے کہ اگر ان دونوں میں کسی وقت تصادم رونما ہو جاتا ہے تو وہ ایک ادبی حادثے اور صدمے کا سبب بن جاتا ہے، جو فنِ فسانہ میں ناروا سمجھا جاتا ہے۔

طرزِ بیان اگر شگفتہ ہے تو اُس میں مُصنّف کا جمالیاتی ذوق بہ طرزِ احسن بہتے کار آسکتا ہے۔ طرز اور عبارت اگر سُبک ہے تو مصنف کے لئے سہل ہوتا ہے کہ وہ دھنک کی نیرنگی، ریشم کی چمک، مخمل کی نرمی، اور پھولوں کی مہک، اس طرح پیش کردے کہ خود اس کی طرزِ بیان زیادہ نازک و نظر فریب بن جائے۔ اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے کہ وہ جواہر کی رنگینی، اُن کی جوت اور دمک کی مُرصع کاری اس طرح کرسکے کہ طرز زیادہ لطیف ہونے کے ساتھ زیادہ قدر و قیمت کے قابل بھی ہوجائے۔ یہی اجزا ہیں کہ جن کے صناعانہ استعمال سے فسانے میں پلاٹ کے تار و پود کے بغیر بھی، ایک خوش رنگ قالینی بناوٹ پیدا کی جاسکتی ہے۔

ایک افسانہ نگار کو کسی وقت بھی یہ نکتہ نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ کردار کی نقاشی اس کے ماحول کی مناسبت سے اگر ثقیل یا شوخ ہوجائیگی تو باوجود زندگی کے مطابق ہونے کے بھی وہ زندہ نہ معلوم ہوگا۔ کیونکہ خود افسانے اور اسی کے ساتھ تائیدی کردار میں عدم تناسب کا نقص پیدا ہوجائیگا اور یہ تصنع اور آورد کی شکل ہے۔ اس لئے بہت احتیاط لازم ہوتی ہے کہ فسانہ نویس کردار کشی یا منظر نگاری میں اپنی حسِ تناسب کا صحیح استعمال کرے، تاکہ اس کے بنائے ہوئے مرقعے موقعہ و محل کی مناسب حد سے گھٹ بڑھ نہ جائیں۔ لیکن یہ حسِ تناسب ایک فطری ودیعت ہے جسے تعلیم، تربیت اور ماحول سے مدد ملتی ہے۔

ایک دوسری احتیاط جو فسانہ نگار کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ یکسانیت (— monotony) سے بچنا ہے۔ ایسے ایک مُصنّف کی فرہنگ الفاظ کا وسیع ہونا بہت ضروری چیز ہے۔ چنانچہ آپنے ادبی تنقیدوں میں پڑھا ہوگا۔ کہ مُصنّفوں کے مستعملہ الفاظ کی تعداد بھی دیکھی اور شمار کی گئی ہے۔ فرہنگ کا وسیع ہونا بجائے خود ایک کمال ہے۔ لیکن بالعموم ہوتا یہ ہے کہ جب ایک ادیب کی طرز قائم ہوجاتی ہے تو پھر اُس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا بھی تو وہ استعمال کم ہوتا ہے۔ آپ جس مُصنّف کی جونسی کتاب بھی اُٹھائیگا آپ اُس کے خاص خاص الفاظ اور مخصوص اندازِ بیان و ادائے خیال کی تکرار پائیگا۔ کسی ادیب کی فرہنگ کا محدود ہونا ہرچند کہ خوبی نہیں بلکہ ایک نقص ہے، لیکن اگر ایسا ہے تو اس افسانہ نویس کو پلاٹ قائم کرکے کردار وضع کرنے میں دقت و زحمت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ دماغ میں خیال پیدا ہوتا ہے اس کے لئے دماغ ہی الفاظ بھی پیش کردیتا ہے۔ چنانچہ جتنی جس کی فرہنگ ہوگی اسی کے مطابق خیال بھی اُس کے دماغ میں پیدا ہوگا۔ یعنی اسے تلاشِ الفاظ نہ کرنا پڑیگی۔ لیکن اگر کسی کی فرہنگ وسیع ہے اور ایک ہی خیال کے لئے اس کے حافظے میں متعدد الفاظ جمع ہیں تو یہ بات اس کے لئے گونہ دقت کا موجب ہوتی ہے۔ کیونکہ اسکو صحیح اور مناسب ترین

فظ اس خیال کو ادا کرنے کے لئے قائم کرنا پڑتا ہے۔ مگر جب اسے اپنی وسیع فرہنگ میں صحیح اور مناسب لفظ مل جاتا ہے نو اس کی ادبی پیدا وار یقیناً اس محدود فرہنگ والے مُصنّف کی پیداوار سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ غرض کہ محدود ذخیرہِ الفاظ والے افسانہ نویس کے لئے آسان ہوتا ہے کہ ایکبار موضوع و مقصود قائم کرکے، محدود طریق پر، افسانہ بیان کرنا شروع کردے۔ اُسے بہت سوچنا نہیں پڑتا۔ اس کا پلاٹ بن جانیکے بعد کردار بروز پانے رہتے ہیں اسکے خیال ۔ الفاظ میں کشاکش نہیں ہوتی یا شاذ ہوتی مگر شدید نہیں ہوتی۔ اسے اظہارِ خیال کے لئے مناسب ترین لفظ کے انتخاب پر غور نہیں کرنا پڑتا یا بہت کم کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ سوچا لفظوں میں جاتا ہے اس لئے اس کا خیال انہیں الفاظ کی حدود کے اندر رہتا ہے جو اس کا حافظہ پیش کرسکتا ہے۔ یہ محدود اور وسیع فرہنگ کی بحث میرے لئے یوں ناگزیر تھی کہ مجھے آپ کے سامنے یہ نکتہ پیش کرنا ہے کہ محدود فرہنگ والا مُصنّف، کثیرالالفاظ مُصنّف کے مقابلے میں بے واسطہ ثر آفرینی سے تو قاصر رہتا ہے، لیکن وہ خیال آفرینی اور اشارہ سازی میں بسہولت کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور ہرچند سے یہ سہولت حاصل ہوتی ہے، مگر یہ خطرہ بھی ہر وقت ہوتا ہے کہ جب اُس کا خیال اس کے الفاظ کی رسائی سے اونچا ہو جائیگا، اس کا اظہارِ بیان ہمیشہ ناقص و نامکمل رہے گا۔ اور اظہارِ خیال کا ناقص ہونا، طرزِ بیان کو ناقص یے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فسانے کے طرزِ بیان کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ شروع میں لہجہ گونہ سُست رکھا جائے اور پھر بتدریج زور پیدا ہوتا ائے۔ بعض نامور مُصنّفین کے اس انداز کی تعریف کی گئی ہے، لیکن میری ناچیز رائے میں بہ صورت صناعت ادب کی ئی اعلیٰ منظر نہیں ہے۔ میں تو اس انداز کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں کہ فسانے کی اُٹھان کے ساتھ طرزِ بیان میں پوری ت و توانائی کا اظہار ہو اور وہ آخر تک قائم رکھا جائے۔ طرزِ بیان کی ہمواری میری رائے میں ادبی حُسن ہے ور اس کی ناہمواری بہت بڑا نقص۔

طرزِ بیان کی دلکشی کے لئے اس میں اس طریقے کو مُرجح سمجھتا ہوں کہ کردار کے جذبات کبھی خود اس کے مُنہ سے راہِ راست بیان نہ کرائے جائیں، بلکہ بالواسطہ یعنی اس کے عمل (action) سے بیان ہوں یا تائیدی کردار فسانے کے ذریعہ سے بیان ہوں۔ آپکو خود بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ ایک شخص کی تکلیف یا خوشی کا بیان خود اُسکے مُنہ سے سُنکر پ اتنے متاثر نہیں ہوتے ہیں جتنا کہ خود قیاس یا اندازہ کرنے سے۔ اور چونکہ افسانے کا مقصد پڑھنے والے کو کردار کے تاثر کی حد تک متاثر کرنا ہے، اسلئے ہمیشہ بالواسطہ اثر پیدا کرنا زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے مگر بالواسطہ ثر آفرینی میں دستگاہ ہونے کو ایک مدّت درکار ہوتی ہے۔

آورد اور تصنع جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ناکام اثر رہتی ہے، اُسی طرح افسانے کے طرزِ بیان میں ن کا ناکام رہنا یقینی ہے۔ شاندار و خوشنما الفاظ اور سطحی مضامین حسین طرزِ بیان کو بھی بے جان بنا دیتے ہیں۔ یک صاحبِ فن افسانہ نویس محض عبارت آرائی سے اتنا ہی پرہیز کرتا ہے جتنا کوئی کسی معبد کو گندہ کرنے سے یا کرسکتا ہے۔

روائی طرزِ بیان اور پلاٹ کی سادگی سے مصنف کو پورا موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی صناعت ادب کو بروئے کار لاسکے۔ حسنِ بیان کا مقتضا رہے کہ جذبات کو عریاں نہ کیا جائے۔ محبت کے بیان کو پاکیزہ رکھنا اور اس میں عمومیت یا سوقیت پیدا نہ ہونے دینا طرزِ بیان کے کمال کی دلیل ہے، ایک مصنف اگر اپنے فن میں کامل ہے تو وہ اکثر اوقات خیالات کے اظہار، احساسات کے بیان، لفظی مرقعوں میں الفاظ کے متوازن استعمال سے صورت واقعہ پیدا کرسکتا ہے۔ اور اسکو طرزِ بیان کی معراج کہا جاسکتا ہے۔ طرزِ بیان ایک بے حقیقت بات یا واقعہ کو ایک اعلےٰ بات یا دلچسپ واقعہ بنا سکتی ہے، ارضی چیزیں سمائی بنا سکتی ہیں اور کثیف نوری ہوسکتا ہے۔

آخر میں یہ اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بنانے اور سکھانے سے آدمی بہت کچھ جان جاتا ہے، لیکن جو چیز کہ واقعی عرفانی ادب پیدا کراتی ہے وہ اُپج ہے۔ باقی وجاہات نہیں، بلکہ صحیح ذوق اور صحیح حسن تناسب ہے، اور ذوق کے بارے میں بیدلؔ کا فیصلہ یہ ہے کہ ع

طبع سلیم فضل است ارث پدر نہ باشد!

ل۔ احمد

تجلیات

درد پاکر ہمہ تن دل نہیں ہونے پاتے
ہم ترے عشق کے قابل نہیں ہونے پاتے

اشک بنجاتے ہیں وہ خونِ جگر کے قطرے
قصۂ غم کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

ڈوب چکتے نہیں ہم بحر میں طوفانوں سے
یعنی آسودۂ ساحل نہیں ہونے پاتے

دیر و کعبہ ہیں بالفاظِ دگر وہ سجدے
جو مرے عجز میں شامل نہیں ہونے پاتے

بے محابا نگہ شوق تجھے دیکھتی ہے
اب حجابات بھی حائل نہیں ہونے پاتے

کردیا شوقِ طلب نے ہمیں گم کردۂ راہ
ہم سرِ جادۂ منزل نہیں ہونے پاتے

صورتِ شمع جلے بزم میں تیری برسوں
پھر بھی ہم رونقِ محفل نہیں ہونے پاتے

ہے کمی شوقِ شہادت میں دمِ قتل کہ ہم
قوتِ بازوئے قاتل نہیں ہونے پاتے

روزِ فردا بھی قیامت نہیں ہوتا تابشؔ
اُن کے وعدے ہیں کہ باطل نہیں ہونے پاتے

تابش دہلوی

شاعرِ درماندہ

ندگی تیرے لئے بسترِ سنجاب و سمور
ور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری،
افیت کوشیِ آبا کے طفیل۔
ں ہوں درماندہ و بے چارہ ادیب
ستۂ فکرِ معاش!
رۂ نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
ں مرے دوست مرے سینکڑوں اربابِ وطن!

تجھے اِک شاعرِ درماندہ کی اُمید نہ تھی
جھ سے جس روز ستارہ ترا وابستہ ہوا
تو سمجھتی تھی کہ اِک روز مرا ذہنِ رسا
ور مرے علم و ہُنر،
حر و بر سے تری زینت کو گہر لائیں گے
رے رستے میں جو حائل ہوں مرے تیرہ نصیب

کیوں دعائیں تری بے کار نہ جائیں
اور راتوں کے سجود اور نیاز
(جسکا باعث مرا الحاد بھی ہے!)

اے مری شمعِ شبستانِ وفا۔
بھُول جا میرے لئے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے
تجھے معلوم ہے مشرق کا خُدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سرا پردۂ نسیاں میں ہے
تُو مسرت ہے مری تُو مری بیداری ہے
مجھے آغوش میں لے
دو "انا" مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس نور کی ہے تجھکو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے!

ن۔م۔راشد

نعرۂ انقلاب

از ——— قاضی نذر الاسلام
ترجمہ ——— اختر حسین رائے پوری

اشتراکی: میں اس مساوات کے گیت گاتا ہوں
جہاں پہنچ کر سب اختلاف اور تفرقے
مٹ جاتے ہیں۔
جس کے سایہ میں ہندو اور بودھ مسلمان اور عیسائی ہمدوش
ہو جاتے ہیں۔
میں اسی مساوات کا نغمہ سنج ہوں۔
تم کیا ہو؟ — پارسی جین یا یہودی- بولو تو ہی کیا
ہو۔
تم جو کچھ بھی ہو- تمہاری مرضی ہے۔
پیٹھ پر خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لادے پھرو۔
قرآن- پران- انجیل- وید- تمہارا جی چاہے تو انہیں
گھول کر پی جاؤ۔
لیکن یہ تو کہو اس درد سر سے مدعا کیا؟ ان کاغذی
پھولوں پر جان کیوں دئے دیتے ہو- وہ دیکھو باغ جہاں
میں نئی چمن بندی ہو رہی ہے- سارے زمانہ کے علم کو کھنگالنے
والو ذرا کتاب دل کی طرف بھی تو ایک نظر دیکھ لو۔
تمہیں اپنے نفس میں دینِ حق کا چراغ جگمگاتا ملے گا۔
تمہارا دل وہ کعبہ ہے جو نوعِ انسان کا قبلہ نما

تمہارا دل جو تجلی نور ہے تمہاری اس کورچشمی پر حقارت
سے ہنستا ہے۔
بڑے بڑے تاجدار اسی دل کے آگے سر تسلیم خم کرتے
ہیں۔
وہی تیرتھ ہے- وہی کعبہ ہے- وہی کاشی ہے- وہی
یروشلم ہے۔
دیر و حرم- کعبہ و کلیسا- سب کچھ اسی دل میں ہے۔
عیسیٰ اور موسیٰ نے اسی خانۂ دل میں بیٹھ کر حق کی
جھلک دیکھی تھی۔
یہی وہ میدانِ جنگ ہے جہاں کشن نے گیتا کا درد
کیا۔
اور اسی کوہ میں بیٹھ کر نبیوں نے حقیقت کی تھاہ پائی۔
یہی وہ کوہِ ندا ہے جہاں گوتم بودھ نے مظلوم انسانیت
کی پکار سنی اور اس کی نجات کی خاطر راج پاٹ تج دیا۔
اسی دل کے مندر میں بیٹھ کر رسولِ عربی نے اپنا پیغام
سنایا۔
ہمدم تو کس فریب میں مبتلا ہے۔
سچ جان کہ اس دل سے بڑی کوئی سجدہ گاہ نہیں ہے؟

خدا: تم آکاش پاتال اور دشت و جبل میں کس
خدا کو ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔

تم وہ دیوتاؤں اور فرسودہ کتابوں کی تلاش میں ناحق
[illegible] سے پھرتے ہو

درویشو۔ صوفیو۔ تم نے بھی کمال کر دیا۔
دُنیا تمہارے مُنہ کو تک رہی ہے اور تم ہو کہ آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو۔

خالق کی تلاش۔ یعنی تم آپ اپنی تلاش میں سرگرداں ہو۔

عقل کے اندھو۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو تو آئینہ میں تمہیں اپنے چہرے کی ہر رگ پر اُسکی صورت نظر آئے گی۔

یہ سُنکر آگ بگولہ نہ ہو جاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ خدانخواستہ تم ہی اللہ میاں کے پرائیویٹ سکریٹری ہو ا

ہر شے میں اس کا نُور ہے اور وہ ہر انسان سے شناسا ہے۔

سوداگر ساحل پر بیٹھ کر موتیوں کا سودا کرتے ہیں لیکن اُنہیں سمندر کی تھاہ کیا معلوم۔ یہ موتی کو پرکھ سکتے ہیں لیکن سمندر کی گہرائی کی خبر انہیں کیا۔

اس سمندر میں یہ گہرے کبھی نہیں گئے۔

ہمدم! تو ان کتابوں کو چھوڑ اور دریائے حقیقت کے اندر بیٹھ کر دیکھ کہ کیا تماشا نظر آتا ہے۔

انسان:- میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔
انسان سے بڑا کوئی نہیں ہے۔

ہر زمانہ میں، ہر مُلک میں، ہر نسل میں، جتنے انسان ہوتے ہیں سب ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں۔ وہ سب انسانیت کے زمرہ میں شامل ہیں۔

پُجاری! دروازہ کھول! بھوک کا دیوتا در پر سے کھڑا ہوا ہے۔ اُٹھ کہ پوجا کا وقت ہو گیا۔

خواب میں یہ ندا سُن کر پُجاری چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور عبادت گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ سوچا کہ دیوتا کا کرم ہو تو سب دلدّر دُور ہو جائیں۔

مسافر کے کپڑے تار تار تھے اور وہ بیدِ مجنوں کی طرح لاغر تھا۔ بھوک سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا" بابا۔ سات دن کا بھوکا ہوں"۔

مگر دروازہ بند ہو گیا اور ہراساں بھکاری اندھیری رات میں جاڑے میں کانپتا ہوا وہیں گر پڑا۔ بھوک کی آگ میں وہ جلا جاتا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "دیوتا۔ یہ تیرا نہیں پُجاری کا مندر ہے"۔

کل مسجد میں کہیں سے کھانا آیا تھا۔ پلاؤ، قورمہ کی رکابیوں کو مُلا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک مسافر آیا جس کا جسم تکان سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ بولا" بابا! کئی روز سے فاقہ کر رہا ہوں"۔

مُلّا نے دیدے نکالکر کہا "مردود۔ یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے۔ کبھی نماز بھی پڑھتا ہے؟"

بھکاری نے کہا "جی نہیں" مُلّا نے چیخ کر کہا "ملعون نکل خدا کے گھر سے" یہ کہہ کر مسجد میں اُس نے قفل جڑ دیا۔

فقیر نے آہ بھر کر کہا "یارب۔ اسّی سال کی مدّت میں میں نے تجھے کبھی یاد نہیں کیا۔ تاہم میری روٹیوں پر تُو نے پابندی نہیں لگائی۔ تیرے مندر و مسجد پر انسان کا کیا اختیار ہے؟ پنڈتوں اور مُلّاؤں نے اُن پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے"

ہلاکو۔ چنگیز۔ غزنوی اور کالا پہاڑ کہاں ہیں؟ ان مُقفّل عبادت گاہوں کو توڑ کر کیوں نہیں پھینک دیتے۔

خدا کے گھر پر کون تالا جڑتا ہے۔ کون زنجیر لگاتا ہے۔

لاؤ ہتوڑی اور گدالا مسمار کر دو ان سیفانوں کو۔

اے عبادت خانو! تمہارے میناروں پر چڑھ کر منافقت نفس پرستی کا پرچم لہراتی ہے۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔

قرآن۔ وید اور انجیل کو چوم چوم کر یہ کمبخت مرے جاتے ہیں۔ یہ ناسمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی انہیں بتلائے کہ انسان کتابیں بناتا ہے۔ کتابیں انسان پیدا نہیں کرسکتیں۔ اور ان مُردہ کتابوں کے صدقے میں زندہ انسان ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں۔

ہم سب کی رگوں میں مذہب کے بانیوں کا خون بہہ رہا ہے۔ ہم انہیں کی روداد ہیں۔ ہم بھی اُن جیسے انسان ہیں۔ معلوم نہیں۔ ہم میں سے کون اُن کے رتبہ کو حاصل کرے۔

ہمدم۔ میرا مذاق نہ اُڑا۔ "انا" کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

ممکن ہے کہ ہمیں میں کوئی کلجگی اوتار ہو۔ کوئی مہدی ہو۔ کوئی عیسیٰ ہو۔

پھر تُو کس سے نفرت کرتا ہے۔ کس پر وار کرنا چاہتا ہے؟

اے نادانو۔ اس کا سینہ بھی بیت اللہ ہوسکتا ہے۔

اگر وہ بیمار اور نحیف ہے۔ اگر نادار اور مُفلس ہے تو کیا ہوا؟

دُنیا کے تمام عبادت خانے اس ایک پیکرِ خاکی سے زیادہ مقدس نہیں ہوسکتے۔

ممکن ہے کہ اسی دُکھیاری عورت کے بطن سے ایک ایسا انسان پیدا ہو جو تاریخ عالم میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔

جس بطلِ نور کو آج تک دُنیا نے نہیں دیکھا۔

جس ندا کو سُننے کے لئے زمانہ اب تک گوش برآواز ہے۔

ممکن ہو کہ وہ اسی کی جھونپڑی کو نوازے۔

انہیں گورکن کہہ کر حقارت سے نہ ٹھکراؤ۔ انکے اندر نہ جانے کتنے ہریشچندر چُھپے ہوئے ہیں۔ کل انہیں میں سے کوئی سربلند ہوا تو تم اس کی آستان بوسی کو اپنی معراج سمجھو گے۔

گوالا کہہ کر اُسے کیوں نفرت سے دیکھتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں پھر کوئی کشن پیدا ہو۔

کسان کے نام پر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہو۔ سچ پوچھو تو وہی اس دُنیا کا سرتاج ہے۔

ان گڈریوں پر نہ ہنسو۔ انہیں میں ایک ایسا نبی پیدا ہوا جس کا پیام اب تک دُنیا کو منور کر رہا ہے۔

تمہارے دروازے پر کوئی فاقہ زدہ آیا تھا۔ اُسے تم نے دھکے دے کر بھگا دیا۔ تم کیا جانو کہ اس بھیس میں کون دیوتا تمہارا امتحان لے رہا تھا۔

ہمدم! تیرے سینہ میں حرص کی آگ سلگتی ہے، اور آنکھوں سے خود غرضی ٹپکتی ہے۔ ورنہ تُو دیکھتا کہ تُو فرشتوں سے قُلی کا کام لے رہا ہے۔

دردِ دل ہی لذّتِ حیات ہے،

لیکن او دُنی فطرت، اسی جوہرِ انسانیت کو تُو اپنے نفس پر قربان کر رہا ہے۔

تجھے خبر نہیں کہ حرص و ہوا کا چنگل تجھے تیزی سے موت کے غار کی طرف دھکیل رہا ہے۔

گُناہ:- میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔
سب گنہگار میرے ہی بھائی بہنیں ہیں۔
اور میں؟ —— میں تو دریائے معاصی میں ڈوبتے اترانے پاپیوں کا سردار رہوں۔

۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے بارِ گنہ سے جہنم دبا جا رہا ہے۔

لیکن انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر ملائک نے بہشت کی راہ پہچانی ہے۔

آدم سے لے کر نذر الاسلام تک ــــــ ہر فرد بشر نے عذاب کی چھری سے ثواب کا گلا ریتا ہے۔

یہ تو پاپیوں کی بستی ہے۔

اس کے آدھے حصہ پر خدا کی حکمرانی ہے اور آدھے پر شیطان کی کار فرمائی۔

مذہبی دیوانو، سنو! دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھوں کے شہتیر کو تو دیکھو۔

نیکی کے پودے پر صرف گناہ کے پھول کھلتے ہیں۔

اس جہانِ جمیل میں فریب و معاصی کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔

کوئی اوتار اور کوئی پیغمبر اپنے کو بے داغ نہ رکھ سکا۔

اس نے اپنی روح اگر ثواب کے سپرد کی تو اپنا جسم گناہ کے حوالے کیا۔

ہمدم، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ برہما، وشنو اور مہادیو جیسے جغادری ــــــ انسان کا ذکر ہی کیا ہے بڑے بڑے رشی منی ــــــ ان سب کی روح بے ریا ہو تو ہو، لیکن ان کے کالبد خاکی لہو و لعب کے پتلے تھے۔

یہ دنیا سیہ خانہ ہے جہاں خرِ مذہب کی پیٹھ پر ثواب کا خیالی پلان پڑا ہوا ہے۔

یہاں سب پرانے پاپی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے گناہ کے ترازو پر دوسروں کی بدکاریوں کو تولتا ہے۔

چوٹی اور ڈاڑھی کے پردے میں کیا تم اپنی ریاکاری کو چھپا سکتے ہو۔

پولیس کا وجود جس طرح چوروں کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے اسی طرح یہ پُر فریب وضع تمہاری سیہ کاریوں پر دلالت کرتی ہے۔

ایک روز فردوسِ بریں میں معصوم فرشتوں نے احتجاجی جلسہ کیا۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ اللہ میاں ہماری عبادت سے تو بے نیاز رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تمام رحمت اس خاکی عاصی ناری انسان کی طرف متوجہ رہتی ہے

یہ شکوہ خالق کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مسکرا کر کہا کہ اس خاک کے پتلے نے کمال نازک دل پایا ہے، اسکی دنیا میں ہر پھول کانٹوں سے چھدا ہوا ہے۔

ہر نین میں جادو ہے اور ہر لبِ لعلیں زہر ہلاہل میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہاں صندل بھی تپِ آرزو میں مبتلا ہے اور چاند بھی بوسوں کی گرمی سے سیاہ پڑ رہا ہے۔

وہاں ہر حسین آنکھوں میں کاجل لگائے، گلے میں چندن ہار ڈالے، پیروں میں مہندی لگائے، ہونٹوں کو خوناب کئے ــــــ عالم کو تہ و بالا کرنے کے درپے ہے۔

اس دنیا میں شیطان حسن کی پوشش میں ملبوس ہے اور حسن کی نگاہوں میں تیر ہے تو مسکراہٹ میں انی ہے

یہ سنکر فرشتوں نے کہا کہ معبودا! ہمیں بھی ٹک اس جہان کی سیر کرا دے جہاں پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ کملائیں، مرجھائیں اور پھر پیوندِ خاک ہو جائیں۔

دربارِ باری سے ارشاد ہوا کہ تم میں سے دو جو سب سے افضل ہیں اس خاکدان کی طرف جائیں اور فریب کا تماشا دیکھیں۔

اجازت ملتے ہی ہاروت اور ماروت ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح آسمان سے زمین پر اُترے۔

یہاں آکر کیا دیکھتے ہیں کہ ذرّہ ذرّہ دامِ تزویر ہے۔ پتا پتا نقشِ فریب ہے۔ آسمان پر تو فقط ایک مہتاب جلوہ ساماں ہے لیکن آب دریا میں اس کی صدہا پرچھائیاں اُتر آئی ہیں۔

یہاں کی ہر ندا، ہر رنگ و بو حسنِ خوں آشام کی تفسیر ہے۔

جس گھاٹ پر دیکھو روپ کی گگری کھل کھلا رہی ہے۔ لیکن اس کی صدائے بازگشت بانسری کے سُروں میں فریاد بن گئی ہے۔

دو دن کے اندر ان آتشِ نفس فرشتوں کی رگ رگ میں مٹی کا رس سما گیا اور ان کے دل ایک جادو نظر کے گرفتار ہو گئے۔

جب زہرہ لہنگا پھڑکا کر اور گگری چھلکا کر سامنے سے نکل گئی۔

تو ان خلد نشینوں کے پیروں میں عشق کی زنجیر پڑ گئی۔

آتشِ جہنم کا خوف لبِ شکریں کی شیرینی میں سرد ہو گیا۔

اور شرابِ کوثر کا لطف مٹی کے پیالوں کے آگے ہیچ ہو گیا۔

وہ ریاضت اور عبادت کہاں گئی؟ — اب خدا کے ان مجلسیانِ خاص کو دیکھو کہ کس مزے سے ساغر لنڈھا رہے ہیں۔

ادھر اللہ میاں نے فرشتوں پر طعن کس کر کہا۔ دیکھو زمین لیتم نے ہاروت و ماروت کا کیا حشر کیا؟

ہم نشین! یہاں ایک ایک جادو بھرے نین میں وہ قدرت ہے کہ اس کے ایک اشارہ کے سیل میں مدتوں کا زہد تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔

مادرِ گیتی کا حسن سدا بہار ہے۔

اور اس پر کسی جبار و قہار کا حکم نہیں چلتا۔ بلکہ اس پر محبت کا دیوتا اپنی رانی کے ساتھ فرماں روائی کرتا ہے۔

طوائف — تجھے طوائف کہہ کر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟ ممکن ہے کہ تو سیتا جیسی کسی ستی کی بیٹی ہو۔

تو جو کچھ ہو، ہماری ماؤں بہنوں کی ہم جنس تو ہے۔

تیرے بچے بھی ہم جیسے ہیں۔ شاید کہ ہمارا ہی کوئی ماموں یا چچا اُن کا باپ ہو۔ کیا عجب کہ ان کے چہرے پر ان کا عکس رخ نظر آ جائے۔ وہ بھی تو فیر اور عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی آواز بھی روح القدس سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ پیدائش کے بعد انسان سے نفرت صریح کفر ہے۔

کیا گناہ کا مرتکب کبھی ثواب نہیں کر سکتا؟

اگر اہلیا[1] کو نجات حاصل ہو سکتی تھی اور میری[2] عصمت کی

---

[1] "اہلیا" گوتم رشی کی حسین و جمیل بیوی تھی جس پر اندر دیوتا سو جان سے فریفتہ ہو گئے۔ ان دونوں کی خفیہ محبت کا پتہ چلنے پر۔ رشی جی نے اہلیا کو بد دعا دی۔ کہ پتھر کی مورت بن جا۔ جب رام چندر جی کے پیر اس پر پڑے تو اس نے پھر انسانیت کا جامہ پہنا۔

[2] "میری" ایک فاحشہ عورت تھی جسے زناکاری کے جرم میں لوگ سنگسار کرنا چاہتے تھے جب اُنہوں نے مسیح سے اجازت چاہی تو انہوں نے جواب میں وہ معرکتہ آلآرا جملہ کہا۔ "جس کسی نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، وہ اس پر پتھر چلائے"۔ بعد ازاں اس عورت نے اپنی ایسی اصلاح کی کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

دیوی بن سکتی تھی تو۔

تو بھی حق و صداقت کی راہ پر چل کر قابلِ عزت بن سکتی ہے۔

تیری اولاد کو جو لوگ نطفۂ ناتحقیق کہہ کر ٹھکراتے ہیں۔ اُن سے میں پوچھوں گا کہ اے نیکی کے فرشتو! دُنیا والوں میں سے کتنوں نے جذبۂ شہوت کو ٹھکرایا ہے؟ اُن میں سے کتنے گناہ سے پاک تھے؟ ہم سب کو اسی شہوانی بھوک نے جنم دیا ہے۔ لیکن کوئی ہمارے غرور کو تو دیکھے۔

نطفۂ تحقیق ہو یا ناتحقیق ــــــ وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہے۔

اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ٹھہرا تو شہوت پرست باپ کا بیٹا بھی یقیناً حرامی کہلائے گا!

عورت:- میری نگاہ میں مرد عورت سب برابر ہیں۔
دُنیا کے حشمت و جلال کی تعمیر میں عورت کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا مرد کا۔

سوز و ساز، تپش و خلش، آگ اور آنسو ــــــ ان کی تخلیق میں مرد کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا عورت کا۔

دیوی! تجھے گناہ کا سبب کون بتاتا ہے؟

کہہ دے کہ گناہ کا تخم بونے والا ابلیس مرد ہی کا ہم جنس تھا۔ یا یوں کہو کہ وہ نہ مرد ہے نہ عورت بلکہ خواجہ سرا ہے! اور دونوں میں ہل چل کر رہتا ہے۔

اِس جہان میں جتنے پھول کھلتے ہیں، جتنے شجر اُبھرتے ہیں عورت ہی نے ان میں رنگ و بو، شیرینی و لطافت کی روح پھونکی۔

ہم نشین! تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے؟

اندر ممتاز سوتی ہے۔ باہر شاہجہاں آرام کر رہا ہے۔

عورت دل ہے، مرد جسم ہے۔

اگر مرد سُورج کی تپش اور بادِ سموم کا جھونکا ہے، تو عورت چاند کی کرن اور نسیمِ صبح گاہی ہے۔

اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت جامِ کوثر ہے۔

مرد نے ہل چلایا۔ عورت نے پانی سے سینچا۔ ان دونوں کے سنجوگ سے کھیتی لہلہا اُٹھی۔

سونے اور چاندی کی زنجیریں عورت کے جسم سے چھُو کر حسین زیوروں میں مُبدّل ہو جاتی ہیں۔

عورت ہی نے شاعری کی بنا ڈالی۔ اور مرد کے ہر لفظ کو موسیقی میں بدل دیا۔

عورت سلسبیل ہے، مرد مجسم پیاس ہے۔

پانی اور پیاس ان دونوں کے میل سے ایک نیا آدم پروان چڑھتا ہے۔

مرد کی ہر فتح و نصرت عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے۔

تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خُون بہایا۔

لیکن یہ کون بتلائیگا کہ اس کے لئے عورتوں نے کس طرح اپنا سُہاگ اُجاڑ دیا؟

ماں نے جگر پاروں کو کیسے نکال پھینکا؟

شجاعت کی داستانوں میں یہ کہاں لکھا ہے کہ فلاں فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی نے برقِ دم بنا دیا تھا۔ راجہ پرجا پر حکومت کرتا ہے مگر راجہ پر رانی راج کرتی ہے۔ ملکہ کی محبت، حاکم کی نخوت کو دھوتی ہے۔

اے بے درد مرد سُن! کہ عورت نے اپنا خون دے دے کر تجھے زندگی سے مالا مال کیا ہے، تاریخ جن لوگوں کے نام پرداری قربان ہوتی ہے وہ سب خود فراموشی کے ایک لمحہ میں پیدا ہوئے تھے۔

عیاش باپوں کے ذہن میں ان کا تخیل بھی نہ تھا۔

ماں کی مامتا بچّہ کو رحم و کرم، اُلفت و محبت کا سبق پڑھاتی ہے، مرد کی وفا نا آشنا آنکھوں میں عورت ہی دردمندی کا کاجل لگاتی ہے۔

لیکن مرد کی احسان فراموشی تو دیکھو کہ وہ عورت سے کس طرح پیش آتا ہے۔ جس نے اسے گود میں کھلایا اسی کا گلا گھونٹتا ہے۔

جس شخص نے اپنے باپ کا حکم مان کر اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ اسے انسان اوتار سمجھ کر پوجتا ہے پرشرام جنہوں نے اپنے باپ کا حکم پا کر اپنی ماں کو قتل کیا تھا۔

لیکن سُن رکھو! اب وہ دن بیت گئے جب عورت مرد کی پابند تھی۔

یہ مساوات، انسانیت اور اشتراکیت کا زمانہ ہے۔

بادِ صبا یہ پیغام لاتی ہے کہ غلامی کے سب بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔ اب نہ کوئی غلام ہے نہ کوئی غلام فروش۔

اگر مرد عورتوں کو قید رکھنے کی کوشش کرے گا۔ تو وہ دن دور نہیں ہیں کہ یہ طوق خود اس کے گلے کا پھندا بن جائے گا اور وہ آپ اپنے دام میں تڑپتا ملے گا۔

دورِ حاضر للکار کر کہہ رہا ہے کہ جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودینگے وہ خود اسی میں گر کر مٹ جائیں گے۔

او مٹی کے بلبلو، عورت پر جتنا تشدد روا رکھو گے اسی قدر نامرد ہوتے جاؤ گے۔

عورت بتلا تو سہی، ان سنہری روپہلی بیڑیوں میں تجھے کس نے جکڑ رکھا ہے؟

یہ کیوں ہے کہ اب تو اپنی جھجک سے آپ ٹھٹھر گئی ہے۔

اور تیری آواز اس خیال سے کانپتی ہے کہ اسے کوئی سُن نہ لے۔

آج تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ بھی نہیں سکتی۔

تیرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے، پاؤں میں بیڑی اور چہرے پر گھونگٹ۔

عورت، کب تک تو اس ظلم کو برداشت کرے گی۔

توڑ دے ان پابندیوں کو، نکل آ اس زنداں سے!

یہ زیور تیری غلامی کا تمغہ ہیں، انہیں مردوں کے مُنہ پر پھینک دے۔

مادرِ گیتی کی لاڈلی بیٹی، پہاڑ اور جنگل کیوں اب تیری آواز سے نہیں گونجتے؟

کیا یونانی سچ کہتے ہیں کہ موت کا فرشتہ ایک روز تجھے اپنے اندھیرے تہہ خانہ میں قید کر آیا تھا؟

ہاں ہاں یہی ہوا تھا، تو روزِ ازل کی زندانی ہے۔

لیکن تو ڈرتی کیوں ہے، جب تو اپنے قید خانہ کی دیواروں کو توڑ کر نکلے گی تو تیری چوڑیاں تاریک راستہ کو اُجال دینگی۔

مرد جو عزرائیل کا کُتّا ہے، اپنے مالک کے ساتھ تیرے قدموں پر لوٹتا نظر آئیگا۔

عورت! اپنے نازک ہاتھوں سے دُنیا کو آج تک تو نے امرت کے پیالے پلائے تھے، للّٰہ اب انہیں ہاتھوں سے سمِ قاتل پلا دے! پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب آسمان مرد کے ساتھ عورت کا بھی جیکار منانے لگے گا۔

ڈاکو:- بھائی، تجھ پر جو چوری کا الزام لگاتا ہے اُسے یہ نہیں معلوم کہ آج یہی قانونِ کائنات ہے۔ حکومت منظم ڈکیتی نہیں تو اور کیا ہے۔

کون ہے وہ خدائی فوجدار جو چوری کی بُرائیوں پر وعظ کہہ رہا ہے؟

اس سے کہو کہ دُنیا سے ایک بھی فرد بشر نکال کر لادے جو ڈاکو نہیں ہے۔

منصف صاحب! ان قانون کے پوتھوں کو طاق پر رکھئے۔

غریبوں کی جیب کاٹ کاٹ کر آج یہ سرمایہ دار جاہ مند بنے پھرتے ہیں۔

جو شخص جتنا بڑا بے ایمان، فریبی اور جعلساز ہے۔ ہمارے سماج میں اتنا ہی معزز اور ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔

رعایا کی ہڈیوں سے راجہ کے محل کی اینٹیں اور رعایا کے خون سے محل کا گارہ تیار ہوتا ہے۔

حریص سرمایہ داروں کے کارخانے غریبوں کی محنت سے تیار ہوتے ہیں۔ ان کی مشینیں غریبوں کے خون سے چلتی ہیں، مگر ان کے چلتوں انگنت انسان بیکار ہو کر در در مارے مارے پھرتے ہیں۔

بیشمار انسانوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم کرکے مل کا مالک شغل ناؤ نوش میں مست رہتا ہے اور سونے کے تاروں سے مکڑی کا جالا بُنتا ہے

مہاجن کی توند اسی وقت بڑھ سکتی ہے جب غریب بھوکے رہیں، اور زمیندار اسی حالت میں آرام کر سکتا ہے کہ غریب کی جھونپڑی کا دیا بجھ گیا ہو۔

دُنیا بیسوا ہے، گناہ رقص ہے،
دولت سرود ہے، سرمایہ دار تماشائی ہے
روٹی، صحت، اُمید اور زبان ـــــ
انسان ان سب نعمتوں سے محروم ہے اور تباہی کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔

اور کوئی رستہ نہیں ہے ـــــ کیونکہ سرمایہ داری نے ہر ہر قدم پر گڑھے کھود رکھے ہیں۔

سارا جہان زنداں ہے اور ڈاکو اُس کے پہرے دار ہیں۔

چوروں نے مالکوں کو قید کر رکھا ہے کہ کہیں وہ باہر نکل کر اپنا مال چھین نہ لیں۔

ہمدم! کون کہتا ہے کہ تُو چور ہے، کون کہتا ہے کہ تُو ڈاکو ہے۔

تُو نے ایک مُٹھی اناج کی چوری کی ہے۔ دلوں کا خون نہیں کیا ہے۔

وہ بھی ہیں جو چوری نہیں کرتے تاہم انسان نہیں ہیں۔

تُو نے چوری کی ہے، پھر بھی انسان ہے۔

حاکم اور محکوم:

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔ جسے سُنکر، درد انسانی سب کو ایک بار میں گوندھ دیتا ہے۔

کتنی سیدھی سادی بات ہو کہ جب سب ایک ہی ماں کی اولاد ہیں تو ان میں سے کوئی حاکم اور کوئی محکوم کیوں ہو۔

لیکن لوگو، یہ تماشا دیکھو کہ کوئی اسی سیدھی سی بات کو زور سے کہہ دے تو وہ بغاوت کا مجرم ٹھہرتا ہے۔

رعایا تو حاکم کی باغی کہی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر حاکم ظالم ہو تو رعایا کا باغی نہیں کہا جا سکتا

پرجا ہی راجہ کی خالق ہے۔ راجہ رعایا کو پیدا نہیں کرتے۔

لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ رعایا کی حالت غلاموں سے بھی بدتر ہے۔

امن و امان کی قیمت ہم نے اپنی آزادی کی صورت میں ادا کی ہے۔

کس سے فریاد کریں کہ ہم اپنے ہاتھوں محل بناتے ہیں لیکن خود بے خاماں ہیں۔

جن کے لئے حکومت قائم ہوتی ہے، حکومت پر اُن کا ہی کوئی زور نہیں چلتا۔

راجہ اور دیوتا ہمارے مُنہ کا نوالا کھا جاتے ہیں۔

اور ہم خود بھوکے مرتے ہیں۔

مگر یہ فریاد کس سے کیجئے۔ بھلا اسی میں ہے کہ ہم "حکومت زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے رہیں۔

عدالت رعایا کے گناہوں کی سزا کے لئے ہے، حاکم تو انصاف سے بلند ہے۔

وہ دیکھو نقارۂ جنگ پر چوب پڑی!!

نونہال ہنستے ہوئے توپوں اور تلواروں پر گر پڑے اور انہیں اپنے معصوم خون کے چھینٹے دینے لگے۔

فتح کا ناقوس بجتا ہے اور اسکی صدائے بازگشت بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی کراہ میں سُنائی دیتی ہے۔

لیکن شادمانی کا ڈھول پیٹتے جاؤ کیونکہ فتح کی دیوی کا رتھ گذرنے والا ہے۔

کیا کوئی بہن اپنے بھائی کے لئے ماتم کر رہی ہے؟

کیا کوئی ماں اپنے لختِ جگر کو رو رہی ہے؟

میدانِ جنگ سے اکلوتا بیٹا نہیں لوٹا؟

شوہر موت کا شکار ہو گیا؟ بھائی کی خبر نہیں ملی؟

تو کیا ہوا؟ یہ سب شہید ہو گئے!! ان سب نے جامِ بقا پیا ہے!!

پریشان نہ ہو کیونکہ ہماری حکومت فتحیاب ہوئی ہے!

فغان و فریاد کا موقعہ ہی کیا ہے؟

فتح و نصرت کا پرچم بلند کرو! بادشاہ زندہ باد کا نعرہ لگاؤ!

نقارہ پر ضرب لگاؤ!

دیکھو تو سہی کہ حضور پُر نور کتنے عرصہ کے بعد حرم سرا سے باہر تشریف لائے ہیں۔

ان زخمی سپاہیوں کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔ کہ ظلِ اللہ کی سواری کے آگے سے نہیں ہٹتے!!

یہ اندھے ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ جاں بلب ہیں تو کیا؟

حکومت کی فتح! بادشاہ کی کامرانی!

ہمدم، رعایا کا خون بہتا ہے۔ لیکن فتح حاکم کی ہوتی ہے۔ اسی کا نام دُنیا ہے۔

سرکاری نوکروں کی تنخواہ رعایا کی جیب سے جاتی ہے۔ لیکن وہ حاکم کے نوکر ہیں، محکوم پر تشدّد کرنے کے لئے۔

رعایا کے نوکر رعایا پر ظلم کرنے کے لئے — کیا بوالعجبی ہے!

لیکن آسمان کروٹ بدل رہا ہے۔

یہ اُمید اُمیدِ موہوم نہیں ہے کہ بہت جلد کائنات کا ہر ذرّہ محکوموں کی فتح کے ترانے گائیگا۔

مزدور

اُس روز ریل میں دیکھا کہ ایک قلی کو بابو صاحب نے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔

یہ دیکھ کر دل بھر آیا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کیا دُنیا میں غریب ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہینگے؟

جو مزدور اپنے گوشت و پوست کے ایندھن سے ریل
چلاتا ہے وہ خود تو پٹریوں پر پڑا ہوا ہے۔ ریل پر بڑے
لوگ بیٹھتے ہیں۔

کیا کہا "تنخواہ دیتے ہیں"! منافقو۔ کہتے شرم
نہیں آتی۔ مزدور کو چند پیسے دے کر تم نے دولت کے
انبار لگائے ہیں۔

سڑکوں پر موٹر، سمندر پر جہاز، فضا میں طیارے
اور شہروں میں مشینیں۔ یہ سب کن کے بنائے ہوئے
ہیں؟ اور کون انہیں چلاتا ہے؟

تمہارے قصر و ایوان کس کے خون سے رنگے ہوئے
ہیں۔ ان کی ایک ایک اینٹ پر کس کا افسانۂ دردکندہ ہے؟
خاک کے ایک ایک ذرّہ کو اس جاہ و جلال کا اصل راز معلوم
ہے۔

لیکن وہ مبارک ساعت آپہنچی۔
قرض میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اسے فوراً
بے باق کرنا ہے۔

ہتھوڑی اور کدال سے جو آسمان بوس پہاڑوں کو
کاٹ کر رکھ دیتا ہے
راستوں کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی
ہیں۔

تمہاری خدمت کیلئے جس نے قلی اور مزدور کا پیشہ
اختیار کیا ہے۔
تمہاری باربرداری کیلئے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے۔
وہی ــ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔
میں اُسی کے گیت گاتا ہوں۔

اُس کا دُکھا ہوا دل ایک نئی زندگی کی تعمیر کرے گا۔
یہ توقع نہ رکھو کہ یہ خاک نشین صرف اس وجہ سے
تمہاری توقیر کریں گے کہ تم بالانشین ہو۔
جو لوگ فرطِ محبّت سے زمین کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا
بناتے ہیں، اب یہ زمین اپنے کو اُنہیں کے سُپرد کرے گی۔

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں، جن میں یہ
خاک پاک خود بخود لپٹ جاتی ہے۔
آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون میں رنگ کر
بطنِ گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔
اب تمام بندھنوں اور بندشوں کو توڑ کر پھینک دو۔
فلکِ کج رفتار کو چاہیئے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے
آشیانے پر گر پڑے۔

ہمارے سر پر چاند سُورج اور ستارے پھول بنکر
برس پڑیں کہ ہم نے ایک جہانِ نَو کی داغ بیل ڈالی ہے۔
ساری دُنیا کے اِنسان سُن لیں۔ کہ ہم سب ایک
ہی کارواں کے مسافر ہیں۔
اگر ایک کو تکلیف ہوگی تو سب کے دل اس کی
کھٹک محسوس کریں گے۔ ایک کی توہین بنی نوعِ انسان
کی توہین ہے۔
ایک نئی دُنیا نئے ارمانوں اور نئے مقصدوں
کے ساتھ راہِ حیات پر گامزن ہو رہی ہے جسے
دیکھ کر خدا مُسکراتا ہے اور شیطان خوف سے
لرزتا ہے۔

.. ..

حدیثِ میکدہ

نیرنگِ روزگار میں کیفِ دوام دیکھ
ساقی کی مست آنکھ سے گردش میں جام دیکھ

قدرت کی سیر کر۔ ترے ہوش و جنوں کی خیر
یہ گلستانِ صبح، یہ صحرائے شام دیکھ

کیا دیکھتا ہے غفلت و ہوش اس نگاہ کے
غافل حیاتِ غم کے فنا و دوام دیکھ

کل تک کھلا نہ تھا مرے دل کا معاملہ
آج اک جہانِ راز کو بے ننگ و نام دیکھ

ہے جنبشِ نظر کے ہے یہ پرسشِ نہاں
یہ خاص ادائے لطف یہ اندازِ عام دیکھ

چشمِ سیاہ کار مٹاتی ہے۔ مٹ بھی جا
حشرِ حیات دیکھ، لبوں کا پیام دیکھ

بیکس نہیں ہے عشق بہت اے نگاہِ ناز
کیا تجھکو میرے درد سے، تو اپنا کام دیکھ

ظلمت سرائے دہر میں کچھ روشنی سی ہے
اک رات کاروانِ عدم کا قیام دیکھ

یہ انقلاب ہے کہ یہ ہر جنبشِ نگاہ
ماضی و حال سب کے الٹتے نظام دیکھ

محرومیاں نہ دیکھ دلِ تشنہ کام کی
بزمِ نشاط، جلوۂ مے، چھلکے جام دیکھ

یوہی نہیں ہیں نرگسِ رعنا کی گردشیں
ہر دور، ہر سکونِ نظر، ہر مقام دیکھ

بس اِک نگاہ حاصلِ بزمِ نشاط ہے
روئے نگار دیکھ، مئے لالہ فام دیکھ

دنیا کو دیکھ لے کہ وہ دنیا نہیں رہی
برقِ نگاہ کا اثرِ ناتمام دیکھ

رعنائیٔ خیال کو سمجھا جمالِ یار
یہ زعمِ عشق دیکھ، یہ سودائے خام دیکھ

اس زلفِ خم بہ خم میں ہے شامِ ابد کی سیر
صبحِ الست دیکھ، نظر کا پیام دیکھ

اٹھتی ہے چشمِ ساقیٔ میخانہ بزم پر
یہ وقت وہ نہیں کہ حلال و حرام دیکھ

ہیں موجِ نورِ گنگ و جمن جامِ ساقیا
یہ رات، یہ مقام، یہ ماہِ تمام دیکھ

خوابِ گرانِ رنج و غمِ روزگار سے
اٹھ اور جلوہ ہائے نشاطِ دوام دیکھ

ہر سانس موجِ بادۂ سرجوش ہے فراق
ہستی کو ماورائے فنا و دوام دیکھ

فراق گورکھپوری

ثمرِ گناہ

مجھے پہاڑ پر آئے کئی روز ہو چکے تھے۔ یہاں نہ کوئی میرا ملنے جلنے والا نہ میری کسی سے جان پہچان۔ اور اس پر طبیعت کچھ ایسی پائی ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں سے میل ملاپ پیدا کرنا مجھے پسند نہیں۔ تنہائی اور سکوت ہو تو اطمینان سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ سچ ہے۔ ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را۔ خیر! میں نے یہاں اپنے لئے ایک دستور العمل بنا رکھا تھا۔ صبح گھومنے چلا جاتا۔ بارہ بجے کھانا کھا کر ذرا آرام کرتا۔ پھر برآمدے میں بیٹھ کر کوئی کتاب یا اخبار دیکھتا۔ اور پانچ بجے چائے پی کر پھر وہی گھوما گھامی۔

آبادی سے کچھ فاصلے پر ایک آبشار تھا لیکن بارش شروع ہو جانے کے باعث میں یہ جگہ ابھی تک نہ دیکھ سکا تھا۔ "مانسون" کے ختم ہوتے ہی دن کو دھوپ خاصی نکلنے لگی۔ اور اکثر شگفتہ مقامات پر پکنک پارٹیاں بھی نظر آنے لگیں۔ ایک روز میں بھی یہ آبشار دیکھنے کے ارادے سے گھر سے چلا۔ سڑک بہت ناہموار تھی۔ دائیں جانب پہاڑ تھے اور بائیں طرف وادیاں۔ اور ان ہی وادیوں میں کہیں کہیں آبادیاں بھی تھیں۔ یہی پانچ پانچ دس دس گھر۔ آبادی کے قریب لب سڑک اکثر لڑکے اور لڑکیاں ہرے ہرے بھٹے بیچتے نظر آتے۔ پیسے میں ایک بھٹا ملتا۔ پہاڑ کی جانب چٹانوں پر سے جا بجا پانی ٹپکتا تھا۔ کہیں سڑک پر درخت اس قدر جھک آئے تھے کہ ایک محراب سی بن گئی تھی۔ بائیں جانب وادیوں کے دامن میں پانی کے دھارے سیماب کی طرح چمکتے نظر آتے۔

راستہ چونکہ اترائی پر تھا اس لئے سفر جلد ختم ہو گیا۔ یوں تو دور ہی سے آبشار کی شورشوں کی آواز کچھ ایسی معلوم ہوتی جیسے کہیں باجا سا بج رہا ہو۔ لیکن پاس پہنچ کر جو منظر دیکھا وہ بھی کچھ کم دلکش نہ تھا۔ پانی بلندی پر سے نیچے گر رہا تھا۔ اتنا صاف کہ بلور کی چادر کا دھوکا ہوتا۔ پاس ہی ایک دیو قامت پیڑ کے سایہ میں ایک سادھو پتوں کی چھتری کے نیچے دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ سادھو کی برف کی طرح سپید سپید جٹیں تھیں۔ سرخ سرخ آنکھیں۔ ناخن کچھ بڑھے ہوئے۔ پیٹ کمر سے لگا ہوا۔ اور بدن پر بھبھوت رمائی تھی۔ پاس ہی کوئی تین ایک سال کی بچی کھیل رہی تھی۔ معصومیت بھولے پن کی تصویر سمجھئے۔ ہلکے سنہری گھونگھریالے بال تھے۔ کنول ایسی پیاری پیاری آنکھیں تھیں۔ گورے چٹے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ اور چاند ایسا خوبصورت چہرہ تھا۔ اس ویرانے میں خاک کی اس پتلی پر حورِ جنت کا دھوکا ہوتا جیسے کردگارِ عالم نے اس گسائیں کے اطمینانِ خاطر کے لئے شاید عرش سے فرش پر بھیج دیا تھا۔

میں آبشار سے ذرا ہٹ کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ تھرمو میں چائے کچھ بسکٹ اور سینڈوچز میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ وہ ہی نکال کر کھانے لگا۔ ننھی سی بچی نے بھولے پن

سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بسکٹ اُس کی طرف بڑھاکر کہا۔ "لو بیٹا!"

بچی نے دوسری طرف منہ موڑ لیا۔

"آؤ۔ لے لو!" میں نے پھر کہا۔

"لے لو اِندرا!" سادہو نے محبت سے بچّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بچی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ میں نے پاس جاکر دو چار بسکٹ اس کی گود میں ڈال دیے۔

"یہ آپ کی بچّی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھگوان کی دیا ہے!" سادہو نے جواب دیا اور مُسکرا مُسکرا کر بچی کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کس دیس سے آئے ہیں؟"

"لاہور سے!" میں نے جواب دیا۔

"بڑا نگر ہے!" سادہو بولا۔

"آپ نے دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" سادہو بولا۔ "میرا دیکھا ہے!" پھر ہنسکر "یہاں تو آپ کا دل نہ لگتا ہوگا؟"

"کیوں؟" میں نے چائے کی پیالی مُنہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں کس چیز کی کمی ہے؟"

"شہر کی باتیں کہاں بابا!" سادہو نے مسکراکر کہا۔ "وہاں زندگی کی بہار یہاں اُداسی کا عالم!"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔ "وہ آج کل جہنّم یہ جنّت۔ رہی شہر کی زندگی تو میں اس سکوت پر ایسی ہزاروں زندگیاں قربان کردوں۔"

یہ سُنکر سادہو کچھ مسکراکر بولا۔

"بھلا کہیے تو سہی یہاں کی کونسی چیز آپ کے من کو بھائی؟"

"ایک ہو تو کہوں گی" میں نے جواب دیا۔ "ذرا اس کہساری کو دیکھ لیجئے، کتنی شادابی اور زیبائش جلوہ نما ہے۔ یہ آس پاس کے مناظر دیکھئے۔ کتنے پاکیزہ اور دلکش ہیں۔ پھر یہ آبشار کسقدر دل آویز ہے اور پھر یہ سبزہ گویا ایک جامِ زمردیں ہے۔ یہاں نہ فکر نہ آلام، زندگی تمنّاؤں اور ارمانوں کے دکھ سے پاک۔ کھانے کو پھل پھلواری، پینے کو چشموں کا ٹھنڈا پانی اور دل بہلانے کو یہ مناظرِ قدرت اور سماعِ طیور!!"

سادہو نے ہنسکر سر جُھکا لیا۔

ایک زرد رنگ کی تیتری کہیں سے آگئی۔ اِندرا اُسے پکڑنے کے لئے پتھروں پر اِدھر اُدھر چھلانگنے لگی اسی کشمکش میں غریب کا پاؤں پھسلا اور وہ منہ کے بل گری۔ سادہو نے لپک کر اُسے اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ بچّی رونے لگی۔

"ماں ایسے ہی وقت یاد آتی ہے!" بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا۔

"کیا یاد آتی ہے اس ننّھی جان کو!" سادہو بچّی کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہوا غریب دُکھوں سے چھوٹ گئی!"

"کیا مرگئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں مرگئی!" سادہو بولا۔ "بہت دُکھ بھوگے غریب نے۔ افسوس! آپ کی سماج کے قوانین بہت ظالمانہ ہیں!"

میں نے سادہو کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اِندرا ابھی بسُور رہی تھی اور وہ اسے بہلا رہا تھا لیکن کچھ اس محبّت کے ساتھ کہ معلوم ہوتا کہ اندرا کے چوٹ نہیں لگی بلکہ سادہو کے دل کا زخم دُکھ گیا ہے۔ وہ بچی کو پیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ بھی کہیں کا انصاف ہے کہ ظلم تو کرے مرد اور اُسکا

سیازہ عورت غریب کو سہگنت پڑے۔ وہ عورت جسے دیوتاؤں
نے سینکڑوں برس کی التجاؤں کے بعد برہما جی نے روپ
دے کر اس سنسار میں بھیجا۔ جو مرد کے لئے درد اور پریم
لے کر آئی۔ جو مرد کے لئے محبت کا تحفہ لائی جس کی محبت
میں مرد کے ہزار دکھ کا درماں مستور ہے جو اس دھرتی پر
مرد کے لئے بھگوان کی دیا کا روپ ہے۔"

پھر اندرا کو تھپک کر "میری اندرا کی ماں کا خون
آپ لوگوں کی گردن پر ہے۔ آپ تعلیم اور تہذیب کے علم بردار
بنے پھرتے ہیں۔ سماج کے لئے قوانین بناتے ہیں۔ قوموں
اور رسم و رواج میں جکڑتے ہیں۔ یہ سب گندم نما جو فروشی
ہے۔ آکاس کے منڈل پر آپ کے مظالم اس طرح چمک رہے
ہیں۔ جیسے اندھیری راتوں میں تارے۔ لیکن دیکھتے وہی
ہیں جنہیں بھگوان نے آنکھیں دی ہیں۔"

"سچ ہے!" میں نے کہا۔

"اگر سچ ہے!" سادھو بولا۔ "تو پھر آپ اس کی اصلاح
کیوں نہیں کرتے؟ بابا! جی تو آپ بھی رہے ہیں اور ہم بھی۔
لیکن حقیقت میں جینا اسی کا ہے جو ملک اور دھرم کی
سیوا کرے۔"

میں چپکا ہو رہا۔ بچی سادھو کی گود میں سو گئی تھی سادھو
نے اسے ایک کمبل پر لٹا دیا اور ایک کونہ اوپر ڈال دیا۔ پھر
میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"جانے! میں کیا واہی تباہی بک رہا تھا۔ بھول ہوئی
معاف کر دیجئے!"

"نہیں!" میں نے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کہا سچ کہا ہے!"

"سچ کہا ہے یا جھوٹ!" سادھو کہنے لگا۔ "اس کا علم تو
بھگوان کو ہو گا۔ لیکن اس بچی کے دکھ کی ذمہ دار یہ آپکی
سماج ہے۔"

"یہ بچی آپکی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری ہی ہے!" اس نے بچی کی طرف محبت بھری نگاہوں
سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیال تو کیجئے! اس عمر میں ماں کی محبت
سے محروم ہو جانا کتنا دکھ ہے۔ پاپ کی فضا میں پیدا
ہونا کتنا ظلم ہے۔"

"پاپ کی فضا!" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیا مطلب؟"

"ارے بابا!" سادھو بولا۔ "تم یہ پاپ کی کہانی سنکر کیا
لو گے۔"

"کچھ ہرج ہے تو نہ کہیئے!" میں نے کہا۔

"ہرج ورنج کچھ بھی نہیں۔" سادھو نے جواب دیا۔ "ایک
دکھیا کی داستان ہے تم بھی سن لو! بہت دن ہوتے
شہر سے کوئی پونے میل پر جمنا جی کے کنارے ایک آم کے
پیڑ کے نیچے میرا ڈیرا تھا۔ تم جانو! ہم سادھو لوگوں کو یہی
بن۔ پہاڑ اور دریا ایسی جگہیں پسند آتی ہیں۔ جہاں
اداسی ہو تنہائی ہو ہمارے من کا کنول کھلتا ہے۔ من کی
جوت جگانے کا مزا ملتا ہے۔ تم شہر کے رہنے والے اس
آکاس کے منڈل کے نیچے رہنے کا لطف کیا جانو۔ جب
شب کو تاروں کی سبھا سجتی ہے تو آنکھ پتیم سے لڑتی ہے
اور وحدت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ جلوت میں خلوت کا
مزا ملتا ہے۔ کوئی بستی پاس ہوئی تو بھوجن بھی بھگوان
بھیج دیتے ہیں نہیں تو جنگل کی پھل پھلواری سے ہی پیٹ
بھر لیا۔"

میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

"سنتے ہو بابا!" ساون رت تھی اور کالی رات ہر طرف
خاموشی اور سناٹا۔ جمنا جی کا پانی تاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی

روشنی میں چمک رہا تھا۔ میں اسی طرح چھتری لگائے بیٹھا تھا کہ کہیں پاس سے ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ساتھ ہی

"اے بھگوان! اس کلیجے کے ٹکڑے کو کس کے
سپرد کروں۔ اسے پانی میں ڈالتے ہوئے بھی
میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ یہ پاپ کی گٹھری کہاں
لے پھروں!"

یہ سنکر میرے دل میں کچھ اضطراب سا پیدا ہوا۔ میں اٹھ کر آواز کے رخ پر ہو لیا۔ سرکنڈوں کے پاس ایک جوان عورت ایک بچے کو جمنا جی کے کنارے گھاس پر لٹائے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آہٹ پاکر وہ کچھ خوفزدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"بیٹی!" میں نے پاس جاکر پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیوں روتی ہو؟"

اس نے روتے ہوئے میرے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

میں نے پھر پوچھا۔

"بیٹی! تم کون ہو۔ یہاں ایسے میں کیا کرتی ہو؟"

"مہاراج!" اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ "میں ایک دکھیا ہوں۔ دیا کیجئے مہاراج! اس دھرتی میں میرے لئے سکھ نہیں!"

یہ کہتے ہوئے اس نے پھر میرے پاؤں پکڑ لئے۔

"چنتا نہ کرو بیٹی!" میں نے کہا۔ "بھگوان دیا کرینگے"۔ بچہ بلک رہا تھا میں نے اسے گود میں لے لیا اور کہا "اس غریب کو یہاں کیوں ڈال رکھا ہے؟"

"مہاراج!" وہ روتے ہوئے بولی۔ "اس پاپ کی گٹھری کو کہاں لئے پھروں!"

"پاپ کی گٹھری!" میں نے تعجب سے کہا۔ "تو یہ تمہارا بچہ نہیں ہے؟"

"میری ہی بچی ہے" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر اسے پاپ کی گٹھری کیوں کہا؟" میں نے پوچھا۔

"مہاراج!" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "میری آپ سے اتنی بنتی ہے کہ آپ اس بچی کو لے لیں"۔

"اس کا باپ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"باپ!" یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ پھر رونے لگی۔

"باپ!" میں نے ہولے سے کہا۔ "آخر تم ہو کون؟"

"آپ میری بپتا سنیں گے مہاراج!" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ہاں کیوں نہیں!" میں نے کہا۔ "سنوں گا"۔

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر بولی:-

"میری اس بپتا کے ذمہ دار میرے ماتا پتا ہیں۔ میرے پتا گاؤں میں آٹے دال کی دکان کرتے تھے اور دھن دولت کو دھرم سمجھتے تھے۔ وہ جب دکان بڑھا کر گھر آتے تو مجھے گود میں لے کر کہا کرتے۔

"اندرا! اس جگ میں دھن ہی تو دھرم ہے۔ تو سیانی ہو تو میں تیرا بیاہ کروں اور ہمیانیاں بھر بھر کر روپے لوں"۔

آخر میں جوان ہوئی۔ ادھر ادھر سے پیغام آنے لگے لیکن میرا سنجوگ ایک پینسٹھ سال کے بوڑھے کھوسٹ سے ہوا۔ یہ شخص پاس کے قصبے میں رہتا تھا۔ پہلی بیوی مر چکی تھی۔ بے اولاد تھا اور اس کے یہاں دولت کا مینہ برستا تھا۔ میرے پتا بہت خوش تھے۔ انہیں منہ مانگی مراد ملی تھی۔ برات اس دھوم دھام سے آئی کہ آس پاس کے گاؤں والے دیکھنے آئے۔ اتنے بھاری جوڑے اور سونے کا گہنا پاتا

میرے لئے آیا کہ دیکھنے والیوں کو میری قسمت پر رشک ہونے لگا۔ دولھا پالکی میں سوار تھا۔ دو آدمیوں نے سہارا دیکر اُتارا۔ چہرے پر جھُریاں تھیں۔ ہاتھ پنجۂ مریم کی طرح سوکھے ہوئے۔ بے نور سی آنکھیں۔ نہ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔

سُسرال آئی تو ایک بُوڑھی چچی نے مجھے پینس سے اُتارا۔ اور ایک سیاہ فام سے جوان آدمی نے ماتا کہہ کر مجھے پرنام کیا۔ لیکن میرے پتی کا یہ حال تھا کہ کھاٹ پر لیٹے کسی ہل جُتنے بیل کی طرح ہانپ رہے تھے۔ سُسرال میں میرے لئے دھن دولت کی تو کمی نہ تھی لیکن زندگی موت سے بدتر تھی۔ خیال تو کیجئے! کہاں ایک سولہ سترہ برس کی کنیا کہاں ایک پینسٹھ سال کا بُوڑھا۔ میرا بیاہ ہوئے بہت دن ہو چکے تھے۔ میرے سوامی کو جب مجھ پر بہت پیار آتا تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتے۔ ’اندرا! بس ایک چاند سا بیٹا مجھے دیدے چاند سا!‘

وہ سیاہ فام آدمی جس نے پہلے روز مجھے ماتا کہہ کر پرنام کیا تھا۔ گھر کا کام کاج سب اسی کے سپرد تھا۔ اس کا نام جسونت تھا۔ چوڑا چکلا سینہ۔ موٹی موٹی آنکھیں تھیں۔ پہلے تو اس کی وہی میلی کچیلی دھوتی اور گاڑھے کا کُرتا ہوتا۔ لیکن چند روز سے یہ اب بن سنور کر رہنے لگا تھا۔ کہتا تو مجھے ماتا ہی تھا لیکن اب کبھی مجھ سے بات کرتے کرتے ذرا مُسکرا بھی دیتا۔ ایک روز جو میں اسے کوئی برتن پکڑانے لگی تو اُس نے میری انگلیوں کو ذرا سا دبا دیا۔ یہ مجھے بہت ناگوار گذرا۔ لیکن کہتی تو کس سے کہتی۔ بڑے لالہ جی صبح صبح دُکان پر چلے جاتے۔ اور چراغ میں بتی پڑے واپس آتے۔ اِدھر روٹی کھائی اُدھر کھاٹ پر لیٹ کر ہولناک ڈکاریں مارنے لگے۔ میں جو کبھی پاؤں دبانے لگتی تو مجھے آغوش میں لے کر اور میری ٹھوڑی ہلا ہلا کر کہتے۔ ’اندرا! اگر تو مجھے ایک چاند سا بیٹا دیدے تو بس چین ہی چین ہے!‘

پھر خود ہی ہنسکر کہتے۔

”بھگوان دے ہی دینگے۔!“

مہاراج! ان کی یہ باتیں میرے سینے میں کٹار ہو کر لگتیں۔ تو خیر! گھر میں ایک میں تھی۔ ایک وہ بُوڑھی چچی۔ جسونت جو پہلے دن بھر میں دو ایک پھیرے کیا کرتا تھا۔ اب کسی نہ کسی بہانے پانچ سات بار ضرور آتا۔ اور جب مجھے جن نظروں سے دیکھتا میں جان گئی تھی کہ اس کی نیت خراب ہے۔

ایک روز چچی کہیں برادری میں گئی تھی۔ جسونت چوکے کے پاس بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ ”بھگوان کبھی ہمارے لالہ جی کی آس بھی پوری کر ہی دینگے!“

’کیا کوئی اور بیوپار کیا ہے؟‘ میں نے پوچھا۔

’بیوپار کیسا؟‘ جسونت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’انہیں تو اس دھن دولت کا وارث دیکھنے کی آس لگ رہی ہے!‘

پھر ہنسکر۔

’لالہ جی تو تم سے چاند ایسا بیٹا مانگتے ہیں!‘

’جسونت!‘ میں نے غصہ سے کہا۔ ”خبردار جو پھر میرے سامنے ایسی بات کہی تو!“

’کوئی بُری بات کہی میں نے؟‘ اُس نے مُسکرا کر پوچھا۔

کم بخت مجھے ہمیشہ ماتا کہا کرتا تھا لیکن آج وہ بات نہ تھی۔ میں نے بگڑ کر کہا "تمہیں اپنی ماں سے ایسی بات کہتے شرم تو نہیں آتی!"

"ماتا!" وہ ہنسکر بولا۔ "اٹھارہ برس کی اور بیٹا چوبیس سال کا! یہ بھی ایک ہی رہی!"

"دور ہو یہاں سے!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "ورنہ لالہ جی سے کہہ دونگی!"

"تم اُن سے کیا کہوگی؟" اُس نے ہنسکر کہا۔ "وہ تو چاند ایسا بیٹا مانگتے ہیں۔ چاند ایسا!"

"دور ہو موا کہیں کا!" میں نے دستِ پناہ اُٹھا کر کہا اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

اس واقعہ کو بہت روز گذر چکے تھے۔ یہی ساون رُت تھی اور کالی رات۔ میں تیسری منزل پر کھاٹ ڈالے پڑی تھی نیچے صحن میں لالہ جی اور چچی سوتے تھے! ایک تو ان کے خراٹوں سے نیند حرام ہو رہی تھی دوسرے مچھر کاٹ کاٹ کر پریشان کر رہے تھے۔ میری پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ اچانک کسی نے پلنگ پر آکر مجھے دبوچ لیا۔ اور جلدی سے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھدیا۔ یہ وہی نمک حرام جسونت تھا۔ ایک ہاتھ سے تو اُس نے میرا مُنہ بند کر رکھا تھا دوسرے سے گھونسہ تان کر بولا:-

"خبردار! آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گا!"

میرا دم جو گھٹنے لگا تو اُس نے مُنہ پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ بھگوان کے لئے چھوڑ دو۔" میں نے منت سے کہا۔

"چپ رہو!" اُس نے پھر گھونسہ تان کر کہا۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"تم میرا گہنا پاتا لے لو!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔"

"مجھے گہنا پاتا نہیں چاہیئے!"

"ظالم چھوڑ دے مجھے!" میں نے اب اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چپکی پڑی رہو!" اُس نے کہا۔ "ورنہ جان سے مار ڈالوں گا!"

"پاپی!" میں نے کہا۔ "تم تو مجھے ماتا کہتے ہو۔ اب اگر لالہ جی آجائیں تو؟"

"وہ کیوں آنے لگے!" اُس نے جواب دیا۔ "وہ تو چاند سا بیٹا مانگتے ہیں۔"

"ڈوب نہیں مرتے!" میں نے کہا۔ "بھگوان کا خوف کرو!" لیکن اُس وقت بھگوان کا خوف کون کرتا تھا۔ میں اس ظالم کے پنجہ میں تھی اور بےبس تھی۔

کچھ روز تو مجھے اس پاپی سے نفرت رہی لیکن آخر مانوس ہونا ہی پڑا۔ اور وہ سب کے سامنے اب بھی ماتا ہی کہتا۔ اسی طرح چار پانچ مہینے گذر گئے۔ آخر پاپ اپنا رنگ لایا۔ میں اب ڈرنے لگی جس طرح بن سکا یہ راز چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ سارا سارا دن کوٹھڑی میں پڑی رہتی۔ کوئی پوچھتا تو کہہ دیتی کہ طبیعت اچھی نہیں۔ لیکن چچی بھانپ گئی۔ وقت اسی طرح گذرتا گیا اور یہاں ساتواں مہینا لگ چکا تھا۔ پڑوس والیاں مجھے دیکھ دیکھ کر جب سرگوشیاں کرتیں تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جاتا۔ لیکن لالہ جی خوش نظر آتے کیونکہ انہیں تو اپنی منتا پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔

ایک روز میں کوٹھے پر بیٹھی تھی کہ جسونت کہیں سے پٹتا ہوا آیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اندرا!" وہ پاس بیٹھ کر کہنے لگا۔ "بہت ظلم ہوا!"

میں تعجب سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھانڈا پھوٹ گیا اندرا!" وہ بولا۔ "لالہ جی کے کوئی بھانجے ہیں۔ وہ کسی دوسری جگہ کاروبار کرتے ہیں۔ مدت سے میل جول بند ہے۔ اس تمام جائداد کے وہی ایک وارث ہیں۔ کہیں اُن کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ تمہارے بچہ ہونے والا ہے۔ آج وہ آئے ہیں۔ بہت دیر لالہ جی سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کچھ آپس میں تُو تُو میں میں بھی ہوئی۔ میرے سامنے پڑتے ہی پہلے تو بے نقط سنائیں پھر پیٹ ڈالا۔ کل لالہ جی کو ڈاکٹر دیکھنے آئے گا۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلوانے آدمی بھی بھیج دیا ہے۔"

"ڈاکٹر کیا دیکھے گا؟" میں نے پوچھا۔

جسونت بولا۔ "اندرا! تم انجان تو ہو نہیں۔ پینسٹھ سال کا بوڑھا بغیر سہارا دیئے نہ چلے نہ اُٹھے۔ پھر تمہیں یہ پیٹ کیسے ہو گیا؟"

"اب کیا بنے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ سب بپتا تمہارے کارن آئی۔ پاپی! تُو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

"میری سنو!" جسونت کہنے لگا۔ "اب اگر عزت کا پاس ہے تو بھاگو یہاں سے۔ تمہیں تو یہ محلے والیاں ہی جینے نہ دیں گی۔ ادھر میکے والوں کو کیا منہ دکھاؤ گی؟"

کچھ دیر اسی قسم کی بحث ہوتی رہی۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ صبح ہونے سے پیشتر ہی کہیں نکل جائیں۔ میں نے اپنا زیور اور کچھ نقدی لی اور کوئی پہر رات گئے جب سب سنسار سوتا تھا ہم گاؤں سے نکل گئے۔ کوئی کوس دو کوس پر ریل کا اسٹیشن تھا۔ پو پھٹتے گاڑی آئی۔ جسونت نے کہیں کے دو ٹکٹ خرید لئے تھے سوار ہو گئے۔

کہاں کہاں سے۔ کیسی کٹی! مہاتما جی یہ ایک طویل قصہ ہے۔ وقت پورا ہونے پر میرے ہاں یہ لڑکی ہوئی۔ اس وقت تک زیور بیچ بیچ کر گذران ہو رہی تھی۔ میں نے ہزار چاہا کہ جسونت کوئی کام کاج کرے لیکن اُس نے میری ایک نہ سُنی۔ اب ہمیں اس دیس میں آئے دس پندرہ روز ہوئے ہیں، جو کچھ پاس تھا وہ اس نے شراب اور جوے کی نذر کر دیا ہے۔ اور اب مجھے رنڈی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ مہاتما جی! میں مرتی مر جاؤں گی پر یہ ذلیل کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

اتنا کہہ کر وہ غریب پھر رونے لگی۔ میں نے کہا۔ "تو پھر اب چاہتی کیا ہو؟ کہو تو میں تمہیں دیس پہنچا دوں؟"

"نہیں مہاراج!" وہ بولی۔ "میں اب دیس والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"وہ پاپی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گھر ہے!" اندرا بولی۔ "آج سرِ شام ہی پی آیا تھا۔ آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا۔"

پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "مہاراج! آپ بھگوان کے پیارے ہیں، ایک پاپن پر دیا کیجئے۔"

"بیٹی!" میں نے کہا۔ "تمہاری بپتا سُن کر مجھے بہت دُکھ ہو رہا ہے۔"

"تو پھر میری اتنی بنتی ہے۔" اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بچی کو لے لیں۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں بھگوان لے جائیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہنے لگی۔ "تو کیا میں ایک دھرماتما کے دوارے سے بھی مایوس ہی جاؤں گی؟"

پھر آسمان کی طرف دیکھ کر "بھگوان! میں اِس پاپ کی گٹھری کو کہاں اُٹھائے لئے پھروں!"

"بھگوان دیا کریں گے بیٹی!" میں نے کہا۔ "لاؤ بچی مجھے دیدو۔"

میں نے بچی اُسکی گود سے لے لی۔ اِندرا سوئی ہوئی تھی!

"اِندرا!" میں نے تعجب سے کہا۔ "اِندرا تو اسکی ماں کا نام تھا۔"

"ٹھیک ہے!" سادھو بولا۔ "یہ اِندرا کی اِندرا ہے۔ بچی کا نام پوچھنا مجھے یاد نہ رہا۔ اِس لئے میں اب اسے بھی اِندرا ہی کہتا ہوں تو خیر! اِندرا کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! بچی کسی اور کو مت دیجئے گا!"

"بیٹی!" میں نے کہا۔ "یہ تو بھگوان کی امانت ہے۔ میں کیوں کسی کو دینے لگا؟"

اُس نے بچی میری گود سے لی۔ اور دیوانوں کی طرح چومنے لگی۔ تم جانو! ممتا کی لگن دیکھ کر میرا تو جی بھر آیا میں نے کہا۔

"بیٹی! انسان اگر اپنے پاپ پر نادم ہو تو بھگوان اُسے مکتی دیتے ہیں۔ اب تم نیک بنکر رہنے کی کوشش کرو۔ شاید بھگوان تمہیں کسی روز بیٹی سے پھر ملا دیں۔"

اُس نے روتے ہوئے اپنے کلیجہ کا ٹکڑا مجھے دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مہاتما جی! اِس سنسار میں اِس معصوم کا اب آپ کے سوا اور کوئی نہیں!"

"بھگوان جو ہیں۔" میں نے کہا۔ "جسے کسی کا سہارا نہ ہو اُسے بھگوان کا آسرا ہوتا ہے۔"

اُس نے پھر ایک بار بچی کو پیار کیا اور مجھے پرنام کرکے شہر کی جانب چلی گئی۔

اِس رات بادل بہت گرجے بارش بھی ہوتی رہی لیکن میری ننھی سی اِندرا آمر سے جھنڑی کے نیچے سوتی رہی۔ جب صبح ہوئی تو مندر کی جانب سے کچھ شور و غل کی آواز آنے لگی، کوئی بھگوان کا پیارا صبح صبح میرے لئے دودھ لایا کرتا تھا اُس کے آنے پر معلوم ہوا کہ مندر کے پاس کسی جوان عورت کی لاش جمنا جی میں تیر رہی تھی۔ کشتی والوں نے نکال کر کنارے پر رکھدی ہے۔ پھر بچی کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"یہ بچی کس کی ہے؟"

"بھگوان کی امانت ہے۔" میں نے کہا۔ "ذرا خیال رکھیو میں بھی دیکھ آؤں۔" جب میں مندر کے پاس پہنچا تو یہاں لوگوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ میں نے اُچک کر جو دیکھا تو سامنے اِندرا کی لاش پڑی تھی۔"

یہ المناک داستان سُنکر میرے دل کو بھی ٹھیس سی لگی۔ سادھو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور چھوٹی سی اِندرا آمر سے سو رہی تھی۔ کوہسار پر سکوت اور خاموشی مسلط ہو رہی تھی۔ وادیوں میں دہقانوں کے جھونپڑوں سے سپید سپید دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ اِس سکوت اور خاموشی میں آبشار کی شورشیں ایک بدنصیب عورت کی المناک موت کا نوحہ بنکر فضا کو اداس بنا رہی تھیں آخر میں بھی واپس لوٹا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ گھر اُسوقت پہنچا جب فضا میں جگنو چمک رہے تھے چراغِ فطرت جلا رہی تھی!!

ایم۔ اسلم

جاسوس دوست

آ ادھر آے دوست! آ تو مجھ سے چھپ سکتا نہیں — سعیٔ "خود پوشی" ہی کیوں؟ جب میں تجھے تکتا نہیں
گرچہ پہلے "صوفیانہ سوانگ نے" دھوکا دیا — لیکن "آنکھوں کی چمک" نے تجھکو پہچنوا دیا
تیری آنکھوں سے عیاں ابتک وہ "برقی لہر" ہے — قہر ہے تیری نگاہِ تیز ہاں ہاں قہر ہے
الاماں یہ تیری "آشفتہ نگاہی" الاماں — عمرِ وعیّار کی بھی ہیچ ہیں چالاکیاں
کیوں میں حیراں ہوں جو ہر سو آج تیری دھوم ہے — تیری فطرت ابتدا سے ہی مجھے معلوم ہے
تجھ سے مل کر آج مجھکو مدرسہ یاد آگیا — پھر وہ طفلی کا مرقع دل مرا تڑپا گیا
مطمئن رہتی نہ تھی تیری "نگاہِ جستجو" — طور تیرے "عارفانہ" نرم تیری گفتگو
مدرسے میں اپنے ہمعمروں سے وہ سرگوشیاں — برمحل سرگوشیوں کے بعد وہ خاموشیاں
ہم جماعت دوست کہتے تھے تجھے اپنا عدو — تجھکو ان کے خانگی جھگڑوں کی بھی تھی جستجو
یاد ہے مجھ سے بھی کچھ پوچھا تھا اک دن اے شریر — اور — پھر کہنے لگا تھا تو مجھے روشن ضمیر
ہر کسی اُستاد کا تو "منہ چڑھا" شاگرد تھا — نام تیرا واقعی سب کی زباں کا وِرد تھا
تیری "فطری قابلیت" تیرے کام آ ہی گئی — "غیر ملکی حاکموں" تک تجھکو پہونچا ہی گئی
ہیں سیاہ اخبار سارے تیرے نام اور کام سے — شاید اب تو آ رہا ہے خاص "ملکِ شام" سے

کر رہا ہے سیرِ دنیا بنکے اک جاسوس تو
آہ! ابنائے وطن سے خاک ہو مانوس تو

علی منظور حیدرآبادی

خوابِ گریزپا

افراد

سیلچن ———— ایک پہاڑی لڑکی؛
لینڈ ———— ایک پہاڑ پر چڑھنے والا؛
فلزمین ———— ایک رہنما؛

افرادِ خواب

عظیم
بعتر
شراب
(پہاڑوں کے نام)

موگرا
گلاب
نیلوفر
گلِ اشرفی
(پھولوں کے نام)

خواب میں چند کردار

پروانے ———— پھول
جھلملیاں ———— بکرے
موت جو سونے میں آئے ———— نیند کی مختلف شکلیں
موت جو ڈوبنے سے آئے ———— گڈریا

پہلا منظر

اگست کی ایک شام کو غروبِ آفتاب کے بعد، منظر پہاڑ کی ایک جھونپڑی کے ایک کمرے پر مشتمل ہے جس میں صرف ایک دیوار گیری اور دریچے سے بنی ہوئی ایک نیچی اور چوڑی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اس دریچے میں سے چاند کی روشنی میں جو غروبِ آفتاب کے رنگوں کو سمیں کر رہی ہے، پہاڑوں کی تین چوٹیاں نظر آرہی ہیں۔ ایک چراغ جل رہا ہے۔ سیلچن ایک اٹھارہ سالہ پہاڑی لڑکی ایک دیہاتی گیت گنگنا رہی ہے اور تازہ دھلے ہوئے شوربے کے پیالے اور گلاس الماری میں

رکھ رہی ہے۔ وہ ایک خوشنما لباس زیب تن کئے ہوئے ہے، اور اس کی دونوں گھنی چوٹیاں سر کے گرد لپٹی ہوئی ہیں۔ آخری برتن رکھتے وقت دستک کی آواز آتی ہے اور لیمنڈ بیرونی دروازہ کھولتا ہے۔ وہ نوجوان اور خوشرو ہے اور پہاڑ پر چڑھنے والوں کے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ اس کے ہاتھ میں برف توڑنے کی کلہاڑی اور ایک تھیلہ وغیرہ ہے۔

لیمنڈ۔ تسلیم۔

سیلچن۔ تسلیم، جنابِ عالی۔

لیمنڈ۔ میرا نام لیمنڈ ہے، شاید مجھے بہت دیر ہو گئی۔

سیلچن۔ کیا آپ یہاں سونا چاہتے ہیں؟

لیمنڈ۔ اگر آپ کرم فرمائیں۔

سیلچن۔ افسوس ہے ـــــ تمام بستر رک چکے ہیں۔ خیر، ذرا ٹھیرئیے۔

لیمنڈ۔ مَیں علی الصباح جبلِ عظیم پر چڑھنے کے ارادے سے آیا ہوں۔

سیلچن۔ (خوفزدہ ہو کر) جبلِ عظیم! مگر وہاں چڑھنا ناممکن ہے۔

لیمنڈ۔ (ہوا کرے) مَیں کوشش تو کرونگا۔

سیلچن۔ (مگر اس سے پہلے) جبلِ شراب اور جبلِ بقر بھی تو ہیں۔

لیمنڈ۔ اُن پر مَیں چڑھ چکا ہوں۔

سیلچن۔ مگر جبلِ عظیم پر چڑھنا بے حد خطرناک ہے ـــ شاید ـــ موت کو دعوت دینا ہے۔

لیمنڈ۔ لاحول ولا! انسان کو کوشش تو کرنی چاہیئے۔

سیلچن۔ ابا کے پاؤں میں چوٹ لگی ہوئی ہے اور رہنما اس وقت صرف فیلزمین ہے۔

لیمنڈ۔ وہ مشہورِ عالم فیلزمین؟۔

سیلچن۔ (گردن سے اثبات کا اشارہ کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لئے تعریف کی جھلک ہے) کیا آپ وہی لیمنڈ صاحب ہیں جو اِس سال ہمارے دوسرے چھوٹے پہاڑوں پر چڑھ چکے ہیں؟

لیمنڈ۔ ہاں، سوائے اِس جبلِ عظیم کے۔

سیلچن۔ ہم نے آپ کا نام سُنا ہے۔ کیا آپ ایک دن انتظار نہیں کر سکتے کہ ابا کا پاؤں اچھا ہو جائے۔

لیمنڈ۔ جی نہیں، مجھے کل تک گھر واپس پہونچ جانا چاہیئے۔

سیلچن۔ تو جنابِ عالی بڑی جلدی میں ہیں؟

لیمنڈ۔ (اُسکو غور سے دیکھتے ہوئے) کیا کیا جائے!

سیلچن۔ کیا آپ کسی بڑے شہر کے باشندے ہیں؟ بہت ہی بڑے شہر کے؟

لیمنڈ۔ ہاں، وہاں چھ لاکھ کی آبادی ہے۔

سیلچن۔ اوہ! (کچھ دیر کے بعد) میں کورٹمنیا دو دفعہ جا چکی ہوں۔

لیمنڈ۔ کیا تم تمام سال نہیں رہتی ہو؟

سیلچن۔ سردیوں میں وادی میں چلے جاتے ہیں۔

لیمنڈ۔ کیا تمہیں دُنیا دیکھنے کی تمنا نہیں ہوتی؟

سیلچن۔ کبھی کبھی۔ (دروازے کے پاس جا کر آہستہ سے پکارتی ہے) فلزمین! (پھر ایک دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کر کے آہستہ سے) وہاں سات جرمن حضرات سو رہے ہیں۔

لیمنڈ۔ اوخدا!

سیلچن۔ ذرا ہولے! وہ یہاں طلوعِ آفتاب کی سیر کرنے آئے ہیں۔ (لیمنڈ کی جیب سے ایک کتاب گر پڑتی ہے، وہ اُسے اُٹھا لیتی ہے) میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔

لیمنڈ۔ یہ ایک بڑے شاعر کا دیوان ہے۔ کیا تم یہاں، اِن پہاڑوں میں گھری ہوئی، کبھی شاعری نہیں کرتیں؟ اور کیا تمہیں

یہاں سُہانے خواب دکھائی نہیں دیتے؟۔

سیلچن ۔ (گردن سے نفی میں جواب دیتی ہوئی۔) دیکھو آج چاند پورا ہے۔

(وہ دونوں دریچے کے پاس کھڑے ہوئے چاند دیکھ رہے ہیں۔ ایک توانا، خاموش اور دُبلا پتلا شخص اندر داخل ہوتا ہے۔)

سیلچن ۔ فلزمین!

فلزمین ۔ کیا ان صاحب کو میری ضرورت ہے؟

سیلچن ۔ (خوفزدہ سی) ان کا کل صبح جبلِ عظیم کا ارادہ ہے۔ (اسکے کان میں) یہ وہی مشہور شہری ہیں۔

فلزمین ۔ جبلِ عظیم پر چڑھنا ناممکن ہے۔

لیمنڈ ۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں! اور آپ ہی وہ شہرہ آفاق فلزمین ہیں!

فلزمین ۔ (تندی سے) ہم علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔

سیلچن ۔ یہ عرصۂ دراز کے بعد پہلا موقع ہے!

لیمنڈ ۔ (دریچے والی جگہ پر اپنا سامان رکھتے ہوئے) کیا یہاں میرے سونے کا انتظام ہو سکتا!

سیلچن ۔ میں ذرا دیکھ لوں۔

فلزمین ۔ (الماری میں سے کمبل نکال کر دریچے والی جگہ پر بچھا دیتا ہے۔) یہاں!

(اس کے باہر جاتے ہی سیلچن اندر آتی ہے)

سیلچن ۔ ایک بستر ابھی خالی ہے۔ یہ جگہ تو آپ کیلئے بہت سخت رہے گی

لیمنڈ ۔ شکریہ! نہیں، یہ ٹھیک ہے۔

سیلچن ۔ میری خاطر سہی!

لیمنڈ ۔ تمہارا نام کیا ہے؟

سیلچن ۔ سیلچن۔

لیمنڈ ۔ ننھی رُوح، اس کا مطلب ہے —— ہے نا! تمہیں خوش کرنے کے لئے میں اُن سات حضرات کے ساتھ سو جاؤنگا۔

(وہ جانے لگتا ہے)

سیلچن ۔ کیا یہ شہر (جو دنیا کہلاتے ہیں اور) جہاں سے تم آئے ہو، بہت اچھے ہیں؟

لیمنڈ ۔ جب میں وہاں ہوں تو یہاں ہوتا ہوں اور جب یہاں ہوں تو وہاں ہوتا ہوں۔

سیلچن ۔ یہ تو میری طرح ہے —— لیکن میں ہمیشہ یہیں رہتی ہوں!

لیمنڈ ۔ ہوں! شہروں میں تم جیسا کوئی نہیں۔

سیلچن ۔ ایک شخص دو جگہ نہیں ہو سکتا۔ (یکبارگی) شہروں میں تھیٹر ہوتے ہیں حسین و جمیل صناعی کے نمونے ہوتے ہیں اور —— رقص —— گرجا —— ریلیں —— اور وہ تمام چیزیں جن کا کتابوں میں تذکرہ ہوتا ہے۔۔ اور ——

لیمنڈ ۔ مصائب۔

سیلچن ۔ لیکن زندگی بھی تو وہیں ہے۔

لیمنڈ ۔ اور موت بھی تو۔

سیلچن ۔ کل، جب تم چڑھ چکے ہو گے —— کیا واپس نہیں آؤ گے؟

لیمنڈ ۔ نہیں۔

سیلچن ۔ تمہارے پاس تمام دُنیا ہے۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

لیمنڈ ۔ سوائے فلزمین اور پہاڑوں کے۔

سیلچن ۔ صرف روٹی ہی کھا لینا تو اچھا نہیں ہے۔

لیمنڈ ۔ (اُسکو تکتے ہوئے۔) میں تو تمہیں کھا لینا چاہتا ہوں۔

سیلچن ۔ مگر میں لذیذ نہیں ہوں۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔

لیمنڈ:۔ میں واپس آؤں گا۔

سیلچن:۔ پھر کوئی دُشوار گذار پہاڑ تو چڑھنے باقی نہیں رہینگے۔ اور اگر یہ سرو رآگیں نہ ہو تو تم پروا ہی کب کرتے ہو۔

لیمنڈ:۔ کتنی سمجھدار ہو تم!

سیلچن:۔ نہیں، میں سمجھدار نہیں ہوں۔ یہاں ہر وقت کا رہنا ایسا معلوم ہوتا ہے —— وہاں بڑی دُنیا میں کیا تم (مجھے) یاد رکھوگے؟

لیمنڈ:۔ (اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) اُس بڑی دُنیا میں کوئی شے اس جیسی حسین اور شیریں نہیں۔

سیلچن:۔ لیکن وہ بڑی دُنیا بذاتِ خود جو ہے۔

لیمنڈ:۔ کیا میں شب بخیر کہنے کیلئے تمہیں بوسہ دوں؟

(وہ اپنا چہرہ آگے کر دیتی ہے اور وہ اُس کے رُخسار پر پیار کرتا ہے۔ اور دفعتاً اُس کے لبوں پر بھی۔ اور جونہی وہ پیچھے ہٹتی ہے۔)

لیمنڈ:۔ مجھے افسوس ہے۔

سیلچن:۔ کوئی ہرج نہیں۔

لیمنڈ:۔ (شمع لیتے ہوئے) خواب شیریں! شب بخیر!

سیلچن:۔ (ہولے سے) شب بخیر

فلزمین:۔ (باہر سے آتے ہوئے اور اُنہیں دیکھکر) ٹھنڈ ہوگئی ہے —— بڑا لطف رہیگا۔

(لیمنڈ، پیچھے مُڑکر دیکھتے ہوئے، چلا جاتا ہے۔ فلزمین اس کے جانے کا انتظار کرتا ہے۔)

سیلچن:۔ (دریچے کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) میں نے سوچا یہ جگہ اس کے لئے بہت سخت ہوگی۔

(وہ اُس کے پاس جاتا ہے اور ایک منٹ خاموش کھڑا رہتا ہے، پھر جھک کر سے اس طرح پیار کرتا ہے گویا بھوکا ہے۔)

سیلچن:۔ کیا تو بھوکا ہے؟

(وہ کوئی جواب نہیں دیتا اور چراغ بجھا کر ایک اندرونی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سیلچن دریچے میں سے، چاندنی میں نہائی ہوئی چوٹیوں کو بیٹھی دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کمبل اوڑھ کر وہیں دریچے والی جگہ پر بمشکل تمام لیٹ جاتی ہے۔)

سیلچن:۔ (سوئی ہوئی آواز میں) اُنہوں نے مجھے پیار کیا ہے —— دونوں نے۔

(وہ سو جاتی ہے)

منظر پر تاریکی چھا جاتی ہے۔

دوسرا منظر

(منظر صبح کے تڑکے کی طرح دھیرے دھیرے روشن ہو رہا ہے۔ سیلچن دریچے والی جگہ پر اب بھی لیٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا چہرہ اور ہاتھ کمبل میں سے نکال کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور گہری نیند کی بجائے روا رخواب لئے ملفوف کرلیتی ہے۔ جھونپڑی کی دیوار غائب ہوچکی ہے۔ سیلچن اور کہر سے ڈھکے ہوئے سیاہ پہاڑوں کے درمیان سوائے تھوڑی سی تاریک فضا کے اور کچھ حائل نہیں ہے۔ سیلچن کے پاس ہی اس اندھیرے کے سرے پر، جو اسکو پہاڑوں سے جُدا کر رہا ہے، چار "پھول" موگرا، گلاب، نیلوفر اور گُلِ اشرفی اُسے تاریکی میں سے جھانک رہے ہیں۔ وہ اپنے سروں پر اپنے بے شمار پھولوں کے تاج

پہنے ہوئے ہیں جن پر شبنم کے قطرے سجے ہوئے
ہیں اور جو ننھی ننھی گھنٹیوں کی طرح بج رہے ہیں)

سیلچن:- ارے! ان کے تو چہرے ہیں!

(چوٹیوں کے چاروں طرف صرف سیاہی مائل
نیلا آسمان نظر آتا ہے۔ چوٹیاں چمک اٹھی ہیں)

موگرا:- (دھیمی آواز میں) کیا تم! کیا تم؟ کیا تم؟ آہ! آہ! گلاب، نیلوفر، گل اشرفی (ان کی گھنٹیاں حسد سے بج رہی ہیں) اوہ اوہ۔

(دفعتاً جبل بقر کی چوٹی ایسی آواز میں بولنے لگتی
ہے جو غیر مانوس ہے۔)

جبلِ بقر:- میں پہاڑ ہوں اور اپنی گایوں اور بھیڑوں میں رہتا ہوں۔ میں خاموش ہوں اور ایک ہی سی آواز ہوں، اور میں ہی بلند پہاڑیاں ہوں۔ میں خوف اور کوہستانی ہوا ہوں، عمدہ چراگاہ اور بے پناہ آرام میری آنکھوں میں دیکھو اور صرف مجھ ہی سے محبت کرو۔

سیلچن:- (حیرت زا) جبلِ بقر! وہ ترجمانی کر رہا ہے — فطرت کی اور پہاڑوں کی۔ یہ میرا نصف قلب ہے۔

(پھول خوش خوش ہنسنے لگتے ہیں۔)

جبلِ بقر:- میں ابدی پہاڑیوں کو اگاتا ہوں — میں کوہستانی برف پیتا ہوں۔ میری آنکھوں کا رنگ دہکتی ہوئی شراب کا سا ہے۔ اور ان ہی میں اداسی پناہ گزیں ہوتی ہے۔ گایوں کی آوازیں، ہوا کی سرسراہٹ، چٹانوں کے گرنے کا شور، سیلاب کا ترنم — (بس) ان کے علاوہ مجھے کوئی اور بات نہیں آتی — خیالات سادے، خون گرم، طاقت بے حد — گردش کا چین۔

سیلچن:- ہاں، ہاں، مجھے اسکی ضرورت ہے۔ وہ بہت طاقتور ہے!

جبلِ بقر:- ننھی روح! میرے پاس آ! مجھ سے محبت کر! اور میرے ساتھ تاروں کی چھاؤں میں رہ!

سیلچن:- (دبی آواز میں) شاید ایسا نہ ہو سکے!

(یکبارگی جبلِ شراب کی چوٹی ایک نوجوان کی
سی آواز میں بولنے لگتی ہے۔)

جبلِ شراب:- میں ہی چھلاوہ ہوں — جو بازاروں میں ناچتا پھرتا ہے! میں قمری ہوں جو شاہ بلوط کے سائے تلے کوکتی ہے۔ (دنیا میں) کسی شے کو قیام نہیں لیکن میں اپنے ہزاروں پیوتاؤں کو اپنی خوشبو پیش کئے جاتا ہوں۔ عراق سے ایوان اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والے خیاباں میرے مسکن ہیں۔ سینکڑوں آدمیوں کی زندگی میری ہے — اور صبح کے تڑکے گلیوں کی روشنیاں بھی۔ (رسان سے) میری الفتیں ہزاروں ہیں لیکن ان میں سے دائمی ایک بھی نہیں کیونکہ میں تمہارے ان بچھڑوں سے کہیں زیادہ شک رد ہوں جو دھوپ میں کھیلتے ملتے ہوں۔

(پھول جن کی گھنٹیاں خوف میں بج رہی ہیں،
چیخنے لگتے ہیں "ہم انہیں خوب جانتے ہیں!")

جبلِ شراب:- میں مسرت کی تخلیق اور موت کی آوازیں سنتا ہوں اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بھی۔ میں لوگوں کی چیخ پکار سنتا ہوں اور خاموش رات میں محبت سے لبریز بوسوں کی آوازیں بھی۔ میرے بغیر اے ننھی روح! تم بھوکی رہو گی اور مرجاؤ گی۔

سیلچن:- یہ ان صاحب (ریمنڈ) کی اور شہری دنیا کی ترجمانی کر رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

جبلِ شراب:- میرے خیالات کا شمار تمہارے سبزہ زار میں لہلہانے والے پھولوں سے کہیں زیادہ ہے اور ان کی پرواز ہوا میں اڑنے والے عقابوں سے زیادہ تیز۔ میں بلند حوصلگی کی شراب اور حقیقت کی دوا پیتا ہوں اور اس لئے میں کبھی کاہل نہیں ہوتا۔

سیلچن:- مجھے شبہ ہے۔

جبلِ شراب۔ مجھ سے محبت کر اے ننھی روح! میں زندگی کو پچاسوں رنگوں سے مزین کرتا ہوں۔ میں ہزاروں چیزیں بناتا ہوں! ——میں تمہارے قلب کا طواف کرونگا۔

سیلیچن۔ وہ شہد کی طرح میٹھا ہے!

(پھول اپنی گھنٹیاں حسد سے بجانے لگتے ہیں اور پوچھتے ہیں "تم بھی تو ہے!")

جبلِ بقر۔ میرے پاس رہو، سیلیچن۔ میں تمہیں شفاف ہوا سے بیدار کرتا ہوں۔

(پھول کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔)

جبلِ شراب۔ میرے پاس آؤ سیلیچن! میرا رنگ برنگا پنکھا تمہیں بیدار کرے گا۔

(پھول ماتم کرتے ہیں۔)

سیلیچن۔ (رنج میں) میرا دل! آہ! یہ ٹوٹے جاتا ہے۔

جبلِ شراب۔ اے ننھی روح، میرے ساتھ رہکر تم بازاروں کی سیر کرو گی اور بہت سے رازوں سے واقف ہو جاؤ گی۔ ہم دونوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پنکھڑیوں کی طرح اڑتے پھرینگے۔

گلِ اشرفی۔ میری پنکھڑیاں زیادہ تیز اڑتی ہیں!

جبلِ شراب۔ میں تمہیں سمندر کی سیر کراؤنگا۔

نیلوفر۔ میری نیلاہٹ زیادہ گہری ہے!

جبلِ شراب۔ میں تم پر ترنم و حجاب کی بارش کر دونگا۔

گلاب۔ میرا حجاب زیادہ احمریں ہے۔

جبلِ شراب۔ ننھی روح، سنو میرے جواہرات، ریشم، مخمل!

موگرا۔ میں مخمل سے زیادہ نرم و نازک ہوں!

جبلِ شراب۔ (فخریہ) پُراسرار لباس!

پھول (افسوس کرتے ہوئے)۔ ہاں یہ ہمارے پاس نہیں۔

سیلیچن۔ اسکے پاس سب کچھ ہے۔

جبلِ بقر۔ یہ سپیں بازو والے سحاب میرے ہیں اور یہ دھوپ میں تپنے والی چٹانیں بھی۔ میرے شبنم کے قطرے موتیوں سے زیادہ سرد ہیں۔ میرے برفانی سانس اور لطیف گھاس سے دور رہکر، اے ننھی روح، تم پژمردہ ہو جاؤ گی۔

جبلِ شراب۔ سبز لونگ میری خوشبو ہے!

سیلیچن۔ (گھبرا کر) آہ!

جبلِ بقر۔ میں تمہیں کبھی اپنے سے جدا نہ کرونگا۔

جبلِ شراب۔ میں تمہیں سینکڑوں مرتبہ چھوڑ دونگا اور سینکڑوں مرتبہ واپس آکر تمہیں پیار کرونگا۔

سیلیچن (سرگوشی میں)۔ میرے قلب کی تسکین!

جبلِ بقر۔ میرے ساتھ رہ کر تم کوہستانی نرم و گرم سبزہ زار میں آرام کرو گی۔

(پھول خوش خوش ہنستے ہیں۔)

جبلِ شراب۔ میرے ساتھ رہ کر تم قمری کے پروں کے ملائم بچھونے پر خوابِ استراحت ہو گی۔

(پھول کراہتے ہیں۔)

جبلِ شراب۔ میں تمہیں پرانی شراب دونگا۔

جبلِ بقر۔ میں تمہیں تازہ دودھ دونگا۔

جبلِ شراب۔ میرا گیت سنو!

(دور سے ستار کی سی آواز آتی ہے)

سیلیچن (اپنا دل پکڑ کر)۔ میرا دل —— آہ! مجھ سے جدا ہو رہا ہے!

(بہت دور سے کسی چرواہے کی بانسری کا نغمہ لہراتا ہوا آتا ہے۔)

سیلیچن (کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے)۔ بانسری کا نغمہ، آہ!

جبلِ بقر۔ میرے ہی ساتھ رہو سیلیچن!

جبلِ شراب۔ میرے پاس آؤ سیلیچن!

جبلِ بقر۔ میں تجھے ایقان دیتا ہوں۔

جبلِ شراب۔ میں تجھے امرِ اتفاقی دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے سکون دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے تلوّن دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے خاموشی دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے آواز دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے وحدت دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے دو محبتیں دیتا ہوں۔

سیلچن (گویا الفاظ اس کے قلب سے زبردستی چھینے گئے ہیں --)۔
دونوں، دونوں سے ——— میں محبت کرونگی۔
(یکبارگی جبلِ عظیم کی چوٹی مخاطب ہوتی ہے)

جبلِ عظیم۔ تو دونوں ہی سے محبت کرے گی اے ننھی روح! تو پہاڑیوں پر "خاموشی" کے ساتھ آرام کرے گی اور شہروں میں "علم" کے ساتھ محوِ رقص ہوگی۔ دونوں تجھ پر قابض رہیں گے! پہاڑوں پر چمکنے والے چاند اور سورج تجھے جلا دیں گے، اور اے ننھی پروالی! شہر کے چراغ تیرے پروں کو جھلس دیں گے۔ ان میں سے ہر ایک تجھکو ایک دنیا معلوم ہوگا اور اپنی قبر بھی! تیرا دل اس پر کی مانند ہے جسے ایک منہ پھونک مار کر اڑا دے، اور پھر دوسرا۔ لیکن خائف نہ ہو! کیونکہ انسان کی زندگی باری باری بہت سی محبتوں کیلئے ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کی طرح ہے جو (ساحل پر) لنگر انداز ہو اور پھر نیلے سمندر میں تیرنے لگے۔ یہ ایک نغمہ ہے جو سکوت میں الجھا ہوا ہو اور پھر سرگوشی کرنے لگے۔ یہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے، کچھ جری، کچھ غافل۔ اس میں "متواتر موسیقی" ہے "تبدیلی" ہے۔ "سکوت" ہے "اتفاق" ہے اور "یقین" ہے "واحد" ہے اور "بیشمار" ہے۔ بھڑکتا رہ ——— اے حسین شعلے! اس کوشش میں کہ تو تمام دنیا کو نگل لے! پر آخر تو آئے گی میرے ہی پاس اے ننھی روح!

(مدہوش سی سیلچن اس منظر اور آواز کو آغوش میں لے لینے کیلئے اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ مگر سب کچھ تاریک نیند میں آہستہ آہستہ کھو جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(تاریک منظر رات کے آسمان تلے پھر چمک اٹھا ہے۔ سیلچن کھڑی ہوئی ہے، اس کے ہاتھ ایک شہر کے دروازے کی طرف جس میں سے روشنی کی ایک نہر بہہ رہی ہے، پھیلے ہوئے ہیں۔ دروازے کی ایک جانب ایک نوجوان کی مورت کھڑی ہوئی ہے جس کے گرد روشنی کا ہالہ ہے، دوسری جانب سائے میں ملفوف ایک مجسمہ ہے۔ دروازے کے اوپر بیچ میں پتھر کا بنا ہوا ایک عجیب الخلقت جانور کا سر ہے جو دھندلا نظر آرہا ہے۔)

جبلِ شراب کا نوجوان گاتا ہے:۔
"اے ننھی سی شہابی روح
جو کہر آلود اتھاہ رات میں
یکہ و تنہا ماری ماری پھر رہی ہے، غیر مطمئن ———
اس غضب کی سردی سے نکل آ،
میں تجھے آرام دہ اور گرم جگہ بلا رہا ہوں ———
یہاں جہاں میں اپنا بربط بجاتا ہوں ———
اس ماہتاب زرنگار کے نیچے"

سیلچن (سرگوشی میں) کیا یہ "شہر" ہے! ——— وہی وسیع دنیا۔

جبلِ شراب کا نوجوان گائے جاتا ہے:۔
"جیسے سمندر ہرا پروانہ

تحیّر خیز فروزاں شمعوں کے گرد،
جل جانا چاہتا ہے، اسی طرح مایوس ذبیحانہ —
آہ! اے بے قرار قمری،
میں چاہتا ہوں کہ تجھ میں بھی —
اب جبکہ میں بربط بجا رہا ہوں —
عشق کا قرمزی شعلہ بھڑک اُٹھے۔

...لیچن:۔ (دروازے کی طرف مسرت سے دیکھتے ہوئے) وہاں
...اور روشنی ہے!

(جس وقت وہ بولتی ہے، دونوں جانب سے
پروانے آتے ہیں اور آپس میں مل جُل کر ناچتے
ہوئے دروازے تک جاتے ہیں اور پھر اُچھلتے
کودتے سامنے آجاتے ہیں۔)

...چن (اپنے تیز ہاتھ پھیلاتے ہوئے) یہ تو سچ مچ کے ہیں —
...کے پروں سے ہوا نکلتی ہے۔

(پروانے اُسکے پاس سے گذر کر شہر میں غائب
ہوجاتے ہیں۔)

...شراب کا نوجوان گاتا ہے:۔

اے میرے گیت کے ہونٹوں! تم
اس مرمریں دوشیزہ کے قلب کے پاس
جاؤ اور دل سوزی سے سرگوشی میں کہو
ان الفاظ پُر اثر کو
"اے سُننے والی!
تیر یا محبت جب ایک دفعہ گذر جائے،
تو وہ دوبارہ واپس نہیں آتی!"

(سیلیچن اسکی طرف دوڑتی ہے — لیکن اُس
نوجوان کے گرد جو روشنی کا ہالہ ہے وہ مدھم
ہوجاتا ہے اور وہ ایک سایہ بنکر رہ جاتا ہے

دروازے میں سیاہ فرغل پہنے ہوئے لیمنڈ
کھڑا ہے۔)

سیلیچن:۔ اے تم ہو؟
لیمنڈ:۔ اپنی ننھی رُوح کے بغیر میں سرد اور بے جان ہوں۔
آؤ! —

(اس کے لئے اپنی آغوش وا کردیتا ہے)

سیلیچن:۔ کیا میں محفوظ رہونگی؟
لیمنڈ:۔ حفاظت کسے کہتے ہیں؟ کیا تم اپنے پہاڑوں میں
محفوظ ہو؟
سیلیچن:۔ میں کہاں ہوں؟
لیمنڈ:۔ شہر میں۔

(مُسکراتے ہوئے وہ دروازے کی طرف اشارہ
کرتا ہے۔ بازار کی جگنو جیسی روشنیاں رقص کرتی
نظر آتی ہیں۔)

سیلیچن (سرگوشی میں) یہ کیا ہیں؟
لیمنڈ:۔ روشنیاں، پیاری — بازار کی روشنیاں۔
چراغ ہیں — زرِ حیات!
سیلیچن:۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی چمکدار رہتی ہیں؟

(جبلِ شراب کے نوجوان کے گرد جو ہالہ ہے
وہ دوبارہ چمک اُٹھتا ہے اور وہ اپنا ساز
بلند آہنگی کے ساتھ چھیڑتا ہے اور جب سیلیچن
اس آواز کی طرف مُڑتی ہے تو اُسکی رنگت دھیمی
پڑجاتی ہے۔ وہ اب پھر وہی نیلا سا سایہ ہے
اور جگنوؤں کی روشنیاں دروازے میں سے
غائب ہوگئی ہیں۔)

سیلیچن:۔ کیا وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے؟
لیمنڈ:۔ آؤ۔

سیلچن:۔ مجھے ڈر لگتا ہے!

لیمنڈ:۔ نئی باتوں سے؟ کیا تم صرف نصف ماہتاب ہی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہو؟ آہ اے ننھی روح کیا تم صرف اپنی کھڑکیوں ہی میں رہو گی ـــــ ایسی حالت میں جبکہ میں تم کو سب کچھ دکھا سکتا ہوں؟

سیلچن:۔ کیا وہ اچھے ہیں؟

لیمنڈ:۔ وہ سب کچھ ہیں۔

سیلچن:۔ (دروازے کی طرف قدم سرکتے ہوئے) شہر کس قدر عجیب وغریب اور روشن ہے! کیا وہاں تمہیں اندھیرا نہ ہوگا ـــــ؟

لیمنڈ:۔ میں تمہیں اندھیرے کو تم سے دور رکھوں گا

سیلچن:۔ اوہ! لیکن میں محبت نہیں کرتی۔

لیمنڈ:۔ اری معصوم! محبت کرنا ہی تو زندگی ہے ـــــ عجب ہے کہ جستجو کرتے رہنا، جب کوئی پرندہ اڑتا ہے تو کیا وہ ہوا سے جو ایک نامعلوم شے ہے، محبت نہیں کرتا ہوتا؟ اگر تاریکی اور روشنی بدلتی نہیں رہتیں تو کیا ہم سانس نہیں لے سکتے تھے؟ (اور جو ہی زور دیتا ہے) محبت کرنا گویا ایک درخت پر چڑھنا ہے اور پھر چھوٹے سے سبز پھول کو دیکھتے ہوئے اسے توڑنے کیلئے نیچے اترنا! اس کے پر ہیں۔ یہ اڑ گیا ہے ـــــ تم کو پھر چڑھنا چاہیئے ـــــ یہ کانپ رہا ہے، لیکن یہ صرف تمہارے ہاتھ کی ہوا ہے ـــــ تم کو گھٹنا چاہیئے، تم کو جھکنا چاہیئے، تم کو کودنا چاہیئے، پھر یہ کبھی وہاں ہے یہاں نہیں ـــــ کیونکہ سبز پھول پروانے کی طرح اڑتا ہے اور صرف اس کے پروں کی ہوا ہی کو تم پکڑ سکو گی۔ مگر تمہاری آنکھیں چمک رہی ہوں گی، تمہارے رخسار دمک رہے ہوں گے۔ تمہارے سینے کا زیر و بم نمایاں ہو رہا ہوگا ـــــ آہ! اے ننھے سے دل! (منظر تاریک ہو جاتا ہے۔) اور جب رات ہو گی ـــــ یہ ساکت ہو جائیگا۔ گل مغیلاں کی طرح اندھیرے میں نہیں مرجھایا ہوا! اور تمہارا گورا ہاتھ اسکو تلاش کریگا لیکن تمہارا شیریں سانس ان کو نہیں دور ہٹا دے گا اور تم ہرگز ہرگز اسکو نہ پکڑ سکو گی ـــــ ہاں، زندگی خوبصورت ہو جائے گی، (اسکی آواز ہوتے ہوتے سرگوشی بن جاتی ہے۔ وہ اپنی آغوش وا کرتا ہے۔) میرے شہر میں آؤ ـــــ آؤ۔

سیلچن:۔ (لیمنڈ کے سینے پر ہاتھ رکھکر) میں آتی ہوں۔

لیمنڈ:۔ (اسکو دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے۔) مجھ سے محبت کرو!

سیلچن:۔ میں محبت کرتی ہوں۔

(بربط بجنے لگتا ہے۔ وہ شہر میں چلے جاتے ہیں۔
جبل شراب کا نوجوان اپنی قرمزی روشنی میں
دوبارہ دکھائی دیتا ہے اور ساز کے ساتھ
آہستہ آہستہ گانا شروع کرتا ہے:)

"ہوائی گھڑیاں تاریکی میں گذری جا رہی ہیں ـــــ
میری پیاری کیا تو انہیں نہیں سن سکتی؟
نئی محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی محبتیں فنا ہو جاتی ہیں،
اور بوسے لیتے ہوئے لبوں کو جدا ہونا پڑتا ہے۔
گذرے ہوئے سالوں کی خاکی مکھیاں ـــــ
کیا تو انہیں نہیں دیکھ سکتی اے میری روح ـــــ
کہ وہ کبھی اس پھول کے اور کبھی اس پھول کے آنسو
چوستی پھرتی ہیں۔
اور میٹھے شہد کی زرد شراب؟
(اس کی آواز عجیب وغریب اور پرجوش بن جاتی ہے۔)
اے وہ شعلے جو وقت کی بادیہ پیمائی کرتا ہے
دم بہ دم نیچا ہونے والے!
جہاں کالی کالی سحر دلدل میں سے نکل

ہم مایوس لوگ تیری رہنمائی میں پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔
اے آتشِ غیر وقت ہم التجا کرتے ہیں کہ تو ذرا ٹھہر!
ادھر اندھیری ہوا میں
سنہرا خانہ بدوش مسافر نکلا رہا ہے —
اور ایسا ہی محبت کے ساتھ ہوتا رہا ہے!"

(اسکے گانے کے دوران میں ہر چیز تاریک ہو جاتی ہے سوائے اس روشنی کے ہالے کے جو اسکے گرد ہے۔ گیت ختم ہونے پر وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ پو پھٹ رہی ہے۔ شہر کے تاریک دروازے میں سے سرد اور سبز روشنی میں سیلچن آتی ہے۔ وہ زرد ہے۔ گویا اس کی زندگی گھٹ گئی ہے۔ اسکی پھٹی آنکھیں اور چہرے کی سفیدی سراسیمگی ظاہر کر رہی ہیں۔)

سیلچن:۔ میرا دل مرجھا گیا ہے۔

(جیسے ہی وہ بولتی ہے دور سے گایوں کی گھنٹیاں بجنے کی مدھم آواز آتی ہے اور جب وہ کھڑی سنتی ہوتی ہے، شہر کے دروازے میں لیمنڈ نظر آتا ہے۔)

لیمنڈ:۔ ننھی روح!

سیلچن:۔ تم! ہر وقت تم!

لیمنڈ:۔ میرے پاس نئے عجوبے ہیں (سیلچن سر کو جنبش دیتی ہے) بخدا تم مجھ سے اکتائی نہیں ہو کیونکہ میں کبھی ایک سا نہیں ہوں۔

سیلچن:۔ سنو!

(گایوں کی گھنٹیوں کی آواز پھر سنائی دیتی ہے)

لیمنڈ:۔ (حسد سے) کاہل نیند کی موسیقی! تو کیا زندگی میرے ساتھ غمگین رہی ہے؟

سیلچن:۔ مجھے اس کا افسوس نہیں۔

لیمنڈ:۔ آؤ۔

سیلچن:۔ (اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے) پرند اڑتے اڑتے تھک گیا ہے۔ (اپنے لبوں کو چھو کر) پھولوں میں شبنم نہیں رہی۔

لیمنڈ:۔ کیا تم مجھے چھوڑ دو گی؟

سیلچن:۔ دیکھو!

(صبح کے جھٹپٹے میں دروازے کے قریب لیکن شہر سے کہیں دور اشارہ کرتا ہوا ایک مدھم مجسمہ، جبل البقر کے چرواہے میں تبدیل ہو گیا ہے۔)

لیمنڈ:۔ یہ کیا ہے؟

سیلچن:۔ میرے پہاڑ!

لیمنڈ:۔ وہاں کچھ نہیں دھرا۔ (اسے مضبوطی سے گرفت میں لے لیتا ہے۔) مت جاؤ! مت جاؤ! میں نے تمہیں اپنے شہر کے عجوبے دیدیے ہیں۔ میں تمہیں اور عجوبے دونگا! (لیکن سیلچن اس سے الگ ہٹ جاتی ہے) اگر اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا تو آؤ ہم دونوں ساتھ مرجائیں! دیکھو! وہ پیاری موتیں آرہی ہیں جو سونے اور ڈوبنے سے واقع ہوتی ہیں۔

(شہر کے تاریک دروازے میں سے دھندلی سی شکلیں نمودار ہو رہی ہیں۔ یہ موتیں ہیں جو سونے اور ڈوبنے سے آتی ہیں۔ وہ سیلچن کی طرف آہستہ آہستہ ناچتی ہوئی آتی ہیں، اور کچھ دیر اسکو مسکرا کر دیکھتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ناچتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔)

سیلچن:۔ ہاں وہ اچھی اور نیک ہیں۔

(جب وہ شہر کی طرف دوبارہ حرکت کرتی ہے لیمنڈ کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھتا ہے لیکن جونہی وہ دروازے کے پاس پہونچتی ہے دور سے گایوں کی گھنٹیوں اور بانسریوں کے

بجنے کی آواز پھر سُنائی دیتی ہے جبلِ شراب کا
چرواہا گاتا ہے :۔
آ! بیابان کی گھاس میں، اور
بہت دُور، گھمنے والی چٹانوں کی مدھم آوازوں میں۔
آ! پھولوں سے لدے ہوئے اپنے پہاڑی وطن کے چمن زار میں
جہاں عقاب پرواز کرتے ہیں۔
اور اُون سے لدی ہوئی بھیڑیں دُھوپ میں چرتی ہیں۔
آ! پہاڑ پہ، جہاں میں چاند کی پتلی پتلی زرد
کرنوں کا تاج پہنے ہوئے
اپنے کاہستان میں گھومتا پھرتا ہوں۔
آ! پُر سکون آسمان تلے، اور گلہائے صبح کے
پُر آرزو نغموں میں ——— میری بیٹی !
(وہ گا رہا ہے۔ سورج طلوع ہو گیا ہے۔ سیلچن لب کھولے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے علیحدہ ہو چکی ہے اور موت کی شکلیں شہر میں واپس جا کر غائب ہو گئی ہیں۔)

سیلچن :۔ میں آتی ہوں۔

لیمنڈ :۔ (اُس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے) ننھی روح! تو کیا مجھے غروبِ آفتاب کے بعد مچھر کی طرح مر ہی جانا چاہیئے؟ آہ! تمہارے بغیر میں زندہ نہ رہونگا۔

سیلچن (اپنے آپ کو چھُڑاتے ہوئے) :۔ بے کس دل! میں جا رہی ہوں —— !

لیمنڈ :۔ تاریکی ہو گئی۔ (شہر کے دروازے میں وہ اپنے چہرے کو اپنے فرغل سے چھپا لیتا ہے۔)

(جب سیلچن، جبلِ بقر کے چرواہے کے پاس پہونچتی ہے بانسری کا ایک طویل نغمہ گونجتا ہے، منظر تاریک ہو جاتا ہے اور کہیں دُور گایوں، اور پھولوں کی گھنٹیوں، اور بانسریوں کی ملی جلی مسلسل آوازیں بلند ہوتی ہیں۔)

چوتھا منظر

(منظر فجر کی کُہر آلود سُرخی سے آہستہ آہستہ روشن ہو رہا ہے۔ سیلچن ایک سبزہ زار پہاڑ پر کھڑی ہوئی ہے جس کے چاروں طرف سوائے نیلگوں آسمان کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسکی پشت پر لال چمک رہا ہے۔ ایک نیچی چٹان پر ایک گڈریا بیٹھا ہوا بانسری بجا رہا ہے اور "چار پھول" اپنے سبزی مائل سپید، نیلے، قرمزی اور سُنہری رنگوں کی تبدیلیوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنے رنگ کے پھولوں سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں تو اُن کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ انمیں سے ہر ایک اپنے رقص کی گردش پوری کرتے ہوئے باری باری سیلچن کی طرف پھول پھینکتا ہے جسے وہ اُٹھا کر اپنے لبوں اور آنکھوں سے لگا لیتی ہے۔)

سیلچن :۔ شبنم۔ (وہ چٹان کی طرف چلتی ہے) گڈریا!

(لیکن "پھول" سیلچن کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور جب وہ اُسکے گرد طواف کر کے چلے جاتے ہیں تو گڈریا بھی غائب ہو جاتا ہے۔ وہ "پھولوں" کی طرف متوجہ ہوتی ہے لیکن وہ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ دُھندلکے کی نقاب اُٹھ رہی ہے۔)

سیلچن :۔ چلا گیا! (وہ اپنی آنکھیں ملتی ہے۔ پھر چٹان کی طرف ایک بار اور مُڑتی ہے۔ سامنے فلزمین اپنے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے کھڑا ہے۔) تم ہو!

فلزمین :۔ تو تُو آ گئی ——— ایک زخم خوردہ بچھیا کی طرح

کہ تکلیف سے نجات پائے! کیا شہر بہت ہی دلکش تھا جس نے تجھے اتنے عرصے تک وہیں جکڑے رکھا!

سیلچین:۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔

فلزمین:۔ پھر واپس کیوں آئی؟

سیلچین:۔ میں اکتا گئی تھی۔

فلزمین:۔ اب تُو مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جائے گی۔

سیلچین:۔ (طعن سے) تُو کس چیز سے مجھے اپنے پاس روکے گا؟

فلزمین:۔ (اپنی آغوش میں لیکر) اس طرح۔

سیلچین:۔ میں تلوّن جان گئی ہوں ——— اور اب ڈرپوک دوشیزہ نہیں رہی۔

فلزمین:۔ (فکرمندی سے) ہاں اب تو بدل گئی ہے۔ تیری آنکھیں خالی ہیں ——— تیرا چہرہ سفید پڑا ہوا ہے

سیلچین:۔ (طنزاً) لیکن تیرے پاس یہاں ہے ہی کیا جو تو مجھ روک رہیگا؟

فلزمین:۔ سورج۔

سیلچین:۔ مجھے جلانے کے لئے۔

فلزمین:۔ ہوا۔

(ہوا کی دھیمی دھیمی نالہ و زاری سنائی دیتی ہے)

سیلچین:۔ مجھے جمانے کے لئے۔

فلزمین:۔ سکوت۔

(ہوا کا شور و غل ختم ہو جاتا ہے۔)

سیلچین:۔ ہاں، اس میں تنہائی ہے۔

فلزمین:۔ پھول تیرے لئے رقص کرینگے۔

(پھول اپنی گھنٹیاں بجاتے ناچتے آتے ہیں اور پھر ایک ایک کرکے ناچنا بند کر دیتے ہیں۔ اُن پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں ———)

سیلچین:۔ دیکھو! یہاں ان تک کو نیند اور سستی آجاتی ہے۔

فلزمین:۔ بکریاں انہیں جگا دیں گی۔

(گڈریا اپنی چٹان پر بیٹھا اور بانسری بجاتا ہوا پھر نظر آتا ہے۔ چار برہنہ، صحرائی آنکھوں والے، خوب رُو کمسن لڑکے، جن کے پاؤں بکروں کے سے ہیں، سوتے ہوتے پھولوں کے کبھی اندر اور کبھی باہر رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھول بیدار ہو جاتے ہیں، اچھلتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہی یہ بکرے بھی اپنے اپنے پھولوں سے لپٹے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔ گڈریے نے بانسری بجانی بند کر دی ہے اور وہ اپنی چٹان پر بے حس و حرکت لیٹا ہوا ہے۔)

فلزمین:۔ مجھ سے محبت کر!

سیلچین:۔ تُو وحشی ہے!

فلزمین:۔ مجھ سے محبت کر!

سیلچین:۔ تُو اکھڑ ہے!

فلزمین:۔ ہاں میری زبان سہمیں نہیں۔ سُن! میری آواز یہ ہے! (خاموش پہاڑ پر ہاتھ پھیر کر) صبح کاذب سے لیکر ستارہ اوّلین کے جگمگانے تک مکمل خاموشی ہے (اپنے دل پر ہاتھ رکھکر) اور پرندے کے پر بھی ساکت ہو جائیں گے۔

سیلچین:۔ (اس کی آنکھوں کو چھو کر) تیری آنکھیں مہیب ہیں۔ ان آنکھوں میں مجھے جنگلی درندے چھپے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی ہیبتناک رہتی ہیں؟

فلزمین:۔ ہرگز نہیں ——— جب یہ تجھے دیکھیں اے میرے گُلِ رعنا۔

سیلچین:۔ (اس کے ہاتھ چھو کر) تیرے ہاتھ گلچینی کیلئے بہت سخت

ہیں ... اس کے پاس سے ہٹ کر ـــــ اُس چٹان کی طرف جہاں گڈریا بیٹھا ہوا ہے مڑتی ہے۔ دیکھو! بالکل جنبش نہیں! دن بھی تو پُرسکوت ہے لڑکے! لیکن گڈریا نہ حرکت کرتا ہے اور نہ جواب دیتا ہے، وہ آسمان کی نیلاہٹ میں کھویا ہوا ہے۔ (جوشیلی آواز میں) لڑکے! آہ! میری آواز کا وہ جواب نہیں دیگا۔ یہاں میری آواز کا جواب کوئی نہیں دیگا۔

فلزمین (پرجوش تمنا کے ساتھ) "میں" کوئی نہیں ہوں:

(شام کے دھندلکے میں منظر تاریک ہو جاتا ہے۔)

سیلیچن۔ دیکھو! ابند نے دن چرا لیا۔ رات ہو چکی ہے۔

(نیند کی زنانی دھندلی شکلیں تارِ عنکبوت میں ملبوس نمودار ہوتی ہیں اور اپنے ہاتھوں کو ہولے ہولے حرکت دیتے ہوئے گویا دائرہ کی صورت بناتے ہوئے ان اس کے گرد اگرد چکر لگاتی ہیں ـــ)

سیلیچن۔ کیا تم نیند ہو؟ میری محبت نیند! میری محبوب ـــــ آرام!

(مسکراتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ فلزمین کی طرف پھیلا دیتی ہے۔ وہ اس کے نیند میں جھومتے ہوئے جسم کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ پھر نیند کے دھندلکے میں دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے، سوائے چاند کی، جو یکایک چمک اٹھا ہے، ہلکی سی روشنی کے۔ گڈریا چٹان پر بانسری کے مدھم نغمہ کے ساتھ ساتھ گاتا ہے:۔)

اے میری چھوٹی سی بکری! جس پر چتیاں پڑی ہوئی ہیں۔
جس کی آنکھیں زرد ہیں اور جس کی خوشبو دل پسند ہے۔
خدا کرے چاند، ہوا اور سنہری سورج،
اور بے شمار تارے،
ہر روز تیرے لئے چراگاہ میں عمدہ گھاس پیدا کریں،
اور تیرا کودنا پھاندنا زیادہ ہو!
اور خدا کرے پہاڑی لومڑیاں تیرے پاس سے گذر جائیں،
اور تجھے ہوتا ہوا کبھی نہ پا سکیں۔
ذرا میری بانسری کو صاف اور شوخ تر تک گونجنے دے!
اور میں ذرا شیریں پانی تلاش کروں!
(خدا کرے) کوئی باز یا کوئی اور شکاری جانور،
تیرے قریب تک نہ آئے، میری ننھی سی بیٹی!
کاش یہ آتشیں چٹانیں دوپہر کے وقت محفوظ رکھیں،
تیرے نازک پاؤں کو پھسلنے سے!
سن میری اس التجا کو، پگھلتے چاند کے پیچھے ـــ
اے آفتاب عظیم! ـــــ اُچھلنے والے خدائے بز!

(ایک طویل نالے کے ساتھ گڈریا خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر چاند کے غائب ہوتے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح کاذب کی دھندلی روشنی میں سیلیچن سوئے ہوئے فلزمین کے پہلو سے بیدار ہو کر اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گڈریا جا چکا ہے لیکن چٹان کے نزدیک جبلِ بقر کا چرواہا اپنے فرغل میں لپٹا ہوا کھڑا ہے۔)

سیلیچن۔ سالہا سال تک میں سوتی رہی۔ میری روح بھوکی ہے۔

(پھر جبلِ بقر کے چرواہے کو وہاں کھڑا ہوا دیکھ کر)

میں اب تجھے جان گئی ہوں ـــــ اے حیاتِ ارض ـــ
ـــ تیری خوشبو کو، تیرے مناظر کو، تیری لذت کو، اور تیری
تمام موسیقی کو۔ میں تیرے پاس سے گذر کر جا چکی ہوں۔

(وہ چلی جاتی ہے)

فلزمین۔ (جاگ کر) تو کہاں چلی؟

سیلچن :۔ دُنیا کے کنارے پر۔

فلزمین (اُٹھکر اور اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے):۔ تُو مجھے نہیں چھوڑ سکتی!

(وہ مسکرا رہی ہے لیکن فلزمین اُس سے اس طرح کشمکش کرتا ہے گویا کسی سخت منجمد شے سے الجھ رہا ہو۔)

سیلچن :۔ اے دوست! اب وقت آچکا ہے۔

فلزمین :۔ تو کیا میرے بوسے وحشیانہ تھے؟ کیا میں تیرے لئے بار تھا؟۔

سیلچن :۔ مجھے! کا رنج نہیں ہے لیکن مجھے جانا ہی چاہیئے۔

(یکلخت جبلِ شراب کا نوجوان، جبلِ بقر کے بے حس و حرکت چرواہے کے سامنے کھڑا نظر آتا ہے اور اس کا ساز بجنا شروع ہوتا ہے۔)

فلزمین :۔ شہر کی منحوس موسیقی! تو کیا تو اسی (جبلِ شراب کے نوجوان) کے پاس واپس چلی جائے گی؟۔

سیلچن :۔ خوف نہ کھا! میں آگے ہی بڑھتی رہونگی۔

فلزمین :۔ مجھے پہاڑوں کی ہوا پر نہ چھوڑ! تیرے بغیر محبت مُردہ ہے اور میں مر جاؤں گا۔

سیلچن :۔ اے شکستہ دل! میں تو چلی!

فلزمین :۔ (چٹان کا سہارا لیکر) یہ سرد ہو چکی ہے۔

(چرواہے کی بانسری بجتے ہی جبلِ بقر اپنے ہاتھ سیلچن کی طرف بڑھاتا ہے۔ ساز بھی بجتا ہے اور جبلِ بقر بھی اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دیتا ہے۔ وہ ساکت کھڑی ہے۔)

سیلچن :۔ اے میرے رفیقو، مجھے چلا ہی جانا چاہیئے۔ کوئی دم میں پو پھٹ جائے گی۔

(جبلِ بقر اور جبلِ شراب خاموشی میں اپنے چہرے چھپا لیتے ہیں۔ صبح کاذب کا جنازہ نکلتا ہے۔ مکمل تاریکی پھیل جاتی ہے)

پانچواں منظر

(بہت دُور مدھم روشنی سے جبلِ عظیم کی برف آلود چوٹی چمک اُٹھتی ہے، اور پھر یہ روشنی تیز ہوکر سیلچن پر بھی پڑتی ہے۔ کوئی اور چوٹی نظر نہیں آتی، البتہ روشنی کے دونوں جانب جبلِ بقر اور جبلِ شراب اپنے سروں کو چھپائے سایوں کی مانند کھڑے ہوئے ہیں۔)

سیلچن :۔ جبلِ عظیم! میں آئی!۔

(جبلِ عظیم کی چوٹی ایک ایسی آواز میں جو دُور سے آرہی ہو مصروفِ تکلم ہوتی ہے۔ اس کی آواز روشنی کے ساتھ ساتھ صاف اور گرجدار ہوتی جاتی ہے۔)

اے شعلۂ آوارہ! اے بے چین تپش!
ہر شے کو خاکستر کرتی ہوئی، ہر کسی بات پر متاسف نہ ہونے والی!۔
تقدیر کی ہوائیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی ہیں ——
تیری پُرفیض زندگی کی کشتی کنارے آلگی،
اور تیری تمام پُرشوق جستجوئیں ختم ہو چکیں!
تو اب مسافر ہے ایسے سمندر کی جہاں مدّ و جزر کبھی نہیں ہوتا،
جہاں روشنی اور تاریکی، تلوّن اور سکون،
ایک ہیں —— آ! اے ننھی روح، گہوارۂ راز میں!

(سیلچن گھٹنے ٹیک کر اپنا سر زمین پر جھکا دیتی ہے۔ روشنی دھیمی ہو رہی ہے، یہاں تک کہ منظر بالکل تاریک ہو جاتا ہے۔)

چھٹا منظر

(تاریکی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے اور صبح کاذب کی دھندلی روشنی پہاڑی جھونپڑی میں سے چھنتی ہوئی آ رہی ہے۔ لینڈا اور فلزمین، سیلچن کے پاس جو دریچے والی جگہ پر سوئی ہوئی ہے، کھڑے اسے دیکھ رہے ہیں۔)

فلزمین (اسے جگاتے ہوئے) کوئی دم میں پو پھٹنے والی ہے۔

(وہ چونکتی ہے اور اس کے لب حرکت کرتے ہیں)

لینڈا۔ اسے سونے دو۔ یہ سو رہی ہے۔

(فلزمین چراغ اٹھاتا ہے اور اسکی روشنی سیلچن کے چہرے پر اچھی طرح پڑتی ہے۔ پھر دونوں آدمی آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلتے ہیں، اور جب وہ کچھ بولتی ہے، وہ دونوں جا چکتے ہیں۔)

سیلچن۔ (کھڑے ہوتے ہوئے اور اپنے ہاتھ وجد میں پھیلاتے ہوئے) آقائے عظیم! میں آتی ہوں! (جاگ کر وہ چاروں طرف دیکھتی ہے اور پاؤں کو کمبل سے چھڑاتی ہے) میرا خواب ــــــ کتنا مختصر!

(دروازے میں سے آسمان پر نور کے تڑکے کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بکریوں کی گھنٹیاں بجنے کی آواز آ رہی ہے۔)

پردہ گرتا ہے

مصنف ــــــــــــ جون گولزوردی
مترجم ــــــــــــ صادق الخیری

ایک خاتون سے

ہزاروں بار دہرایا گیا ہے لفظ "الفت" کا میں تیرے سامنے اس لفظ کو دہرا نہیں سکتا
محبت آج اک مذموم سی شے ہے زمانے میں مگر اس کی حقیقت کو زمانہ پا نہیں سکتا
مجھے تجھ سے محبت ہے، میں تجھکو پیار کرتا ہوں یہ وہ الفاظ ہیں جنکو زباں پر لا نہیں سکتا
مگر اس دل میں کچھ جذبات ہیں تو جن کی ملکہ ہے وہ کیا جذبات ہیں میرے تجھے سمجھا نہیں سکتا
مجھے وحشی بنا دیتی ہیں جب یادیں گزشتہ کی مرے دل کو سوا تیرے کوئی بہلا نہیں سکتا
تری باتوں میں آسودہ ہے اک جادو صداقت کا صداقت! جس کو دنیا میں کوئی جھٹلا نہیں سکتا
وہ تیری سادگی ہے جس نے میرے دل کو تڑپایا اداؤں سے مرے دل کو کوئی تڑپا نہیں سکتا
تری ہمدرد نظروں سے ملا ایسا سکوں مجھکو کہ میں ایسا سکوں مر کر بھی شاید پا نہیں سکتا
یہ دنیا آہ اسکی بھی اجازت دے نہیں سکتی، کہ میں اس چیز کو چاہوں جسے میں پا نہیں سکتا
کوئی ظالم مشیت روک لیتی ہے مجھے ورنہ میں تیرے واسطے کس چیز کو ٹھکرا نہیں سکتا
مگر میں زندگی بھر صرف تیرے گیت گاؤں گا
اور ایسے گیت جو دنیا میں کوئی گا نہیں سکتا

(جاں نثار اختر علیگ)

مجھے آج اک بیوفا یاد آیا

مجھے آج اک بے وفا یاد آیا — وہ چشمِ کرم کا اثر توبہ توبہ
مجھے یاد آئیں وہ پُرکیف راتیں — اسی نے مجھے آج یہ دن دکھایا
وہ ظالم ادائیں وہ بیدرد گھاتیں — مجھے آج اک بیوفا یاد آیا
وہ بازیٔ الفت کی دلچسپ باتیں — وہ مستانہ نظروں سے پیغامِ الفت
اسی یاد نے مجھکو پھر دل لایا — وہ شوخی، وہ عشوہ وہ پیہم شرارت
مجھے آج اک بیوفا یاد آیا — مجسّم عنایت سراپا محبّت
کبھی مُنہ چھپانا کبھی مُنہ دکھانا — غرض خُوب سا خوابِ الفت دکھایا
کبھی رونے لگنا کبھی مُسکرانا — مجھے آج اک بیوفا یاد آیا
کبھی بے حجابانہ آنکھیں لڑانا — مرے دل میں پھر درد سا ہو رہا ہے
مٹایا بنایا بنا یا مٹایا — تصوّر میں یہ آج کیا ہو رہا ہے
مجھے آج اک بیوفا یاد آیا — وہ بہزاد کیوں رُونما ہو رہا ہے
وہ زلفِ سیہ تا کمر توبہ توبہ — وہی تو ہے وہ جسنے مجھکو مٹایا
وہ اُلفت میں ڈوبی نظر توبہ توبہ — مجھے آج اک بیوفا یاد آیا

بہزاد لکھنوی

بسلسلۂ ما سبق نومبر ۱۹۳۴ء

دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی

جس طرح حضرات شعرا روایاتِ کہن کے دلدادہ ہوتے ہیں اُسی طرح اُن کا محبوب بھی ہر حال میں اپنی روایتی وضع کا پابند رہتا ہے۔ جیتے جی عاشق کو ستانا، جلانا، کڑھانا، حتیٰ کہ مار ڈالنا اور کبھی نہ ملنا اُس کے آئینِ محبت کی اہم دفعات ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد عاشق کی قبر پر جانا لازمی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، محبت کی کشش اگر زندگی میں اپنا اثر نہ دکھائے تو کیا مرنے کے بعد بھی محرومِ تاثیر رہ جائے اس لئے کہ بقولِ شاعر ؎

جذبۂ عشق اگر سچ ہے تو انشاء اللہ ⁂ کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے

جذبۂ عشق کی تاثیر برحق۔ جیتے جی نہ سہی، بعد از مرگ ہی سہی ایک بار "انہیں" آنا ضرور پڑے گا۔ کچھ ندامت کچھ حجاب، یکایک مزارِ عاشق پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی اس لئے وہ "شوخِ جفاجو" پہلے اپنے کوچہ کی صبا اور نسیم کو وہاں بھیجتا ہے کہ ذرا خبر تو لائے کہ قبر کے اندر عاشق صاحب کس حال میں ہیں۔ عاشق صاحب اپنے پُرانے تلخ تجربوں کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ہوا ابھی میری خاکِ مزار کو برباد کرنے آئی ہے۔ چنانچہ کبھی اپنے دل سے اور کبھی خود ہوا سے پوچھتے ہیں کہ:۔ ؎ (فانی)

خیر ہے کیا چاہتی ہے اے نسیمِ کوئے یار ⁂ اے ستم ظالم میری مٹی ہو چکی برباد بھی

آتی ہے صبا سوئے لحد اُن کی گلی سے ⁂ شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

آخر رفتہ رفتہ عاشق صاحب کی یہ بدگمانی دُور ہو جاتی ہے اور نسیم و صبا کو آمدِ محبوب کا پیش خیمہ تصور کر کے اُس کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اختلافِ طبائع ہر موقع پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہر شاعر کا محبوب ایک نئے انداز سے اپنے چاہنے والے کی قبر پر آتا ہے۔ حسرت صاحب کا محبوب اپنے گیسو آراستہ کر کے اُن کے مزار پر گیا تھا[1]۔ جگر صاحب کے معشوق نے اُن کی قبر پر روتے روتے اپنا بُرا حال کر لیا تھا[2]۔ فانی صاحب کے "خانہ برانداز" نے اور بھی اُپج کی لی۔ وہ برافگندہ نقاب آتا ہے ؎

قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہے ⁂ آفتابِ صبحِ محشر ہم رکاب آنے کو ہے

خدا جانے "اُس" کے آنے پر گورِ غریباں میں کیسا تہلکہ مچ گیا ہوگا۔ غالباً اسی لئے بعض مُلا کہتے ہیں کہ "قبرستان میں عورتوں کا جانا منع ہے۔ بے ادبی ہوتی ہے"! خیریت ہوئی کہ وقتِ سحر تھا اور ابھی تھوڑے ہی لوگ گھروں سے باہر آئے تھے۔

---

[1] فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ ⁂ پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو۔

[2] برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے ⁂ کیا اُٹھ کے کہدیا مری خاکِ مزار نے (جگر)

ورنہ اُسے "بے نقاب دیکھکر مُردوں پر تو خیر جو گذرتی، گذرتی، زندوں کا خدا جانے کیا حشر ہوتا" ؎

سحر ہوئی کہ وہ بادش بخیر آتا ہے ؛ چراغ ہیں مری تُربت کے جھلملائے ہوئے

قبرستان میں آنے کو تو وہ آیا مگر طبیعت میں جھجک باقی تھی اس لئے آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ فانی صاحب نے قبر کے اندر سے آواز دی ؎

چلے بھی آؤ یہ[1] ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ ؛ تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

پُرانا قبرستان تھا، قبریں شکست و ریخت کی حالت میں تھیں، پہچانی نہ جاتی تھیں۔ فانی صاحب کی قبر تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو چکی تھی۔ بی صاحبہ[2] گھونگٹ کے پٹ کھولے، سر جھکائے، فانی صاحب کی آواز کے سہارے آگے بڑھیں اور پھر ٹھٹک گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ فانی صاحب کی قبر کونسی ہے۔ خود فانی صاحب بھی صحیح نشان بتانے سے قاصر تھے۔ ناچار یہ صلاح دی کہ ؎

زمین گورِ غریباں پہ اِک جگہ نہ ٹھہر ؛ یہیں کہیں نگہ شرمسار ہم بھی ہیں

چنانچہ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر چل پھر کے اندازہ سے ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ دراصل یہی قبر فانی تھی۔ ہائے افسوس، جو آرزو زندگی میں پوری نہ ہوئی وہ مرنے کے بعد بر آئی مگر زندوں کی مصلحتیں مُردوں کی مصلحتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ قبر میں کچھ اس طرح جانچ تول کر تختے لگاتے ہیں اور پھر اس پر کچھ اس طرح مٹی لادتے ہیں کہ مُردہ لاکھ چاہے، قبر سے باہر نہ نکل سکے حضرتِ فانی بہت تڑپے، بہت تلملائے، بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ تختے سرکا کر گھڑی بھر کے لئے باہر نکل آئیں مگر کمبخت قبر کچھ ایسی استوار بنی تھی کہ ذرہ برابر جنبش نہ کی۔ ناچار نہایت دردناک آواز سے یہ شعر پڑھا ؎

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ارے توبہ ؛ کوئی مزار میں کوئی سر مزار رہے

جب اور کچھ بس نہ چلا تو حضراتِ شعرا کے اصول مسلمہ کے مطابق آپکی خاکِ تربت دامنِ محبوب سے لپٹ گئی ؎

بخشا جو شرف اُنکے اُڑتے ہوئے دامن نے ؛ اُٹھ اُٹھ کے بلائیں لیں خاک سر مدفن نے

محبوب نے جب دیکھا کہ یہ عجب دامنگیر مٹی ہے، چمٹی ہی جاتی ہے، تو اپنے دامن کو جھٹک کر صاف کرنے کا ارادہ کیا اور جیسے ہی اس نیت سے اپنے دامن پر نظر ڈالی، حضرتِ فانی کی خاک کا ذرہ ذرہ تھرا اُٹھا کہ ہائے اب یہ سعادت بھی چھن

---

[1] مطبوعہ متن میں اس جگہ "وہ" ہے۔ میں نے "یہ" بنا دیا۔ اس جزوی تصرف کے لئے حضرتِ فانی سے معذرت خواہ ہوں۔ (شادانی)

[2] مضمون کے دورانِ تحریر میں میرے ایک دوست "حکیم صاحب" تشریف لائے۔ اُنہوں نے لفظ "بی صاحبہ" پر اعتراض کیا اور کہا کہ "آپکو کیونکر معلوم ہوا کہ محبوبِ فانی ایک "بی صاحبہ" ہیں۔ ممکن ہے کوئی "امرد" ہو"۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں ممکن تو ضرور ہے مگر اس مصرع میں (قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہے) لفظ "نقاب" سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ غالباً "بی صاحبہ" ہونگی۔ بہت ممکن ہے کہ پروفیسر فراق بھی یہی اعتراض کریں۔ تو جواباً گذارش ہے کہ مضمون لکھتے وقت میرا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا اسلئے کہ ع۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ بہرحال اگر فراق صاحب اپنے ذاتی علم کی بنا پر میرے اس قیاس کو غلط سمجھتے ہیں تو میں بخوشی اسکے لئے تیار ہوں کہ وہ لفظ "بی صاحبہ" کاٹکر "صاحبزادہ صاحب" بنا دیں۔ (شادانی)

جائے گی ؎

کس نظر سے اُس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف　٭　کانپ اُٹھا ہر ذرّہ میری خاکِ دامنگیر کا

جس وقت بی صاحبہ گورستان سے پلٹنے لگیں تو حضرتِ فانی نے یہ آخری وصیت کی کہ "حضور! آخر ایک مرنے والے کا ماتم کب تک۔ بہت سوگ ہو چکا۔ اب اس خاکسار کو بھول جائیے اور دوسروں پر مشقِ تغافل فرمائیے۔ اس لئے کہ حضور کا اس طرح سوگوار رہنا تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ؎

وہ مشقِ خوئے تغافل پھر ایک بار رہے　٭　بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے

حضرتِ فانی نے گورستان کی یہ داستان بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ ہم نے بخوفِ طوالت یہاں اس کا خلاصہ درج کر دیا ہے جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو اور جزئیات امور سے آگاہی حاصل کرنا چاہیں وہ حضرتِ فانی کا دیوان ملاحظہ فرمائیں۔

سلسلۂ نزع و مرگ کی آخری کڑی روزِ جزا، حشر، محشر، اور قیامت ہے۔ معاد کا عقیدہ تو اکثر مذاہب میں پایا جاتا ہے لیکن قیامت کب آنے گی اس کی تعیین کسی نے نہیں کی۔ زیادہ سے زیادہ قربِ قیامت کے کچھ آثار بتا دئے گئے ہیں مگر وہ ایسی مبہم باتیں ہیں کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے شعرا، خصوصاً چوٹی کے غزلگو جس درجہ حساس واقع ہوئے ہیں وہ ظاہر ہے بھلا اُن سے اس غیر معین حالت کی برداشت کہاں ممکن تھی، اور وہ کب تک انتظار کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ایک خیالی دُنیا بنائی اور اُس دُنیا میں پہونچنے کے لئے فرضی طور پر یا تو جلاد محبوب کی چھُری سے ہلاک ہوئے یا پھر اُس کے جور و ستم کے باعث ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دی۔ پھر قیامت قائم کی۔ حشر و نشر کے سامان ہوئے۔ خدائی دربار سجایا اور داورِ محشر کے سامنے فریاد لے کر پہونچے۔ چونکہ یہ حضرات شاعر ہونے کی حیثیت سے گویا ایک ہی اُمت کے افراد ہیں۔ اسلئے حشر میں سبکو تقریباً ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں، چونکہ اس سلسلہ میں حسرت و جگر وغیرہ کے جو اشعار ہم پیش کر چکے ہیں وہ اثباتِ دعویٰ کے لئے بالکل کافی ہیں۔ لیکن اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو حضرتِ فانی آنجہانی کے اشعار سے مل جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک بات نہایت دلچسپ اور قابلِ غور ہے وہ یہ کہ غالباً ان بزرگوں نے کسی ایسی وجہ سے جو خود انکے سوا کسی دوسرے کو معلوم نہیں، یہ عہد کیا ہے کہ جو کچھ بیان کریں اس میں تناقض و تضاد ضرور ہو۔ چنانچہ حضرتِ فانی حشر میں پہونچکر کبھی تو پیکرِ مجسمۂ محبت، گلہ جور و جفا کے بجائے سراپا شکر و امتنان بن جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

روزِ جزا گلہ تو کیا، شکرِ ستم ہی بن پڑا　٭　ہائے کہ دل کے درد نے، درد کو دل بنا دیا

اور کبھی شکووں کے دفتر کھول دیتے ہیں اور ایسی دھواں دھار تقریر فرماتے ہیں کہ بیچارہ محبوب بغلیں جھانکنے لگتا ہے اور خاموشی کے سوا اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا ؎

وہ مری شکایت پر چُپ کھڑے ہیں محشر میں　٭　بُت اُنہیں بنا پایا اب خدا خدا کر کے

اس شعر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ معنوی اعتبار سے دیکھئے تو سبحان اللہ، اور لفظوں پر غور کیجئے تو ماشاءاللہ۔ ہت انہیں بنا یا یا ابر خدا خدا کرے۔ واہ کیا بات کہی ہے۔ رعایتِ لفظی کیا کہنا۔ میاں امانت زندہ ہوتے اس شعر کو سنکر پنی ساری "ضلع جگت" بھول جاتے۔

دوسرے شعرا کی طرح حضرت فانی بھی جب اپنے محبوب سے ملاقات یا "اس بات" کے طالب ہوتے ہیں تو وہ عیار رفع الوقتی کے لئے اُن سے روزِ حشر کا وعدہ کرلیتا ہے۔ ان کی سادہ دلی دیکھو کہ اس عہد کو سچا جان کر، اس کے ایفا کی امیدیں خوشی خوشی جان دے کر حشر میں جا پہونچتے ہیں۔ وہ ہزار جھوٹوں کا جھوٹا جب دیکھتا ہے کہ یہ نامراد تو پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ گیا اور حشر میں بھی آ پہونچا تو صاف مکر جاتا ہے کہ میں نے تم سے کسدن وفا کا وعدہ کیا تھا ؎

محشر میں بھی وہ عہدِ وفا سے مکر گئے ٭ جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

یہ جواب سنکر حضرت فانی کو جیسی کچھ مایوسی ہوئی ہوگی ظاہر ہے۔ اس دردناک سانحہ میں ہماری دلی ہمدردیاں اُنکے ساتھ ہیں۔ ہمارا بس ہوتا تو اس دغاباز کو اس عہد شکنی کی پاداش میں غلام بناکر حضرتِ فانی کو بخشدیتے۔

حشر کے دن پیش آنے والے گوناگوں واقعات کے بیان میں ہمارے چوٹی کے غزلگو شعرا نے خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ فانی صاحب کے یہ دو شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں ؎

وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چپ کی داد ٭ یہ حشر ہے یہاں تو کھلے گی زبانِ داغ

محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خونبہا بھی ہے ٭ وہ اِک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے

بخوفِ طوالت ہم اس موضوع پر رسمی شاعری کے ان ہی چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں اور جنابِ فراق سے نہایت مودبانہ گذارش ہے کہ اس قسم کے لایعنی کلام کی حمایت کرکے اپنے ذوق کو رسوا اور نوخیز شعرا کو گمراہ نہ کریں۔

"زاہد، واعظ، محتسب، ناصح"

رسم و تقلید کی بنا پر جس طرح ہمارے شعرا اپنے آپ کو رندِ سیہ مست، مریدِ پیرِ مغاں، پرستارِ ساقی اور بے نیازِ طاعت و زہد بناکر پیش کرتے ہیں اسی طرح اُن کے آئین شاعری میں یہ بھی فرض ہے کہ زاہد، واعظ، اور شیخ کی ہجو کریں، ان پر پھبتیاں کسیں، اُن کی پگڑیاں اُچھالیں[1]۔ انہیں میخواری کی دعوت اور ترغیب دیں بلکہ موقع ملے تو پچھاڑ کر پلا دیں۔ انہیں محفلِ ساقی اور بزمِ حسن میں بلائیں اور شراب و حسن کی بے پناہ قوتوں سے مغلوب نہ ہونے کا چیلنج دیں۔ جن اشعار میں اس قسم کے مضامین بیان کئے گئے ہیں اُن کے مطالعہ کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضراتِ شعرا کو زاہد و واعظ وغیرہ سے اسقدر کد کیوں ہے اور اُن کے درمیان وجہِ مخالفت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ

[1] لے گیا ہے کوئی پگڑی جو اُڑا کر حسرت ٭ مجھ گنہگار پہ ہے شب سے گمانِ واعظ۔

ہمارے شعرائے بربنائے تقلید چونکہ رندانِ سیہ مست کا سوانگ بھرا ہے اس لئے ہر ایسے گروہ کی مخالفت انپر واجب ہے جو مذہب و دینداری سے کوئی علاقہ رکھتا ہو۔ رندی کا فرض جبھی ادا ہوگا جب مستوری کی دھجیاں اُڑائی جائیں

زاہد و واعظ کے گناہوں کی ایک طویل فہرست ہر رسم پرست غزلگو کے دیوان میں آپکو مل جائیگی۔ ہم یہاں صرف اُن چند "کبائر" کا ذکر کرینگے جو حضرات شعرا کے بیان کے مطابق زاہد و واعظ کے لئے لازم و ملزوم قرار دئے گئے ہیں۔

زاہد و واعظ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ عبادت و ریاضت میں اپنا وقت گنواتا ہے۔ منہیات شرعیہ سے لوگوں کو روکتا ہے۔ جنّت کا طالب ہے۔ کوثر و تسنیم کے آب گوارا سے اپنی تشنگی بجھانے کا آرزومند ہے۔ حورانِ بہشتی سے اپنے چشم و لب و آغوش کے لئے سرمایۂ کیف و سکون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں شاعر صاحب ایک رندِ دُردآشام اور دین و مذہب کی تمام قیود سے آزاد ہوتے ہوئے بھی خاصانِ خُدا میں سے ہیں۔ ان کا سینہ اسرارِ معرفت کا گنجینہ اور اُن کا دل انوارِ حقیقت سے رشکِ طورِ سینا ہے۔ وہ گمرہوں کی ہدایت اور زاہد و واعظ پر شدّت سے نکتہ چینی کرنے کے لئے گویا من اللہ مامور ہیں۔ تعصب کے پردے اگر آنکھوں پر پڑے ہوئے نہ ہوں تو ہر شخص کو صاف نظر آجائے کہ ان خود ساختہ ریفارمروں یعنی ہمارے شاعروں نے جن میں اکثر ہماری آپکی طرح اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں، رندی کا سوانگ بھر کر اپنے اشعار میں زاہد و واعظ اور شیخ و محتسب پر جو لے دے کی ہے وہ محض نقالی اور رسم پرستی ہے۔

جب کبھی اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم تھی محتسب بھی تھے، مگر آج اُن کا وجود کہاں۔ چند تعلیم یافتہ حضرات کے سوا عام طور پر تو لوگ "محتسب" کے معنی سے بھی ناآشنا ہیں، لیکن فراقؔ صاحب کے "بادشاہِ متغزلین" یعنی مولانا حسرتؔ موہانی آج بھی محتسب سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ شراب کی حلّت و حرمت کے بارے میں اس سے مباحثے کرتے ہیں اور آخر اُسے لاجواب کرکے چھوڑتے ہیں۔ نہ صرف اسقدر بلکہ دلیل قطعی کے طور پر ایک ایسا الزامی جواب دیتے ہیں کہ "محتسب" کے پاس دم بخود رہجانے کے سوا چارہ نہیں ؎

ترکِ مے کے معاملے میں فضول ۔ محتسب ہم سے گفتگو نہ کرے
میکشوں سے نہ محتسب کی چلی ۔ آخرکار لاجواب اُٹھا
اسقدر تاکید کیوں ترکِ مے و ساغر میں ہے ۔ محتسب خود بھی تو فکرِ جنّت و کوثر میں ہے

اپنی خیالی دُنیا میں جگرؔ صاحب کو بھی ایک مرتبہ محتسب سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ انھوں نے ہزار منّت کی مگر اس کمبخت نے شراب پھینک ہی دی ؎

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک ۔ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

ہاں تو جیسا ہم ابھی بیان کر چکے ہیں زاہد و واعظ کا سب سے بڑا گناہ جنّت اور اس کے لوازم کی آرزو ہے۔ اور یہ ایک ایسا جُرم ہے جو کسی طرح معاف نہیں ہوسکتا چنانچہ حسرتؔ صاحب بہانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ؎

حشر میں بھی نہ ہوگا اے واعظ ۔ گنہ آرزوئے حور معاف

اور یہ خواہشِ جنّت وہ بُری بلا ہے کہ اس کی بنا پر زاہد نورِ معرفت سے محروم ہوجاتا ہے۔ اگر کسی کو نورِ معرفت کی

تلاش ہو تو وہ شاعر صاحب کے قلبِ سیاہ میں ڈھونڈھے اسلئے کہ نورِ معرفت رندوں ہی کے حصے میں آیا ہے اور اسی لئے وہ مخلوق کے ارشاد و ہدایت کے اہم منصب پر مامور کئے گئے ہیں ؎

نورِ عرفاں کی عبث ہے دلِ زاہد میں تلاش ؛ اور یاں خاک نہیں خواہشِ جنت کے سوا
جلوۂ حق سے ہیں بیخبر زاہد ؛ محوِ تسنیم و سلسبیل ہیں سب

واعظو! مُرشدِ کامل کی تمہیں ہو جو تلاش ؛ بزمِ رنداں میں کبھی اِک روز ذرا جا دیکھو

"بادشاہِ متغزلین" نے جنابِ شیخ کو ہجو شراب سے باز رکھنے کیلئے ایک نہایت معقول" بات کہی ہے ؎

طالبِ کوثر و تسنیم جو ہوں حضرتِ شیخ ؛ خواہشِ بادہ کی توہین گوارا نہ کریں

ہمارے "مشایخ" یعنی شعرا نے رندی کا جامہ پہن کر زاہد، واعظ، اور شیخ پر ہزار گونہ برتری حاصل کرلی ہے" اور بات بات پران بیچاروں کو لتاڑتے اور شرمندہ کرتے ہیں۔ جگر صاحب فرماتے ہیں ؎

فکر ہے زاہد کو حور و کوثر و تسنیم کی ؛ اور ہم جنت سمجھتے ہیں ترے دیدار کو

ظاہر ہے کہ "طالبِ مولیٰ" کے مقابلہ میں طالبِ جنت کا مرتبہ بہت پست ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا سچ مچ آپ "عشقِ حقیقی" کے چکّر میں پڑ گئے ہیں۔ یہ دعویٰ اگر حقیقت پر مبنی ہے تو اُس کا پیش کرنا انتہائے کم ظرفی ہے بلکہ کھُلی ہوئی دلیل ہے اس امر کی کہ یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اصلیت سے اِسے کوئی سروکار نہیں۔ اور اگر آپ کا مقصود "محبوبِ مجازی" ہے جس کے دیدار کو آپ جنت سمجھتے ہیں تو پھر اس میں زاہد بیچارے پر طعن و تعریض کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا اپنا مذاق اور اپنی اپنی پسند ہے۔

حضرتِ فانیؔ نے چونکہ رندی و ہوسناکی اور بادہ و ساغر سے چنداں سروکار نہیں رکھا اسی لئے زاہد و واعظ اور شیخ و مُحتسب سے بھی زیادہ نہیں اُلجھے۔ تاہم کہیں کہیں اپنی ظاہری "معصیت" — جسے وہ اپنے زعم میں معنوی عصمت سے کم نہیں سمجھتے — کا ذکر بڑی شان سے کرتے ہیں ؎

ذکرِ خورشیدِ قیامت سُن کے واعظ کیا کہوں ؛ خیر اس تر دامنی کو روزِ محشر دیکھنا

حضرتِ اصغرؔ ارشاد فرماتے ہیں ؎

حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے ؛ سو راہِ طریقت کھُلی[1] اِک لغزشِ پا سے

رندانِ سیہ مست کی لغزشِ پا سے "طریقت" کی سو راہیں کیا ہزار راہیں کھُل سکتی ہیں مگر "طریقت" کے مسلمہ معنی میں کچھ تغیّر کرنا پڑے گا۔ زاہد بیچارہ کیا جانے کہ رندی و کرامت لازم و ملزوم ہیں۔ یہ اسرار و رموز تو ہمارے شعرائے

---

[1] سو راہِ طریقت کھُلی "صد راہِ طریقت کشود" کا لفظی ترجمہ ہے مگر اُردو زبان کے قاعدہ کے مطابق فاعل اگر بصیغۂ جمع ہو تو فعل بھی اُسکی مطابقت میں بصورتِ جمع ہی آنا چاہیئے۔ اس لئے "کھُلی" جو صیغۂ واحد ہے اس محل پر قطعاً غلط ہے۔ فارسی میں اگر فاعل، اسمِ بے جان ہو تو جمع ہونیکے باوجود بھی اس کا فعل صیغۂ واحد ہی میں ہوگا۔ لیکن اُردو میں ایسا نہیں۔ (شادانی)

بلا نوش ہی کو معلوم ہیں۔

حسرت ؎ جم چکا ہم پہ حال وقال کا رنگ ؛ شیخ بیکار ہائے وہو نہ کرے

ظاہر ہے کہ جو شخص حال وقال کے تمام مدارج طے کر کے عرفانِ رندانہ کی انتہائی منزلوں تک پہونچ گیا ہو اُس پر شیخ بیچارے کی ہائے وہو کا کیا رنگ جم سکتا ہے۔

اصغر ؎ ابھی اک موج سے اٹھی تھی میخانہ میں اے واعظ ؛ ابھی اک برق چمکی تھی مری وادیِ ایمن میں

واعظ بیچارہ تو صرف حضرتِ موسیٰ والی وادیِ ایمن کو جانتا ہے، اُسے کیا خبر کہ میخانہ بھی وادیِ ایمن اور موجِ شراب برقِ تجلی ہو سکتی ہے۔

جگر ؎ کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ ؛ میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

واعظ کی کتاب کیا ہوگی؟ قرآن مجید۔ یا کوئی دوسرا صحیفہ مذہبی۔ ظاہر ہے کہ جگر صاحب کے جام شراب میں جو تجلیاں کوندتی ہوئی نظر آئیں گی وہ اِن "پرانی" کتابوں میں کہاں۔ بیچارہ واعظ کس برتے پر اپنی "کتاب" کا جام شراب سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور اگر کریگا تو مُنہ کی کھائیگا۔

جگر ؎ نہ پوچھی بات بھی اس شوخ کی کافر نگاہوں نے ؛ سے بیٹھا رہا زاہد متاعِ دین وایماں کو

یہ زاہد کی انتہائی حماقت تھی جو متاعِ دین وایمان کو اس اُمید پر لئے بیٹھا رہا کہ اُس شوخ کی کافر نگاہیں" ملتفت ہونگی اسلئے کہ متاعِ دین وایمان ہے ہی کیا بلا جو کوئی اس کی طرف اعتنا کرے۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ شوخ کافر نگاہ تھا۔ کون؟ شاید خُدا؟ مگر نہیں۔ اسلئے کہ خدا کے نزدیک اگر دین وایمان ایسی ہی بیقدر چیز ہوتے تو اتنے پیغمبر بھیجکر اتنے مذاہب کی تبلیغ کاہے کو کراتا۔ کیوں نہ اُسی شے کو لوگوں میں رواج دیتا جو اُس کی "کافر نگاہوں" کو محبوب ہوتی۔

اصغر ؎ زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا ؛ رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

حضرت اصغر کا موضوعِ سخن چونکہ "حقیقت" ہے اسلئے اُن کے اشعار کو "مجازی" معنی پہنانا ان کے ساتھ حد درجہ ناانصافی کرنا ہے۔ رہ گئے "حقیقی" معنی تو اس کا سمجھنا زاہد کے بس کی بات نہیں۔ اسلئے کہ استعارات کا حجاب اُٹھا لینے کے بعد بھی معنی پر تاریکی کے پردے پڑے ہی رہتے ہیں۔ "اصطلاحاتِ صوفیہ" میں "رخ" کے معنی "تجلیات" اور "زلف" کے معنی "موجودات" "وتعینات" کے لکھے ہیں۔ زلف کا رُخ پر بکھرنا گویا ذاتِ احدیت پر تعینات کے حجابوں کا حائل ہو جانا ہے اور یہی اصغر صاحب کا "حاصلِ ایمان" ہے۔ اس چیستان کا سمجھنا زاہد تو کیا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

اِن بزرگوں کا ایک دلچسپ مفروضہ یہ بھی ہے کہ واعظین جو لوگوں کو ارتکابِ مناہی سے روکتے اور پاداشِ گناہ سے ڈراتے ہیں تو گویا وہ رحمتِ ایزدی کے منکر ہیں اسلئے کہ رحمت تو بہرحال گنہگار ہی پر نازل ہوگی۔ انسان اگر مرتکبِ عصیان نہ ہو تو خُدا کو اپنی رحمت کے صرف کرنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔ اس طرح ارتکابِ معصیت گویا خدا پر ایک طرح کا احسان ہے۔ حقیقتاً یہ ایک زبردست مغالطہ ہے اور انتہائے تنگ نظری کی دلیل ہے۔ دراصل ہمارے شعرا کا منشا کسی حقیقت کا بے نقاب کرنا یا کسی واقعہ نفس الامری کو پیش کرنا ہرگز نہیں ہوتا۔ نہ وہ کبھی ایسی گہری باتوں پر غور و فکر

کرنے میں اپنا وقتِ عزیز ضائع" کرتے ہیں۔ وہ تو صرف وہی کہتے ہیں جو اُن کے پیشرو کہہ گئے ہیں۔ اس سے انہیں بحث نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ کوئی دانش و حکمت کی بات ہے یا محض لایعنی خرافات۔ وہ اس مسئلہ میں "نقل راجح عقل" کے اصول پر کاربند ہیں اور بس۔ کاش وہ اتنا سوچتے کہ واعظ جو کام کر رہا ہے وہ خود اُس کی ایجاد نہیں۔ یہی کام تمام ادیانِ و مذاہب کے بانیوں نے بھی کیا ہے اور واعظوں سے ہزار درجہ زیادہ سرگرمی کے ساتھ کیا ہے۔ تو کیا وہ سب کے سب رحمتِ ایزدی کے منکر تھے؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ انسان کو اگر معصیت سے روکا جائیگا تو رحمتِ خداوندی معطل ہو کر رہ جائے گی۔ یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ اگر انسان کو ارتکابِ گناہ پر ٹوکا جائے تو وہ گناہ نہ کرے گا۔ انسان بہرحال انسان ہے فرشتہ نہیں۔ از روئے خلقت معصوم نہیں۔ خطا اس کی فطرت ہے۔ اُسے عذاب سے ڈراؤ یا بہشت کا لالچ دو، معصیت سے باز رکھنے کی جو تدبیر بھی ممکن ہو عمل میں لاؤ مگر وہ گناہ کریگا اور ضرور کریگا۔ پھر رحمتِ الٰہی کے معطل ہو جانے کا اندیشہ کیسا۔ بات صرف اتنی ہے کہ "رندوں" کو اپنی سیاہ کاریوں پر ملامتِ خلق سے بچنے کے لئے کسی پناہ کی ضرورت تھی اسلیئے جوازِ معصیت کی یہ "معقول" دلیل پیدا کی گئی۔ مگر اس کے موجد ہمارے شعرا نہیں۔ یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ ہمارے شعرا نے تو اپنے شاعرانہ اصول کے مطابق محض تقلید بلکہ نقالی پر اکتفا کی ہے۔ دیکھئے حضرتِ اصغر اس میدان میں کس شان سے وارد ہوئے ہیں ؎

کیا کرے زاہد بیچارہ اُسے کیا معلوم ؛ رحم کرتا ہے باندازۂ عصیاں کوئی

حضرتِ اصغر کے مریدِ خاص جنابِ جگر بھی اپنے مرشد کے قدم بقدم چلے ہیں ؎

مجھکو مرے عصیاں سے کیا خاک ڈرائے گا ؛ زاہد وہی زاہد جو رحمت سے گریزاں ہے

زاہد کیلئے "خشک" ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ عشق کی رنگینیوں سے محروم ہے اسلیئے وہ کبھی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

حسرت ؎ پیروِ عشق رہنما نہ ہوا ؛ زاہدِ خشک باخدا نہ ہوا

جگر ؎ کعبۂ دل کی حقیقت سے تو واقف ہی نہیں ؛ باندھکر شیخ کہاں جامۂ احرام چلے

اصغر ؎ نہ ہوگا ہستیِ بے مدعا کا رازداں برسوں ؛ وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

"ہستیِ بے مدعا"، ماشاءاللہ کتنی گہری بات کہی ہے۔ حکمت و فلسفہ سب اسکے آگے چیں بول جائے۔ دانایانِ روزگار جنہیں حضرتِ اصغر کے کلام کی روشنی میں عقل و دانش سے یکسر بے بہرہ سمجھنا چاہیئے۔ آج تک اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی ہستی کا ایک مقصد و منشا ہے اور وہ مقصد و منشا بہت عالی ہے۔ "بے مدعا" صرف وہ ہستی ہو سکتی ہے جس کا وجود محض بیکار ہو۔ سو ایسی ہستی ایک انسان کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مگر حضرتِ اصغر چونکہ سطحِ انسانی سے الگ ہو کر شعر کہتے ہیں اس لئے اُن کے بیان کئے ہوئے "نکات" کا سمجھنا ایک انسان کے بس کی بات نہیں۔ اور زاہد بیچارہ بھی چونکہ آدمی ہی ہے اسلیئے حضرتِ اصغر نے واقعی بجا فرمایا کہ وہ ہستیِ بے مدعا کا رازداں نہیں ہو سکتا مگر مصرعِ اولیٰ میں ردیف (برسوں) سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ شاید دس پانچ برس حضرتِ اصغر سے درسِ معرفت لینے کے بعد اس سمجھ میں نہ آنے والے معمہ کو سمجھ جائیگا۔

حضرات شعرا اپنی عالی ظرفی کی بنا پر بیچارے زاہد و واعظ پر ترس کھا کر اُسے بھی میخواری کی دعوت دیتے ہیں کہ زاہد بیچارہ محفل رنداں میں آتا ہے اور "سینۂ مینا" میں "برقِ سینا" کو تڑپتے دیکھکر اُس کے ہوش جاتے رہتے ہیں۔ وہ ہچکچاتا ہے۔ رندانِ مے آشام طرح طرح سے اس کی ہمت بندھاتے ہیں مگر وہ کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ حیلے حوالے کرتا ہے۔ مگر کون سنتا ہے۔ آخر زبردستی اُسے پلائی جاتی ہے اور جب اُس کے منہ کو مزہ لگ جاتا ہے تو ہزار جان سے اس انگور کی بیٹی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی "ظاہری مصالح" کی بنا پر اس کی ہجو کرتا ہے۔ مگر پیتا ہے اور دھوم سے پیتا ہے یہاں تک کہ میخانے کی کنجی ہر وقت اپنی دستار میں لٹکائے پھرتا ہے کہ جب جی چاہے میخانہ کا تالا کھولے اور دو چار جام چڑھالے۔ یہ داستان رنگین ہمارے شعرائے رسم پرست نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی۔ یہاں اُس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

دعوت و ترغیب۔ ؎

حسرت ؎ واعظو منہ میں تمہارے بھی بھر آئے پانی ؛ مے رنگین کا جو ساغر سے چھلکنا دیکھو

جگر ؎ بزمِ ساقی میں ذرا دیکھ تو چل کر زاہد ؛ کیا بہاریں ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

حسرت ؎ بزمِ ساقی میں چلیں بھی تو کہیں حضرتِ شیخ ؛ شرط ہم کرتے ہیں رہ جائے جو ایمان کا ہوش

حضرتِ زاہد کے میخانہ میں پہونچنے کے بعد ؎

جگر ؎ دم بخود ہیں حضرتِ زاہد یہیں تک دیکھکر ؛ ہوش اُڑ جاتے اگر شیشہ سے باہر دیکھتے

اصغر ؎ میخانے کی یہ صحبت اے شیخ غنیمت ہے ؛ لے کچھ لبِ ساغر سے، کچھ سینۂ مینا سے

جگر ؎ پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا ؛ بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے

حسرت ؎ نہ کر بزمِ ساقی میں انکار واعظ ؛ بگڑ جائینگے رندِ میخوار واعظ

جگر ؎ یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا ارے زاہد ؛ یہ میکدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے

میخانے کا آخری سین۔

حسرت ؎ رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی ؛ واعظ کے نہ چل سکے بہانے

دوسرا دور۔

حسرت ؎ شوق ہو دل میں لب پہ ہجو شراب ؛ ہم پہ روشن ہیں سب جناب کے رنگ

جگر ؎ کھل گیا آج مجھے دیکھ کے بیخود دمِ کیف ؛ زاہد خشک کو سمجھا تھا میں نا محرمِ کیف

حسرت ؎ ہے کلیدِ درِ میخانہ مقرر اے شیخ ؛ وہ جو پنہاں ہے ترے گوشۂ دستار کے پاس

جگر ؎ ہوگیا کیا مریدِ مے زاہد ؛ اب تو چہرہ پہ نور رہتا ہے

غرض جس طرح کبوتر اور بلی میں قدرتی دشمنی ہے[1] اسی طرح ہمارے شاعر اور زاہد میں بیر ہے۔ اور لطف یہ کہ نہ وہ

---

[1] سخت حیرت ہو کہ بنگال میں اکم سے کم ڈھاکہ میں، بلیاں خانگی پرندوں مثلاً کبوتر، مرغی، مینا وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کرتیں (رشادانی)

خود رند ہے نہ اُسے محتسب اور زاہد و واعظ سے کوئی سروکار مگر رسمی شاعری کے طفیل اُسے یہ سوانگ بھرنا پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے چوٹی کے غزلگو شعرا کے چند شعر اور سُن لیجئے اور ان کی "صنّاعانہ" تعالی کی داد دے لیجئے۔

جگر ؎ عرض کرتے تجھکو زاہد، تیری دُنیا کو خراب ؛ کم سے کم اِتنی تو ہر میکش کے پیمانے میں ہے

اصغر ؎ زاہد سادہ لوح کو وہم تھا اشتباہ کا ؛ مصحفِ رُخ سے حل ہوا مسئلۂ جوازِ عشق

حسرت ؎ لیگیا ہے کوئی پگڑی جو اُڑا کر حسرت ؛ مجھ گنہگار پہ ہے شبہ گمانِ واعظ

جگر ؎ اِک بزمِ ناز میں چل زاہد تجھے دکھا دوں ؛ مینا بدوش آنکھیں، ساغر بکف نگاہیں

اصغر ؎ بنائے عشق کو سمجھا ہی کیا اے اعظ ناداں ؛ ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

افسوس ہے کہ حضرت اصغر کی زندگی میں کسی نے اس شعر کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ ہندوستان کے حاجیوں کو بڑی سہولت رہتی۔ حضرتِ اصغر کے بنائے ہوئے کعبوں ہی سے کام چل جایا کرتا۔ مکہ معظمہ جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ نہ کچھ خرچ ہوتا نہ صعوباتِ سفر سے دوچار ہونا پڑتا۔ مگر اب کون بتائے کہ حضرتِ اصغر کے وہ خانہ ساز کعبے کہاں کہاں واقع ہیں۔ شاید فراق صاحب رہنمائی کر سکیں۔

حسرت ؎ فصلِ گل میں پڑیں تو خوب کھلیں ؛ خرقۂ زہد پر شراب کے رنگ

جگر ؎ زاہد مسجد نشیں ہیں اور اک ٹوٹا ساظرف ؛ میکدہ میں اہتمامِ جام و ساغر دیکھئے

ہمارے شعرانے زاہد، واعظ، محتسب اور شیخ کی جو دُرگت بنائی ہے وہ تو آپ نے دیکھ لی۔ اب حضرتِ ناصح باقی ہیں۔ بر بنائے رسمِ زمانہ شاعر صاحب چونکہ عاشق بھی ضرور ہوتے ہیں اس لئے ان کو سمجھانے، بہلانے اور مشورہ دینے کے لئے ایک ناصح کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا جس طرح روشنی میں ہر مادی جسم کا سایہ لازمی ہے اسی طرح عالمِ عاشقی میں شاعر صاحب کے لئے ناصح کا وجود ناگزیر ہے۔ ناصح جہاں ہمدرد اور دلسوز ہوتا ہے وہاں اس کا نادان ہونا بھی ضروری ہے اور ناصح کے اِن صفات کے متعلق تمام شعرائے مجتہدین و مقلدین متفق الرائے ہیں مگر ہمارا موضوعِ بحث چونکہ شعرائے مقلدین ہیں اسلئے ہم صرف اُنہیں کے کلام سے چند مثالیں اپنے بیان کی تائید میں پیش کریں گے۔

فانی ؎ چارہ گر، ناصحِ مشفق، دل بے صبر و قرار ؛ جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

جگر ؎ ہر قدم پر ناصحِ مشفق کی دلسوزی نہ پوچھ ؛ آدمی اچھا ہے لیکن اِک ذرا دیوانہ ہے

اصغر ؎ ناصحِ مشفق مگر یونہی تڑپنے دے مجھے ؛ مجھکو بھی معلوم ہے سود و زیانِ اضطراب

جگر ؎ جا بھی اے ناصح کہاں کا سود اور کیسا زیاں ؛ عشق نے سمجھا دیا ہے عشق کا حاصل مجھے

اصغر ؎ مری وحشت پہ بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح ؛ بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

یہ ہیں ہمارے چوٹی کے غزلگویوں کی جدّت طرازیاں۔ یہ ہے اُن کا انفرادی رنگ۔ اسی کی بنا پر فراق صاحب کا دعویٰ ہو

کہ "اُردو غزل گوئی لکھنؤ اور دلّی کی تاریک گلیوں سے نکل کر........ نئی آوازوں سے نغمہ سرا ہوتی ہے"! ہمیں یقین ہے کہ اگر جناب فراق غزل گوئی کی حمایت میں اپنا مقالہ سپردِ قلم کرنے سے پیشتر اصغر، جگر، فانی اور حسرت کے دیوانوں کا مطالعہ کر لیتے تو انہیں اپنی اکثر رایوں کی غلطی اور اپنے بیشتر دعووں کی بے اساسی کا علم ہوجاتا اور جو ناواقف لوگ اُن کا مقالہ پڑھکر غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں اُن کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری بھی موصوف پر عاید نہ ہوتی۔

جفائے محبوب

مضامین فرسودہ کی پانچویں سُرخی "جفائے محبوب" ہے "پیکان و تیر، خنجر و شمشیر اور قتل و خون" کے سلسلہ میں اس موضوع پر کافی بحث ہوچکی ہے لیکن یہ عنوان خصوصیت کے ساتھ اس لئے علیحدہ قائم کیا گیا ہے کہ "بادشاہِ متغزلین" نے اس موضوع پر بہت کچھ زورِ طبع صرف کیا ہے اور دل کھول کر نقّالی اور رسم پرستی کی داد دی ہے۔ اُن کے دوسرے معاصرین یعنی اصغر، جگر اور فانی اس میدان میں اُن سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جنوری ۱۹۳۷ء کے ساقی میں میں نے اپنے مضمون "ایران کی امرد پرستی کا اثر اُردو شاعری پر" میں ایرانی شاعر کے معشوق کی بیوفائی اور ستمرانی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس محل پر اُن کا دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ہمارے شعرا کی "نقالی" پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

"ہر ایرانی شاعر کے محبوب کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بے انتہا ظالم اور بے وفا ہے۔ اس کی تمام عنایتیں رقیبوں کے لئے وقف ہیں۔ عاشق اُس کے لُطف و کرم سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ اسکے اخلاق حد درجہ پست اور اطوار بالکل غیر شریفانہ ہیں۔ میں مدتوں حیران رہا کہ یہ صفاتِ رذیلہ ایران کے حسینوں کے لئے کیوں مخصوص ہیں۔ میں نے بارہا اسپر غور کیا کہ ایران کے ہزاروں شاعروں میں سے جن کا کلام ہم تک پہونچا ہے کیا کوئی ایک بھی ایسا خوش قسمت نہ تھا کہ اُسے باوفا محبوب ملتا۔ آخر محبّت تو دونوں ہی جانب سے ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم اصطلاحاً مرد کو عاشق اور عورت کو محبوب (معشوق) قرار دیتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ ایران میں کبھی کسی محبوب کو اپنے چاہنے والے سے محبّت نہیں ہوئی۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد یہ نکتہ سمجھ میں آگیا کہ ایرانی شاعر کے معشوق کی "بیوفائی" اور "ستمرانی" بالکل فطری ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک امرد کا حسن شاعر کی فریفتگی کا باعث تو ہوسکتا ہو لیکن خود شاعر میں وہ صفات سادہ روئی کہاں کہ اس کے محبوب کے جذباتِ محبّت کو برانگیختہ کرسکیں۔ اس لئے چاہت یکطرفہ رہتی ہے اور محبّت کا جواب محبت سے نہیں ملتا بلکہ نہیں مل سکتا۔ اسی کا نام شاعروں نے محبوب کی بیوفائی اور ایذا رسانی رکھا ہے"!

اس بیان سے ایرانی شاعر کے محبوب کی جفاشعاری کا سبب تو واضح ہوگیا مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُردو شاعری میں جفائے محبوب کے اسباب وہی ہیں جو ایرانی شاعری کے سلسلہ میں ابھی مذکور ہوئے۔ اسلئے کہ شعرائے اُردو میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جنہیں امرد پرستی سے کبھی سروکار نہیں رہا۔ پھر بھی جفائے محبوب کا رونا سبھی

نے رویا ہے، درحقیقت اُن چند افراد کو چھوڑ کر جنہوں نے آپ بیتی بیان کی ہے باقی سب نے محض رسم و تقلید کی بنا پر ان مضامین کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُردو کا ہر شاعر بلا استثنا محبوب کی بے وفائی اور جفا شعاری کا قائل ہے۔ نہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو تقلید کی شارعِ عام کو چھوڑ کر بیانِ واقع کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں چنانچہ کوئی دلسوختہ حرماں نصیب کہتا ہے ؎

رات اِک بزم میں تھے جور و جفا کے شکوے ⁂ دل کو پھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

کسی اور مجبورِ اُلفت کا ایک شعر ہے ؎

حُسن سے سب کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں ⁂ یاں یہ رونا ہو کہ مجبور ہے مختار نہیں

مگر اس قسم کے کہنے والے "الشاذ کالمعدوم" کا حکم رکھتے ہیں۔ شاعرانہ رسم پرستی کے جتنے نمونے اب تک ہم نے پیش کئے یوں تو وہ سبھی "دفترِ بے معنی" کہلانے اور "غرقِ مے ناب" بلکہ نذرِ آتش کئے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن جفائے محبوب کے سلسلہ میں ہمارے چوٹی کے غزل گو شعرا نے جو کچھ لکھا ہے وہ حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اب ہم "بادشاہِ متغزلین" کے کلام سے چند ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں اُن مخصوص صفات کا ذکر کیا گیا ہے جو شاعر کے محبوب کے لئے لازمی ہیں مثلاً وہ بانیٔ جور و جفا ہے۔ بدخو اور ستمگر ہے۔ وفا دشمن اور عیار ہے۔ جفاکار اور خود بیں ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا کچھ نہیں ہے ؎

کیا کیا تو نے یہ حسرتؔ کہ دل اپنا چھوڑا ⁂ ایسے عیار، ستمگار، جفاکار کے پاس
یہ بھی کیا انصاف ہے اے دشمنِ اہلِ وفا ⁂ ہم رہیں ناکام یوں اور کام ہو حُسّاد کا
آرزو لازم ہے وجہِ آرزو ہو یا نہ ہو ⁂ التفات اس کافرِ خود بیں کی خو ہو یا نہ ہو

نہ سمجھا بانیٔ جور و جفا اس شوخ کو کوئی ⁂ کہ ہم نے جس کو پایا شکوہ سنجِ آسماں پایا
وصل اُس بُتِ بدخو کا میسر نہیں ہوتا ⁂ وابستۂ تقدیر ہے تدبیر ابھی تک

مشقِ جفا کی بہت سی صورتیں ہیں ان میں سے ایک نہایت دلچسپ صورت یہ بھی ہے کہ عاشق صاحب کے زخموں پر نمک پاشی کی جائے۔ عشقِ کامل کا کرشمہ یہاں نظر آتا ہے کہ یہ نمک پاشی باعثِ آزار ہونے کے بجائے عاشق صاحب کے لئے موجبِ تسکین و لذت ہوتی ہے۔ حسرتؔ ؎

قیامت کا تعلق ہے قیامت کی محبت ہو ⁂ مرے زخموں کی گویا جان ہو اُسکے نمکداں میں

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آزار سے لذت گیری محض ایک عارضی کیفیت تھی اور جلد ہی آزار درحقیقت آزار ثابت ہوا چنانچہ اُس کی برداشت نہ لا کر حضرت مولانا صاحب نے دبی زبان سے شکایت شروع کردی ؎

ہم بندگانِ درد پہ عشقِ جفا ہو کیا ⁂ دعوئی وفا کا یہی مقتضا ہے کیا

اور جب دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا تو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں اُسے جتا دیا کہ اگر تم جفا سے باز نہ آؤ گے تو پھر

ہم بھی عاشقی سے استعفا دیدینگے۔ اور اس کے ذمہ دار خود تم ہوگے ؎

اے ستمگر مجھ سے گو ترکِ وفا ممکن نہیں ؛ میں کروں لیکن کبھی ایسا تو کیا بیجا کروں

غرض شکوہ و شکایت کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اس "دشمنِ وفا" کو یہ بات ناگوار گذرنے لگی اور اُس نے تنگ آکر مولنا صاحب سے کہدیا کہ مولانا آپ کی روز روز کی گلہ سنجیوں سے دل پک گیا۔ خدا کے لئے اب بس کیجئے۔ یہ سُنکر مولانا نے فوراً یہ عادلانہ تجویز پیش کردی ؎

ستم تم چھوڑ دو میں شکوہ سنجیہائے ناچاری ؛ کہ فرضِ عین ہے کیشِ محبت میں رواداری

مگر بھلا وہ کب کسی کی سُنتا ہے۔ ادھر مولانا کی قوتِ برداشت بھی قریب قریب سلب ہو چکی تھی اسلیئے جی کڑا کرکے کنایتاً ترکِ محبت کی دھمکی دیدی کہ ؎

نہ کر اتنا ستم ہم دردمندوں پر کہ دُنیا سے ؛ مبادا یکقلم اُٹھ جائے تہذیبِ وفاداری

مگر جب دیکھا کہ وہ "بانیٔ جور و جفا" محض کودن ہے اور لطیف کنایوں کو نہیں سمجھتا تو ناچار صاف صاف کہنا پڑا کہ ؎

وفا سے دشمنی رکھکر مرے دل کی خریداری ؛ بہت مشکل ہے اس جنسِ گرامی کی خریداری

جی ہاں، یہ عاشق کا دل ہے۔ محض پارۂ گوشت نہیں۔ آپ حسین ہیں تو ہوا کریں مگر مہر و وفا قیمت میں دئے بغیر اس جنسِ گرانبہا کی خریداری ناممکن ہے۔ مگر وہ "عیار" مولانا کی ان گیدڑ بھبکیوں میں کب آتا ہے۔ نہ جانے ان جیسے کتنوں کو تگنی کا ناچ نچا چکا ہے کچھ ایسے تیور بدلے اور اس انداز سے مولانا کو ڈانٹا کہ بیچارے سہم کر رہ گئے اور چپکے چپکے خدا سے دعا کرنے لگے کہ پروردگارا! یا تو اس کے دل میں رحم ڈالدے یا پھر میرے دل سے اس کی محبت نکال دے ؎

عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یارب ؛ نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کردے

مولنا کی یہ بیکسانہ حالت دیکھکر اس کا تاؤ ذرا ٹھنڈا پڑا۔ پھر بھی یہ حکم دے دیا کہ خبردار! خبردار! آج سے ہمیں ستمگار نہ کہنا۔ نہ ہمارے جور و جفا کا شکوہ زبان پر لانا۔ یہ مانا کہ ہم ایسے ہی ہیں مگر تمہیں حق نہیں کہ ہمیں ایسا کہو ؎

خود ہی اقرار اُنہیں اپنی ستمگاری کا ؛ پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

ایسی صورت میں صبر کے سوا مولنا کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔ وہی مثل ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ دل پر جو کچھ گذر رہی تھی اُس سے تو خدا ہی باخبر تھا مگر بربنائے مصلحت اس جفاکار کو خوش کرنے کے لئے نہایت نیازمندانہ انداز سے یہ عرض کیا کہ ؎

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی ؛ مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

مثل مشہور ہے کہ ؎ جو خوشامد کرے خلق اُس سے خُدا راضی ہے ؛ سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خُدا راضی ہے۔ اُسپر بھی مولنا کی اس "نیازمندی" کا بہت اثر ہوا اور غصہ مہربانی سے بدل گیا۔ مولانا نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فی الفور کہا ؎

کچھ غیر نہیں ہم کہ بگڑ جائیں وفا سے ؛ اظہارِ مراعات کی حاجت نہیں ہم کو

جور و ستم کی یہ بے پایاں داستان کہانتک بیان کی جائے۔ اب ہم محبوبِ حسرت کی ایک مخصوص عادت بیان کرکے دوسر

ساتذہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اشعار بالا سے یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ کافر بدخو جور و ستم کا بادشاہ ہے مگر یہ جان کر آپکو بے انتہا افسوس ہوگا کہ وہ بدخو ہونے کے ساتھ ساتھ بدلگام اور بدزبان بھی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا بھولا بھالا اور سیدھا سادہ ہے مگر جب تنہائی میں ملاقات ہوتی ہے تو مولانا کو ایسی فحش گالیاں سُناتا ہے کہ خُدا کی پناہ ؎

مجھ سے تنہائی میں گر ملیئے تو دیجئے گالیاں ٭ اور بزمِ غیر میں جانِ حیا بن جایئے

یوں تو ہر شاعر کا محبوب جفاکار رہتا ہے لیکن حضرتِ فانی کے معشوق نے انتہا کر دی۔ کمبخت نے مِنّت کے طوق پہنے تھے تاکہ فانی صاحب سچ مچ آنجہانی ہو جائیں۔ مِنّت آخر پوری ہو کر رہی اور حضرتِ فانی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ محبت سے کہتے ہیں اور وفاداری اس کا نام ہے کہ مرنے کے بعد بھی محبوب کے آرام و راحت کا خیال ہے چنانچہ فانی صاحب نے مرنے کے بعد بزورِ کرامتِ شاعرانہ جب یہ دیکھا کہ اُس ظالم نے اب تک مِنّت کے طوق نہیں اُتارے اور اُن کے بوجھ سے گردن دبی جاتی ہے۔ اور تکلیف ہوتی ہے تو قبرستان کے مجاور کی معرفت کہلا بھیجا کہ ؎

طوقِ مِنّت کے بڑھا، ہو گئی مِنّت پوری ٭ بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

فانی صاحب رعایتِ لفظی کو کسی حال میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہاں بھی ماشاءاللہ طوق کے ساتھ بیڑیاں موجود ہیں۔ رقیب نوازی ہر شاعر کے محبوب کی ایک ممتاز صفت ہے لیئے اگر فانی صاحب کا معشوق بھی اس سے متصف ہے تو کچھ جائے شکایت نہیں ؎

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز ٭ دل ستم دوست، وہ رقیب نواز

ہاں شاعر کی یہ صفت البتہ قابلِ داد ہے کہ مرتے مرجاتا ہے مگر دامنِ وفا بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ فانی ؎

ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پروا کر ٭ تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فنا ہوجا

حسبِ دستور جگر صاحب کو بھی ایک "جور و جفا کے مالک" سے سابقہ پڑا ہے۔ چند کلمے اُن کی داستانِ درد کے بھی سُن لیجئے ؎

میں خوگر ستم ہوں، پروردۂ الم ہوں ٭ جور و جفا کے مالک مہر و وفا نہ کرنا

نگاہِ قہر پر بھی جان و دل سب کھوئے بیٹھا ہے ٭ نگاہِ مہر عاشق پر اگر ہوتی تو کیا ہوتا[1]

شوخ گستاخ کا چہرہ یہ اثر دیکھ نہ لے ٭ ڈر رہا ہوں کہ وہ سفاک اُدھر دیکھ نہ لے

ایسے "سفاک" سے ڈرنا ہی چاہیئے۔ ذرا میں چھُری بھونکدے تو کوئی اسکا کیا کرے۔ ؎

شیشۂ دل وہ ہستیِ نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا ٭ اُسپہ کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہیئے

انہیں آنسو سمجھکر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم ٭ پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

---

[1] جب اتنی بیوفائی پر دل اُنکو پیار کرتا ہے ٭ الٰہی وہ ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا۔ آغا حشر کاشمیری مرحوم۔

خُدا ایسے بیدردوں سے دوست دشمن سب کو بچائے۔ ایک بیچارہ ہو کہ بِلک بِلک کر رو رہا ہے اور اس سنگدل کے بھاویں ہی نہیں۔

مضامین فرسودہ کی فہرست میں چھٹا نمبر "تصوف و فلسفہ" کا ہے اور ترتیب کے لحاظ سے پہلے اسی موضوع پر بحث ہونی چاہیئے مگر ہم نے بعض مصالح کی بنا پر اس موضوع کو چوتھی قسط کے لئے اُٹھا رکھا ہے۔

اشکِ خونیں

رسم پرستی کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ انسان لمحہ بھر کیلئے اسپر غور نہیں کرتا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یا کہہ رہا ہوں آخر اس کا مطلب و منشا کیا ہے۔ اصل و حقیقت کیا ہے۔ حاصل و نتیجہ کیا ہے۔ اس قسم کی بے معنی نقالی کا بہترین نمونہ ہمارے چوٹی کے غزلگویوں کے وہ اشعار ہیں جنہیں اشکہائے خونیں کا ذکر ہے۔ چہرۂ محبوب کیلئے غازہ کا استعمال اسی حد تک اچھا معلوم ہوتا ہے کہ حُسن کو نکھار کر چمکا دے۔ نہ اتنا کہ اصلی رنگ کو دبا دے۔ اگر اعتدال کا خیال نہ رکھا جائے تو یہ آرائش رغبت کے بجائے کراہت بلکہ بعض اوقات نفرت کا باعث ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی حال تشبیہ و استعارہ اور مبالغہ کا ہے لعبتانِ خیال کو زیادہ جاذب توجہ اور دلربا بنانے کے لئے ان زیوروں سے آراستہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں مگر اس کی ایک انتہا ہونی چاہیئے۔ اشعار میں جذبات انگیز مضمون کیلئے ضروری ہو کہ اس کی بنیاد کسی نہ کسی حد تک اصلیت پر قائم ہو ورنہ سُننے والے پر اُس سے کسی قسم کا اثر مترتب ہونا غیر ممکن ہو مگر ہمارے شعرا جو اپنے پیشرووں کی کورانہ تقلید کے شیدائی اور سنتِ جاریہ کے شدّت سے پابند ہیں کبھی اس حقیقت کی طرف اعتنا نہیں کرتے۔

انسان جب کسی روحانی یا جسمانی رنج و تکلیف کی برداشت نہیں لا سکتا تو بے اختیار اُس کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ رونے سے اضطراب قلب کو نہ تسکین پاتا ہے اور غم کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اس سے شاعروں نے یہ مضمون پیدا کیا۔ یعنی کہ دل کا خون ہو جاتا ہے تب آنسو نکلتا ہو۔ دل کے خون ہو جانے سے دل کا حد درجہ تکلیف پانا مراد ہے۔ یہ نہیں کہ دل فی الواقع خون کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی مناسبت و رعایت سے، جب شدّتِ غم کا اظہار مقصود ہوا تو آنسوؤں کو اشکِ خونیں اور گریۂ خونیں سے تعبیر کرنے لگے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آنسوؤں میں سچ مچ خون کی سُرخی موجود ہوتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ نے یہاں تک بڑھی کہ آنسوؤں کی سُرخی ایک مسلمہ حقیقت ہو گئی۔ نہ صرف اسقدر بلکہ آنسوؤں کو عینِ خون تسلیم کر لیا گیا۔ لہٰذا خون کی جو ایک مخصوص صفت ہو یعنی سُرخی و رنگینی وہ آنسوؤں کیلئے بھی ثابت ہو گئی۔ اور جس طرح خون کے چھینٹوں یا قطروں سے کپڑے یا دوسری چیزوں پر سُرخ دھبے پڑ جاتے ہیں اُسی طرح آنسوؤں سے بھی چہرہ، رومال، آستین اور دامن رنگین ہونے لگے۔ قطراتِ سرشک کہیں لالہ و گل کو شرماتے ہیں۔ کہیں دامنِ کہسار میں آگ لگاتے ہیں۔ کہیں شفق اور بہار کی رنگینیاں دکھاتے ہیں۔ وہی قطراتِ سرشک جن کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر صاف ہوں تو کپڑے پر گر کر خشک ہو جاتے ہیں اور کوئی نشان باقی نہیں رہتا اور اگر

آنکھوں کا میل بھی اُن میں شامل ہو تو صاف کپڑے پر میلے میلے دھبے ڈال دیتے ہیں۔ خدارا انصاف! اِن میل کے دھبوں کو لالہ و گل سے تشبیہ دینا کہاں کی خوش مذاقی ہے۔ کب تک یہ کورانہ تقلید کا جُوا اُردو غزل کے کاندھے پر سوار رہے گا۔

جناب اصغر کا ایک شعر ہے ؎

روانی رنگ لائی دیدۂ خونناب افشاں کی ÷ اُتر آئی ہے اِک تصویر دامن پر گلستاں کی

"نشاطِ روح" کے مقدمہ میں مرزا احسان احمد صاحب اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں کہ "غور کرو کس قدر رنگین پیرائے بیان ہے"۔ مرزا صاحب کے یہ الفاظ پڑھکر بیساختہ ایک حکایت یاد آگئی ؎

"ایک نواب صاحب نے مرتے وقت اپنے فرزند ارجمند کو وصیت کی کہ بیٹا ہماری وفات کے بعد اگر ہمارے احباب میں سے کوئی تم سے ملنے کیلئے آئے تو اُسکے ساتھ بہت عزت و احترام سے پیش آنا۔ اونچی جگہ پر بٹھانا اور نہایت نرم و شیریں گفتگو کرنا۔ سعادت مند بیٹے نے باپ کی بات گرہ میں باندھی اور مرحوم کی رحلت کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ جلد سے جلد ایک بلند مینار تیار کرایا۔ حُسنِ اتفاق کہیئے یا سوءِ اتفاق، مینار کی تعمیر کے چندہی روز بعد نواب صاحب مرحوم کے ایک بوڑھے دوست صاحبزادے صاحب سے ملنے آتے۔ صاحبزادے صاحب کی ہدایت کے بموجب نوکروں نے بڑے میاں کو مینار کی آخری منزل پر پہونچادیا۔ کمزور سن رسیدہ آدمی چڑھتے چڑھتے بیچارے کا دم پھول گیا۔ آخری سیڑھی پر پہونچکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں صاحبزادے صاحب بھی تشریف لے آتے اور دُور سے دیکھکر تعظیم بجالائے۔ بڑے میاں نے کہا "کہو بیٹا، اچھے تو ہو"۔ صاحبزادے نے جواب میں فرمایا "رُوئی"۔ بڑے میاں نے متعجب ہوکر پھر خیریت دریافت کی۔ صاحبزادے صاحب نے کہا "ریشم۔ موم۔ پروں کا تکیہ"۔ بڑے میاں سخت حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ آخر کسی قدر برہمی کے ساتھ کہا کہ میں رُوئی، ریشم، پروں کے تکیہ کا حال نہیں پوچھتا میں تم لوگوں کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ صاحبزادے صاحب نہایت مودبانہ انداز میں بولے "گڑ، شکر، قند، مصری"۔ یہ الفاظ سُنکر بڑے میاں کو ضبط کی تاب نہ رہی۔ جھلا کر مینار سے نیچے اُتر آئے اور نہایت درشت لہجہ میں صاحبزادہ صاحب سے مخاطب ہوکر بولے کہ "ابے احمق! کچھ دیوانہ ہوگیا ہے۔ پہلے تو مجھ بُڈھے کو چار منزل اوپر چڑھادیا۔ اور حال پوچھتا ہوں تو رُوئی، ریشم اور گُڑ شکر خدا جانے کیا کیا خرافات بکتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے انتہائے عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ چچا جان گستاخی معاف، میں نہ احمق ہوں نہ دیوانہ۔ میں نے جو کچھ کیا وہ ابا جان مرحوم کے ارشاد کی تعمیل تھی اور بس۔ مرحوم نے مرتے وقت فرمایا تھا کہ ہمارے دوستوں کو اونچی جگہ پر بٹھانا اور نرم و شیریں گفتگو کرنا۔ اسی لئے میں نے یہ مینار بنوایا ہے کہ اس سے اونچی جگہ یہاں اور کوئی نہیں ہے اور میرا خیال تھا کہ دُنیا میں سب سے زیادہ نرم چیزیں رُوئی، ریشم اور موم ہیں اور اسی طرح سب سے زیادہ میٹھی چیزیں شکر، قند، اور مصری ہیں، اس سے زیادہ نرم اور میٹھی باتیں اور کیا ہوسکتی ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ خفا ہوگئے۔ بڑے میاں یہ جواب سُنکر بھونچکا رہ گئے"۔

اگر رُوئی ریشم اور قند و شکر کے معنی نرم و شیریں گفتار کے ہوسکتے ہیں تو یقیناً اصغر کا شعر بھی رنگینیوں سے معمور ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں۔ اشک بیچارے میں پہلے رنگ تو ثابت کرلیجئے اسکے بعد دامن پر گلستاں کی تصویر اُتار دیجئے گا۔ رنگین اشعار کا یہ مطلب ہے کہ اُنہیں پڑھکر یا سُنکر بہار کی رنگینیاں آنکھوں میں چھا جائیں۔ رنگین صحبتیں یاد آجائیں۔

رنگین نغمے کانوں میں گونجنے لگیں۔ تصوّر میں رنگینیوں کی ایک دُنیا آباد ہوجائے۔ حُسن کی بجلیاں چمکیں، بادۂ گلرنگ کے ساغر چھلکیں۔ فضا رنگ و بو سے یکسر معمور ہوجائے اور ناظر خیال اِس میں کھُو جائے۔ یہ نہیں کہ شعر میں رنگ کا لفظ آگیا اور شعر رنگین ہوگیا۔ اگر اسی کا نام رنگینی ہے تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہو کہ "خالق باری" کا یہ شعر ؎

نیلا، پیلا، زرد، کبود ؛ نانا، بابا، تنست و پود

دُنیا کے ہر شعر سے زیادہ رنگین ہے۔ "اشک خونین" کے متعلق اب اپنے چوٹی کے غزلگویوں کے چند شعر سن لیجئے ؎

فانیؔ ؎ بدلا ہوا ہی آج مرے آنسوؤں کا رنگ ؛ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا

ماشا اللہ کتنی گہری بات کہی ہے۔ دل کا زخم اور پھر اس کا رفو۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے طبّی دُنیا ابد تک ہمارے شعرا کی ممنون رہے گی۔ کس قدر غلط خیال ہے کہ جملہ تحقیقاتِ علمیہ کے لئے ہمیں دورِ جدید اور یورپ و امریکہ کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کوئی بتائے کہ بیسویں صدی میں دل کے زخم میں ٹانکے لگانا یورپ یا امریکہ کے کس ڈاکٹر کو نصیب ہوا۔ مگر شعرا کے یہاں یہ ایک پُرانی چیز ہے۔ ہاں تو فانیؔ صاحب کے دل کے زخم کا ایک ٹانکا ٹوٹ گیا۔ اس سے خون بہ نکلا۔ آنسوؤں کا منبع چونکہ دل ہے اسلئے اشکوں میں اس خون کی آمیزش ہوگئی اور آنسوؤں کا رنگ عنابی ہوگیا۔ اِسے کہتے ہیں پروازِ تخیل یا بالفاظِ دیگر دُور کی کوڑی لانا۔ اشکوں کی مفروضہ سُرخی کا ماشا اللہ کہاں سے تار نکالا ہے ؎

فانیؔ ؎ فرقت میں بارِ اشک ہو ہر تار آستیں ؛ ہر داغ خون ہے دیدۂ خونبار آستین

اصغرؔ ؎ اشکِ خونین ہے کہیں نالۂ رنگین ہے کہیں ؛ ہر قفس میں اُتر آتا ہے گلستاں کوئی

نالۂ رنگین سے تو خیر کیا مگر اشکِ خونین سے ضرور قفس میں گلستاں اُتر آتا ہوگا۔ اشکِ خونین کے فرضی رنگ سے گلستاں کی تصویریں بنانے کا اصغرؔ صاحب کو بہت شوق ہے۔ مگر ان تصویروں کی حقیقت اُس "نوری جامہ" سے زیادہ نہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ بعض عیاروں نے کسی زمانہ میں ایک سادہ دل بادشاہ کو پہنایا تھا۔ اور جس کی یہ صفت بیان کی گئی تھی کہ صرف "ایماندار" لوگوں کو نظر آسکتا ہے۔ سالگرہ کے موقع پر جب بادشاہ اُس "نوری جامہ" کو پہنکر جلوس کے ساتھ شہر میں گشت کیلئے نکلا تو اُسے دیکھکر لوگ ہکّا بکّا رہ گئے۔ وہ مادر زاد ننگا تھا مگر لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ ہمارے ایمان کا قصور ہے جو "نوری جامہ" نظر نہیں آتا اور بادشاہ برہنہ دکھائی دیتا ہے۔ سب دم بخود تھے اور جو کچھ دیکھ رہے تھے اسکا اظہار و اعتراف دوسروں سے اسلئے نہیں کرتے تھے کہ "بے ایمان" سمجھے جائینگے۔ آخر ایک معصوم بچّہ نے چلّا کر کہا۔ "ارے یہ کیا! بادشاہ ننگا جارہا ہے"! ایک دفعہ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ اس سرے سے اُس سرے تک ایک ہلچل مچ گئی۔ اب ہزاروں زبانوں پر یہی الفاظ تھے کہ "بادشاہ ننگا جارہا ہے"۔ اب لوگوں کو یقین آگیا کہ اُن آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ حقیقت تھی۔ اُن کے ایمان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ "نوری جامہ" کوئی خارجی یا مادی وجود نہیں رکھتا تھا۔ عیاروں نے بادشاہ اور رعایا سب کو فریب دینے اور احمق بنانے کی کوشش کی تھی۔ آخر فریب کا پردہ چاک اور حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہوگیا۔

یہی حال اصغرؔ صاحب کی اُن تصویروں کا ہے جو مقدمہ نگاروں کو بغایت "رنگین" نظر آتی ہیں حالانکہ وہ نقوش سادہ کی

حیثیت بھی نہیں رکھتیں بلکہ سرے سے اُن کا وجود ہی نہیں۔ مقدمہ نگاروں کی لفظی جادوگری نے لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو کچھ اس طرح مسحور کر دیا ہے کہ اب وہ اُنہیں کی آنکھوں سے دیکھتے اُنہیں کے دماغ سے سوچتے اور اُنہیں کے دل سے محسوس کرتے ہیں۔ ذاتی رائے پر مطلق اعتماد نہیں رہا۔ مقدمہ نگار نے اگر کسی شعر کو حد درجہ حسین و رنگین بتایا ہے مگر پڑھنے والے کو اس میں کوئی حسن و رنگینی دکھائی نہیں دیتی تو وہ اِسے اپنے فہم کا قصور اور استعداد کا نقص سمجھتا ہے حالانکہ حقیقت وہی ہے جو اُسے نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رسمی، تقلیدی اور بے بنیاد شاعری کے خلاف میں نے جو آواز بلند کی ہے وہ بہتوں کی آنکھیں کھولدے گی اور انہیں نظر آنے لگے گا کہ ہمارے شعرائے رسم پرست کے اشعار کی رنگینی و رعنائی اور "معنویت" کی حقیقت "نوری جامہ" سے زیادہ نہیں۔ اور مقدمہ نگار حضرات اُن صنعت گروں کے ہم فن اور ہم رُتبہ ہیں جنہوں نے "نوری جامہ" تیار کیا تھا۔

ہاں تو اصغر صاحب اپنے چیپڑے۔ جنکو بمنزلہ رنگ سمجھنا چاہیئے۔ آنسوؤں کے پانی میں حل کرکے مژگان کے مُوقلم سے دامنِ قبا کے کینوس پر جو تصویریں کھینچی ہیں ان میں سے بعض آپ کے ملاحظہ کیلئے پیش کی جاتی ہیں ؎

وہ نغمۂ رنگیں میں سب بھول گیا اصغر ٭ اب گریۂ خونیں میں رودادِ گلستاں ہے

دل میں اک بوند لہو کی نہیں رہ گیا ٭ اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

تھا لطفِ جنوں دیدۂ خونابہ فشاں سے ٭ پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

حضرت اصغر کے دیدۂ خونابہ فشاں نے دامنِ صحرا کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔ جناب جگر کے دیدۂ خونبار نے دامنِ کہسار کو گلستاں بنا دیا۔

جگر ؎ جب کبھی چھیڑا جنوں نے دیدۂ خونبار کو ٭ بھر دیا پھولوں سے ہم نے دامنِ کہسار کو

مُرشد و مُرید کے ان شعروں میں کس بلا کی صوری و معنوی مشابہت ہے "من تو شدم تو من شدی" کی منزل اب دُور نہیں

جگر ؎ پوچھ مت مجھ سے مرے زخمِ جگر کی حالت ٭ میرے دامن میں ہر آنسو گُل تر ہے کہ نہیں

حضرتِ فانی نے زخمِ دل کے لہو سے آنسوؤں کو رنگین کیا تھا[1]۔ جنابِ جگر کے اشک، زخمِ جگر کے خون سے گلرنگ ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ جگر کا خون زیادہ شوخ رنگ ہوتا ہے یا دل کا تو اسی کے لحاظ سے یہ فیصلہ کرنا سہل ہوگا کہ جگر کا شعر زیادہ رنگین ہے یا فانی کا۔

جگر ؎ رنگین ہیں فضائیں جاری ہیں اشک خونیں ٭ افسانہ حُسن کا ہے اور عشق کی زباں ہے

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشک خونیں ہی سے فضائیں رنگین ہوگئی ہونگی۔ لیکن یہ نکتہ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر صاحب جہاں بیٹھے اشکِ خونیں بہا رہے تھے وہاں کتنی فضائیں تھیں جو جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

---

[1] بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ ٭ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا۔ فانی

حوالت کا خوف اپنی جگہ پر درست۔ مگر ناانصافی ہوگی اگر "بادشاہِ متغزلین" کے چند اشعار اس موضوع پر یہاں نقل نہ کئے جائیں۔

سُنیئے۔ حسرتؔ ؎ جوشِ گل کی ہیں یہی کیفیتیں تو کیا عجب ۞ اشکِ بلبل سے قفس ہو لالہ زار اب کی برس

"اشکِ بلبل" کی جدت قابلِ داد ہے اور اُن اشکہائے خونیں سے قفس کا لالہ زار بنجانا داد سے مستغنی۔

حسرتؔ ؎ مری گریۂ خون کی سب لالہ کاری ۞ نمودار ہے دامن و آستین پر

وہ دن اب یاد آتے ہیں بہارِ خونفشانی کے ۞ وہ میرا جیب کو دامن کو بھی گلنار کر لینا

چشمِ رنگین یار کو ہے پسند ۞ سُرخیِ اشکِ عاشقان کی بہار

ظاہر ہے کہ بربنائے مشابہت چشمِ رنگین یار کو سُرخیِ اشکِ عاشقاں کی بہار پسند ہوگی۔ مثل مشہور ہے کہ ؎

کُند ہمجنس باہمجنس پرواز ۞ لال کے ساتھ لال اور باز کے ساتھ باز

"جنون"

دُنیا میں ایسا کون ہے جس نے زندگی کے کسی نہ کسی دور میں محبت کی گرمی اپنے قلب میں محسوس نہ کی ہو۔ خصوصاً ایک غزلگو شاعر کیلئے تو عاشق ہونا ناگزیر ہے مگر ہمارا شاعر ہم آپ جیسا یعنی معمولی درجہ کا عاشق بننا پسند نہیں کرتا بلکہ لغوی، اصطلاحی تاریخی ہر اعتبار سے ایشیا کے آئیڈیل عاشق میاں مجنوں کا سچا جانشین بننا چاہتا ہے۔ میاں مجنوں کا اصلی نام قیس تھا مگر جب فرطِ عشق نے جنون کی صورت اختیار کی تو مجنوں مشہور ہو گئے۔ حُسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے یہ واقعہ ہمارے شاعر صاحب کو بھی معلوم ہے اور اس سے اُنہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کمالِ عشق کے لئے جنون لازمی ہے لہذا دیوانے بن گئے۔ مگر دیوانے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دور کے بعض مفکرین کی طرح "عدمِ تشدد" کے قائل ہوتے ہیں اور اپنا جنون اپنی ہی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جنون کے جوش میں طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ جو چیز سامنے آئی اُٹھا کر پھینکدی، توڑ دی، برباد کر دی۔ جو ملا اُس سے بھڑ گئے۔ لڑ پڑے۔ پتھر مارنے لگے۔ اس قسم کے دیوانوں کو حفظِ امنِ عامّہ کی خاطر آزاد نہیں پھرنے دیا جاتا۔ یا اُن کے اعزّہ اُن کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر گھر ہی میں اُنہیں بند رکھتے ہیں یا پھر سرکاری پاگل خانوں میں اُنہیں قید رکھا جاتا ہے۔ اس طرح پہلی قسم کے دیوانے آزاد پھرتے ہیں اور دوسری قسم کے پابزنجیر رکھے جاتے ہیں۔ شاعر صاحب نے کہیں یہ بھی سُن لیا ہے کہ "کمالِ فن" اس کا نام ہے کہ انسان جامع حیثیات ہو لہذا دونوں قسم کے دیوانوں کی تمام خصوصیات و صفات اپنی ذات میں ثابت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دیوانے کا سوانگ بھرنے کیلئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ فرضی دیوانگی کے جوش میں ہمارا شاعر کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے۔ پہلے گریباں چاک کرتا ہے۔ اس کے بعد دامن کی دھجیاں اُڑاتا ہے۔ پھر سر بصحرا نکل جاتا ہے۔ جب تک شہر کی حدود سے خارج نہیں ہو جاتا لڑکوں کا غول اُس کے پیچھے ہوتا ہے جو تالیاں بجاتا، شور مچاتا اور اُس پر کنکریاں برساتا ہے۔ میاں مجنوں کے لئے تو نجد کا صحرا قریب ہی موجود تھا اسلئے صحرا نوردی سہل تھی مگر ہمارے شاعر کے لئے کسی صحرا تک پہونچنا بھی آسان نہیں اسلئے اور بھی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ جنون کے جوش میں اتنا ہوش کہاں کہ جوتا پہنکر صحرا کو جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ننگے پاؤں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ ان میں کانٹے چُبھتے ہیں۔ پھر آبلے پھوٹتے ہیں اور زخم بنجاتے ہیں۔

یہ دیوانگی کا ایک رُخ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب اسیرِ دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے تو اُسے زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ قید خانے میں پہونچکر وہ کچھ اس درد اور جوش سے آہیں کرتا ہے کہ زنداں کی دیواریں ہلجاتی ہیں۔ محافظوں کے کلیجے اُلٹنے لگتے ہیں۔ پھر جب فصلِ بہار آتی ہے تو اس کا جنون اور بھی تیز ہوجاتا ہے۔ پہلے وہ گریباں چاک کرتا ہے پھر سلے کپڑے بدن پر سے نوچ کر پھینکدیتا ہے اور مادر زاد ننگا ہوجاتا ہے۔ کبھی جوشِ دیوانگی میں اپنا سر پیٹنے لگتا ہے یہاں تک کہ لہولہان ہوجاتا ہے کبھی زنجیر کو پارہ پارہ کرکے اور کبھی زنجیر سمیت زنداں سے نکل بھاگتا ہے۔

یہ ہے مختصر رُوداد دیوانگی کی جو بادنیٰ تغیر ہر شاعر نے تفصیل کے ساتھ بیان کی ہو۔ رسم پرستی اور نقالی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی کہ ایک صحیح المزاج انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو دیوانہ کہے۔ جھوٹ موٹ اپنا گریبان چاک کرے۔ فرضی محبس میں قید رہے اور محض خیالی صحرا میں تنکے چُنتا پھرے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے "بادشاہِ متغزلین" یعنی مولانا حسرت موہانی اس میدان میں اپنے حریفوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ دیوانے تو بنے مگر گھٹیا قسم کے۔ یعنی اُن کا جنون چاک دامانی اور صحرا نوردی سے آگے نہیں بڑھا۔ نہ اُنھوں نے زنجیر پہنی۔ نہ اپنا سر پھوڑا۔ نہ قید خانے میں رہے۔ نہ اپنی آہوں سے زنداں کی دیواریں ہلائیں۔ یہ سعادت اصغر، جگر، اور فانی کا حصہ تھی۔ اُنہیں کو ملی اور حسرت صاحب باوجود سعی اس سے محروم رہ گئے۔ سچ ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست ∴ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

آیئے اب اپنے شعرائے فرزانہ کی فرضی دیوانگی کا تھوڑا سا تماشا دیکھ لیجئے۔ پہلے دامن و گریباں کی دھجیاں اُڑتی ہیں ؎

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت ∴ اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

مولانا کو سکون و خاموشی کے مقابلہ میں چونکہ شور و ہنگامہ زیادہ پسند ہے اسلئے صحرا میں جی نہیں لگتا اور ناچار شہر میں تشریف لے آتے ہیں تاکہ لڑکوں کا غول تالیاں بجاتا، شور مچاتا، پتھر برساتا آپ کے پیچھے پیچھے ہو اور آپ اس برات کے دولھا بنے آگے آگے کوچہ و بازار میں چکر لگاتے پھریں ؎

شورِ طفلاں چاہیئے اے عشقِ سودائی مجھے ∴ کیوں پسند آنے لگی صحرا کی تنہائی مجھے

بحیثیت ایک مردِ سیاسی کے مولانا حسرت کی ہمت و جرأت کا ہندوستان بھر میں شہرہ ہے۔ آپ نے سچ مچ کے جیل خانوں میں رہکر قید بامشقت کی اذیتیں برداشت کی ہیں، چکیاں پیسی ہیں اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں مگر یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جب آپ ایک مجنوں عاشق کا سوانگ بھرتے اور خیالی صحرا گردی کرتے ہیں تو آبلوں میں کانٹے چُبھنے کی بھی تاب نہیں لا سکتے اور تکلیف کے تصوّر ہی سے بلک بلک کے رونے لگتے ہیں ؎

جانِ افگار پہ طاری ہوئی رقت کیا کیا ∴ آبلوں سے جو سنی خارِ مغیلاں کی صلاح

موضوعِ زیرِ بحث پر مولانا صاحب کا صرف ایک شعر اور سُن لیجئے ؎

زیبائش فرقِ عاشقی ہے ∴ دستارِ جنوں میں غم کا پیوند

ظاہری مطلب تو اس شعر کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ عشق کے سر پر جنوں کی پگڑی لپٹی ہوئی ہے۔ اِس میں غم کا پیوند

لگا ہوا ہے اور یہ پیوند لگی ہوئی پگڑی آنجناب کے سرِ مبارک پر بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت اگر صرف اتنا ہی مطلب ہے تو یہ تو کچھ بات ہی نہ ہوئی۔ اسلئے ضرور اس میں کوئی "باطنی" مطلب بھی ہوگا جس پر اہل ظاہر کی نظر نہیں پہونچ سکتی۔ انہیں اس شعر میں ضلع جگت اور لفظوں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نظر نہ آئیگا۔

"بادشاہِ متغزلین" کی جنون سامانیوں کا مظاہرہ بہت پھیکا اور پھسپھسا رہا۔ آیئے اب حضرتِ جگر کے جوشِ دیوانگی کی ہنگامہ آرائیاں دیکھیں جنہوں نے اتنے گریباں پھاڑے ہیں کہ اب مرادآباد میں ایک ثابت پیرہن بھی مشکل ہی سے ملیگا۔ موصوف کا جنون نہایت تدریجی رفتار سے بڑھا ہے۔ آغازِ جنون میں اتنا ہوش تھا کہ گریباں چاک نہ ہو ورنہ رازِ محبت افشا ہوجائے گا ؎

عشق کا رازِ جنونِ عشق کی حد ہی پر ہے ٭ دل گیا ہے تو گریبان نہ جانے پائے

بلکہ سچ پوچھیے تو رازِ عشق چھپانے ہی کیلئے جنون کا یہ روپ بھرا تھا ؎

پیراہنِ جنون سے تنِ عشق ڈھک لیا ٭ یہ اک طریقِ خاص ہوا اخفائے راز کا

مگر یہ موصوف کی ناتجربہ کاری تھی جو یہ سمجھ لیا کہ جنون، عشق کی پردہ پوشی کرے گا۔ ابتدا میں غالباً جھوٹ موٹ آپنے اپنے اوپر جنون طاری کرلیا تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی جنون، حقیقی دیوانگی بنگیا اور اس کا جوش اتنا بڑھا کہ رازِ محبت چھپانے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اسلئے کہ گریبان سو سو جگہ سے چاک ہوگیا ؎

جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبطِ عشق کی ٭ سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا

جگر صاحب کو خود حیرت ہے کہ گریبان چاک ہوا تو کیونکر اسلئے کہ عالمِ دیوانگی میں آپکا ضعف اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہاتھ کا اٹھنا بھی محال تھا پھر اس نے گریبان کس طرح پھاڑ ڈالا اور اگر اس نے نہیں پھاڑا تو پھر کیونکر پھٹا ؎

دستِ جنوں کا ضعف سے اٹھنا محال تھا ٭ کیا جانے کس طرح سے گریباں نکل گیا

بہرحال گریبان چاک ہوا۔ اور جب ایکمرتبہ یہ سلسلہ جاری ہوگیا تو پھر جاری ہی رہا ؎

حال وحشت میں ہوا یہ ترے دیوانوں کا ٭ جیب چھوٹی تو گریباں لئے بیٹھے ہیں

جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے ٭ خبر نہیں کہ گریباں بھی تار تار ہوا

اس عشق میں پیدا کبھی ساماں نہیں دیکھا ٭ دامن پہ نظر کی تو گریباں نہیں دیکھا

یہ سب ابتدائی دور کا حال ہے۔ اس کے بعد تو آپ نے اس بری طرح گریبان و دامن کی دھجیاں اڑائیں کہ الٰہی توبہ ؎

خاص یہ شان ہے اک آپکے دیوانوں کی ٭ دھجیاں خود بخود اڑتی ہیں گریبانوں کی

ہم نے دیکھی تھی ادا کل ترے دیوانوں کی ٭ دھجیاں چھ لئے بیٹھے تھے گریبانوں کی

رحم کر اتنو جنوں جان پہ دیوانوں کی ٭ دھجیاں پاؤں پہ آپہونچیں گریبانوں کی

یا تو جناب جگر جنون سے اس امر کے ملتجی تھے کہ "گریبان نہ جانے پائے" یا بالآخر گریبان و دامن پھاڑنے ہی کو رازِ عشق کا عرفان سمجھنے لگے ؎

عشق کا رازِ دروں سوختہ ساماں سمجھا ؛ جس نے دامن کبھی جانا نہ گریباں سمجھا

اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہوگیا کہ جہاں کسی کو چاک گریباں دیکھا ان پر جنون کا دورہ پڑ گیا۔ مثل مشہور ہے کہ "دیوانہ را ہُوے بس است" مگر یہاں "ہُو" کی بھی ضرورت نہیں۔ پھٹا ہوا گریبان دیکھا اور دیوانگی نے طوفان برپا کر دیا ؎

اللہ اللہ مرے جوشِ جنوں کی لہریں ؛ نظر آجاتا ہو جب چاک گریباں کوئی

گریباں پھاڑتے پھاڑتے آخر ہاتھ شل ہوگیا ؎

اب اُسی دستِ جنوں پر آستیں ہو خندہ زن ؛ دھجیوں کو بارہا جس نے گریباں کر دیا

مرزا غالب نے بطریقِ طنز کہا تھا کہ ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ؛ صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

جگر سے اپنے عہد میں اس طعنہ کی برداشت نہ ہوسکی اور جنون کا وہ نام اُچھالا وہ صحرا گردیاں کیں کہ سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ۔ آخر دُنیا کو ماننا پڑا کہ میاں مجنوں کے سچے جانشین اس "قحط الرجال" کے دور میں جناب جگر ہی ہیں اُنہیں خود بھی اپنی اس بزرگی کا احساس ہے چنانچہ بڑے فخر کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں ؛ میں نے صحرا کو جگر صحرا کیا

سچ یہ ہے کہ جگر صاحب کو یہ دعویٰ ہر طرح زیبا ہے اسلئے کہ گریبان تو سبھی دیوانوں نے پھاڑے ہیں مگر نہ اسطرح کہ ؎

داماں وجیب ہوگئے نذرِ جنوں تمام ؛ باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں

ہائے بیچارے جس طرح برہنہ دُنیا میں آئے تھے اُسی طرح برہنہ دُنیا سے جائینگے بشرطیکہ میونسپلٹی نے ننگا دفن کرنے کی اجازت دیدی۔

اس میں شک نہیں کہ جناب جگر کا جنون مولنا حسرت کے جنون سے کہیں زیادہ تیز ہے پھر بھی آپ نے کچھ ایسی زیادہ صحرا نوردیاں نہیں کیں اور پاگل خانے میں بھی غالبًا آپ کو زندگی کے آخری چند روز ہی گذارنے کا اتفاق ہوا ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مع زنجیر صحرا میں جا پہونچے تھے ؎

حاصل دشت نوردی ہیں یہ اے دشتِ جنوں ؛ آبلے ٹوٹ نہ جائیں کہیں زنجیر کے ساتھ

مگر اس شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ گھر سے فرار ہوتے تھے یا پاگل خانے سے۔ یقینی طور پر تو صرف اتنا معلوم ہے کہ جب آپ گرفتار کر کے زنداں لے جائے گئے تو وہاں آپ کی بہت حفاظت کی جاتی تھی کہ کہیں نکل نہ بھاگیں۔ اس واقعہ کا آپنے بڑی حسرت کے ساتھ ذکر کیا ہے ؎

ان جنوں سامانیوں پر کیا رہائی کی اُمید ؛ حسرتیں بھی دفن زیرِ خاکِ زنداں ہوگئیں

یہ امر بھی متحقق ہو چکا ہو کہ عالمِ جنون ہی میں آپ کا وصال ہوا ؎

سخت دشوار حفاظت تھی گریبانوں کی ؛ آبرو موت نے رکھ لی ترے دیوانوں کی

حضرتِ اصغر نے بھی گریبان دری میں کچھ کمی نہیں کی پھر بھی آپ جنابِ جگر کو نہیں پہونچتے۔ صحرا نوردی میں البتہ

آپ جگر کے ہم رتبہ قرار دئے جاسکتے ہیں مگر قید خانے کی سختیاں جھیلنے میں یقیناً اُن سے افضل ہیں۔ آپکی روداد کا خلاصہ یہ ہے ؎

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم ؛ کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

اس کے بعد آپ حسبِ دستور صحرا نوردی کے لئے تشریف لے گئے ؎

خوب صحرا ہے یہ لے جوشِ جنوں ؛ پھاڑنے کو نت نئے دامن کہاں
لُطف ہر طرح کا ہے دشتِ جنوں میں لیکن ؛ پھاڑنے کو نہیں ملتا ہے گریباں کوئی

صحرا میں آپکی دلبستگی کے تمام سامان موجود تھے، کمی اگر تھی تو صرف اتنی کہ ہر روز نیا گریبان پھاڑنے کو نہیں ملتا تھا کیونکہ آدھی درجن قمیص اور اتنے ہی کُرتے جو آپ اپنے ہمراہ صحرا کو لے گئے تھے وہ چند روز میں پھٹ پھٹا کے برابر ہوگئے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ دیوانہ بن کر گریبان و دامن پھاڑ ڈالنے کے بعد آپ کو یہ پتہ چلا کہ آپ کا محبوب دل اور کلیجی کے کباب بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ لہٰذا اُسے آپ کے قلب و جگر کے ٹکڑوں کی ضرورت ہے ؎

اس کو مطلوب ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے ؛ جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

پاگل خانہ جانے سے پیشتر جس زمانہ میں آپکا قیام صحرا میں تھا آپ آستانِ یار سے جُدا ہوجانیکے غم میں بہت رویا کرتے تھے ؎

جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار ؛ روتے ہیں مُنہ پہ دامنِ صحرا لئے ہوئے

مگر روتے وقت آپ صحرا کا دامن کس طرح اپنے مُنہ پر ڈھانک لیا کرتے تھے اس کا سمجھنا اور سمجھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ شاید فراقؔ صاحب یا سہیلؔ صاحب یا مرزا احسان احمد صاحب کچھ ان اسرار و رموز کا انکشاف کریں تو پتہ چلے جس زمانہ میں آپ پاگل خانے میں تشریف رکھتے تھے آپ کا جنون بہت جوش پر تھا۔ زنجیروں کو اُٹھا کر جھنجوڑتے اور زمین پر دے دے مارتے تھے جس سے ایک نہایت وحشت انگیز شُور پیدا ہوتا تھا ؎

اور آجائے نہ زندانی وحشت کوئی ؛ ہے جنوں خیز بہت شورِ سلاسل میرا

جس وقت آپ دیوانگی کے جوش میں پہنچتے تھے تو پاگل خانے کی دیواریں اور محافظوں کے دل ہل جاتے تھے ؎

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ ایسی درد کی کھینچی ؛ نگہباں چیخ اُٹھے ہل گئی دیوارِ زنداں کی

پاگل خانے میں قریب قریب یہی حالت حضرت فانیؔ کی بھی ہوگئی تھی ؎

ہلگیا زنداں بُرا ہو نالۂ شبگیر کا ؛ چونک اُٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

"حلقۂ زنجیر کا گھبرا کے چونک اُٹھنا" کچھ ایسی بات ہے کہ جو سمجھے اسکو بھی مزہ آئے اور جو نہ سمجھے وہ بھی لُطف اُٹھائے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ یوں تو جگرؔ، اصغرؔ اور فانیؔ تینوں حضرات نے صحرا نوردی بھی کی اور زنداں کی ہوا بھی کھائی مگر فانیؔ صاحب اپنے دونوں رفیقوں سے اس باب میں ممتاز ہیں کہ اُن کی زندگی کا زیادہ حصہ پاگل خانے ہی میں گذرا اور ظنِ غالب یہ ہے کہ پاگل خانے ہی میں وفات بھی پائی۔ زنداں سے وہ کچھ اسدرجہ مانوس ہوگئے تھے یا یوں کہیے کہ پاس وضع کا انہیں کچھ ایسا خیال تھا کہ قید خانہ چھوڑ کر صحرا جانے کو کبھی تیار نہ ہوتے تھے ؎

بے مروت بن کے کیوں اب سوئے صحرا جایئے ؛ لپٹتے ہیں پاؤں پر حلقے مری زنجیر کے

دوسرے ارباب جنوں کی طرح پاگل خانے میں بھی آپ کا شغل گریباں دری جاری تھا ؎

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو ؛ گریباں نے گلے لپٹا لیا ہو بڑھ کے داماں کو

فصلِ بہار میں چونکہ جنون کا جوش زیادہ ہوتا ہے اسلیئے ایکدن فانی صاحب نے پاگل خانے کی دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لیا اور خون جو بہا تو اس میں انگلیاں بھگو کر زمین پر گل بوٹے بنانے شروع کر دیئے۔ خالی بیٹھے بیٹھے بھی انسان اکتا جاتا ہے آخر کچھ تو شغل چاہیئے ؎

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھول بنائے گئے ہی سہی ؛ موسمِ گل آگیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حضرات شعراء دیوانے ہونے کے بعد پہلے پاگل خانے تشریف لیجاتے ہیں اور اسکے بعد صحرا نوردی کیلیئے نکلتے ہیں اور کبھی پہلے صحرا گردی فرماتے ہیں اور اسکے بعد پاگل خانے میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ اور کبھی مکرر بھی قیدخانے کو نوازتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانی صاحب ایک مرتبہ سے زیادہ محبوس رہے تھے ؎

پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنوں ؛ صحرا کو نذر تنگیٔ زنداں کئے ہوئے

خاتمہ پر حضرتِ فانی کی صحرا نوردی کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے ؎

مرے تلووں سے کانٹوں پر نئی گلکاریاں ہونگی ؛ مری وحشت مبارک ہو جنونِ عیش ساماں کو

یہ صحبتیں بھی دیکھیئے لاتی ہیں رنگ کیا ؛ مہمانِ خار پاؤں کے چھالے ہوئے تو ہیں

معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا حسرت کی طرح فانی صاحب صحرا جاتے وقت جوتا ساتھ لیجانا بھول گئے تھے اور ناچار ننگے پاؤں گھومنا پڑا۔ آبلے پڑتے تھے تو پڑے تھے، اُن میں کانٹے بھی چُبھ کر رہ گئے۔ مضمون کا یہ حصہ ختم کرنیسے پہلے فانی صاحب کے تین شعر اور سن لیجئے۔ شعر لائے جنون زدہ کی یاد کچھ دنوں تو آپ کے دل میں تازہ رہے ؎

رکھ پنجۂ جنوں سے سر وکار آستیں ؛ کبتک رہینگے ہاتھ گرانبارِ آستیں

ہے ہے وہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں ؛ سر پیٹتا ہوں خانۂ زنجیر دیکھ کر

وحشتِ تازہ کا نوروز مبارک اے عشق ؛ پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عریانی دے

فانی صاحب کی فرزانگی سے ہمیں توقع ہے کہ اُنھوں نے باہمہ جوشِ جنوں حضرتِ عشق سے یہ خلعتِ عریانی قیامِ صحرا کے زمانہ ہی میں مانگا ہوگا کیونکہ شہروں میں تو ننگا پھرنا نہ صرف اخلاقاً معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ قانوناً بھی ممنوع ہے۔ جسطرح جناب جگر نے عالمِ دیوانگی میں رحلت فرمائی تھی اسی طرح حضرت فانی بھی جنون کی حالت میں رہگرائے عالمِ باقی ہوئے جسکی تفصیل ہم "جنازہ" کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس شعر کا دُہرا دینا کافی ہے ؎ فانی ؎

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں ؛ لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

عندلیب شادانی

جولیٹ

[ملک اطالیہ میں ورونا ایک خوشنما شہر ہے۔ وہاں کبھی دو بڑے امیر گھرانے تھے ایک کیپولٹ اور دوسرا مانٹیگو۔ ان میں ایک زمانے سے دشمنی چلی آتی تھی۔ یہ دشمنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ گھر والے ایک طرف نوکر چاکر تک آپس میں جانی دشمن ہو گئے تھے سو راستے کو نکلے ہیں ایک نے دوسرے کو دیکھا کہ تو تو میں میں ہونے لگی۔ کبھی لکڑی چلی۔ کبھی تلوار چلی۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا۔ کسی کا سر پھوٹا کوئی جان سے گیا۔ ان باتوں سے شہر کا سکھ چین اٹھ گیا تھا۔ ہر وقت بے اطمینانی چھائی رہتی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کیپولٹ گھرانے کے امیر کبیر نے اپنے والوں کی دعوت کی ابھی مہمان نہیں آئے۔ ایک جگہ گھر والی بیگم بیٹھی اپنی بیٹی کی ددا سے باتیں کر رہی ہیں۔]

بیگم دوا بی بی کہاں ہے؟ میرے پاس بلا۔

ددا۔ ابھی بلاتی ہوں

(آواز دیتے ہوئے جاتی ہے)

اجی مہرنی! اری قمری!.... اللہ کی امان!.... جانے یہ صاحبزادی کہاں ہیں!.... اجی جولیٹ!!۔

[جولیٹ اس وقت خانہ باغ میں بیٹھی ہے۔ پاس ایک ہرنی کھڑی ہے جسے اپنے ہاتھوں کچھ کھلا رہی ہے۔ گو اس لڑکی کی عمر نے ابھی چودہ بہاریں ہی دیکھی ہیں۔ مگر جس سرزمین میں پلی بڑھی۔ پروان چڑھی۔ وہاں کی آب و ہوا سے بڑی شاداب معلوم ہوتی ہے۔ بھولی بھولی۔ تندرست۔ جیسی من کی رانی۔ وفا کی دیوی! جونہی ددا کی آواز سنی۔ رنگین تیتری کی طرح تڑپ کے اٹھی اور مچلتی ہوئی آئی۔]

جولیٹ۔ کیا ہے ددا؟ کون بلاتا ہے؟۔

ددا۔ تمہاری امی۔

(جولیٹ اور ددا ساتھ ساتھ آتے ہیں)

جولیٹ۔ ماں کے پاس آ کے، جی امی، کہیئے؟۔

[بیگم پہلے تو ددا کو جانے کے لئے کہتی ہیں مگر پھر کچھ سوچکر روک لیتی ہیں۔ اور ان دونوں میں یہ باتیں ہونے لگتی ہیں کہ نام خدا بچی سیانی ہوئی۔ کھیلنے کھانے کے دن گئے، بیٹی میں باتیں ہوتی ہیں۔]

بیگم۔ جولیٹ! میاں پیرس سے تمہاری بات آئی ہے۔

ددا۔ ہے ہے بیگم، پیرس میاں تو لاکھوں کے آدمی ہیں!۔

بیگم۔ کیا کہا؟!.... ورونا کی بہار میں ایسا پھول نہیں!!

ددا۔ بس حضور وہ پھول ہی ہیں۔

بیگم۔ (جولیٹ سے) تو بیٹی! آج رات لڑکا ہمارے ہاں دعوت میں آئے گا۔ نیک ہے۔ سلجھا ہوا ہے۔ تم دیکھنا، حسن کی زبان میں اُس کے ماتھے شادمانی لکھی ہے

جولیٹ۔ جی۔

[دعوت میں کیپولٹ گھرانے کے بیسیوں مہمان آئے۔ ان میں خواتین کی سج دھج دیکھنے کی ہے۔ جیسے دیکھو رنگینیوں کا گلدستہ بنی ہوئی ہے۔ رات پر نغمے رقص بھی۔ سب نقابیں پہن کر ناچ میں مصروف ہوئے۔ جان منہ کی موج بن گئی۔ اس بزم میں قضارا مانٹیگو گھرانے کا ایک خوبصورت نوجوان —— رومیو بھی بھیس بدل کے آیا۔ ہاتھ پیر کا سیدھا، باذوق۔ جی دار جس کی زندگی کا ابھی کوئی مقصد نہ ہو جس کی روح میں ایک انہونی پیاس سی رہتی ہو یہاں آ کے کیا دیکھتا ہے کہ فطرت کی راڈلی —— جولیٹ پر چودھویں کے چاند کا سا نکھار ہے۔]

رومیو۔ (جولیٹ کی طرف اشارہ کر کے ایک نوکر سے) یہ کون ہیں؟؟

نوکر۔ جی معلوم نہیں۔

رومیو۔ (جولیٹ کو دیکھتے ہوئے) اللہ رے حسن! کہ نور شمع دوبالا ہو جائے!!.... معلوم ہوتا ہے کہ لیلائے شب ہیرے جگمگاتا آویزہ پہنے ہے۔.... حسن جو دنیا میں انمول ہو۔ اور جسے چھوا کہ مُوا!!

[رومیو انجانی میں ایک طرف کھڑا یہ کہہ رہا تھا کہ جولیٹ کے ممیرے بھائی —— ٹائی بالٹ نے اس کی آواز پہچان لی۔ سوچا یہ مانٹیگو ضرور ہماری بھد اڑانے یہاں آیا ہے۔ اور تلوار سونت کر اس سے لڑنے چلا۔ مگر جولیٹ کے والد کو اس کی خبر ہو گئی۔ تو انہوں نے ٹائی بالٹ کو روک لیا۔ اور کہا، اس وقت، لڑائی جھگڑا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی رومیو اچھا لڑکا ہے۔ وہ کسی کے بُرے میں نہیں۔ آ گیا ہے، تو آ جانے دو۔ یہ شرافت سے دور ہے کہ کوئی تو محبت سے اپنے ہاں آئے۔ اور ہم اُس کے ساتھ بُرا سلوک کریں۔ ماموں کے کہنے سننے سے ٹائی بالٹ خون کا سا گھونٹ پی کر چپکا تو ہو رہا۔ مگر مارے غصے کے وہاں نہ ٹھہرا۔ چلا گیا۔ سوچا کہ خیر آج نہیں تو کل رومیو سے سمجھ لونگا۔

یہاں آنے کا مزہ چکھاؤں گا۔]

میو۔ (نزدیک آکر، جولیٹ سے) حسن کے اس پاک مندر کو میرے نجس ہاتھ چھولیں !!۔

(یہاں ذرا کی ذرا رومیو منہ سے نقاب ہٹا دیتا ہے۔)

لٹ ۔ (رومیو کو دیکھتے ہوئے گھبرا کر) اے جاتری !! .....

میو۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) مندر میں دیبی کے لب بھی ہوتے ہیں جاتریوں کے بھی ہوتے ہیں ؟!

لٹ ۔ ہوتے ہیں جاتری! مگر ان سے سمرن جپنی چاہیئے !!

میو۔ بس تو اے دیبی ! یہ ہاتھ اور لب تیرے حضور دعا جپتے ہیں۔ انہیں قبول فرما کہ ہو کہ میری آس یاس بن جائے !!

(یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ددا آجاتی ہے)

دا ۔ (جولیٹ سے) بی بی ! تمہیں امی بلا رہی ہیں۔

(جولیٹ چلی جاتی ہے)

میو۔ (ددا سے) ان کی امی کون ہیں ؟۔

دا ۔ کون ہیں کی بھی ایک رہی۔ اے گھر کی بیگم۔ نیک بخت۔ پاکدامن۔ ان کی بچی کی ددا ہوں جس سے تم باتیں کر رہے تھے۔ میاں! اس سے جو بیاہ کریگا، نہال ہو جائیگا۔

میو۔ (اپنے میں آپ) ... کپولٹ کی بیٹی !!! ..... اپنی زندگی میں نے دل کو سونپ دی !!۔

[ناچ ختم ہوتا ہے۔ سب مہمان جانے لگتے ہیں تو ایک طرف ٹ بھی آکھڑی ہوتی ہے۔]

لٹ ۔ ددا! ذرا یہاں آنا۔ دیکھنا وہ صاحب کون ہیں ؟۔

دا ۔ بیٹی! ٹائبرد کے صاحبزادے ہیں۔

لٹ ۔ اور وہ جو دروازے میں سے جا رہے ہیں ؟

دا ۔ میاں پیٹرد شو ہیں۔

لٹ ۔ اچھا وہ جو پیچھے آرہے ہیں۔ ناچے بھی نہیں !

دا ۔ معلوم نہیں۔

لٹ ۔ اچھی ددا جاؤ۔ ان کا نام پوچھ لو۔

(ددا جاکر نام پوچھ آتی ہے۔)

دا ۔ وہ تو مانٹگو گھرانے کا لڑکا ہے ! ..... رومیو !! ... تمہارے ... ی دشمن کا اکلوتا بیٹا !!!

لٹ ۔ (گھبرا کر اپنے آپ) ہائے چاہت بھی ہوئی تو اس ظالم سے ... کے گھرانے سے نفرت ہے۔ ..... (رنجیدہ) جولیٹ ! تو نے اندھیر

کیوں دیکھا۔ پہلے کیوں نہ معلوم کر لیا کہ کون ہیں۔ آہ! اب وقت نکل گیا .. نصیب ایک بیری سے پیار کرا تا ہے !!

ددا ۔ ہائیں بیٹی !! کیا کہہ رہی ہو !

جولٹ ۔ کچھ نہیں ددا ناچ میں گیت سُنا تھا۔ یاد آگیا۔

(کوئی اندر سے آواز دیتا ہے، جولٹ !)

ددا ۔ جی آئے ....

(جولٹ سے) چلو بیٹی ! دیکھی نہیں، سب مہمان چلے گئے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

[جولٹ کی محلسرا۔ خانہ باغ۔ آدھی رات گذر گئی۔ کچھ کچھ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ رومیو چھپ کر باغ میں آتا ہے۔ جہاں تھوڑی دیر میں پہلے تو جھروکے میں روشنی نظر آتی ہے، پھر جولٹ آتی ہے۔ گویا اُفق مشرق سے سُورج نکلا۔ جس نے چاند کو شرما دیا۔ اس لڑکی کی آنکھیں دو دہتے تارے ہیں۔ عارض ایسے ہیں جیسے ایک ہی وقت میں چاندنی بھی کھلی ہو۔ شفق بھی پھولی ہو۔ اپنے ہاتھ پر رُخسار کو سہارا دیتی ہے۔ اور سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ پھر ایک آہِ سرد بھر کر اپنے آپ باتیں کرنے لگتی ہے]

جُولٹ ۔ ہائے اللہ، میں کیا کروں !

رومیو ۔ (جولٹ کو دیکھ کر دبی زبان میں کہ جولٹ نہ سُنے) بول، آسمان کی حور! بول !!

جُولٹ (اپنے میں آپ) ۔ رومیو ! رومیو ! تم رومیو کیوں ہو !!۔ ... کہدو، رومیو نہیں ہوں۔ مانٹگو نہیں ہوں ! .... اچھا ! تم یہ کہنا نہیں چاہتے تو مجھے نباہ کا قول دو۔ میں کپولٹ نہیں رہوں گی !۔ ... بس یہ تمہارا نام بُرا ہے۔ نہیں، میں چوکی۔ تم مانٹگو کب ہو ؟ تم تو تم ہو !! ...... ویسے بھی تو یہ مانٹگو بھلا کیا شے ہے ؟ نہ ہاتھ۔ نہ پیر۔ نہ آنکھ۔ نہ ناک ـــــــ کوئی حصۂ جسم نہیں ! اسے بدل ڈالو۔ نام میں دھرا ہی کیا ہے ؟ گلاب کو گلاب نہ کہا۔ کچھ اور کہا۔ تب بھی وہ اپنی خوشبو دیگا پر دیگا۔ اسی طرح رومیو کو بھی رومیو نہ پکارا تو تم اتنے ہی پیارے رہو گے۔ جتنے اب ہو۔ بس تو رومیو ! اپنا نام بدلدو۔ اس کے بدلے مجھے لے لو !! .....

رومیو ۔ (بے اختیار بول اٹھتا ہے) نہیں نہیں میں رومیو نہیں رہا۔ مجھے اب اپنا پریمی پکارو !۔

جولٹ ۔ (چونک سی پڑتی ہے) آپ کون ہیں ؟؟!!

رومیو ۔ کیونکر بتاؤں، کون ہوں ؟ نام لے نہیں سکتا۔ کیونکہ خود اپنے نام سے اب مجھے نفرت ہو گئی کہ تمہارا بیری ہے۔ کاش یہ لکھا ہوا

لفظ ہوتا تو میں اس کے پرزے پرزے کر ڈالتا۔

جولیٹ:۔ (دل ہی دل میں) یہ آواز تو میں نے زیادہ نہیں سنی۔ پر جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔ (رومیو سے) آپ رومیو ہیں؟...... مانٹیگو؟؟......

رومیو:۔ یہ نام تمہیں پسند نہیں ہیں۔ میں ان میں سے ایک بھی نہیں!

جولیٹ:۔ (گھبرا کر) آپ یہاں کیسے آگئے؟ کہئے تو کیونکر آ گئے؟؟ باغ کی دیواریں اونچی اونچی ہیں۔ ان پر چڑھنا آسان نہیں۔ جگہ بھی خطرے کی ہے۔ میرے لوگوں نے آپ کو دیکھ پایا تو بڑے جوکھم کی بات ہے۔

رومیو:۔ محبت کو سنگین دیواریں نہیں روک سکتیں۔ یہ جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ اسی کے سبک پروں سے میں ان دیواروں پر سے اُڑ آیا۔

جولیٹ:۔ مگر وہ لوگ آپ کو یہاں دیکھ لیں گے تو خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔

رومیو:۔ رہنے بھی دیجئے۔ پہلے اپنی آنکھوں کی تو خبر لیجئے۔ جان لیوا یہ ہیں۔ ہلاہل ان میں ہے۔

جولیٹ:۔ نہیں نہیں۔ آپ چلے جائیے۔ وہ آپ کو دیکھ لیں گے۔

رومیو:۔ گھبراؤ نہیں۔ نقابِ شب مجھے چھپائے رہے گی!

جولیٹ:۔ آخر آپ کو یہ جگہ کس نے بتا دی؟

رومیو:۔ محبت نے!

[جولیٹ جو مارے لحاظ کے عرق عرق ہو جاتی ہے۔ دل ہی دل میں کہتی ہے کہ اچھا ہوا کہ رات ہے۔ جس نے میری شرم و لحاظ کی لاج رکھ لی۔ ورنہ بڑی مشکل آ بنتی۔]

جولیٹ:۔ (لجاتے ہوئے) اچھا میں اگر یہ پوچھوں۔ آپ مجھے چاہتے ہیں؟ تو آپ شاید "ہاں" کہیں گے؟؟...... خیر آمنّا! مگر آپ مرد ہیں! مردوں کا پیمانِ وفا کچا دھاگہ ہوتا ہے! سنتی ہوں اس پر عشق کا دیوتا بھی ہنستا ہے!!! اچھی دنیا دکھا دے کی تو کہئے گا نہیں۔ مجھے سچ سچ بتا دیجئے!..... مگر ہاں! شاید میری ان باتوں سے آپ خیال کریں! میں کیسی خراب لڑکی ہوں، جو ایک دن کی ملاقات میں اتنی بے لحاظ ہو گئی۔ تو یہ میں مانے لیتی ہوں۔ مگر اللہ جانے مجبور دل نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اب آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔ میں سیدھی سادی لڑکی ہوں۔ مجھے اینچ پینچ نہیں آتا..... دل میں چور تھا، یوں زبان پر آ گیا۔ اور انجانی میں نہ جانے کیا کہا۔ جسے آپ نے بھی سن لیا۔ وہ تو خیر گذری کہ آپ بول اٹھے۔ ورنہ خدا معلوم اور کیا کیا کہہ جاتی......

آپ مجھے معاف کر دیں!!

رومیو:۔ میرے من کی ملکہ! اس چاند کی قسم جس کی روپہلی کرنیں ان پھل پھول والے درختوں کی چوٹیوں کو چھو رہی ہیں.....

جولیٹ:۔ اے ہے، چاند کی قسم تو نہ کھائیے۔ موا بھولا مسافر آج ہے کل نہیں۔ سارے مہینے میں ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ نہ ہو کہ آپ کی چاہت بھی ایسی ہو جائے۔

رومیو:۔ پھر کس کی قسم کھاؤں؟

جولیٹ:۔ قسم کی کیا ضرورت!..... اور کھانی ہے تو اپنی قسم کھائیے کہ آپ میرے دیوتا ہیں مجھے یقین آ جائیگا۔

رومیو:۔ اگر میری.......

جولیٹ:۔ (قطع کلام کرکے) نہیں نہیں، کوئی قسم نہ کھائیے۔ رات کی بات کا کیا بھروسہ!...... ویسے بھی یہ باتیں کچھ ایسی اچانک ہوئیں، جیسے بجلی کی چمک۔ چمکی نہ چمکی کہ آنکھوں سے اوجھل بھی ہو گئی۔.. مگر اب آپ جائیے۔ خدا حافظ! جب ہم پھر ملیں تو خدا کرے پیار کی یہ کلی کھلکر پھول بن جائے!...... اچھا، خدا حافظ!....... مولا میرے! مجھ سا سُہانا چین ان کے بے قرار دل کو بھی دیدے!!

(جانے لگتی ہے۔)

رومیو:۔ جولیٹ! مجھے کانٹوں ہی پر تڑپتا چھوڑ چلیں؟

جولیٹ:۔ کیوں؟

رومیو:۔ تم بھی تو وفا کا عہد کرو؟!

جولیٹ:۔ واہ! میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی قول دے چکی!..... اچھے رومیو! یہ دل سمندر ہے۔ اس سے جتنی الفت لوگے۔ اتنی ہی بڑھیگی

(دوا اندر سے آواز دیتی ہے، جولیٹ!)

جولیٹ:۔ مجھے اندر بلا رہی ہیں۔ جاؤ۔ اللہ نگہبان...... دوا اماں! ابھی آئی..... رومیو! بھولنا نہیں! (جاتے جاتے لوٹ کر) اچھا ذرا ٹھیرو میں پھر آتی ہوں۔

(چلی جاتی ہے۔)

رومیو:۔ اے مبارک رات! یہ ساری باتیں کہیں سہانا خواب تو نہیں!!

(اتنے میں جولیٹ پھر آتی ہے۔)

جولیٹ:۔ اچھے مانٹیگو! ایک بات اور کہنی ہے۔ شادی کی تاریخ.....

دوا:۔ (اندر سے) بی بی!

جولیٹ:۔ آئی دوا، ابھی آئی۔ (رومیو سے جلدی جلدی) آپ یہ نہیں چاہتے تو میری التجا ہے......

ودا ۔ (اندر سے) بی بی۔

لٹ ۔ آتو رہی ہوں، ودا! (رومیو سے) آپ مجھے بھول جائیں
یر جیسی بے گی سہہ لوں گی۔ . . . . بس تو کل، آدمی بھیجوں گی۔ جو
ا ہو کہلا بھیجنا۔

ومیو ۔ کاش کہ تم میری ہو جاؤ۔ اور میری آتما پھولے نہ سمائے!

لٹ ۔ (جاتے ہوئے) خدا حافظ! ہزار ہزار بار خدا حافظ!!

[جولٹ جھروکے میں سے اندر چلی جاتی ہے۔ رومیو بھی واپس جانے لگتا ہے بلکہ خاصی دور آجاتا ہے کہ جولٹ پھر جھروکے میں آتی ہے۔]

لٹ ۔ (دبی آواز میں) سنتے نہیں، رومیو! سنو تو!!

ومیو ۔ (اچھتی ہوئی آواز سنکر) میری روح میرا نام لیکر پکارتی ہے!! . . . . نقرئی گھنٹیوں کی آواز! رسیا کانوں کے لئے کومل روں کی چھیڑ!!

(رومیو واپس آتا ہے)

لٹ ۔ رومیو!

ومیو ۔ پری!

لٹ ۔ تو کل کب آدمی بھیجوں؟

ومیو ۔ نو بجے۔

لٹ ۔ اچھا! . . . . مگر، لیجئے! میں بھول ہی گئی۔ جانے آپ کو ں پھر بلایا تھا۔

ومیو ۔ (مسکراتے ہوئے) میں ٹھیرا رہتا ہوں۔ یاد کرلو

لٹ ۔ (نیچی نظروں) واہ! آپ کے ہوتے میں سب کچھ بھول جاتی ں! . . . . ادھر! پو پھوٹنے لگی۔ صبح ہورہی ہے۔ بس اب جائیے۔ احافظ! اللہ نگہبان۔ ورنہ غم فرقت میں تو وہ چاشنی ہے کہ میں صبح ے تک یونہی رخصت ہوتی رہوں گی!۔

[جولٹ چلی جاتی ہے۔ رومیو بھی خانہ باغ سے نکلا۔ تو خیال ہوا۔ وحانی پیشوا کے پاس چلنا چاہیئے۔ اس آڑے وقت میں وہی کوئی نیک ملاح دیں گے۔ پیشوا کا نام لارنس ہے۔ جو ایک گوشہ نشین بزرگ ہیں۔ ح سویرے بیدار ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں ایک چنگیر لئے ہیں۔]

رنس ۔ صبح، بھوری بھوری آنکھوں والی دیبی رات پر مسکرانے ہے۔ مشرق کی سمت بادل نور کی کرنوں سے گنگا جمنی بن رہی ہیں۔ اندھیرا بے خرابا تی کی طرح بدھارتا ہے۔ دن کا رستہ صاف ہو رہا ہے کہ ورج کی سواری آتی ہے۔ دن نکلے گا اور کی کلی کھلے گی۔ رات کی اداسی دور ہوگی۔ لاؤ میں بھی چنگیر پھولوں سے بھر لوں۔ جس میں کوئی تریاق ہوگا۔ کوئی سم ہوگا۔ زمین فطرت کے ان دلاروں کی ماں ہے۔ اس کے گود وں بھانت بھانت کے لاڈلے پھولتے پھلتے ہیں۔ مرجھا بھی جاتے ہیں۔ اس جڑی بوٹی میں بڑے بڑے خواص ہیں مگر دنیا کی کوئی شے بری نہیں۔ اس میں ایک نہ ایک بھلائی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان بری بنالے۔ موقع سے برائی بھلائی ہے۔ بے موقع بھلائی بھی برائی بن جاتی ہے۔ اس ننھے منے پھول کے معصوم خول میں زہر بھی ہے امرت بھی ہے۔ سونگھو تو جان تازہ ہوجائے کھاؤ تو گزر جانے پھل پھول ہو یا انسان ہو ان میں بھلائی برائی کے دو کارفرما ہوتے ہیں۔ لیکن جب برائی چھاونی چھالے تو سمجھو موت کا گھن لگ گیا۔

[اتنے میں رومیو بھی آگیا۔ لارنس نے دعائیں دیں باتوں باتوں میں رومیو نے اپنا ماجرا لارنس کو سناکر کہا "بابا! میرے دکھ کا مداوا تمہارے ہاتھ ہے جان جس ظالم کو سونپ رہا ہوں۔ وہ کیپولٹ کی بیٹی ہے۔ جولٹ نام ہے۔ گو ہمارے خاندان آپس میں جانی دشمن ہیں۔ مگر ہم دونوں بیاہ پر راضی ہیں اب آپ کے دو بول شامل حال ہوجائیں۔ تو ہم ایک ہوجائیں"۔ لارنس سوچتا ہے "شاید خدا کو یہی منظور ہو کہ ان دونوں کے سنجوگ سے ان کے خاندان بھی ایک ہوجائیں" اس لئے مخفی طور پر انکے عقد پر راضی ہوجاتا ہے۔ رومیو کو بڑی جلدی ہے۔ چاہتا ہے کل کا ہوتا کاج آج ہوجائے اور جولٹ کو بیاہ لائے۔ مگر لارنس سمجھاتا ہے "رومیو! جلدی کا کام اچھا نہیں! بیٹا، دنیا میں دوڑ چلو، نہ پیر پھسلے!!"۔ یہ باتیں کرکے رومیو گھر آیا۔ تو دیکھا محلہ میں دوست احباب کھڑے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور ٹائبالٹ نے رومیو کے بھیس بدل کے دعوت میں آنے پر جو خط رومیو کے والد کو لکھا ہے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہیں رومیو بھی آجاتا ہے۔ سب ہنسنے بولنے لگتے ہیں۔ قریب نو بجے جولٹ کی ددا آتی ہے۔ رومیو کے ساتھی اس کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ ددا رومیو کو دریافت کرتی ہے۔ رومیو آپ اپنا تعارف کرتا ہے۔ دونوں الگ جاکر کچھ باتیں کرتے ہیں۔ ددا چلی جاتی ہے۔]

جولٹ ۔ (اپنے خانہ باغ میں) نو بجے سے پہلے ددا گئی تھیں۔ کہتی تھیں، آدھ گھنٹے میں آجاؤں گی۔ معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ملے . . . . مگر یہ بات نہیں۔ ددا بوڑھی بھی تو ہیں . . . . محبت کا پیامی خیال ہوتا ہے۔ جو سورج کی کرنوں سے بھی دس گنا تیز خرام ہے! . . . . ادھر! سورج سب سے اونچی پہاڑی پر آگیا۔ نو سے بارہ تک تین پہاڑ سے گھنٹے گزر گئے، مگر ددا کا پتہ نہیں۔ کاش ان کے لہو میں جوانی کی گرمائی

ہوتی۔ تم نہیں اُلفت کا مزہ یاد ہوتا۔ تو طرارے بھرتی آتیں! ......
میرے اُن کے پیام سلام ہیں دوا خوب ہچکولے کھا رہی ہیں۔ بڑھیا ہی تو ہیں۔ بچاری نیم جان۔ ہائے! (لپٹنے میں دوا کو آتا دیکھکر) اللہ تیرا شکر کہ آگئیں!!

(دوا آتی ہے۔)

جولٹ:۔ پیاری دوا! کیا خبر لائیں؟ وہ ملے؟؟ ...... بولو چپ چپ کیوں ہو؟!! اچھی بری جو کچھ ہو، ہنستی ہنسی سناؤ۔ خوش خبری ہو تو تمہارے اس اداس چہرے پر بھی زیب جائیگی

دوا:۔ اسے میں تھک کر چکنا چور ہو گئی۔ مجھے تھوڑی دیر یونہی رہنے دو...... ارے رے رے! درد کے مارے میری ہڈیاں کٹے جا رہی ہیں!! تھوڑا پھرا پڑا ہے!

جولٹ:۔ کاش تم میں اور میں تم ہوتی! اور اُن کا سندیسہ لاتی!!

(جولٹ دوا کو ایک طرف لیکر بیٹھ جاتی ہے۔)

لو آؤ، اب کہو۔ اچھی دوا! بولو؟

دوا:۔ اے میرے اللہ! اتنی کیا جلدی ہے تھوڑی دیر کا بھی صبر نہیں۔ دیکھتی نہیں ہو۔ میرا سانس تو سماتا نہیں۔ کیا خاک بولوں!

جولٹ:۔ (اداس) سانس پھولے پر بھی تو آخر باتیں کر ہی رہی ہو؟! .... اچھی زبردستی ہے...... کہہ چکو اچھی بری جو بھی سناؤ۔ میں قسمت پر شاکر رہوں گی۔

دوا:۔ (سنجیدگی سے) ہاں! تو سنو، لڑکا اچھا ہے۔ آنکھ ناک خاصی ہے ہاتھ پیر بھی چوکھے ہیں۔ خلق و محبت کا گلدستہ نہ سہی۔ بھلا مانس ضرور ہے! بس جاؤ اب مزے کرو!..... جولٹ! تم نے کھانا کھا لیا؟!!

جولٹ:۔ (اضطرابی سے) نہیں نہیں یہ ساری باتیں میں پہلے ہی جانتی ہوں۔ یہ بتاؤ، بیاہ کے بارے میں انہوں نے کیا کہا؟

دوا:۔ ہائے میرا درد سر! کیسا درد سا ہے!! تڑخنے جاتا ہے، جیسے ٹکڑے ہو جائے گا...... اُف! میری کمر!! (درد کا بہانہ کرتی ہے۔) اللہ میری کمر! میری کمر!......

(جولٹ جلدی جلدی دوا کی کمر دبانے لگتی ہے۔)

دوا:۔ (سنجیدگی سے) دیکھو جی! اب اپنے پیام سلام چھپر پر رکھو۔ مارے مارے پھرنے سے میری جان نکل جاتی ہے!

جولٹ:۔ دوا! یقین مانو مجھے بڑا دکھ ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی۔ تم نڈھال ہو گئیں...... (خوشامدانہ) مگر پیاری پیاری دوا بولو۔ انہوں نے کیا کہا؟

دوا:۔ وہ کہتے ہیں...... جیسے ایک بھلا مانس کہتا ہے...... ہاں ہاں بھلا مانس!! ...... تمہاری امی کہاں ہیں؟!! ......

جولٹ:۔ (حیرانی سے) امی کہاں ہیں؟؟!! ...... اندر ہیں۔ اور کہاں ہیں!! ... کہاں جائینگی؟؟!! ...... (خفا سی ہو کر) واہ واہ دوا تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ ... کیا خوب!! ..... بھئی ہو! وہ کہتے ہیں۔ بھلے مانس کی طرح ..... تمہاری امی کہاں ہیں؟!!

(جولٹ روٹھ کر ایک طرف بیٹھ جاتی ہے۔)

دوا:۔ (کن انکھیوں سے جولٹ کو دیکھکر بے تحاشہ ہنس دیتی ہے۔)
ہاں!! اب اشتیاق بڑھا؟!! ...... (جولٹ کو مناتے ہوئے۔) اچھا لو آؤ، سنو۔

(جولٹ ہنستی ہوئی آکر دوا کو لپٹ جاتی ہے۔)

دوا:۔ کیوں جی! میرے پیر توڑنے کا یہ بدلہ ہے کہ مجھ سے روٹھ بیٹھی ہو؟ اچھا تو جاؤ، اب سے خود ہی پیام سلام کر لینا۔

جولٹ:۔ (خوشامد سے) نہیں دوا! مجھے کیا معلوم! تم چھیڑ خانی کر رہی تھیں...... (بے تابی سے) لو اب سناؤ

دوا:۔ تم نے آج گرجا جانے کی پروانگی لے لی؟

جولٹ:۔ ہاں لے لی

دوا:۔ تو جاؤ۔ لارنس بابا کے پاس جلدی چلی جاؤ۔ وہیں میری ہریالی آج بنی بنے گی..... (جولٹ کو شرماتا دیکھکر) لے لو اب شرم آگئی۔ گورے گورے گالوں پر لہو کی سرخی دوڑ گئی!...... (جولٹ کو ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے) اچھی اٹھو، جلدی گرجا جاؤ....

جولٹ:۔ میری دوا!!

(دوا کو لپٹ کر چلی جاتی ہے۔)

[اس وقت تک رومیو بھی لارنس بابا کے پاس پہونچ گیا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں کر رہے ہیں۔]

لارنس:۔ خداوندا! تیرے آسمان اس پاک سنجوگ پر کچھ ایسے تبسم ہوں کہ زمانہ پھر ہمیں غم کی صورت نہ دکھائے!

رومیو:۔ آمین آمین!...... لیکن غم بھی آسکتا ہے تو آئے۔ یہ اس شادمانی کو ماند نہیں کر سکتا جو جولٹ کے ہوتے مجھے نصیب ہوتی ہے۔ بابا! آپ دو پاک بولوں سے ہمارا پلہ باندھ دیجیے۔ پھر پریم کی بیرن، موت بھی آجاتے تو ہرج نہیں۔ یہی کیا کافی ہے کہ اس نیک بخت کو میں اپنا کہہ لوں!

لارنس:۔ نا بیٹا! ایسا نہیں کہتے...... طوفانی خوشیوں کا انجام

بھی طوفانی ہوتا ہے انہیں آگ اور بارود سمجھو کہ ادھر ملیں اُدھر بھک سے ہو گئیں۔ یاد رکھو، شہد جتنا میٹھا ہوگا اتنی ہی تلخی لئے ہوگا۔ اور بھوک مار دے گا۔ اسی لئے طوفانی محبت بھی بُری۔ یہ تو دل کی دھیمی آنچ پر اکسیر بنتی ہے۔ دیکھو، بیٹا! میں پہلے ہی کہہ چکا۔ دوڑ چلو۔ نہ پیر پھسلے۔

[اتنے میں جولیٹ بھی آ گئی۔ جس سے رومیو ہنسی خوشی باتیں کرنے لگا۔ لیکن لارنس نے یہ کہہ کر روک دیا۔ آؤ آؤ، تم دونوں میرے پاس آؤ۔ اب دیر نہ ہونی چاہیئے۔ جوان بیٹے بیٹیوں کی خلا ملا اسوقت تک ٹھیک نہیں، جب تک وہ اللہ رسول کے حکم سے ایک نہ ہو جائیں ...۔ خیر تو ادھر لارنس نے ان دونوں کا عقد کیا۔ اُدھر محلہ میں رومیو کے دوست بن وولیو اور مرکوشیو سے جولیٹ کا چیرا بھائی ٹائی بالٹ آ کر ملا۔ یہ اصل میں رومیو سے بن بلائے دعوت میں آنے کا بدلہ لینے آیا ہے۔ ٹائی بالٹ، رومیو کو دریافت کرتا ہے۔ مرکوشیو اُلٹے سیدھے جواب دیتا ہے۔ دلوں میں خاندانی بیر ہے۔ اس لئے گرم گرم تارزی ہونے لگتی ہے۔ اس اثنا میں رومیو آ جاتا ہے۔ اب ٹائی بالٹ بجائے مرکوشیو کے رومیو سے اُلجھتا اور اُسے پاجی تک کہہ دیتا ہے۔ لیکن رومیو خیال کرتا ہے کہ جولیٹ سے رشتہ ہو گیا۔ اب ٹائی بالٹ سے کیا لڑوں۔ اس لئے اُس کی باتیں سہہ لیتا ہے۔ مگر مرکوشیو کے آگ لگ جاتی ہے ٹائی بالٹ اور اس کے ساتھی بہت خوش ہیں کہ رومیو ڈر گیا۔ اور جانے لگتے ہیں۔ مگر مرکوشیو بگڑ کر ٹائی بالٹ کو آواز دیتا ہے۔ تلواریں بے نیام ہوتی ہیں۔ اور لڑائی ہونے لگتی ہے۔ رومیو بہتیرا روکتا ہے۔ مگر مرکوشیو نہیں مانتا۔ بپھرا شیر بنا ہوا ہے۔ تا آنکہ رومیو آگے بڑھ کے بیچ بچاؤ کراتا ہے، اور مرکوشیو کو ہاتھ سے ہٹانا چاہتا ہے کہ ٹائی بالٹ موقع پا کر مرکوشیو پر کاری وار کر دیتا ہے، جو تھوڑی دیر میں مر جاتا ہے۔ اس حادثہ سے رومیو بے آپے ہو جاتا ہے۔ غم و غصہ سے تلوار لیکر بھاگتا ہوا ٹائی بالٹ کے پاس جاتا اور کڑک کر کہتا ہے ٹائی بالٹ! آ، اب اس کا فیصلہ کر لیں کہ پاجی کون ہے؟ تو یا میں؟ مرکوشیو کی رُوح ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ اور میری یا تیری یا دونوں کی منتظر ہے۔ اس لئے دُنیا کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ یہ سُنکر ٹائی بالٹ بھی تیز ہوتا ہے۔ اور دونوں میں تلوار چلتی ہے۔ مگر لڑائی میں ٹائی بالٹ مارا جاتا ہے۔ رومیو کا جگری دوست بن وولیو جو رومیو کو بھاگتا ہوا دیکھ کر ساتھ آ گیا تھا۔ یہ ماجرا دیکھتا اور رومیو کو ترکیب سے فرار کر دیتا ہے۔ اور خود وہیں رُک جاتا ہے۔ اس لڑائی اور قتل کی خبر آناً فاناً میں چو طرف پھیل جاتی ہے۔ رستہ پر شہریوں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر میں بادشاہ سلامت بھی آتے ہیں۔ دریافت حال پر بن وولیو سارا قصہ سچ سچ بتا دیتا ہے۔ بادشاہ سوچتا ہے کہ ٹائی بالٹ نے مرکوشیو کو جان سے مارا تھا۔ جو شاہی خاندان کا رکن تھا۔ اس لئے اسے موت کی ہی سزا دی جاتی مگر چونکہ رومیو نے اُسے مار ڈالا۔ جو بجائے خود اک جرم ہے۔ اس لئے رومیو کو جلاوطن کر دیا۔ اور دونوں فسادیوں پر سخت جرمانے کئے۔ اِدھر یہ حادثے ہو رہے ہیں اُدھر جولیٹ ان باتوں سے بے خبر خانہ باغ میں اپنے آپ باتیں کرتی مگن بیٹھی ہے۔]

جولیٹ:۔ سُورج داتا! سدھارو! جلدی اپنی سواری بڑھاؤ۔ آج تمہارے قدم کیوں جم گئے۔ ایک گھٹاٹوپ رات کی اندھیری ڈالدو کہ پیت کی ریت ہو جائے۔ اور وہ آئیں تو کوئی اُنہیں دیکھ نہ پائے۔ اے سیاہ ابروؤں والی پیاری رات! جلدی آ جا! اور اپنے ساتھ اُنہیں بھی لا جو میرے من کا اُجالا ہیں! ...... اور ہاں دیکھ، دُنیا آنی جانی ہے۔ فانی ہے۔ اے رات! جب بھی اللہ کو پیارے ہوں، تو اُن کے ذرات کو جگمگاتے تارے بنا دینا کہ آکاش کھل اٹھے جائے! اور ساری دُنیا تجھے ہی عزیز رکھے۔ دہکتے سورج کو کوئی نہ پوچھے ...... ہائے! میں نے بک کر تو پریم محل خریدا۔ مگر میرے قبضے میں نہیں۔ مجھے اس سے آرام نہیں .... دن کیسا اجیرن ہو گیا! ...... مجھے رات کا ایسا انتظار ہے۔ جیسے تہوار کے پہلے رات میں ایک بے تاب بچہ نئے نئے کپڑے دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے۔ مگر انہیں پہن نہیں سکتا! ..... لے لو، دَدا آ رہی ہیں ضرور کوئی خوشخبری لائی ہیں۔ ایک دَدا کیا جو بھی میرے ساجن کا نام لیتا ہے۔ سمجھو مُنہ سے بہشتی پھول برساتا ہے!!

(دَدا آتی ہے۔ سراسیمہ۔ کفِ افسوس ملتی ہوئی۔)

جولیٹ:۔ کیوں دَدا! خیر تو ہے؟ یوں ہاتھ کیوں مل رہی ہو؟

دَدا:۔ ارے غضب ہو گیا۔ وہ مر گیا۔ فنا ہو گیا! ہم کہیں کے نہ رہے۔ برباد ہو گئے!

جولیٹ:۔ ہائیں!! کیا فلک نے کوئی نیا گُل کھلا دیا؟!

دَدا:۔ فلک نے نہیں تمہارے دولھا نے! ..... ارے رومیو! رومیو! کسی کو اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ رومیو!! .....

جولیٹ:۔ دَدا! تمہیں ہو کیا گیا ہے؟؟ کیوں تم مجھے کانٹوں پر کھینچ رہی ہو۔ بتاؤ تو سہی۔ آخر کیا ہوا؟ تم نہیں جانتیں یہ دُکھ مجھے دوزخ کے برابر ہے!

دَدا:۔ میں نے زخم دیکھا۔ خُدایا تیری پناہ! اپنی آنکھوں میں نے اُس کے

چھاتی پر زخم دیکھا ہے۔ لاش خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ چہرہ سفید گویا دھوبا ہوا کپڑا ـــــ یہ دیکھ کر میرے تو اوسان جاتے رہے۔ مجھے غش آگیا۔

جولیٹ :- شق ہوجا۔ اے دل مفلس، دوا یہ۔ شق ہوجا۔ آنکھوں بے نور ہوجاؤ کہ پھر کبھی سکھ چین کا منہ نہ دیکھو۔ جسم! تو بھی مٹی کے سپرد ہو کر اب آرزو اور ارمان ملیا میٹ ہوگئے۔

دوا :- ہائے! ٹائی بالٹ! ٹائی بالٹ!! محبت دار۔ ملنسار۔ بھلے مانس! کیا میں تیری موت دیکھنے کے لئے ہی اب تک زندہ رہی تھی۔

جولیٹ :- ہیں! یہ کیسی دوہائی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ رومیو نے نہیں قتل کر ڈالا! یا ٹائی بالٹ بھیا مر گئے! آخر ہوا کیا؟! اگر وہ دونوں مر رہے، تو پھر دنیا میں رہا کون! صور کیوں نہیں پھونک جاتا!!

دوا :- تمہارے دولہا نے تمہارے بھائی کو مار ڈالا۔ اور خود جلاوطن ہوگئے۔

جولیٹ :- غضب ہوا! ٹائی بالٹ بھائی کا خون ان کے ہاتھوں ہوا ـــ!

دوا :- ہاں یہی تو ہوا۔ اس گھڑی جھلسا لگ جاتے۔ ایسا ہی ہوا!!

جولیٹ :- (ایک دم بپھر کر) رومیو! او پھولوں کے ڈھیر!! تجھ میں ناگ چھپا تھا!!! ایسے سندر ڈھیر میں بھی سانپ ہوتے ہیں؟؟ ـــ خوبصورت ظالم! فرشتہ رو قاتل!! قمری کی صورت شکرے!!! بھیڑ کی صورت بھیڑیے!!!! .... اور زیادہ بگڑ کر) ایزد کی سروپ کے بھونڈے نمونے! جو تم دکھائی دیتے ہو، وہ نہیں! نہ جانے قدرت اُس وقت کون سے ہاتھی کام کی دیکھ بھال میں تھی جو ایسی دلفریب گوشت پوست دل فانی بہشت میں تم بس گئے!! رومیو ایک دلفریب لفافہ ہے۔ جس میں بدی کا نقش بند ہو! ..... اف! ایسے سجیلے ایوان عناصر میں یہ دغا، یہ فریب رہے!!

دوا :- اس دنیا میں بھلا کس پر بھروسہ کیا جائے۔ جسے دیکھو جھوٹا مکار! ..... ارے کوئی ہے! ..... (نوکر سے) لا میرے پینے کا امرت جل تو لے آ! یہ دکھ۔ یہ غم۔ مجھے مروڑے ڈالتے ہیں ..... خدا رومیو کو شرمائے! .....

جولیٹ :- (چونک سی پڑتی ہے) دوا! تمہاری زبان کٹے۔ انہیں ایسا کیوں کہتی ہو؟ تم کیا جانو؛ شرمندہ ہونے کو وہ پیدا ہی نہیں ہوئے۔ شرمساری تو ان کے ابرو پر آتے شرماتی ہے۔ وہ تنہا سریر ناموس ہیں۔ میں بھی عجیب ہوں کہ حق ناحق کو میں نے انہیں برا بھلا کہدیا!

دوا :- بیٹی! انہوں نے تو تمہارے چیرے بھائی کو مار ڈالا اب بھی تم انہیں کی گائے جاتی ہو؟

جولیٹ :- کیوں نہ گاؤں۔ کیا اپنے سرتاج کو برا کہوں؟ بیاہ کو تین گھنٹے ہوئے کہ میں نے انہیں اتنا برا بھلا کہدیا۔ خدا مجھے معاف کرے ..... لیکن سچ پوچھو تو انہوں نے برا کیا کہ میرے بھائی کو مار ڈالا ..... مگر ہاں یہ بات بھی تو تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ خود مارے جاتے بس آنسو! نادان آنسوؤ! اپنے اصل چشمے لوٹ جاؤ۔ تم دکھ کی نشانی ہو۔ خوشی میں تمہارا کیا کام۔ یہ کیا کم ہے کہ وہ جیتے ہیں! ایسی خوشی کی بات پر میں کیوں روؤں! ..... مگر اس قتل سے بھی زیادہ ایک اور بات ہے جو مارے ڈالتی ہے۔ اور بھلائے نہیں بھولتی۔ جیسے گنہگار کو اپنے ناپاک گناہوں کا خیال! یعنی ٹائی بالٹ بھیا مر کے چھوٹے۔ وہ جیتے جی چھوٹ رہے ہیں۔ جلاوطن ہو رہے ہیں ..... "جلاوطنی!" اف! کہنے کو یہ دو لفظ ہیں۔ مگر انہوں نے ٹائی بالٹ جیسے میرے ہزاروں عزیزوں کو مار ڈالا ..... بھائی مر گئے تھے۔ کافی دکھ دے گئے تھے۔ اگر مصیبت تنہا نہیں آتی تو دوا نے پھر یہ خبر کیوں سنائی کہ میرے ماں باپ بھی مر گئے۔ یہ غم سہنا ہی ہوگیا! چہ جائیکہ بھائی کی موت کے ساتھ کانوں نے دل کی موت کی خبر سنی کہ وہ جلاوطن ہوگئے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماں، باپ، بھائی، بہن، میں، دوا سب مر گئے۔ برباد ہوگئے! ..... "رومیو جلاوطن ہوگئے!!" اس جملے کے دکھ کا حد و حساب نہیں! دنیا کے کوئی لفظ مجھ پر ایسا ستم نہیں ڈھا سکتے!! ..... (ہراساں ہوکر) دوا! میرے ابا جان کہاں ہیں؟ میری امی کہاں ہیں؟

دوا :- تمہارے ماموں کے ہاں ہیں۔ مرنے والے کی جواں مرگی کو روتے ہیں۔ چلتی ہو، تمہیں بھی لے چلوں؟

جولیٹ :- نہیں۔ انہیں اپنے آنسوؤں سے مرنے والے کے زخم دھو لینے دو۔ میرے آنسو جب بہیں گے کہ ان کے خشک ہوجائیں! ..... ہائے! اب جولیٹ سہاگن بیوہ مرے گی!!

دوا :- جاؤ بیٹی! اب آرام کرو۔ میں لارنس بابا کے پاس جاتی ہوں۔ تمہارے دولہا وہیں ہوں گے۔ ان سے کہوں گی۔ جانے سے پہلے رات کو چھپ چھپا کے وہ تم سے رخصت ہوجائیں۔

جولیٹ :- ہاں دوا، ضرور جاؤ۔ تو یہ میری انگوٹھی بھی انہیں نشانی دیدینا۔ اور کہنا ضرور ضرور آکر مجھ سے وداع ہوجائیں!

(دوا چلی جاتی ہے)

[رومیو ٹائی بالٹ کو مارکے لارنس بابا کے ہاں آگیا ہے۔ لارنس باہر گیا ہوا ہے کہ رومیو کے بارے میں شاہی حکم سرزنش کرآئے۔ تھوڑی دیر میں آتا ہے۔ اور رومیو کو جلا وطن ہونے کی خبر سناکر کہتا ہے کہ خدا نے بڑا رحم کیا کہ تمہاری جان بچ گئی۔ مگر رومیو کی نظر میں دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔]

لارنس:- رومیو! گھبرانے کی بات نہیں۔ ورونا سے جلا وطن ہو گئے تو کیا ہوا۔ دنیا بڑی ہے۔ میا! پائے گدا ۔۔ ملک خدا

رومیو:- بابا! ورونا کی چار دیواری سے باہر دنیا نہیں، دکھ ہی دکھ ہے۔ دوزخ ہے۔ یہاں سے جو جلا وطن ہوا۔ سمجھو، دنیا سے جلا وطن ہوا۔ جس کا دوسرا نام موت ہے! ..... آپ جلا وطنی کو کچھ نہیں سمجھ رہے۔ اسے ظلم نہیں رحم کہتے ہیں! گو یا سونے کی چھری سے مجھے ذبح ہوتے دیکھکر مطمئن ہیں!! ..... بہشت تو یہاں ہے۔ جہاں جولیٹ رہتی ہے ..... بابا! خدارا کہیئے، یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ ہر کس و ناکس تو اس جنت میں رہے۔ جولیٹ کو دیکھے۔ مگر رومیو اس کے دیدار کو ترسے جو میرے لئے جیتے جی کی موت ہے ..... (مضطرب ہو کر) آپ میرے محسن ہیں۔ بزرگ ہیں۔ صاحب دل ہیں! بسر دیکھئے کہ جلا وطن ہو کر میری روح کس طرح پاش پاش ہوئی جاتی ہے!

لارنس:- دیوانے! میں تجھے اس کی بھی روک بتائے دیتا ہوں۔ سن بیٹا! دھیان گیان فلاکت کا کھاجا ہوتا ہے۔ اس سے تیرے دل کو بھی قرار آجائے گا!

رومیو:- قبلہ! دھیان گیان کو آنچ لگایئے! بھلا یہ کیا میری مدد کریگے ان سے نہ حکم شاہی رد ہوگا۔ نہ جولیٹ ہی ملیگی!

لارنس:- تو معلوم ہوا دیوانوں کے کان بھی نہیں ہوتے!

رومیو:- کیسے ہو سکتے ہیں، بابا! جب سیانوں کے آنکھیں نہیں ہوتیں!

لارنس:- کیا؟؟

رومیو:- بابا! بُرا نہ مانیئے، آپ اس بپتا کی نسبت کیا کہہ سکتے ہیں۔ جو آپ پر نہیں پڑی۔ ہاں میری طرح آپ بھی نوخیز ارمان لے ہوتے۔ آپکے سر میں بھی سودا ہوتا۔ کسی جولیٹ کی چاہت ہوتی۔ اس سے بیاہ کو کچھ ہی دیر گزرتی کہ کوئی ٹائی بالٹ آپ کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اور آپ جلا وطن ہو جاتے تو پھر ایسی باتیں نہ کرتے۔ بلکہ سر بصحرا نکل جاتے!

[اس عرصے میں جولیٹ کی دوا بھی آجاتی ہے ۔۔۔ دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ لارنس دروازہ کھول کر اُسے اندر بلاتا ہے۔ رومیو، دوا کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ پوچھتا ہے، جولیٹ کیسی ہے؟ کہاں ہے؟ کیا کرتی ہے؟ میرے متعلق کیا کہتی ہے؟ مجھے تو قاتل سمجھتی ہوگی؟ ہائے! میں نے معصوم خوشی کے دامن کو کیوں خونیں کر دیا! اس خیال سے بے آپے ہو کر کہتا ہے، بتاؤ، ارے مجھے کوئی بتاؤ کہ اس تن خاکی میں رومیو کہاں ہے کہ میں اسے مٹا دوں! جھٹ خنجر نکال کر چاہتا ہے کہ اپنا کام تمام کرے۔ مگر لارنس بابا آڑے آجاتے ہیں۔]

لارنس:- (رومیو کا ہاتھ پکڑ کر) کیا کرتے ہو! کوئی آدمی ہو؟ ..... صورت شکل سے انسان ہو۔ انسان ہی بنو۔ عورتوں کی طرح ہتھڑ مارنے سے کیا ہوگا ..... بھئی واہ! ظاہر میں مرد، باطن میں عورت! یا ان دونوں کے برن میں کوئی اور! ..... حیرت کی بات ہے کہ تم بھی اس پر اتر آئے۔ میں تمہیں طبیعت کا اتنا ہیٹا نہیں سمجھتا تھا ..... ٹائی بالٹ کو تو مار ڈالا۔ خود کو بھی مارے ڈالتے ہو۔ لیکن یہ بھی سوچا کہ جولیٹ کی جان بھی تمہارے ہی قالب میں ہے۔ اس نا شدنی بات سے اُسے بھی جیتے جی مار ڈالو گے ..... یہ بھی اچھی رہی کہ اپنا آیا بُرا زمین بُری، آسمان بُرے! میاں! یہ سب تمہارے ہی ہونے سے تو ہیں۔ بلکہ خود تم ہیں ہیں۔ تم نہ ہوگے تو یہ بھی نہ رہینگے۔ خود کو گنوا کے انہیں رائیگاں کرتے ہو!! ... توبہ! توبہ!! ایسی باتوں سے تو تمہاری زندہ دلی، چاہت، وجاہت سب کو شرم آتی ہوگی جو تم میں مہاجن کے سُود کی طرح بے حساب ہیں! یقین مانو۔ تم ان میں سے ایک سے بھی کام نہیں لے رہے۔ ورنہ تم میں چار چاند لگ جائیں ..... واہ وا واہ! تم تو موم کی مریم ہی نکلے۔ کیوں جی! وفا و محبت کے عہد و پیمان ہوا ہو گئے؟!! صاحبزادے! اپنی زندہ دلی کا تو پاس کرو۔ وہ تمہاری چاہت، وجاہت کی آرسی ہے۔ آج اُسے ایسی بارود نہ بناؤ جو ایک اُجڈ سپاہی کے پاس ہو۔ اور جس میں نادانی سے وہ آگ لگا لے! نہ ہو کہ پھر پچھتا کر یہ کہنا پڑے کہ گھر کو گھر کے چراغ ہی سے آگ لگ گئی!! ..... (رومیو کو اٹھاتے ہوئے) چلو اٹھو۔ مرد خدا! ..... سنو۔ تمہاری جولیٹ زندہ ہے۔ اس کی خاطر تم مرگئے ہوتے۔ ٹائی بالٹ تمہیں مار ڈالتا۔ مگر تم نے اُسے مار ڈالا۔ قانون بھی بجائے دشمن کے تمہارا دوست ہے کہ پھانسی کی جگہ تمہیں جلا وطنی کا حکم ہوا ہے۔ جو کچھ کم خوشی کی بات نہیں۔ بیٹا! دیکھو تو فضل خدا تمہارے شامل حال ہے۔ خوشی خرمی نے چھاؤنی چھائی ہے۔ مگر تم ہو کہ ایک بدنہاد لونڈی کی طرح تقدیر پر بڑبڑا رہے ہو! ..... مجھ سے کام لو۔ ورنہ یاد رکھو: ایسے بن آئی مرا کرتے ہیں!! جاؤ، اپنی دلہن کے پاس جاؤ۔ اس سے مل آؤ۔ مگر زیادہ نہ ٹھہرنا۔ منہ اندھیرے ہی تمہیں شہر سے چلا جانا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد ہم موقع سے تمہاری شادی کا

ذکر کر دیں گے۔ بادشاہ سلامت سے بھی معافی چاہ لیں گے۔ اور تمہیں واپس بُلا لیں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آج اُداس جاتے ہو۔ انشاء اللہ کل خوش خوش آؤ گے۔ وِدا، جاؤ۔ بٹیا سے کہدو کہ یہ آ رہے ہیں۔

[وِدا، رومیو کو جولیٹ کی دی ہوئی انگوٹھی دیدیتی ہے۔ اور چلی جاتی ہے۔ اس انگوٹھی کو دیکھ کر رومیو باغ باغ ہے۔ پھر آکر وِدا دیکھتی ہے۔ اس کے سرکار، بیگم اور پیرس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ باتیں جولیٹ کی شادی کی ہیں۔ جن پر آخر یہ قرار پاتا ہے کہ دو تین دن میں پیرس سے جولیٹ کی شادی ہو جائے گی۔ وِدا دبے پاؤں نکل کر جولیٹ کے پاس جاتی ہے اور رومیو کے آنے کی خبر کرتی ہے۔ خیر تھوڑی دیر میں چوطرف سناٹا ہو جاتا ہے۔ جولیٹ جھروکے میں آکر رومیو کا انتظار کرنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد رومیو بھی آجاتا ہے اور یہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں اس وقت ایکا ایکی رومیو کو کوے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ صبح ہو رہی ہے۔ رومیو کو لارنس کا کہا یاد آتا ہے کہ اسے مُنہ اندھیرے شہر سے چلا جانا ہے۔ اس لئے جانے کا ارادہ کرتا ہے۔]

جولیٹ:۔ ابھی صبح تو نہیں ہوری؟ آپ جا رہے ہیں؟!! (پرندکی آواز بغور سُنکر) یہ کوے کی آواز تھوڑی ہے۔ بلبل کی ہے۔ جو روز رات کو ادھر انار کے درخت پر بولا کرتا ہے! (رومیو کو متامل دیکھکر) سچ! وہ بلبل ہے!!

رومیو:۔ اچھا؟!! مجھے تو کوے کی آواز معلوم دی۔ جو صبح کا پیامی ہے..... مگر جولیٹ! دیکھنا! مشرقی بادلوں میں ان نور کی دھاریاں کیسی ہیں؟..... کافوری شمعیں بھی پوری پوری جل چکیں..... ہنس مکھ دن پہاڑ کی چوٹیوں پر آتا دکھائی دے رہا ہے...... (اپنے میں آپ) اب جاؤں اور زندہ رہوں۔ یا ٹھیروں اور مر جاؤں!

جولیٹ:۔ وہ روشنی؟ نہیں، دن کی روشنی نہیں! میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ تو کوئی شہاب ہے۔ جسے سورج نے اُگل دیا ہے کہ آج رات سفر میں آپ کو مشعل کا کام دے!..... بس تو ٹھہرئیے! ابھی مت جائیے!!

رومیو:۔ تم کہتی ہو تو میں نہیں جاتا۔ کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ مجھے پکڑ لیں یا مار ڈالیں۔ ٹھیک ہے۔ یہ بھورا بھورا دھندلکہ دیدۂ صبح نہیں۔ وہ تو حُسن کی دیبی کا ہلالِ ابرو ہے! نہ یہ کوا بول رہا ہے۔ جسکے چہکنے سے گنبدِ فلک گونج اٹھتا ہے!..... بس اب تو جانے سے زیادہ مجھے ٹھہر جانا مزا دے رہا ہے۔ آ! موت! خوش آمدید!! جولیٹ کی یہی مرضی ہے!!!..... تو لو آؤ، اب جی کھول کر باتیں کریں..... ہائیں!! چُپ ہو گئیں؟؟!!

جولیٹ:۔ (روشنی کو دیکھتے ہوئے) جی نہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دن نکل رہا ہے۔ جائیے۔ جلدی جائیے۔ یہ کوا ہی بول رہا ہے جسکے چیخے کانوں کے پار ہوئے جاتے ہیں..... جائیے۔ اب جائیے۔ روشنی بڑھنے لگی۔

رومیو:۔ آہ! روشنی کیا بڑھ رہی ہے۔ سیاہ بختی بڑھ رہی ہے!

(وِدا آتی ہے)

وِدا:۔ بی بی!

جولیٹ:۔ وِدا!؟

وِدا:۔ تمہاری امی بیگم آ رہی ہیں۔ دن نکل آیا۔ کچھ خبر بھی ہے؟!

جولیٹ:۔ (کھڑکی کے پٹ کھولتے ہوئے) بس تو اے کھڑکی! روشنی کو آنے دے۔ جان کو نکل جانے دے۔

رومیو:۔ (جاتے ہوئے) خُداحافظ! اللہ نگہبان!!

جولیٹ:۔ میرے سرور، سرتاج، پریمی اپیتم! آپ مجھے چھوڑے جا رہے ہیں!!...... دیکھئے! ہر روز اپنی خیریت بھیجتے رہئے گا کیونکہ آپ کے نہ ہوتے ایک ایک پل میرے لئے کئی کئی دن کے برابر ہوگا!!

رومیو:۔ ہاں ہاں، ضرور۔

جولیٹ:۔ ہم پھر کبھی ملیں گے، پیتم؟!

رومیو:۔ پیاری! دل تو کہتا ہے!!......

(رومیو چلا جاتا ہے۔)

جولیٹ:۔ اے نصیب! اے مقسوم!! لوگ تجھے متلون کہتے ہیں۔ تو اپنے تلون کا ہی کرشمہ دکھا دے کہ وہ مجھ سے جلدی آن ملیں!!

بیگم کپولٹ:۔ (اندر سے آواز دیتی ہوئی آرہی ہیں۔) کیوں بیٹی! اُٹھ گئیں!

جولیٹ:۔ (اپنے میں آپ) کون؟ امی!..... رات کو دیر سے سو کر بھی اتنے سویرے بیدار ہو گئیں؟!..... یا اللہ خیر!...... کس لئے یہاں آ رہی ہیں؟؟

(بیگم، جولیٹ کے پاس آئی ہیں۔)

بیگم:۔ کیوں، کیسی ہو؟ جولیٹ!

جولٹ :- امّی، جی اچھا نہیں ہے۔

بیگم :- بھائی کے مرنے پر آخر کب تک روگی؟ ان آنسوؤں کے طوفان میں تو کہیں مُردہ بھی بہہ جائے!..... بیٹی! اب جتنا چاہے رو لو۔ وہ تو جینے سے رہا۔ میری دانست میں تو تھوڑا غم محبت کی نشانی ہے زیادہ غم نادانی!!

جولٹ :- امّی! ایک بے بہا شے کے چھن جانے پر کیسے نہ روؤں؟

بیگم :- ہاں ہاں، مگر.....

جولٹ :- اپنوں ہی کے لئے رویا جاتا ہے۔

بیگم :- بھائی کی موت سے زیادہ تو اس موذی کے جان جینے کو رو جس نے تمہارے بھائی کو جان سے گزارا!

جولٹ :- وہ کون موذی ہے، امّی؟

بیگم :- وہی موذی ـــــ روؔمیو!

جولٹ :- ہائے غضب! کیسا موذی ہاتھ سے نکل گیا۔ اس خیال سے مجھے دلی دُکھ ہوتا ہے!

بیگم :- تھوڑے دُکھ کی بات ہے کہ وہ عیار جیتا جاگتا بچ گیا!!۔

جولٹ :- امّی، کاش میرے ہاتھ اُس کے گلے تک پہونچ سکتے!..... میری طرح ٹائی بالٹ بھائی کا کوئی بھی بدلہ نہ لے سکتا۔

بیگم :- گھبراؤ نہیں۔ ہم اس سے بدلہ لیکر چھوڑیں گے..... بس اب رونا دھونا چھوڑ دو۔ وہ مرلیا مانتو میں نظر بند ہے۔ وہاں ایک آدمی کے ہاتھ زہر بھیجیں گے کہ وہ جانہار بھی ٹائی بالٹ کے پاس پہونچ جائے۔ اس سے تم کو بھی قرار آجائے گا۔

جولٹ :- مجھے تو اس وقت تک قرار نہ آئے گا کہ روؔمیو کو دیکھ لوں ـــــ مُردہ! میرا دل نہیں مانتا!..... امّی! اُسے "ہلاہل" میں بھیجوں گی! اور خوب تیز بناکے بھیجوں گی!!..... کیا بتاؤں! اسکے نام اور "ہلاہل" کے خیال سے میرے دل کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ مگر افسوس اُس تک نہیں پہونچ سکتی! ورنہ بتاتی کہ مجھے ٹائی بالٹ سے کتنا لگاؤ تھا!!!

بیگم :- اچھا تو تم زہر فراہم کرو۔ میں آدمی فراہم کرتی ہوں..... مگر ہاں، جولٹ! یہ خوشخبری تو سُنو؟

جولٹ :- سُنائیے امّی! کیا ہے؟ ایسے وقتوں خوشی کی بات بڑی سُہانی ہے!۔

بیگم :- ہاں، سُنو بیٹی! تمہارے ابا بڑے سمجھ کے آدمی ہیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ تم رنجیدہ ہو تو جھٹ تمہاری خاطر ایک "روزِ خوشی" قرار دیدیا۔ کہ جو کبھی دید ہے۔ نہ شُنید ہے!

جولٹ :- اچھا!..... وہ کیا روز ہے؟

بیگم :- جمعرات!..... آئندہ جمعرات کی صبح کو نوجوان، سُورما اور رجیلے مانس پیرس سے ہنسی خوشی تمہارا بیاہ ہوجائیگا!!

جولٹ :- (حیران ہوکر) ..... یہ، یہ تو بڑی جلدی ہے۔ امّی! ابا جان سے کہیے۔ اتنی جلدی نہ کریں۔ ورنہ اس وقت تو یہ کاج ایسا ہی بے موقع ہوگا۔ جیسے پیرس کے بجائے روؔمیو سے میرا بیاہ ہوگیا!!۔

بیگم :- آلو تمہارے ابا بھی اِدھر آرہے ہیں۔ اب تم خود ہی اُن سے کہہ لو۔ دیکھو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

(کپیولٹ اور وردا آتے ہیں)

کپیولٹ :- سُورج غروب ہوتا ہے تو فلک اُس کے آنسو ٹپکاتا ہے۔ مگر میرے بھانجے کے غروب پر بارشِ غم ہو رہی ہے۔ (جولٹ سے) ہائیں، لڑکی! تمہارے آنسوؤں کی لڑیاں ابھی جاری ہی ہیں؟ آنکھیں ہیں یا سرجیون چشمے! میں دیکھ رہا ہوں، ایک ہی وقت میں تم کشتی بھی ہو۔ سمندر بھی ہو۔ بادِ مخالف بھی ہو۔ یعنی تمہاری آنکھیں سمندر ہیں جن میں اشکوں کا مدوجزر ہوتا ہے۔ تن کشتی کہ اس کھاری سمندر میں تیر رہی ہے۔ اور آہیں بادِ مخالف ہیں۔ نہ ہو کہ ان کا طوفان تمہاری جیون نیّا ڈبو دے!..... کیوں جی، بیگم! تم نے جولٹ کو میرا فیصلہ سُنا دیا؟

بیگم :- ہاں کہدیا، مگر یہ بات صاحبزادی کے بھا دیں نہیں۔

کپیولٹ :- کیا بات!..... ہم تو اس کے لئے اتنا کریں۔ مگر اسکے بھا دیں ہی نہیں۔ نالائق یہ تو سمجھے کہ ایک لائق سے اس کا پلّہ بندھ رہا ہے۔

جولٹ :- آپ مجھ پر بیحد شفقت فرماتے ہیں۔ اس کی میں ممنون ہوں، مگر.....

کپیولٹ :- مگر کیا؟!..... بس لگی منطق بگھارنے!..... یہ وہ کچھ نہیں۔ صاف سُنو: پیرس سے تمہارا بیاہ ہوگا۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

جولٹ :- اباجان! خدارا میری تو سُن لیجئے!

کپیولٹ :- چُپ۔ نالائق، مُردار! میں تیرا ایک لفظ نہیں سُنونگا۔..... بیگم! اس ناشدنی کو ہم ایسا نہیں سمجھتے تھے..... واہ ری قسمت!

لڑکی بھی ہے تو عذابِ جان!

ددا:- سرکار! اتنا غصہ نہ کیجئے۔ بچی کو یوں بُرا بھلا نہ کہیئے خدا اسے اپنی امان میں رکھے!

کپولٹ:- تم چپ رہو جی بڑی عقل کی دیبی بن کے آئی ہیں۔

ددا:- سرکار! میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔

کپولٹ:- پھر وہی؟

ددا:- (دبی زبان سے) رئی، بات کرنی مشکل ہو گئی۔

کپولٹ:- جاؤ، جاؤ۔ دفعان ہو۔ اپنے برابر والوں کو عقل سکھاؤ یہاں ضرورت نہیں۔

بیگم:- اے ہے! اتنا غصہ نہ کیجئے۔

کپولٹ:- اس ناہنجار بچی کی باتیں مجھے پاگل بنائے دیتی ہیں۔ دن رات، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے مجھے یہی خیال ہے کہ یہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ کسی شریف سے اس کا پلّہ بندھے ...... پیرس کو دیکھو! بھلا مانس۔ خوبصورت ذات جماعت کا اچھا۔ سوچا تھا اس لاڈو کو اس کے سر چیپ دوں گا۔ مگر یہ اپنی عقل کے آگے کسی کی چلنے نہیں دیتی ..... (جولٹ سے) خوب کان کھول کے سُن لے اس دیوانگی کا میرے ہاں گزارہ نہیں۔ جمعرات نزدیک ہے۔ دل پر ہاتھ رکھو۔ اس سے صلاح لے۔ پھر تو تو میری بیٹی، میں تیرا باپ۔ ورنہ در بدر بھیک مانگے گی۔ فاقوں بھی مر جائے گی تو اُلٹ کر نہیں دیکھوں گا۔ یاد رکھ، پھر تجھے مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔

(یہ کہہ کر کپولٹ چلا جاتا ہے۔)

جولٹ:- اے اللہ! تیرے آسمانوں میں کیا رحم نہیں رہا کہ میرے دکھ درد کی گہرائیاں دیکھے؟! ..... پیاری امّی! مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نہ نکال پھینکئے۔ اس بیاہ کو ہفتے عشرے کے واسطے روک دیجئے۔ یا نہیں تو پھر میری سہاگ سیج بھی مقبرے میں سج دیجئے۔ جہاں ٹائی بالٹ بھیّا موت کی نیند سوتے ہیں۔

بیگم:- بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ بیٹی ہم تو تم سے دہائیا!

(بیگم بھی چلی جاتی ہیں۔)

جولٹ:- خدایا!! ..... ددا!!! ..... یہ بیاہ کیسے رکے گا۔ وہ ابھی تک زندہ سلامت ہیں ..... اب میں کیا اُن کو بُرا چیتوں کہ وہ دنیا کو خیرباد کہیں۔ جنت سدھاریں ..... ددا! مجھے تسلی دو۔ کوئی صلاح دو ..... ہائے اللہ! مجھ ناتواں بندی کا بے سبب آسمان دشمن ہو گیا!! ..... پیاری ددا! تم چپ ہو؟ کچھ نہیں کہتیں؟ کیا میرے لئے آج تمہارے پاس ایک حرفِ تسلی بھی نہیں؟؟

ددا:- بیٹی! ..... رومیو جلا وطن ہو گئے۔ اب دنیا ان کو تمہارے پاس نہیں لاسکتی۔ آئے بھی تو چوری چھپے آئیں گے۔ جو ٹھیک نہیں۔ یہ سب دیکھتے بہتر ہے کہ پیرس میاں سے ہی تمہارا بیاہ ہو جائے۔ بڑے خوبصورت آدمی ہیں۔ میاں رومیو تو اُن کے آگے پانی بھرتے ہیں! دیکھنا! آنکھیں تو ایسی پائی ہیں کہ نگوڑی ہرن کی بھی کیا ہوں گی!! ..... میں سمجھتی ہوں اس دوسرے سنجوگ سے تمہیں بڑی خوشی ہوگی یہ پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ بہتر نہ بھی ہوا تو پہلے سے کم بھی نہیں۔ اور میاں رومیو کا تو اب تمہارے لئے ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

جولٹ:- ددا! یہ باتیں تم اپنے دل کی زبانی کہہ رہی ہو؟

ددا:- دل و جان کی زبانی! ورنہ دونوں ناپید ہو جائیں!!

جولٹ:- آمین!

ددا:- کیا؟

جولٹ:- نہیں! میں یہ کہہ رہی ہوں۔ تمہاری نیک صلاح سے میرے دل کو قرار آگیا ..... جاؤ، امّی سے کہہ دو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ اب آپ جو فرمائیں میں حاضر ہوں۔

ددا:- اللہ اللہ! کیسی سمجھ کی بچی ہے!!

(ددا چلی جاتی ہے)

جولٹ:- (ددا کا دھیان کرکے) مکّارہ بڑھیا۔ بدذات چڑیل! جس زبان سے تو ہزاروں بار اُن کی بھلائیاں گناتی تھی۔ آج اُن کو بُرا کہہ کر اُسی پر فالج گراتی ہے؟ ..... جا، جہنم واصل ہو! ..... میں لارنس بابا سے اس دردِ دل کا مداوا پوچھوں گی۔ انہوں نے بھی کچھ نہ بتایا تو خود میں مٹ جانے کا یارا رکھتی ہوں!

[جولٹ، لارنس بابا کے ہاں جاتی ہے۔ وہاں پیرس بھی پہلے سے آیا ہوا ہے۔ اور لارنس سے کہہ رہا ہے کہ آئندہ جمعرات کو جولٹ سے اُس کا بیاہ ہو جائے گا۔ لارنس انجان بن کر کہتا ہے کہ بھئی! عجیب بات ہے۔ تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ لڑکی تم سے بیاہ پر خوش نہیں۔ مگر تم ہو کہ اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گئے! پیرس نے کہا: بابا! بات دراصل یہ ہے کہ جولٹ کو اپنے میرے بھائی ٹائی بالٹ کے مرنے کا بڑا قلق ہے۔ اس لئے وہ چپ چپ ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، محبت کی دیوی اشک محل میں نہیں مسکرایا کرتی۔ اتنے میں جولٹ بھی آجاتی ہے۔ اُسے دیکھ کر پیرس پھولے نہیں سماتا۔ اور مارے خوشی

کے جو جی میں آتا ہے، کہنے لگتا ہے۔ جولٹ، لارنس سے کہتی ہے: مجھے آپ سے علیحدگی میں کچھ کہنا ہے جس پر لارنس، پیرس کو چلتا کر دیتا ہے۔]

جولٹ:- (پیرس کے جانے کے بعد) بابا! جانیے، دروازہ بند کر دیجئے۔ پھر میرے ساتھ آپ بھی میری قسمت کو رو دیجئے کہ اب میرا کوئی دستگیر نہیں رہا۔ میری آس یاس بن گئی۔ میرا دُکھ لادوا ہو گیا!

لارنس:- آہ! جولٹ، مجھے پہلے ہی تمہارا دُکھ... معلوم ہو گیا۔ عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کروں..... (متامل ہو کر) جمعرات کو پیرس سے تمہارا عقد ہو گا۔

جولٹ:- بابا! صرف یہی نہ کہئے کہ آپ نے میری بپتا سن لی۔ کوئی سبیل بھی نکالئے کہ میں بچ جاؤں..... آپ کوئی ایسی تدبیر نہیں بتا سکتے، تو اس خنجر سے میں اپنی جان گنوا دوں گی۔ کیونکہ جب آپ نے ہمارا سنجوگ کر دیا تو خدا رسول سے ہم ایک ہو چکے۔ اب کسی اور سے پلہ نہیں بندھ سکتا..... بیوفائی بھی کبھی سرسبز ہوئی ہے!..... آپنے دُنیا دیکھی ہے۔ آپ ہی مجھے کوئی نیک صلاح دیجئے۔ ورنہ میں کہہ چکی، پھر یہ خنجر میرے دُکھ کی دوا کریگا۔

لارنس:- ٹھیرو بیٹی! اُمید کی ایک جھلک مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھو، جب تم میں اتنا یارا ہے کہ جان سی عزیز شے بھی گنوا سکتی ہو تو میں تمہیں اس عذاب سے نجات کا علاج بتاتا ہوں۔

جولٹ:- بتائیے، بابا! جلدی بتائیے۔ پیرس سے بیاہ نہ ہونے کے لئے اگر آپ کہیں کہ مینارے پر چڑھ کر کود پڑ۔ تو میں کود پڑوں گی۔ سانپ کے بل میں چھپ جاؤں گی۔ بھوکے بھیڑیوں کے ساتھ رہ جاؤں گی۔ ایک مقبرے میں بند ہو سکتی ہوں۔ جو مُردوں کی ہڈیوں سے پٹا پڑا ہو۔ جہاں چوطرف ڈراؤنے ڈھچر ہوں۔ زرد زرد کھوپریوں کے خول نظر آئیں۔ یہی نہیں۔ میں کسی تازی قبر میں بھی مُردے کے ساتھ روپوش ہونے کو تیار ہوں۔ گو لوگوں کی کہی سُنی باتیں مجھے یاد آئیں گی۔ مجھے ڈر لگے گا۔ مگر اس خیال سے بلاخوف و خطر چھپی رہونگی کہ با وفا مروں گی!۔

لارنس:- اچھا تو یہ لو۔ میں تمہیں ایک عرق دیتا ہوں۔ جسے میں نے جڑی بوٹیوں سے تیار کیا ہے۔ یہ لیکر گھر جاؤ۔ اور ماں باپ پر یہ ظاہر کرو جیسے اس بیاہ سے تم خوش ہو۔ کل بدھ ہے۔ کل ہی رات میں تم اپنے کمرے میں اکیلی سونا۔ دایہ بھی پاس نہ پھٹکے۔ جب سونے لگو تو یہ عرق پی لینا۔ عرق کے پیتے ہی تمہارے خون میں خنکی دوڑ جائے گی۔ اور تم پر غشی چھا جائیگی۔ نبضیں ساقط ہوں گی۔ سانس رُک جائے گا۔ گرمائی جاتی رہے گی۔ اور یہ تمہارے لب و عارض جو گلاب بنے ہوئے ہیں زرد پڑ جائیں گے۔ آنکھوں کے سُندر دریچے بھی بند ہو جائیں گے۔ جیسے موت کے ہاتھوں جان کی روشنی آنی بند ہو گئی ہو! تمہارا ہر عضو اکڑ جائیگا۔ خنک ہو جائیگا۔ مردہ نظر آئے گا۔ یہ مصنوعی موت تم پر دو اوپر چالیس گھنٹے طاری رہے گی۔ پھر اس طرح بیدار ہو جاؤ گی جیسے کوئی میٹھی نیند سے جاگے! صبح میں جب پیرس نوشاہ بن کے آئے گا تو تم مُردہ بنی ہوئی ہو گی۔ اور جیسا ہمارے ملک کا دستور ہے۔ سب تمہیں پہنا اُڑھا کر کھلے ڈولے میں مقبرے لائیں گے جہاں تمہارے خاندانی لوگ بلا دفنائے رکھے گئے ہیں۔ اس عرصے میں میں رومیو کو بھی اطلاع دے دونگا۔ وہ بھی آجائے گا۔ میں اور وہ تمہاری دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ جب تم اس نیند سے جاگ جاؤ گی۔ تو اپنے دولہا کے ساتھ مانتو چلی جانا۔ بس یہی ایک تدبیر ہے جو تمہیں اِس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم نسوانی ڈر دل سے نکال دو۔ اور ہمت سے کام لو۔

جولٹ:- لائیے، بابا! وہ امرت مجھے دیدیجئے۔ اور ڈر، خوف یاد نہ دلائیے۔

لارنس:- یہ لو۔ (عرق سے بھری ہوئی ایک شیشی دیتا ہے۔) جاؤ!..... دیکھو استقامت ہاتھ سے نہ جائے۔ ارادہ ہیٹا نہ ہو۔ میں بھی خط دیکر ایک آدمی کو مانتو بھیجدیتا ہوں۔

جولٹ:- خدا حافظ، اچھے محسن!..... محبت مجھے ہمت دلائیگی۔ ہمت میری اعانت کرے گی!۔

[وہاں سے آکر جولٹ دیکھتی ہے کہ اُس کے ماں باپ مہمانوں کی فہرستیں تیار کر رہے ہیں۔ پکوان کی فردیں لکھی جا رہی ہیں۔ کل بدھ کو ہی بیاہ قرار پا گیا ہے۔ چوطرف ایک دُھوم مچی ہوئی ہے]

بیگم کپولٹ:- (خاوند سے) آپ نے بھی کمال کیا۔ کل ہی کی تاریخ ٹھہرا دی۔ ایک رات میں کیا کیا ہو گا؟۔

کپولٹ:- کیا کروں۔ لڑکی کا تو یہ حال ہے کہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ!...... تم گھبراؤ نہیں چپکی بیٹھی دیکھتی رہو۔ میں سب انتظام کر لونگا۔

[رات کا وقت۔ محلسرا روشنی سے دُلہن بنی ہوئی ہے۔ جولٹ، دَدا کے ساتھ اپنی خوابگاہ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ دَدا کپڑے نکال رہی ہے۔ جولٹ پر عجب کیفیت طاری ہے۔ بالکل خاموش ہے]

جولٹ:- (ایکا ایکی، بھرائی آواز میں) بس یہ جوڑا ٹھیک ہے.....

ودا! آج رات تم میرے پاس نہ سونا۔ میں اکیلی اپنے اللہ سے دعائیں مانگوں گی کہ مجھ دکھیاری پر آسمان مسکرائیں۔ غضب نازل نہ کریں۔ تم جانتی ہو ایسا کاج گناہ ہے۔

(بیگم کپولٹ آتی ہیں)

بیگم:۔ کیوں بیٹی، جولٹ! کیا ہو رہا ہے؟

جولٹ:۔ جی امی! کپڑے نکلوا رہی ہوں ۔۔۔۔۔ امی بیگم! آج آپ کو تو بہت کام ہوگا۔ آپ جائیے۔ ودا تم بھی جاؤ۔ کچھ ہاتھ بٹا دو۔ میرے پاس کو تو کام ختم ہوگیا!

بیگم:۔ (مسکرا کر) ہاں، بہت کام ہے، بیٹی!

(بیٹی کو گلے لگا کر پیار کرتی ہے۔)

اچھا، خدا حافظ! اللہ نگہبان!! تم بھی آرام کرو۔ جی تھک گیا ہوگا۔ میں صدقے، میرے لال نے کل سے حق ناحق کو برا بھلا سنا!۔

(بیگم کپولٹ اور ودا چلی جاتی ہیں)

جولٹ:۔ خدا حافظ! اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اب پھر کب ملیں گے!!

(جولٹ کا دل بھر آتا ہے۔ اور اپنے آپ ایک خوف طاری ہوجاتا ہے۔)

جولٹ:۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) ایک موہوم خوف سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ روح سینے میں گھٹ رہی ہے۔ کیا ان لوگوں کو بلالوں؟ ۔۔۔۔۔۔ (دبی آواز میں) ودا! ۔۔۔۔۔ (پھر متامل ہوکر) مگر وہ کیا کریں گے۔ آج رات تو مجھے اپنا دکھیارا پارٹ خود کرنا ہے، آ، اے شیشی!! (لارنس کی دی ہوئی شیشی دیکھتے ہوئے) مگر اس عرق سے بھی کچھ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ صبح کو پیرس سے میرا بیاہ ہوجائیگا ۔۔۔۔۔ نہیں، یہ عرق مجھے اس عذاب سے بچالے گا۔۔۔۔۔ مگر، کہیں عرق زہر تو نہیں؟ جسے بابا نے اس لئے دیدیا کہ میں مرجاؤں۔ مخفی طور پر انہوں نے پہلے ہی میرا عقد کر دیا ہے۔ سوچا ہوگا۔ آئندہ یہ بات پھوٹی تو ہمارے ساتھ ان کی بھی بے حرمتی ہوگی ۔۔۔۔۔۔ ایک دل یہ کہتا ہے۔ لیکن ایک دل یہ بھی کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بابا بڑے پاک خیال بزرگ ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہائے!! یہ کیسے خوف کی بات ہے کہ مُردوں کی طرح تو میں مقبرے میں رکھی جاؤں۔ اور ان کے آنے سے پہلے ہی جاگ جاؤں! ۔۔۔۔۔ مقبرے میں تازی ہوا آ نہیں سکتی؟ ان کے آتے آتے تک دم گھٹ جائیگا۔ بس تڑپ تڑپ کر مرجاؤں گی! ۔۔۔۔۔ اجی زندہ بھی رہی تو رات اور موت کی ہولناکی مجھے زندہ درگور کر دے گی۔ کیونکہ تن تنہا میں ہونگی۔ مقبرہ ہوگا۔ سالہا سال سے میرے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں بھری پڑی ہیں۔ جہاں خونیں ٹائی بالٹ کا تازہ لاشہ تابوت میں گل سڑ رہا ہے۔ ۔۔۔۔ تو میں ایسی جگہ رکھی جاؤں گی۔ جہاں کہتے ہیں کہ رات میں روحیں آیا کرتی ہیں۔ ہائے اللہ! ایسا تو نہ ہوگا کہ وہاں میں جلدی بیدار ہوجاؤں۔ بدبو سے میرے اوسان جاتے رہیں۔ اور روحوں کی چیخ پکار مجھے بیچ بیچ مار ڈالے؟؟ ۔۔۔۔۔ بیدار ہوکر میں کہیں دیوانی تو نہیں ہوجاؤں گی؟؟ کیونکہ اس وقت مجھے خوف سا خوف گھیرے ہوگا۔ نہ ہو کہ اس نیند سے اٹھوں، تو دیوانی اٹھوں! اور اپنے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں چننے لگوں۔ ٹائی بالٹ کو تابوت سے باہر کھینچ لاؤں۔ اور اس دیوانگی میں کسی ہڈی سے اپنا سر پاش پاش کرلوں!!! (خیال میں ڈوبے ہوئے) ہائیں!! یہ کون؟! میرے بھائی ٹائی بالٹ کی روح!!! جو شاید "ان" کی تلاش میں بھٹکتی رہی ہے!!! جنہوں نے اس کے کالبد خاکی کو تلوار میں اس طرح پرو دیا تھا جس طرح سیخ کباب کو پرو لیتی ہے!! ۔۔۔ ٹھیرو، ٹائی بالٹ بھائی، ٹھیرو! ۔۔۔۔۔ رومیو!! میں آئی!!! ۔۔۔۔۔ تمہارے خاطر یہ بھی سہی!!!!۔

(عرق پیتی ہے اور بیہوش ہوکر بستر پر گرجاتی ہے۔)

[گھر کے صحن میں پکوان ہو رہا ہے۔ جہاں گھر والے بڑے میاں کپولٹ بھی ہیں۔ بیگم بھی ہیں۔ ودا بھی ہیں۔ نوکر چاکر گڑبڑ کرتے پھر رہے ہیں۔ بڑی گھما گھمی ہے۔ بہار آرہی ہے۔]

بیگم:۔ (نیند میں) ودا! لو یہ کنجیاں لو۔ ذرا گرم مصالحہ تو نکال لاؤ۔ باورچی مانگ رہا ہے۔

ودا:۔ دلی بیگم! گرم مصالحہ کا اس وقت کیا ہوگا؟ وہ تو میٹھے کے لئے ہی کا مربہ اور چھوارے مانگ رہا تھا!

کپولٹ:۔ (اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) چلو چلو۔ جھٹ پٹ کام ختم کرو ۔۔۔۔۔ مرغ بانگ دینے لگے۔ تین بج گئے۔ استاد! لو اب بریانی دم دینی شروع کردو!!

[وقت کے پر ہوتے ہیں۔ دم بھر میں یہ جا، وہ جا۔ ابھی تین بجے تھے۔ بات کی بات میں آسمان پر نور کے دریا بہنے لگے۔ اس وقت کپولٹ کی گھبراہٹ دیکھنے کی تھی۔ بڑے میاں آپے میں نہ تھے۔ اتنے میں برات کے باجے کی بھی آواز آنے لگتی ہے۔

بس اب کیا تھا۔ اُن کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے]

کپولٹ :۔ ارے، دولھا آرہا ہے! باجے کی آواز آنے لگی!! ۔ ...... بیگم! ..... ددّا!! ...... ہیں؟؟ ..... سب چلے گئے؟ ...... ارے میرے کپڑے کہاں ہیں؟؟؟ ..... لاحول ولا!! ... میں کیا کہہ رہا تھا ....

(اتنے میں ددّا آتی ہے)

کپولٹ :۔ ددّا!! ابھی تم نے جولٹ کو بیدار کیا؟ ..... ابھی اُسے دُلہن نہیں بنایا!! شاباش ہے!! جاؤ جلدی جاؤ، یہاں کیا کر رہی ہو؟

ددّا :۔ ابھی جاتی ہوں، سرکار!

(ددّا جاتی ہے، اور جولٹ کی خوابگاہ میں قدم رکھنے سے پہلے ہی خوشی خوشی آوازیں دینے لگتی ہے۔)

ددّا :۔ بیوی! بٹو!! ..... جولٹ جانی!!! ..... اوہو کیسی میٹھی نیند ہے! ..... اجی ہرنی، اجی قمری!! سستن کہیں کی!!! ..... سجنی! ..... دُلہن!! ..... اللہ اللہ نیند سی نیند ہے!!

(مسہری کے پاس جاکر بہ آواز جولٹ کو اُٹھانا چاہتی ہے۔)

بی بی! بیگم!! ....

(پھر مسہری کا پردہ ہٹاتی ہے)

لو اور سُنو۔ ریت کا جوڑا پہن، اور سو گئیں!

(جولٹ کو ہاتھ سے ہلا کر جگاتے ہوئے)

میری موہنی! میری بیگم!!

(جونہی جولٹ کے سرد ہاتھ پر ددّا کا ہاتھ لگتا ہے تو اس پر بجلی سی گر جاتی ہے۔)

ارے غضب ہوگیا! لوگو دوڑو۔ دیکھو میری بچّی کو کیا ہوگیا!؟ ..... سرکار! بیگم صاحب!! .....

(بیگم کپولٹ آتی ہیں)

بیگم :۔ ددّا! کیا ہوا؟؟!!

ددّا :۔ بیگم صاحب! غضب ہوگیا!!

بیگم :۔ (پریشانی سے) بولو تو سہی، آخر کیا ہوا؟؟

ددّا :۔ (روتے ہوئے) دیکھئے، دیکھئے۔ (جولٹ کی طرف اشارہ کر دیتی ہے۔)

بیگم :۔ (جولٹ کو ہاتھ لگا کر پہلے سکتے کے عالم میں ہو جاتی ہے۔ پھر جولٹ کو پٹ کر) ہائے! میں لُٹ گئی!! برباد ہوگئی!!! ....

میری بچّی! میری اکلوتی بچّی!! (جولٹ کو پیار کرتے ہوئے) جولٹ، بیٹی! اُٹھو!! بولو!!! ..... بولتی کیوں نہیں؟ تم پہ ماں قربان!!

(کپولٹ بھی آتا ہے)

کپولٹ :۔ (بگڑتے ہوئے) بڑے شرم کی بات ہے۔ اب تک دُلہن کو نہیں لاتے؟ دولھا کبھی کا آچکا!

ددّا :۔ سرکار میری دُلہن تو اللہ کو پیاری ہوگئی!!

بیگم :۔ (خاوند سے) جولٹ روٹھ گئی! ارے کوئی اُسے منا دو!!

(رونے لگتی ہیں۔)

کپولٹ :۔ یہ کیا ہوگیا!!!

(جولٹ کو ہاتھ لگا کر، سنجیدہ)

دوڑتا خون رُک گیا۔ ہاتھ پیروں میں سختی آگئی۔ گلابی لبوں سے بہارِ زندگی کبھی کی سدھار چکی ..... جولٹ کو موت نے توڑ لیا۔ میرے چمن کے پھول کو بے وقت پالا مار گیا!!

[یہ کہتا ہوا کپولٹ مغموم نیچے جاتا ہے۔ وہاں لارنس، پیرس اور بہت سے مہمان ہیں۔]

لارنس :۔ (کپولٹ سے) کہئے صاحب؟ دُلہن گرجا چلنے کے لئے تیار ہے؟؟

کپولٹ :۔ گرجا جانے کے لئے تو تیار ہے۔ مگر وہاں سے پھر کبھی نہیں لوٹے گی! ..... (پیرس سے) بیٹا! تمہاری ہونے والی دُلہن کو رات فلک نے ہم سے چھین لیا۔ اس کھلتے پھول کو اجل نے مسل ڈالا .... اب ملک الموت ہی میرا داماد ہے۔ میرا وارث ہے۔ اسی کے ہاتھ میں نے جولٹ کا ہاتھ دیدیا ہے!

پیرس :۔ ہائیں!! ..... اتنے آرزو ارمان کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا!!!

کپولٹ :۔ ہائے کیسے کہوں! میری بچّی کے ساتھ میری ساری خوشیاں مر گئیں!!

لارنس :۔ (کپولٹ سے) صبر کیجئے! ..... پریشانی کا علاج پریشانی سے نہیں ہوتا ..... جولٹ میں ایک جولٹ آپ کی لاڈلی تھی۔ ایک جولٹ قدرت کی دُلاری تھی۔ آپ اپنی جولٹ کو اجل سے نہ بچا سکے۔ قدرت نے اپنی جولٹ کا بھلا چاہا۔ تو اسے آسمان پر اُٹھا لیا۔ اور باغِ جناں کا پھول بنا دیا! ..... برادرا یہ بشریت ہے کہ انسان عزیزوں کی موت پر آنسو بہائے۔ مگر سوچ کی روشنی میں دیکھو تو یہ آنسو سانچے نہیں، موتی موتی ہیں!

[سچ یہ ہے کہ دُنیا اسی کا نام ہے۔ یہاں شادی دغم ساتھ
تھ ہیں۔ اللہ اللہ جو گھر ابھی ابھی شادی کا گھر تھا۔ دیکھتے دیکھتے ماتم
دہ بن گیا۔ چو طرف وحشت برسنے لگی۔ عبرت طاری ہو گئی۔ مادشاکی
ھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دلوں کے بند ٹوٹ گئے۔ غموں کے
ور بہہ نکلے۔ یہاں یہ ہوا۔ وہاں مانتوہما رومیو نیند سے بیدار
کر ٹہل رہا ہے۔]

ومیو۔ (اپنے میں آپ) خواب کی باتوں کو سچ جان لوں۔ تو خوشی
دن قریب ہیں۔۔۔ عشق کا دیوتا من کے من رہیں براجمان ہے۔
مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میری رُوح کے جلو میں بہت سے سُہانے
لات ہیں جو مجھے اُڑائے لئے جا رہے ہیں!۔۔۔۔ (سوچ میں۔)
نے خواب دیکھا کہ جولٹ آئی ہے۔ مگر میں مرگیا ہوں!۔۔۔۔۔۔
ب خواب ہے۔ اس سے تو ایک مُردہ بھی سوچ میں پڑ جائے!۔
ں تو جولٹ آئی۔ اس کا سانس سنجیون تھا جس سے میں جی اُٹھا۔
دل کا بادشاہ بن گیا!۔۔۔۔ ہائے الجت کی پرچھائیاں جب اتنی
ہیں تو خود محبت کتنی موہن ہو گی!!!

[ایک شخص ــــ بلتاسر نام، گھوڑے پر سوار آتا ہے]

میو۔ (خوشی سے) کہو، بلتاسر! وروناسے کیا خبر لائے! لارنس
نے خط دیا؟ میرے والدین اچھے ہیں؟ جولٹ خیریت سے ہے؟
خیریت سے ہے۔ تو پھر سب خیریت ہی خیریت ہے!

[بلتاسر کو رومیو نے لارنس کے پاس بھیجا تھا۔ جو خفیہ طور پر
ناگیا تھا۔ مگر یہ شخص ورونا اُس وقت پہونچا کہ جولٹ کی میّت جا
تھی۔ ملک کے دستور کے موافق جولٹ عروسی پوشاک میں ڈولے
تھی۔ ساتھ بہت سی راہبات تھیں۔ جو سر سے پیر تک سفید لباس
تھیں۔ دوسری طرف پادری لوگ تھے۔ جن کے کالے پیرہن تھے،
ب کے سب دھیمے سُروں میں خدا کی حمد گا رہے تھے۔ جب ڈولہ
ب آیا تو بلتاسر نے ایک درخت کی آڑ سے دیکھا کہ جولٹ پر ایک
سکوں حُسن کی لہر آئی ہوئی ہے۔ جولٹ کو حباب کی سی مہین ریشمی
زرا اُڑھا دی گئی ہے جس میں سے اُس کا حسین چہرہ اس طرح جھلک
ہے جیسے صافی سے گلاب! یہ حادثہ دیکھ کر بلتاسر اُلٹے پاؤں
یو کے پاس آیا۔ رومیو نے جولٹ کے مرنے کی خبر سُنی تو جیتے جی
یا۔ بلتاسر کو اپنے لئے گھوڑا لانے کو بھیجا۔ اور خود سوچ میں پڑ گیا۔]

میو۔ (اپنے میں آپ) جولٹ!! تمہیں تو وفا کا بڑا دعویٰ تھا۔
۔۔ پھر یہ کیسی بے وفائی!؟۔۔۔۔ اچھا گھبراؤ نہیں۔ اب تمہارا

یہ باوفا بھی تمہارے پاس آتا ہے!۔۔۔۔ مگر رومیو! اس کی تدبیر!
۔۔۔۔۔ آہ! اے شرارتِ نفس اب تیرا کام ہے۔ جان ہاروں کی تو
ہی مُونس ہوتی ہے!۔۔۔۔ ہاں، خوب یاد آیا! یہاں قریب ہی میں
ایک دواساز رہتا ہے۔ بُرے حالوں۔ مفلوک۔ میں نے پہلے پہل
اُسے دیکھا تو خیال ہوا تھا کہ یہ شخص موت بیچتا ہوگا! اس کے پاس چلوں،
اُس کے ہاں ضرور کوئی مہلک زہر مل جائیگا۔

(دواساز کے پاس آتا اور آواز دیتا ہے۔)

دواساز۔ (اندر سے) کون ہے؟

رومیو۔ ذرا اِدھر آؤ۔

(دواساز آتا ہے۔)

رومیو۔ تم غریب آدمی ہو۔ یہ اشرفیاں لو۔ اور مجھے کوئی ایسا زہر
دو کہ کھاتے ہی رُوح اس طرح پرواز ہو جائے، جیسے توپ سے گولہ
چھوٹ جاتا ہے!۔

دواساز۔ ایسے زہر تو میرے پاس کئی ہیں۔ مگر یہ بات میں مُنہ سے نہیں
نکال سکتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو قانوناً موت کی سزا دی جاتی ہے۔

رومیو۔ کیا تم اتنے عیش میں ہو کہ مرنے سے ڈرتے ہو؟۔۔۔۔۔۔
فاقے تمہارے چہرے پر بسورہے ہیں۔ احتیاج تمہاری آنکھوں سے
جھانک رہی ہے ــــ بھیک تمہاری گردن پر سوار ہے۔ نہ دُنیا تمہاری
ساتھی، نہ قانون تمہارا۔ یا جو کہ تمہیں مالدار بنا سکے۔ پھر افلاس کی
کڑیاں جھیلنے سے حاصل؟۔۔۔۔۔ لو اشرفیاں لو۔ اور فلاکت پر خاک
ڈالو۔۔۔۔۔

دواساز۔ میری طینت تو اسے قبول نہیں کرتی۔ ہاں میری غریبی
قبول کرلے تو کرلے۔

رومیو۔ مجھے تمہاری غربت سے کام ہے۔

دواساز۔ (اندر جاتا اور زہر کی شیشی لاکر دیتا ہے) انسان
میں بیس آدمیوں کی بھی قوت ہو تو اس کے پینے سے پلک جھپکاتے ختم
ہو جائے گا!

رومیو۔ (زہر کی شیشی لیکر) لو یہ اشرفیاں۔۔۔۔۔ مگر یاد رکھو!
رُوحِ انسانی کے لئے سونا زہر سے بھی کہیں زیادہ خطرے کی چیز ہے!
اس گھناؤنی دُنیا میں اس نے اتنوں کو برباد کیا ہے کہ تمہارے سارے
زہر ہیچ ہیں!!۔۔۔۔ زہر تو میں نے تمہارے ہاتھ بیچا ہے۔ تم نے مجھے
زہر مول نہیں دیا!۔۔۔۔۔ اچھا، خدا حافظ!۔۔۔۔۔ جاؤ اب تم بھی
اس سے کچھ آذوقہ خرید لو۔ اور قبر کے کیڑوں کے لئے اپنا تن تازہ

دو!! (شیشی کو دیکھتے ہوئے) آ! اَمرت، تو زہر نہیں!! چل میرا ساتھ دے۔ جولٹ کے پاس تجھے نوشِ جان کرنا ہے!!!

[لارنس اپنے گوشۂ تنہائی میں پریشان بیٹھا ہے۔ اس نے بھی ایک شخص کو خط دیکر مانتو بھجوایا تھا۔ جو رستہ میں ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ طاعون کے شبہ میں روک لیا گیا۔ لارنس کو اس کی کوئی خبر نہ ہو سکی۔ اور نہ رومیو کو ہی اطلاع ملی۔ جب وقت بہت دیر ہو گیا۔ اور لارنس کو رومیو کے آنے کی توقع نہ رہی تو وہ خود مقبرے روانہ ہو گیا۔ تاکہ جب جولٹ بیدار ہو تو وہ وہاں رہے۔ ورنہ مقبرے میں دَم گھٹ کر مر جائے گی۔ ابھی یہ مقبرے نہیں پہونچا تھا کہ وہاں پہلے سے پیرس آموجود ہوا۔ جس نے ساتھ کے آدمی کو تو یہ کہکر ایک درخت تلے چھوڑ دیا کہ تم یہاں رہو۔ اور جب کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہو، تو سیٹی بجا دینا۔ اور خود پھولوں کی چادر چڑھانے مقبرے میں اندر چلا گیا۔]

پیرس:۔ (اپنے میں آپ) جولٹ! پیارے پھول!! میں تیری ابدی سیج کو ان پھولوں سے سجانے آیا ہوں ۔۔ ۔۔۔۔۔ میری محبت کی نذر و نیاز یہی ہے کہ میں تیرے مزار پہ پھول چڑھاؤں۔ اور تیری یاد میں آنسو بہاؤں!۔

[پیرس ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اُس کے نوکر نے سیٹی بجائی۔ سمجھا کوئی آرہا ہے۔ اس لئے مقبرے کے دروازے میں ایک طرف چھُپ لیا۔ مگر کیا دیکھتا ہے کہ رومیو آیا ہے، اور مقبرے میں اندر جا رہا ہے۔ پیرس آڑے آکر اُسے اندر جانے سے روکتا ہے۔ دونوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ جس میں پیرس مارا جاتا ہے۔ رومیو، جولٹ کے پاس جاتا ہے۔]

رومیو:۔ (اپنے میں آپ) مرنے سے کچھ دیر پہلے انسان کتنا بشاشر ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے سنبھالا لینا کہتے ہیں۔ ہائے میں اسے کیوں کر سنبھالا لینا کہوں،؟ ۔۔۔۔۔ پیاری، جولٹ، دُلہن! گو موت نے تیرے سانس کا شہد چھین لیا۔ مگر تیری زیبائی کو تاراج نہ کر سکی! تجھے کسی نے نہ جیتا!! حُسن کا قرمزی پرچم تیرے لب و عارض پر جھُوم رہا ہے۔ موت کا زرد رنگ پھریرا ابھی تک نہیں لہرایا۔ ۔۔۔ ٹائی بالٹ! تم بھی یہاں سو رہے ہو؟ ۔۔۔۔ بتاؤ، ان ہاتھوں تمہاری اور کیا خدمت کروں۔ جن سے میں نے تمہیں موت کے گھاٹ اُتارا ہے!۔۔ ۔۔۔۔ بھیّا! مجھے معاف کر دو! ۔۔۔۔ جولٹ! تم اب تک کیوں اتنی دلربا ہو؟ ۔۔۔۔ کہیں اَن دِکھ موت بھی تو تمہاری گھائل نہیں ہو گئی۔ جو تمہارا یہ سبھاؤ ہے۔ مجھے اس بات کا خوف ہے۔ میں یہاں ٹھیرونگا۔ اس اندھیرے محل سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے یہیں اَبدی چین ملے گا۔ اور زندگی کے بجھ تھکے ماندے کو قسمت پھر جہاں تہاں کی ٹھوکریں نہ کھلوائے گی!۔۔۔۔۔ آنکھوں! اپنے نور کی پتلی کو آخری مرتبہ دیکھ لو۔ بانہوں! آخری دفعہ اس پیکرِ محبت کو کلیجے سے لگا لو۔ لبوں! اے سانس کے دروازوں!! جولٹ سے آخری پیام سلام کر لو!!۔۔ ۔۔ بس اب آ، اے تلخ رہنما!! بدمزہ ناخدا!!!۔ اور میری ڈوبتی جیون نیّا کو موت کی چٹان سے ٹکرا دے!! (شیشی کو دیکھکر) یہ جولٹ کا جامِ محبت ہے!!! ۔۔۔۔۔ (زہر پی لیتا ہے) ۔۔۔۔ اے سچے دواساز! واقعی تیری دوا زود اثر ہے!!

[رومیو وہیں گر کے مر جاتا ہے۔ اتنے میں دوسرے دروازے سے لارنس روشنی لئے ہوئے دبے پاؤں آتا ہے۔ مگر یہاں منظر ہی اور دیکھتا ہے۔ ادھر پیرس کا نوکر سارے مقبرے کے دربانوں کو اُٹھا دیتا ہے۔ اور اپنے آقا، رومیو اور لارنس کے مقبرے میں جانے کی خبر کر دیتا ہے۔ چوطرف جاگ ہو جاتی ہے۔ دربان مقبرے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ لارنس، جولٹ کے پاس آتا ہے اور وہ بیدار ہوتی ہے۔]

جولٹ:۔ (لارنس سے) اے سُکھ چین دینے والے بزرگ!، فرمایئے؟ وہ کہاں ہیں؟؟ ۔۔۔۔ میں سمجھتی تھی کہ بیدار ہوں گی تو کہاں رہوں گی۔ شکر ہے وہیں ہوں ۔۔۔۔۔ بولئے نا! وہ کہاں رہ گئے؟؟۔

(مقبرے میں لوگوں کے آنے کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔)

لارنس:۔ (سراسیمہ) جولٹ، اُٹھو، دیکھو۔ کوئی اندر آرہا ہے ۔۔۔۔ موت کے اس نشیمن سے نکل بھاگو۔ بیٹی! ایک بالاتر قوت نے ہمارے ارادوں کو زیر کر دیا! چلو، چلو، رومیو یہ مرا پڑا ہے۔ پیرس بھی جان سے گزر گیا۔ آؤ اب تم بھی اللہ کی یاد میں زندگی گزار دو۔ زیادہ کہنے سُننے کا وقت نہیں۔ دربان جاگ گئے۔ دیکھو، خاصے قریب آگئے ہیں۔ یہاں ٹھہرنا کسی طرح ٹھیک نہیں ہے۔

جولٹ:۔ (بگڑ کر) جایئے، آپ یہاں سے چلے جایئے۔ میں نہیں جاؤں گی۔

(لارنس چلا جاتا ہے)

جولٹ:۔ (رومیو کو دیکھ کر) یہ کیا ہے؟ شیشی؟! ۔۔۔۔ زہر کے ہاتھوں آغوشِ الٰہی میں سو گئے! ۔۔۔۔ کیا خوب! سب کا سب

(اب حیات پی لیا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لئے بوند بھی نہ چھوڑی کہ مجھے مدد ملتی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید ان ہونٹوں پر کچھ لگا رہ گیا ہو۔ جو میرا کام بنا دے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف! ہونٹوں میں اب تک جان کی گرمائی ہے!!

(لوگوں کے آنے کی آوازیں! در قریب آنے لگی ہیں۔)

جولیٹ:۔ (اپنے میں آپ) لوگ بہت قریب آ گئے! جولیٹ!! بس اب قصہ تمام کرو!!!۔

(یہ کہکر رومیو کے پہلو سے خنجر نکالتی ہے۔)

جولیٹ:۔ (خنجر کو دیکھتے ہوئے) یہ سینہ تیری نیام ہے! (سینہ میں خنجر بھونکتے ہوئے) یہاں بسرام کر!!۔

(رومیو کے جسم پر گر کے مرجاتی ہے۔)

(لوگ آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ بوڑھا لارنس ساری بپتا سناتا ہے۔ جسے سُنکر سب سینہ کوٹ لیتے ہیں۔ اور اس دن سے ایسے شیر و شکر ہوتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں لڑتے جھگڑتے۔ مبارک ہیں دیس کے بیٹا بیٹی جن کی جاں نثاری سے روٹھے من جائیں! بچھڑے مل جائیں!!)

سید وزیر حسن

ارمغانِ عید

(بحضورِ دوست)

موسمِ گُل سے کیا غرض برگِ خزاں رسیدہ کو
دیدِ خوشی سے کام کیا دیدۂ خوں چکیدہ کو

فصلِ بہار آ گئی عیش مناؤ خوش دلو!
کافی ہے سوز و سازِ درد چاکِ جگر بُریدہ کو

یوں ہے دلِ تباہ کی حالتِ زار ہمنفس
کوئی مسل کے پھینکدے غنچۂ نارسیدہ کو

قابلِ داد ہے مگر تیرا یہ ظلم بھی خزاں!!
جلتی ہی جا رہی ہے کر، سبزۂ نو دمیدہ کو

داغِ جگر دکھاؤں گی، قصۂ غم سناؤں گی!
خواب ہی میں کبھی نواز اپنی الم رسیدہ کو

لذّتِ انتظارِ مرگ، پوچھ نہ مجھ سے ہمنشیں
آتا ہے کچھ قرار سا اس میں دلِ طپیدہ کو

اے دلِ درد آشنا! شکوۂ بخت تا کجا؟!
جامِ طرب ہی زہر ہے، لذّتِ غم چشیدہ کو

اب ہے غمِ فراق ہی، رُوحِ روانِ زندگی!
سوزشِ مستقل سے ہے تاب و توانِ زندگی!

"دلفگار"

ساقیِ گلفام

گھنگھور گھٹا جھوم کے اٹھی ہے سرِ شام   گل گشت کو نکلے ہیں حسیں، شوخ، گل اندام
تھمتی نظر آتی نہیں شیشے میں ذرا رام   لا دو رہیا ئے خانۂ تنشیط کے اجرام

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

رنگین فضائیں ہیں دہک جائے گلابی   سرمست نوائیں ہیں چھلک جائے گلابی
سرشار ہوائیں ہیں بہک جائے گلابی   بارش کی سرائیں ہیں بہک جائے گلابی

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

ہر چہرۂ گل رنگ پہ آتے ہیں پسینے   بجلی کی چمک سے دمک اٹھے ہیں نگینے
کوئل کی صدائیں ہیں لگاوٹ کے قرینے   بے تاب ہیں لٹنے کو نوا سنج دفینے

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

عُریاں ہیں مرے سامنے فطرت کے نظارے   مہ پاروں کا دربار ہے ساگر کے کنارے
تقویٰ شکن آنکھوں میں جوانی کے شرارے   ہر سانس میں لہرائے ہوئے شوق کے دھارے

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

کھائی ہے نہ پینے کی، پلانے کی قسم، خوب!   اس میکدہ بردوش زمانے کی قسم، خوب!
متوالے، حیا بیز ترانے کی قسم، خوب!   ہنس ہنس کے مجھے اپنا بتانے کی قسم، خوب!

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

ساون کے ہیں لمحات جنوں خیز گہربار   آغوشِ سماعت میں لئے نغمۂ سرشار

انگڑائیاں لیتی ہے تجلّیِ طرب زار سوتوں کو جگا دیتی ہے پیمانوں کی جھنکار
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

اس فصل میں لازم ہے پئیں اور پلائیں خوابوں کو لئے نغمۂ تخریب جگائیں
پُر کیف رہیں، کیف میں عالم کو بسائیں ہر ذرّۂ ناچیز کو فردوس بنائیں
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

لو دونگڑا ہے مینہ کا اثر ہو گیا جل تھل آئی ہے ندی بازوؤں میں پارے کا جل
ہر فرشِ زمیں ہو گیا گل بوٹوں سے مخمل اس رُت میں نہ کیوں بیٹھ لنڈھا جام میں بوتل
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

بوندوں کی ٹپاٹپ ہے نکھر آئے ہیں گلشن ضَو ریز ہیں الماس، قیامت کا ہے جوبن
ہر گوشۂ ویرانہ ہے اک وادیِ ایمن رنگ رلیاں ہیں، جھولے ہیں، فسونکار فسوں فن
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

آ، ساغرِ بلّور میں کونین سما دے! آنکھوں میں جو کھنچتی ہے وہی آج پلا دے
اربابِ شریعت کو نگاہوں میں جھکا دے اک دھوم مچا دے، ارے اک دھوم مچا دے
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

صدقے ترے انداز کے اے ساقیِ گلپوش ہر ایک ادا ہے تری شوخیِ غزل کوش
اس بادلے موسم میں عطا کر مئے سرجوش کاوش کو نہ احساسِ تکلّم کا رہے ہوش
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

جوشؔ حیدرآبادی

بھوجائی

(ایک [illegible] محترمہ چودھرانی ضیا رحمٰن صاحبہ)

جناب بھاوج صاحبہ، سلام و دعا۔ آپ کی خدمت میں عرض ہے آپ عاشق جان قطعی نہیں ہیں۔ بلکہ بھاوج ہیں اردو کی اصطلاح والی بھابی ان تو فلسفہ والی مسز سراج الدین ہیں۔ اور بھوجائی ایک دوسری ہیں۔ آج آپ کو ان کا تھوڑا سا حال سناتا ہوں اور اسی کو جی چاہے آپ رسالہ میں چھاپ دیجئے ورنہ اب اس بڑھاپے میں افسانے کہاں سے آتے۔

جس روز میرا اسکول کی دوسری جماعت میں داخلہ ہوا تو ہم تین کے مرغا بنائے گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ تیسرے گھنٹہ میں ماسٹر صاحب کے آنے میں دیر ہوئی، اور لڑکوں نے مجھے نیا سمجھکر آڑے ہاتھوں لیا۔ نوبت پلش پر پہونچی۔ نتیجہ یہ کہ ماسٹر صاحب آن پہونچے اور ہم تین لڑکوں کو دو دو نٹے مارکر مرغا بنا دیا۔

مرغا بنے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے پڑوسی مرغ کی ٹانگ جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کان ہاتھ میں بند تھی مگر چھنگلی کے پاس ایک اور صحیح سالم چھنگلی مٹر کی پھلی کی طرح لٹک رہی ہے۔ میں نے سلسلہ تحقیقات آہستہ سے اپنا ہاتھ ٹانگ میں سے نکال کر اس انگلی کا کر جو معائنہ کیا ہے تو یہ مرغ چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ ٹانگ میں لے جا کر بدستور اپنا کان پکڑ لیا۔ لیکن ماسٹر صاحب نے دیکھ لیا۔ حالانکہ میں نے انگلی آہستہ سے صرف چھو کر دیکھی تھی۔ لیکن چھنگا انگلی کھینچنے کے الزام میں خوب پٹا۔ چھنگا بھائی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک فاضل انگلی اس طرح لٹک تھی اور یہ اس کام آتی تھی کہ لڑائی ہو تو پکڑ لی جائے۔

بھائی چھنگا کا نام رام لال تھا اور یہ ذات کے بنئے تھے۔ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ صرف ایک بہن منی تھی جو وقفہ میں انکے ایک گلاس دودھ بھر کر لاتی تھی جو اکثر یار لوگ پی جاتے تھے۔ بھائی کے باپ کی مصالحوں اور کرانے وغیرہ کی دوکان تھی۔ بہت جلد میری اور ان کی ایسی دوستی ہو گئی کہ ہم دونوں بچے تو تھے ہی لیکن بھائی ہو گیا۔ ایسی یاری اور بے تکلفی ہو گئی کہ عرض نہیں کر سکتا۔ میرا انکا چار برس ساتھ رہا۔ اس لئے کہ میرے والد صاحب کو وہ شہر چھوڑنا پڑا ذرا غور کیجئے کہ کبھی عمر بھر چھنگا بھائی سے خط و کتابت نہ ہوئی۔ زمانہ گذر گیا۔ ایک دوسرے کو بھول بھال گئے۔ مرے جئے کی خیر خبر نہ رہی کہ ابھی حال میں انہی سے مع بھوجی کے ملاقات ہو گئی۔ اس ملاقات کا مختصر حال سناتا ہوں۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کام سے رتلام جانا پڑا۔ رتلام جاورہ سے ریلوے سے ڈوا اسٹیشن اور بذریعہ موٹر جو بیس میل پختہ سڑک ہے۔ میرا ایک دوست کی آمد کے سلسلہ میں موٹر سے گیا۔ یہ بدتمیز دوست نہ آئے۔ مایوس چلا آرہا تھا کہ سر اٹھا کر دیکھا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کھدر پوش بزرگ مجسم کانگریس بنے، گاندھی ٹوپی لگائے، ڈیڑھ بالشت کی ڈاڑھی اور مونچھوں میں کل کا کل منہ پوشیدہ، پیشانی پر لال پیلا قشقہ اس زور کا لگائے کہ برہمن شرمائے۔ گود میں دو سال کا بچہ۔ پیچھے ایک سفید چادر اوڑھے کوئی ڈھائی ڈھائی سیر کی پازیب پہنے خوش جمال اور نو عمر عورت۔ میں بھلا ان سورما گو کا ہیکو پہچانتا۔ مگر گود والے ہاتھ کو دیکھا تو چھنگلی لٹک رہی تھی۔ ایک بجلی سی کوند گئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ لاکھ ضبط کرتا ہوں پر جی نہیں مانتا۔ قدم بڑھا کر آگے راستہ کاٹا۔ میں نے کہا "کیوں جی۔ یہ تم کس کی عورت بھگا لائے؟" میں نے نو عمر بھوجی کی طرف انگلی اٹھا کر پوچھا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کافی طور پر برہم ہو سکیں یا آنکھیں نکال سکیں میں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ارے صاحب میں اس خوفناک ڈاڑھی والے کانگریسی کو پیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ڈاڑھی وار گال پر بوسہ دینا چاہتا ہوں۔ خواہ میری عینک ڈاڑھی میں الجھکر رہ جائے۔ مگر وہ شرمیلی بہو کی طرح لڑے پڑتے ہیں۔ مگر توبہ کیجئے۔ لونڈا الگ حمزہ بن کر گود سے سڑک پر آ پڑا پر میں نے نہ چھوڑا۔ نہ یہ سوچا کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہیگا۔

ہم دونوں دوست ایک دوسرے کو پہچان کر محبت سے مل رہے تھے اور ان کی بیوی اس عجیب و غریب سین کو دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے ہی سے پتہ چلتا تھا کہ پہلی بیوی کا بھوجن کر چکے اور یہ دوسری بیوی ہیں۔ اب انہوں نے مجھ سے پردہ کیلئے گھونگھٹ فرما لیا تھا۔ میں نے

زرا او قدر دانی پھر پوچھا "بھئی یہ کہاں سے بکالائے ؟ وہ پہلی والی کیا ہوئی ؟ اور وہ جوڑا بھی کب چھوڑا ؟ . . . بھئی ہم بھی تو دیکھیں . . . " اور یہ کہکر جو بڑھا بیں بھوجی کی طرف تو جھنگا سخت خفا ہو کر مجھے مارنے کو کہا۔ لڑنے لگے کہ کیسی جوڑا بن۔ مجھے بیہودہ بدتمیز سب کچھ کہا

آپ جانتے ہیں مسافر کے پاس تو جراثیم ہوتے ہیں۔ وہ مجبور ہوتے ہوئے کوئی تیرتھ والی مزید حماقت کر کے گھر جاتے تھے گاڑی چھوٹنے کے بے حد قائل۔ ادھر میں نے کہا کہ بھئی جا درہ راستے میں پڑتا ہے ایک دورہ نہ ہو۔ گیا غرض کہ دس اس موذی نالہ سے کیسا کیا کہا پر نہ مانا۔ میں نے بھتیجے کو گود میں لے لیا تھا کہ کل و ملاقات۔ طے ہو گیا کہ وہ نہ مانیں گے۔ ان کی گاڑی میں بٹھانے گیا۔ اور اب خدا حافظ کر کے اور بھوجائی جی سے بھی رخصت ہوا۔ میں نے کہا "بھوجی جی یہ بھتیجے ہیں بدد اور دراصل تم ان کی داڑھی پر نہ جاؤ ہم اس کے بدلے دو کا انتظام کرا دیں گے " حضرت جھنگا نے اس پر خندہ فرمایا اور کہنے لگے "بڑے بیہودہ ہو۔ طے ہو گیا پہنچ ہم لیں گے۔ بھوجائی جی نے کہا کہ لیلو۔ میں ان کو رخصت ہو کر بھتیجے کو دے کر اپنی موٹر پر آیا اور جھنگا مجھے رخصت کرنے آئے۔ میں نے بچے کو پیار کیا اور جھنگا سے کہا "یار یہ لونڈا مجھے دیدو" وہ ہنسکر بولے "لیلو" میں موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی میں نے بچہ دینے کا شکریہ ادا کیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ نہ مذاق ہی سمجھے اور میں بھتیجے کو لیکر یہ جا وہ جا۔ سیدھا جاورہ آکر دم لیا۔ مجھے نہیں معلوم وہاں میاں بیوی پر کیسی گذری۔ مگر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

گھر پر پہونچا تو گھر والی نے پوچھا۔ اُسکو سارا حال بتایا۔ بچہ مزے میں کھیل رہا تھا۔ اور راستے مٹھائی کھلونوں پر ڈھر لیا۔

زیادہ دیر گھر پہونچے نہ ہوئی تھی کہ ریل کی آواز آئی اور کوئی پندرہ منٹ میں ایک تانگہ آکر رکا۔ بھائی جھنگا اور بھوجائی جی موجود۔ "خیر تو ہے " میں نے کہا "کیسے آئے ؟ " ادھر نہ پوچھئے بھائی جھنگا کا حال۔ جز بز ہو رہے تھے۔ زیادہ جو اکڑے تو میں نے کہا "ایسے ہوش میں بھی ہے۔ غصہ دکھانا گورنمنٹ افسروں کو۔ یہ آپے سے باہر کیوں ہوا جاتا ہے "

مجھے مطلع کیا گیا کہ حضرت مذاق قطعی ناپسند فرماتے ہیں۔ اب خلاصہ یہ کہ لڑکا لاؤ تو جاکر دھرم شالہ میں ٹھہریں۔ میں نے اوپر سے نیچے تک دیکھکر کہا کہ "بچا یاد رکھو عقل ٹھکانے کر دوں گا۔ سیدھے سیدھے اتر آؤ "

نوکروں نے جلدی جلدی اسباب لیا۔ غرض دوست کو گھر میں اتارا۔ ذرا دیر میں محبت کی باتیں کرنے لگے۔ بچوں کو پیار کرنے لگے۔ آدمی ہو گئے۔ قصہ مختصر آرام سے ٹھہرائے گئے۔ پانی وغیرہ کا انتظام کرایا۔ کھانے کیلئے میں نے گھر والی کو آواز دی کہ بھئی کباب پراٹھے پکاؤ۔ اس پر بیحد خفا ہوتے کہنے لگے "یہ کیا بیہودہ مذاق ہے " اور میں نے بھوجائی کے سامنے کہا "یار کیوں جھوٹ بولتا ہے بکرے کے بکرے ہضم کر گیا " اور بھوجی سے میں نے پوچھا "کہ تم کیا کھاؤ گی۔ انڈا مرغی کیا لو گی "

بھوجائی جی نے "ہے رام " کی صدا کھینچی اور میں نے اُن سے معافی مانگی یہ سوچکر کہ بھئی میں نے سمجھا کہ میرے دوست کھاتے پیتے ہیں تو تم بھی کھاتی ہو گی۔ اس بات پر جھنگا بہت خفا ہوئے بہت بُرا مانے۔ اور سیدھے ہو بیٹھے۔ اپنے کہ میری بیوی نے کہا کہ بُرا مان گئے اور ایسا نہ چاہیئے تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ تم کیا جانو اسے یہ بڑا ہتھیارا آدمی ہے۔ جھنگا ہاتھ منہ دھونے گئے اور میں نے گھر والی سے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا کہ چھپا کے کبابوں کا انتظام کر دینا ورنہ بہت ہی بُرا مانیگا یہ میں نے اس طرح کہا کہ بھوجائی یہ سمجھیں کہ میں اُن سے چھپا کر چپکے سے کہہ رہا ہوں۔ مگر اس انتظام سے کہا کہ وہ اچھی طرح سُن لیں۔ اور یہ بھی تاکید کر دی کہ بھوجائی کو پتہ نہ چلے۔

اور گھر والی سے یہ کہکر میں نے بھوجائی جی سے کہا "میں تو اپنے دوست سے مذاق کرتا ہوں یہ گوشت کبھی نہیں کھاتے ہیں۔ میں نے تو جھوٹ کہا تھا۔ توبہ توبہ کہیں یقین آپ بھی نہ کر لینا "

اور میں نے بھوجائی جی کے معصوم چہرے کو دیکھا۔ انہیں کب ایسے معاملات سے سابقہ پڑا ہوگا۔ اور ادھر میری بیوی اس دھوکے میں کہ واقعی جھنگا دوست چھپ کر کباب کھائیں گے۔ چنانچہ اُس نے پوشیدہ انتظام کرنا شروع کیا۔ اب درمیان میں جو میں نے چھپ چھپ کر دو چار ہدایتیں گھر والی کو دیں تو بھوجائی جی کے بیچ بیچ کان کھڑے ہوئے۔ اس لئے کہ واقعی آدمی کو جلد سے جلد کبابوں کے انتظام کیلئے دوڑایا جا چکا تھا۔

دوسرا آدمی ایک برہمن کے یہاں پوری کچوری اور مٹھائی کے انتظام کے لئے گیا تھا۔ اور بار بار میں بھوجائی جی کو سُنا رہا تھا کہ بڑی اُونچی ذات کے برہمن کے یہاں بھوجن تیار ہو رہا ہے۔ ادھر جھنگا بھائی ہاتھ منہ دھو کر اپنی بیوی کے پاس گئے۔ اور ادھر میں قینچی چھانٹنے لگا کہ کس قینچی سے ان کی داڑھی پکی جاوے۔

اب ادھر کا حال سُنئے۔ میاں بیوی میں کچھ ماتم رہا ہو، ہم نے

میاں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ کیا معلوم کیا۔ نہیں ہوتیں کہ میں نے پکار کر یہ تجویز کی کہ ہم تم ساتھ کھائیں گے اور عورتیں علیحدہ۔ وہ بولے "ٹھیک ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چھنگا میرے پاس آئے۔ بیحد سنجیدہ، ملول اور کبیدہ خاطر۔ آپ یقین مانئے گا کہ ان کی بیوی کا عقیدہ متزلزل ہو گیا۔ چھنگا نے مجھے بہت سمجھایا کہ ایسی باتیں نہ کرنا چاہیئے ورنہ ہمارے یہاں آ؟ چلے جائیں گے۔

لیکن باوجود برہمن کا کھانا کھانے کے چھنگا کی آفت آ گئی۔ میں نے گھر والی سے پھر اس طرح چپکے سے کہا کہ بھوجائی جی سن لیں۔ میں نے کہا کہ "بھئی یہاں تو موقع نہیں ملا چھنگا بھائی کہتے ہیں کہ بھوجائی جی مشکوک ہو گئی ہیں۔ لہذا سیر کرنے چلیں گے وہاں کھائیں گے۔ لہذا موٹر میں تم چھپا کر رکھوا دینا۔ کہیں بھول نہ جانا اس لئے کہ انہوں نے کھانا قصداً نہیں کھایا ہے اور بھوکے رہ گئے ہیں۔"

اب تقدیر کی خوبی کہیئے کہ چھنگا بھائی نے واقعی کھانا بہت ہی کم کھایا تھا۔ لہذا بھوجائی جی کا ماتھا اور کبھی ٹھنکا۔ یہی کیا کم تھا کہ بعد کا ڈرامہ۔ موٹر میں ایک لپٹے ہوئے رومال میں کٹوردان جو رکھنے لگے تو چھنگا بولے "یہ کیا ہے" تو میں نے کہا "دہی ہے"۔ وہ مسکرا کر بیٹھ گئے اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔

شام کے وقت میں نے چھنگا کو موٹر ہی پر مٹھائی اور کچالو اور الا بلا کھلائی اور خود بھی کھائی۔ چھنگا دہی بڑے بہت کھا گئے کہنے لگے کہ "یار اب کھانا نہیں کھایا جائے گا۔" میں نے دل میں کہا کہ رہ جاؤ تیری گت بنوائی ہو جو یاد کرے۔

ہم دونوں واپس آئے۔ رات کے کھانے کے لئے جو پوچھا گیا تو بولے کہ نہ کھائیں گے۔ اور بھوجائی جی نے جو مشکوک ہو کر پوچھا "کیوں؟" تو بولے "ہم کھا آئے ہیں؟" اور قبل اس کے کہ بھوجائی جی کچھ بول سکیں۔ میں نے کہا "بھوجائی جی قسم لے لو جو سوائے دہی بڑے اور مٹھائی کے کچھ بھی کھایا ہو۔ بازار سے منگائے تھے۔۔۔۔"

اب لاکھ بھوجائی جی سے کہا جاتا ہے کہ کھانا کھا لو مگر انہوں نے نہ کھایا۔ میں نے چھنگا سے کہا کہ "یار جو رو سے وجہ تو پوچھ۔"

اب جناب یقین کریں کہ وجہ جو پوچھنے علیحدہ گئے تو جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ بھوجائی جی نے خوب رونا شروع کیا۔ اب لاکھ میں سمجھاتا ہوں کہ خدا کی بندی یہ تیرا شوہر سوائے دال ساگ کے کبھی کچھ نہیں کھاتا۔ خود چھنگا خفا ہوتے ہیں، مگر توبہ کیجئے! کھیل بگڑ گیا۔

چھنگا سے مجھ سے خوب لڑائی ہوئی۔ ایسی کہ پرانا زمانہ یاد آ گیا۔ بہت برا مانے اور بات نے بیحد طول کھینچا۔ رات گئے جا کر ان کو منایا سمجھایا۔ مگر بھوجائی جی بگڑی پھولی پڑی رہیں۔

رات کو سونے کا وقت آیا تو میں نے کہا تم ادھر سو رہو میں اندر سوؤں گا۔ بار بار وجہ پوچھنے لگے مگر میں نے نہ بتائی۔ آرام سے لیٹ گئے۔ میں نے بھی کہا کہ رات گئے تک بیٹھا رہوں گا لہذا ساتھ سونا نہ سونا برابر ہوا۔ چھنگا تو مزے سے باہر لیٹے۔ میں اندر جو آیا تو بیوی نے وجہ پوچھی۔ میں نے دبی زبان سے کہا "جانتی ہو نیند وا رات کو آتا ہے"۔ بیوی ہنسنے لگی مگر بھوجائی نے سن لیا۔ اب میری طرف غور سے دیکھتی ہیں۔ میں نے کہا "دیکھتی کیا ہو! بڑے آرام سے سوئیں گے۔"

میں نہیں عرض کر سکتا کہ وہ کس طرح بے کل ہو گئیں۔ کسمساتی رہیں۔ میں نے قصداً موقع دیا اور وہ سٹک کر گئیں اور چھنگا سے کہا۔ چھنگا مارے ہیبت کے پھاند پڑے۔ گھبرا کر چلائے۔ میں پہنچا تو اکیلے کھڑے تھے۔ میں نے کہا "خیر تو ہے" کہنے لگے "تم گرمی میں کیوں اندر سو گئے" میں نے کہا "یونہی!" کہنے لگے "یہاں نیند وا آتا ہے!" میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ، ہو نا آخر کو بنیئے۔ ہاں اب تھوڑی آتا ہے۔ پہلے آتا تھا" یہ سنکر گویا پھاند پڑے "ارے! وحشت کہیں کا!" تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ اب لاکھ میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ ہرا د اب نہیں آتا پہلے آتا تھا مگر نہیں مانتے۔ گھر سر پر اٹھا لیا۔ اندر آ گئے۔ غل مچایا کہ مجھے کھا جاتا تو کیا ہوتا۔ بھوجائی کی جان ضیق میں آ گئی تھی۔ وہ بھی بڑبڑائیں۔ قصہ مختصر نہ مانے۔ اندر سونے پر راضی ہوئے۔ میں نے کہا کہ "یار ادھر چور آتا ہے۔" ہنسنے لگے کہ "رہنے دو!"

اس کے بعد بڑے محبت اور پیار کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ کس طرح بھوجائی کو یقین دلا دیا ہے کہ تم گوشت کھاتے ہو۔ سارا قصہ سنکر اٹھ بیٹھے۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بیحد رنجیدہ ہو کر بولے "پرسے ہو گئی"! محض اس وجہ سے کہ نہ صرف بھوجائی بلکہ بدقسمتی سے میری بیوی بھی یقین کرتی ہے کہ گوشت کھاتے ہیں۔

کہنے لگے کہ "یار بڑا غضب ہو گیا۔ کیا سوچتی ہو گی!" میں نے کہا "یہی سوچتی ہے کہ چھپ چھپ کر بکرے تو ہضم کر جاتے ہو نہ معلوم انکی ڈھیر چھوڑتے ہو کہ نہیں۔" بڑی فکر میں پڑے رہے۔ ایک یہی کیا غم تھا کہ گھر والی ان پر شبہ کر رہی تھی۔ میں نے کہا "یار اب سو رہو کل اٹھ کے تردید کر دیں گے۔" مگر تردید مشکل تھی اس لئے کہ بھوجائی جی کا عقیدہ تھا کہ مسلمان کی دوستی میں لوگ گوشت کھانے لگتے ہیں اور چھنگا کی

بدقسمتی سے اُن کے میکے میں اس کی کئی مثالیں تھیں۔

اب دوسرے دن لاکھ تردید کرتے ہیں مگر بھوجی چپ۔ بڑی مشکل سے انہوں نے صبح ناشتہ کیا۔ جانے کو تیار۔ کپڑے کیسے میں نے رو کا ہے اور کیسا کیسا ان کو سمجھایا کہ بھیا ایک روز اور ٹھہر جاؤ پر نہیں مانتے۔ کہنے لگے کہ شگون روانگی کا بہترین ہے۔ پھر ایسا شگون مہینوں نہ آئیگا میں نے دل میں کہا "ٹھہر تو جا تیرا شگون درست نہ کر دیا تو میرا ذمہ"

غرض شام کی گاڑی سے روانہ ہو گئے۔ میں نے کہدیا تھا کہ شگون ٹھیک نہیں ہے نہ جاؤ مگر نہ مانے۔

دوسرے اسٹیشن گئے ہوں گے کہ پولیس نے ان کو اسی شبہ میں جا لیا۔ اس الزام میں پکڑے گئے کہ پرائی عورت اندور سے بھگا کر لاتے ہو۔ گاڑی سے اتار لئے گئے۔ دادا کو رحم کر گئے۔ ہوش جاتے رہے۔ پولیس والا ہے کہ ہتھکڑی ڈالے دیتا ہے۔ قسمیں کھاتے ہیں میرا حوالہ دیتے ہیں۔ پولیس والے نے کہا کہ اگر مجھ سے تصدیق کرا دیں تو چھوڑ دیگا۔ تار پر وہ موذی کیا راضی ہوتا کہنے لگا نام بدل لیا ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ بھائی صاحب صبح کی گاڑی سے وارد اور کھڑا ہوا ہے تانگہ مع پولیس۔ خود سوچیے کہ میں بھلا کیا کرتا۔ میں نے کہا "میں اِن سے واقف نہیں ہوں۔"

یہ سُنکر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیران ہو کر بولے "ارے!" میں نے تخلیہ چاہا۔ سنجیدگی سے میں نے پوچھا "مرے یار ہم تمہیں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ غضب کے شاطر نکلے۔ غضب کیا ہمیں بھی نہ بتایا۔"

اب مع ڈاڑھی جھنگا بھائی کی قسموں کا حال نہ پوچھئے۔ میں نے بھوجائی کو بھی بلایا اور اُن سے کہا "بھئی ہم تم کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔ بھلا اس بدتمیز ڈاڑھی دار میں کیا رکھا تھا جو اس کے ساتھ بھاگیں۔" یہ سنکر وہ بیچاری رونے لگیں۔ جھنگا نے مجھے مارنے کی دھمکی دی۔ خوشامد کی۔ میں نے کہا "یار بڑی ذمہ داری ہے۔ ایک شرط ہے۔" بولے "وہ کیا؟" میں نے کہا "ہفتہ بھر ہمارے مہمان رہو۔" کہنے لگے "یہ ناممکن ہے۔" میں نے کہا "بہتر ہے، تم جانو تمہارا کام ہم کچھ نہیں جانتے۔" ادھر پولیس والے نے تقاضہ کیا۔ چار و ناچار راضی ہو گئے کہ ہفتہ بھر ٹھہریں گے۔ چنانچہ پولیس والے کو میں نے دفان کیا کہ بھئی میرے دوست ہیں اور میں ذمہ لیتا ہوں کہ یہ ان کی بیوی ہیں۔

اب اس لالہ کی بے ایمانی دیکھئے کہ دوسرے ہی دن بگڑ کھڑا ہوا کہ تم نے پولیس والے کو سکھا دیا تھا۔ کسی طرح نہ مانا۔ خلاف وعدہ بھاگ گیا اور مثل سابق جو پولیس نے ریل میں پھر پکڑا تو اُسے مارا اور صاف نکل گیا۔

یہ تو سب کچھ مگر غور کیجئے بھوجائی جی کو کہ خط جو آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بھوجائی بجے ہنستی ہیں۔ اور ایک دفعہ پھر آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اور اس جھنگا احمق سے خط برابر لکھوائی رہتی ہیں۔ [1]

عظیم بیگ چغتائی

---

[1] تقریباً سال بھر سے چغتائی صاحب علالتِ مزاج کی وجہ سے ساقی کے لئے کوئی مضمون نہ لکھ سکے۔ پھر اُن کے مرض نے اتنی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی کہ وہ خطوط کے جواب بھی دینے سے معذور ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اُن کی طبیعت سنبھل رہی ہے اور انشاء اللہ ہم ان کا مژدۂ صحت بھی جلد سنیں گے۔ چغتائی صاحب کے مضمون کی ایسے کوئی اُمید نہیں تھی مگر ۱۴ دسمبر کو ایک لفافہ میں مندرجہ بالا خط یا مضمون ملا جس کے ساتھ چغتائی صاحب کا کوئی خط نہیں تھا۔ اسے سالنامۂ ساقی کے لئے اُن کا تحفہ سمجھکر شائع کر دیا گیا ہے۔ اگر فی الحقیقت یہ ساقی کے لئے مضمون نہیں بلکہ محترمہ حیا کے نام چغتائی صاحب کا مکتوب ہے تو اسے شائع کرنے میں پہلے چغتائی صاحب اور پھر مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن یہ اگر غلطی بھی ہے تو بہت لطیف اور دلچسپ کہ سالنامۂ ساقی میں ایک دلکش مضمون کا اِس سے اضافہ ہوا

گفتارِ بیخود

مُسخّر کرلیا کرتی ہے وحشت عشقِ جاناں کی ‖ بنیں تعویذ بازو دھجیاں میرے گریباں کی
ستم کے بعد یاد آنا انھیں شامت ہے انساں کی ‖ اجل بن جائیں گی یہ ہچکیاں بیمارِ ہجراں کی
ترے جلوؤں کی عادی ہیں نگاہیں اہلِ عرفاں کی ‖ سمائیں گی نظر میں کیا بہاریں باغِ رضواں کی
نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہی اک اگلی بہار انکی ‖ بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی
بنینگی نور یہ تاریکیاں یوسف کے زنداں کی ‖ دُعائیں بہرِ آرائش چلی ہیں پیرِ کنعاں کی
کہاں سے میں کہاں پہنچا مری قسمت کا کیا کہنا ‖ اِرم سے کھینچکر لائی مجھے مٹی کوئے جاناں کی
مرے قاتل نے کس پانی میں خنجر کو بجھایا تھا ‖ لہو کے ساتھ کچھ ٹپکی ہیں بوندیں آبِ حیواں کی
خلافِ وعدہ کوئی آگیا گھر ہوگیا روشن ‖ ہوئی تقسیم زلفوں میں سیاہی شامِ ہجراں کی
نشانی میرے قاتل کی مری بخشش کو کافی ہے ‖ الٰہی ٹوٹ کر رہجائے دل میں نوک پیکاں کی
علاجِ وحشتِ دل اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا ‖ گلے میں ڈالکر نکلا ہوں میں زنجیر زنداں کی
نہیں ملتی ہے دم بھر کو بھی یادِ رفتگاں دل سے ‖ نظر کے سامنے تصویر ہے گورِ غریباں کی
تصور میں رُکے آتے ہوئے تو خواب میں آئے ‖ کششِ سے دل کی سٹی گم ہوئی انکی نگہباں کی
وہ بہرِ فاتحہ آتے ہوئے اب کیوں جھجکتے ہیں ‖ کہ اب تو خاک بھی باقی نہیں تربت میں ارمانکی
امیدِ مرگ سے وابستہ تھی دیدار کی حسرت ‖ خوشی دیکھے دمِ آخر کوئی بیمارِ ہجراں کی
ترے عاشق تو ناکامِ تمنا رہ نہیں سکتے ‖ کہ صبحِ حشر نے کی ہے تلافی شامِ ہجراں کی
ہمارے سامنے اس حسنِ ظاہر کی حقیقت کیا ‖ ہماری آنکھ تو نظارگی ہے حسنِ پنہاں کی

اُبھر آئیگی کشتی بحرِ غم سے ڈوب کر بیخود
غلامی کا شرف حاصل ہی مجھکو شاہِ جیلاں کی

بیخود دہلوی

اُزومہ اُدوری

ٹوکیو میں گیشاؤں کی انجمن کی جانب سے سال میں دو مرتبہ ناچ دکھایا جاتا ہے۔ پہلا ناچ ماہ اپریل میں جب سکورا کی بہار ہوتی ہے۔ اسی کو "ازومہ اُدوری" کہتے ہیں۔ دوسرا ماہ نومبر میں جب خزاں کی وجہ سے درختوں پر سُرخ رنگ کھلتا ہے۔ اسے "اتشو کانی" کہتے ہیں پچاس سال سے یہ ناچ برابر ہو رہے ہیں۔ پہلے جب گیشاؤں کا اپنا تھیٹر نہیں بنا تھا تو مختلف تھیٹروں میں ناچوں کا انتظام ہوتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کی انجمن نے شمباشی امبوجو کے نام سے چو منزلہ تھیٹر تعمیر کرلیا تو اس میں ناچ ہونے لگے۔ اپریل و نومبر میں گیشاؤں کے ناچ ہوتے ہیں۔ باقی دس مہینے ڈرامہ دکھانے والی کمپنیوں کو کرائے پر دیدیا جاتا ہے۔

اس تھیٹر میں صرف علاقہ شمباشی کی گیشائیں کھیل کرتی ہیں جو فن کے اعتبار سے تمام ٹوکیو میں مشہور ہیں اور اپنی قدیم روایات کی حامل ہیں۔ گیشا کا فرض مردوں کی تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا ہے۔ کسب کمانا اس کا پیشہ نہیں۔ پہلے زمانے میں مردوں کے ساتھ عورتیں باہر نہیں نکلتی تھیں۔ مرد کسی سیاسی یا سماجی ضرورت سے ایک جگہ جمع ہوتے تھے تو گانا بجا کر ان کا دل بہلانے کے لئے گیشائیں طلب کی جاتی تھیں۔ عہدِ توکوگاوا (۱۶۰۰ء تا ۱۸۶۸ء) میں شوگن کا پایۂ تخت "ایدو" یعنی موجودہ ٹوکیو رہا۔ احکام شوگن کے بموجب ہر نواب کو چھ مہینے اپنی جاگیر پر اور چھ مہینے ٹوکیو میں بسر کرنے پڑتے تھے۔ ان نوابوں کے جلسوں میں سیاسی بحثیں چھڑ جاتی تھیں اور سخت کلامی تک نوبت پہنچتی تھی۔ گیشاؤں کا کام تھا کہ ایسے موقع پر لطیفوں اور چٹکلوں سے جانبین کی توجہ اپنی جانب منعطف کرلیں۔ اس کے لئے بہت سمجھ کی ضرورت تھی اور گیشائیں بڑی خوبی سے یہ فرض انجام دیتی تھیں۔ گانے بجانے اور ناچنے کے ساتھ لطیفہ سنجی ان کی تعلیم کا اہم جُزو تھا اور اب بھی ہے۔

عہدِ توکوگاوا کے بعد شاہی عہد میں بھی گیشاؤں کا یہی کام رہا۔ مدبرینِ مُلک سیاسی مسائل پر بحث کرنے کیلئے اپنے دفاتر کے خشک کمروں پر شمباشی کے ریسٹورانٹوں کو ترجیح دیتے تھے کہ یہاں سنجیدہ گفتگو کے ساتھ تفریح بھی ہوتی رہتی تھی۔ پچھلے تیس چالیس سال میں جاپان نے بہت ترقی کرلی ہے۔ اخبارات بے انتہا اور اعلیٰ پیمانے پر جاری ہوگئے ہیں اور ہر شخص گھر بیٹھے دُنیا بھر کی خبر معلوم کرسکتا ہے۔ پہلے یہ حال تھا۔ اُس زمانے میں گیشائیں تفریح طبع کے علاوہ معلومات بڑھانے کا بھی ذریعہ ہوتی تھیں۔ وہ ایک طرح کا اخبار تھیں اور مدبرین و عمائدین ان کے پاس خبریں حاصل کرنے آتے تھے۔ اخبارات کی روز افزوں اشاعت سے گیشاؤں کا بازار مندا ہوگیا۔ نا اہل گیشائیں پیٹ بھرنے کیلئے اپنے اعلیٰ معیار سے گر گئیں۔ یہی عام گیشاؤں کی بدنامی کا باعث ہوئی ہیں۔

گیشاؤں کے مکان پر کوئی مرد نہیں جاتا۔ یہ جاپانی ریسٹورانٹوں میں یا جلسوں میں فرمائش پر بُلائی جاتی ہیں اور وہیں ان سے مُلاقات ہوتی ہے۔ دعوتوں میں یہ کھانا پیش کرتی ہیں اور ساقی کی خدمت بجالاتی ہیں۔ حاضر جوابی سے حاضرین کو محظوظ کرتی ہیں اور گا بجا کر ان کا دل بہلاتی ہیں۔

سنبھالتی ہے۔ موجو زلزلہ ضامن اور آتش ضامن عمارت ہے۔ تین منزلوں پر تماش بینوں کی نشست کا انتظام ہے۔ ان کی تمام ضروریات عمارت تھیٹر کے اندر پوری ہوسکتی ہیں۔ کھانے پینے اور حوائج ضروری کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ایک منزل میں کئی کئی رسٹارنٹ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ چوکولیٹ، سگریٹ وغیرہ کی دکانیں بھی ہیں۔ تین جانب وسیع برآمدہ ہے جہاں جگہ جگہ مخملی صوفے لگے ہوئے ہیں کہ لوگ بیٹھ کر سگریٹ پی سکیں۔ آڈیٹوریم میں قیمت کے لحاظ سے الگ الگ درجے ہیں اور ان میں نشستیں محفوظ ہیں۔ آڈیٹوریم کے باہر تھیٹر کے جملہ انتظامات سے ہر کس و ناکس یکساں مستفید ہوسکتا ہے۔ یہاں درجے کی کوئی تخصیص نہیں۔ تھیٹر میں داخل ہوتے وقت ہر ایک کو مطبوعہ پروگرام جاپانی زبان میں مل جاتا ہے۔ غیر ملکیوں کے لئے انگریزی کا مختصر پروگرام مہیا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طویل مصور پروگرام قیمتاً مل سکتا ہے۔ ایک دکان پر مندرج پروگرام ناچوں کی تصاویر کے کارڈ فروخت ہوتے ہیں۔

سامنے اسٹیج ہے جس کے دونوں پہلوؤں میں آنے جانے کا راستہ ہے۔ آرکسٹرا اسٹیج پر نہیں ہے بلکہ آڈیٹوریم کی بغل میں ہے۔ دائیں جانب دو منزلہ آرکسٹرا ہے۔ بارہ گیشائیں نیچے بیٹھتی ہیں اور بارہ اوپر۔ نیچے کی منزل والیاں کچھ طبلہ بجاتی ہیں کچھ کندھے کی ڈھولک کچھ شامیسین اور کچھ بانسری۔ اوپر کی منزل میں چھ شامیسین بجاتی ہیں اور چھ گاتی ہیں۔ بائیں جانب والا آرکسٹرا ایک منزلہ ہے جس میں بارہ گیشائیں شامیسین بجاتی ہیں۔ سب کی نشست دو زانو ہے۔ دونوں آرکسٹرا باری باری سے بجاتے ہیں۔ جب ایک آرکسٹرا کام کرتا ہے تو دوسرے پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مغربی بینڈ بھی ہے جو دائیں آرکسٹرا اور اسٹیج کے درمیان واقع ہے۔ اس میں بھی کنڈکٹر کے علاوہ تمام باجے والیاں عورتیں ہوتی ہیں۔

آرکسٹرا کی ترتیب کے علاوہ اس تھیٹر میں ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ اسٹیج کے پہلوؤں کے سوا دو راستے اور ہیں جن سے اداکاریں آتی جاتی ہیں۔ دونوں آرکسٹروں کے سامنے یعنی آڈیٹوریم کی بغل میں راستے بنے ہوئے ہیں جو اسٹیج سے آڈیٹوریم کی پشت تک جاتے ہیں گویا کہ "نو" تھیٹر میں ایک پل ہوتا ہے یہاں دو ہیں۔ اداکاریں ان پلوں پر سے اداکاری کرتی ہوئی آتی ہیں اور اسی طرح حاضرین کی بغل میں سے اداکاری کرتی ہوئی پیٹھ کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں۔

کابکی تھیٹروں کی طرح یہاں بھی ایک تماشہ مہینہ بھر تک دکھایا جاتا ہے۔ امسال پروگرام میں بیس ناچ تھے بعض ناچ ایک دوسرے سے غیر متعلق تھے تو منظر ختم ہونے پر تمام تھیٹر میں اندھیرا کر دیا جاتا تھا اور اداکاریں اندھیرے میں اسٹیج پر سے چلی جاتی تھیں اور پردے بدل جاتے تھے۔ اکثر ناچ ایسے تھے کہ ایک دوسرے میں ضم ہوجاتے تھے تو حاضرین کے سامنے ہی پردے بدلے جاتے تھے۔ درخت کھنچے چلے آرہے ہیں، مکان کھسکے چلے جارہے ہیں۔ نیچے سے جنگل کے جنگل اُٹھ رہے ہیں۔ اوپر سے مناظر اُتر رہے ہیں۔ کوئی آدمی ان کو جماتا ہوا نہیں دکھائی دیتا کوئی ہاتھ انہیں سرکاتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تمام کام کلوں سے ہورہا ہے۔ اسٹیج والے حاضرین کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرتے کہ جنگل لگا لگایا پیش کردیا بلکہ دکھا دیتے ہیں کہ ہم جنگل کا منظر اس طرح بناتے ہیں۔ اسٹیج والوں نے آپ کو اپنا رازدار بنا لیا۔ بعض

تماش بین اس آشکارا راز کو دیکھ کر ہنس بھی دیتے ہیں۔ مناظر جمانے کی ترکیب کے ساتھ ساتھ ان کی خوبصورتی نہایت دلفریب ہوتی ہے۔ منظر نگاری میں جاپانی کسی قوم سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی بڑھے ہوئے ہونگے۔ یہ صرف ایک پردے سے منظر نہیں بناتے بلکہ اس کے اجزا الگ الگ جما کر بڑا پیارا نظارہ مکمل کر دیتے ہیں۔

مناظر نگاری کے علاوہ جاپانی روشنی کے کام میں بھی استاد ہیں۔ روشنی کے لئے صرف اسٹیج کے آگے ہی برقی قمقمے نہیں ہوتے بلکہ پہلوؤں میں، آرکسٹروں کے اوپر، سامنے یعنی تماشائیوں کی پشت پر اور چھت میں طرح طرح کی روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔ کبھی پہلوؤں سے رنگین روشنیاں نکل کر اسٹیج پر رقص کرتی ہیں۔ کبھی سامنے سے روشنی کا ہالہ پڑتا ہے اور کبھی چھت میں سے نور کی چادر اُترتی نظر آتی ہے۔ غرضیکہ روشنی کا اعجاز دکھاتے ہیں۔ تماشے کے دوران میں آڈیٹوریم میں اندھیرا ہوتا ہے۔ راستہ چلنے کے لئے فرش میں قمقمے لگے ہوتے ہیں۔

تماشے کا نام تھا "جاپان آگے بڑھو"۔ اس کے دو حصے تھے۔ پہلے کا نام "حصۂ قلم" تھا اور دوسرے کا "حصۂ شمشیر"۔ پہلے میں نو ناچ تھے اور دوسرے میں گیارہ۔ تماشہ "ہنو مارُو۔ سمباسی" سے شروع ہوا۔ تین گیشائیں مردوں کے لباس میں آئیں اور آفتاب کے سامنے مبارکباد ناچیں۔ آفتاب جاپان کا قومی نشان ہے اور تمام جہان کو منور کرتا ہے۔ یہ ناچ مردانہ تھا، اسی وجہ سے اس میں کچھ کرختگی تھی۔

اس کے بعد دو ناچ "مُراساکی۔ شکیبُو" سے متعلق تھے۔ یہ ایک درباری خاتون تھی جس نے گیارہویں صدی میں "گینجی۔ مونوگتاری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ جاپان کا پہلا ناول ہے اور کلاسک مانا جاتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لئے اس نے ایک خانقاہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ جب وہ ختم ہوگئی تو اس کی خوشی میں ناچی ہے۔ پہلے ناچ کا نام "مندر میں چاند" ہے۔ نام کی مناسبت سے رات کا منظر تھا۔ چاند برآمد ہو چکا تھا۔ دو خادمائیں کشتی میں کتاب کی جلدیں لے کر حاضر ہوئیں۔ یہ اپنے حجرے سے برآمد ہوئی اور ان کے ساتھ جشن منایا۔ پہلے چاند کی پوجا کی پھر تینوں مل کر ناچیں۔ ناچ میں کتاب کا طریقہ اور لکھنے میں جو مشقت ہوئی اسے ظاہر کیا اور تکمیل پر اظہار مسرت کیا۔ دوسرا ناچ اسی کتاب کے ایک باب کی تفسیر تھا جس کا نام "اکاشی کا افسانہ" ہے۔ خلیج اکاشی پر شہزادہ گینجی اور شہزادی اکاشی سمندر کے کنارے نظر آتے ہیں۔ شہزادہ کسی مہم پر جا رہا ہے۔ دونوں الوداعی رقص ناچتے ہیں۔

چوتھا ناچ "کابُکی ناچ" تھا۔ اوائل سولھویں صدی میں کیوتو کے قدیم اسٹیج کا منظر ہے۔ سکُورا کی بہار ہے۔ "اِزُومو۔ اوکُنی" عورت اور "ناگویا۔ سنزا" مرد جو کابُکی کے بانی ہیں ناچتے ہیں۔ چھ خوبصورت لڑکیاں بھی ناچ میں شریک ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کے ناچوں میں پھولوں کے مناظر تھے۔

پانچویں ناچ میں دو گل فروش نوجوان لڑکے پھولوں کی بہنگیاں کندھے پر رکھے اسٹیج پر آئے اور رقص کیا۔

چھٹا رقص آلوچے کے پھولوں کا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا اور ایک لڑکی قدیم زمانے کی کسبیوں کے لباس میں ناچی، منظر میں آلوچے کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔

ساتواں ناچ سکورا کا تھا۔ چاروں طرف پھول کھل رہے ہیں۔ درخت لدے پڑے ہیں۔ یہ ناچ میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اسکے ودان میں اوپر سے گُل سکورا کی پتیوں کی بارش ہوا کرتی ہے۔ اس مرتبہ ایک جدت تھی۔ گیشاؤں کے ناچ میں سینما کی ٹکنیک مخلوط کردی گئی تھی۔ پتیوں کی بارش کی بجائے پردے پر اسی منظر کا فلم دکھایا تھا۔ پردے پر فلم اور اس کے سامنے اسٹیج پر ناچ کچھ ایسے ہم آہنگ ہوگئے تھے کہ لطف دوبالا ہوگیا تھا۔ ناچ میں ایک مرد سارنگی لئے ہوئے تھا اور ایک عورت شامیسین بجا رہی تھی۔ دونوں پہلے سازوں کے ساتھ ناچے۔ پھر انہیں رکھ کر۔

آٹھویں رقص میں وِسٹیریا کے پھولوں کا منظر تھا۔ پھولوں کے لمبے لمبے گچھے جابجا درختوں میں لٹک رہے تھے۔ دعورتوں نے ایک چھتری کے نیچے رقص کیا۔

نویں رقص میں گُل داؤدی کا منظر تھا۔ باغ میں دُور دُور تک اس کے گملے لگے ہوئے تھے اور جابجا کھل رہے تھے۔ س منظر میں گھروں کی نوکریں ناچیں۔ اس رقص کے ساتھ پہلا حصّہ ختم ہوا۔

دوسرے حصہ میں گیارہ ناچ تھے اور سب میں فوجی عنصر موجود تھا۔ پہلا رقص "یاماتو۔ داماشی" تھا۔ بہت سی گیشائیں مشیر کے مندر کے سامنے روح جاپان کے نغمے کے ساتھ ناچیں۔

دوسرے رقص میں ایک مشہور شمشیر ساز بھٹی کے سامنے تلوار بنا رہا ہے فصل کا دیوتا نمودار ہوتا ہے اور لوہار کی مدد کرتا ہے۔ اس کی امداد سے ایک متبرک تلوار بن جاتی ہے اور دونوں ناچتے ہیں۔

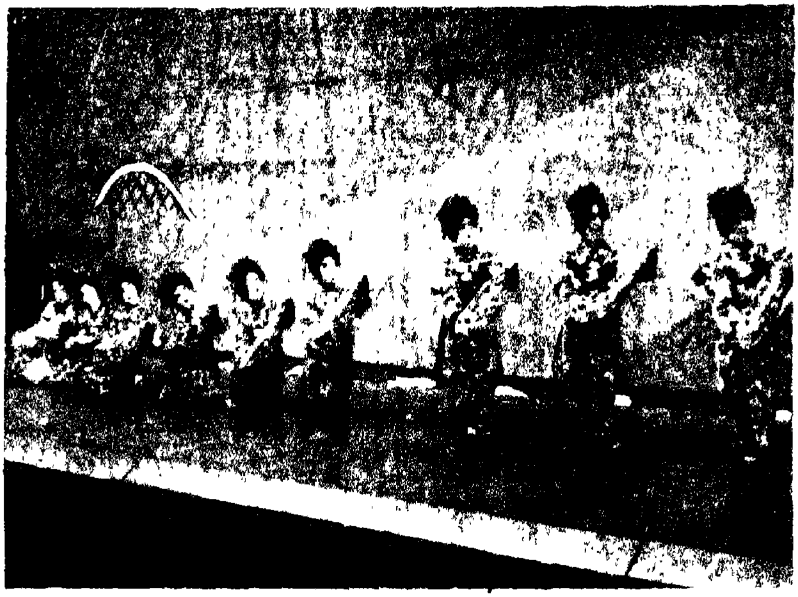
تیسرا رقص ایک مشہور تلوار کی تعریف میں تھا۔ ایک سورما جنگل میں چلا جا رہا ہے کہ یکایک گھاس میں آگ لگ گئی۔ ذرا سی دیر میں پھیل گئی اور چاروں طرف شعلے بھڑکنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے وہ آگ میں گھر گیا۔ اس وقت اس نے تلوار کا رقص کرنا شروع کیا۔ اس کی برکت سے شعلوں کا زور کم ہوا یہاں تک کہ آگ بالکل ٹھنڈی ہوگئی اور تلوار جیت گئی۔ آگ بجھانے میں جنگل کی پریوں نے سورما کا ساتھ دیا۔ شعلہ رنگ کپڑوں میں نمودار ہوئیں اور کھلے ہوئے دامنوں سے آگ بجھانے میں اس کی مدد کی۔ اس ہیبت ناک سماں میں پریوں کا ناچ ناچ کر دامن ہلانا بڑا پیارا منظر تھا۔

چوتھے رقص میں سپاہیوں کی حوصلہ مندی کا اظہار تھا۔ جب وہ جنگ پر جاتے ہیں تو کس طرح جان سے ہاتھ دھو کر نڈر بن کے گھر سے نکلتے ہیں۔

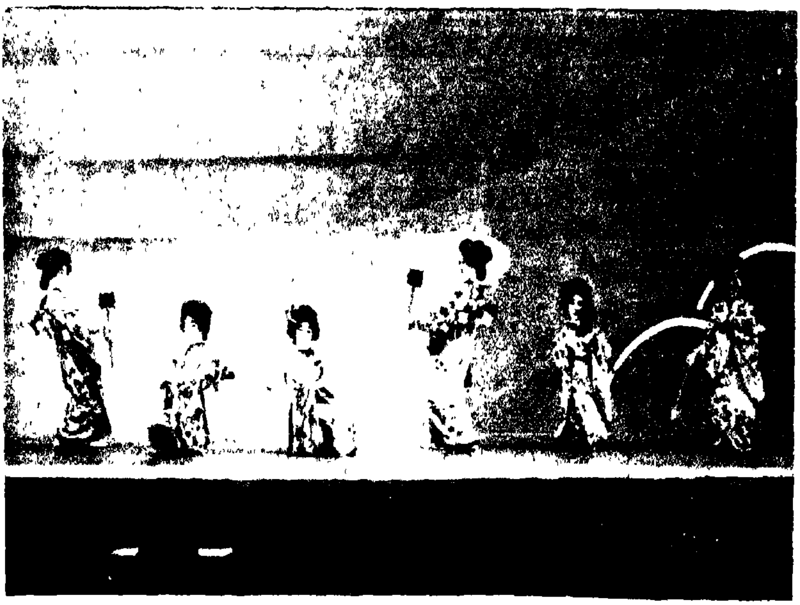
پانچویں رقص میں "ناگی ناتا" کی تعریف تھی۔ یہ ایک قسم کی تلوار ہوتی ہے جس کا دستہ ایک مُٹھ کی بجائے نیزے کے برابر لمبا ہوتا ہے۔ "ہاچیمان" جنگ کے دیوتا کے مندر کے سامنے اس تلوار کا رقص کیا گیا۔

چھٹا رقص "واکے۔ کیو مارو" کی تعریف میں تھا۔ یہ پُرانے زمانے کا ایک سُورما تھا مصیبت کے وقت وفادار رہا اور جاپان کو ایک بڑی آفت سے بچا لیا۔ یہ اب جاپان کا محافظ دیوتا مانا جاتا ہے۔

ساتویں رقص میں دہقانی عورتیں ناچیں۔ ان کے شوہر اور بھائی سب لڑائی پر گئے ہوئے ہیں۔ کاشتکاری کا تمام کام عورتوں کے سر پر آ پڑا ہے۔ اُنہوں نے ناچ ہی ناچ میں کھیتی کا تمام کام کر دکھایا۔ زمین کھودنا اور برابر کرنا، بیج ڈالنا، کھیتی کاٹنا، دھان کے پودوں کے گٹھے باندھنا اور سکھانا، دھان کوٹنا اور پھٹکنا، تولنا اور بوریوں میں بھرنا۔ غرضیکہ



کارخانے کی مزدورنیوں کے رقص کا آخری منظر



کارخانے کی مزدورنیوں کے رقص کا پہلا منظر -



گل الوجہ کے رقص میں زمانہ
قدیم کی کسدی کا باب



ہر عمل ناچ میں ظاہر کردیا۔

آٹھویں رقص میں کارخانوں کی مزدورنیاں تھیں۔ اس میں جاپان کی صنعتی ترقی دکھائی تھی۔ پارچہ بافی کا کارخانہ ہے۔ مزدورنیاں سُوت کی چرخیاں لئے ناچ رہی ہیں۔ ناچ ہی میں تانے بانے ڈال کر کپڑا بُن رہی ہیں۔

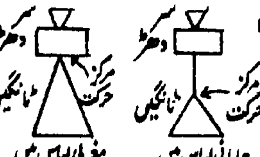
نویں رقص میں دُنیا کے مختلف ممالک کی عورتیں اپنے اپنے قومی لباس میں اسٹیج پر آئیں اور اتحاد کا رقص ناچا۔

گیارہواں رقص تمام تماشے کا لب لباب تھا۔ اس کا نام تھا "جاپان آگے بڑھو"۔ اس میں تمام گیشائیں جن کی تعداد تقریباً تین سو تھی اسٹیج پر مل کر ناچیں۔ اس منظر میں دراصل آپیرا کی ٹکنیک خلط ملط کردی گئی کہ تمام اداکار یک وقت اسٹیج پر جمع ہوگئیں۔

گیشا کا ناچ مغربی ناچ سے اور ہندوستانی ناچ سے بھی بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس میں حرکت کم اور سکون زیادہ ہوتا ہے۔ تُرت پُھرت نام کو نہیں۔ خطوط اور زاویئے بنانے کا نام ناچ ہے جسے ہم بتانا کہہ سکتے ہیں۔ اس بتانے میں ایسی نزاکت اور لطافت ہوتی ہے جو دیکھنے سے ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ ناچ میں کولھوں کے خم، بدن کے جھوک اور ہاتھوں کے اشاروں سے عجیب اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر حرکت نہایت سہولت سے انجام پاتی ہے۔ ناچنے والیوں کی بھولی ادائیں دل لُبھانے میں جادو کا کام کرتی ہیں۔

جاپانی پنکھیا ناچ کا اہم جزو ہے۔ کمونو کی لمبی آستینیں جاذبیت پیدا کرنے میں بہت مُمد ہوتی ہیں۔ تمام ناچ بیانیہ ہوتا ہے جو گانے کے ساتھ ناچا جاتا ہے۔ بعض ناچ ایسے ہوتے ہیں جن کا مطلب اجنبی بھی سمجھ لیتا ہے۔ بہت سے ناچ ایسے ہوتے ہیں جن کا سمجھنا بغیر مخصوص اشاروں کے معنی جانے مشکل ہے۔ تاہم کوئی ناچ ایسا نہیں ہوتا جس میں بے حیائی کا شائبہ ہو یا جس سے جذبات اسفل برانگیختہ ہوں۔ بلکہ اُس کے دیکھنے سے مذاق میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے سمجھنے میں دقت ضرور ہوتی ہے کیونکہ بالکل اجنبی چیز ہے۔

مجھے اس مرتبہ ایک ہی مہینے میں گیشاؤں کا ناچ اور آپیرا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ گیشاؤں کے ناچ سے میں اپنا دل لطیف جذبات سے پُر کے اُٹھا۔ آپیرا میں مغربی ناچ تھا۔ فوق البھڑک لباس، اکثر نیم برہنہ کپڑے، ناچ میں برق کی سی تیز رفتاری، لڑکیوں کی چونچالی، سب باتیں نظر فریب اور جذبات میں ہیجان برپا کرنے والی تھیں مگر وہ لطافت مفقود تھی۔



جاپانی ناچ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں کئی عناصر نظر آتے ہیں جو لطافت و نزاکت پیدا کرتے ہیں۔ ناچ میں انسانی جسم کے تین جوڑ اکثر حرکت میں آتے ہیں اوّل گردن، دوئم کمر، سوئم گھٹنا۔ ان میں بھی گھٹنا سب سے زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ مغربی اور جاپانی لباس میں اس لحاظ سے بڑا اہم فرق ہے مغربی اور ہندوستانی لباس میں عورت کی ٹانگیں وسیع دائرے میں گھوم سکتی ہیں۔ برخلاف اسکے کمونو بدن پر ایسا چُست ہوتا ہے کہ ٹانگوں کا گھماؤ بہت تنگ دائرے

میں ہوتا ہے۔ مندرجہ نقشوں سے واضح ہوگا کہ اوّل الذکر لباس میں مرکزِ حرکت بہت اوپر یعنی کولھوں کے قریب ہوتا ہے۔ جاپانی لباس میں یہی مرکز گھٹنوں کے قریب واقع ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاپانی عورت لمبا قدم نہیں ڈال سکتی اور وہ اپنے گھٹنوں کو بہت کم حرکت دے سکتی ہے۔ سُبک رفتاری اور نازک خرامی اس کے اجزائے لاینفک ہیں۔

دوسرا عنصر جاپانی عورت کی گردن اور گھٹنوں کا خم ہے۔ وہ کبھی اپنا سر بلند کرکے نہیں کھڑی ہوتی۔ اس کی گردن آگے کو جھکی رہتی ہے اور سر اور دھڑ میں تقریبًا ایک سو ساٹھ درجے کا زاویہ بنتا ہے۔ یہ اس کی نزاکت کا اہم عنصر ہے۔ اسی طرح گھٹنے آگے کو جھکے رہتے ہیں اور اتنا ہی زاویہ پنڈلیاں رانوں کے ساتھ بناتی ہیں۔ اس حالت میں جسم کا توازن قائم رکھنا مشکل ہے۔ اس کا یہ تدارک کرتی ہے کہ پاؤں کے پنجے اندر کی جانب موڑتی ہے۔ قدم ڈالتے وقت اس کے پنجے ہمیشہ اندر کی جانب پڑتے ہیں۔ پنجوں کا خم اس کو لمبا قدم ڈالنے سے باز رکھتا ہے۔ اور سُبک رفتاری میں ممد ہوتا ہے۔



تیسرا عنصر کِمونو کی لمبی آستینیں ہیں۔ مغربی عورت اپنے بازو وسیع دائرے میں گھما سکتی ہے۔ جاپانی عورت ڈھیلی ڈھالی آستینوں کی وجہ سے اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے اُٹھاتی ہے اور اُسے تنگ دائرے میں حرکت دیتی ہے۔ یہ تمام باتیں جاپانی عورت کو ہر حرکت میں نزاکت دکھانے پر مجبور کرتی ہیں اور اس کی ہر ادا میں لطافت محسوس ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک اور عنصر بھی ہے جو غالبًا تمام مندرجہ عناصر پر غالب ہے۔ گیشا اپنے پرستاروں پر شوخیٔ ادا کا جادو نہیں چلاتی بلکہ وہ سادگیٔ ادا سے ان کے دلوں کو مسحور کرتی ہے۔ اس کی سادہ ادائیں بھول پن کا اظہار کرتی ہیں جو اپنے اندر عجب اندازِ دلکشی رکھتا ہے۔

گیشا ٹھیٹھ جاپانی لباس میں اسٹیج پر آتی ہے۔ سر کے بال تاج کی صورت میں بنے ہوتے ہیں۔ پاؤں میں سفید جراب۔ تمام بدن کِمونو سے ڈھکا ہوا اور اس پر شاندار اوبی۔ اس کے ناچ تمام جاپانی ہوتے ہیں۔ ہر ادا جاپانی۔ وہ قدامت پرستی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ مگر گیشائیں رفتارِ زمانہ کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ اپنے لباس اور ناچ میں تو قدیم روش کی پابند ہیں مگر اسٹیج پر تھیٹر کی ٹکنیک سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ تھیٹر کے پردے اور مناظر، برقی رنگین روشنی، سینما اور اوپیرا کی ٹکنیک، یہ سب باتیں اپنے ناچ میں آمیزش کرکے اُسے ترقی دے رہی ہیں۔ ناچوں کے نام بھی اسی امر پر دلالت کرتے ہیں۔

نور الحسن برلاس

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال جیسے صوفی کا تصوّر جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میری چھاتی پر مگر جلتی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل پھر کسی گل ریز و گوہر بیز کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے سے اُٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پُر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں اُن کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مُناسب ہے، یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
دل میں اِک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں اِس کنارے نوچ لوں ــــ اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
عیش و دولت کے مظاہر ہیں نظر کے سامنے سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
لے کے اِک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں تاج پر اُسکے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھکر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
بڑھ کے اس "اندر سبھا" کا ساز و ساماں پھونکدوں اس کا گلشن پھونکدوں اسکا شبستاں پھونکدوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونکدوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجازؔ
بی۔ اے۔ (علیگ)

سعید

"خدا جانے کتنا لمبا سفر ہے" تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں ایک مریض مسافر نے تنگی گنجائش سے عاجز آکر کہا۔

"میرے بستر پر یہ صندوقچہ کس نے رکھدیا" ایک موٹے تازے مسافر نے پوری سیٹ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں کوئی اسٹیشن آگیا اور غریب مسافر بھیڑ بکری کی طرح تھرڈ کلاس ڈبوں میں گھسنے لگے۔

"دیکھو ادھر مال بہنیں بیٹھی ہیں۔ تم کہاں گھُسے جارہے ہو" ایک غیور مسافر نے کہا۔ "بابا بیڑی اِدھر مت کریے یہ تمام دھواں میرے حلق میں جاتا ہے" ایک نمبر کو بیراز مسافر نے احتجاج کے طور پر کہا۔

اوّل تو اس ڈبہ میں ویسے ہی جگہ نہ تھی اسٹیشن آنا قیامت ہوگیا۔ مسافروں کو جگہ کا خیال نہ تھا۔ بس کسی طرح ڈبے میں گھس پڑنا مقصود تھا۔ گارڈ صاحب سیدھے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں چلے گئے انہوں نے تھرڈ کلاس کے مسافروں کی حالتِ زار پر نظر ڈالنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اسی طرح اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ تھرڈ کلاس میں ایک پر ایک آدمی چڑھا ہوا ہے باہر نکل کر ٹیلیٹ دیدیا اور گاڑی چلدی۔ ٹکٹ چیکر صاحب چھلانگ مار کر پائیدان پر کھڑے ہوگئے اور ڈبہ میں گھُسکر اطمینان سے ٹکٹ چیک کرنے لگے۔ مسافروں کی پریشانی کا غرض کسی کو احساس نہ ہوا۔

"کیوں بھئی اب دہلی کتنی دور ہوگی؟" بیمار مسافر نے اپنے پاس والے مسافر سے دریافت کیا"

"ہنوز دہلی دُور است" ایک برخود غلط ظریف صاحب بولے۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں" ایک مسافر نے بیمار مسافر سے دریافت کیا۔

"جہنم سے۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا" بیمار نے آخر جل کر کہا۔

"میاں گھبراؤ نہیں دو تین گھنٹے کا سفر اور ہے" ایک مسافر نے آخر جواب دیا۔

بیمار مسافر کی عمر مشکل سے بائیس ۲۲ سال کی ہوگی۔ اسکے خدوخال نہایت اچھے تھے۔ خرابی صحت کے باوجود وہ وجیہ نظر آرہا تھا۔ ہاں لیکن اس کی ایک ایک حرکت سے تکدّر، اضمحلال اور آثارِ علالت ظاہر تھے مسلسل بیماری نے اس کی گلاب تک کو بیمار بنادیا تھا۔ زندگی کے حیات بخش جلوے اس کے سینے میں بجھ چکے تھے۔ افسردگی کی فراوانی بھی بعض وقت انسان میں ایک نحیف سی جولانی پیدا کردیا کرتی ہے۔ بیمار نوجوان پر اس قسم کی جولانی کے اکثر "دورے" پڑتے رہتے تھے اور بعض دفعہ تو وہ اس قدر زندہ دل، پرگو، شیریں گفتار بنجایا کرتا تھا کہ کوئی اسکو بیمار تصور کرہی نہیں سکتا تھا۔

وہ ایک نہایت سیدھے سادے کردار کا مالک تھا۔ تصنع، نمود۔ منافقت وغیرہ سے اُسکو عار تھا۔ صاف باطن اور پاک ضمیر انسان تھا۔ نہ تو کسی کی خود غیبت کرتا تھا اور نہ سُننے کا روادار تھا۔ صاف گوئی کا مادہ تو اس میں اسقدر خطرناک حد تک تھا کہ اگر آپ کوئی راز کی بات بھی اس سے کہدیں تو اس کے اخفا کی آپکو توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ اس قسم کے کیریکٹر کے انسان کو عوام احمق یا سادہ لوح سمجھتے ہیں۔ بارہا اس کو

لوگوں نے اس کے منہ پاگل کہا لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔

وہ تقریباً پانچ سال سے مرگی جیسے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ علاج کی استطاعت نہ تھی ایک دُور کے رشتہ دار نے ازراہِ خُدا ترسی اس کا علاج و معالجہ کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا آخر اُسکو کشمیر بھیجا جانا تجویز ہوا۔ اب وہ چار سال کشمیر میں صرف کرکے دھلی آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی صحت پہلے کے مقابلہ میں اب ذرا بہتر نظر آ رہی تھی۔

اتنے طویل سفر کے بعد اس کی جیب میں اب ایک پائی بھی نہ تھی۔ دھلی میں اُس کی دور رشتہ کی ایک خالہ رہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ملازمت نہ ملنے تک وہ اُن کے ہاں قیام کریگا۔ لیکن اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے کے بعد اس کی غیرت مقتضی نہیں تھی کہ ان کے پاس جاکر ٹھیرے۔ اس کے خالو دہلی کے نہایت معزز لوگوں میں سے تھے وہ کب اس کی پریشاں حالی کے متحمل ہو سکتے تھے۔

آخر دھلی اسٹیشن آ گیا۔ سعید (مریض نوجوان) اُتر پڑا۔ اس کے پاس سامان کچھ نہ تھا۔ فقط ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جسکو ہاتھ میں لیکر وہ سیدھا نواب فخرالدین علی خانصاحب (اُس کے دُور کے خالو) کی کوٹھی پر پہونچا۔ اور ملازم سے اپنے آنے کی اطلاع پہنچائی۔ ملازم نے سر سے پیر تک سعید کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"معاف فرمایئے۔ نواب صاحب اس حالت میں آپ سے شاید ہی ملنا پسند کریں"

"آخر بیگم صاحبہ میری خالہ ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ نواب صاحب مجھے ٹالدیں۔ تم اطلاع تو کردو"

بادلِ ناخواستہ ملازم اندر گیا اور چند منٹ بعد طلبی کا پیام لے کر باہر آ گیا۔ سعید دل میں کچھ گھبراہٹ لیکن چہرے پر سکوں لئے کمرے میں داخل ہوا۔ نواب صاحب بہت مصروف و کاروباری قسم کے انسان تھے۔ لوگوں کو ملاقات کا بہت کم وقت دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے سعید کے سراپا پہ ایک اُچٹتی نظر ڈالی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سعید آداب کرکے بیٹھ گیا۔

"کہیئے؟" اُنہوں نے بغیر مُلاقاتی کی جانب دیکھے ہوئے کہا۔

"میرا نام سعید الدین علی خاں ہے۔ اور بیگم صاحبہ سے ایک رشتہ کا بھی شرف رکھتا ہوں"

"افسوس آپ ایسے موقعہ پر آئے ہیں کہ میں آپ کی اس وقت کچھ امداد نہیں کرسکتا" نواب صاحب نے خشک لہجہ میں کہا۔ سعید کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ نواب صاحب نے اس کے تیور دیکھکر اپنی غلطی کا احساس کیا اور فوراً لہجہ بدلکر بولے۔ "معاف کیجئے۔ شاید میں نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی۔ کیا میں آپکی تشریف آوری کی غایت معلوم کرسکتا ہوں"

"میں آپ سے اور بیگم صاحبہ سے صرف نیاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس ملاقات سے میری اور کوئی غرض وابستہ نہیں ہے"

"صرف ملاقات؟"

"جی"

"آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں سیدھا کشمیر سے آپکی خدمت میں حاضر ہوا ہوں" اس کے بعد سعید نے اپنی علالت و قیام کشمیر وغیرہ کے حالات تمام تر نواب صاحب سے بیان کئے۔ اُس نے کشمیر اور وہاں کی تفریحات کو اس خوبی سے پیش کیا کہ نواب صاحب اس کی تقریر میں بیحد دلچسپی لینے لگے۔

"آپ مصوّر ہیں۔ آپ نے کشمیر کا جیسا لفظی نقشہ کھینچا ہے اس سے آپکے تخیل و زبان کی بے اختیار داد دینے کو جی

چاہتا ہے"

"واد تو اُردو زبان کو دیجئے۔ جس میں یہ قدرت ہے کہ خیالات و جذبات کا وہ اس خوبی سے اظہار کر سکتی ہو"

"اچھا میں بیگم کو مطلع کرتا ہوں۔ اگر وہ تم سے ملنا پسند کرینگی تو ابھی طلب کریں گی" نواب صاحب نے کہا۔ دفعتہً کمرے میں ایک وجیہ نوجوان اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے داخل ہوا۔ وہ نواب صاحب کا حقیقی بھانجہ تھا۔ نواب صاحب اسکو دیکھتے ہی بولے "اچھا ہوا حامد تم آ گئے۔ یہ اپنے دُور کے ایک عزیز ہیں انکو بیگم کے پاس لیجاؤ لیکن پہلے دیکھ لینا کہ انکا مزاج برہم نہو" حامد نے ایک نظر حقارت سعید پر ڈالی۔ اس کے لباس کی دقیانوسیت پر مسکرایا اور تضحیک آمیز لہجہ میں بولا "چلئے صاحبزادہ صاحب۔ آپکا کیا رشتہ ہے ہماری ممانی سے؟"

"باعتبار رابطہ ہم سب ابنِ آدم ہیں لیکن ؎

نازم باین شرف کہ غلامِ محبتم
لافِ نسب زنسبتِ آدم نمی زنم"

سعید نے سادگی سے مسکراکر اس کی حقارت ریز فقرے کے جواب میں کہا۔

"لیجئے ماموں میاں یہ "غلامِ محبت" جدید انکشاف ہے" حامد نے ایک پُرحقارت قہقہہ لگایا اور سعید کو ساتھ لیکر بیگم صاحبہ کے کمرے کا رُخ کیا۔

بیگم نے ایک عجیب مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی۔ رشتہ ناطوں کی وہ زیادہ قائل نہیں تھیں لیکن جب حامد نے ظاہر کیا کہ ملاقاتی علاوہ آپکا بھانجہ ہونے کے ایک اچھا خاصہ آلۂ تفریح بھی ہے تو انہوں نے سعید کو اندر آ جانے کی اجازت دیدی۔

نواب صاحب کے تین نوجوان لڑکیاں تھیں۔ بڑی خالدہ بلند و بالا قد اور موزوں خدوخال کی مالک تھی۔ ناصرہ میں حُسن و نزاکت کے ساتھ ایک خاص قسم کی جاذبیت بھی تھی اور راشدہ سب سے چھوٹی تھی۔ لیکن ہمہ خوبی، ہمہ رعنائی و زیبائی۔ تینوں بہنیں نہایت زندہ دل ہنس مکھ اور خوش طبع تھیں۔ راشدہ لیکن بیحد شوخ و طرار تھی۔ یہ مغرور حُسن لڑکی اپنے ابا تک کو چٹکیوں میں اُڑا دیا کرتی تھی۔ رکھ رکھاؤ میں اگرچہ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھکر تھیں لیکن راشدہ میں ایک خاص خودداری و پندار تھا۔ جب یہ تینوں کہیں جمع ہو جاتی تھیں تو بڑے سے بڑے صاحب عقل و شعور انسان کو بنا کر رکھدیا کرتی تھیں۔

سعید جونہی کمرے میں داخل ہوا اُسکی ہیئت کذائی کو دیکھکر تینوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ پہلے تو وہ غریب بھی جز بز ہوا لیکن جلد اپنی حالت سنبھال کر بیگم صاحبہ کو آداب کیا اور تینوں لڑکیوں کی طرف معصومانہ دیکھکر بولا۔ "آپ شاید میرے لباس پر ہنس رہی ہیں۔ میں سیدھا ریل سے اُتر کر یہاں چلا آیا ہوں"

"اجازت دیجئے کہ ہم آپکے نہلانے اور کپڑے بدلنے کا انتظام کریں" منجھلی نے ہنسکر کہا۔

"مگر سُنا ہے کہ یہ تو غسل کرنے کے عادی ہی نہیں ہیں" بڑی بولی۔

"آپ نے ایک غسل تو دُنیا میں تشریف لانے کے بعد فرمایا تھا اور ایک اس جہان سے تشریف لیجانے کے بعد فرمائیں گے" اسپر پھر تینوں نے قہقہہ لگایا جسمیں سعید نے بھی معصومانہ ہنسی سے شرکت کی۔

"چُپ رہو۔ فسر بر کہیں کی۔ اپنے مہمان کا مذاق اُڑاتے ہوئے تمکو شرم نہیں آتی" بیگم صاحبہ نے غصّہ سے فرمایا۔

"ناخواندہ مہمان" خدا جانے تینوں میں سے کس نے فقرہ بلند کیا۔ اس کے بعد تینوں ہنسی کا گولہ پیا ہو کر رہ گئیں۔

"لیکن میں آپکے ہاں قیام کرنے حاضر نہیں ہوا ہوں۔ آپنے اپنے کو میزبان تصور کرنے میں قبل از وقت علو ہمتی سے کام لیا ہے۔" اس سادہ لباس میں سے ایسی چبھتی ہوئی طنز سننے کی کسیکو توقع نہیں تھی۔ تینوں دفعتہً خاموش ہو گئیں۔ بلکہ خالدہ کو تو اس کے سیدھے پن پر رحم سا آنے لگا۔ چنانچہ وہ تو بالکل چپ ہو گئی۔ لیکن راشدہ کی زبان برابر چلتی رہی۔

"میاں تم ان پگلیوں کی باتوں پر نہ جاؤ۔ بیٹھو۔ تم برا تو نہیں مانو گے اگر میں پوچھوں کہ کیا تم اپنے کو میرا رشتہ دار ظاہر کرتے ہو؟ کیا رشتہ ہے؟"

"معاف فرمائیگا آپ سے کوئی علاقہ میری افلاس زدہ مگر شریف ہستی میں کسی تفاخر کا اضافہ نہیں کر دیگا۔ میں نے اپنی رشتہ کا ذکر نواب صاحب سے محض امر واقعہ کے طور پر کیا تھا۔ میں اس کا متمنی بھی نہیں ہوں کہ اس آستانۂ عالیہ سے اپنی فکر کفاف کو وابستہ کروں۔ والدہ مرحومہ اکثر آپ کا ذکر کیا کرتی تھیں، مجھے بھی آپ کی زیارت کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ دہلی میں میرا چونکہ کوئی آشنا نہیں ہے اس لئے میں سیدھا یہیں چلا آیا تاکہ پہلے آپ سے نیاز حاصل کروں ——"

"اور پھر اگر موقع لگ جائے تو یہیں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں۔" راشدہ نے کھل کھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ سعید بھی ہنس دیا اور بیگم بھی مسکرا دیں۔ ناصرہ سے ہنسی ضبط نہیں ہوئی تو منہ پر ہاتھ رکھکر باہر بھاگ گئی اور پاگلوں کی طرح باہر خوب ہنسکر پھر اندر آ گئی۔

"تم شاید اسعد علی خاں کے لڑکے ہو میں نے اُن کو آج تک نہیں دیکھا لیکن نام ضرور سُنا ہے۔ تمہاری ماں میرے پھوپا کی بہن کی لڑکی تھی۔"

"کیا ہوائی رشتہ ہو یہ" ناصرہ نے کہا۔

"پھر یہ ہمارے کون ہوئے امی؟" راشدہ نے خندۂ شوخ سے دریافت کیا۔

"ناخواندہ مہمان" سعید نے ہنسکر جلدی سے کہا۔

یہ فقرہ حسین راشدہ پر چپک کر رہ گیا۔ اس کے سُرخ رُخساروں پر دفعتہً ہلکی سی خفت کا خون دوڑ گیا۔ اپنی جادو بھری آنکھوں سے سعید کو دیکھتی ہوئی بولی "آخر آپنے یہ تو مان لیا کہ آپ ہمارے مہمان بننے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

"کچھ رہی نہیں راشدہ یہ تو" ناصرہ نے کہا۔ راشدہ اپنے فقرے کی بے اثری پر اور زیادہ کھسیانی ہو گئی۔ اسکو توقع نہیں تھی کہ وہ ایک سعید جیسے سادہ لوح انسان سے یوں زک کھا سکے گی۔

"آپکو کشمیر میں سب سے زیادہ کس چیز میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی؟" خالدہ نے دریافت کیا۔

"گدھوں میں۔ میں نے ......"

"گدھوں میں؟" ناصرہ نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا جس سے اُسکا چہرہ گلنار ہو گیا۔

"گد... گ..... گدھوں میں!" راشدہ نے ہنسی کے مارے لوٹتے ہوئے کہا۔ سعید بھی انکو ہنستا دیکھکر معصومانہ ہنسنے لگا۔ بڑی بی اس بار مُسکرا دیں۔ وہ سعید کے بھولے پن اور سادہ اطواری کو بہت پسند کرنے لگیں تھیں۔ عجیب ٹھنڈی مٹی کا انسان تھا کسی بات پر غصہ ہونا یا ناک بھوں چڑھانا جانتا ہی نہ تھا۔

"آخر گدھوں میں ایسی آپکے لئے کیا کشش تھی؟" خالدہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کند ہم جنس ـــــ" راشدہ نے شوخی سے کہا۔

"چُپ رہو" بیگم نے اُسکو ڈانٹتے ہوئے کہا لیکن سعید کی صورت دیکھکر اُنکو پھر ہنسی آگئی۔ بیگم کے ہنستے ہی طوفانِ خندہ کا بندھ ٹوٹ پڑا۔ تینوں پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئیں۔ چونکہ یہ خواہ مخواہ کی ہنسی تھی۔ سعید محرک خندہ شے کو اب تک سمجھا ہی نہ تھا چنانچہ وہ بھی بلا وجہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اُسکو ہنستا دیکھکر راشدہ کا تو مارے ہنسی کے دم اُلٹ گیا۔

جب یہ دیوانگی کا دور سب پر سے کم ہوا تو ناصرہ بولی "آپ بیحد دلچسپ آدمی ہیں"

"گدھوں میں دلچسپی لینے والے انسان میں تم بھی دلچسپی لینے لگی ہو" خالدہ نے ناصرہ سے کہا۔

"حالانکہ دونوں میں بظاہر بیّن فرق ہو" راشدہ نے پھر فقرہ جڑا۔

"اس تجنیس شناسی پر میں آپکا بیحد ممنون ہوں کہ آپنے مجھے "حقیقتِ حال سے بہت جلد آگاہ کر دیا۔ ورنہ میں تو خدا جانے کب تک اس ابہام میں مبتلا رہتا کہ اس جلوت میں کوئی نوعِ جنس بھی ہے ـــــ"

"کس قدر مہمل تقریر ہے" ناصرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں جناب وہ گدھوں والا قصہ تو رہ ہی گیا" خالدہ نے کہا۔

"کیا تمہارا یہ خیال ہے باجی کہ یہ ماہرِ نفسیاتِ خر ہیں ؟" راشدہ نے پوچھا۔

"میں کشمیر کے گدھوں کی اِسلیئے تعریف کر رہا تھا کہ وہ بڑے مضبوط و محنتی ہوتے ہیں"

"اور آپ بھی محنت و جفاکشی کو پسند کرتے ہونگے" ناصرہ نے سعید سے پوچھا۔

"یہ تو ظاہر ہے۔ گدھوں کے باب میں آپکی خوش مذاقی قایم اسی بنا پر ہے کہ اُن میں آپکی پسندیدہ صفت موجود ہے" راشدہ نے ہنسکر کہا۔ پھر سب پر ہنسی کا شدید دورا پڑا۔

"لیکن میری اس وقت کی مایوسی کا بھی تو اندازہ لگائیے جب میں اپنی پسندیدہ صفت کا انسانوں میں فقدان دیکھکر گدھوں کو انسانوں پر ترجیح دینے پر مجبور ہوتا ہوں"

"آپکی فطرت شناسی قابلِ داد ہے" ناصرہ نے کہا۔

"ہاں اس فن میں مجھے خاص ملکہ ہے"

"اچھا تو میری فطرت پڑھیئے" خالدہ نے اشتیاق سے کہا۔

"بہتر ہے۔ ذرا قریب آجایئے" خالدہ قریب کی کرسی پر آ بیٹھی۔ سب کا خیال تھا کہ اس باب میں بھی وہ اپنی کسی "حماقت گوئی" سے ہنسنے کا موقع دیگا۔ لیکن جب سعید نے خالدہ کی بالکل صحیح فطرت پڑھکر سُنا دی تو سب ایکدوسرے کا مُنہ دیکھنے لگیں۔

"اچھا میرے متعلق کیا ارشاد ہے" ناصرہ نے کہا۔

"اچھی روح پائی ہے" سعید نے ناصرہ کی بڑی بڑی آنکھوں کے اعماق میں اپنی نظریں اُتارتے ہوئے کہا۔ "دل صاف ہے لیکن محرومی پسند۔ طبیعت تمرد کو چاہتی ہے لیکن فطری انکسار روک دیتا ہے۔ روح میں بیچارگی کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ طبیعت ماحول سے متاثر ہوکر مائل فرعونیت ہوتی ہے لیکن روحانی عجز آپ کی حالت قابلِ رحم بنا دیتا ہے۔

"بیٹے میری طینت بھی پڑھو" بڑی بی نے اشتیاق سے

آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ناصرہ کے متعلق سعید نے جو کچھ کہا تھا لفظ بلفظ صحیح تھا۔ وہ اپنی صحیح فطرت سعید کی زبان سے سُنکر اسکی قابلیت کو دل میں مان گئی۔

سعید نے بیگم صاحبہ کی بھی فطرت پڑھی۔ اب راشدہ کی باری تھی لیکن جب اس کی جانب سے کوئی اشتیاق ظاہر نہ ہوا تو سعید بھی چُپ ہوگیا۔

"اچھا اب اجازت چاہتا ہوں"۔ سعید نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھئے چائے پیتے جائیے"۔ ناصرہ بولی۔

"لیکن اب تم جاؤگے کہاں"! بیگم نے دریافت کیا۔

"میں خود بھی یہی سوچتا ہوں کہ کہاں جاؤں۔ جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے"!

(پنسل روپے کے نوٹ اُسکو دیکر) ابھی تم اس سے اپنا کام چلاؤ۔ ضرورت ہو تو اور طلب کرلینا"۔ بیگم نے کہا۔

سعید نے بکمال بے تکلفی اس عطیہ کو قبول کرلیا۔

"ان پیسوں کا آپ کیا کرینگے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو کچھ کپڑے بنواؤنگا تاکہ آیندہ ملاقات پر میرے لباس پر آپکو ہنسنے کا مزید موقع نہ ملے"۔

"ہاں اچھا خیال ہے۔ لیکن میرا خیال ہے سب سے پہلے آپ کسی ماہر امراض دماغی سے ملیئے۔ آپکا لباس اتنا نہیں ہنساتا ہے جتنا دماغ"! راشدہ نے کہا۔

"بہت اچھا۔ لیکن کیا عجب ہے کہ میرا دماغ قہقہوں کی اعجاز آفرینی سے خود بخود درست ہوجائے۔ آپ ہنسئے اور مجھے اچھا کیجئے"۔ سعید نے مسکراکر کہا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپکا دماغ اجتماعی قہقہوں سے درست ہوگا یا انفرادی سے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اس کا جواب آپ خود دیں تو اچھا ہے۔ آپ انفرادی طور پر اپنے قہقہوں کی سحرکاری سے خوب واقف ہونگی"! سعید نے راشدہ کی جانب نظریں جماکر کہا۔ لیکن وہ اس انداز سے بیٹھی رہی گویا اس نے سُنا ہی نہیں ہے۔

"چائے کا وقت آگیا ہے۔ اب آپ چائے پی کر ہی کیوں نہ جائیے"! خالدہ نے سعید سے کہا۔

"جیسی آپکی مرضی"!

"انکو تو کسی چیز سے انکار ہی نہیں ہے۔ تم ناحق پوچھتی ہو"! راشدہ نے کہا۔

"ہاں میاں اب تم چائے پی کر ہی جانا۔ اچھا میں اب ذرا غسل کرلیتی ہوں"! یہ کہہ کر بیگم صاحبہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے ساتھ ہی تینوں لڑکیاں بھی کھڑی ہوگئیں۔ کمرے میں سعید تنہا رہ گیا۔

ابھی اُسکو تنہائی میں چند منٹ ہی گذرے ہونگے کہ دروازہ کھلا اور حامد نہایت احتیاط سے اندر داخل ہوا۔

"سعید۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اگلی گستاخی کو معاف کروگے۔ میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم اسکے اخفا کا وعدہ کرو"! اُس نے چپکے سے سعید سے کہا۔

"اگر میں اس کام کو انجام دینے کے لئے آمادہ ہوگیا تو اسکو پردۂ راز میں رکھنا تو خود بخود میرا فرض ہوجائیگا"۔ سعید نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس حقیر سی خدمت سے انکار نہ کروگے"! حامد نے لجاجت سے کہا۔

"آپ مقصد بیان کیجئے۔ زیادہ طول کلامی سے کیا فائدہ"۔ سعید نے کہا۔

"یہ لو یہ رقعہ کسیطرح راشدہ کو دیدو۔ لیکن براہ کرم تم اسکو نہ پڑھنا"!

سعید نے سادگی سے حامد کی طرف دیکھا۔ رقعہ لے لیا اور بولا۔ "اچھا آپکا رقعہ دیدیا جائیگا اور میں اسکو پڑھونگا بھی نہیں۔ اور کچھ ارشاد؟"

"بس شکریہ۔ اچھا اب میں جاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ چپکے سے چلا گیا۔ اسکو گئے ہوتے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ زینے پر پیر کی چاپ ہوئی سعید نے جلدی سے رقعہ مٹھی میں دبا لیا اور بظاہر ایک اخبار پڑھنے لگا۔

پردہ ہٹا اور راشدہ اپنا کچھ کروشیا کا سامان لئے سیدھی الماری کی طرف چلی گئی۔ اسنے سعید کو اس طرح نظر انداز کردیا گویا وہ کمرے میں تھا ہی نہیں۔ جب وہ الماری کے پاس پہنچ گئی تو سعید اٹھا۔ اس کا دل خود بخود نامعلوم کیوں دھڑکنے لگا۔ اپنی مشن کی تکمیل کی سکو ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر وہ الماری کے پاس جا کھڑا ہوا اور با انداز استغنیٰ بولا "حامد صاحب مجھے یہ رقعہ دے گئے ہیں تاکہ اسکو آپ تک پہنچا دوں"۔

راشدہ اب بھی اپنے کام میں اسی قدر مصروف تھی گویا اس نے سنا ہی نہیں۔ آخر سعید نے رقعہ الماری کے تختہ پر رکھدیا اور اپنی جگہ پر چلا آیا۔

"مسٹر سعید" چند منٹ راشدہ کی خشمگیں آواز کان میں آئی۔ سعید نے سادگی سے اسکی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر برافروختگی کے آثار دیکھکر حواس باختہ ہو گیا۔

"تم کو شرم نہیں آتی ——" وفورِ غیظ میں راشدہ کے کپکپاتے لبوں سے صرف اسقدر نکل سکا۔

"لیکن شرم کا یہاں کیا محل ہے خاتون" سعید نے اسی سادگی سے دریافت کیا۔

"کمینہ۔ پاجی" راشدہ کی زبان سے نکلا۔

"کہاں ان مبارک الفاظ کا شکار یہ خاکسار ہے؟" سعید نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں میں تم کو گالیاں نہیں دے سکتی۔ تم نے اس رقعہ کو پڑھا تو ہوگا۔"

"مطلق نہیں۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا راز ابھی بالکل محفوظ ہے"۔

"مجھے تمہاری سادہ دلی سے توقع تھی کہ تم نے اس کو نہیں پڑھا ہوگا۔ لیکن تم کو اسے پڑھنا چاہیئے۔ تم کو دیکھنا چاہیئے کہ تم لوگ، تم مرد کس قدر ابلیسی ذہنیت رکھتے ہو"۔ سعید اس شوخ و طرار لڑکی کو اس طرح سنجیدگی سے گفتگو کرتے دیکھکر حیران کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ان حسین دشنام کا کیا مطلب ہے۔

"مگر نہیں۔ تم مجھے اتنے خطرناک نظر نہیں آتے جتنے اور بدتمیز مرد ہوتے ہیں۔ اچھا تم بیٹھ جاؤ اور اس رقعہ کو پڑھو"۔ سعید نے معصومانہ رقعہ لے لیا اور بولا "لیکن مجھ سے کہدیا گیا تھا کہ میں رقعہ نہ پڑھوں"۔

"پڑھو جی۔ میں حکم دیتی ہوں"۔ سعید نے اس حکمرانی پر غور کئے بغیر تعمیلِ ارشادِ حسین میں رقعہ پڑھنا شروع کیا۔

"میری جان۔

تیرے گلابی ہونٹوں کی قسم میں دیوانہ وار تجھ پر عاشق ہوں۔ تیری پیاری زبان سے آج اقرارِ محبت ہوجائے تو میں اپنی منسوب لڑکی کو ابھی ٹھکرا دوں۔ میں تجھے جیت کر عیش کی زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ جب تجھ جیسی لڑکی ہاتھ آجائے تو دنیا، اس جہنم زار کا گہوارہ عشرت و عیش بنجانا کچھ مشکل نہیں۔

سراپا پا تیرا "ح"

سعید نے بغیر کسی انقباض و اظہار غیظ کے رقعہ واپس دے دیا۔ "اگر تم اجازت دو تو میں سگریٹ پی لوں۔ معمولی سے سگریٹ پیتا ہوں میں۔ قیمتی کے لئے پیسے کہاں سے لاؤں"

"تم عجیب حماقت کی حد تک سادہ لوح ہو۔ بے محل گفتگو شروع کر دی۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ اس رقعہ کو پڑھکر کیا تم کو غصہ نہیں آیا؟"

"غصہ؟ نہیں" سعید نے نہیں پر سر ہلا کر کہا "آپکے معاملات پر میں غصہ ہونے کا کیا حق رکھتا ہوں"

"مردہ روح۔ بیجان جذبات کا انسان" راشدہ نے غصہ سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ میری مراد حامد سے ہی" سعید نے کہا۔ اس کی اس کوتاہ فہمی پر حسین راشدہ کو اور بھی غصہ آگیا۔ شعلہ فشاں آنکھوں سے اسکو دیکھنے لگی اور پھر حقارت سے کچھ کہکر چلدی۔

"سنیئے تو سہی۔ میں حامد سے کیا کہدوں؟" سعید نے اس کے تعاقب میں دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

"حامد سے؟" راشدہ نے دفعتہً مڑکر پوچھا "یہ" چٹاخ! ایک چیٹ کی آواز پیدا ہوئی اور سعید سمٹ کر رہگیا۔ ابھی وہ اپنے رخسار کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ راشدہ جاچکی تھی۔

"کیوں تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟" بیگم نے سعید کو سراسیمگی کی حالت میں دروازے کے پاس کھڑا ہوا دیکھکر کہا۔ سعید خاموش کھڑا رہا۔ اتنے میں چائے آگئی اور اس کے ساتھ ہی خالدہ، ناصرہ اور راشدہ بھی آگئیں۔ راشدہ پھر وہی اگلی سی تیز و طرار راشدہ تھی گویا کوئی بات ہی نہیں گذری تھی۔

"آپ چائے پسند کرتے ہیں یا کافی؟" خالدہ نے پوچھا۔

"محض گرم پانی" راشدہ نے ہنسکر سعید کی جانب سے جواب دیا۔

"اگر کافی، چائے اور گرم پانی سے محض اکتساب حرارت مقصود ہے تو میں چانٹا، چیت، دھول وغیرہ وغیرہ کو بھی پسند کرتا ہوں" سعید نے مسکرا کر کہا۔ یہ فقرہ حالانکہ اس نے راشدہ کی جانب دیکھکر نہیں کہا تھا لیکن وہ اسکو سنکر کچھ بیچین سی ہوگئی اور ترحم آمیز نظروں سے بیقصور سعید کو دیکھنے لگی۔ اس کو احساس ہوا کہ غریب سعید کے ساتھ اس نے سخت ناانصافی کی۔

"معلوم ہوتا ہی کہ مکتب میں آپکی کافی مرمت ہوئی ہی" راشدہ نے آخر بالجبر ہنسکر کہا۔

"جی مکتب کی کوئی تخصیص نہیں ہر شکستگی کے بعد مرمت ہو جاتی ہے" سعید نے ہنسکر جواب دیا۔

"پھر آپ کو تو ہر وقت معمار ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے" خالدہ نے کہا۔

"صاحب اللہ بڑا مسبب الاسباب ہی وہ ہر جگہ معمار پیدا کر دیتا ہے" یہ کہہ کر اس نے یونہی راشدہ کی طرف دیکھ لیا جس کی حسین آنکھیں سعید سے درخواست کر رہی تھیں کہ بس اس سے آگے نہ بڑھو ورنہ میرا راز فاش ہو جائے گا۔

بعض منفی امور بھی کس طرح غیر متوقع طور پر خود بخود زندگی حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ ہم سے بلا ارادہ ایک حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ لیکن مشاعر اس کے اثرات سے خواہ مخواہ جاگ اٹھتے ہیں۔ کوشش کیجاتی ہے کہ اسکی اہمیت کو روک دبا جائے لیکن جب وہ بات اپنی ذات سے منتقل ہوکر

کبھی دوسرے انسان کی شخصیت کو بھی لپیٹ لیتی ہے تو ہم صرف اپنے تحفظِ شخصی کی خاطر اس کے اثرات کی نفی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل بیکار کوشش ہوتی ہے۔ راشدہ کا سعید کے چپت رسید کر دینا تو ایک عام بات سمجھئے لیکن اس کے "غیر مطلوب" اثرات کو دیکھیے کہ انہوں نے پیدا ہو کر راشدہ کو کیسے نامطبوع جذبات سے دوچار کر دیا۔ چپت مار کر اس "رازِ چپت بازی" کے اخفا میں اس کی سعیٔ غیر مستقل، سعید پر خود بخود اسکو رحم آنے لگنا۔ اپنی چند فطری کمزوریوں سے (مغلوب الغضبی وغیرہ وغیرہ) دفعتہً اسکا خود بخود آگاہ ہو جانا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے وقوع کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ سعید پر رحم آتے ہی اس کے دل میں رحم اور رحم کی تمام متعلقہ صفاتِ حسنہ بیدار ہو گئیں۔ اور اسکو اس جذباتی مقام سے ہٹ جانا پڑا جہاں سے ہٹنے کا فی الحال اسکا کوئی قصد وارادہ نہ تھا! نفسیات کے گورکھ دھندے سے مفر نہیں ہے۔ ایک راشدہ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہر انسان کو بغیر اپنی مرضی کے جگہ بدلنی پڑتی ہے ایک مرکز سے ہٹنا پڑتا ہے۔ تبدیلی کا شکار بننا پڑتا ہے!!

چند منٹ اور بیٹھکر سعید نواب صاحب کے مکان سے چل دیا۔ دہلی کے گلی کوچے تھے اور اسکا بوسیدہ جوتا۔ ایک مختصر سی کوٹھری کرایہ پر لے لی۔ جب تک پنشن (روپیہ) کا گھٹتا ہوا سایہ سر پر قائم رہا گزر کرتا رہا۔ اس کے بعد پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں۔ خدا خدا کر کے کچھ عرصہ بعد اسکو دس روپیہ ماہوار کی ایک ٹیوشن مل گئی۔ اُسی کو غنیمت سمجھا۔ اس کی کوٹھری کے پاس ہی ایک مزدور رہتا تھا۔ جو اپنی دن بھر کی محنت کے بعد شام کو آتا تھا۔ اس کے بچے بیمار ہوتے تو سعید ہر طرح اُنکی دوا وغیرہ کا انتظام کرتا۔ خود بیمار تھا اسلئے بیماری کی مصیبت سے متاثر ہوتا تھا۔ خود غریب تھا اسلئے افلاس کی صعوبت سے آگاہ تھا۔ رحم وہمدردی ممکن ہے کسی شخص کی فطرت میں قدرت کی جانب سے ودیعت کی جاتی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان خود مصیبت میں نہیں پھنستا وہ دوسرونکی مصیبت کو نہیں سمجھ سکتا۔ رحم و مروّت حقیقی جذبات نہیں ہیں مروّت تو بلکہ انسان میں ایک قسم کا عیب ہے لیکن رحم خواہ اعصابی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو خواہ دوسرونکی تکالیف دیکھکر وہ دل میں رونما ہو گیا ہو، ہے بہت اچھی چیز۔ معلوم نہیں سعید کا کیریکٹر اپنی علالت سے قبل کیسا تھا لیکن جب سے وہ خود شکارِ آلام وعلالت ہوا تھا اس میں ایک عجیب قسم کی "سپردگی" فتادگی، انکسار و ترحم پیدا ہو گیا تھا۔ اب اتفاق سے اِن صفات والے انسان کا ایک ایسی سوسائٹی میں گذر ہو گیا تھا جو بالکل برعکس صفات کی حامل تھی۔ بیگم کے گھر میں افلاس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ یہاں ایک حد تک زر کی فولادی قوت نے امراض کی راہیں بھی روک رکھی تھیں۔ اس ماحول میں خالدہ، ناصرہ اور راشدہ جیسی لڑکیاں بھی تھیں جو ایک فسردہ دل کے افسردہ جذبات اپنی دائمی زندہ دلی کے جانبخش اثرات کے باعث سمجھنے سے قاصر تھیں۔ مگر ——

مگر ان تمام باتوں کے باوجود کیریکٹر: ایک معصوم کردار کا سد دلوں میں نشان کئے بغیر نہ رہا۔ بیگم سعید کو اُسکے بھولے پن کی وجہ سے پسند کرنے لگیں تھی۔ خالدہ اس کی سادگی سے متاثر ہو چکی تھی، ناصرہ اس کی بے سروسامانی کی وجہ سے اُسپر رحم کھانے لگی تھی اور راشدہ ——

راشدہ......؟ راشدہ جس کی فطرت سب سے زیادہ سخت تھی اپنی ایک غیر ارادی حرکت (چپت زنی) سے اپنی بعض عادتوں کی

اصلاح کا تہیہ کر چکی تھی۔ یعنی سعید کے باب میں وہ بھی اپنی نسوانی پندار، غرورِ حسن، اور نخوتِ امارت کو ملائم دیکھ رہی تھی! یہ ہیں کردار کے کرشمے، ایک ٹھوس کردار کے کرشمے۔!

سعید کسی امثالی کیریکٹر کا انسان نہ تھا بلکہ ایک نیچرل کردار کا مالک تھا۔ کیریکٹر تو ہر انسان کا نیچرل ہی ہوتا ہے لیکن سوسائٹی، ماحول، کتابیں اور دیگر متفرق باتیں اسپر دوسری قسم کا رنگ چڑھا دیتی ہیں۔ میرے اعتقاد میں انسان ایک بالکل بے عیب مخلوق کا نام ہے۔ فطرت کا منشا نہ تھا کہ شدّاد، نیرو اور ابوجہل وہ بنیں جو وہ بنگئے۔ انسان انسان کا شیطان ہے۔ شدّاد ایک صاحب جاہ و حشم انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ کتنی تملق مآب زبانیں اس کے دربار میں کھلتی ہونگی۔ اب اگر وہ اپنے کو خدا نہ منواتا تھا تو کیا نفسیاتی عوائد سے جنگ کرتا۔ نیرو کا ماحول اور اس کے معاصرین کے دور پر نظر ڈالیے۔ اگر اس میں خشونت، درندگی، تظلّم بربریت و شقاوت کے عوض رحم و کرم، محبّت و ایثار، عدل و انصاف کا مادہ ہوتا تو ایسے ماحول میں پلے ہوئے انسان کو اتنے اچھے صفات کا انسان دیکھکر ہم وجودِ باری کے قائل رہ سکتے تھے؟

سعید اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ کیا دُنیا میں اُس نے صرف اس لئے جنم لیا تھا کہ وہ بیمار و مفلس کی سی زندگی ہمیشہ گذارتا رہے۔ آخر اس کی اس زبوں حالی سے قدرت کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ یا تو یہ انفرادی مصائب منجانب خدا نہیں ہیں اور اگر اسی کی جانب سے ہیں تو اتنی بیشمار مخلوق پیدا کر دینے کے بعد وہ اپنے بندوں کی طرف سے بے پرواہ ہو جانے کا عادی ہو! شاید ہمارا خیال غلط ہو ہم ہر رمز کو سمجھ لینے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ سپردگی ہی میں ہماری بہبودی ہے سرکشی میں نہیں۔

سعید کو بیگم صاحب سے مُلاقات کئے چار ماہ گذر چکے تھے۔ اور اس چار ماہ میں وہ اپنی دس روپیہ ماہانہ کی قلیل آمدنی کے ذریعہ اُن کا نصف قرضہ ادا کر چکا تھا۔ انکا خیال تھا کہ بیس روپیہ کی معمولی رقم چند یوم میں صرف کرکے سعید پھر مزید مدد کے لئے ان کے سر پر آمسلط ہوگا اور عجب نہیں کہ یہ ایک مُستقل مصیبت ہی بنجائے۔ لیکن جب انکی خدمت میں سعید کا مرسلہ دس روپے کا منی آرڈر پہنچا تو وہ نواب صاحب اور ان کی تینوں صاحبزادیاں سعید کے متعلق اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

ایک روز وہ رات کو دس بجے کے قریب پڑھا کر چلا جا رہا تھا کہ ایک کار اس کے بائیں ہاتھ کے بالکل قریب آکر رُک گئی۔ وہ سر جُھکائے اپنے خیال میں غرق چلا جا رہا تھا۔ کار کے پاس سے گذر گیا لیکن کسی نے اس کا نام لے کر پُکارا تو وہ ہوش میں آگیا۔ کار کے پاس گیا اور نواب صاحب کو دیکھکر سلام کیا۔

"اماں کہاں غائب ہو" نواب صاحب نے پوچھا۔

"تم نے تو اُس روز کے بعد سے صورت ہی نہیں دکھائی" بیگم صاحبہ کار کی پچھلی سیٹ پر سے بولیں۔

"آپ سنجیدہ کیسے کھڑے ہیں گویا اب آپکو دیکھکر ہم کو ہنسی آہی نہیں سکتی" تین قہقہوں کے درمیان کہا گیا۔

"سنجیدہ بن کر تو آپ خاصے دیوانے نظر آنے لگتے ہیں" حامد نے طنز کے طور پر کہا۔ اُس کا خیال تھا خالدہ، ناصرہ و راشدہ بھی اس کی طنز کی شریک ہونگی لیکن اس باب میں ان لوگوں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

"آجکل فرصت ذرا کم ہی ملتی ہے" سعید نے کہا۔

"اچھا۔ ہفتہ کو ضرور آؤ۔ ہم ایک ——"

"معاف فرمایئے" سعید وہاں سے معذرت کرکے فوراً ایک اندھے کی طرف لپکا۔ جو لکڑی ٹیکتا ٹیکتا نالی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھاما اور رہبری کرتا ہوا اسکو صحیح راستے پر لے گیا۔

"عجیب آدمی ہے۔ گویا ہم سب گدھے ہیں اور اس اندھے کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ اعتنا نہیں ہیں" نواب صاحب نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ حامد نے انکے فقرے میں مزید تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بیگم نے اور انکی تینوں لڑکیوں نے اسکی اس حرکت کا مطلق برا نہ مانا۔

ہفتہ کی شام کو آخر سعید بیگم کے ارشاد کے مطابق اُن کی کوٹھی پر گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ وسیع باغیچہ میں چوطرف اندھیرا تھا۔ صرف صدر دروازہ پر بجلی کا بڑا سا قمقمہ لگا ہوا تھا۔ سعید گھاس کے تختہ پر سے گذر کر جب بیچ کے پاس پہنچا تو پیچھے سے کسی نے آکر آہستہ سے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔ راشدہ تھی "آداب عرض راشدہ صاحبہ۔ کہیئے کیا ہو رہا ہے"

"سیر" راشدہ نے کہا۔

"خوب" سعید نے مختصر جواب دیا اور جانے لگا۔

"بات سنو۔ حامد بڑا برا آدمی ہے"

"خوب" سعید نے پھر مختصر جواب دیا۔

"سعید میں تم سے پوچھتی ہوں کیا تم میری مشکلات سے متاثر نہیں ہوتے؟ تم یہ نہ سمجھنے لگنا کہ میں تم سے کسی امر میں طالبِ امداد ہوں"

"تو پھر آپکی نامعلوم مشکلات سے میرے متاثر ہونے کا سوال ہی غیر ضروری ہے"

"تم بھی بہت برے آدمی ہو" حسین لبوں سے ترشروئی کے ساتھ کہا گیا۔

"شاید"

"شاید نہیں یقیناً۔ میں تم سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی ہوں —— نہیں۔ مجھے تم سے ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ تم جیسے بیوقوف انسان سے"

"راشدہ اگر حامد تم سے محبت کرتا ہے تو تم کیوں نہیں اُس کی محبت کا جواب دیتی ہو۔ اگر تم اُس سے نفرت کرتی ہو تو کیوں نہیں جرأت سے اُسکو ایک دفعہ ٹھکرا دیتیں۔ اس کشمکش سے کیا فائدہ کہ کبھی میری نحیف رائے کی پناہ لو اور کبھی غرور سے خودسری کی لینے لگو"

"تم کو مجھ سے اس قدر آزادی سے گفتگو کرنے کا حق نہیں" راشدہ نے آہستہ سے کہا۔

"آیندہ نہیں کرونگا" سعید نے کہا اور قدم آگے بڑھایا۔

"سعید۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ اُن سب سے اچھے جنکو میں جانتی ہوں"

"لیکن تم بہت خراب لڑکی ہو۔ اُن سب میں خراب جنکو میں نہیں جانتا"

"بیوقوف۔ پھول گئے اپنی تعریف سنکر۔ میں نے ایک گدلتے بینوا سمجھکر یہ تم کو محض الفاظی خیرات دینی چاہی تھی"

"لیکن میں نے تم کو غیر راشدہ سمجھکر یہ بیضرر الفاظ کہے تھے"

"غیر راشدہ سے کیا مطلب؟"

"جب تم کو غصہ آتا ہے تو تم تم نہیں رہتی ہو۔ راشدہ وہ نہیں ہے جو وہ بن گئی ہے۔ وہ اس میں شک نہیں مغرور ضرور ہے لیکن اندھی مغرور نہیں بلکہ سمجھدار مغرور جو اپنے

نازو غرور کے باوجود بھی اپنی پاک و منزہ رُوح کی بنا پر حُسنِ سلوک کی زیادہ عادی ہے۔ اگرچہ وہ دوگونہ فطرت کی مالک ہو۔ اگرچہ اُس کی قوتِ فیصلہ ضعیف ہے۔ اگرچہ وہ اپنے معتقدات تک سے روگردانی کی خوگر ہے لیکن اس میں متاثر ہونے کی صلاحیت نہ ہے، وہ تاثرات سے مغلوب ہو سکتی ہو۔"

"سعید تم نے اُس روز سب کی فطرت پڑھی تھی۔ آج میری فطرت کا مطالعہ کر رہے ہو۔ تم نے جو کچھ کہا ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن مجھے بھی اجازت دو کہ تمہاری فطرت کو پڑھوں۔ تم بالکل جماد ہو۔ انسانی جذبات سے خالی۔ محبت سے ناآشنا۔ سادہ لوح لیکن صاف گو، ہمدرد۔"

"بس بس راشدہ۔ ممکن ہے تم میری تعریف میں غلطی کر جاؤ اور میں تمہاری زبان سے اپنے متعلق اچھی صفات سُنکر وہ نہ رہوں جو میں ہوں۔ تم کوٹھی میں چلتی ہو یا ابھی کچھ دیر یہیں رہو گی۔"

"تم چلو میں آتی ہوں۔" سعید چلدیا۔ ابھی وہ بڑے دروازے سے گذرا ہی تھا کہ گیلری کے اختتام پر ناصرہ سے بالکل اتفاقیہ مُلاقات ہو گئی۔

"کون سعید؟" اس کا ہاتھ تھا مکر "سعید میں تم کو کسقدر یاد کرتی تھی۔"

"خوب۔"

"خوب کیا معنی۔ تم نے بھی کبھی مجھے یاد کیا؟"

"کیوں یاد کرتا میں تمہیں۔"

"کیونکہ میں تمہیں یاد کیا کرتی تھی۔"

"لیکن میں کیوں اس سے متاثر ہوتا۔ تم غلطی کر رہی ہو ناصرہ۔ چلو۔ یہ جگہ بات چیت کے لئے موزوں نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچا۔ اُنھوں نے محبت سے اُسکو بٹھایا اور بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ چند منٹ کے بعد تینوں لڑکیاں بھی کمرے میں آگئیں۔ ان کا یکجا جمع ہونا تھا کہ پھر یہ کمرہ قہقہستان بن گیا۔ راشدہ و ناصرہ کی اِس وقت کی طنز و تحقیر سے اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ لڑکیاں چند منٹ قبل سعید کے ساتھ بالکل مختلف طریقے سے پیش آ چکی ہیں۔

سعید کے سامنے ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ مرگی کے مریض کے لئے آئینہ بینی بھی مُضر بتائی جاتی ہے۔ سعید کو دفعتہً کھانسی اُٹھی اس کے بعد اُسپر مرگی کا دورہ پڑ گیا۔ خُدا کی پناہ! اس کی اس وقت کی حالت دیکھکر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی چند منٹ پیشتر کا سعید ہے جو نہایت عاقلانہ باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے کمزور جسم میں رُوح لرز رہی تھی! ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ سخت عذاب میں مبتلا ہے۔ کرسی پر سے گر پڑنے سے اُس کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔

جب اُسکو ہوش آیا تو وہ ایک آرام دہ کمرے میں پڑا ہوا تھا اور اُس کے پاس راشدہ اور نرس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ راشدہ مُسکرا کر اُس کے سرہانے آئی اور بولی "کیوں اب تو تمہارا دماغ درست ہو گیا ہوگا۔"

"میں تم لوگوں کی غور و پرداخت کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بیگم صاحبہ ــــ نہیں خالہ اماں کہاں ہیں؟"

"ہونہہ جب سر پر پڑی تو خالہ اماں ہو گئیں۔ اُس روز تو اُس اندھے کے مقابلہ میں انکی ایسی تحقیر کی گئی۔"

"تحقیر؟ معاذ اللہ۔ راشدہ مجھے تم سے توقع نہ تھی کہ تم بھی اس قدر تنگدل ہو۔"

"میں تنگدل تو تم سنگدل،" راشدہ نے ہنسکر کہا۔

"کس طرح؟"

"جس روز سے میں نے تمہارے چپت رسید کیا اُس روز سے مجھے تم پر بڑا رحم آنے لگا ہے" اُس نے بات ٹالنے کے طور پر کہا۔

"خدا آپکو اس کا اجر دیگا"

"ہاں انسان تو اجر دینے کا عادی نہیں ہے"

"آپ زیادہ باتچیت نہ کیجئے" نرس نے سعید سے کہا۔

"خاموش مرجانے سے تو گفتگو کرتے ہوئے مرجانا اچھا ہے نرس" سعید نے مسکرا کر کہا۔

سعید ایک ہفتہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو اُس نے اپنے مستقر پر جانا چاہا لیکن بیگم نے کہا "تم بیمار ہو مناسب یہی ہے کہ یہیں رہو" مگر سعید اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ بیگم محض ازراہ خدا ترسی اسکو قیام کی دعوت دے رہی تھیں اور وہ اس خیراتی نوازش کے لئے تیار نہ تھا۔ ممکن ہے کوئی اس کی اس حرکت کو ناسپاسی سے تعبیر کرے لیکن ہر شخص کا نظریہ جداگانہ ہوتا ہے۔ جب وہ جانے لگا تو راشدہ نے پھر اُسکو باغ میں جا لیا۔ "تم ہمارے ہاں سے کیوں جارہے ہو؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ میں چلا جانا چاہتا ہوں"

"سعید میں حامد سے اب محبت کرنے لگی ہوں"

"خوب" سعید کا پھر وہی مختصر جواب تھا۔ راشدہ اس کے سامنے حامد کا بار بار تذکرہ کرکے اس میں جذبۂ رقابت پیدا کردینا چاہتی تھی، لیکن سعید کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ راشدہ کے باب میں کسی سے رقابت پیدا کرسکتا ہے۔

"تم بہت بزدل انسان ہو۔ حامد سے ڈرتے ہو"

"ڈرتا تو نہیں ہوں۔ ہاں بچتا ضرور ہوں"

"اور وہ رات دن تمہاری تاک میں ہے"

"کیوں؟"

"میں کیا جانوں۔ تم نے شاید اس سے کہدیا ہوگا کہ میں راشدہ سے محبت کرتا ہوں" غریب سعید راشدہ سے محبت کرنے کا تخیل بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس غیر ممکن الوقوع بات کو سُنکر اس کے ذہن میں اس خیال نے کروٹ لی کہ وہ بھی راشدہ سے محبت کرسکتا ہے۔ راشدہ کی ترکیب کامیاب ہوسکتی تھی (اُس نے سعید کے سینے میں محض بیداری محبت کے خیال سے ہی مرقوم بالا فقرہ کہا تھا) اگر سعید محبت آشنا دل کا مالک ہوتا۔

"لیکن راشدہ میرا تم سے محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے بیکس فرہاد کا شیریں کو چاہنا"

"ہاں ہے تو یہی بات۔ تم مجھے چاہو ہی کیوں؟"

"تو میں تمہیں چاہتا ہی کب ہوں" سعید نے کہا۔

"تم بزدل ہو محض بزدل۔ حامد سے ڈرتے ہو" اُس نے پھر اُس کے جذبات مردانہ کو اُبھارنے کی نیت سے کہا۔

"راشدہ اگر مجھے تم سے کبھی محبت ہوگئی تو میں حامد تو کیا خدا سے بھی نہیں ڈرونگا"

"لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ میں بھی تم سے محبت کرنے لگونگی؟"

"نہیں یہ بات میرے خیال میں بھی نہیں آتی ہے"

"حالانکہ حامد جی اسی اُمید پر رہا ہے کہ میں اس سے محبت کرسکتی ہوں۔ تم بھی ایسی اُمید کیوں نہیں باندھ لیتے"

"موہوم اُمید سے کیا فائدہ۔ ہوسکتا ہے کہ تم کچھ عرصہ بعد اُسکو چاہنے لگو کیونکہ وہ دولتمند آدمی ہے۔ خوشرو ہے"

اگرچہ فطرت اچھی نہیں ہے۔"

"یہ آپ ہر شخص کی فطرت خوب پڑھ لیا کرتے ہیں۔ مگر وہ کس قدر صحیح ہوتی ہے! میں دولت کو پسند نہیں کرتی ہوں"

سعید کو اس قدر توقعات دلانے کے بعد وہ پھر اسکو دور کرنے کے خیال سے بولی۔ "مگر ہاں تم سے میں محبت نہیں کرونگی۔"

"مجھ سے کوئی محبت نہیں کرسکتا ہے۔ میں مرگی کا مریض ہوں۔ افلاس زدہ ہوں۔ اور زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں۔ میرے اطوار دلوں کو موہ لینے کی قوت سے خالی ہیں۔ مجھے ریا آمیز گفتگو و حرکات نہیں آتیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو کہ تم سے کوئی محبت نہیں کرسکتا۔ ناصرہ باجی میرا خیال ہے تمکو چاہتی ہیں۔"

"ایں!" سعید نے حیرت سے کہا۔ "ناممکن!" وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"سعید محبت خواہ کوئی چیز نہو اور جسکو ہم محبت کہتے ہیں وہ خواہ "پسندیدگی" ہی ہو۔ شکار کے مختلف طریقہ رکھتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہماری عین خواہش ہے کہ دولتمند شوہر ملے۔ تم مجھے شاید اس آزاد گفتگو پر بے حیا سمجھوگے۔ تمہیں خیال ہوگا کہ اس قسم کی آزاد بیانی لڑکی کے شایاں شان نہیں۔ مگر تم جیسے انسان کے سامنے ہر لڑکی اسی طرح اپنے حقیقی خیالات کا اظہار کرسکتی ہے۔ خیر تو ہماری بھی خواہش یہی ہے کہ دولتمند میاں ملے۔ لیکن اباکے پاس بفضلہ دولت کی کمی نہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک غیر دولتمند مگر پسندیدہ انسان کو ٹھکرادیں اور دولتمند مگر غیر پسندیدہ انسان سے شادی کرلیں۔"

"تم نے "ہم" استعمال کرکے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یا تم تینوں بہنوں کا یہی خیال ہے؟"

"کم ازکم میرا تو یہی خیال ہے۔"

"خیر میں اس مسئلہ میں چونکہ زیادہ معلومات نہیں رکھتا ہوں اس لئے تم سے کچھ بحث نہیں کرسکتا۔ اچھا اب جاتا ہوں۔"

"پھر کب آؤگے؟"

"ہفتہ عشرہ میں بشرط فرصت چکر لگا جاؤنگا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ راشدہ وہیں کھڑی ہوئی اسکو دیکھتی رہی۔ نیچے سے دل میں نامعلوم کیا اندوہناک خیال آیا ایک دھیمی سی آہ بھری اور اندر چلدی۔

قسمت کے آپ قائل ہوں یا نہ ہوں مگر بعض دفعہ اتفاقی واقعات کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ جس بابو کے لڑکے کو سعید پڑھاتا تھا اس نے زبردستی ایک ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ سعید کے سر بھی منڈھ دیا تھا۔ آپ تعجب کرینگے کہ پہلا انعام سعید کے نام ہی نکلا!

اب وہ بھی سینکڑوں رئیسوں سے کم نہ تھا۔ لیکن فطرت کی سادگی کا کیا کرتا۔ اس کی عادتوں پر زر کی آشوبی قوت بھی کوئی شیطانی اثر نہ ڈال سکی۔ جولوگ اسکی غربت و افلاس کی وجہ سے پہلے اس سے متنفر تھے اب اُس کی شناسائی کو باعث فخر سمجھنے لگے۔ نواب صاحب کی موٹر تو رانذن اس کے دروازے پر ہی رہتی تھی۔

اس نے اس دولت سے بہت سے رفاہی کام جاری کردیئے وہ غربا و امراء دونوں طبقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ہزاروں بیوائیں سینکڑوں طلبا اور بیشمار سفید پوش مفلس شرفا اس سے پل رہے تھے۔

ناصرہ نے اپنی مبہم محبت کو آخراب اسیر بالکل واضح کردیا۔ اپنی حرارت محبت سے مغلوب ہوکر نہیں بلکہ دولت کی آنچ سے متاثر ہوکر۔ خالدہ اب بھی اسکو اسی قدر قابل رحم آلہ تفریح سمجھتی تھی۔ اور راشدہ اب بالکل خاموش تھی۔

"خالہ اماں میرے مکان کے پاس ایک لوہار رہتا ہے۔ میرا ارادہ اُس کی لڑکی سے شادی کرنے کا ہے۔ کیسی محنتی لڑکی ہے۔"

"مگر تم بغیر ڈاکٹر کے مشورے کے شادی نہ کرنا!" بیگم نے کہا۔

"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میرے مرض میں شادی سے افاقہ ہوجانے کی توقع ہے۔"

"کسی کمہار کی لڑکی سے شادی کرتے تو اچھا تھا۔ جہیز میں گدھے تو ملتے"۔ راشدہ نے ہنسکر کہا۔

"کہی تو پتہ کی بات!" ابھی وہ باتیں کرہی رہے تھے کہ چوکیدار گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ اُس کی بیوی کے سخت دردِ زِہ ہو رہا ہے کوئی سنبھالنے والا نہیں ہے اُسکو شفاخانہ میں بھیجنے کا انتظام کردیا جائے۔

ناصرہ وخالدہ ہنسکر بولیں "خدا غریبوں کو بچے دیتا ہی کیوں ہے کہ مفلسوں کی تعداد میں اضافہ ہو"۔ لیکن راشدہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور چوکیدار کی کوٹھری کی طرف چلدی۔

"راشدہ کہاں جاتی ہے۔ نہ بیٹی کنواری لڑکی زچہ خانہ میں نہیں جایا کرتی ہیں۔"

"امی کنواریں کی آبرو ایک غریب کی خدمت کرنے سے مجھ پر اور بھی فخر کرنے لگے گی!" یہ کہہ کر وہ چلدی۔ اور جب تک بیمار عورت شفاخانہ میں نہ چلی گئی وہ ہر طرح اُسکی خدمت کرتی رہی۔ یہ تھی راشدہ کی اصل فطرت! ہر انسان کی اصل فطرت یہی ہوتی ہے۔ دوسروں کی تکلیف سے وہ ضرور متاثر ہوتا ہے۔ لیکن کبر، نمود تصنع اور شخصیت پرستی اسپر اسقدر موٹی غیر انسانی چادر لپیٹ دیتی ہے کہ وہ اپنے سے پست لوگوں کے کام آنے میں شرم وعار محسوس کرنے لگتا ہے۔

سعید راشدہ کی اس حرکت سے بیحد متاثر ہوا۔ اسکے ساکن قلب میں دفعتہً ایک جدید روشنی سی پیدا ہوگئی جسنے اُس کے سادہ دل کے گوشے گوشے کو منور کردیا۔ سینے کے ویران احاطہ میں ایک پری جلوہ گر ہوئی جو پہلے تو بصد شوخی و ناز مصروف خرام رہی اس کے بعد راشدہ کی حسین وجمیل صورت میں منتقل ہوکر دورانِ خون کے ساتھ اس کی روح کے عمق میں پہنچ گئی!

صبح سعید اُٹھا تو اُسکو شدید بخار چڑھا ہوا تھا۔ یہ محبت کا بخار تھا۔ خواب میں لوہار کی لڑکی نے آکر اُسکی تکالیف کو کم کرنا چاہا لیکن سعید نے گرانی طبع میں کوئی شگفتگی محسوس نہیں کی۔ ناصرہ نے پیار کی باتیں آکر نائیں۔ لیکن وہ بدستور بخار میں تپتا رہا۔ بیگم نے آکر مادرانہ محبت سے اُس کے سر کو تھپتھپایا لیکن وہ اسی قدر گرانی محسوس کرتا رہا۔ آخر شام کو اُسکا بخار تیز ہوگیا اور رات کو ایک سو چھ ڈگری سے بھی اونچا ہوگیا۔ اُسپر بحران کی سی حالت طاری تھی۔ نواب صاحب۔ ڈاکٹر، بیگم۔ ناصرہ، خالدہ، راشدہ سب ہی کمرے میں موجود تھے اور وہ چیخ چیخ کر بخار کی حالت میں بک رہا تھا۔ "راشدہ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ حامد سے بھی نہیں ڈرتا۔ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ نواب صاحب سے بھی نہیں ڈرتا۔ میں تمہارے لئے حامد سے جنگ آزمائی کرونگا۔ کیونکہ میں تمہیں چاہتا ہوں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ایں! ہاں ہاں تم سے محبت شدید محبت کرتا ہوں۔ چوکیدار کی ماں (بیوی کے عوض) کے بچہ پیدا ہوگیا۔ وہ راشدہ اُسکو لئے بیٹھی ہو۔ میری راشدہ!......"

نواب صاحب نے بیگم کی طرف دیکھا بیگم نے نواب صاحب کی طرف۔ دونوں نے ایکدوسرے کو کچھ سمجھا دیا چنانچہ وہ باہر آگئے۔

حامد جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ناصرہ جل کر جلدی۔ خالدہ حیرت سے مُنہ موڑ کر ہنسنے لگی۔ ڈاکٹر نے لپک کر لین
ڈر پیشانی پر چھڑکا اور راشدہ شرماتی ہوئی محبت سے سعید کے سرہانے آ بیٹھی!

قیسی رامپوری

قطعات

اونگھتا ہے جب شہ خاور شفق کی گود میں — سینۂ دریا پہ یوں ہوتا ہے گلشن کا گماں
جیسے آئینے پہ گرتا ہے عروسِ نو کا عکس — صبحدم گلرنگ جلووں سے حسیں گلکاریاں

(۲)

گا رہی ہے ایک ٹیلے پر کوئی آتش نوا — زمزموں سے پڑ رہی ہیں یوں ہواہیں سلوٹیں
بسترِ ناکامِ اُلفت کو وفورِ درد سے — جس طرح کر دیں شکن آلود شب کو کروٹیں

(۳)

سایہ افگن ہے فضا پر آج دیوالی کی شب — جگمگاتے ہیں در و دیوار پر زرّیں چراغ
رات کے پچھلے پہر جیسے وطن کی یاد سے — مُسکراتے ہیں کسی مہجور کے سینے کے داغ

(۴)

وصل کی شب ایک کمسن کے حسیں چہرے پہ یوں — سرمئی زلفوں کی اک گستاخ نے ڈالی نقاب
چلچلاتی دھوپ میں جیسے دُعا میخوار کی — بڑھ کے خوں آشام سورج کو کرے زیرِ سحاب

(۵)

کر رہی تھی غُسل دوشیزہ لبِ آبِ رواں — چاپ سُن کر پاؤں کی میرے سمٹ کر رہ گئی
رات کی دیوی کے کانوں میں سپیدی صبح کی — نقرئی ہونٹوں سے جو کہنا تھا جیسے کہہ گئی

(۶)

دیکھ کر تقدیر سے افلاس کی گستاخیاں — چل دیئے ہیں چھوڑ کر سب اسطرح الطاف کو
جسطرح گُم کردہ منزل راہرو کا سایہ بھی — شب کی تاریکی میں چُپکے سے کہیں جاتا ہے کھو

الطاف مشہدی

اُردو ڈراما کی ترقی کے ذرائع

ڈراما کی اہمیت

ادبیات میں ڈراما ہی ایک ایسی صنف ہے جس کے دو پہلو ادبی اور تمثیلی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی پر پوری طرح حاوی ہے۔ چونکہ یہ خصوصیت علم و فن دونوں کو اپنے دائرہ میں یکساں طور پر گھیرے ہوتی ہے، اس لئے دُنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے اس کو انسانی زندگی کے عملی پہلو کے لئے خاص طور پر موزوں خیال کیا۔ یونانی عقلاء نے جس طرح اس کی اصلاح و ترقی کیلئے کوشش کی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ کے انگلستان نے اپنے ماحول کو ڈراما کیلئے حد درجہ موزوں پایا اور اس کے سدھارنے اور پھیلانے میں جتنی دلچسپی لی وہ ادبیاتِ انگریزی کا ایک اہم اور ناقابل فراموش باب ہے۔

دورِ جدید کو انقلابی دور کہا جاتا ہے اور جہاں زندگی کو ہر شعبہ میں جنگِ عظیم کے بعد اہم انقلابات نے دُنیا کی کایا ہی پلٹ دی۔ وہاں ادبیات کی تاریخ کا نیا صفحہ بھی اُلٹا گیا۔ تاریخ ادبیات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں ترقی یافتہ اور انقلاب پسند ممالک ڈراما کی ترقی و اصلاح پر کافی توجہ کر رہے ہیں۔ روس نے حکومت کا چولا کیا بدلا زندگی اور ضروریاتِ زندگی کی ہر پرانی چیز نکال پھینکی مگر ڈراما کا یہاں بھی طوطی بولتا ہے۔ بلکہ سوویٹ نظام سے پہلے جو حالت تھیٹر کی تھی اب اس میں کئی گنا زیادہ خوبیوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلے زار حکمرانِ روس، اپنی ہوسناکیوں کی پیاس بجھانے کیلئے تھیٹر کے وجود کو باقی رکھتے تھے مگر اب تھیٹر ایک باضابطہ ادارۂ تعلیم بنا لیا گیا ہے اور اس لحاظ سے اس کی بقا نہایت ضروری سمجھی گئی۔ انقلاب فرانس کے بعد پیرس کے اوپیرا کی مقبولیت بھی زیادہ ہوگئی۔ اطالیہ کا تھیٹر گو کہ آج "رومن تھیٹر" کے مقابلہ میں نہیں لیکن اپنے ہمسایہ ممالک سے کسی طرح کم نہیں۔ جرمنی نے جنگِ عظیم کے بعد سے جہاں مختلف شعبہ جات میں ترقی کی ہے اور اپنے آپ کو بہت جلد اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی طاقت کی ہمسری کر سکے وہاں اس نے تھیٹر کو نظر انداز نہیں کیا۔ تھیٹر کو عیش و عشرت کا ہی محض گہوارہ خیال کیا جاتا جیسا آج بھی بعض تنگ نظر افراد سمجھتے ہیں تو جرمنی کبھی اپنے لئے گہوارۂ تعیش تیار نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دُنیا ساری اس بات پر متفق ہے کہ اسٹیج کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے اور اگر پچھلے دس سال کی رپورٹوں کا مطالعہ کریں تو وہ ہر ملک جس نے تھیٹر کی بقا محض اسی خیال سے کی تھی آپ کو ایسے اعداد و شمار بتائیگا جس سے کہ اس کی کامیابی ظاہر ہوگی۔ ۱۹۲۶ء کی وہ رپورٹ جو انگلستان کی مجلس تعلیم بالغان کی طرف سے شائع ہوئی ہے اس طریقہ کار کی کامیابی کی گواہ ہے۔

مسٹر برنارڈ شا "ڈراماتی تنقیدیں اور مضامین" میں لکھتے ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ میں جو اہمیت گرجا کو حاصل تھی وہی اہمیت بیسویں صدی میں تھیٹر کو حاصل ہے۔ بلکہ لندن کے گرجا کی جو اہمیت تھی اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر لندن کے تھیٹر کو حاصل ہے۔ "گرجا کو جانے کی بجائے" برنارڈ شا لکھتے ہیں "لوگ اب لندن میں تھیٹر کو جاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تھیٹر اس سے فائدہ اٹھا کر ٹھوس کام کرنے لگے۔ اور اپنے آپ کو اچھے خیالات پیدا کرنیکا کارخانہ، ضمیر کا مکبّر الصوت، سماجی قانون کا معمل اور تجرباتی تعلیم کی درس گاہ قرار دے لے!!"

ڈراما اور تھیٹر کا تعلق

یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ڈراما اور تھیٹر کا تعلق روح اور جسم کا سا ہے۔ روح بغیر جسم کے اور جسم بغیر روح کے بیکار ہے۔ ڈراما کے ادبی اور تمثیلی دونوں پہلوؤں میں تمثیلی پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور بعض نقادوں کا خیال تو یہ ہے کہ ڈراما بغیر تمثیل کے بے جان ہے اور یہ بڑی حد تک حقیقت ہے ایسی کہ جس سے انکار مشکل ہے۔ اس لحاظ سے جہاں ڈراما کی ترقی کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں تھیٹر کی ترقی کا سوال خود بخود اٹھتا ہے۔ ترقی یافتہ تھیٹر کو دیکھکر اندازہ لگانے والے قیاس کر سکتے ہیں کہ یہاں ڈراما کی صنف نے بھی اسی مناسبت سے ترقی کی ہوگی۔ یہ خیال کوئی بیسویں صدی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم ہی سے یونانیوں نے اِسکی

ترویج کی۔ رومانے کھنڈرات میں تھیٹر کی جو عالی شان عمارت کے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں وہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ یونانی ڈراما کی ترقی دراصل یونانی تھیٹر کی ترقی تھی یہی حال ملکہ الزبتھ کے زمانہ کے تھیٹر کا ہے۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ اس زمانے میں فن تھیٹر کی مادی ترقی کے وہ ذرائع مہیا نہ تھے جو آج ہم میں موجود ہیں۔ شکسپیئر کو بلاشبہ بیسویں صدی کا تھیٹر نصیب نہیں ہوا جہاں کہ وہ آرڈن کے جنگل کا سین پیش کر سکتا۔ طوفان، ابر و باد کا منظر دکھا سکتا، پریوں کو فضائے بسیط میں اڑتے ہوئے ظاہر کر سکتا۔ پاگل لیر کو پہاڑ کی اونچی چوٹی سے گرتے ہوئے دکھا سکتا لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے تھیٹر کی ترقی انگریزی سماج کے دوسرے شعبوں کے مقابل میں زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہے۔

مختصر یہ کہ تھیٹر میں چونکہ ڈراما کے ادبی پہلو کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اس لئے لازمی ہے کہ اس اہم شعبہ کی تکمیل کیلئے وہ مناسب ترقی کرے۔ ورنہ تمثیلی پہلو کی خرابی سے ادبی پہلو پر بھی حرف آئیگا۔ اس کے علاوہ ڈرامہ نگار چونکہ ہمیشہ تھیٹر کو پیش نظر رکھکر ڈرامہ لکھتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ڈرامہ نگار کی منشار کے مطابق تھیٹر ترقی یافتہ ہو ورنہ جو چیز فضا، مقام اور موقع کے ذرائع سے ظاہر کرنا چاہتا ہے واضح نہ کر سکے گا۔ ڈراما نگار کو تھیٹر کی جتنی سہولتیں مہیا ہونگی اتنا ہی زیادہ اچھا ڈرامہ وہ لکھ سکیگا اور اسی قدر سہولت کے ساتھ مصنف کا اصلی مقصد اور منشا جو کہ وہ حقیقت میں پیدا کرنا چاہتا ہے ظاہر ہو سکے گا اور جب تک ڈراما اور تھیٹر کا یہ باہمی تعاون نہ ہوگا اس وقت تک ڈراما صحیح معنوں میں تمثیلی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ڈراما نگار کے قطع نظر اداکار جو ڈراما کے تمثیلی پہلو پر گہرا اثر ڈالتے ہیں بہت کچھ تھیٹر کی ترقی پر دار و مدار رکھتے ہیں۔ ترقی یافتہ تھیٹر ہر ملک اور ہر زمانہ میں اچھے اداکار پیدا کرنے کا کارخانہ سمجھا گیا ہے۔ تھیٹر ہی کی ضروریات پر اچھے اداکار ہوتے ہیں۔ اور اسی کی مناسبت و موزونیت سے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں۔

اوپر کے سارے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تھیٹر اور ڈراما کا چولی دامن کا تعلق ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب تک تھیٹر ترقی نہیں کرے گا ڈراما ترقی نہیں کر سکے گا اسلئے ہمیں اس بات پر غور کرنیکی ضرورت ہے کہ تھیٹر کیونکر ترقی کر سکتا ہے؟

تھیٹر کی ترقی کے ذرائع

سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ تھیٹر کی بدنامی کو دور کیا جائے۔ ہمارے ملک میں تھیٹر اتنا بدنام ہے کہ سنجیدہ اور شائستہ طبقہ اس کے نام ہی سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے بدمعاشی اور عیاشی کا اکھاڑہ جانتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں کہ یہ خیالات ملک میں کیوں پیدا ہوئے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان سب کا اصل ہماری تھیٹریکل کمپنیوں کی بدترین سماج ہے۔ وہ جہلار کے ہاتھوں میں ہیں اور سرمایہ دار عیاشوں کے دل بہلانے کا ذریعہ بنے ہوتے ہیں۔ اس کے ایکٹر اور ایکٹرس نہ صرف جاہل ہیں بلکہ بد اخلاق اور بد اطوار ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو ڈراونی اور بھیانک تصویر ہندوستانی تھیٹر کی معاشرت کی عام طور پر پیش کی جاتی ہے اس میں مبالغہ کا جزو ہوتا ہے لیکن اسکی تہ میں حقیقت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ دار کون ہیں ——— مالکان کمپنی یا عوام جو انکی سرپرستی کرتے ہیں؟ میں ذاتی طور پر دونوں کو اس کا مشترکہ ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کے اسباب و علل پر بحث کی جائے میرے پیش نظر یہاں صرف ان کی اصلاح ہے۔ ملک کے ہر طبقے میں تھیٹریکل کمپنیوں کی طرف سے عام بدگمانی پھیلی ہوئی ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس خیال کو ازسرِنو بدل دیا جائے۔ کیونکہ ایک چیز کے متعلق جب کوئی خیال ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ بسا اوقات پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ جو مٹائے نہیں مٹتا۔ اس کے علاوہ اگر موجودہ تھیٹریکل کمپنیوں کے اعداد و شمار فراہم کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی تعداد بہت کچھ گھٹ گئی ہے اس کا سبب یقیناً فلم کمپنیوں کی بہتات ہے۔ اس لئے میرے خیال میں جتنی پرانی قسم کی تھیٹریکل کمپنیاں باقی رہ گئی ہیں ان سب کو بالکل ہی توڑ دینا چاہیئے۔ اور ان کے کھنڈر پر نئی تھیٹریکل کمپنیاں بنانی چاہئیں اور ایسی ہی صورت میں عوام کے خیالات کی کایا پلٹ ہوگی۔

فلم تھیٹر کا نعم البدل نہیں ہے

بعض لوگوں میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ فلم تھیٹر کا نعم البدل ہے اور یہ کہ فلم کمپنیوں کی موجودگی میں تھیٹریکل کمپنیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے اور فلم اور تھیٹر کے فرق کو محسوس کئے بغیر قائم کر لیا گیا ہے

بیشک بولتے فلموں نے آنکھ کے ساتھ کان کی تواضع کا بھی انتظام کر دیا لیکن کیا تصویروں کو حرکت کرتے دیکھنا اور تصویروں کو بولتے سُننا اتنا ہی زندگی کے قریب ہے کہ جتنا کہ خود انسانوں کو گوشت و پوست والے انسانوں کو حرکت کرتے ہوئے اور بولتے ہوئے دیکھنا اور سُننا؟ دوسرے اور بے شمار اصولی اور فنی اختلافات کے علاوہ یہ فرق اتنا زبردست ہے کہ ذہین والوں نے محض اس کی وجہ سے یہ ضروری خیال کیا کہ تھیٹر فلم کی ترقیوں کے باوجود بھی ایک مستقل آرٹ کے طور پر علیحدہ باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ شہروں میں فلموں کی نمائش کے ساتھ تھیٹریکل ڈرامے بھی اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ اور عوام کی سرپرستیاں برابر دونوں کو کھینچے ہوئے ہیں۔ بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے ڈراما کو جو رفعت حاصل ہے وہ فلم کو آج تک حاصل نہیں ہو سکی۔

تھیٹریکل کمپنیوں کا قیام

پُرانی تھیٹریکل کمپنیوں کی کمزور عمارت کو گرانے کے بعد اس کی تعمیر از سرِ نو نئے طرز پر ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کے مختلف بڑے بڑے شہروں میں متعدد تھیٹریکل کمپنیوں کا قیام ضروری ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ظاہر ہے کہ سرمایہ ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج کل فلم کمپنیاں بنانے کا مرض عام ہو چلا ہے اور ہر طرف یہی کوششیں ہو رہی ہیں اور باوجود اس کے کہ اب ہر فلم کمپنی کو مالی فائدہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ بہت سی چھوٹی چھوٹی کمپنیاں خسارہ برداشت کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے جاں کنی کی حالت میں ہیں مگر پھر بھی نئی کمپنیاں بنانے کا شوق روز افزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کچھ دنوں کسی نہ کسی فلم کمپنی میں حصہ لیتا ہے خواہ اداکار کی حیثیت سے یا خواہ کسی اور حیثیت سے وہ وہاں سے علیحدہ ہو کر فوراً ہی خود غلط یہ رائے قائم کر لیتا ہے کہ اس کو فلمی دُنیا کا کافی تجربہ ہے لہٰذا اس کو فلم کمپنی قائم کرنی چاہیئے۔ عوام کو گمراہ کر کے حصص فروخت کر کے چھوٹے سے غیر مستحکم سرمایہ کے ساتھ کمپنی قائم ہوتی ہے اور فضول ڈرامے پیش کر کے ٹوٹ جاتی ہے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ کی فراہمی اس قسم کے اغراض کیلئے ابھی ہمارے ہاں زیادہ دشوار نہیں ہوئی۔ اس لئے اگر منظم کوشش کی جائے تو وہ سرمایہ جو ٹوٹنے والی فلم کمپنیوں کیلئے فراہم کیا جاتا ہے۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے قیام کیلئے آسانی کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم کمپنی کی بہ نسبت تھیٹریکل کمپنی کو سرمایہ بھی کم درکار ہے۔

سرمایہ کے بعد اداکاروں کی ضرورت زیادہ اہم ہے کوئی تھیٹریکل کمپنی عمدہ اداکاروں کے بغیر نام پیدا نہیں کر سکتی اس لئے ان کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جانا چاہیئے۔ اداکاروں کے انتخاب میں کئی چیزوں کا خیال زیادہ ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں، ان کے اخلاق، عادات و اطوار قابلِ اعتراض نہ ہوں، جسمانی صحت اور دماغی صلاحیت اچھی خاصی ہو۔ شائستہ اور مہذّب ہوں، اور ان سب سے بڑھکر ان کی فطرت میں اداکاری کی صلاحیت ان کے تمام خصائل میں زیادہ نمایاں ہو۔ اگر کسی میں آخر الذکر خصوصیت نہیں ہے اور باقی تمام محاسن جمع ہیں تو میں ایسے شخص کو اداکاری کیلئے کبھی موزوں نہیں کہوں گا۔ اس فطری صلاحیت کے ساتھ ساتھ مشق اور محنت بھی لازمی ہے ورنہ لاپروا اداکار اکثر و بیشتر اپنی پوری چمک نہیں دکھا سکتا۔ اور اس کو وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جسکا کہ وہ فطرتاً مستحق تھا۔ اسی قسم کی ایک دلچسپ مثال میں نے ایک جگہ پڑھی ہے۔ ایک ہندوستانی امیر ہالی ووڈ گئے۔ اور ایک مشہور فلم اسٹوڈیو دیکھنے گئے۔ وہاں انھوں نے متعدد اداکاروں سے باتیں کیں اور اسی سلسلہ میں ایک شہرۂ آفاق ایکٹریس سے بھی ملنے کی خواہش کی۔ اس ایکٹریس نے جواب میں کہلوا بھیجا کہ گو کہ ابھی اس کی شوٹنگ کیلئے کافی وقت ہے لیکن شوٹنگ ختم ہونے تک وہ شاید ملنے کے قابل نہ رہے اس لئے معافی چاہتی ہے۔ فلم کے شوٹنگ کے ختم ہونے کے بعد وہ ملی اور مکرر معافی چاہنے کے بعد اس نے پہلے نہ ملنے کی وجہ یہ بتائی کہ اُس کو اِس دفعہ ایک حُزنیہ پارٹ کرنا تھا اسی لئے وہ وقت سے بیشتر آکر حُزنیہ تاثرات اپنے اوپر طاری کر رہی تھی۔ اور رو رہی تھی کہ نہ صرف اس کا دل بھر آئے بلکہ اس کے چہرے اور جسم پر حُزنیہ تاثرات قبل از وقت ہی پیدا ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس قسم کا خلوص اور اتنی محنت نہ کی جائے اداکاری عروج کو نہیں پہنچتی۔

اداکار کیلئے میں نے تعلیم یافتہ ہونیکی شرط محض اس لئے لگائی کہ اداکاری کی دو خصوصیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک حرکات

اور دوسرے طرز ادا۔ اور ان دونوں کیلئے اداکار کا اپنے پارٹ کے نہ صرف مفہوم کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے بلکہ لفظوں اور جملوں کو اسی مفہوم کے لحاظ سے اداکرنا لازمی ہے اور یہ غیر تعلیمیافتہ اداکار کے بس کی بات نہیں۔ یہاں ان غیر معمولی ذہین اور دربیں اداکاروں سے بحث نہیں کر رہا ہوں جو بنتے نہیں بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ قسم سارے اصولوں اور قوانین سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ہر اداکار کیلئے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ضروری ہے کہ وہ ڈرامہ نگار کے مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرنیکی صلاحیت اپنے میں رکھے۔ البتہ بڑا اداکار اس ضرورت کے سوا ایک خصوصیت یہ بھی رکھتا ہے کہ ڈرامہ نگار کے کردار کی پوری ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو انفرادی طور پر باقی رکھے۔ شاعر اپنے شعر میں جب کبھی فلسفیانہ نکات یا جذباتی نفسیات کا ذکر کرتا ہے تو صرف اشارہ ہی پر اکتفا کرتا ہے مگر اس کا شارح اپنی دماغی صلاحیتوں سے بال کی کھال کھینچ کر ان اشاروں کی ایسی وضاحت کرتا ہے کہ وہ خود بجائے ایک مستقل درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی حال ڈرامہ نگار کے کردار کا ہوتا ہے وہ اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اداکار ان لفظی اشاروں کو حقیقت میں اس طرح بدل دیتا ہے کہ اس کی ساری تفصیلات پیش نظر ہو کر ایک خاص چیز ہو جاتی ہے۔ میں نے اداکار کے انتخاب میں اچھے کردار کے اصحاب کا ذکر محض اس لئے کیا کہ موجودہ دور میں تھیٹریکل کمپنی جس چیز کی وجہ سے زیادہ بدنام ہے وہ اداکاروں کی بد اخلاقی ہے لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ عوام کے دلوں سے یہ خیال نکالنے کے لئے اداکاروں کا انتخاب کرتے وقت خاص طور پر اچھے عادات، اخلاق کے اشخاص کا لحاظ رکھا جائے۔ بعض نقاد جن کے مطمع نظر "آرٹ، آرٹ کی خاطر" ہے وہ ضرور اس طرز انتخاب کو دقیانوسی اور غیر ضروری سمجھیں گے لیکن اگر حالات کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ طریق کار کتنا اہم اور ضروری ہے۔ جب تک اس قسم کی کمپنیوں کی اخلاقی زندگی کا معیار بلند نہ ہوگا سنجیدہ اصحاب اس میں دلچسپی نہ لیں گے۔ اور اچھے کیریکٹر کے اداکار کبھی اپنے آپ کو اس زمرہ میں شامل نہیں کریں گے۔ اداکاری جب تک عوام کے ہاتھوں سے نکل کر صاحب ذوق، سنجیدہ، تعلیمیافتہ اور شریف طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچ نہ جائیگی اس کی پیشانی سے کلنک کا ٹیکہ دور نہ ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ممالک غیر میں ڈراما اسی وقت ترقی کر سکا جب کہ اس کے اداکاروں کی وقعت لوگوں کے دلوں میں آرٹسٹ کی حیثیت سے قائم ہو گئی۔ زمانہ قدیم ہی سے وہاں یہ پیشہ کبھی بدنام نہیں ہوا۔ اور اسٹیج پر آنے کیلئے کسی ایسے شخص نے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہو کبھی پس وپیش نہیں کیا۔ اداکاروں کا وہی اعزاز کیا گیا جو دوسرے اعلیٰ درجہ کے پیشوں اور ان کے آرٹ کو اسی طرح سراہا گیا جس طرح کہ دوسرے فنون کو اور پھر ان کی شخصیت کی بھی ویسی ہی وقعت کی گئی جیسی کہ کی جانی چاہیئے تھی۔ انگلستان کے تھیٹر کے مشہور اداکار آج تاریخ ادب انگریزی میں باقی ہیں۔ اور انکی سماجی حیثیت بھی اتنی ہی بلند تھی جتنی کہ ان کی فن کاری۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں اداکاروں کی سماجی حیثیت بیحد پست ہے اور اس کے وہ خود بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ ان کی جہالت اور بد اخلاقی نے انھیں سوسائٹی میں کوئی درجہ حاصل نہیں کرنے دیا۔ یہ کوئی متعصبانہ بیان نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے نوجوان جو جہالت کی وجہ بدکاریوں کا شکار ہوجاتے اور جنہیں اپنے کرتوتوں کے سبب خود اپنے گھر میں رہنا دوبھر ہو جاتا ہے آوارہ گردی کے لئے سب سے پہلے اس قسم کے میدان تلاش کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب اداکاروں نے اپنی فنی زندگیاں اسی طرح شروع کی ہیں بلکہ مجھے اس کا اقرار ہے کہ بعض صاحب ذوق افراد نے بڑے ایثار سے کام لیکر آرٹ کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ہے مگر انکی تعداد بہت ہی کم ہے۔ بہرحال یہی وہ اسباب ہیں کہ جن کے سبب ہمارے اداکار بدنام ہیں۔ اور جب تک ان کا ازالہ نہ کیا جائیگا تھیٹریکل کمپنیوں کا دوبارہ قیام ناممکن ہو جائیگا۔ اور جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں بغیر تھیٹریکل کمپنیوں کے اردو ڈراما کی ترقی ناممکن ہے۔

اسٹیج

ڈراما کی کامیابی کے لئے اسٹیج کی وسعت و ترقی نہایت ضروری ہے۔ اداکار کتنے ہی عمدہ ہوں اور ڈراما کیسا ہی اچھا ہو لیکن اگر اسٹیج ڈراما کی ساری ضرورتوں کیلئے ناکافی ہے اور اداکار اور ڈرامانگار کو ممکن سہولتیں بہم نہیں پہنچاتا تو ڈراما کی ناکامی یقینی ہے۔

سب سے پہلے اسٹیج کا وسیع ہونا ضروری ہے اتنا کہ اگر ضرورت ہو تو اس پر راستہ کا منظر پیش کیا جاسکے، لوگوں کی آمد و رفت

کا انتظام کیا جا سکے۔ اور مجمع دکھایا جا سکے۔ ایک مشکل ڈراما سے دوران میں یہ پیش آتی ہے کہ ایک سین اور دوسرے سین کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے وہ تماشائیوں کو ناگوار گذرتا ہے لیکن اس وقفہ کے بغیر اسٹیج کا انتظام نہیں کیا جا سکتا اور دوسرے منظر کی ضروریات کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ اگر اسٹیج اتنا وسیع کیا جائے کہ ایک پردہ کے پیچھے دوسرا سین اور دوسرے پردہ کے پیچھے تیسرا سین قبل از قبل جما دیا جائے تو یہ مشکل ایک حد تک پوری ہو سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ تجویز بھی کچھ زیادہ کار آمد ثابت نہیں ہوئی کیونکہ پہلا سین تو یقیناً اسٹیج کے بالکل اگلے حصّے پر ہوگا۔ لیکن دوسرا اس کے پیچھے اور تیسرا اس کے پیچھے اس طرح پیچھے جمے ہوئے سین اسٹیج کے اتنے اندرونی حصے میں ہوں گے کہ اوّل تو تماشائیوں کو مکالمہ سنائی نہ دے گا اور اگر بالفرض مکبّر الصوت کا انتظام ہو اور سنائی بھی دے تو اسٹیج کا اگلا حصّہ خالی رہ کر وہ بدنما منظر پیش کرے گا کہ جس کی کوئی انتہا نہیں اس لئے اس مشکل پر قابو پانے کیلئے دو طریقے رائج کئے گئے۔ ایک تو یہ کہ اسٹیج گھومنے والا بنایا گیا اور اتنا وسیع رکھا گیا کہ اس کے مختلف حصوں پر مختلف مناظر قبل از قبل بنا دیئے جاتے ہیں اور ایک منظر کے ختم ہونے پر اسٹیج گھما کر دوسرا منظر فوراً ہی پیش کر دیا جاتا ہے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دو منزلہ اسٹیج بنایا گیا اور "لفٹ" کے انتظام کی طرح اس کے دونوں حصّے اوپر نیچے کئے جا سکتے ہیں۔ جب تک ایک منزل تماشائیوں کے روبرو رہے دوسری منزل پر سین تیار کر لیا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت فوراً پہلے کو ہٹا کر دوسرے کو پیش کر دیا جاتا ہے۔

اسٹیج کی وسعت کے بعد منظر کی تکمیل ضروری ہے، لیکن اس سلسلہ میں اہم ترین ضرورت روشنی ہے۔ اسٹیج کی روشنی دراصل منظر اور فضا تیار کرنے کا سب سے بڑا آلہ ہے۔ نہ صرف رنگ برنگ کی روشنی اسٹیج پر تماشائیوں کی نظروں کی ضیافت کا انتظام کرتی ہیں بلکہ کمی اور زیادتی سے خاص تاثرات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ روشنی نہ صرف حقائق کو واضح کرتی ہے بلکہ جذبات کی بھی نمائش کرتی ہے۔ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر صرف آپ کا کمرہ منور ہو اور باہر کی ساری فضا تاریک تو آپکے دل پر کیا گذرتی ہے؟ یا اس کی برخلاف آپکے کمرے میں اندھیرا ہو اور ساری آس پاس کی فضا منوّر تو جذبات کا رُخ کس طرح بدلتا ہے؟ ساری کی ساری فضا تاریک ہو ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُجھائی دیتا اور ایسے میں کبھی کبھی روشنی کی ایک آدھ جھلک پیدا ہو جاتی ہو تو آپ کے دل میں کس قسم کے خیالات موج زن ہوتے ہیں۔ بجلی کے لٹکے ہوئے قمقمے شدّت باد کی وجہ سے جب ہلنے لگتے ہیں اور ان کا سایہ دیوار پر متحرک ہوتا ہے تو آپ کا دل کیوں لرزتا ہے؟ اچھی خاصی روشن فضا جب یکلخت تاریک ہو جاتی ہے تو آپ کے منہ سے کیوں ہلکی چیخ نکل جاتی ہے جب تیز روشنی آنکھوں کو چُندھیا دیتی ہے تو آپ کے چہرے پر کیا آثار رونما ہوتے ہیں؟ روشنی ناکافی ہو اور مقام دیکھا بھالا نہ ہو تو کیوں آپ ٹٹول کر چلتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں؟ ہلکی روشنی میں جب سایہ پھیلتا ہے تو کیوں ایک ڈراؤنا منظر پیش کرتا ہے؟ یہ سب روشنی کے سحر فریب کارنامے ہیں جن کو آسانی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کر کے حسب خواہش اثرات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

پیش کنندہ ڈراما کی ترقی کے لئے پیش کنندہ (Pro-ducer) کا وجود ضروری ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ڈرامانگار کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کو خود اسٹیج کرائے اور یہ ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ مصنّف کا اپنی کتاب خود شائع کروانا۔ ساری دُنیا میں مصنفین اور مؤلفین کے ساتھ ساتھ پبلشرز کا وجود بھی ترقی کرتا گیا ہے اور ان دونوں کا تعلق چولی دامن کا سا ہو گیا ہے ایسا کہ ایک کے بغیر دوسرا بے سہارے ہو جاتا ہے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری زبان کا کہ مصنفین اور مؤلفین کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود پبلشرز کا فقدان ہے۔ ایک آدھ جو ہیں بھی برائے نام تو انھیں سوائے مصنف اور مؤلف کو لوٹنے، ستانے اور پست ہمت کرنے کے اور کچھ نہیں آتا۔ بالکل یہی حال ڈراما کا ہے اور چونکہ ہماری زبان میں ڈراما کی صنف ہی کمزور ہے اور ڈرامانگار کم ہیں اس لئے اس خصوص میں اس کی حالت اور زیادہ خراب ہے، پیش کنندہ کا وجود سرے سے ہی نہیں۔ یا تو ڈراما تھیٹریکل کمپنی کے سپرد کرنا پڑتا ہے یا خود مصنف کو اسٹیج کرانا۔ تھیٹریکل کمپنیاں اب تو اس حالت میں ہیں کہ ان کا رہنا اور نہ رہنا دونوں یکساں ہیں لیکن جب ان کی حالت قابل لحاظ تھی تو وہ بجائے ڈراما خریدنے کے ڈرامانگار کو خرید لیتی تھیں۔ ڈراما پیش کرنے کا یہ عجیب و غریب

طریقہ تھا۔ ڈرامہ نگار کمپنی کا ملازم ہو کر اس کا آلۂ کار بن جاتا تھا اور اپنی شخصیت کو اس میں فنا کر دیتا تھا۔ اس نقص کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اگر ہم ڈرامہ نگاروں کی تصانیف کا شمار کرنا چاہیں تو ہمارے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ کمپنی میں ڈرامہ نگار کو کسی حیثیت سے بھی اہمیت دی ہی نہ جاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے نہ عوام کو اور نہ خواص کو اس کا علم ہو سکا کہ کون سا ڈرامہ کس کا لکھا ہوا تھا۔ اگر ڈرامہ نگار خود اپنا ڈرامہ پیش کرتا ہے تو اس کو ننی مشکلیں پیش آتی ہیں کہ بیان سے باہر اور جس نے بھی کبھی اس کا ایک دفعہ تجربہ کیا ہے دوبارہ ہمت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ذریعہ معاش

آج کل دُنیا میں ایسے فدا رسیدہ کم ہیں جو علم کو علم کی خاطر، فن کو فن کی خاطر اور پیشے کو خدمت کی خاطر حاصل کرتے ہیں۔ اب ہر شخص زندہ رہنے کا حق چاہتا ہے اور نہ صرف حق بلکہ اس کی ضروریات بھی اور اس سلسلے میں علم، فن اور پیشہ کی مدد سے وہ زندگی کی ضروریات حاصل کرتا ہے۔ پیشہ کوئی ادنیٰ و اعلیٰ نہیں ہے علم و فن میں کوئی بزرگی اور برتری کا سوال نہیں ہے۔ ہر علم علم ہے، ہر فن فن، اور ہر پیشہ پیشہ۔

کسی زمانہ میں بچوں کو پڑھا کر روپیہ کمانا بد اخلاقی اور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ محض اس خیال سے کہ درس و تدریس خدمتِ خلق ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرنا نازیبا۔ اسی طرح تصنیف یا تالیف کو فروخت کرنا اخلاقی جُرم سمجھا جاتا تھا مگر رفتہ رفتہ معاشی تقسیم نے پیشوں اور آمدنی کے ذرائع میں وسعت پیدا کر دی اور اب ترقی یافتہ ممالک میں ادبیات کی ہر ہر صنف میں پیشہ ورانہ تخصیص آپ کو نظر آئیگی۔ کوئی ناول نگاری پر گذر کرتا ہے، کوئی شاعری کو ذریعہ آمدنی بناتا ہے اور کوئی ڈرامہ نگاری پر تکیہ کرتا ہے۔ تھیٹر کے فن کو بھی مختلف پیشوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کوئی پیش کنندہ ہے، کوئی ڈرامہ نگار، کوئی تھیٹر کا مینجر، کوئی اداکار، کوئی تنقید نگار، کوئی بہروپ بدلنے والا، کوئی ادا آموز، کوئی روشنی کا انتظام کرنے والا، کوئی لباس تیار کرنے والا۔ کوئی اسٹیج کی زینت کا خیال کرنیوالا وغیرہ وغیرہ۔ اس تقسیم سے منجملہ اور فائدوں کے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ متعدد افراد کی اس سلسلہ میں کھپت ہو جاتی ہے اور تقسیم معاش کے ساتھ ساتھ روزگار حاصل کرنیکا میدان زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ چونکہ روزگار کا سوال دورِ جدید کا سب سے اہم سوال ہے اس لئے جب تک ہمارے ڈراما کو ذریعہ معاش قرار نہیں دیا جائیگا اس کی ترقی ناممکن ہے۔

ادبیات میں یہ ضروری نہیں کہ انسان اپنا پورا وقت اسی کی نذر کر دے بلکہ وہ اپنے دوسرے مستقل پیشے سے بچا ہوا وقت اس پر صرف کر کے اپنی محدود آمدنی میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ایسے افراد جن کی آمدنی کم ہے اور جنہیں اس کا شوق و ذوق ہے وہ اپنے آپ کو بیک وقت مشغول بھی رکھ سکتے ہیں اور آمدنی میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے ایک طرف ادبیات کے ذخیرے میں اضافہ ہوگا اور دوسری طرف آمدنی کے ذرائع بھی وسیع ہونگے ہمارے ملک میں اس طریقہ کار کی زیادہ ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ عام طور پر ہماری آمدنی کم، محدود اور ناکافی ہے، اور پھر ہمارے ادبیات کی کوئی صنف بطور پیشہ اختیار نہیں کی جاتی اسلئے ضروری ہے کہ اس طرح مصنفین اور مؤلفین کے لئے کاروباری میدان مہیا کیا جائے گو کہ ہم پورے طور پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادبیات کی ہر صنف کو ہمارے مصنفین اور مؤلفین مستقل طور پر پیشہ بنائیں اور اپنا پورا وقت اس پر صرف کریں تاکہ ہمارا ادب ایسے دماغوں کی پیداوار سے مسلسل مالامال ہوتا رہے جو اس کی صلاحیت بدرجۂ اتم رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ دوسرا طریقہ کار بھی ان افراد کے لئے فائدہ مند سمجھتے ہیں جو ادبیات کیلئے اپنا پورا وقت نہیں دے سکتے۔

ہمارے یہاں طلباء کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں اپنی عمر کا بہترین حصہ جامعات میں گذارتی ہے اور اس زمانہ میں یہ جماعت اپنے طور پر کسی قسم کی آمدنی، ذریعہ معاش یا معاوضہ کا کوئی انتظام نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ اپنے والدین، عزیز و اقارب اور سرپرستوں کی جیبوں پر بار ڈالتی ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھیں اکثر و بیشتر آمدنی کے مواقع ہاتھ آسکتے ہیں مگر وہ توجہ نہیں کرتے تعطیلات میں جبکہ جامعات بند رہتی ہیں اس قسم کے مواقع ہمیشہ ملتے ہیں مگر اس کو لہو و لعب میں گذار دیا جاتا ہے یا پھر کالج کے اوقات کے بعد بھی اگر مستعدی سے کام لیا جائے تو تھوڑا بہت وقت کسبِ معاش کیلئے بھی نکل آتا ہے۔ والدین اپنے لڑکوں کی تعلیم کے معاملہ میں جو زیر بار ہو رہے ہیں اور عام طور پر جو

شکایات سننے میں آتی ہیں کہ اولاد کی تعلیم میں والدین کا دیوالہ نکل گیا محض اسی سستی اور کاہلی کے نتائج ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں نہ صرف لڑکے بلکہ لڑکیاں بھی سیانی ہونے کے بعد اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہونیکی کامیاب کوشش کرتی ہیں اور اپنا زیادہ بار طلباء خود ہی برداشت کر لیتے ہیں۔ میں یہاں ادبیات کی دوسری اصناف کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ صرف ڈراما کا۔ اگر کالج کے طلباء تھیٹر اور ڈراما میں گہری دلچسپی لینا شروع کریں اور اپنی فرصت کے لمحات معاوضہ لیکر اس کے مختلف شعبوں میں کام کریں تو یقیناً انھیں کافی مالی امداد کا ایک ذریعہ ہاتھ آ جائیگا اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمیافتہ جماعت کی تائید تھیٹر کو حاصل ہو جائے گی۔ اور ڈراما ترقی کرے گا۔

شوقیہ انجمنیں

ڈراما کی ترقی کیلئے نہ صرف پیشہ ورانہ تھیٹریکل کمپنیوں کی ضرورت ہے بلکہ شوقیہ (Amateur) انجمنوں کی بھی ضرورت ہے۔ تعلیمی ادارے درسگاہ، مدرسے اور ادبی ادارے نہایت آسانی کے ساتھ شوقیہ ڈرامائی انجمن قائم کر سکتے ہیں اور جب تک اس قسم کے ادارے ڈراما کی ترویج میں حصہ نہ لیں گے ڈراما کا شوق ملک کے عرض و طول میں نہیں پھیل سکتا۔ چونکہ ڈراما تعلیمی حیثیت سے نہایت مفید ہے اور اس کی افادیت میں اب کسی کو کلام نہیں رہا اسلئے ہر تعلیمی ادارے میں شوقیہ ڈرامائی انجمنوں کا قیام لازمی ہے۔ دراصل یہی ادارے گہوارہ ہوتے ہیں جہاں ڈراما کا ذوق و شوق پرورش پاتا اور بڑھتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی مراحل میں جب طلباء اس کے فوائد سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو آئندہ چل کر انھیں اس کو پھیلانے میں بڑی سہولتیں ہوتی ہیں۔

شوقیہ ڈرامائی انجمن نہ صرف تعلیمی اداروں میں ہونی چاہئیں بلکہ غیر تعلیمی اداروں کو بھی ان کی سرپرستی کرنی چاہیئے۔ جس طرح سے لوگ شام کا وقت مختلف مصروفیات میں گذارتے ہیں اسی طرح اس قسم کی شوقیہ انجمنوں کا کام ہے کہ وہ عوام کی وقت گذاری اور دماغی تفریح کیلئے ڈرامائی دلچسپیاں مہیا کریں۔ فارغ التحصیل اصحاب جو مختلف پیشوں میں مستقل طور پر زندگیاں گذار رہے ہیں شام کے وقت تفریح کیلئے بے چین رہتے ہیں ابھی ہمارے ملک میں اتنے کلب نہیں ہوئے کہ ہر طبقہ اور ہر مذاق کے لوگ اور وہ بھی سب کے سب ان میں سما جائیں اس لئے وہ لوگ جو کلب نہیں جاتے دوسری مشغولیت اور مصروفیت ڈھونڈتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر شوقیہ ڈرامائی انجمنوں کا قیام عمل میں آئے تو یقیناً بہت سے افراد اس کی طرف کھنچے آئیں گے۔

شوقیہ انجمنوں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں وہ برائیاں جو پیشہ ورانہ کمپنیوں میں پیدا ہو جاتی ہیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ پیشہ ور اداکار شوق سے زیادہ روپیہ کمانے کی خاطر اداکاری کرتے ہیں۔ پیشہ ور ڈرامہ نگار جیب بھرنے کیلئے جلد سے جلد ڈرامے لکھتا ہے۔ پیشہ ور نقاد اس انداز سے تبصرہ کرتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ روپیہ ملے، پیشہ ور پیش کنندہ ایسے ہی ڈرامے پسند کرتا ہے جس کی نمائش سے اس کو زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو۔ غرض یہ کہ ہر شعبہ میں پیشہ ور فن کو فن کی خاطر اور فطری دلچسپی کے لحاظ سے پیش نہیں کرتا بلکہ پیشہ ورانہ طمع و حرص اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے شوقیہ انجمنیں چونکہ روپیہ کمانے کا خیال ہی نہیں کرتیں اور محض اپنے ذوق و شوق کی نمائش کرتی ہیں اس لئے اس میں یہ کاروباری عنصر شامل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ڈراما کی ترقی کیلئے شوقیہ انجمنوں کا قیام از بس ضروری ہے۔

بچوں کا تھیٹر

چونکہ تھیٹر کو آلۂ تعلیم بنایا جا سکتا ہے اس لئے بچوں کے تھیٹر کی ضرورت ناقابل انکار ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بچوں میں نقالی کا شوق بہ نسبت عمر رسیدہ اصحاب کے زیادہ ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ نقالی کا مادہ بچوں میں فطرتاً ہوتا ہے اور جس عمدگی اور سہولت کے ساتھ وہ اداکاری سیکھتے ہیں دوسرے نہیں سیکھتے۔ اس کے علاوہ اداکاری اور نقالی سے وہ جتنا اثر لیتے ہیں ہر شخص جانتا ہے۔

موجودہ تعلیمی رجحان یہ ہے کہ بچوں کو اُن کی طبیعت کی اُفتاد پر چھوڑ دیا جائے اور اسی مناسبت سے طریقۂ تعلیم مرتب کیا جائے تاکہ وہ اپنے ذوق و شوق کی مطابقت میں اپنی ذہنی نشوونما کی تکمیل کر سکیں۔ فروبل کا کنڈرگارٹن، اور منٹسوری کے کھلونوں کی مقبولیت اسی اصول کی وجہ سے ہوئی۔ ایسے حالات میں چونکہ تھیٹر میں بچہ فطری طور پر دلچسپی لیتا ہے اس لئے اس کے لئے خاص انتظامات نہ صرف نازیبا نہیں ہوں گے بلکہ بڑی حد تک ضروری۔ جس طرح بچوں کی تعلیم میں ریڈیو شامل کر لیا گیا ہے اور اس سے

تعلیمی فوائد مرتب کئے جا رہے ہیں اسی طرح ضرورت ہے کہ بچوں کے تھیٹر کا قیام بھی عمل میں آئے۔ اور اس کا انتظام اتنے وسیع پیمانہ پر کیا جائے کہ ہر مدرسہ کی عمارت میں تھیٹر داخل ہو۔

چونکہ فنونِ لطیفہ کا مذاق آج کل کی جدید تعلیم میں بچوں کے دلوں میں ابتدا ہی سے پیدا کیا جاتا ہے اور اسی سلسلہ میں موسیقی، مصوری وغیرہ کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اسی لئے تھیٹر جو کہ فنونِ لطیفہ کا اچھا مرکز ہے مدرسہ کی زندگی کا اہم جُز بن جاتا ہے۔ طلبار یہاں ایک طرف موسیقی وغیرہ کی مشق کر سکتے ہیں اور دوسری طرف تعلیمی غرض و غایت کے مدِّ نظر لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج کر کے تعلیمی استفادہ کر سکتے ہیں۔ روس میں اس قسم کے تھیٹر کی نہ صرف بہتات ہے۔ بلکہ اس کو روز افزوں نت نئے طریقوں سے ترقی دینے کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں اور یہ سب کچھ طلبار ہی کے حلقہ سے ہوتا ہے کیونکہ وہی اپنی ضروریات کا اچھا اندازہ رکھتے ہیں اور کافی تجربہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ اونچی جماعتوں کے طلبار نہ صرف اسٹیج کا انتظام کرتے ہیں ضروریات مہیا کرنے میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں بلکہ اداکاروں کو تیار کرتے ہیں اور طریقہ اداکاری سکھاتے ہیں۔ اکثر دفعہ ان چھوٹے چھوٹے تھیٹروں میں دنیا کے بڑے بڑے مصلحانِ تعلیم کے ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ یہیں کے طلبار کے لکھے ہوئے۔ بچوں کے تھیٹر کا خیال نہ صرف روس میں ترقی کر چکا ہے بلکہ یورپ اور بالخصوص انگلستان نے بھی اس کی اہمیت کا اندازہ کر لیا ہے۔

حسنِ اتفاق سے ہمارے ملک میں آجکل تعلیمی اداروں کی از سرِ نو تنظیم قومی نقطۂ نظر سے عمل میں آ رہی ہے اور ہر صوبہ میں تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کا معقول انتظام کیا جا رہا ہے، ایسے میں اگر بچوں کے تھیٹر کا انتظام بھی درسگاہوں میں ہو جائے تو کتنا موزوں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے مصلحانِ تعلیم اور عہدہ دارانِ محکمہ اس خصوص میں غور کریں۔

دیہاتی تھیٹر آج بھی ہم دیہات میں دیکھتے ہیں کہ "رام لیلا" کا کھیل یا مہابھارت کا تماشا کبھی کبھار ہوتا رہتا ہے اور عوام اتنی دلچسپی لیتے ہیں کہ بغیر کسی سہولت کے وہ اپنا کام کاج چھوڑ کر گھنٹوں یہ تماشا دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن اب یہ کھیل تماشے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے تنِ بے جان میں نئی زندگی کے آثار پیدا کئے جائیں۔ دیہات میں تھیٹروں کا قیام اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شہروں میں۔ ان تھیٹروں سے دیہات سدھار اور تعلیم بالغان کا کام آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ اور لیا جانا چاہیے۔ دیہات میں چونکہ شہری زندگی کے مواقع حاصل نہیں ہوتے اور شہری رجحانات کا انھیں کوئی عملی رخ نظر نہیں آتا اسلئے ضروری ہے کہ تھیٹر کے ذریعہ انھیں اس سے روشناس کرایا جائے۔ اسکے علاوہ دیہات میں چونکہ زرعی اور صنعتی تعلیم کے سوا فنونِ لطیفہ کی تعلیم کا انتظام کم ہوتا ہے اسلئے تھیٹروں کے قیام کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہے۔

ڈرامائی تنقید ڈراما صحیح معنوں میں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ فنی اور بے لاگ تنقید کا مذاق ملک میں عام نہ ہو جائے۔ اس کیلئے جہاں ڈراموں کی بہتات کی ضرورت ہے وہاں ڈرامائی فن کے موضوع پر عمدہ کتابوں کی اشاعت بھی لازمی ہے۔ ہماری زبان میں نہ ڈرامے ہی ہیں اور نہ ڈراموں پر تنقیدی ادب۔

کتابوں کے علاوہ تنقیدی ادب رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اصول اور فن کی تبلیغ ترویج کا طریقہ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ ڈراما اور تھیٹر کی غلط کاریوں پر ٹوکا جا سکتا ہے اور انھیں صحیح راستہ پر لگا کر ضروریات اور لوازمات کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔ صحیح اصول اور فن سے واقف کرانیکی اس وقت اس وجہ سے ضرورت ہے کہ عام طور پر ملک میں ڈراما اور تھیٹر کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں اور وہ ایسے ہاتھوں میں ہے جہاں کہ اس کو ترقی کے ذرائع مہیا نہیں کئے جا سکتے۔

فلمی ڈرامے متحرک فلموں نے اوّل ہی سے تھیٹر کی رونق گھٹا دی تھی لیکن جوں ہی بولتے فلم میدان میں آئے تھیٹر کا کاروبار بالکل ہی سرد پڑ گیا۔ اس لئے اب ڈراما کی سرپرستی کے لئے دے کر ایک ہی جگہ رہ گئی ہے اور وہ فلم کمپنیاں ہیں اور ان کا یہ حال ہے کہ خدا کی پناہ۔ جس طرح یہاں ڈراما کا خون ہو رہا ہے شاید ہی کہیں اور ہوا ہو۔ انھوں نے یہ عجیب و غریب ریکارڈ قائم کیا کہ آجتک کوئی ایک بھی ایسا ڈرامہ پیش نہیں کیا جو اصول اور فنی نقطہ نظر سے بے عیب سمجھا جا سکے۔ کیا بہ لحاظ افسانہ کیا بلحاظ سیرت نگاری اور کیا بلحاظ مکالمہ کوئی اچھا ڈرامہ پیش نہیں کیا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ فلم کمپنیوں میں کوئی بھی ایسا ڈرامہ نگار نہیں ہے جو اصول اور فن کے ساتھ ساتھ زبان اور ادبیات پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ ہماری فلم کمپنیاں

اپنا روپیہ صرف حسین طوائفوں پر صرف کرتی ہیں اور انھیں کسی اور ضرورت کا احساس نہیں ہوتا لیکن اگر ڈراما کو اس ملک میں ترقی کرنا ہے تو ڈراما سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ فلم کمپنیوں کے اس طریقۂ کار پر صدائے احتجاج بلند کریں اور اس بات پر انھیں مجبور کریں کہ وہ ڈراما کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

انجمنوں کا قیام ملک کے طول و عرض میں ڈراما سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب تفصیلی حدود کریں۔ اور مختلف صوبوں کے شہروں اور گاؤں میں ذیلی اور مرکزی انجمنیں قائم کریں۔ انجمنوں کے قیام اور ان کے الحاق سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہو سکے گا کہ ایک دوسرے کی وقتِ ضرورت مدد کر سکیں گے۔ ورنہ انفرادی کوششوں کے بارآور ہونے کے امکانات کچھ زیادہ نظر نہیں آتے۔

سید بادشاہ حسین
(حیدرآبادی)

حسن

تو پیچ و خم ہے کاکل میں   تو رنگِ شگفتہ ہے گل میں
تو کیف ہے چشمِ ساقی میں   تو سوز ہے نغمۂ بلبل میں
تو ناز و کرشمہ خوباں میں
تو نشہ ہے ذوقِ رنداں میں
اللہ ری خود بینی تیری   خود مست ہی رنگینی تیری
منکر نہیں جس کے دنیا میں   وہ دین ہے بیدینی تیری
جی بسکہ لبھا لیتا ہے تو
دنیا کو بھلا دیتا ہے تو
تو نور بنا ستاروں میں   تو رنگ بنا گلزاروں میں
گھنگھور گھٹائیں جب چھائیں   تو کیف بنا میخواروں میں
تو ساقی بھی میخانہ بھی
تو مے بھی اور پیمانہ بھی
ہے پھولوں کی رعنائی میں تو   معشوق کی ہے انگڑائی میں تو
پھولوں میں نہاں ہے لالی تیری   ہے صحرا کی تنہائی میں تو

تو سوز میں ہے تو ساز میں ہے
تو درد بھری آواز میں ہے
تو داغِ محبت لالے میں   تو سوز ہے دل کے چھالے میں
نظارۂ کیف افزا ہے تو   ہر چشم کو مہ کے ہالے میں
گھنگھور گھٹا کی جان ہے تو
دل والوں کا ایمان ہے تو
تو کاہکشاں کا جوبن ہے   تو قمری کا طوقِ گردن ہے
تو آرائش ہے رخساروں کی   تو شعلۂ وادیٔ ایمن ہے
یہ تو تھا مجنوں کے دل میں
یا لیلیٰ دل کے محمل میں
گلشن میں گلریزی تیری   کلیوں میں دلاویزی تیری
ہر پھول کا دامن رنگیں ہے   اے حسن یہ خوں ریزی تیری
کیوں تجھ سے نہ ہو الفت مجکو
اس شوخ سے ہے رشتہ تجکو

نیاز قدوائی

قلعۂ معلّٰی کی ایک جھلک

زینت محل ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی بڑی چاہیتی ملکہ تھیں۔ گویا چراغِ سلطنت کے شعلۂ محبت کی آخری بھڑک تھی۔ بڑے راؤ چاؤ تھے۔ ایک مرتبہ ان کا پنڈا ذرا پھیکا پھیکا ہوگیا اب کیا تھا قلعہ میں ادھر سے اُدھر تک کانا پھوسی ہونے لگی۔ قلماقنیاں۔ اُڑدابیگنیاں جسولنیاں مُنہ بنائے ہوئے دوڑنے لگیں۔ جہاں پناہ کو اطلاع ہوئی۔ ہوادار حاضر ہوا۔ محل میں مزاج پُرسی کی تیاریاں ہوگئیں۔ ... شہزادیاں۔ سلاطین زادیاں جوڑے بدل بدل کر عیادت کو روانہ ہوئیں۔ ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ پہلے میں پہنچوں تاکہ حضور کی خوشنودی کا باعث ہو۔ چوبدار حکیم احسن اللہ خاں کو بلانے دوڑے۔ شہر میں خبر پہنچی تو اُمرا کی بیگمات اور نواب زادیاں پینسوں میں بیٹھ بیٹھ کر روانہ ہوئیں۔ گھنٹہ بھر نہیں گذرا تھا کہ بادشاہ بیگم کا محل مہمانوں سے بھر گیا۔ اتنے میں ڈیوڑھی کے باہر نقیبوں چوبداروں نے آواز لگائی۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ رسول کی امان۔ دوست شاد دشمن پائمال۔ بلائیں رد" کہاروں سے فوراً ہوادار شاہی کہاریوں نے اپنے کندھوں پر لے لیا۔ پھر چوبدار پکارے "خبردار" اندر سے جسولنیوں نے جواب دیا "اللہ رسول خبردار ہے"۔ بادشاہ سلامت محل میں پہنچے۔ مُنہ ہی مُنہ میں دعائیں پڑھتے ہوئے ہوادار سے اُترے۔ دورویہ بیگمات کے پرے تھے۔ سلام لیتے ہوئے زینت محل صاحبہ کی سکھ سیج کے پاس پہونچے۔ وہ دوشالہ تانے خاموش آرام کررہی تھیں مگس رانی ہورہی تھی۔ جہاں پناہ کو دیکھتے ہی مجرے کیلئے اُٹھنا چاہا۔ حضور نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا "مجرا معاف۔ اُٹھنے میں ہلکان ہوگی۔ اوہو! واقعی طبیعت بدمزہ ہے۔ اماحکیم احسان اللہ ابھی تک نہیں آئے!" جسولنی نے عرض کیا "مہابلی حکیم صاحب تو کبکے دردولت پر حاضر ہیں"۔ "اماتو بلاؤ۔ دیر کاہے کی ہے"۔ پردہ ہوا۔ قناتیں لگ گئیں۔ سکھ سیج کے آگے شفق کھڑی کردی گئی۔ حکیم صاحب آئے۔ جُھک جُھک تسلیمیں کیں۔ مؤدب بیٹھے۔ نبض دیکھی۔ نسخہ تجویز ہوا۔ حضور نے ملاحظہ فرمایا۔ اشارہ ہوا کہ ابھی حکیم صاحب کی نگرانی میں تیار ہوکر پیش ہو۔

حکیم صاحب کے جانے کے بعد بادشاہ سلامت مسند پر جلوہ افروز ہوئے۔ پیچوان لگادیا گیا۔ بیگم کی خواص خاص نے خاصدان پیش کیا جس میں سونے چاندی کے ورق لگی ہوئی گلوریاں تھیں۔ مورچھل ہونے لگا۔ شاہزادیاں اپنے اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ لیکن حضور خاموش تھے کہ سامنے سے "اللہ شافی اللہ کافی" کی صدا آئی۔ دو قلماقنیاں آگے آگے۔ پیچھے مہری کے سر پر ایک خوان کمخواب کے تورہ پوش سے ڈھکا ہوا۔ عرض بیگی نے دعا دیکر عرض کیا "جامِ صحت حاضر ہے"۔ حکم ہوا "ملاحظہ میں لاؤ"۔ تورہ پوش ہٹاکر کسنے کی مہر توڑی۔ خوان پوش ہٹایا تو بلوریں پیالے میں ٹھنڈائی تھی اور زہر مہرہ کی پیالی میں خمیرہ مروارید۔ بادشاہ نے آیاتِ شفا دم کر کے اپنے دستِ مبارک سے پہلے خمیرہ کی پیالی بیگم صاحبہ کو دی پھر ٹھنڈائی کا پیالہ اور فرمایا "حکیم احسن اللہ کا ہاتھ بہت ہلکا ہے۔ خدا چاہے تو ابھی جی بحال ہوا جاتا ہے۔"

دوا کی تاثیر اور سلطانی عنایات چند ہی منٹ میں ملیکہ حضرت کے چہرہ کا تکدر جاتا رہا۔ مسکراتی ہوئی اُٹھ بیٹھیں۔ محل میں امی جمی ہوگئی سب کے مُنہ پر جو قفل سے لگے ہوئے تھے کھل گئے۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ باہر شادیانے بجنے لگے۔ اندر ڈومنیاں۔ مراثنیں "جم جم راحت نت نت صحت۔ بادشاہ سلامت"، گانے لگیں۔ ہر طرف چہچہے تھے اور قہقہے۔ حضور مطمئن ہوکر تشریف لے جانا ہی چاہتے تھے کہ زینت محل صاحبہ نے دست بستہ عرض کیا "حضور نے جہاں اتنا کرم کیا ہے خاصہ بھی آج اس کفش خانہ ہی میں نوش فرمالیں تو زہے نصیب۔ لونڈی بھی جہاں پناہ کے تصدق میں دوچار لقمے کھالیگی"۔ ارشاد ہوا "کیا مضائقہ ہے تمہاری خاطر سے ہمیں عذر نہیں"۔

حکم ہوتے ہی لونڈی باندیاں۔ پیش خدمتیں۔ بکاولنیں اہتمام میں مصروف ہوگئیں۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ کھانے چُنے جانے لگے۔ بادشاہ کی دعوت اور زینت محل صاحبہ کے ہاں کا خاصہ۔ شان ہی نرالی تھی۔ رنگ برنگ کی روٹیاں شیرمال۔ باقرخانی۔ کلچہ۔ گاؤدیدہ۔ گاؤزباں۔ عوض روغنی۔ نانِ پنبہ۔ نان تنکی۔ نان گلزار۔ نانِ قماش۔ قسم قسم کے میٹھے اور نمکین چاول۔ مزعفر۔ متنجن۔ زردہ۔ مشش رنگا۔ چوگنی کے چاول۔ نکتی پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ نورمحلی موتی پلاؤ۔ نرگس پلاؤ۔ ماہی پلاؤ۔ رشتہ پلاؤ۔ یاقوتی۔ دودھ کا دُلمہ۔ ماہی بے آب۔ بادام کا

قلیہ۔ قورمہ۔ شامی کباب۔ ماہی کباب۔ مرغ کے کباب۔ شسی قلیہ۔ حسینی کباب۔ نکتی کباب۔ سمنی۔ بادشاہ پسند دال وغیرہ وغیرہ طرح طرح کے اچار مربّے۔ حلوے۔ مٹھائیاں غرضکہ خاصا کیا اگلا پَن بندی کی گئی۔

کھانے سے فراغت پاکر حضور تو محل سرائے معلیٰ کو تشریف لیگئے اور یہاں بیگمات اور شہزادیاں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ ڈومنیوں نے منجھی ہوئی سُریلی آوازوں سے الپنا شروع کیا۔ غزلوں۔ ٹھمریوں۔ ٹپوں۔ خیالوں کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ نوجوان میراثنیں بڑے بڑے استادوں سے تعلیم پائے ہوتے۔ ٹپہ گایا تو شوری کی روح کو شرما دیا۔ ٹھمری شروع کی تو جیسی پیا بسند پیا پھل رنگ خوش رنگ۔ سدا رنگ اور قدر کو بھی مات کر دیا۔ غزل چھیڑی یا قوالی کی دُھن اٹھائی تو استاد تان رس خاں کی پوری نقل اتار دی۔

اپنے اپنے میل جول کی بیگمات الگ الگ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کہیں شہزادیوں کی بولی ٹھولی کا مزہ آ رہا تھا تو کہیں اُمرا کی خواتین کی گفتگو کے لُطف تھے۔ عجب بہار تھی۔ زینت محل صاحبہ صدر میں بیٹھی کبھی قلعہ والوں کی باتوں پر مسکرا دیتی تھیں تو کبھی شہر والیوں کے محاورات پر بیگمانہ وار ہنسنے لگتی تھیں۔

بدرجہاں زمانی۔ نوج۔ ایسا بھی کسی کا خون ہلکا ہو۔ سُنا ہے کہ شاموں شام حمام کرکے دھانی جوڑا پہن کر کھلے بالوں مہتاب باغ میں چلی گئی تھیں دُردانہ چڑیل نے انہیں ٹوک دیا۔ بس اسی وقت سے دشمنوں پر اچاہنے والوں کا مُنہ تمتا گیا۔

ارجمند بانو۔ موئی کو نقشکاری کے حوالے نہیں کیا۔ ایسی سبز قدم خواصی کے لائق ہے۔

مہ افروز۔ نیک پراں بھی مرشد زادے خدا جانے کہاں سے ایک چھل پائی کو پکڑ لائے تھے۔ نگوڑی صورت حرام۔ گل چمن نام رکھ کر بھی میں تو چھپائی۔ مُردار! دیپری کا سایہ بن گئی۔ نظر تھی کہ بلا جس کو کھاتے دیکھ لیا بس زمین دیکھنی پڑی۔ آخر میں نے تو اُسے کھڑے کھڑے نکالا۔ کم لامنہ ایسی شکل صورت کو کوئی لیکر کیا جائے۔

خورشید جمال۔ وہ تو حضور کو میاں نے نظر اتارنے کی کوئی دُعا بخش دی ہے۔ دیکھا تھا کہ ہوادار سے اترتے ہی کچھ پڑھتے ہوئے آئے تھے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ دم کیا تھا۔ یہ عمل ایک بر ایک ہے۔ نظر تو نظر کالے جادو کی اس کے آگے کوئی اصل نہیں۔ اُسی وقت سے چہتد کی ہوائیاں موقوف ہوگئیں۔

مریم زمانی۔ آغائی کی اوڑھنی کو کالب پر میں بی مغلانی سے بیٹھی دھنک ٹنکوا رہی تھی کہ مرزا ٹیلوے نے خبر دی کہ حضرت زینت محل کو دور پار کچھ خارش ہوگئی ہے۔ سنتے ہی میرے تو اوسان جاتے رہے۔ جگر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دل شاد میرے لئے چمپا۔ موتیا۔ مولسری۔ چنبیلی اور جوہی کے پچ میل ہار گوندھ رہی تھیں اسکو بھی جیسا کا تیسا چھوڑ اور سُکھپال لگوا فوراً حاضر ہوئی۔ چھائیں پھوئیں آپا بیگم کے بیری کی آنکھ میلی اور مریم گھر میں سُکھ کرے۔ اللہ کی کارسازی کے قربان کہ میں نے اس چاندسی صورت کو ہنستے دیکھ لیا۔

گیتی آرا۔ مجھے بھی صبح ہی ساری باتوں کا پتہ لگ گیا تھا۔ دُردانہ مالزادی کی زہریلی نگاہ کا حال میں نے شبّو سے سُنا۔ چنڈالنی کی آنکھ ہے کہ بِس کی گانٹھ۔ سنتے ہی میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ یہاں آکر جو دیکھا تو تھوڑا ہی رنگ پایا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی۔ رنگت پھیکی۔ صورت پر . . . .
اب آگے کیا کہوں۔ اللہ نے بڑی خیر کی۔ پھر جب بڑے حضرت کی ایکھی چتون دیکھی ہے اور جس کڑوے تیوروں سے حضرت نے دُردانہ کٹنی کو دیکھا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب اس کا لکھا پورا ہوا۔ مگر اس کی بھی کیا خطا ہے۔ آنکھوں میں شیطان گھُس پڑے تو کیا کرے۔

خورشید لقا۔ زیب النسا کو تو آپ جانتی ہیں کیسی ضدن ہے اور جب سے میں نے اس کو بیٹی بنا لیا ہے وہ رہی سہی بھی آپے سے باہر ہوگئی ہے۔ کل چراغ جلے ابکا یکی اسے بیٹھے بیٹھے اُدماد اُچھلا کہ چاندنی مناؤنگی۔ ہر چند میں نے کہا کہ یہ کیا موقع ہے حضور کی اجازت کے بغیر سیر سپاٹے کرتی اچھے نہیں۔ سوسن جیسی پتنگ چھُری سے بھی نہیں ڈرتی۔ یہ ایک ایک کی چار چار لگا کر بھی نہیں چھوڑیگی۔ لیکن اس ہٹ دُنگی نے ایک نہ مانی۔ کبھی روئے کبھی بسورے۔ کبھی ہاتھ جوڑے۔ غرض ایسے چونچلے بگھارے کہ میں موم ہوگئی۔ میرا ہاں کرنا تھا کہ گھٹنیوں چلتے بچوں سے لیکر اسّی برس کی ہپتو تک کے دل مچلنے لگے۔ دست بچھے نکل آئے۔ لونڈیاں۔ باندیاں۔ ماماتیں۔ صیلیں۔ مہریاں۔ باری داریاں۔ اناتیں۔ چھوچھوئیں سب کی سب بننت بناؤ میں مصروف ہوگئیں۔ سواریاں آئیں۔ اب اس نازو نے میرے تلوے سہلانے شروع کئے۔ اس کی عادت ہے اور سچ پوچھو تو مرزا ثریا نے ناز اٹھا اٹھا کر اُسے شوخ دیدہ بھی بہت کر دیا ہے۔ ہاں تو اس کی عادت ہے کہ جس بات کی دھت لگی بس لگی۔ مجال ہے کہ وہ

ہٹ سے باز آجائے۔ مجھ کو سوار کرا کے مانی۔

ب جو باغ میں پہنچے تو کیا کہوں کیسا سُہانا سماں تھا۔ اوپر والا اپنا نور بھرا طباق سا چہرہ نیلے پردے سے باہر نکالے پھولوں کو گھور رہا روشوں پر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ میں۔ گوہر سلطان جن کا برسوں کی اللہ آمین کے بعد خدا خدا کر کے اب ں بھاری ہوا ہے اور رحمتی مخلدا سنی وغیرہ دس بارہ عورتیں تو خیر فرش پر بیٹھ گئیں۔ ان جوان خون والیوں کے ساتھ کیا ایلی گیلی پھرتی۔ زیب النسا اور اس کے ساتھ دلشاد۔ نرگس کیتگی۔ سمن بر۔ غنچہ دہن۔ شیریں۔ لیلیٰ نے تو ایسا اودھم مچایا کہ سارے باغ کو سر پر اٹھالیا۔ کیاری ڈوے ڈوے دنگے مچاتی او کہ کڑے لگاتی پھرتی تھیں نہ ان کم بختوں کو مرداری سے ڈر لگتا تھا نہ ماموں کی پروا رکھتی۔ وہاں تو شیطان رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جلے پاؤں کی بلّیاں ہیں ٹک کر بیٹھنا جانتی ہی نہیں۔

کوئی آدھی رات آئی ہوگی کہ زیب النسا کو امریوں میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ کسی نے کہا چوٹی والا ہے۔ کوئی ڈالی والا ابھی نگوڑیوں کے کوے سے تجھے سے آپے ہو کر بھاگیں۔ دہشت کے مارے بُرا حال تھا۔ میں پہلے ہی دہیں اوسان جاتے رہے لپ جھپ سوار ہوئے اور جب اپنے یں پہنچے تو ذرا دل ٹھکانے ہوا۔ لیکن زینب کی ساری چونچالی جاتی رہی۔ منہ فق ہو رہا تھا۔ رات بھر چونکتی رہی۔ مجھے بھی بیسیوں بُرے خواب دکھائی دیئے۔ صبح کو دیر سے آنکھ کھلی ابھی چوکی پر بھی نہیں گئی تھی کہ ضیا مہری بدخبری نے یہ شگوفہ چھوڑا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ سب کو اپنے حال پر چھوڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہاں آتے ہی پہلے دُردانہ جھکو دکھائی دی۔ میں نے آنکھیں بدل کر کہا۔ بی تمہارے ں میں رائی نون تجھے تو گھورتے نہیں۔ تمہاری تو وہ مثل ہے کہ جس کا کھاؤ اسی کے نمک میں زہر ملاؤ۔ میں آپ ہی پھونک پھونک کے قدم ہوں۔ اور چھپا کے سے گذر کر اندر آگئی۔

شہر کی خاص خاص بیگمات۔ نواب زادیاں ڈھیلے پائجامے کے شروع۔ زربفت۔ کمخواب کے پاجامے پہنے۔ کارچوبی۔ زردوزی۔ ے دار بھاری بھاری دوپٹے اوڑھے کسی کا آنچل۔ ہے تو کسی کا سینہ صاف۔ زیورات سے گوندنی کی طرح لدی علیحدہ ٹکڑی جمائے بیٹھی۔ پاندان سنہری روپہلی گنگا جمنی رکھے ہیں۔ پان پر پان چل رہا ہے۔

یہ بیگم۔ بہن! قلعہ کا یہ کیا دطیرا ہے کہ جو منہ چڑھ گیا نظروں سے اترتا ہی نہیں۔ ایسی کہاں کی ستیا ستی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نہ تخت لی اس کا چونڈا مونڈتے ہیں نہ بیگم کی ناک چڑھتی ہے۔

ابہ خانم۔ مجھ والی کے ہاں گُردان بندی ہوتی اور ایسا کوئی سانحہ ہو جاتا تو ٹنڈیاں کھچوا دیتی۔ سپہدار خاں اس کو جیتا چھوڑتے! ں کا غسل دلوا دیتے۔ ڈائن ہے نامراد پوری ڈائن۔

دلھن۔ ماموں جیسی کو آپ جانتی ہیں ان کی سلیقہ ماشاء اللہ کیسی جہاں دیدہ عورت ہیں سنتی ہوں اُن کے سر پر کوئی بزرگ جی یا شیخ سدو بھی آتے ہیں۔ وہ ایک دن جو اماں جان سے ملنے آئیں تو انھوں نے میری اتون کی لڑکی فہیمہ کو دیکھا۔ اس کے گول گول ے دیدے ہر وقت پھرتے رہتے تھے اور جب کسی کو دیکھتی تھی تو ٹکٹکی باندھ کر۔ انھوں نے صاف منہ پر کہہ دیا کہ بُوا اس لڑکی کا بھرے گھر آنا جانا رہنا سہنا اچھا نہیں۔ یہ نظر ہائی ہے اور والدہ سے کہا۔ باجی غضب خدا کا ایسی سانپن کو تم نے پال رکھا ہے۔ اس کی نظریں تو بن بُجھی ہوئی ہیں اور مجھ سے فرمایا۔ بچی۔ گھر سے جب کہیں باہر جاؤ پیر غیب کا دُونا مان کر جاؤ۔ جب نہاؤ نیا جوڑا بدلو۔ سات لال مرچیا سے پاؤں تک اتار کر چولھے میں ضرور ڈلوا دو۔ اس دن سے میں نے ان کی یہ بات آنچل سے باندھ لی۔

بت جہاں۔ جی ہاں بڑی بوڑھیوں کی ہر بات آزمودہ ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے چونڈے دھوپ میں تھوڑی سفید کئے تھے۔ صدقے نہ جھٹکیں۔ تعویذ گنڈے جیسے جیسے کم ہوتے جاتے ہیں ویسے ہی بچے ہبنگ ہک رہے ہیں۔ بیٹی نظر بد سے خدا بچائے۔ گولی کا مارا ماہے مگر نظر کا مارا نہیں بچتا۔ اس سے پہاڑ کھیل کھیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں آٹا پینے ایک چماری آیا کرتی تھی۔ ایک دن جو وہ آئی۔ مع کی کوٹھڑی میں گئی تو چکی کے کرنڈ میں کہیں سانپ بیٹھا تھا۔ پہلے تو وہ رُکتی کہکر جھجکی پھر آگے بڑھکر اُسے گھور کر دیکھا اور یہ کہتی ہوئی ل آئی۔ بڑی بیگم دیکھنا کیسی ملوک ناگن سو رہی ہے۔ میں نے شہزادی کی دوا سے کہا۔ دیکھنا یہ نگلو کیا بک رہی ہے۔ کیسی سانپن۔ یلسہ کچے دل کی عورت۔ سانپن کا نام سنتے ہی صندلی پر چڑھ گئیں اور آنکھیں بند کر کے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، پڑھنے لگیں۔

اتنے میں منگلو ہنستی ہوئی پھر کوٹھڑی میں گئی اور کہا دیکھتی ہوں کہ ایک کالے سنک سے سانپ کی دُم پکڑے اٹھائے لئے چلی آتی ہے۔ صحن چبوترے کے نیچے ڈال کر کہنے لگی "سرکار میری آنکھ سے آنکھ ملاتے ہی مر گئی"۔ مجھکو بڑا اچنبا ہوا۔ میں نے پوچھا اری پگلی آنکھ سے آنکھ ملانے سے یہ کیسے مر گئی۔ بولی بیگم جی میری آنکھوں میں کالی دیوی بستی ہیں۔ میں نے تو کتنے سانپ مار گیرے جس کو دیکھا پٹ سے مر گیا۔ اب میں بھی کہ یا تو یہ کوئی چھلتی ہے یا اس کی نظر بُری ہے۔ بس بی بی وہ دن اور آج کا دن میں نے اُسے گھر میں نہیں گھسنے دیا۔

نشاط افزا النسا۔ نزہت زمانی کا جب سے پہلوٹھی کا بچہ اترا ہے اور لوگوں نے نظر بتائی ہے میں تو ہر وقت چوکنی رہتی ہوں۔ جہاں کسی نے اپنا ہوا پر (یا میت نے بچے کو ٹوکا۔ ہی سنوری کسی لڑکی کو ہونٹا اور میں نے جلدی سے کہا ذرا بوا اپنی ایڑی کو دیکھنا کیا لگا ہے اور فوراً اس کے پاؤں تلے کی مٹی اٹھا کر چولھے میں جلا دی۔

بلقیس جہاں۔ پہلے ان باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ ایرے غیرے کے سامنے کھانا پینا تو کیا لنگھی چوٹی سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ آؤ آدمی پہلے پیرا دیکھ لیتے پھر ان کے گھر میں رہنے کے روادار ہوتے۔ عورت ہو یا مرد بعض ایسا بھاگوان ہوتا ہے کہ اس کا قدم آیا اور گھر بھر گیا اسی طرح کوئی ایسا منحوس ہوتا ہے کہ جہاں جاتے اُوڑا پڑ جائے۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ نواب دولھا کے ہاں جاپا ہوا۔ دولھن میری شاہجہاں کی دوپٹہ بدل بہن ہے۔ سنتے ہی دوڑی گئی میرے پہنچتے پہنچتے مغرب ہو گیا تھا۔ کچھ بچہ تو ہو گیا تھا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ بر جیس جس کو دور پار کوک کا روگ لگا ہوا ہے۔ اوپر تلے پانچ بچے مر چکے ہیں پہل پہلوٹھی کا زچہ کے چپرکھٹ پر بٹھا رکھا ہے۔ دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ اتنے میں نظر جو پڑی تو نصیبن دائی کل ہی نیلی چوڑیاں پہنے بچے کو نہلا رہی ہے۔ بوا میں دہم کی پوٹ میرے تو اوسان جاتے رہے۔ بھرے گھر میں بچے کیا دخل بیٹھی مرٹھ دیکھتی رہی۔ پھر کان میں اذان دینے کو بادا اللہ داد امسجد کے موٹے کھوسٹ ملا کو بلایا۔ یہ تو خیر تھا ہی۔ سامنے سے مہترانی طشت صاف کرنے چلی آتی ہے۔ سوڑ میں زچہ کے پاس مہترانی کا کیا کام۔ اس نے آتے ہی طشت اٹھایا اور کہنے لگی بیگم صاحب جھاڑو دبھی دبدوں۔ ہے ہے بدشگونی کی حد ہو گئی میرے تلووں سے جو لگی تو دماغ تک آئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا کہ او غیبانی جھاڑو پھرے نیرے گھر پر۔ اس گھر کے دشمنوں پر شہترانی نہیں کہتی۔ اور دیکھ مُرادہ کس کا بچہ ہے اس کے پاؤں میں شہترانی لگ گئی۔ ذرا سا ننگا ٹھنکا کر توڑ ڈال۔ نہیں صاحب میں نے ایسی باتیں کب دیکھی تھیں میرا تو خون کھول گیا۔ اسی وقت پالکی لگوا اپنے گھر آگئی۔

سلطانہ خاتون۔ ارے نواب دولھا کے یہاں کا یہ بڑا جا رہا ہے۔ خدا بخشے سکندر جہاں بیگم کے وقت تک تو ان کے گھر کا سا قرینہ شہر بھر میں نہ تھا۔ ان کے سارے طور طریق پرانے زمانے کے تھے۔ ماشاء اللہ چار چار بہوئیں رائیں۔ چار بیٹیاں بیاہیں مگر کبھی آمنے سامنے کا بیج نہیں آیا۔ مجال ہے کہ کوئی بچہ ایک پاؤں میں جوتی گھسیٹے پھرے۔ کوئی جا رہا ہے اور کسی کو چھینک آگئی۔ جب تک پاؤں میں جوتی پیر پھیر نہ پہنوا دیتی تھیں ممکن ہے کہ وہ چلا جائے۔ کسی کی ناک کھجائی اور سانسوں۔ بے جولی چھوائی۔ جہاں کسی بچے نے رات کو دانت چبائے صبح ہی کو لکی پول کی مٹی سوتے سوتے اس کے منہ میں ڈال دی۔ کسی نے قینچی بجائی اور بڑی بی نے ڈانٹا کیوں لڑائی ٹلواؤ گی۔ ماما نے بکتی ہنڈیا پر کفگیر رکھی اور انھوں نے لتے لئے "ہاں کر دو کھانا بدمزہ"۔ ایک دن کہیں میرا ہاتھ ان کی ناک کو چھو گیا۔ اور تو کچھ کر نہ سکیں۔ میرا بڑا لحاظ تھا مگر پھر بھی اپنا ٹوٹکا کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ تھو تھو کر کے کہنے لگیں۔ اچھی بوا میں بھی تمہاری ناک ذرا چھو لوں۔ تو دیکھ لو اُن کے جیتے جی ہمیوں خوشیاں ہوئیں کبھی کوئی بجوگ پڑا۔ دُلہنیں آئیں بھی اور گئیں بھی۔ خدا نے امی جمی ہی رکھی۔ زچہ خانے بھی سال میں تین تین چار چار ہوئے۔ نہ سوڑ بگڑی نہ کوئی بچہ جھیجا۔ ہم نے تو ان کے ہوتے کسی کی آنکھ دُکھتے بھی نہیں دیکھی۔

فیاضی۔ (جماہی لے کر) اماں بیگم ہمیں تو نیند آرہی ہے۔ آنکھیں کڑوائی جاتی ہیں۔

فاطمہ صغرا۔ بچی! منہ پر ہاتھ رکھ۔ ابھی ہوا لگ جائے تو دہانہ پھٹا کا پھٹا رہ جائے۔ کیوں بی زینب بیگم یہ لڑکی تو وہی ہے نا جس کو کوئی شتا حکیم صاحب کے پچھواڑے ڈال گئی تھی۔ جبھی نکلے گی تو خوب مگر بُرا نہ مانو تو کہوں بد نتیر اٹھ رہی ہے۔

زینب بیگم۔ آپا آپ کو کیا خبر میں چنتیوں بھرا کباب ہوں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے نہیں سنبھلتے یہ غریب کس گنتی میں ہے۔ یہ نیند کی دکھیا سونے کو کہے تو کیا عجب۔ مجھ بوڑھی عورت سے نہیں بیٹھا جاتا۔ نیند آنکھوں میں گھل رہی ہے۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ خدا جانے کیونکر اپنے کو سنبھالے بیٹھی ہوں۔

فاطمہ صغرا۔ اللہ خیر کرے۔ تمہیں کیا ہوا۔ خدا نخواستہ کچھ طبیعت بدمزہ ہے یا کہیں خدائی رات منائی تھی۔

زینب بیگم۔ جی کو تو خالہ جان کچھ نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ کل قیصر بڑا اپنے ہاتھ کی تھیں۔ بیاہی بیٹی پڑ دس برابر اوّل تو میں اسی کی دلوا نہ تھی کہ اپنے میکے میں وہ ہاتھ پاؤں سے فارغ ہو۔ ور دلگنے ہی ادھر سسری کال جاتی ہے تو اُدھر تبسم۔ لیکن میاں شریف الحسن نہیں مانے۔ یہ چالیس دن جس طرح میں نے کاٹے ہیں میں ہی جانتی ہوں۔ چوبیس گھنٹے جان سوئی پر رہتی تھی۔ خیر خدا نے شرم رکھ لی۔ بی قیصر صحیح و سلامت بھری گود لئے بیٹھیں۔ ہوئی شدنی کوئی پانچ بجے ہوں گے قیصر کے سسرال جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ مرزا آباد بخت کی صاحبزادی آ اُتریں۔ قیصر سے ان کا بڑا میل جول ہے۔ میں تو بہا داری کے جھگڑے میں لگ گئی وہاں وہ قیصر سے خوب گلے ملیں۔ بچے کو لپٹایا چمٹایا پیار کیا۔ بچہ اللہ رکھے ایسا پیارا پیارا اگل گوتھنا سا ہے کہ آرا ہو۔ ئے کو پیار آ جائے۔ شامت کی مارکہ مرشد زادی کے ساتھ اُن کی ایک سہیلی بھی تھی۔ وہ ایسی شوخ چلبلی کہ اللہ کی پناہ۔ کبھی بچے کو گدگدا نے کبھی کندھے پر بٹھلائے کبھی سر سے اونچا اُچھالے۔ منع کرنیوالا کون تھا۔ وہ دونوں گویا برسوں کی بچھڑی ہوئی۔ ان کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ رمضان کی انتیس تاریخ تھی اس رکانہ کو جو چاند دیکھنے کا خیال آیا بچے کو لئے کوٹھے پر چڑھ گئی۔ سوا مہینے کی جان جاڑوں کے دن۔ جھٹ پٹا وقت۔ بچے نے اوپر جاتے ہی ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو گیا۔ کیا کہوں خالہ جان میں سجدے میں تھی کہ سیدنی کھڑی ہوئی کیسی نماز اور کہاں کا روزہ سینکڑوں ملا سیانے بلائے جس نے کہا یہی کہا کہ بچہ جھپٹ میں آ گیا ہے کسی کی پیری نہیں چلی۔ آخر میاں جی کو بلایا۔ انھوں نے جھاڑا فلیتے جلائے تو بچے نے آنکھیں کھولیں اور سب کی جان میں جان آئی ساری رات ست ہی ست میں گذری۔ صبح بچے نے ذرا سا دودھ بھی پیا اور اس کا چہرہ بھی بحال تھا۔ سوچ رہی تھی کہ جس طرح بنے دوپہر سے پہلے پہلے قیصر کو سسرال بھیجدوں۔ اتنے میں یہاں آنا ہو گیا۔

فاطمہ صغرا۔ (دوسری بیگموں سے مخاطب ہو کر) اب اجازت لینی چاہیئے۔

نوشابہ خانم۔ سچ تو ہے ہم تو یہاں آ کر ایسے بیٹھ گئے جیسے اپنے گھروں میں۔

عالیہ بیگم۔ میں کسی خواص کو بلا کر اس سے عرض کراتی ہوں۔

• چنانچہ پہلے شہزادیاں رخصت ہوئیں اور جب ان کی پرچھی کم ہوئی تو شہر کی بیگمات کے اٹھانے۔ پالکیاں لگنی شروع ہوئیں اور تھوڑی دیر میں حضرت زینت محل کا جلوت کدہ خلوت خانہ بن گیا۔

——— اشرف صبوحی دہلوی

کوکن کی خارش

لذت آزار پیدا کرنے کیلئے شاعروں اور صوفیوں نے عشق و محبت کے شغلے کو زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دیا ہے۔ لیکن کیا یہ ہر ایک کے قبضہ اختیار میں ہے کہ وہ بیمار عشق بن جائے؟ فرحت اللہ بیگ نے عشق کی گولیوں کا اشتہار البتہ دیا تھا لیکن اس کا نسخہ بتانے پر وہ بھی رضامند نہ ہوئے کیونکہ اشتہاری ادویات در اصل مداری کے کرتب کی طرح ہیں کہ ادھر طلسم نظر ٹوٹا اور ادھر حقیقت مجاز میں تبدیل ہو گئی بہر حال لذت آزار پیدا کرنے کے لئے دنیا میں عشق و محبت کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی ممکن ہیں۔ جن میں سب سے آسان ترکیب کھٹمل زدہ پلنگ پر آرام کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ میر تقی میر کے کلام میں جو درد اور حلاوت پائی جاتی ہے۔ در اصل کھٹملوں ہی کی مرہون منت ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

گرچہ ہتو نکو میں سل مارا پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
ملتے اتو نکو گھر کہیں ہو رہیں ناخنوں کی ہیں لال سب پوریں
تو شکایت گردوں ہی بے بے چھانا ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

پوری نظم نقل کرنے کی گنجائش نہیں لیکن اگر آپ ان اشعار میں تھوڑا سا تصرف کر کے کھٹملوں کا لفظ نکال دیجئے اور ان کو ایک خاص لحن سے گنگنانا شروع کیجئے تو سامعین یہی خیال کریں گے کہ کوئی دل کا بیمار اپنی بھڑاس نکال رہا ہے۔ میں نے بھی کھٹملوں کے ساتھ راتیں گذاری ہیں لیکن شب بیداری میں نہیں بلکہ شب خوابی میں۔ واقعہ یوں ہے کہ میرا خون میٹھا ہے اس لئے ان کی چھیڑ چھاڑ میں مجھے کوئی خاص لذت محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں مجھ کو کوکن کی لذت آزار اب تک یاد ہے لیکن اس میں کھٹملوں کے بوسوں کے تاثرات شامل نہیں ہیں بلکہ یہ کچھ اور ہی لطف ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں کیونکہ اس کیلئے تجربہ شرط ہے۔ جس طرح ایک مست مے گلفام ایک زاہد خشک سے حقارتاً کہتا ہے کہ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں" اسی طرح میں آپ سے عرض کرونگا کہ:۔

"آپ کوکن کبھی گئے ہی نہیں"

مغربی ساحل پر کوکن کا خطہ در اصل بہشت کا ایک ٹکڑا ہے لیکن جس طرح یہ حقیقت ہے کہ انسان اس خاکی پیرہن کیساتھ جنت کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ حدود کوکن میں داخل ہو جانے کے بعد ایک پردیسی کو ایک نیا ہیولیٰ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی جلد میں ایک انقلاب واقع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پہلی سطح کی جگہ ایک نئی سطح نمودار ہو جاتی ہے اور اس انقلاب کا عمل خارش کے ذریعہ پورا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے ناظرین میں سے چند ہستیاں ایسی بھی ہونگی جو اس لذت آزار کا کافی تجربہ رکھتی ہونگی۔ لیکن کوکن کی خارش کے تاثرات بالکل انوکھے ہیں۔

ڈاکٹروں نے اس کے ظاہری اسباب پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے لیکن چونکہ ان کی نگاہ حقیقت بین نہیں ہے اس لئے ان کی تحقیق قابل قبول نہیں کیونکہ باوجود ان تمام ترکیبوں کے جو حفظ ما تقدم کے طور پر عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ وہاں کی سرزمین پر خارش کا وجود پانی اور ہوا کی طرح عام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ بارش کثرت سے ہوتی ہے اور سمندر کا ساحل قریب ہی ہے۔ اس لئے یہ مرض کثرت سے ہوتا ہے لیکن کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ انھیں اسباب کی موجودگی میں بنگال، مدراس اور جاپان کے ساحلوں پر اس کی عام شکایت کیوں نہیں ہے؟ اس لئے معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ کوئی اور وجہ بھی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ "بونبل مچھلی" کی جیو ہتیا کا اثر ہے۔ ہندوستان میں" اہنسا" کے اصول سے کسی جاندار کو اپنی غذا کا ایک جزو قرار دینا مہا پاپ خیال کیا جاتا ہے اور گوشت خور انسانوں کے معدوں کو جانوروں کے قبرستان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر سارے ملک میں "پنجرا پول" کا ایک نظام پھیلا ہوا ہے تاکہ جانور تندرست اور زندہ رہیں اور یہاں کے انسان اتنے مرتاض کہ ہمیشہ سرحدی پٹھانوں کے خیال سے لرزاں اور ترساں رہیں۔ بہرحال امراض کا یہ فلسفہ کہ "طاقتور انسانوں کو طاقتور بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اور کمزوروں کو معمولی بیماریاں"

قابلِ غور ضرور ہے۔ اسی اصول پر کوکن میں بھی اس تحریک کیلئے کافی مواد موجود ہے کہ یہاں بونبل مچھلی کی رکھشا کیلئے شکار کرنا ممنوع قرار دیدیا جائے۔ اور یہاں کے باشندوں کی غذا صرف اُبلے ہوئے چاول اور بھُنے ہوئے پاپڑ تک محدود کردی جائے۔ اس طرح یقین ہے کہ خارش کے حملوں سے نجات ہو جائیگی۔

چونکہ اس مرض کا لباس کے ساتھ بھی گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ کوکن کے مزدور اور کاشتکار کا لباس اس قسم کا ہوتا ہے کہ جسمیں اعتدال پایا جاتا ہے۔ یعنی نہ تو سادھووں کی طرح جوڈ یا کے ساتھ، سوائے ایک لنگوٹی کے، لباس بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اور نہ اُن مسرف نوجوانوں کی طرح جو دھوتی کو شلوار اور لہنگا بنا دیتے ہیں۔ ان کی کیفیت ان دونوں حالتوں کے بین بین ہے۔ اسی لئے ہم ان کے اس مخصوص لباس کو نہ تو لمبی لنگوٹی کہہ سکتے ہیں اور نہ چھوٹی دھوتی۔ خصوصاً عورتوں کے مسئلہ میں تو اور بھی مغالطہ ہوتا ہے۔ بہرحال لباس کا یہ اختصار حکیمانہ اصول پر مبنی ہے۔

ہندوستان کا مزدور اپنے سر پر بوجھ رکھ کر اپنے توازن کو قائم رکھنے کے لئے یا تو دونوں ہاتھوں سے مدد لیتا ہے یا اُن کو آزاد چھوڑ دیتا ہے لیکن یہاں اس کا ایک ہاتھ وزن کو سنبھالنے میں مشغول رہتا ہے اور دوسرا ہاتھ کھجانے میں۔ اگر آپ اس کا ایک ہاتھ زبردستی جیب میں ڈال دیں تو وہ یقیناً چیخ مار کر گر جائیگا۔ خارش کا مرکز خصوصیت سے کمر کے اس حصے پر ہوتا ہے جہاں دھوتی کا بندھن ہوتا ہے اور یہ مقام ایسا نظر آتا ہے جیسے سوکھے تالاب کی تہ میں پپڑائی ہوئی مٹی۔

اب آپ خیال فرمائیے کہ لباس کے اس اختصار کے باوجود خارش کے مورچے اتنے زبردست ہوتے ہیں۔ پھر اُن لوگوں کی کیا کیفیت ہوگی جو اس گرم مرطوب آب وہوا میں سرد منطقۂ معتدلہ (انگلستان) اور گرم خشک ریگستان (عرب) کے لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ ان کی حالت یا تو خدا ہی جانتا ہے یا وہ خود۔ بہرحال "دھوتی کلچر" اور "لنگوٹی کلچر" کے مبلغین انھیں جغرافیائی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں پائجامہ اور پتلون کی مخالفت کرتے ہیں۔

یہ کیفیت اس سرزمین پر اتنی عام ہے کہ اب خارش جسم کا ایک عضو بن چکی ہے اور صدیوں کے ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد مستقل حیثیت اختیار کرچکی ہے جس میں مستثنیات کو کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہاں پر وہ فرد جو خارش نہیں رکھتا یقیناً کسی خطرناک مرض میں گرفتار ہے۔ چنانچہ مجھ کو بھی ان حالات کے معلوم ہونے کے بعد اپنی تندرستی کے متعلق شک ہو چلا تھا۔ لیکن چند روز کے قیام کے بعد میں بھی عام انسانوں کی سطح پر آگیا کیونکہ میرے جسم پر آہستہ آہستہ خارش کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ یہانتک کہ چند دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ میرا تمام خون رگوں کے اندر دوڑنے کے بجائے جسم پر دوڑنے لگا اور دوڑتے دوڑتے تھک کر جم گیا۔ اب میرا تمام مجسمہ تازہ گوشت کی کٹی ہوئی بوٹی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی توضیح اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ میرے دل نے سینہ کے اندر رہنا پسند نہ کیا بلکہ اس نے وسیع ہونا شروع کیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس شعر کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی اور میرا دل بحیرۂ عرب بننے سے باز رہا۔

دل میں آکر دیکھئے کیفیتِ سیلابِ غم بیٹھکر کشتی میں کچھ دم سیرِ دریا کیجئے

البتہ اتنا ہوا کہ میں خود دل بن گیا اور میرے دل نے جسم بنکر مجھے چاروں طرف سے ملفوف کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں مجسم درد تھا اور مجسم لذت۔ گویا میں اب فلک کا محتاج نہ تھا۔ اب مجھے غالب کی طرح یہ شکایت نہ تھی کہ :-

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ؛ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

ایسے حالات میں دوستوں نے میری غمخواری میں سعی فرمائیکی بہت کوشش کی لیکن میں نے اس کا علاج خود ہی دریافت کر لیا۔ اس کا نسخہ مجھے غالب کے دیوان ہی سے دستیاب ہوا تھا "زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا" اور واقعی میں اب تمام معالجوں سے بے نیاز تھا۔ رات کا وقت، کھرّا پلنگ، بڑھے ہوئے ناخن اور میں۔ کیا عاشقوں اور شاعروں کو ان تاثرات کے علاوہ کوئی چیز حاصل ہو سکتی ہے؟ پھر کیوں نہ میں بلاخوفِ تردید کہہ اٹھوں کہ عشق اور خارش دونوں مختلف صورتیں ہیں ایک ہی جذبے کی۔

سیّد ابو طاہر

سچی کہانی

"جوانی کی شورانگیزیاں اللہ اللہ، جان دیدینا ایسا سہل معلوم ہوتا ہے جیسے ریل میں بیٹھ کر ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک چلا جانا۔ جہاں کوئی ناکامی ہوئی اور مرنے کی سوجھی۔ خصوصاً ناکامی محبت کا علاج موت کے سوا نہیں۔ گولی مار کر۔ ریل کی پٹری پر لیٹ کر۔ دریا میں ڈوب کر۔ پھانسی لے کر زہر کھا کر غرض کسی نہ کسی طرح "نامراد" زندگی کا خاتمہ کردیا جاتا ہے، اسلئے کہ بقول مرزا اسد اللہ خاں غالب ؎

تم نہ آؤگے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں[1]

ہمیں بھی ناکامی ہوئی، ہم نے بھی جان دینے کی ٹھانی لیکن گھر میں نہ بندوق نہ طمنچہ، گولی ماری جائے تو کیوں کر۔ چھری سے بھی کام لیا جاسکتا تھا لیکن گوسفند قربانی کے خاک وخون میں تڑپنے کا منظر بارہا آنکھوں نے دیکھا تھا مرغ بسمل کا پھڑکنا بھی اکثر نظر سے گذرا تھا۔ لہذا جسمانی اذیت کے خیال نے اپنے اوپر "خنجر آزمائی" سے باز رکھا۔ دراصل انسانی خون اور وہ بھی خود اپنا خون پانی کی طرح بہتے دیکھنا میرے لئے موت کی بھیانک صورت سے زیادہ روح فرسا تھا۔ رہا ریل کے نیچے لیٹ جانا تو یہ خود ایک طول عمل ہے۔ گھر سے میل ڈیڑھ میل چلو تو ریل کی پٹری ملے پھر کوئی دیکھ لے تو سارا پروگرام غلط۔ یہی قباحت ڈوب مرنے میں ہے۔ کیونکہ نل کی بدولت بڑے بڑے شہروں سے کنوئیں تو اس طرح ناپید ہوگئے ہیں جس طرح آجکل کی تعلیمیافتہ لڑکیوں کے دل سے ماں بننے کی خواہش۔ رہا دریا تو وہ ہاتھ کے داؤں کہاں۔ پھانسی سے مجھے ہمیشہ سے نفرت ہی یہانتک کہ اس ہنگامی جنون کے عالم میں بھی پھانسی کا پھندا میری نظر میں نفرت انگیز ہی رہا۔ لہذا اب اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ "دردِ ناکامی" کا وہی علاج کیا جائے جو سوداگر کی بیٹی یعنی "زہرِ عشق" کی ہیروئن نے کیا تھا مگر وہی دشواری ہمیں بھی پیش آئی جو مرزا غالب کو پیش آئی تھی اور جس کا انہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں ذکر کیا ہے ؎

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

اسلئے کہ جس طرح مرزا غالب کے زمانہ میں زہر پر لائسنس تھا (غالباً ہوگا) اسی طرح آج بھی ہے اور آج سے بارہ برس پہلے بھی تھا جب ہمیں زہر کی ضرورت پڑی تھی۔ مرنا بھی بہرحال ضروری تھا۔ سوچا کہ اب کیا کریں۔ خیال آیا کہ آخر دنیا میں ہر چیز کا بدل ہے۔ کیا ایسی اور کوئی چیز نہ ہوگی جو زہر کا کام دے اور بلا دقت دستیاب ہوجائے۔ آخر ایک بات سمجھ میں آگئی، خدا بخشے، امی جان کو داد کا ایک نہایت کامیاب مرہم کسی نے بتایا تھا وہ ہمیشہ بنایا کرتی تھیں اور ضرورتمندوں کو مفت دیا کرتی تھیں[2]۔ ایکدفعہ وہ مرہم بہت دنوں تک رکھے رکھے خراب ہوگیا امی نے اسے کوڑے پر پھینکدیا۔ ہمارے آنگن میں ایک بیری کا پیڑ تھا۔ ایک کوا اس پر بیٹھا تھا۔ اسکی جو شامت آئی تو تیر کی طرح لپکا اور گھی سمجھکر اس مرہم کی ایک چونچ بھرلی اور کھا گیا اور پھر پیڑ پر جا بیٹھا۔ چند منٹ گذرے ہونگے کہ دھڑ سے نیچے گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ اگرچہ کئی برس گذر چکے تھے لیکن یہ واقعہ مجھے یاد تھا اور اس مرہم کے اجزا بھی معلوم تھے یعنی خالص موم، تل کا تیل اور ہائیڈرا جرائی امونیٹا۔ میں نے سوچا کہ لاؤ ہائیڈرا جرائی امونیٹا سے سنکھیا کا کام لو۔ چنانچہ فوراً ایک پڑوس کے ڈاکٹر سے چار آنے کا ہائیڈرا جرائی امونیٹا خریدا۔ باریک

---

[1] دیوان غالب کا حمیدیہ ایڈیشن جس وقت شائع ہوا میں لاہور میں تھا۔ میں نے بھی اس کا ایک نسخہ منگایا اور پڑھنا شروع کیا، رات کا وقت تھا۔ پڑھتے پڑھتے سوگیا۔ خواب میں دیکھا کہ دیوانِ غالب (حمیدیہ ایڈیشن) پڑھ رہا ہوں اور اس میں یہ دو شعر بھی موجود ہیں جو آج تک کسی اور ایڈیشن میں نظر سے نہیں گذرے تھے ؎

آگ لگ جائے اگر گھر کو تو اندیشہ کیا — شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤگے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں — موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

صبح کو جب سوکر اٹھا تو خواب مجھے یاد تھا اور اشعار بھی۔ فوراً دیوانِ غالب (حمیدیہ ایڈیشن) اٹھا کر دیکھا مگر اس میں ان اشعار کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ وہی تین شعر "زہر ملتا ہی نہیں الخ" درج تھے جو سب مروجہ ایڈیشنوں میں نہیں ملتے۔ حیرت تھی کہ خواب میں یہ دو شعر مجھے کیونکر یاد ہوگئے۔ وقتاً فوقتاً اکثر احباب کو سنائے۔ مگر کسی نے اقرار نہ کیا کہ یہ اشعار کبھی کہیں نظر سے گذرے ہیں۔ (پریم پجاری)

[2] داد کا یہ لاجواب مرہم جن صاحب کو درکار ہو ایڈیٹر ساقی کی معرفت مجھ سے بلا قیمت منگا سکتے ہیں۔ (پریم پجاری)

میں کرپڑا یا بنائی اور سرہانے رکھ لی۔ اسکے بعد چار خط لکھے۔ ایک اس بانی فتنہ" یعنی رشیدہ کے نام، ایک کوتوال شہر کے نام۔ ایک ابا کے نام جو اُن دنوں پردیس میں تھے اور ایک امی جان کے نام۔ سب میں اپنے مرنے کی وجہ مختلف بیان کی تھی۔ وہ چاروں خط نہایت دلچسپ تھے اور ایک مجنون زدہ دماغ کی اس کشمکش کی مکمل تصویر جو زندگی کے آخری لمحوں میں حسرت زیست اور آرزوئے مرگ سے پیدا ہوتی ہے۔

اب شام ہو چلی تھی۔ خطوں سے فارغ ہو کر ٹائم پیس میں ۲ بجے پر الارم لگایا اور اپنے ایک نہایت رازدار دوست "سید صاحب" سے ملنے گیا۔ یہی سید صاحب بعد کے واقعات سے ان تمام "ہنگاموں" کے ذمہ دار اور ایک "کامیاب حریف" ثابت ہوئے۔ میں نے انہیں سب حال بلا کم و کاست سنا دیا اُنہوں نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی "بظاہر" کوئی کوشش نہیں کی۔ گلے مل کر رونے لگے اور کہا خدا انجام بخیر کرے +

رات کے دو بجے گھڑی نے الارم بجایا۔ میں کچھ سوتا تھا کچھ جاگتا تھا گھبرا کر اُٹھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سینہ میں گونا گوں جذبات کا ایک طوفان برپا تھا، مرگ و زیست کی تمناؤں میں آخری جنگ ہو رہی تھی۔ نامراد زندگی سے جی سیر ہو چکا تھا، پھر بھی جینے کی آرزو دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی تھی جو بھیانک رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آفتاب کی ایک مضمحل کرن کی طرح کبھی کبھی چمک اُٹھتی تھی اور اسکی روشنی میں مستقبل کی بہت سی ناتمام تصویریں بڑی سرعت کیساتھ یکے بعد دیگرے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ دن نکل آیا۔ زہر اپنا کام کر چکا ہے۔ میرا سرد مُردہ جسم بستر پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ بہنیں، امی جان اور دو چار عزیز مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر آیا۔ نبض دیکھی اور کہا "افسوس خاتمہ ہو گیا"۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ مرد سناٹے میں آ گئے۔ امی جان غش کھا کر گریں۔ میری چھوٹی بہن انجم میرے گلے سے چمٹ گئی۔ منہ پر منہ رکھ دیا اور فریاد کرنے لگی "ہے ہے بھیا ہم سے خفا ہو گئے۔ بولتے نہیں۔ میں نے آپکے لئے تکیہ کاڑھا ہے۔ دیکھئے کیسا خوبصورت ہے۔ انعام نہیں دو گے کیا؟ میں تو لے لونگی۔ ہائے بولتے نہیں۔ بھیا، ہائے بھیا۔ اپنی انجم سے نہیں بولتے کیا کروں۔ ہائے کیا کروں اللہ"

دفعتاً منظر بدلا۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ آبادی سے دور "شہر خموشاں" کے ایک گوشے میں ایک نئی سفید قبر، چاند کی زرد زرد اُداس روشنی میں ایسی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے سفید ململ کی ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک نوجوان بیوہ تنہائی اور بیکسی کے عالم میں اپنے اُجڑ جانے والے سُہاگ اور جوانی کا ماتم کر رہی ہے۔ اتنے میں ایک گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سُنائی دی۔ راستہ کے کنارے گاڑی ٹھہر گئی ہے، یہ کون؟ رشیدہ! تنہا۔ رات کے وقت۔ قبرستان میں۔ کیوں کس لئے۔ میرے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ آئی اور قبر کی پائنتی بیٹھ گئی۔ اسکے پاس کچھ پھول تھے۔ وہ اس نے قبر پر ڈالدیئے کئی منٹ خاموش بیٹھی رہی، پھر اس نے لوح مزار کی طرف دیکھا اس پر لکھا تھا "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ اسکی گردن جھک گئی پھر اُس نے سر اُٹھایا اور آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اسکی آنکھوں سے ڈھلک پڑے

ابھی ان جاگتے خوابوں کا سلسلہ جاری تھا کہ کلاک نے ادھا بجایا۔ میں چونکا۔ ارے ڈھائی بج گئے۔ دُنیا کی دلچسپیاں بار بار میرا دامن پکڑ کر کھینچتی تھیں۔ اور مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرتی تھیں لیکن ناکامی کی تلخیاں ہر بار میرے ارادہ کو استوار تر بنا دیتی تھیں۔ فرشتہ مرگ کی بھیانک صورت اب مجھے بیوفا رشیدہ سے زیادہ مہربان نظر آتی تھی۔ گھر میں سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ میں آہستہ سے اُٹھا، دبے پاؤں آنگن میں گیا۔ صُراحی سے گلاس میں پانی اُنڈیلا۔ اور خاموشی کیساتھ اپنے بستر پر واپس آ گیا۔ پھر ایک بار سب پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ مجھے اسوقت ایک چکر سا آ رہا تھا، مجھے وہ الفاظ نہیں معلوم جو اس شخص کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ جسے چند لمحوں کے بعد موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جانا ہو۔ پھر اپنی دلی کیفیت کیسے بیان کروں۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تکیہ ہٹایا اور چادر کا کونا اُلٹا اور ہائیڈراجرائی امونیا کی پُڑیا کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں ایک سناٹے میں آ گیا۔ بالکل مبہوت۔ میرے حواس بالکل معطل تھے۔ اب میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا اور کروٹیں لیتے لیتے صبح ہو گئی۔ اس دوران میں اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے جو عجیب و غریب ناممکن الوقوع اور مضحکہ خیز تدابیر میرے ذہن میں آئیں ان کا ذکر بیکار ہے اس لئے کہ عموماً ہر شخص کو زندگی میں ایکبار ضرور اس منزل سے گذرنا پڑتا ہے اور وہ ایسے ہی بے سر و پا افکار سے دوچار ہوتا ہے۔

دن بھر گذر گیا، اور میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ اب کیا کروں۔ ایک رات اور گذر گئی، اور میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا۔ دوسرے دن صبح کو سو کر اٹھا تو مجھے یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے میرے خیالات میں کوئی تغیر ہو گیا ہے جس طرح عدالت عالیہ بعض اوقات ایک خونی مجرم کی جوانی پر ترس کھا کر اسکی سزائے موت کو حبس دوام میں تبدیل کر دیتی ہے اسی طرح میرے دل نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ خودکشی کو جلاوطنی سے بدل دیا جائے۔ دراصل یہ عقل کی بات تھی مگر حیرت ہے کہ اُس وقت میرے دماغ میں کیسے آئی۔ "اخلاق جلالی" میں جو فلسفہ اخلاق کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔ انہیں دنوں میں نے پڑھا تھا کہ "دور دراز کا

سفر اختیار کرنا "اس" مرض کا بہترین علاج ہے"۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر جاؤں تو کہاں جاؤں اور کس سلسلہ میں جاؤں۔ سیاحت، تجارت، ملازمت، گداگری، آخر کیا کروں۔ ہرطرف نظر دوڑائی، آخر ایک دیرینہ دوست رشید کی طرف خیال گیا جنکے ساتھ میں نے مسلم ہوسٹل الہ آباد میں دو برس گذارے تھے۔ رشید بی۔ اے پاس کرنیکے بعد ولایت چلے گئے اور وہاں سے آئی، سی، ایس ہوکر آئے اور اب دو برس سے بنگال میں کسی جگہ سب ڈویژن آفیسر تھے ایک مرتبہ یہ بھی سُنا تھا کہ کلکتہ میں ہیں۔ قبل اسکے کہ وہ ہندوستان میں واپس آئیں میری اُنکی خط وکتابت بند ہوگئی تھی لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کم از کم میرا یہی خیال تھا اور یہ خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ میں رشید اور میں دو برس تک ایک کمرے میں رہے تھے۔ بارہا ایک پلنگ پر سوئے تھے، ایک گلاس میں پانی پیا تھا، ایک پلیٹ میں کھانا کھایا تھا۔ ایک دوسرے کے کپڑے پہنے تھے، ایک دوسرے کی کتابوں سے کام لیا تھا۔ ایک دوسرے کا روپیہ خرچ کیا تھا حتیٰ کہ ایک دوسرے کی "چوری" نیز "سینہ زوری" میں حصہ لیا تھا۔ غرض ہر حال میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔

رشید کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ کچھ گرم کچھ ٹھنڈے کپڑے اس میں رکھے۔ ہولڈال میں بستر باندھا اپنے کمرے میں چپکے چپکے انہیں تیاریوں میں مصروف تھا کہ اچانک امی جان آگئیں اور مجھے اس حال میں دیکھ کر متعجب ہوکر پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا "کہیں نہیں۔ ذرا لکھنؤ کا ارادہ ہے۔ پرسوں آجاؤنگا انشاءاللہ"۔ جس وقت یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کا اضطراب مجھ پر طاری تھا، قدم ڈگمگا رہے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کانپور سے یہ میرا آخری سفر ہے۔ وطن واپس نہ آنے کا میں تہیہ کرچکا تھا۔ امی جان چلی گئیں۔ میں نے پھر اپنی چیزیں درست کرنی شروع کیں۔ میز کی دراز میں سے بٹوا نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں کُل پانچ روپے سوا دو آنے۔ دل دھک سے ہوگیا۔ چکر سا آنے لگا میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ دُنیا کا سفر چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو عاقبت کے سفر سے کہیں زیادہ مشکل ہے، وہاں چار آنے کی سنکھیا میں انسان آخری منزل پر پہونچ جاتا ہے یہاں کلکتہ تک جانے کے لئے کم سے کم دس روپے چاہئیں۔ اسی سوچ میں سر پکڑے بیٹھا تھا کہ اب کیا کروں اتنے میں دروازے پر کسی نے آواز دی۔ یہ ہمارے منشی جی تھے۔ دکانوں کا کرایہ وصول کرکے لائے تھے، اسّی روپے نقد انہوں نے میرے ہاتھ میں دئے۔ اسّی روپے یوں بھی اتنے بڑے ہوتے ہیں اور اسوقت تو مجھے اسّی اشرفیوں سے زیادہ معلوم ہوئے۔ رات کی گاڑی سے میں کلکتہ روانہ ہوگیا۔ راستہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا، بجز اسکے کہ ایک رفیق سفر کا لوٹا گاڑی میں سے فاختہ کی طرح اُڑ گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ وہ گاڑی کا پٹ کھولے دروازے کے کنارے پر بیٹھے منہ دھو رہے تھے اُٹھے تو لوٹا وہیں چھوڑ دیا۔ میں برابر کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ریل پوری رفتار سے جارہی تھی، دروازہ کھلا دیکھ کر میں نے کواڑ جو بھیڑا تو لوٹا آتش بازی کے انار کی طرح سرسراتا ہوا اُڑا چلا گیا۔

دوسرے دن شام کو میں کلکتہ پہونچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے دن رشید کی تلاش میں نکلا۔ معلوم ہوا کہ وہ چھ ہفتے کی چھٹی لے کر شیلانگ گئے ہوئے ہیں۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مگر قدرت کو یہی منظور تھا۔ اسلئے کہ اگر رشید اسوقت کلکتہ میں موجود ہوتے تو غالباً میری زندگی میں وہ خوفناک انقلاب کبھی رونما نہ ہوتا جس نے مجھے "اخلاقی دُنیا" کا بدترین مجرم بنادیا۔ میں نے گناہ کئے، کر رہا ہوں اور کرتا رہونگا، انکی خوفناک سزائیں پائیں، پا رہا ہوں اور پاتا رہونگا۔ مگر اس سے میری ہمتیں پست اور میرے حوصلے شکست نہیں ہوئے ہیں جو کچھ کرتا ہوں جان بوجھکر کرتا ہوں اور اپنے کسی عمل پر کبھی متاسف نہیں ہوتا، مکرر گناہ۔ بے مرتے دم تک اسی طرح قدرت سے انتقام لیتا رہونگا۔ رشید سے بُعد کرکے قدرت نے میری رُوح پر جو عذاب مُسلط کردیا اُسے آسانی سے نہیں بھلایا جاسکتا۔ معمولی زخم ہو تو بھر جائے، ناسُور کیا بھرے، سینہ کے اندر ہروقت سُلگتی رہنے والی آگ اس وقت ذرا بھڑک اُٹھی ہے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اُسے توجہ سے سنئے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے حالات اور خیالات سے واقف ہونیکے بعد آپکو بھی مجھ سے نفرت ہوجائیگی، آپ مجھے سوسائٹی کے لئے ایک مُوذی مرض اور ایک مہلک بالتصور کرنے لگیں گے۔ مگر مجھے اسکی پروا نہیں، ہزاروں بُرا کہنے والوں اور بُرا سمجھنے والوں میں اگر ایک آپ کی ذات بھی شامل ہوجائے تو اس سے میرا کیا بگڑتا ہے۔

ہمارے ہوٹل کا "پختہ کار" منیجر بلا کا عیار تھا۔ میں یقین کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر شیطان کو اسکی شاگردی کا موقع مل جاتا تو وہ عمر بھر اپنی اس خوش قسمتی پر ناز کرتا، ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنیکے ہزاروں گر اُسے یاد تھے۔ ریس (گھوڑ دوڑ) کا اُسے جنون تھا۔ مگر اس دیوانگی میں بھی اسکے ہوش کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ دوسروں کے روپیہ سے کھیلتا۔ ہار ہو تو روپیہ لگانے والے کی اور جیت ہو تو یہ بھی برابر کے شریک۔ اس بدبخت نے چند ہی روز میں مجھے اپنے رنگ پر لگالیا۔ میرے پاس اوّل تو روپیہ تھا ہی کتنا، خیر جس قدر بھی تھا اس میں سے کچھ تو "ریس بازی" کی نظر ہوا۔ کچھ ہوٹل کے "بل" میں چلا گیا۔ اب میں بالکل فقیر تھا۔ قرض پر زندگی کا مدار تھا جسکی مقدار ہر روز خوفناک طریقہ پر بڑھتی جارہی تھی، منیجر کی "پُراسرار" عنایتوں کے باعث میری معمولی آسائشوں میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی میں اُسی کمرے میں مقیم تھا جس میں پہلے دن آکر ٹھیرا تھا۔ اب بھی مجھے ویسا ہی اچھا کھانا ملتا تھا۔ جیسا نقد قیمت ادا کرنے والوں کو اور بھی جو چھوٹی موٹی ضروریات ہوتی تھیں اُن سب کا سرانجام منیجر کے ذمہ تھا۔ اُس نے

کبھی ایک لمحہ کیلئے مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کا قرضدار ہوں میں اپنی سادہ دلی سے اس غیر معمولی مہربانی کو اس کی شرافت اور نیکدلی پر محمول کرتا تھا مگر درحقیقت وہ محض "شیطنیت" پر مبنی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ پر اس قدر حاوی ہوگیا کہ اسکے ہاتھوں میں میری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی، اسکے حکم سے سرتابی کی مجھ میں مجال نہ تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کیلئے مسمریزم کے ایک معمول کی طرح استعمال کرے۔

اپنے گھر میں بچپن سے اپنے حسن و رعنائی کا تذکرہ سنتا آیا تھا جب ہوش سنبھالا تو آئینہ نے اس روایت کی تصدیق کی اور جوانی نے تو صنف نازک کے روز افزوں التفات اور غیر معمولی میلان نے اس پر مہر توثیق ثبت کردی مجھے اپنی خوبصورتی کا احساس ضرور تھا اور اس پر تھوڑا سا ناز بھی۔ مگر اپنے حسن و شباب کی تباہ کن قوتوں کا صحیح اندازہ ہرگز نہ تھا۔ میں ایک جوہر تھا ناتراشیدہ، تابشوں سے معمور لیکن جلا کا محتاج۔ حسن و صورت کیساتھ ساتھ قدرت نے سحر گفتار بھی عطا کیا تھا اور وہ تمام چیزیں جو شباب کی متوالی عورتوں کو دیوانہ بنادینے کیلئے کافی ہیں۔ مگر ابتک ان قدرتی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ انکے نشو و نما کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت درکار تھی جو خدا نہ کرے کہ کسی کو نصیب ہو۔ "پختہ کار" منیجر نے جلد میری ان صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور انسے کام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ پہلے مجھے ریس کا چسکا لگایا۔ پھر قرض دیکر ممنون احسان بنایا۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ میری خواہش، میرا ارادہ، میرا اختیار اسکی خواہش، اسکے ارادے اور اسکے اختیار کے تابع اور مطیع ہوگئے۔ اس نے مجھے سکھایا کہ جھوٹ موٹ عورتوں سے عشق کس طرح کرنا چاہیئے انہیں فریب دینے اور اپنی محبت میں مبتلا کرنیکے کیا طریقے ہیں۔ انکے بٹوے کس طرح خالی کرلئے جاسکتے ہیں۔

مثال بہت رکیک ہے مگر واقعہ کے عین مطابق جس طرح ایک نائکہ اپنی نوخیز نوچیوں کو "تماشبینوں" کے دل چھین لینے کے طریقے سکھاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح منیجر نے میری تربیت کی اور اسکے بعد میرے حسن و شباب کو فروخت کرنا شروع کردیا۔ کلکتہ میں جس طرح عشرت پسند مرد خوبصورت طوائفوں اور دوسری پیشہ ور یا غیر پیشہ ور عورتوں پر اپنی دولت برباد کرتے ہیں۔ اسی طرح وہاں عیش و عشرت کے گہواروں میں پلنے والی، مغربی آزادی کی فضا میں سانس لینے والی ایسی بہت سی "خوش مذاق" عورتیں بھی ہیں جو اپنے تنوع پسند ذوق کی تسکین کے لئے مردانہ حسن و شباب کو بھاری بھاری قیمتیں دیکر خریدتی اور اس سے لطف اندوز ہوتی ہیں یہ ضرور ہے کہ نسوانی حسن کلکتہ میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے اور بہت اچھی قیمت پاتا ہے مگر وہاں کے "مہذب" و "شریف طبقۂ نسواں" نیز دولتمند طوائفوں میں مردانہ حسن و شباب کے بھی کچھ گاہک نکل ہی آتے ہیں۔ ریس کے سلسلہ میں منیجر کی بہت سے اونچے اونچے گھرانوں میں رسائی تھی اس نے ہر جگہ میری غیبت میں کچھ اس طرح میری تعریف کی کہ لوگ مجھ سے ملنے کے مشتاق ہوگئے۔ رفتہ رفتہ میرا حلقۂ احباب جس میں بیشتر عورتیں تھیں کافی وسیع ہوگیا۔ کہیں بازار کے سودے کی طرح مجھے خریدا گیا۔ کہیں "نشست و برخاست" نے بے تکلفی کی صورت اختیار کی، بے تکلفی دوستی بنی۔ دوستی عشق و محبت میں تبدیل ہوگئی۔ نتیجہ بہرحال واحد تھا۔

منیجر کے حکم کے مطابق مجھے یہ سب روپ بھرنے پڑتے تھے منتیں کیں۔ آہیں بھریں، آنسو بہائے، قدموں پر سر رکھا، کیا کیا نہیں کیا۔ مگر میرے جذبات کو اس میں ذرہ برابر دخل نہ تھا۔ محبت کا بہروپ بھرتے بھرتے اور عشق عاشقی کی نقالی کرتے کرتے غالباً محبت کا احساس ہی میرے دل سے فنا ہوگیا تھا۔ میری حیثیت اس بے جان ساز کی سی تھی جس میں کبھی ایسے غم انگیز نغمے نکلتے ہیں کہ سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہو کبھی ایسا آہنگ مسرت بلند ہوتا ہے کہ سامعین جوش نشاط سے بیتاب ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ کیفیت تاثر فقط سننے والے ہی تک محدود رہتی ہے خود ساز متاثر نہیں ہوتا۔ نہ اسے غم کا احساس ہوتا ہے۔ نہ خوشی کا۔ دوسرے رخ سے دیکھئے تو میں گویا ایک مجسمۂ سنگین تھا جسکی پرستش کی جاتی ہے۔ پرستار اپنے جوش عقیدت میں کبھی ہاتھ جوڑکر اسکے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے کبھی اس کے قدموں پر سر رکھدیتا ہے۔ کبھی فرط رقت سے آبدیدہ ہوجاتا ہے۔ کبھی گڑگڑا کے اس سے اپنی مرادیں مانگتا ہے۔ مگر پتھر کی بے جان مورت میں اسکے جذبات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کہاں؟ وہ سمجھتا ہے کہ میرا بت سب کچھ سنتا ہے سب کچھ دیکھتا ہے سب کچھ محسوس کرتا ہے۔ اور جو کچھ میں اس سے مانگتا ہوں، مجھے دیگا۔ مگر اس آرزو کا بر آنا معلوم حسن اتفاق سے اگر کوئی مراد پوری ہوجائے تو وہ اسے اپنے "بت" کی مہربانی پر محمول کرتا ہے۔ وائے نادانی! جس طرح فرط عقیدت میں انسان کی آنکھوں پر پردے پڑجاتے ہیں۔ اسی طرح جوش محبت بھی اسے اندھا کردیتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہیں وہ چاندنی راتیں جب حسین آنکھوں نے میرے لئے آغوش میں آنسوؤں کے دریا بہائے ہیں۔ آہ، مجھے خوب یاد ہیں۔ وہ رنگین خلوتیں جب حسن کی ناز پروردہ جوانیاں محبت کی بھیک مانگنے کے لئے میرے قدموں پر سرنگوں ہوئی ہیں۔ آہ سب کچھ یاد ہے۔ مگر کیا یہ نیاز حسن میرے قلب کو متاثر کرسکا؟ نہیں کبھی نہیں۔ ذرہ برابر نہیں۔ میرا دل ایک سنگپارہ سے زیادہ بے احساس ہوچکا تھا۔ ہائے میں نے کیسے کیسے معصوم دلوں کو محبت کے فریب دیئے۔ کس کس طرح اپنا دیوانہ بنایا اور جب یقین ہوگیا کہ حریف شکست کھاگیا۔ یعنی میری جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گیا تو پھر کیسا کیسا اسے تڑپایا ہے کس کس بیدردی سے اسے ذبح کیا ہے، اسلئے ہرگز نہیں کہ کسی کو مبتلائے اذیت دیکھکر مجھے مسرت ہوتی تھی۔ نہیں میری روح ہنوز اس درجہ مسخ نہیں ہوئی تھی، میرا مقصد فقط اپنے حسن و شباب کی قیمت وصول کرنا تھا۔ اب زیادہ سے زیادہ جس قدر بھی وصول ہوسکے اور جس جس تدبیر سے وصول ہوسکے منت سے یا ستانے سے۔ مجھے بہرحال اپنے

کام ہے کام تھا۔

بعض اوقات جب کچھ اور ملنے کا امکان نہ ہوا تو میں نے قیمتی ساڑیاں تک لے لینے میں دریغ نہیں کیا۔ غرض جھوٹی محبت کی مجھے ایسی ایسی بھاری قیمتیں دی گئیں۔ میرے فریب کی قربانگاہ پر ایسی ایسی گرانبہا قربانیاں پیش کی گئیں کہ اُنکی مثال شاید ہی مل سکے۔ مگر یہ سب کچھ منیجر کا "حق" تھا۔ قیمتی لباس، عمدہ کھانا، سجا ہُوا کمرہ، اور موٹر کی سیر، بس یہ میرا حصہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی ریس کھیلنے کے لئے دس بیس روپے بھی مل جاتے۔ یہ بدبخت منیجر شیطان کی طرح میری رُوح پر مسلط ہو گیا تھا۔ میں اُسکے اشاروں پر چلتا تھا، خدا جانے اُس نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں کسی بات میں اسکی مخالفت کر ہی نہ سکتا تھا۔ پہلے پہلے مجھے اس کام سے سخت نفرت ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ نفرت محض کراہت بنکر رہ گئی۔ کچھ مدت کے بعد یہ احساس بھی فنا ہو گیا اور اس قسم کا ہر عمل ایک مشین کی طرح مجھ سے صادر ہوتا تھا۔ آہ، قدرت اگر رشیدہ کیسے دغاباز پر آمادہ نہ کر دیتی تو کیا میری یہی حالت ہوتی؟ جسوقت یہ خیال آتا ہے تو میں غم و غصہ سے دیوانہ ہو جاتا ہوں، اور جوشِ غضب میں اپنے اس عہد کی تجدید کر لیتا ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے گناہ کر کے قدرت سے اس بدسلوکی کا انتقام لونگا جس نے میری روح اور میرے جسم کی تمام راحتوں کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا۔ کہاں تک کہے جاوں۔ یہ مجذوب کی بڑ کہیں ختم ہونیوالی ہے۔

ہاں تو جو بات میں کہنے والا تھا وہ رہ گئی۔ جذبات کے ہیجان میں سب کچھ بھول گیا۔ ان دنوں میری خریدار ایک ایرانی "خانم" تھیں اُن کا سن چالیس سال سے کم نہ تھا رُخساروں پر غازہ کی سُرخی کے سوا جسے وہ کثرت سے استعمال کرتی تھیں، اب جوانی کی اور کوئی نشانی اُن میں باقی نہ تھی۔ مگر بوالہوسی کے لئے عمر کی قید نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ ؎

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

جوش سے مُراد غالباً فرطِ ہوس ہے۔ یہی حال اُن "خانم" کا تھا۔ مگر اُن کی ٹھنڈی گرمیاں جلد ہی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئیں، اسلئے میں نے اب وہاں نہ جانیکا تہیہ کر لیا تھا۔ منیجر میری اس "حماقت" سے سخت ناراض تھا، بہر حال میں نے اس سے وعدہ کیا کہ دو تین ہفتے کے اندر اندر انشاءاللہ اس سے زیادہ موٹا شکار پھانس کر دکھا دونگا۔ اسی فکر میں کئی دن سے سرگرداں پھر رہا تھا، مگر ہنوز کامیابی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انہیں خیالات میں غلطاں پیچاں ایک دن صبح کے وقت میں ہوٹل سے نکلا۔ کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا میں اپنے افکار میں اُلجھا ہُوا گرد و پیش سے بالکل بے خبر، سڑک پر خاموش چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک موٹر آتی ہُوئی دکھائی دی۔ میں بے خیالی میں اپنے داہنے ہاتھ کو ہٹ گیا، چشم زدن میں موٹر بالکل سر پر آ پہونچی، اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہُوا اور فی الفور میں نے پُوری قوت سے بائیں جانب کو جست کی۔ موٹر نکل گئی، میں بچ گیا۔ بس یہیں تک مجھے یاد ہے، اسکے بعد جو کچھ ہُوا اس کا حال دوسروں سے سُنا۔ کیونکہ جب میں نے آنکھ کھولی اور ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ سارا بدن زخموں سے چُور، کپڑے خاک آلودہ، خون میں شرابور، سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ تکلیف سے بُرا حال تھا۔ میں نے ایک آہ کی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

کسی نے مجھ سے پُوچھا "کیا حال ہے"۔ یہ آواز نہ تھی۔ موسیقی کی ایک موج تھی جس سے میرے قلب میں ایک کیفیتِ اہتزاز سی پیدا ہو گئی، میں نے فوراً آنکھیں کھولدیں۔ ایک جوان خاتون میرے سرہانے کھڑی تھی فرنگیوں کا سا گورا بھبوکا رنگ، سُنہری بال، مگر نقوش ہندوستانی، کالی ساڑی میں گورا مکھڑا ایسا پیارا معلوم ہوتا تھا جیسے آدھی رات کو چودہویں رات کا چاند۔ ساڑی پر سفید ستارے ٹکے ہُوئے تھے، تھوڑی سی دیر کے لئے میں اپنی تکلیف کو بھول گیا اور میں نے اسکے چہرہ پر نظر جما دی، وہ سخت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔ میں نے پھر اپنے دل میں ایک سنسنی سی محسوس کی مُسکرا کر میں نے کہا "اچھا ہوں"۔ میرے اس جواب سے وہ پھول کی طرح شگفتہ ہو گئی۔ گلابی ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا۔ جہاں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی، اسکے بعد ایک بڑے کمرے میں جہاں اور بھی کئی مریض تھے مجھے ایک پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ نرس سے میں نے پُوچھا "یہ کالی ساڑی والی عورت کون تھی؟" اُس نے مُسکرا کر جواب دیا "آپ کی قاتل"

میں کچھ نہ سمجھا۔ مجھے حیران دیکھکر نرس نے کہا "جسوقت آپ نے سامنے سے آنیوالی موٹر سے بچنے کے لئے بائیں جانب کو جست کی، پیچھے سے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ یکایک آپ اُسکے سامنے آ گئے۔ ٹکر ہوئی آپ تیورا کر گرے اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً ہی آپ کو اُسی موٹر میں ڈال کر یہاں لایا گیا۔ یہ اُس عورت کا بیان ہے۔ اب خدا جانے اسمیں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ"۔

"مگر اس عورت کا اس حادثہ سے کیا تعلق ہے؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ موٹر چلا رہی تھی اور آپکو کچل دیا"۔ نرس نے ایک شوخ مسکراہٹ کیساتھ جواب دیا۔

"اچھا تو وہ خود ہی مجھے موٹر میں ڈال کر یہاں لائی ہے"۔

"جی ہاں وہ خود۔ بڑی رحمدل ہے بے چاری"۔

ہسپتال میں کوئی تین ہفتے مجھ پر سخت تکلیف کے گذرے۔ شدت کا بخار آیا۔ مگر جلد ہی میری حالت درست ہو گئی۔ سر کا زخم بھی جو بظاہر اندیشہ ناک تھا رفتہ رفتہ اچھا ہو۔ ہاتھ۔ میری جسمانی اذیت منیجر کے لئے بظاہر حد درجہ اندوہناک تھی وہ ہر وقت میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا اور ہر طرح تسلی دیتا تھا۔ مگر درحقیقت وہ اپنے دل میں اس حادثہ سے بیحد مسرور تھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا "بھیا! خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ نہ جانے اس میں اسکی کیا مصلحت تھی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے کرتا ہے، بہت ممکن ہے کہ اس حادثہ اور مصیبت میں بھی ہماری کوئی بھلائی اسکے مدنظر ہو اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ تکلیف کے بعد راحت لازمی ہے، دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے"۔

نرس کے بقول میری "قاتل" یعنی سیاہ ساڑی والی خاتون اس دوران میں کئی بار مجھے دیکھنے ہسپتال آئی وہ اس حادثہ سے حد درجہ متاثر معلوم ہوتی تھی، منیجر نے مجھے بتلایا کہ وہ ایک لکھ پتی کی بیوہ اور ایک بہت بڑی جائداد کی تنہا مالک تھی۔ منیجر کے اور میرے درمیان اب اکثر اسکے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ہم نے اپنی مصلحتوں اور اسکی دولت کی مناسبت سے اس کا نام "لکشمی" رکھ لیا تھا۔ منیجر کو یقین تھا اگر میں نے اسکے مشورہ پر عمل کیا تو ایک نہایت معقول رقم "لکشمی" سے وصول ہو جائیگی۔

کلکتہ کے دوران قیام میں کتنی ہی کافر جوانیوں سے میں کھیل چکا تھا، میرے نزدیک انکی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی حسن و شباب کی ساحرانہ قوتیں اب مجھے متاثر نہ کر سکتی تھیں، رشیدہ کی بیوفائی کے بعد محبت کو میں حماقت و دیوانگی کا مجموعہ اور فطرت انسانی کی بدترین کمزوری سمجھنے لگا تھا۔ اگر کوئی یہ کہتا کہ مجھے فلاں سے محبت ہے تو میرے نزدیک اس کے معنی ہوتے کہ یا تو شخص خود کسی کو فریب دے رہا ہے یا کسی کا فریب کھا رہا ہے۔ محبت کرنے کی صلاحیت مجھ میں اتنی بھی باقی نہ رہی تھی جتنی ایک اندھے میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں امتیاز کرنے کی ہوتی ہے۔ میرے لئے صرف وہی عورت دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھی جو میری گرمی آغوش بھاری قیمت دیکر خرید سکتی تھی۔ مگر دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے کہ صدیوں سرد و خاموش پڑے رہنے کے بعد بعض پہاڑ یکایک پھٹ جاتے ہیں اور شعلہ فشانی شروع کر دیتے ہیں، آگ کا ایک دریا انکے دہانے سے ابلتا ہے اور جدھر رخ کرتا ہے خشک و تر سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتا ہے۔ ٹھیک یہی میری حالت ہوئی میرا مردہ اور بے احساس دل جو مدتوں سے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرح سرد پڑا تھا اور محبت کی گرمی سے یکسر محروم ہو چکا تھا اب پھر ایکبار اس میں حرارت زندگی کی ایک موج پیدا ہوئی پھر اس نے دردِ محبت کا احساس کیا۔ پھر اس میں نشتر کی ایک نوک سی چبھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو دل کے گوشہ گوشہ میں انگڑائیاں لینے لگی، اور اس انقلاب کا باعث وہی فتنہ گر تھی جس نے مجھے چند دن کیلئے زندگی سے دور اور موت سے بہت قریب کر دیا تھا۔

پہلی بار جب میں نے ہسپتال میں اسکی آواز سنی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری روح کے بربط کا ہر تار اس صدائے نغمہ سے گونج اٹھا۔ پھر جب پہلی مرتبہ میں نے اسکی صورت دیکھی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے بہت سے پردے میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے جیسے میں سوتے سوتے جاگ اٹھا، میرا دل پتھر تھا۔ مگر اس پتھر پر ایک نقش بن گیا گہرا نقش آسانی سے نہ مٹنے والا۔ پہلے اس نقش کی حیثیت ایک "خاکہ" سے زیادہ نہ تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ ایک رنگین تصویر بن گیا اور ہر وقت پیش نظر رہنے لگا، منیجر صاحب سے میں نے اس کو چھپایا۔ میں اس سے ڈرتا تھا۔ وہ لکشمی سے ایک "معقول رقم" وصول کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ بظاہر میں اسکی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا مگر میرا دل ہرگز اس "کمینہ پن" میں شریک ہونے کیلئے تیار نہ تھا۔

ایک دن جب کہ میں ہسپتال میں تنہا بیٹھا ہوا تھا لکشمی آئی اس نے کہا "شاہد صاحب! آج مجھے آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔ ایک التجا آپ کے پاس لیکر آئی ہوں اور مجھے آپکے اخلاق و شرافت سے توقع ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کرینگے۔ شاید آپ کو یقین نہ ہو مگر میں خدا کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ اس حادثہ سے آپ کو جو کچھ تکلیف پہونچی اس کا مجھے بیحد افسوس اور صدمہ ہے۔ مگر ساتھ ہی آپ کو معلوم ہے کہ میں بالکل بے قصور ہوں میں نے موٹر کو روکنے اور بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر بدقسمتی سے آپ اتنے قریب اور اس طرح سامنے آگئے تھے کہ ٹکر ہوئے بغیر نہ رہی آپ کے چوٹ لگی اور بہت لگی اور اب اتنے دنوں سے آپ ہسپتال میں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ مجھے آپکے نقصان کا اچھی طرح احساس ہے مگر میں پھر وہی عرض کرونگی کہ خطا میری نہیں۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ حادثات کو کوئی روک نہیں سکتا۔ بہر حال میں اسکے لئے بخوشی تیار ہوں کہ جس طرح آپ پسند کریں آپ کے نقصان کی تلافی کر دوں۔ آپکے منیجر صاحب کئی بار دیوانی و فوجداری میں مجھ پر دعوے

کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ پولیس نے الگ مقدمہ چلایا ہے اور یہ بھی منیجر صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف پولیس کو میری آزار رسانی پر آمادہ کیا ہے۔ بلکہ کچھ دے دلا کر دو تین جھوٹے گواہ بھی تیار کرلئے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حادثہ کی ذمہ دار میں ہوں Wrong side, Negligence, Rash driving. کونسا جرم ہے جس کا ارتکاب میں نے نہیں کیا۔ خیر پولیس اور منیجر صاحب جو کچھ بھی کہیں۔ مگر مجھے کم سے کم آپ کی ذات سے اُمید ہے کہ آپ ایک بے قصور کو خطاوار نہ ٹھہرائیں گے۔ اور کل مجسٹریٹ کے سامنے وہی بات کہیں گے جو حق ہے۔ یہ ہرگز خیال نہ کیجئے کہ میں الزام سے بری ثابت ہونیکے بعد اپنا وعدہ پورا نہ کروں گی۔ نہیں جو کچھ کہہ رہی ہوں اُسکے لئے تیار ہوکر آئی ہوں۔ آپ جو کچھ فرمائیں اسی وقت حاضر کرسکتی ہوں۔ ساتھ ہی ایک بات اور بھی عرض کردوں۔ آپ باور کیجئے کہ میں آپکے منیجر صاحب کی دھمکیوں سے خوفزدہ ہوکر ہرگز یہ درخواست لیکر آپ کے پاس نہیں آئی ہوں۔ بلکہ مجھے آپکی تکلیف اور آپکے نقصان کا کامل احساس ہے اور اس کی تلافی جس طرح بھی ممکن ہو میرے نزدیک لازمی ہے۔ بالفرض میری غلطی ثابت بھی ہوجائے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ عدالت مجھ پر کچھ جرمانہ کردے گی۔ اس سے آپ کو کیا ملے گا۔ آپ خود جو جی چاہے مجھ پر جرمانہ کردیجئے۔ میں بخوشی اُسے ادا کردوں گی۔"

لکشمی جس وقت یہ باتیں کہہ رہی تھی میرے دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لکشمی بے قصور ہے۔ خطا درحقیقت میری تھی مگر میں منیجر سے وعدہ کرچکا تھا کہ مجسٹریٹ کے روبرو لکشمی کو قصوروار ثابت کردونگا ایک طرف منیجر کی شیطانی قوت میری روح پر بُری طرح مسلط تھی۔ دوسری طرف شرافت کا احساس جو مدت ہوئی مٹ چکا تھا، خدا جانے کس طرح پھر ایکبار میرے قلب کی گہرائیوں میں موجزن ہوگیا تھا اُسکے ساتھ ساتھ محبت کا وہ جذبہ بھی اپنا عمل کررہا تھا جسے میں نے سب سے چھپا کر اپنے بے احساس دل کے ایک گوشہ میں جگہ دی تھی۔ بہرحال میں نے خود کو سنبھالا۔ اور تمام مصلحتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ "قصوروار کون ہے اس کا صحیح علم کم ازکم مجھے نہیں۔ رہ گیا تلافی کا سوال تو اسکے متعلق منیجر صاحب سے مشورہ کئے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" لکشمی مایوس ہوکر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں خود اپنے نامہربان جواب سے شرمندہ ہوگیا۔ دوسرے دن میں، لکشمی، منیجر، پولیس کا داروغہ، سپاہی، جھوٹے گواہ، سب مجسٹریٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے جو بیان دیا اس کا خلاصہ یہ

کہ "غلطی سراسر میری تھی۔ لکشمی ہرگز حادثہ کی ذمہ دار نہیں۔" صرف میرے بیان نے مقدمہ کا خاتمہ کردیا۔ پولیس کی شرمندگی، منیجر کی برہمی، لکشمی کی حیرت اور میری خوشی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس واقعہ نے آنِ واحد میں لکشمی کو مجھ سے اور مجھے لکشمی سے بہت قریب کردیا۔

دوسرے دن لکشمی نے مجھے اپنے یہاں چاء پر بلایا۔ نہ جانے آج کتنی مدت کے بعد مجھے حقیقی مسرت کے چند لمحے نصیب ہوئے تھے۔ لکشمی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ خدا جانے کیوں ہم دونوں خاموش تھے۔ میرا دل کسی قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جو میرے جذبات کی غمازی کرسکے مگر آنکھیں زبان کی قائم مقام بن کر دل کی ترجمانی کا فرض بخوبی ادا کررہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس کیفیت سے لکشمی بھی متاثر ہورہی ہے۔ مگر برابر اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ دل کی چوری کھلنے نہ پائے۔ آخر میں نے کہا "لکشمی دیوی! آپنے میرا قصور معاف کردیا؟"

لکشمی نے حیران ہوکر پوچھا "آپ کا قصور؟ آپ نے کونسا قصور کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں سخت شرمندہ ہوں کہ پرسوں ہسپتال میں میں نے آپ کو مایوس کُن جواب دیا اور اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ پردے پردے میں آپ کو قصوروار ٹھہرایا۔"

لکشمی نے کہا "شاہد صاحب! گئی گذری باتوں کا اب ذکر نہ کیجئے۔ مجھ پر آپ نے جو احسان کیا ہے اگرچہ وہ آپ جیسے ایک شریف انسان کے ظرف کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر میری توقعات سے یقیناً کہیں بڑھکر ہے۔ اب آپ سے ایک التجا ہے۔ کیا آپ اُسے قبول کرینگے"۔ میں نے کہا "بسروچشم"۔ لکشمی یہ سُن کر اُٹھی۔ برابر والے کمرے میں جاکر میز کی دراز میں سے کوئی چیز نکالی اور واپس آکر ایک لفافہ بند میرے سامنے رکھدیا اور کہا "یہ آپکی امانت ہے"۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ لفافہ اُٹھا کر کھولا۔ اس میں سو سو روپے کے کئی نوٹ تھے کتنے تھے۔ یہ نہیں معلوم میں نے شمار نہیں کئے۔ لکشمی کا مطلب سمجھ گیا۔ گویا یہ روپیہ میری اس تکلیف کا معاوضہ تھا جو موٹر کے حادثہ سے مجھے پہونچی تھی۔ نہایت بے اعتنائی کے ساتھ وہ لفافہ لکشمی کے سامنے ڈالتے ہوئے میں نے کہا "مجھے آپ سے ایسی اُمید نہ تھی کہ آپ گھر بلاکر مجھے اس طرح ذلیل کرینگی"۔ لکشمی اس جواب کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ سخت مضطرب ہوکر بولی "نہیں نہیں خدا کے لئے آپ میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھئے۔ میرے ساتھ بے انصافی نہ کیجئے کیا اس کا امکان بھی ہے کہ میں آپ کو گھر بلاکر شرمندہ کروں۔ کیا میں آپکے نزدیک ایسی ہی ذلیل ہوں"۔ لکشمی کے ان الفاظ نے مجھے لاجواب کردیا۔

کچھ دیر تک پھر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں نے ہی ابتدا کی

میں نے کہا "لکشمی دیوی، شاید آپ کو معلوم ہے کہ منیجر صاحب میرے حد درجہ دوست، خیرخواہ اور محسن ہیں۔ مقدمہ خارج کرا کے میں نے اُنہیں بیحد ناراض کردیا ہے۔ پرسوں، مقدمہ سے پہلے میرے نقصان کی تلافی کے طور پر ایک معقول رقم آپ مجھے دینا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے نہیں لی۔ غالباً آپ ان تمام باتوں کو میری شرافت اور نیکی پر محمول کرتی ہونگی۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں۔ کاش میری ذات میں اتنی شرافت اور نیکی موجود ہوتی۔ اپنی کمزوریاں اور عیوب کوئی دوسروں پر ظاہر نہیں کیا کرتا مگر بعض اوقات انسان اسکے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ یاد رکھیئے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ محض خود غرضی کی بنا پر تھا۔"

"مگر اس میں آپ کی کیا غرض تھی؟" لکشمی نے میرا قطع کلام کرکے کہا۔

"غرض یہ تھی کہ میری وجہ سے منیجر صاحب اور پولس نے آپ کو جو ذہنی اذیت پہونچائی تھی اسکی تلافی ہو جائے۔"

"اوہ، شاہد صاحب!" لکشمی نے صرف اتنا کہا۔ اسوقت وہ تشکر و امتنان کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"اسکے علاوہ ایک اور بات بھی تھی"

"وہ کیا؟"

لکشمی کے اس سوال کا جواب میں نے الفاظ میں نہیں دیا بلکہ ہاتھ بڑھا کر لکشمی کا ہاتھ تھام لیا۔ پہلے اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا، پھر ہونٹوں سے۔ لکشمی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے ایک لرزش سی اُسکے ہاتھ میں محسوس ہوئی۔ میرا خود تمام جسم کانپ رہا تھا، دل کی اس وقت جو حالت تھی۔ بیوفا رشیدہ سے جُدا ہونیکے بعد آج پہلی بار مجھ پر طاری ہوئی تھی۔

وقت گذرتا گیا اور ہم ہر روز ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے منیجر کی برہمی ہمارے اس بڑھتے ہوئے ارتباط کو دیکھکر گھٹتی جا رہی تھی۔ اسکا خیال تھا کہ جلد وہ مجھے اپنی راہ پر لگا لیگا۔ اور مقدمہ خارج کرا کے میں نے اسکا جو مالی نقصان کیا تھا۔ اسکی تلافی کی صورتیں نکل آئیں گی۔ لیکن میں تہیہ کر چکا تھا کہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے مگر لکشمی سے ایک پیسہ نہ لونگا۔ واقعہ یہ ہے کہ رشیدہ کی بے وفائی نے میرے قلب میں جو ناسور ڈالدیئے تھے لکشمی کی وفا پرستیوں نے اُنہیں مندمل کردیا۔ جسمانی راحتیں اور روحانی مسرتیں اب قدم قدم پر مجھ سے ہم آغوش ہوئی تھیں۔ کمر تک پہونچنے والے لکشمی کے سُنہرے بال جس وقت میرے بازو پر بکھرے ہوتے تھے اور اُسکی گداز مرمریں باہیں میری گردن کے گرد حلقہ کئے ہوتی تھیں اس وقت میری کیا حالت ہوتی ـــــ آہ کن الفاظ میں بیان کروں کیسی حالت ہوتی تھی لکشمی کی دولت، لکشمی کا جسم، لکشمی کی روح ہر چیز میری ملکیت تھی۔ چند روز اس طرح گذرے۔ دولت، حُسن، جوانی، محبت اور آزادی جب یہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر کونسی تمنا ہے جو پوری نہ ہو سکے۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو یہ سب کچھ مل جانیکے بعد اور رہ بھی کیا جاتا ہے جسکی انسان تمنا کرے۔ مگر افسوس، حصولِ آرزو کے بعد محبت کی زندگی شفق اور دھنک کی رنگینیوں سے زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی ہے۔ چاہت کی آگ رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگی۔ نفس کی کمینگی جس پر تھوڑی سی مُدت کے لئے شرافت نے غلبہ پالیا تھا۔ پھر اُبھر آئی۔ پہلے مجھے خود لکشمی سے محبت تھی اب میں فقط اسکے روپیہ کو چاہتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ لکشمی نے میری خاطر اپنی دولت پانی کی طرح بہائی۔ تقریباً ہر ہفتہ میں ریس میں کچھ نہ کچھ ہارتا تھا لکشمی مجھے بہت کچھ دیتی تھی اور اس طرح کہ گویا قرض ادا کر رہی ہے۔ احسان جتانا تو کُجا احسان کرکے اُلٹی ممنون ہوتی تھی۔ بایں ہمہ میرے نفس کی دنائت روز افزوں ترقی پر تھی۔ آخر لکشمی کو بھی اس کا احساس ہو گیا۔ اس نے مجھے سنبھالنے کے لئے ہاتھ روک لیا۔ میں ورکی بگڑ گیا۔ اب اُسکو اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ اُسکے ہونٹ میرے لبوں کو چھو سکیں۔ میرا کھنچنا اُس کے لئے قیامت ہو گیا۔ خوابِ راحت کی خوگر آنکھیں جنہیں قدرت نے جادوگری کے لئے بنایا تھا اب جاگنے اور آنسو بہانے کے لئے وقف تھیں۔

ایکدن شام کے وقت میں لکشمی کے ہاں گیا وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسکے سُنہرے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے چُپکے سے اسکے مُنہ پر منہ رکھدیا۔ وہ بیتاب ہوکر اُٹھ بیٹھی۔ میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اُسوقت اسکی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت لوہا گرم ہے زور سے ضرب لگانی چاہیئے۔ وہ کسی طرح مجھ سے جُدا ہونا نہ چاہتی تھی۔ مگر میں نے بزور اُسے اپنے سے علیحدہ کیا اور کہا "لکشمی دُنیا میں ہر چیز قیمت سے ملتی ہے، میرے آغوش کی بھی ایک قیمت ہے۔ خدا نے تمہیں اس قابل کیا ہے کہ تم پُوری قیمت دیکر اسے خرید سکتی ہو۔ میں ضرورتمند ہوں، اسلئے قیمت لینے پر مجبور ہوں ورنہ تم جانتی ہو کہ میں نے کبھی اسکی پروا نہیں کی۔"

میرے یہ الفاظ سُن کر لکشمی یکایک سنبھل گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اسوقت کس قسم کے جذبات اسکے قلب میں موجزن ہیں۔ تاہم اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ اس کا جوش سرد پڑ گیا۔ اسکی آنکھوں میں اور چہرے پر برہمی، نفرت اور حقارت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے نہایت متانت سے کہا "کیا قیمت ہے تمہارے آغوش کی؟" میں سمجھا وار کاری لگا۔ دلمیں سوچا کہ اب کیا مانگوں۔ وہ ایک

ہیرے کی انگشتری پہنے ہوئے تھی۔ بہت بڑا اور تابناک ہیرا۔ میں جوہری نہیں تاہم میرا خیال تھا کہ اس ہیرے کی قیمت ہزار بارہ سو سے کم نہ ہوگی۔ انگشتری کی طرف اشارہ کرکے میں نے کہا "یہ انگوٹھی"۔ لکشمی نے فوراً انگوٹھی اپنی انگلی سے اُتار کر میرے سامنے پھینک دی میں نے اُسے اُٹھا کر پہن لیا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا لکشمی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُسے آغوش میں لینا چاہا اس نے زور سے میرے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور نہایت غضبناک آواز اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا "نکل جا یہاں سے، پاجی، کمینے!" اتنا کہکر اُس نے اپنے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ فوراً آیا۔ لکشمی نے اس سے کہا "شاہد صاحب کو ہوٹل پہونچا دو"۔ میں سر جھکا خاموش اسکے کمرہ سے نکل آیا۔ اس ذلت نے میرے جذباتِ غیرت کو تھوڑی دیر کے لئے برانگیختہ کیا۔ مگر دودھ کے اُبال کی طرح جلد ہی یہ عارضی طوفان فرو ہوگیا۔ منیجر کو میں نے کل واقعات سُنائے۔ اس نے پوری داستان سنکر بہت کچھ میری تسلی تشفی کی اور کہا کہ "بھیا خدا دراز دستی رساں ہے ایک در بند تو ستر در کھلے۔ خدا تمہیں زندہ سلامت رکھے لکشمی جیسی ہزاروں چھوکریاں تمہاری جوتی کی نوک پر سے قربان ہیں"۔ انگشتری دیکھکر وہ بے انتہا خوش ہوا اور کہا کہ پندرہ سو سے کم اس کی قیمت نہ ملیگی۔ اس خیال سے میرے بھی کچھ آنسو پُچھ گئے کہ خیر جو ہُوا سو ہُوا ایک معقول رقم تو ہاتھ آئی۔ اگلے دن ہم دونوں وہ انگشتری فروخت کرنے کے ارادہ سے ایک بڑے جوہری کی دکان پر گئے۔ بُڈھے جوہری نے انگشتری کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا پھر مسکرا کر بولا "بابو جی کسی نے خوب آپ کو بیوقوف بنایا۔ یہ تو امی ٹیشن (نقلی) ہے"۔

چند روز ہوئے میں کلکتہ گیا تھا۔ اُس شخص کو میں نے دیکھا جس کی شہرت ناک داستان سچی کہانی کے عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ دیکھکر کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص کسی زمانہ میں مردانہ حسن کا مجسمہ رہ چکا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ زرد رنگت، پچکے ہوئے گال۔ لاغر جسم، پریشان بال، جھاڑ جھنکاڑ کی طرح اُلجھے ہوئے میلے کچیلے کپڑے۔ شراب کے نشہ میں چور، ہوٹل کے برآمدہ میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ میرے ایک دوست نے جو واقفِ حال تھے اور خود اُسی کی زبانی اسکی رام کہانی سن چکے تھے، اسکے حالات زندگی مجھ سے بیان کئے اُسکو دیکھکر اور اسکی داستانِ حیات سن کر میرا دل لرز گیا۔ جہانتک واقعات و خیالات کا تعلق ہے میں نے مطلق تصرف نہیں کیا ہے۔ البتہ الفاظ میرے ہیں۔

پریم پجاری

دلچسپ اور پُر از معلومات کتابیں

اُردو ڈرامہ نگاری: سید بادشاہ حسین صاحب کی تصنیف ہے جس میں اُردو ڈرامہ کی تاریخ، اُردو کے مشہور ڈرامے اور تراجم وغیرہ کا مفصل حال درج ہے۔ قیمت ۸؍

صمدانی:۔ ناکارہ حیدرآبادی نے اس دلکش کتاب میں اپنے خاص طرز میں کئی عمدہ مضامین لکھے ہیں جو مکمل بھی ہیں اور مسلسل بھی۔ 〃 ۸؍

سودیشی ریل:۔ شوکت تھانوی کا یہ افسانہ انکی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اب علیحدہ مع ترجمے کے شائع ہوا ہے۔ پڑھنے کے لائق کہانی ہے۔ 〃 ۴؍

گناہ کی راتیں:۔ ایم اسلم صاحب کی لکھی ہوئی سات عبرتناک کہانیاں جن میں دکھایا ہے کہ عورت کس طرح اپنا گوہرِ عصمت ضائع کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ 〃 ۸؍

نغماتِ موت:۔ حجاب امتیاز علی صاحبہ کے لکھے ہوئے ادب پارے جن میں لطیف خیالات مترنم الفاظ میں ادا کئے گئے ہیں مؤثر اور دلکش۔ 〃 ۶؍

ادبِ زریں:۔ حجاب امتیاز علی صاحبہ کی دوسری تصنیف جس میں چھوٹے بے شمار مضامین شامل ہیں ادب لطیف کے شائقین کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ 〃 ۸؍

جوشِ فکر:۔ سلطان حیدر جوش کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ۔ سنجیدہ اور ظرافت آمیز مضامین لکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ 〃 ۸؍

شعلے:۔ پروفیسر احمد علی ایم اے کے افسانوں کا مجموعہ انہیں پڑھکر آپ میں زندگی کی حرارت پیدا ہو جائیگی۔ بالکل نئی طرز کے افسانے۔ 〃 ۴؍

دوشیزہ:۔ علمِ نوعی کی عام فہم کتاب، عورت کی فطرت اسکی ضروریات، اسکے جذبات واحساسات وغیرہ کو مفصل و مشرح بیان کیا گیا ہے۔ 〃 ۸؍

دیوانِ شمس تبریز:۔ عبدالمالک صاحب آروی نے ایک محققانہ مقدمہ لکھکر اس نسخے کو شائع کیا ہے۔ فارسی شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات کیلئے ایک خاص چیز۔ 〃 ۸؍

آئینۂ حسن:۔ جناب رسا ہمدانی ایم اے گیا کے مشہور شاعر ہیں۔ انکے کلام کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے۔ کلام عمدہ، تخیلات بلند، زبان شستہ۔ 〃 ۴؍

روحِ سیاست:۔ ابراہیم لنکن کا لکھا ہوا شہرۂ آفاق ڈرامہ۔ محمد عمر نور الٰہی صاحبان نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ رنگین سرورق۔ 〃 ۱۲؍

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ کھاری باؤلی دہلی

ہم اور سینما

شام بھری تھی، آواز آئی "جاجا، گاڑی جلدی لے آ"
ہم نے جانا، کام ضرورت ہے فوراً اٹھ کر پان بنایا
ایسے آئے، ہولے ہولے دل نے پکارا، جان ہو صدقا
ہے نہ ہے، ایسی جلدی کیا ہے جیسے کہیں ہو خزانہ ملتا!

ہاتھ کو پکڑا، موٹر بیٹھے آن کی آن میں، ہم تھے، اندھیرا
گھنٹے گذرے، گھڑیاں گذریں ہر ساعت اک سال تھی گویا
بارے شکر ہے، گھر کو پہنچے کتنا خوش تھا چہرہ کسی کا
اپنی خوشی تو اس لئے تھی بس پاس تھا اپنا من مکھ، پیارا
کس کو خبر، یہ ظلم بھی ہوگا گھر چل کر ہے رائے بھی دینا

آتے ہی پوچھا خوش ہو، ہوکر "فلم تھی کیسی، کیسا قصا؟"
"کیا کہنے، کیا لطف ہو جیسے کالی کوٹھڑی، اور کلکتا!"
جل کے کہا "کیا مطلب تیرا؟ پڑھ کے بھی ہو انسان، نہ طوطا"
"اب سے نہ لینگے ساتھ کبھی پھر یوں ہی اگر ہے خرچہ کرنا"
"آپ کا احساں، آپ کی منت آپ کا اپکار، آپ کی کرپا!"

خطرہ ہے کسی کا، اپنی منشا ورنہ کھیل کی کس کو تمنا
وہ تو، جلوہ تھا بھی کسی کا ورنہ گھٹ کر دم ہی نکلتا
ہم نے وہ دیکھا کھیل ہی نیارا جس کے آگے ہیچ ہے دنیا
اپنی فلم، اور اس کا تقابل! راجہ بھوج اور تیلی گڑوا!"
"ہم بھی تو دیکھیں، فلم وہ کیسی! ہے وہ کیا آکاش کا تارا!"

"جی، نہیں بخشیں، یہ نہیں منشا! آپ بھی اس میں لیں کچھ حصا!
جن کو پتلوں سے ہو چسکا اصلی فلم کا لطف انھیں کیا!
اس کا مزہ کچھ وہ ہی جانیں جن پہ پڑی ہو ایسی بپتا!
"ہم بھی تو جانیں، بپتا کیسی! کیسی فلم، اور کیسا قصا!
غیر برابر، اس کو مانیں حکم ہمارا جس نے ٹالا!"

"اچھا، لیجئے، بتائیں سب کچھ! یہ تو ہے، پر، انصاف نرالا!
غیر کی فلم کو پیسے خرچے اپنی فلم کو حکم چلایا!"
"واں تو دیکھی ہوں دو اک ٹپے یہ لے، سارا خرا لطہ تیرا!"

دیکھئے! وہ اک عورت آئی جس پہ ہے سارا زمانہ مرتا
کس نے اس کو کیا نہ سراہا جگ کی کھلیں نہ زبانیں کیا کیا!

(آنکھ میں جادو، منہ میں امرت لب پہ بجلی، رخ پر تڑکا
گال پہ تیرے زلف، کہ تیرے نور کے چشمے سانپ کا بچا
سینہ بھرا، اور ابھرا جوبن طور پہ دو ننھے سے موسا
رنگ و قامت باہم جیسے چاند کی کرنیں ہوں مل یکتا
بات بہ شان اسم اعظم چال بہ کام قسم عیسا
ایک سراپا حسن مجسم ایک سراپا سحر کا پتلا")

ہریا ساڑی پہنی، جیسے سبزہ پہ، شام کی دھوپ کا جلوا
منہ پر شوخی، دل میں عفت باطن موتی، ظاہر مونگا
اتنا غرور حسن و خوبی ہفت اقلیم کی گویا ملکا
لاکھ تمنا جس کے صدقے سینکڑوں دل تھے جس کا تحفا
دل کیا تھا اک ادنیٰ غنچہ توڑا، مسلا، پھینکا، روندا
مست خودی و محو عشرت رنج دی، نے فکر فردا
اونچا گھرانا، عالی گوہر علم و فضل و سیرت حسنا
عزت جس کی مانے راجہ دولت، جس کا ہو نہ احصا

اک دن، شام جو نکلی تفریح باغ سا منظر، وقت سہانا
اس پہ غضب، اک ظالم دیکھا زیر نظر تھا جس کی پرچا
آنکھ جو ٹھٹکی، دل کیوں دھڑکا "ذرا سے" رکا کیوں موٹر پہیا
جانے، اس کے سامنے یہ تھی یا پھر اس کے سامنے وہ تھا
نظریں زور سے چار ہوئیں، یا دل کو پایا دو صد پارا
شرم نے باگ نظر کی موڑی واپس لوٹی، موٹر پھیرا

وہ آگے اور پیچھے نظر تھی   چلتی تھی گویا، رستہ الٹا
مطلب سعدی دیگر، گو تھا   پھولوں کے نظارے کا بہانا
گھر پہنچی کچھ ایسا پایا   جیسے جواری کھوتا آیا
روز کی تفریح داخلِ ایماں   تفریح تھی یا فرضِ خدا تھا!
وہ آیا، اور یہ بھی پہنچی   اسی طرح اک عرصہ گذرا
جتنا بھلایا، وقت رفتہ،   یاد کو اتنا بڑھتے پایا
دید میں گذرے دل کی خوش خرّم   اُوٹ ہوئی، اور ظالم مچلا
کتنا ڈرایا، کتنا منایا   پھر بھی وہی ضد اپنی اکھڑا!
کھلے کسی کا، لگا نے کسی کا   بھاڑ میں جائے ایسا کینا!
یہ ہے اسکو بتائے کیونکر   غیر پہ کوئی یوں نہیں مرتا!
جیسے جیسے دن تھے گذرتے   دل کا مرض تھا اتنا بڑھتا
دل کی دھڑکن دیکھی، دیکھی   شوق کا گھٹنا اٹھتا شعلا
اٹھتے، بیٹھے، جاگے، سوئے   چین کسی کل، تھا نہیں پڑتا
حال پریشاں ہر دم، کوئی   جیسے بھوت کے خواب سے اٹھا
بات سے نفرت، ملنے سے وحشت   وہ تھی، اور اک تنہا کونا
حسن رخ دیکھو ایک ہی جلوہ   جلوہ تھا، یا نظر کا دھوکا
وہ جو نہ آیا، نیند نہ آئی   آہ کی تیغ سے رات کو کاٹا
جتنا کرب تھا، اتنی لذت   جتنا درد تھا، اتنا چسکا
اتنا بڑھا یا سوزِ دروں نے   دل پہ ہوا انگارے کا دھوکا
پورا کو جیسے جگنو کا ست   کس کو سنائے دل کی بپتا
اتنا سنایا، اتنا ستایا   تابِ ضبط، نہ سہنے کا یرتا
درد ہی کو خود جسم سا آیا   مونسِ غم جب کوئی نہ پایا
آنکھ میں آنسو ڈبڈب آئے   دل کا بڑھتا سوز بجھایا
حسن پڑا ماند عشق کے آگے   ناز کو سارے نیاز نے لوٹا
ذہن میں ہمت، دل میں دھڑکا   منہ پر بات، نہ کہنے کا یارا
یارب، وہ! اور اتنی بے بس   کیسی عصیاں کا ہے یہ بدلا!

حال ادھر غیر اس کا اتنا   اور ادھر وہ اتنا بگانا
انساں تھا، یا کوئی فرشتہ   تھا بھی دل؟ یا برف کا ٹکڑا؟
دل ہے جو اس کی کیوں نہیں سنتا   مرد کے، یا پھر، دل نہیں ہوتا!
دل تھا اگرچہ اتنا کڑھتا   روز کا جانا پہ نہیں چھوٹا
روز نیا اک وارِ محبت   روز نیا دل عقل کا جھگڑا
عقل کا منشا شرم و عزت   دل کا کہنا "تو اور پیارا"
دل نے آخر عقل کو جیتا   کتنا دانا! کتنا سیانا!
آنکھ پہ عقل کی پردہ ڈالا   اپنا اندھا راج چلایا
کل کی لاج کو خاک میں جھونکا   نام کے نام و ننگ کو میٹا
اپنے پرائے طعنے، تشنے   سب کو بلا پر اپنی وارا
جی میں آئی، چل کر کہہ دیں   لاج نے پھر بھی دامن تھاما
لکھ آخر، اک نامہ بھیجا   واں سے جواب اچٹتا آیا
کتنے نامے، کتنے پرچے   کتنی گذارش، کتنی تمنا
کا ہے حرف، اور کا ہی جھڑکی   پھر بھی یہ دل، اور انا رہا
عزت نہ ہوئی، شرم کو مارا   خود جا جا کر، ہارے، منایا
کتنا ضدی! کتنا ستمگر   کتنا وہمی، گماں کا بندا
مان کے بھی ہیں شرطیں لاکھوں   اک اک پہ اقرار کرایا

"جو کریں گے ظلم کریں گے!"   "آپ کی مرضی، اپنی منت!"
"سب سے انوکھی اپنی طبیعت!"   "اس کا علم ہے ہم کو پورا!"
"غنا غنا کا ساتھ ہو کیونکر!"   "ان میں تو ہے بس فرق صفر کا!"
"اس عزت کے ہم نہیں قابل"   "دھن کا عزیز ہے دل کا شہنشا!"
"مان لو، ہم عیاش بہت ہیں!"   "آپ کی خاطر سب ہی گوارا!"
"پھر بھی وفا کا دعویٰ! کب تک؟"   "جان نے جب تک ساتھ نہ چھوڑا!"
"اس کا یقیں پر آئے کیسے؟"   "سر ہے جو یہ قدموں پر رکھا!"
اتنے جتن اور وعدے لیکے   قدموں سے سر کو جلد اٹھایا
دیکھا پھر اک خاص نظر سے   "پیاری" کہا، اور گلے لگایا،
وعدہ کیا "ملنے کا دائم   اور کہا "ہوں تیرا عفیفا!"

"پیاری، میں! اور قسمت میری!   واری خدایا! صدقے مولا!
وعدہ! اور آملنے کا دائم   اور کہا "ہوں تیرا عفیفا!"
بول ہیں یہ! یا امرت بوندیں!   ہوش ہے یہ، یا میٹھا سپنا!
کیسی قسمت! کیسا مقدر!   کیسا بخت! اور کیسا نصیبا!

لیجے! پوں، پوں! موٹر آئی!   موٹر کیا! وہ خود ہی آیا!
ناز کھیوتا، جیون سنگی   دل کی جوت، اور من کا اجالا
کتنا حسیں، اور کتنا پیارا   کیسا نرالا، کیسا بانکا!
کتنی رسیلی آنکھیں، پریمی!   پھول میں جیسے میٹھا بھونرا!
گال پہ گورے سرخی، جیسے   ہولی کھیلے ننھا بچا

کتنا بہادر ابتر، نہ نبغ　　دل کے جیسے شیر کو مارا!
غم کی فوج نے آن جو گھیرا　　تنہا مار کے ہم کو بچایا
دیر سے آکر کس نے رُلایا　　ہاتھ سے کس نے آنسو پونچھا
کس نے نظر سے پھول جھڑا ئے　　ہنس کر ہم کو کس نے ہنسایا
پیار کی باتیں کس نے سنائیں　　دل کی لگی کو کس نے بجھایا
وہ نہیں یعنی نورِ نظر جب　　جگ میں نہ ہو کیوں سارا اندھیرا
ساری خوبی، ایک خرابی　　ظالم اتنا جتنا اچھا
ظلم بھی اچھا، وہ جو اچھا　　اس کے لئے ہی سب کچھ زیبا
کتنے خوف سے اس کو سنبھالا　　جیسے ہتیلی کا ہو پھپولا
کپڑے اُتارے، سکھ سے بٹھایا　　ہاتھ بھی جوڑے، کی بھی پوجا
اتنا پوجا، اتنا پوجا　　خود دیوتا کو بندہ بنایا
پھر تو پریم کے غنچے چٹکے　　غم کے جہاں کو خلد بنایا
دکھ کی کہانی سکھ سے بدلی　　اسی خوشی میں سُنئے گانا:

کتنے چاؤ سے تو ہے سنوارا دل　　نین کا آئینہ، پلکوں کا کنگھا
زلفوں کی کلی، اشکوں کی مالا　　پریم کی خوشبو، دل کا پھاہا
تم بن اجڑے ساری نگری　　آؤ، آؤ، من کے بسیا!
نین کی موٹر بیٹھے دکھاؤں　　کتنی پیاری خیال کی دُنیا!
دُکھ میں جہاں ہو عیش کی لذت　　اک اک سال بھی پل ہے جہاں کا
تم بن اُجڑے ساری نگری　　آؤ، آؤ، من کے بسیا!
پیت کی چوٹی سب سے اونچی　　جس پہ ہمارا دل ہو دھڑکتا
پھر تم آؤ، گود میں جھیلو　　دل ہو دھڑکتا پھر سے اُچھلتا
تم بن اُجڑے ساری نگری　　آؤ، آؤ، من کے بسیا!
نین کا ساگر بیٹھے کنارے　　تم جو نہ آؤ اشکوں سے کھیلا
ہجر کا مارا تیرہ کسی نے　　ہم نے سمجھ کر تار اٹھایا
تم بن اُجڑے ساری نگری　　آؤ، آؤ، من کے بسیا!
دیکھے پرندی، چوں، چوں کرتے　　پیار سے جن کا دل تھا اُمنڈتا
دھیان کے جادو گر سے مدد لی　　ہم نے بھی اپنے پی کو بُلایا

تم بن اُجڑے ساری نگری　　آؤ، آؤ، من کے بسیا!
ہم کو نہیں دُنیا سے غرض کچھ　　سب سے الگ اک اپنا ہو بسنا
نیک سے، بد سے پاک ہو دُنیا　　پریم کی جنت کا ہو نقشا!
تم بن اُجڑے ساری نگری　　آؤ، آؤ، من کے بسیا
ہجر میں ہم کو مرتے نہ چھوڑیں　　مار کے جاں دیں آپ خدارا!
جینا ہو وہ، سو جینے سے بڑھکر　　جان کو قدموں پر جو وارا!
تم بن اُجڑے ساری نگری　　آؤ، آؤ، من کے بسیا!

دیکھا! کتنا اچھا گانا　　کیسا گیت، اور کیسا گلا تھا!
ہے یہ آنکھ میں آنسو ایکیوں!　　اس میں پایا اتنا اثر کیا!
ہنس کے کہا پھر "یوں ہی کچھ تھا　　ہم بھی سُنیں، کیا نام ہے اسکا!"
ہم نے کہا ہے "عشق کی دُنیا"!　　بولے "فلم ہے یہ، یا قصّا؟"
فلم ہے، خاکہ، قصّہ، پردہ　　برق ہے، گھر ہی جوت، اندھیرا
سب کچھ ہی یاں دلکش ساماں　　چاہیئے واں، اک دیدۂ بینا
عشق کی برق، اور دل کا گھر ہے　　وصل ہی جوت اور ہجر اندھیرا
فلم ہے اک تصویر کسی کی　　جس کا منظر سینہ کا پردا
جس کا ٹکٹ، اک نظرِ محبت　　جس کا تماشا تنہا، اِکّا
زر کی نہیں یاں قدر کسی دن　　لیجیے، آپ کا کھوٹا پیسا

سینہ سے جو دامن کو ہٹایا　　"کل اک موتی کی مالا
جس میں تھی وہ تصویر کسی کی　　فلم تھی جو، اور اپنی دُنیا
اب نہ بنائیں اس کے آگے　　فلم ہے کس کی، کس کا نقشا!
بات نہیں یہ کہنے کی، سمجھیں　　خود ہی اگر ہے عقل کا دعوا،
ایسے ریجھے اتنا سُن کر　　مہر کا جیسے دریا اُمڈا
مست سی نظریں پلکیں، اُٹھکر　　ہاتھوں کا ہار گلے میں آیا
ختم ہوئیں جب باتیں نظر کی　　ہنستے ہوئے پھر یہ فرمایا
"عقل کا ہو یاں کس کو دعویٰ　　سحرِ عشق جو کر دے ابلا"
"ہم کیا جانیں ہوگی کسی کی　　نیچے تو ہے' ہاں، شاکر لکھا!"

سیّد علی شاکر ایم۔ اے

توجّہ طلب

(۱) خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر کیا کیجئے۔ (۲) جواب طلب امور کیلئے کارڈ یا لفافہ بھیجا کیجئے۔ مضامین کی واپسی کیلئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔　　(منیجر ساقی دہلی)

سادگی

زندگی کی مسرتیں حقیقت میں اُسی کو حاصل ہیں جس نے طرزِ معاشرت میں اِعتدال قائم رکھا اور سادگی کو اپنا مسلک قرار دیا ہو، ضروریات اور لوازمات زندگی میں ہمیشہ سادگی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اِس سے رفتہ رفتہ انسان کے خیالات خودبخود پاکیزہ ہونے لگتے ہیں ۔ زیب وزینت، آرائش وزیبائش اور تہذیب جدید کے نئے نئے طریقوں میں جو وقت برباد ہوتا ہے ۔ معاشرت میں سادگی اختیار کرنے والے ان اوقات کو دوسرے مُفید اور ضروری کاموں میں صرف کر سکتے ہیں انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہوتا ہے ۔ بشرطیکہ ہم اُسکی قدر وقیمت کرنا سیکھیں ۔ اور اُس کی اہمیت کو محسوس کریں ۔

ہم کو فطرتاً سادہ معاشرت کا پابند ہونا چاہیئے ۔ مگر ہم پر اندھی تقلید کا مادہ اِس قدر غالب ہے کہ بھول کر بھی ہم اُس مسلک کو اختیار کرنا نہیں چاہتے جس سے زندگی کی حقیقی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں جب تک ہم اپنی معاشرت میں سادگی نہ پیدا کریں ۔ روپیہ اور وقت برباد کرنیوالے زیب وزینت کے طریقوں اور نِت نئے فیشنوں سے احتراز نہ کریں ، ہمیں حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی ۔

وہ دولت مند اور متموّل حضرات جن کو ساری دنیا کی نعمتیں ، عیش وعشرت، زیب وزینت ، اور آرائش وزیبائش کے اسباب حاصل ہیں کیا وہ واقعی ایسے قانع ہیں جیسا کہ انہیں ہونا چاہیئے ؟ غور کرنیسے نہیں تو خود اُنہیں سے دریافت کر کے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں آخر اسکے اسباب کیا ہیں ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جس قدر نعمتیں اُنکو زیادہ میسر آتی جائینگی ۔ اُسی قدر اُنکے تکلفات بڑھتے جائیں گے جتنی انکی خواہشیں پوری ہوتی جائینگی اُن سے دُونی پیدا ہوتی رہینگی ۔ حقیقت میں زندگی کا لُطف اُسی کو حاصل ہے ۔ جو معاشرت میں سادہ ہو ۔ اِس قدر سادگی کی بھی ضرورت نہیں کہ مقدور ہوتے ہوئے پھٹے کپڑے پہنے ، حیثیت ہو اچھا نہ کھائے اور فراغت ہو مگر تکلیف اُٹھائے ۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اِرتقائے انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو واضح ہوگا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ سادگی سے نظر پوشی کی گئی ۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت انسان غاروں اور درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے ، ہر طرف نیچر کی حکومت تھی ، یہ آزاد میدانی زندگی صحت بخش ، طاقت افزا اور بے لوث ہونیکے علاوہ ، اسمیں فکر ، رنج ، تکلیف اور تجارت کا کہیں نام ونشان نہ تھا ۔ نہ اس کثرت سے بیماریاں آتی تھیں ۔ نہ قحط پڑتے تھے ، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں ، نہ آزادی کے لئے کوششیں ، صرف آزادی اور سادگی کی ہر طرف حکومت تھی ، خیالات سادہ تھے ، مگر وسیع اور عمیق ، نہ وہ ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں اُلجھے ہوئے ، اسکے بعد آگ وجود میں آئی جس نے ہمارے تعلقات کو نیچر سے کامل طور پر جُدا کر دیا ۔ اس آگ کے معلوم ہونیکے دن سے تہذیب وتمدن کی تاریخ شروع ہوتی ہے ۔ کیونکہ اس وقت سے انسان کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا نتیجہ یہ ہُوا کہ ضروریات بیحد بڑھ گئیں اور ساری برکاتِ اوّلین غائب ہوگئیں ۔

اِس وقت ہم نے جو طرزِ معاشرت اختیار کر رکھی ہے اس کا اصول سادگی نہیں بلکہ سرتاپا تکلف ہی تکلف ہو ۔ سادگی سے قطعی جُدائی ہمارا شعار ہوگیا ہے ۔ اب ہمارا مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو جس حالت میں پائیں ، اُسے اُسکے برعکس بنادیں ۔

اگر ہم معاشرت میں سادگی پسند کریں تو اپنی آدھی سے زیادہ مشکلات پر غالب آسکتے ہیں ، سادہ عادات ، سادہ خیالات ، سادہ مشاغل تفریح سادہ ضروریاتِ زندگی ، غرض کہ ہماری معاشرت میں سادگی کا دور دورہ ہو پھر دیکھئے دُنیا مع اپنے سارے تکلفات کے ہم کو مغلوب نہیں کر سکتی ۔ کیونکہ سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے ۔

ہم نے اکثر بچوں کو سڑک کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہے ۔ وہ اپنی اس حالت میں بہت زیادہ خوش وخُرّم دکھائی دیتے ہیں اتنا زیادہ جتنا کہ ہم اپنے بیش قیمت لباس میں کبھی نہیں ہوتے ، ہماری تہذیب اُنہیں گندہ کہتی ہے ۔ مگر یہ مسئلہ غور طلب رہتا ہو کہ آیا ہم زیادہ گندے ہیں یا وہ ؟ جُوں جُوں وقت گزرتا جاتا ہے ، بچہ ہماری تہذیب اور معاشرت میں گرفتار ہوتا جاتا ہے ۔ یہانتک کہ وہ اپنے گذشتہ مشاغل تفریح کو عہدِ طفلی کی لغویات پر محمول کرتا ہے ، سادہ اور حقیقی مسرت جو اُسکے دلمیں اُسکے اردگرد کی چیزوں سے پیدا ہوتی تھی کم ہونا شروع ہوتی ہے ، اور تھیٹر ، سینما ، راگ ورنگ ، رقص وسرود اور ایسے ہی دوسرے تہذیبی تکلفانہ مشاغل تفریح میں مسرت حاصل کرتا ہے ۔ غرض کہ اسکی معاشرت میں سادگی کے عوض تدریج

تکلفات جگہ پاتے ہیں۔ اور سادہ معاشرت کی خوبیاں اور آزادیاں تہذیب و تمدن کے بندھنوں میں مقید ہو جاتی ہیں۔

سادہ معاشرت کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں۔ گھر کی سادگی، لباس کی سادگی، عادات کی سادگی، رسم و رواج اور دیگر ضروریات زندگی میں سادگی، اور غذا میں سادگی وغیرہ۔

گھر کی سادگی سے یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے مکانوں کو سادہ مگر صاف ستھرا رکھیں۔ جن مکانوں میں فضول چیزیں بھری رہتی ہیں، انکے مکینوں کی جان ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتی ہے، شب و روز اُن کو ان چیزوں کی ترتیب اور تہذیب کی فکر لگی رہتی ہے اور ان کا سارا فرصت کا وقت ان غیر ضروری چیزوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے۔ اوّل اوّل کچھ عرصہ تک آرائش و صفائی کا شوق رہتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ شوق سرد پڑ جاتا ہے۔ جو چیزیں روزمرہ استعمال میں نہیں آتیں۔ اُن پر گرد و غبار کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ جو اشیاء اسلئے خریدی گئیں تھیں۔ کہ اُن سے گھر کو آراستہ کیا جائے اب اُنہی آرائشی چیزوں نے گھر کو کباڑی کی دوکان بنا دیا ہے۔ اور وہی آرائش و زیبائش کے عوض مکان کی بدنمائی کا باعث ہو رہی ہیں۔

آج کل اکثر حضرات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ خواہ ضرورت ہو نہ ہو، نیلاموں سے بغیر سوچے سمجھے بہت سی بیکار اور فضول چیزیں لاکر جمع کر لیتے ہیں۔ اور دوسروں سے مقابلے کے شوق میں بازار کی قیمت سے زیادہ قیمت پر سامان خریدتے ہیں۔ چند روز کے بعد جب طبیعت ان چیزوں سے سیر ہو جاتی ہے۔ اور اُنکے بے ضرورت ہونے کا احساس ہوتا ہے تو پھر نیلام میں بھیج دیتے ہیں۔ اسی خرید و فروخت میں جو نقصان ہوتا ہے اُس کا اندازہ وہی لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں جو اس مرض میں مبتلا ہیں۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ ناظرین ساقی کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

ایک صاحب کو جن کے والد کافی جائداد اور دولت چھوڑ گئے تھے فرنیچر اور دوسری آرائشی چیزیں خریدنے کا شوق ہوا۔ ایکدن آپ کسی نیلام میں رونق افروز ہوئے اور اندھا دھند سامان خریدنے لگے، نیلامی نے جو یہ رنگ دیکھا، طرح طرح سے ان کو اُکسانا شروع کیا، اگر اُنہوں نے ایک ہی وضع کی دو چیزوں میں سے ایک چیز خرید لی تو اُنہیں مخاطب کر کے کہدیا "جوڑی بگڑتی ہے" اگر کبھی کسی چیز کو زیادہ بولی کی وجہ سے چھوڑ دینا چاہا تو ذرا درغلا دیا کہ "یہ چیز تو آپ ہی کے لائق ہے، جہاں اتنا سامان خریدا اسکو بھی خرید لیجئے کہ دولت خانہ کی آرائش ہو" الغرض کہ اسطرح ہمارے ناعاقبت اندیش دوست نے تین چار ہزار کا سامان خرید لیا۔ گھر تھا پرانی وضع کا۔ اُس میں یہ طرز جدید کا فرنیچر اور اسباب آرائش کیا بھلا لگتا۔ چونکہ مکان کرایہ کا تھا۔ اس لئے دوست احباب کی رائے ہوئی کہ گھر بدلنا چاہیئے۔ فوراً اس مکان کو خیرباد کہدیا گیا۔ اس منتقلی میں بہت سارا چینی کانچ کا سامان ٹوٹ پھوٹ گیا۔ میز کرسیوں اور الماریوں کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ الغرض یہ سارے اسباب آرائش کے ساتھ جس مکان میں منتقل ہوئے تھے وہ بھی کچھ قرینے کا نہیں نکلا۔ جب یہ آرائشی چیزیں اسمیں سجائی گئیں تو بعض احباب کی رائے ہوئی کہ اس نئے طرز فرنیچر اور سامان آرائش کے لئے یہ مکان بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں اس مکان کو بھی وداع کیا گیا اور ایک مکان معقول کرایہ پر لیا گیا۔ حالانکہ اب بھی سرمایہ اس قدر موجود تھا کہ ایک نہایت اچھا مکان بنا بنایا خریدا جا سکتا تھا۔ یہ مکان بھی بیش قیمت فرنیچر کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ مکانوں کی اس ردو بدل کی وجہ سے جو سامان ناکارہ ہو گیا اُس کو جب نیلام میں بھجوایا گیا تو آدھی سے بھی کم قیمت پر فروخت ہوا اور اس قیمت کا بھی کچھ حصہ نیلامی کے کمیشن کی نذر ہو گیا اور اس تقریب میں ہمارے دوست کو گھر بدلنے کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

مکان کی طرح ہمارا لباس بھی سادہ مگر صاف ستھرا ہونا چاہیئے۔ مرغ زریں بنے رہنے سے ہمکو بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، جو لوگ قیمتی لباس استعمال کرتے ہیں اُن کو ہر وقت اپنے لباس کو ہتھیلی کے پھپھولے کی طرح حفاظت سے رکھنا پڑتا ہے۔ جہاں کسی نے ذرا ہاتھ لگایا۔ ان کا دل دھڑک گیا۔ ہم کو چاہیئے کہ زرق برق لباس کی قید میں خود کو نہ پھنسائیں۔ لباس ایسا استعمال کرنا چاہیئے کہ تن پوشی کے علاوہ تراش خراش میں بھی اچھا ہو، تاکہ دیکھنے والوں کی نگاہوں کو بھلا معلوم ہو۔

اسکی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں درجنوں سوٹ، شیروانیاں، شوز وغیرہ ہوں ان اشیاء کی افراط انکی دیکھ بھال سے ہمیں بے نیاز کر دیتی ہے اور یہ قیمتی چیزیں برسوں کام دینے کے عوض مہینوں میں ناکارہ اور ناقابل استعمال ہو جاتی ہیں۔ شوز اتنے ہوتے ہیں کہ انکی صفائی اور پالش کے لئے ہمارے نوکر کو وقت نہیں ملتا، شکستہ چلے جا رہے ہیں۔ نوکر صاحب اگر ذرا چالکدست ہیں تو ہر مہینہ ایک آدھ چیز کم ہو رہی ہے، تعداد کی کثرت میں یاد بھی نہیں رہتا کہ کتنی چیزیں خریدی گئی تھیں اور اب کتنی ہیں۔ غرضکہ ہر چیز کی افراط ہر طرح کے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

لباس میں فیشن کی لعنتوں نے شریک ہو کر اس کو انسانی صحت کے لئے مختلف طریقوں سے مضرت رساں بنا دیا ہے۔ فیشن کی نظر فریب اختراعات سے ہماری صحت اور خوش حالی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ فیشنیبل

لباس کی خاطر ہم اپنی دوسری اہم ضروریاتِ زندگی سے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو محروم رکھتے ہیں۔

خیالات کی سادگی بھی بڑی چیز ہے جس کو یہ حاصل ہو اسکو پھر خوشی مسرت اور آزادی ہی آزادی ہے بعض حضرات خواہ مخواہ اپنے دماغ کو بے جا خواہشات کا آماجگاہ بنالیتے ہیں۔ انکی خواہشیں اس قدر بلند اور لامتناہی ہوتی ہیں کہ ان کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہونے پاتا ایسی موہوم امیدوں کے خیالات انکے دل و دماغ پر حاوی ہوجاتے ہیں کہ ان کا پورا ہونا اس دنیا میں قرینِ قیاس نہیں ہوتا، وہ اُن آسائشوں اور مسرتوں کے حاصل کرنیکا خیال کرتے ہیں جن کے حصول کی امید خیال خام ہوتی ہے "دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست" کا مقولہ ان لوگوں پر صادق آتا ہے فضول اور لایعنی خواہشوں کے ہوائی قلعے نہ بنانا چاہیئے۔ سادگی اسی میں ہے کہ ہم ایسی خواہشوں کے حاصل کرنے کی فکر کریں جن کا حصول ممکن ہو اور جو ہمارے اور ہمارے ابنائے جنس کے لئے مفید ہوسکیں۔ ایسے خیال اور اصول کو ہم اپنا رہبر بنائیں جو ہماری زندگی کے لئے مفید اور ضروری ہوں۔ زندگی کو فضولیات اور خرافات سے آزاد رکھنا چاہیئے۔

عادت کی سادگی کا مطلب یہ کہ ہم اپنی عادات و خصائل میں سادگی اختیار کریں۔ سادہ عادتیں ہماری زندگی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کرتی ہیں اور ہماری معاشرت کو کم خرچ بالانشین بناتی ہیں۔ عہدِ طفلی میں جو عادتیں گھر کرلیتی ہیں وہ تادمِ آخر برابر قائم رہتی ہیں۔ بچوں کی عادتوں کو سنوارنے اور اُن میں صلاحیت پیدا کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر ہماری خواتین کے سر ہے کیونکہ ماں کی گود بچہ کا پہلا مکتب ہے، اور اگر اس مکتب میں وہ بُری عادتیں سیکھ لے اور یہ بُری خصلتیں اس میں راسخ ہوجائیں تو پھر انکی اصلاح دشوار ہی نہیں بلکہ تقریبًا ناممکن ہوجاتی ہے۔

ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ بچوں میں ایسی سادہ عادتیں پیدا کرائیں جو انکی زندگی کے نظام میں آسانیاں مہیا کریں، اور انکی تکلفانہ معاشرت کی خاردار راہوں اور دشوار گزر گاہوں کو صاف اور ہموار بنادیں۔ بچوں میں فطرتًا ہٹ اور ضد کا مادہ بدرجہ اتم ہوتا ہے اگر عہدِ طفلی میں اسکی روک تھام اور اصلاح نہیں کی گئی تو انکی آئندہ زندگی خود انکے لئے باعثِ عذاب اور تکلیف دہ ہوجاتی ہے۔ انکے رگ و ریشہ میں خود پسندی اور انانیت سرایت کرجاتی ہے۔ انکی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انکی ہر خواہش اور ہر آرزو کسی طرح پوری ہو۔ خواہ اسمیں انکے والدین اور متعلقین کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

ہماری خواتین کو چاہیئے کہ بچوں میں ابتدا ہی سے سادہ مگر صاف ستھرا لباس اور سادہ زود ہضم غذا استعمال کرنے کی خو ڈالیں قیمتی لباس اور مُرغن غذائیں انکے دماغ اور انکے نظامِ جسمانی کو تباہ و برباد کردیتی ہیں۔ ہماری بہنیں بچوں کی بُری عادتوں کو یہ کہکر ٹال جاتی اور برداشت کرلیتی ہیں کہ ابھی تو بچہ ہے۔

"آتے آتے آئیگا اسکو خیال"

جب سمجھ آجائیگی تو خود ہی یہ عادتیں چھوڑ دیگا مگر جب بچہ میں یہ عادتیں راسخ ہوجاتی ہیں تو پھر ان کا چھوٹنا ایک طرف۔ بلکہ جہاں صرف چند عادتیں خراب تھیں وہاں نئی نئی پیدا ہوجاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی ہی بربادی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اپنے گھر اپنے خاندان اپنے دوست احباب اور اپنے ملک و قوم کے لئے بھی اس کا وجود تباہ کن اور باعثِ ننگ و عار ثابت ہوتا ہے اور آخر میں وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔

بے جا لاڈ پیار اور ناز و نعم میں پلنے والے بچے دنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے، ہماری بعض بہنیں بچوں کو ضرورت سے زیادہ اہم بنا دیتی ہیں بچوں کی پیدائش کوئی عجیب و غریب بات نہیں۔ پھر کیا وجہ ہو کہ ہم انکی پرستش کریں۔ انکی ہر ادا اور ہر حرکت پر آمین کہیں اور اُن کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ تصور کریں۔ ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو اپنے لئے نہیں بلکہ دنیا کے لئے اور اپنے ملک و قوم کے لئے تیار کریں۔

غذا کی سادگی سے یہ مُراد ہے کہ غذا مُرغن اور محرّک نہ کھائیں۔ ہمارے ملک کی گرم آب و ہوا کے مدِ نظر ہمارے لئے مُفید نہیں ہوسکتیں۔ مُرغن غذائیں جسم میں چربی پیدا کرکے جسم کو فربہ اور بھدا بنادیتی ہیں۔ تازہ دُودھ، روٹی، مکھن، انڈے، مچھلی وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے۔ گوشت پر ترکاریوں اور تازہ پھلوں کو ترجیح دینی چاہیئے۔ آج کل چاء کے استعمال کا رواج بہت ترقی پر ہے، ہر گلی کوچے میں چاء خانوں کی افراط ہے۔ یہ چاء خانے جن پر نام نہاد ہوٹل اور رسٹوران کے خوشنما سائین بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں اپنے اندر اقسام اقسام کی گندگیاں رکھتے ہیں۔ بڑی حیرت ان حضرات کے ذوقِ خورد و نوش پر ہوتی ہے جو ایسے گندہ مقامات پر چاء کی پیالیاں اُڑاتے گپ شپ میں گھنٹوں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ ضیافتِ شکم کے ساتھ ساتھ اُن کی ضیافتِ سمع کے بھی کچھ سامان فراہم کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس بھول بھلیوں میں پھنس کر نہ انہیں گھر کی یاد ستائے، اور نہ زندگی کی دوسری مصروفیات کا خیال آئے، نہ صرف صحت بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہاں کی فضا نہایت مکدر رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چاء کی یوروپین کمپنیوں نے جو ہندوستان چاء کی تجارت کرتی ہیں۔ چاء کی فروخت کو ترقی دینے کیلئے ایک مشترک بورڈ قائم کرلیا ہے،

جواقسام کے طریقوں سے پبلک کو چاء کی خوبیوں پر مائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ سرد ممالک میں اگر چاء ضروریات زندگی میں شریک کرلی جائے تو مقام تعجب نہیں۔ لیکن ہندوستان جیسے گرم ملک میں چاء کا استعمال قابل ستائش نہیں ہو سکتا بلکہ ایک حد تک مضرت۔ سال میں چاء میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ جہاں وہ تکان دور کرتی ہے وہاں اُن لوگوں کو جن کے گردے کمزور ہیں سخت نقصان پہونچاتی ہے۔ بعض حضرات چاء کو غذا کا اہم جزو سمجھتے ہیں، اور اس کو غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر چاء کا استعمال ناگزیر ہی ہے تو اسکو ہلکی بنانا چاہئیے اور دن میں دو وقت سے زیادہ نہ پینا چاہئیے۔ غرض کہ ہماری غذا سادہ مگر کافی اور مختلف قسم کی ہونی چاہیئے۔ روزمرہ ایک ہی قسم کی غذا کا استعمال اشتہا کو کم کردیتا ہے۔

توہمات اور فضول رسم ورواج بھی ہماری معاشرت میں سادگی قائم نہیں رہنے دیتے۔ غیر ضروری اور بیجا رسوم کی پابندیوں میں ہم بہت بے دردی سے روپیہ صرف کرتے ہیں۔ خوشی اور غمی کی سینکڑوں تقاریب اور موقعوں پر دولت کا اندھا دھند اسراف روا رکھا جاتا ہے۔ اگر کچھ پاس نہ ہو تو قرض لے کر ان لغویات اور خرافات کو پورا کیا جاتا ہے۔ ہماری معاشرت میں بیہودہ رسم ورواج نے یہ بھونڈے داغ دھبے نہایت بدنما ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کی سادگی کو برباد کرنیکے علاوہ ہماری دولت اور اخلاق کو بھی تباہ کررہے ہیں۔ ان فضول رسم ورواج کی پابندیوں نے خاندان کے خاندان تباہ کردیئے ہیں اور آئے دن ہماری دولت غیر اقوام کے قبضہ میں چلی جارہی ہے۔ ہماری روز افزوں مفلسی کے سدباب کے لئے ہماری معاشرت کے یہ رسم ورواج بڑی حد تک اصلاح طلب ہیں۔

ان فضول رسم ورواج اور توہمات کی اصلاح کا ہماری معزز خواتین سے زیادہ تعلق ہے۔ کیونکہ وہی ان لغویات میں جی کھول کر حصہ لیتی ہیں خوشی اور غمی کے موقعوں پر وہ ان مذموم رسوم کی اس حد تک پابند ہوگئی ہیں کہ ان کو صرف اپنی معاشرت ہی کا نہیں بلکہ اپنے مذہب اور قومیت کا بھی ایک اہم جزو سمجھتی ہیں۔ ان کی توہم پرستی نے ہمارے بھائیوں کو ان بیہودہ رسوم کا پابند کردیا ہے۔ اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹیوں کی خوشی کی خاطر مردوں نے بھی خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے کبھی مخالفت کرتے بھی ہیں تو دبی زبان سے، مگر نازک اصرار قوی "انکار" پر غالب آجاتا ہے۔ اور پھر وہی ہوتا ہے جو "صنف نازک" کے نازک مگر توہم پرست دل ودماغ میں لیا ہوا ہے اور وہ برملا کہتی ہیں۔

"ہم وہی آخر کریں گے جو ہمارے دل میں ہے"

غرض کہ ہماری معاشرت کی اصلاح اور اسمیں سادگی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر دو صنف متفق ومتحد ہوکر اس طرف توجہ کریں اور اپنی اصلاح کی مسلسل کوشش کرتے جائیں۔ تاکہ ہماری معاشرت میں اعتدال قائم ہو اور ہم ان فضول رسم ورواج، وقت اور روپیہ برباد کرنے والے غیر مفید طریقوں اور تکلفات کے بدھنوں سے نجات حاصل کریں +

مرزا سیف علیخاں
(حیدرآبادی)

فیوجل

فیوجل نے اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کا آغاز قہوہ خانے کے نگہبان کی حیثیت سے کیا۔ ابتداً ان بدقسمت نوکروں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا جو پیتل کے بٹنوں والے سبز کوٹ پہنے افسروں کے تہدید آمیز احکام کی بجا آوری نہایت خندہ پیشانی سے کرتے ہیں۔

اسی قہوہ خانے میں وہ اپنی غلامانہ زندگی کے لمحات کو مستقبل کے بڑے بڑے امید افزا خواب دیکھ دیکھ کر بسر کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی روز وہ کسی بڑے ہوٹل کا ——— کسی تیسرے درجے کے ہوٹل کا نہیں جہاں تجارت پیشہ مسافر ذلیل بستروں پر سوتے ہوں بلکہ اس اعلیٰ درجے کے ہوٹل کا جہاں انگریز اور امریکہ کے کروڑپتی سونے کے ایک کمرے کا ہزار فرانک تک کرایہ ادا کرتے ہوں اور شراب کے ایک گلاس کے لئے پانچ لوئیس پیش کرتے ہوں ——— منیجر بن جائیگا!

اس مقصد کی تکمیل کے لئے انگریزی کی تھوڑی بہت تحصیل ضروری تھی۔ اس لئے یہ زبان سیکھنے پر وہ کمربستہ ہوگیا۔ اس نے اتنی رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کس طرح قہوہ خانے میں اکثر آنے جانے مسافروں سے لسانی رجحانات سیکھے؟ یہ ان اصحاب کے لئے ایک راز ہے جو فیوجل کی شخصیت سے آشنا نہیں۔ مگر اس کے دوستوں کے لئے یہ کوئی پیچیدہ معمہ نہ تھا۔ فیوجل کو ہر مشکل اور محنت طلب کام بہت آسان معلوم ہوتا تھا اور ہر آسان کام اس کے لئے سخت مشکل ہو جاتا تھا۔ فیوجل اس خوفناک فطرت کا مالک تھا ——!

چنانچہ کچھ عرصے کے بعد انگریزی پر اُسے اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ چند مختلف حالات میں زندگی گذارنے کے بعد وہ لڑکیوں کے ایک تعلیمی سکول میں فرانسیسی زبان کا اُستاد متعین ہوگیا۔

دس بیس سال جو فیوجل نے اس کے بعد گذارے، اتنے پُراسرار ہیں کہ تفصیل کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھنا ایک بڑا مشکل کام ہے۔ واقعہ جس کا ذکر صفحاتِ ذیل میں ہونے والا ہے سکول کے عرصۂ ملازمت کے فوراً بعد اسے پیش آیا۔

سکول نے فرانسیسی زبان کے اخذ کرنے میں جو ترقی کی گو وہ قابل قدر تھی مگر ساتھ ہی صرف و نحو کے قواعد کو افسوسناک طور پر نظرانداز کیا گیا تھا۔ سہ ماہی امتحان میں، جب پرچے کسی دوسرے اُستاد نے بنائے تو نتیجہ نہایت حوصلہ شکن نکلا۔ لڑکیوں نے ترجمے میں عجیب عجیب غلطیاں کیں۔ بعض افعال گرامر کی لاعلمی کے باعث غلط استعمال کئے گئے۔ فرانسیسی تاریخ کے واقعات کو اس طرح خلط ملط کیا گیا کہ ممتحن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ غرضیکہ جب ہیڈ مسٹرس کو شبہ گذرا کہ فیوجل کے طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص ہے تو اس نے بذاتِ خود اس کی جماعت کا معائنہ کیا۔ کمرۂ جماعت میں عجیب سا منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ لڑکیوں نے تعلیم کے وقت ہی اودھم مچا رکھا تھا۔ فیوجل فرطِ انبساط میں پلیٹ فارم پر عجیب وغریب حرکات کر رہا تھا۔ وہ جماعت کو ایک کہانی بتا رہا تھا۔ اور بیان کرتے وقت اس کا عضو عضو جنبش کر رہا تھا۔ جونہی اس کی نظر ہیڈ مسٹرس کی مرعوب کن شخصیت پر پڑی وہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔ اور کہانی کی بقیہ تفصیل وہیں کی وہیں دھری رہ گئی۔ ہیڈ مسٹرس بولی: "تم عجیب طریقے سے فرانسیسی پڑھاتے ہو!"

وہ کہنے لگا: "مادام میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا طریقۂ تعلیم عجیب وغریب ہے مگر اس کے بغیر میں اپنے سبق کو دلچسپ نہیں بنا سکتا تھا۔"

ہیڈ مسٹرس نے کہا: "اس طریقے سے لڑکیوں کو نہیں پڑھانا چاہئے۔ جماعت کو ذرا افعالِ ناقصہ کی مشق تو کرائیے۔"

تو ہیڈ مسٹرس کی شعلہ بار آنکھوں کے سامنے فیوجل نے افعالِ ناقصہ کا سبق پڑھایا۔ افسوس کہ اُسے گرامر سے قطعاً کوئی شغف نہ تھا۔ اس کا سبق ناکام رہا اور وہ ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

دسمبر کی ایک شام کو ایسٹن سٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر فیوجل یاس والم کی تصویر بنا کھڑا تھا جس پر صرف باہر سے آنے والی گاڑیاں آکر ٹھہرتی ہیں۔ اس کے پاؤں کے قریب ایک حقیر سا بقچہ پڑا تھا۔ ہاتھ میں اس نے پھولوں کا ایک بڑا سا ہار پکڑ رکھا تھا۔ یہ ہار ان طالبات کی طرف سے ایک اخلاص آمیز پیشکش تھی جو اس کی علیحدگی کو بہت محسوس کر رہی تھیں۔ قلی بوجھ اُٹھائے جلدی جلدی اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ سٹیشن کے باہر اِکا دُکا گاڑیاں کھڑی نظر آتی تھیں۔ کوچبان واٹر پروف کوٹوں میں ملبوس تھے۔ انکے کوٹ بارش میں بھیگ جانے سے چمک رہے تھے۔

اتنی بارش میں مجھے کوئی اِکا دُکا گاڑی لے لینی چاہئے۔ یا بقچہ ہاتھ

میں تمہارے یا پیادہ چل پڑنا چاہیئے! وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بڑا مستعد خادم جو اس کے پاس ہی کھڑا تھا کہنے لگا:۔

"معاف فرمایئے، مجھے مسٹر سمتھ نے بھیجا ہے"

"خوب، خوب، مجھے بہت خوشی ہوئی!

"کیا آپ ہی وہ فرانسیسی ہیں جو مانچسٹر سے تشریف لا رہے ہیں"

"بالکل"

"تو مسٹر سمتھ نے آپ کے لئے یہ گاڑی بھیجی ہے"

"ان کی بڑی نوازش ہے!"

خادم بقچہ اٹھا کر جلدی سے پلیٹ فارم پر سے نیچے اتر آیا۔ فیوجل اس کے پیچھے ہو لیا۔ خادم نے اسے بٹھانے کے لئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ فیوجل سوچنے لگا کہ میں گاڑی میں بیٹھ تو گیا ہوں مگر یہ مسٹر سمتھ ہیں کون؟ جنہوں نے اتنی ہمدردی سے مجھے گاڑی بھیجی ہے۔ پھر خود ہی دل میں کہنے لگا "اچھا کوئی ہو، اب خود ہی جا کر دیکھ لونگا"

وہ گاڑی پر سوار ہو کر نرم نرم گدیلوں پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

گاڑی چل پڑی اور جلد ہی موسلا دھار بارش کے قطرے تڑاتڑ کھڑکیوں کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ فیوجل نے جل تھل گلیوں کو دیکھ کر اپنے آپکو اس آرام کی حالت میں پاتے ہوئے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ جس سکول میں میں پڑھاتا تھا وہاں مس سمتھ نام کی دو چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ شاید یہ ان ہی کا شریف باپ ہو۔ جس نے مجھے بلا بھیجا ہے۔ مگر مجھے اس بات سے کیا غرض کہ وہ ضرور میری ہی شاگرد لڑکیوں کا باپ ہو۔ اس نے خود مجھے بلا بھیجا ہے۔ میرے لئے گاڑی بھیجی ہے۔ یقیناً ایسا شخص کوئی کھاتا پیتا اور دلچسپ آدمی ہی ہوگا۔ اور لطف یہ ہے کہ مجھے غائبانہ طور پر اب اس سے کچھ مناسبت بھی پیدا ہونے لگی ہے۔

گاڑی ایک ہیمپ سٹیڈ میں ایک مکان کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اور جہاں تک اندھیرے میں اس کی نگاہ کام کرتی تھی، مکان کی ملحقہ زمین ہی میں ٹھیرائی گئی۔ خادم نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور فیوجل کو اتار کر سیڑھیوں پر لے آیا۔ ایک خادمہ نے ایک بڑے سے ہال میں اس کا استقبال کیا۔ اور اس کا کوٹ اور ہار اتار کر کہنے لگی "مسٹر سمتھ ابھی تک شہر سے واپس نہیں آئے۔ ہاں مس کرسٹابیل ڈرائنگ روم میں موجود ہیں"

فیوجل بولا "مجھے وہ ہار ذرا دیدیجئے"

خادمہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ جہاں ایک مورلقا دوشیزہ ایک نازک سے سٹول پر جلوہ افروز تھی۔ فیوجل کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی اور ایک دلربا تبسم کے ساتھ اس کے استقبال کو آگے بڑھی۔ "دوپہر بخیر، مسٹر ہیرن! میں سوچ رہی تھی کہ تم اس تمہیں پہچان سکے گا؟ مگر خوش قسمتی سے اس نے تم کو پہچان ہی لیا۔ دیکھئے نا، نہ میں نے اور نہ اباجان نے اس سے پہلے تم کو دیکھا تھا۔ اس لئے ہم تمہارے حلیے کے متعلق اسے کچھ نہ بتا سکتے تھے!"

فیوجل کو یہ بات پسند تو بہت آئی مگر اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اسے ہیرن کے معزز لقب سے کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ انگریز لوگ اس لقب کو بہت مقبول سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا "مادموزیل! تمھارا کوچوان بہت ہوشیار آدمی ہے"

اس کے بعد کچھ لمحے سکوت رہا۔ مس کرسٹابیل کبھی فیوجل کی طرف اور کبھی اس کے ہار کی طرف دیکھتی۔ اور فیوجل کبھی کرسٹابیل کی طرف اور کبھی اپنے ہار کی طرف اور پھر کرسٹابیل کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس نے کہا "مادموزیل! کیا تم یہ ہار قبول کرو گی؟"

کرسٹابیل نے ہار لے لیا اور ایک دلکش انداز میں شرما سی گئی۔!

اس کے بال اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ چھوٹی سی دلفریب ستواں ناک اور دنیا بھر میں سب سے چھوٹا منہ تھا، کہنے لگی "ایک فرانسیسی کو بھی ایسا خیال نہیں آسکتا!"

فیوجل یہ سنکر مسکرانے لگا۔ اور اپنا ہاتھ کانوں تک لیجا کر، جیسے توبہ کہتے وقت لوگ عام طور پر کرتے ہیں، کہنے لگا "ایک فرانسیسی کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ بڑا کشادہ دل ہوتا ہے"

کرسٹابیل یہ سنکر خوشی سے ہنسنے لگی اور اسے آگ کے سامنے بٹھا کر چائے اور چپاتیوں سے اسکی خوب خاطر مدارات کی۔ اس میزبان لڑکی کے آزادانہ دلکش انداز کو دیکھکر فیوجل کے دل سے اس عجیب اتفاق کے تمام تاثرات دور ہو گئے، جو مسٹر سمتھ کے گھر پہنچ جانے کے سلسلہ میں اسے پیش آیا۔ یہ ایک الف لیلوی سحر تھا جس نے اسے ایک یاس انگیز حادثت سے اٹھا کر اس معطر محل میں، جہاں کرسٹابیل جیسی شہزادی اس کی ہم جلیس تھی، لا بٹھایا۔ وہ آگ کے شعلوں کو اس کے چمکیلے بالوں میں رقص کرتے اور ہنسی کو اس کے چہرے پر کھیلتے دیکھکر یوں محسوس کر رہا تھا گویا وہ ہیمپ سٹیڈ کی بجائے بغداد میں بیٹھا ہے۔ اس نے کہا "کرسٹابیل، تم تو کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہو!" کرسٹابیل بولی "ہاں ایک دفعہ بازار میں مجھے ایک شہزادی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا وہ کیا ہی

ایک شہزادی تھی!"

فیوجل نے کہا "ادھو تم بازار میں پھرنے والی شہزادیوں کا ذکر کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں پرستان کی ایک شہزادی سمجھتا ہوں۔"

کرسٹابیل کہنے لگی "تم نہیں جانتے اگر کوئی آدمی اس قسم کی محبت آمیز باتیں انگریز لڑکیوں سے کرے تو اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔"

فیوجل نے جواب دیا "انگریز! ہاں مگر ان کی محبت تو ایک ہفتے یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک رہتی ہے اور پھر انڈے کی طرح گندی ہو جاتی ہے۔ ہم برِ اعظم یورپ کے رہنے والے، ہم تو حسن کو اپنے دل کی گہرائیوں سے خراج دیتے ہیں۔ ہماری محبت حقیقی اور گہری ہوتی ہے۔ اور جو چیز دل سے پیدا ہو اس کا مضحکہ نہیں اڑایا جاتا!"

کرسٹابیل پھر ہنس کر بولی "میں تو ہمیشہ یہی سنتی آئی ہوں کہ کسی فرانسیسی کو جس عورت سے بھی ملنے کا اتفاق ہو جائے۔ وہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔"

فیوجل کہنے لگا "ہاں، کیوں نہیں! اگر وہ کوئی حسین عورت ہو تو!"

کرسٹابیل جس کو آج تک یہ بات معلوم نہ تھی بولی "خوب۔"

فیوجل بولا "تو مجھے تم سے محبت ہے!"

"میں حیران ہوں کہ اگر میرے منگیتر کو اس بات کی خبر ہو جائے تو وہ کیا کہے گا۔"

"تمہارے ___!"

"ہاں ہاں میرے ہی منگیتر کو! وہ دیکھو میرے قریب ہی میز پر اس کا فوٹو پڑا ہے وہ چھ فٹ کا ایک دراز قد نوجوان ہے اور عاشق صادق ہے۔"

"تو کیا یہ کوئی ترک ہے؟!"

"میں تمہاری بات سے ناک بھوں تو نہیں چڑھاتی۔ مگر میرے منگیتر کو ترک کہنا مناسب نہیں، وہ بڑا خوبصورت نوجوان ہے اور مجھے بہت چاہتا ہے۔"

"اس خوش قسمت کا نام!"

کرسٹابیل نے اس کا نام بتایا ___ ہیری رالسٹن ___ یہ محض ہیری رالسٹن ہی نہ تھا بلکہ آنریبل ہیری رالسٹن تھا۔ بڑا امیر آدمی اور بڑی جائیداد کا وارث تھا۔ پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا۔ ہیمپ شائر میں اس کا ایک عظیم الشان مکان بھی تھا۔ جو آرٹ کے خوبصورت ترین نمونوں کا ایک مرقع تھا۔ کرسٹابیل کا باپ اور ہیری اکثر اکٹھے ہی مختلف صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور ان دونوں میں گہرا رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔

کرسٹابیل نے سینے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو ہم نے یہاں کتنی نفیس تصویریں جمع کر رکھی ہیں۔"

فیوجل نے دیواروں پر نظر دوڑائی۔ وہاں سونے کے فریموں میں جڑی ہوئی بہت سی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ ان دنوں فیوجل کا مذاق اتنا پختہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ سیاہ چمکیلے بالوں میں سے جھانکتا ہوا کرسٹابیل کا نورانی فردوز چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ذرہ برابر بھی گوارا نہ تھا کہ ایک جیتی جاگتی حقیقی تصویر سے نظر ہٹا کر دیوار پر کی مصنوعی تصاویر کو دیکھنے میں اپنا وقت ضائع کرے۔ کرسٹابیل نے اس کی چھلکتی ہوئی نگاہ سے متاثر ہو کر کہا "میرا خیال تھا تم کوئی دقیق شناس آدمی ہو گے!"

فیوجل نے اپنی چمکیلی آنکھیں کرسٹابیل کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا "کیوں نہیں!"

وہ شرما سی گئی اور اٹھ بیٹھی، کہنے لگی "مجھے کھانے کا لباس تبدیل کرنے کیلئے اب چلنا چاہیئے، شاید اب تم وہ کمرہ جو تمہارے قیام کیلئے مخصوص کر رکھا ہے، دیکھنا پسند کرو۔"

وہ اپنا سر ایک طرف جھکا کر بولا "مادموزیل! کیا میں نے کوئی گستاخانہ بات تو نہیں کی؟!"

وہ کہنے لگی "مجھے نہیں معلوم۔"

پھر خادم فیوجل کو دری بچھی ہوئی کشادہ سیڑھیوں پر سے خوابگاہ میں لے گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنی زندگی میں ایسا کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ پردے، قالین، صوفے، ساٹن کے لحاف، اور لکھنے کی خوبصورت میزیں، سب اپنی اپنی جگہ پر مزین تھیں۔ دھیمی دھیمی روشنی نمودار تھی۔ انگیٹھی میں خوشگوار آگ جل رہی تھی۔ فیوجل کا اپنا سامان سنگار میز پر پڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی سوٹ کیس نہ تھا۔ خادم نے اس کا قیمتی فراک کوٹ اور پتلون کا فالتو جوڑا بستر ہی پر رکھ دیا۔ سرہانے پر اس کی رات کو پہننے والی قمیص پڑی تھی!

فیوجل نے ان تکلفات سے متاثر ہو کر دل میں کہا، اب مجھے نہا کر اپنا لباس تبدیل کرنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے یہی میرے سونے کا کمرہ ہے۔

فیوجل نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا۔ سفید ٹائی اور بادامی رنگ کے تقریباً نئے ہی بوٹ ___ اور ڈرائنگ روم میں پہونچا۔ کرسٹابیل وہاں پہنچی تھی۔ آتشدان کے پاس ہی ایک گنجے سر والا، سرخ چہرے والا

انگریز بیٹھا تھا۔ جس کی آنکھیں چھوٹی سی تھیں اور اخلاق پسندیدہ تھے، اس نے کھانے کا لباس پہن رکھا تھا۔ اپنے بازو پھیلا کر کہنے لگا: "میرے دوست! میں تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں تمہارے متعلق کچھ سن چکا ہوں۔ اور میری یہ لڑکی تمہاری بہت تعریف کرتی ہے!"

فیوجل بولا "مادموزیل بڑی مہربان ہیں"

مسٹر سمتھ نے کہا: "تم دیکھ رہے ہو ہم معمولی سے لوگ ہیں۔ مگر خیر، یہ لو اعلیٰ درجے کی شراب کی بوتل اور سگرٹ۔ تم جانتے ہی ہو کہ صرف انگلستان ہی میں پینے کے قابل اچھی شمپین اور سگرٹ مل سکتے ہیں۔ انگریزی وضع کا یہ مکان بھی ایک معقول جگہ ہے، میرا خیال ہے کہ فرانس میں ایسی جگہیں کہاں!"

فیوجل نے اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ اپنے ملک کے خلاف ایسی غیر معقول باتیں سنی تھیں کہنے لگا: "تو گویا فرانس میں سب آدمی نہ وہ خانوں ہی میں رہتے ہیں؟"

مسٹر سمتھ نے بڑے شوق کے ساتھ جواب دیا: "بھائی، پھر بھی انگلستان ہی اچھی جگہ ہے۔ ہے نا! گو یہ ٹھیک ہے کہ پیرس بھی اپنی جگہ ایک دلکش شہر ہے!"

کھانے کا اعلان کر دیا گیا۔ فیوجل نے کرسٹابیل کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا۔ وہ نہ صرف اس لئے خوش تھا کہ اسے کرسٹابیل جیسا اچھا ساتھی مل گیا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ فراک کوٹ، سفید ٹائی اور چمکدار بادامی بوٹ پہنکر کھانے میں شریک ہو رہا ہے۔

وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ میزبان ایک خوشنما میز کے ایک سرے پر بیٹھا تھا۔ کرسٹابیل دائیں طرف تھی۔ فیوجل بائیں طرف بیٹھ گیا۔ کھانا ایک خوشگوار انداز میں شروع ہوا۔ سمتھ بڑا مسرور نظر آتا تھا۔ کہنے لگا:

"فیوجل، تمہارے پرانے دوست جیول کیسے ہیں؟"

فیوجل نے اپنے دل میں سوچا کہ جیول میرا دوست کہاں سے نکل آیا۔ مگر اس نے جرأت کر کے جواب دے ہی دیا: "اور تو سب طرح خیریت ہے مگر کبھی کبھی اسے وجع المفاصل کی شکایت ہو جاتی ہے۔"

سمتھ بولا: "مجھے بھی یہ تکلیف اکثر رہتی ہے۔ اسے چھوڑیے!"

فیوجل نے کہا: "جیول بھی تمہاری طرح بڑا ہمدرد آدمی ہے۔ اس نے تمہارے متعلق اکثر ذکر کیا ہے۔"

اسکے بعد فیوجل فرانس کے متعلق عجیب و غریب باتیں سنانے لگا۔ اس نے انہیں اس زمانے کی بہت سی باتیں بتائیں جب وہ سکول ماسٹر تھا۔ یہ سب باتیں سنکر سمتھ بولا: "میں نے پہلی دفعہ ایک فرانسیسی کو اتنی پُرلطف اور پُرمزاح باتیں کرتے سنا ہے!" پھر کہنے لگا: "بیرن! میرا خیال تھا کہ تم نے اپنی زندگی اپنے پرانے شاتو[1] میں رہ کر گذار دی ہوگی۔۔۔!"

فیوجل نے جواب دیا: "ہاں مسٹر سمتھ! میں بیرن ہوں پھر بھی اپنے اسی پرانے شاتو میں رہتا ہوں!"

کرسٹابیل نے پوچھا "کیا تمہارے شاتو کے پاس کوئی خندق، کوئی متحرک پل اور کوئی چھوٹا گرجا بھی ہے؟"

فیوجل نے ذرا فخر کے ساتھ کہا: "ایک کیا دو گرجے ہیں۔"

کرسٹابیل کہنے لگی: "میں لینگوڈ کے متعلق بات کر رہی ہوں۔۔۔"

اینگوڈ! یہ تو فیوجل کا اپنا ہی علاقہ تھا۔ اس علاقے میں تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ہاں آنکھوں کا استقبال کرنے کو بہت سے مناظر موجود ہیں۔ فیوجل نے اس ہال کی تفصیل شروع کر دی جو اب تقریباً نابود ہو چکا تھا۔ اور جس کے قریب خندق، گرجا، متحرک پل سب کچھ تھا۔ مگر یہ تو بالکل حقیر سی چیزیں تھیں۔ اس کے آراستہ کئے ہوئے راستے، اس کے برج، اس کی پناہ کی جگہیں، اس کے بے شمار کمرے، جن میں دو سو مسلح آدمی ایک ہی وقت میں کھانا کھا سکتے تھے۔ اور اس کا وہ خاص کمرہ جس میں جان آف آرک قتل کی گئی تھی۔۔۔ یہ تھیں قابل دید چیزیں! فیوجل نے اس جگہ کو کچھ ایسے انداز میں پیش کیا۔ کہ بھولے بسرے کی ساری یادگاریں سامعین کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ اس نے بتایا کہ کس طرح کتے، گائیں، بطخیں اور مرغابیاں وہاں محفوظ رکھی جاتی تھیں، اور کس طرح ایک بڑے تالاب میں کھانے کے لئے مینڈک پالے جاتے تھے۔

کرسٹابیل کپکپاتی ہوئی بولی: "میں تو مینڈک کھانا کبھی گوارا نہ کروں!"

اس کا باپ کہنے لگا: "وہ لوگ تو گھونگے بھی کھاتے تھے!"

فیوجل بولا: "ہاں میرے پاس بھی ایک خاص جگہ ہے جس میں گھونگوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ تم نے کبھی ان جیسے دلچسپ جانور نہیں دیکھے۔ یہ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں۔ اور اگر تم محبت سے کھانے کی کوئی

---

[1] فرانسیسی وضع کا دیہاتی مکان!

چیز اپنے ہاتھ پر رکھ کر انہیں دو تو وہ تمہارے ہاتھ پر کھانے لگ جائیں گے۔"

مسٹر سمتھ بولا۔ "فیوجل! تم ان تصویروں کے متعلق کچھ کہنا بھول ہی گئے۔"

فیوجل نے اپنے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "ہاں ہاں تصویریں، گیلریاں ان سے بھری پڑی ہیں۔ وہاں سب کے شاہکار موجود ہیں۔"

اس نے ذرا توقف کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ڈرامائی شان کے ساتھ کچھ بیان کرنے والا تھا بلکہ اس لئے کہ اور بہت سے مصوروں کے نام اس وقت اس کے ذہن میں نہیں تھے۔ وہ بولا۔ "فی الحقیقت یہ ایک تاریخی شاتو ہے۔"

کرسٹابیل بولی۔ "میں اسے ایک بار ضرور دیکھنا چاہتی ہوں۔"

فیوجل نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "مادموزیل! یہ شاتو تمہارا اپنا ہی ہے۔ شادی کا زمانہ وہاں خوب وہیں گذارنا۔"

اب کھانا ختم ہو چکا۔ کرسٹابیل، سمتھ اور فیوجل کو شراب پیتے چھوڑ کر خود چلی گئی۔ یہ شراب پرتگال کی تھی جس کی تعریف میں سمتھ رطب اللسان تھا۔ فیوجل پر تکلف کھانوں اور شراب سے سیر ہو کر تلو لیے گھوڑے کے خوشگوار تصور سے دل کو مسرور کئے ہوئے اور ایک بڑا سا سگار منہ میں دبائے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ اسے مسٹر سمتھ سے جو ایک متواضع آدمی تھا ایک طرح کا انس ہو گیا تھا۔ اور اگر وہ چاہتا تو اس کے پاس ایک ہفتہ یا ایک مہینہ یا یوں سمجھئے کہ ایک سال تک رہ سکتا تھا!

قہوے اور شراب کے دور کے بعد سمتھ نے ایک تیز قمقمہ روشن کیا۔ اور کمرے میں لپٹی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جو ایک کیل کے ساتھ آویزاں تھی۔ اس نے فیوجل کو اپنے پیچھے آنے کو کہا اور پردہ اٹھا کر تصویر کو نمودار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو۔ کیا یہ تصویر حیرت انگیز نہیں؟"

یہ ایک تصویر تھی جس میں آسمان، پانی، اور درخت، سفیدی مائل سیاہ رنگ میں نمودار تھے۔ اور سامنے ایک چھوٹے آدمی نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔

فیوجل جو حسین چیزوں کے دیکھنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتا تھا چلا اٹھا۔ "کتنی خوبصورت ہے کتنی شاندار ہے۔"

"کارٹ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہے نا!"

"بیشک!"

سمتھ نے فیوجل کی پسلیوں پر تھپکی دی اور کہنے لگا۔ "میں نے تمہیں حیران ہی تو کر دیا کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ کاش جاک ایسی تصویر بنا سکتا ہے! حالانکہ یہ اسی نے بنائی ہے۔ جب تم یا کوئی اور شخص اسی کارٹ کا شاہکار کہہ بیٹھتا ہے تو میں فرط مسرت سے دیوانہ ہی ہو جاتا ہوں۔۔"

فیوجل نے اس کے سرخ چہرے پر ایک تیز نگاہ دوڑائی۔ اسے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں فریب کی ایک جھلک نظر آئی۔

سمتھ بولا۔ "اب تو سارا معاملہ صاف ہو گیا۔"

"ہاں ہاں بالکل۔" فیوجل نے کہہ تو دیا مگر یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

سمتھ بولا۔ "اب جبکہ تم نے اس تصویر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ تمہارے خیال کے مطابق اس کی کتنی قیمت ہو سکتی ہے۔ میں نے تو دو اور تین ہزار پونڈ کے درمیان تجویز کی ہے۔ اب تم اس تصویر کے ذہنی مالک ہو۔ تم نے سمجھ لیا؟ ذرا اسی طرح گاہک کے سامنے اسے پیش کرنا جس رنگ آمیزی کے ساتھ تم نے اپنی تاریخی شاتو کو پیش کیا تھا۔"

فیوجل نے متانت سے کہا۔ "اس کی قیمت تین ہزار پونڈ ضرور ہوگی۔"

سمتھ کہنے لگا۔ "وہ نوجوان جو اس کا خریدار ہے کہتا ہے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ مگر اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔"

فیوجل نے عجیب اختصار کے ساتھ جواب دیا۔ "خوب۔۔۔۔۔!"

سمتھ بولا۔ "عجب نہیں وہ تین ہزار پونڈ ہی مان جائے ۔۔۔ اور یہی اس کی صحیح قیمت ہے ۔۔۔ ہے نا؟ بات یہ ہے کہ ہیری، اس کا خریدار، ایک بڑی جائیداد کا وارث ہے۔ اور تین ہزار پونڈ اس کیلئے کوئی بڑی رقم نہیں۔"

فیوجل بولا۔ "مگر وہ تصویر کو دیکھ چکا ہے یا نہیں!"

مسٹر سمتھ نے کہا۔ "وہ تو اسے ایک شاہکار خیال کرتا ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ مجھے تصویر کے سودے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کا مالک تو ایک فرانسیسی نوجوان ہے اور وہی اس کی قیمت مقرر کریگا۔"

فیوجل دل میں خیال کرنے لگا کہ یہ وہی آنریبل ہیری تو نہیں، جو کرسٹابیل سے منسوب ہے۔

سمتھ بولا۔ "میں نے اسے بتایا تھا کہ ممکن ہے اس کی قیمت تین یا چار ہزار تک پہونچ جائے۔ یہ سنکر وہ ذرا گھبرا سا گیا تھا۔ میں نے

جب یہ دیکھا تو اُسے بتایا کہ شاید دو اور تین ہزار پونڈ کے درمیان ہی سودا چک جاتے۔ چنانچہ میں نے تم کو یہی قیمت لکھدی۔ اب تم تین ہزار سے شروع کرنا۔"

فیوجل نے میز پر جاکر شراب کا ایک گلاس چڑھایا۔ اور بولا۔

"بہتر!"

سمتھ نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو تیزی سے جنبش دیتے ہوئے کہا "اب آؤ آپس میں فیصلہ کرلیں۔ ذرا انصاف سے کہو تمہارا کمیشن کتنا ہوگا؟ دیکھو بیرن! یہ سب حکمت میرے ہی دماغ نے اختراع کی ہے۔ ذرا خیال تو کرو مجھے کتنی تکلیف کا سامنا ہے۔ کہو چار سو پونڈ مناسب ہونگے؟"

فیوجل نے جواب دیا "نہیں پانچسو"

سمتھ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو ضرور اتنے اہم کام کے لئے ایک ہزار پونڈ طلب کرتا۔ اور میں خود بھی آٹھ سو پونڈ دینے پر تیار تھا۔

اُسنے کہا "بات ہوچکی!"

فیوجل بولا "ہوچکی"

دونوں نے باہمی فیصلے پر مہر تصدیق لگانے کے لئے ایک دوسرے سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملائے۔ اور کہنہ شراب کے دو گلاس چڑھائے۔ اسی اثنا میں ایک خادم اندر داخل ہوا۔ اور سمتھ کو ایک طرف لے گیا۔

سمتھ نے کہا "معاف رکھنا بیرن! ایک منٹ کے لئے میں باہر جارہا ہوں"

فیوجل نے اپنے میزبان کا موٹا سا سگار سُلگایا اور آتشدان کے قریب بازوؤں والی چمڑے کی کرسی پر لیٹ کر خوشگوار خیالات میں مستغرق ہوگیا۔ کبھی وہ اپنی عجیب و غریب حالت کو دیکھکر ہنسنے لگتا تھا۔ اسکے خیال میں مسٹر سمتھ بڑا دلچسپ آدمی تھا۔

اس کے خوشگوار خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کا میزبان ایک بھورے رنگ کے عجیب چہرے والے خاصی عمر کے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اُس کی مونچھیں سفید تھیں اور اُس کے اوورکوٹ کے بٹن کے سوراخ میں فوج کا امتیازی تمغہ لٹک رہا تھا۔

مسٹر سمتھ کا چہرہ فرط غضب سے سُرخ ہو رہا تھا۔ فیوجل کے قریب جاکر کہنے لگا "تم بتا سکتے ہو کہ تم کون ہو؟"

فیوجل اپنے ہاتھ فراک کوٹ کے پیچھے رکھکر ہنستے ہوئے آتشدان کے قریب ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا "دوست میں بیرن ہوں"

سمتھ تیز آواز میں پوچھنے لگا "تم تو کوئی بدمعاش معلوم ہوتے ہو"

فیوجل ذرا ملائم لہجہ میں بولا "اور یہ شریف زادہ کون ہے جسکی ملاقات کا شرف ابھی تک مجھے حاصل نہیں ہوا"

اجنبی ذرا فخریہ انداز میں کہنے لگا "میں موسیو بائرن ہوں۔ برن برجر کا ایجنٹ!"

فیوجل بولا "میرا خیال تھا تم کوئی بیرن ہوگے"

سمتھ چلاکر کہنے لگا "ٹھٹھا مخول نہ کرو۔ کہو تم بیرن ہو یا یہ؟"

فیوجل بولا "میں دُنیا بھر کی دولت کے لئے بھی بائرن کا نام اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میرا نام آرسٹائیڈ فیوجل ہے"

"تو تم یہاں آ کیسے گئے؟"

"تمہارے خادم نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر پوچھا "کیا تم ہی مانچسٹر سے آنے والے فرانسیسی ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ کہنے لگا۔ مسٹر سمتھ نے تمہارے لئے گاڑی بھیجی ہے۔ میں نے سوچا یہ مسٹر سمتھ کوئی بڑا مہمان نواز شخص ہوگا۔ جس نے اتنی محبت سے گاڑی بھیجی ہے۔ میں اس پر سوار ہوگیا"

مسٹر سمتھ نے اپنا ہاتھ گھنٹی کے بٹن تک لیجاتے ہوئے کہا "تو اسی وقت کمرے سے باہر ہو جاؤ"

فیوجل نے اس کی مشتعل طبیعت کو ذرا ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا "بھائی میزبان، دیکھو باہر چھاجوں پانی برس رہا ہے۔ مجھے تمہارے پُرتکلف گھر میں بہت آرام ہے۔ میں یہیں رہونگا"

مسٹر سمتھ کا چہرہ زیادہ سُرخ اور وحشتناک ہونے لگا۔ اُس نے کہا "اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو میں تمہارے لئے زندہ درگور ہوں۔ اب بتاؤ تم خود نکلوگے یا تمہیں پھینک کر باہر نکالا جائے"

فیوجل سگرٹ کا کش لگا کر کہنے لگا "تم بھول گئے ہو کیا؟ کہ جب دلکش مس کرسٹابیل کے منگیتر کو معلوم ہوگیا کہ جس تصویر کے تم تین چار ہزار پونڈ مانگتے ہو، گوٹس چاک کو صرف آٹھ پونڈ اُجرت دے کر بنوائی گئی ہے تو......"

"کیا کہنا تمہاری عقل کا"

"تم ابھی دیکھ لوگے"

"ارے او بدمعاش، پاجی"

کتنی اچھی اور نیک مجلس میں میں بیٹھا ہوں"

"تو پھر تم باہر چلے جانے کے لئے کیا لوگے، یہ دیکھو چیک بک!"

یہ سُن کر مسٹر سمتھ آتشدان سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ فیوجل بازوؤں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "میں اندر رہنے کے لئے پانچ سو پونڈ لوں گا!"

"اندر رہنے کے لئے!" مسٹر سمتھ نے غضب آلود ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں اندر رہنے کیلئے۔ میرے بغیر تمہارا کام نہیں چلے گا۔ تمہاری لڑکی اور تمہارے خادم مجھے ہی ہیرن سمجھتے ہیں"

"میں چاہتا ہوں کہ تمہاری گردن توڑ دوں بخدا اگر تم کو اندر ہی رہنے کی اجازت مل گئی تو تمہیں ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑینگے، میں اتنا بیوقوف نہیں کہ تمہاری باتوں میں آجاؤں"

"جو بھی تم چاہو!"

مختصر یہ کہ فیوجل اس سودے میں شریک کر لیا گیا۔ پلاٹ یہ تیار کیا گیا کہ فیوجل مالی مشکلات سے تنگ آ کر اپنی یہ تصویر بیچنے پر مجبور ہے۔ مسٹر سمتھ کو اس بات کی اطلاع ملی ہے۔ اور اس نے ایک دوست کے ذریعے سے آنریبل ہیری۔۔ اپنے ہونے والے داماد کو اطلاع دی ہے۔ قیمت کا فیصلہ کرنے کیلئے مالک خود آیا ہے۔ مسٹر پاٹرن، جو اتفاق سے اس وقت لندن میں ہے، اس قسم کے سودے چکانے میں بڑا ماہر ہے۔ وہ بھی مسٹر سمتھ کے ایما سے اس کے مکان پر آگیا ہے تاکہ تصویر کو اچھی طرح دیکھ کر اس کی قیمت کا صحیح اندازہ کرے۔

فیوجل بولا "صحیح طور پر اس سودے میں مسٹر پاٹرن کا دخل اندازہونا بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ یہ ابھی واپس چلا جائے!"

مسٹر پاٹرن بولا "میں اتنی بارش میں واپس نہیں جا سکتا۔ اسکے علاوہ میں کوئی ناخواندہ مہمان نہیں ہوں"

اس اثنا میں دروازہ کھلا۔ اور مس کرسٹابیل نمودار ہوئی۔ اجنبی پاٹرن کو دیکھتے ہی وہ حیران سی ہو کر رہ گئی۔ مسٹر سمتھ کے کبیدہ چہرے پر تبسم رقص کرنے لگا وہ بولا "میری پیاری بچی! یہ پیرس کے مشہور مسٹر پاٹرن ہیں جو اس تصویر کے متعلق اپنی رائے دینے آئے ہیں"

پاٹرن نے اپنا سر جھکا لیا۔ فیوجل آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ "مادموزیل! تمہارا چہرہ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کوئی پیاسا ریگستان میں نخلستان دیکھ لے"

کرسٹابیل دلفریب تبسم کے ساتھ باپ سے کہنے لگی "نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہیری آدھ گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اور تمہیں خبر ہی نہیں"

سمتھ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ جواب دیا "میری پیاری بچی، اسے یہاں لے آؤ۔ میرے یہ دوست اس کی ملاقات کے لئے ہمہ تن انتظار ہیں"

لڑکی کمرے سے یوں جھٹ غائب ہو گئی جیسے کوئی روشن شمع فوراً بجھ جائے۔ اور یہ تینوں بدمعاش ایک دوسرے سے سر جوڑ کر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ کرسٹابیل جلدی سے واپس آگئی۔ اس کے ساتھ آنریبل ہیری بھی تھا۔۔۔ لمبا قد، کنگھی کئے ہوئے خوبصورت بال اور مونچھیں، بڑی بڑی نیلی آنکھیں۔۔۔ اس نے سمتھ سے مختصر سے آداب و نیاز کے بعد فیوجل سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا "ہیرن! یہ کتنی خوشنما تصویر ہے، نہ جانے تم اسے جدا کرنا کیسے گوارا کرو گے!"

فیوجل کی پشت کھانے کی میز کے ساتھ تھی۔ اس کی نگاہ شاہکار پر مرکوز تھی۔ کہنے لگا "ایسی بہت سی تصویریں میرے شاتو میں موجود ہیں۔ میرے باپ اور دادا اور خود مجھے ایسی چیزوں کے فراہم کا خبط ہے"

پاٹرن بولا "تو کہہ رہے تھے کہ تمہارے معزز دادا نے براہ راست کارٹ سے یہ تصویر خریدی تھی"

فیوجل نے جواب دیا "ہاں ہاں میرے دادا کارٹ کے بڑے مداح تھے"

آنریبل ہیری نے کہا "کیا تمہیں یہ پسند ہے پیاری!"

کرسٹابیل نے بڑے اشتیاق سے کہا "ہاں تو، دیکھو یہ کتنی خوبصورت ہے فیوجل! معلوم نہیں تم اسے جدا کرنا کیسے گوارا کرو گے۔ یہ جو تم نے کہا تھا کہ میرے ہاں آ کر سب تصویریں دیکھ لینا۔ کیا واقعی خلوص سے تم نے دعوت دی ہے؟"

فیوجل بولا "میرے لئے تمہاری ملاقات ایک سحر انگیز ملاقات سے کم نہ ہو گی"

کرسٹابیل نے آہستہ سے ہیری سے کہا "تو پھر مجھے ہاں ضرور لے جانا"

فیوجل نے کہا "موسیو کیا تم بھی آؤ گے؟"

ہیری بولا: "میں یہ تصویر تم سے چھین رہا ہوں۔ کہتے ہو تو اسکی معافی طلب کرنے کے لیئے وہاں آجاؤں گا۔ . . . . آہا کتنی دلکش چیز ہے۔"

فیوجل جواب کرسٹابیل کی سحر طراز آنکھوں اور گلابی گلابی رخساروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اُسے ایک طرف لیجا کر کہنے لگا: "کرسٹابیل تمہارا منگیتر تو بڑا خوبصورت آدمی ہے۔ اتنی بڑی جائیداد اُسے مبارک ہو۔"

مسٹر ہاپرن کی ناگوار آواز نے اِن دونوں کی گفتگو کے طلسم کو توڑ دیا۔ کہنے لگا: "دیکھو، آرٹسٹ نے اس تصویر کو اپنے آخری سٹائل کے مطابق بنایا ہے۔ اگر اسے نمائش میں رکھ دیا جائے تو یقین ہے کہ اس کی قیمت پانچ ہزار پونڈ سے کم نہ ہو!"

ہیری نے متبسم ہو کر جواب دیا: "پانچ ہزار کی رقم تو بہت زیادہ ہے۔ اتنی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا۔ مسٹر سمتھ تو کہتے تھے کہ تین اور چار ہزار کے درمیان سودا چک جائے گا۔ میں تین ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

مسٹر سمتھ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا: "ہیری! مجھے اس معاملے سے کیا تعلق، میں باہر چلا جاتا ہوں ہیرن خود تمہیں قیمت بتا دیگا!"

ہیری نے مسرت آمیز لہجے میں پوچھا: "تو ہیرن کہو تمہارا کیا خیال ہے؟"

فیوجل میز پر بیٹھ گیا۔ تصویر اُس کے سامنے تیز برقی روشنی میں چمک رہی تھی۔ کہنے لگا: "میں اس کے لیئے تین ہزار پونڈ کبھی نہیں لونگا۔ نہیں ہرگز نہیں!!"

ہاپرن بولا: "مسٹر فیوجل یقین جانو یہ مناسب قیمت ہے!"

فیوجل بولا: "یہ تصویر میری ذاتی ملکیت ہے"

سمتھ نے جواب دیا: "کیوں نہیں۔ کون کہتا ہے یہ تمہاری نہیں ہے؟"

"تو پھر اب میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اور اسے فروخت کرنا نہیں چاہتا!"

سمتھ نے اپنی ہڈیوں کے مغز تک کانپتے ہوئے اپنے ابرو حیرانی سے اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا: "کیا! کیا؟ ارادہ بدل لیا ہے؟ تو اب تم اسے فروخت کرنا نہیں چاہتے؟"

فیوجل بولا: "نہیں چاہتا، دوست! ذرا غور سے اس بات کو سُنو، میں یہاں تمہارے سامنے اس بات کا اظہار کیئے دیتا ہوں کہ مجھے مادموزیل کرسٹابیل سے اُلفت ہے!"

کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ مسٹر سمتھ اپنے سُرخ چہرے اور کھُلے منہ کے ساتھ فیوجل کی طرف دیکھنے لگا۔ مس کرسٹابیل کے چہرے پر فرطِ حیا سے خون دوڑنے لگا! اور ہیری کی آنکھیں خون برسانے لگیں۔ اُس نے کہا:

"کیا کہا جناب؟"

فیوجل نے اُس کی طرف مخاطب ہو کر کہا: "میں مادموزیل کو تم سے چھیننا نہیں چاہتا۔ میری محبت ایک اُمید موہوم ہے۔ مگر یہ اُلفت مرتے دم تک میری رُوح کو خوراک بہم پہنچاتی رہے گی، اور اس ناکام محبت کی خوشی میں یہ تصویر تم کو تحفے کے طور پر مفت دوں گا"

وہ ایک ہیرو کی طرح اپنے بازو آگے بڑھاتے ہوئے استقلال سے کھڑا تھا۔ ہیری اور کرسٹابیل حیران و مبہوت ایستادہ تھے۔ اُس نے کہا: "یہ تصویر میری ہے اور میں ہی تمہیں دے رہا ہوں۔ مجھے اس تحفے سے محض تمہاری مسرت مقصود ہے۔"

مسٹر سمتھ گڑگڑا کر بولا: "کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

ہیری بولا: "دوست! تمہاری یہ فیاضی بے نظیر معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں اس تصویر کو تحفے کے طور پر قبول کرنے میں عذر ہے"

فیوجل نے ایک عجیب سے انداز میں آگے بڑھ کر کہا: "تو پھر میں اُسے بغل میں دبا گاڑی پر سوار ہو کر ابھی اپنے شہر کو واپس چلا جاتا ہوں!"

اور بالآخر انہیں یہ تصویر قبول کرنی ہی پڑی۔

اس تحفے کے بعد فیوجل ان دونوں —— ہیری اور کرسٹابیل کا گہرا دوست بن گیا۔ وہ ان کی شادی پر بھی شامل ہوا۔

تصویر ابھی تک ہیری کے مکان کی زینت ہے مگر فیوجل کا تاریخی شاتو اس واقعے سے چند ہی روز بعد جل کر راکھ ہو گیا۔ نہ معلوم یہ کس کا کام تھا؟

(بہ تلخیص از ڈبلیو، جے، لوکی۔)

طاہر قریشی۔ بی۔ اے

ایک ایکٹ کا ڈرامہ :-

"فسادی"

افراد ڈرامہ

عزت :- بائیس سالہ لڑکی صندلی رنگ معمولی نقشہ بھولا بھالا چہرہ کسی قدر حسین بہت جلد ہر بات کا یقین کر لیتی ہے۔ ذرا ڈرپوک، اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی زود رنج۔

الماس :- بیس سالہ گوری چٹی تندرست لڑکی، طبیعت میں چلبلاپن، ناک پر غصہ، بات بات پر روٹھنا اور آنسو بہانا بول چال بند کرنے کی عادت، گانے کی شوقین، خوش آواز، عزت کی چچازاد بہن۔

ایاز :- دبلے پتلے ٹھیک نقشہ، متانت اور سنجیدگی کے مجسمہ، زود رنج مگر صابر کم سخن، جلد گھبرا جانے والے۔ گورنمنٹ میں اچھے عہدے پر تازہ تازہ تقرر ہوا ہے۔ عزت کے بچپن کے منگیتر الماس کے بھائی۔

نشاط :- اٹھارہ انیس برس کا جوان جو صرف پندرہ برس کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ نحیف آواز کا، بیمار سفید رنگ گربلا کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، اور غضب کا چرب زبان اور خوش مزاج۔ نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ ایاز کا چھوٹا بھائی۔

حورا :- دس گیارہ برس کی موٹی تازی سرخ و سفید لڑکی، ہر وقت نانی اور اماں کے لاڈ کی وجہ سے ٹھنکتی رہتی ہے۔

جولی :- آٹھ برس کا بچہ دبلا کالا اور شریر، بری طرح چیختا اور بات بات پر لڑتا ہے۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔

اماں جان :- چالیس پینتالیس سالہ بھاری بدن کی بیوی بہت غصیل، ڈبل چال، اور بلند آواز، ذرا چالاک، بیوقوف۔ سمجھنے سے پہلے غصہ، بھولی ہوئی سی مغرور۔

محمود :- خوش وضع جوان، سانولا، تندرست اور ہنس مکھ، بے فکر، تیل کا سوداگر۔ خوب امیر۔ الماس کا منگیتر۔

موسم :- آخری جاڑے۔

زمانہ :- بس یہی ہمارا اور آپ کا۔

پہلا سین

(عزت کا کمرہ، ایک کشادہ کمرہ جو ایک پلنگ، چند کرسیوں اور زمین پر چاندنی اور قالین کے فرش سے مزین ہے، ایک کونے میں

جوکی ہے۔ دو تین مونڈھے بھی ہیں۔ جن پر سلیقہ سے جانماز یا کوئی کپڑا بچھا ہوا ہے۔ ایک کونے میں ایک لمبی سی کوچ جس کے پاس ہی کھڑکی ہے جس میں ایک چائے کی خالی پیالی رکھی ہے۔ عزت کوچ پر اس طرح لیٹی ہے کہ دونوں گھٹنے پیٹ میں اڑے ہوئے ہیں اور کوئی کتاب غور سے پڑھ رہی ہے۔)

ایاز :۔ (خاموشی سے کمرے میں داخل ہو کر نرمی سے) عزت میں نے تمہیں بارہا منع کیا ہے کہ اس طرح روشنی کی طرف پیٹھ کر کے نہ پڑھا کرو گر۔

نشاط :۔ (صوفہ کے قریب والی کھڑکی سے چڑھتے ہوئے جملہ پورا کرتے ہوئے) تم مانتی ہی نہیں۔

ایاز :۔ (نشاط کی طرف ایک دم مڑتے ہوئے) نشاط احمد میں نے تم کو بارہا منع کیا ہے کہ اس طرح اُچکوں کی طرح کھڑکیاں اور دریچے نہ پھلانگا کرو مگر..........

عزت :۔ (آہستہ سے) تم مانتے ہی نہیں

نشاط :۔ قبلہ بھائی جان۔ میں نے آپ کو بارہا منع کیا ہو کہ مجھے یہ نام مجھے قطعی پسند نہیں مگر آپ ہمیشہ نشاط "احمد" ہی کہتے ہیں۔ آپ مانتے ہی نہیں۔

الماس :۔ (جوکی کا ہاتھ پکڑے داخل ہو کر) ہم ایک دوسرے کا کہنا بالکل نہیں مانتے۔ یہ جوکی اپنے بھورے جوتے پر سیاہ پالش کئے بغیر نہیں مانتا۔ ذرا دیکھئے گا آپ کے جوتے کیسے بھونڈے رنگ کے ہو گئے ہیں۔

(جوکی اترا اترا کر پاؤں چھپانا چاہتا ہے۔ اور اس کوشش میں اپنے سفید نیکر کو سیاہ اُنگلیوں سے میلا کرتا ہے)

ایاز :۔ (ارے جوکی! (ناصحانہ انداز میں) چچ چچ۔ اتنے بڑے ہو گئے اور اتنے بدتمیز! توبہ توبہ۔

نشاط :۔ (چائے کی چھوٹی پیالی اُٹھا کر ایاز کے سامنے کرتے ہوئے) ذرا پہلے ان محترمہ عزت کو دیکھئے "یہ سگھڑاپا ہے"۔ جوکی بچارہ تو خیر بچہ ہے اور یہ مکرمہ تو ماشاءاللہ......

عزت :۔ (شرمندہ ہو کر) اُونہہ تو اس میں کیا پھوہڑپنا ہے؟

نشاط :۔ (طعنہ سے) جی؟ یہ تو مہا سگھڑاپا ہے (ایاز سے) بھائی جان! قسمت پھوٹی سمجھو۔ جوکی غریب کو ڈانٹ رہے ہو اور عزت صاحبہ کو کچھ نہیں کہتے۔ وہ بچارہ چھوٹا جو ہے۔ مت رو جوکی۔ چچ چچ۔ بے چارہ روتا بھی تو نہیں۔ مت رو......"

(جوکی اپنی دردناک حالت کا احساس کر کے واقعی رونے لگتا ہے)

نشاط :۔ (چمکار کر) مت رو۔ غریب کو ابھی تو بخار آیا تھا۔ جب بچارے کے سوئیاں لگی تھیں اور اب ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ کیا کرے۔

(جوکی زور سے روتا ہے۔ ایاز کچھ کھسیانہ کچھ جھنجلایا کھڑا ہے۔ عزت مسکرا رہی ہے۔ الماس کچھ غضب ناک کچھ پریشان)

الماس :۔ (ایاز سے) واہ بھائی جان۔ اتنا کیوں ڈانٹتے ہیں۔ (جوکی کو لے کر چلی جاتی ہے)

ایاز :۔ نشاط تم بڑے وہ ہو۔ آخر ان باتوں سے فائدہ؟

نشاط :۔ (مسکراتا ہوا عزت کے بہت پاس گھس کر بیٹھ جاتا ہے) ہاں تو بھائی کہئے آپ کی قسمت پھوٹی یا رہی۔

ایاز :۔ (جل کر) چپ رہو نشاط۔ (بڑے بڑے ڈگ بھرتے چلے جاتے ہیں)

نشاط :۔ (عزت کے اور قریب سرک کر) عزت آپا!

عزت :۔ نشاط بھئی ذرا ہٹ کر بیٹھو۔ (ذرا ہٹ جاتی ہے)

(نشاط پھر قریب گھس کر بیٹھ جاتا ہے)

عزت :۔ اُونہہ کھا لیا نشاط تم نے تو (اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

نشاط :۔ (فوراً کرسی کے ہتے پر بیٹھتے ہوئے) ابھی کہاں کھایا۔ ابھی تو چبا رہا ہوں۔

عزت :۔ (دھکیلتے ہوئے) ہٹ بھئی یہاں سے۔

نشاط :۔ تو خود ہٹ یہاں سے۔

عزت :۔ دیکھو نشاط میں تم سے بڑی ہوں۔ خبردار جو تُو کر کے بولے۔

نشاط :۔ جی۔ ہوئیں بڑی۔ ایسے بڑے بہت دیکھے ہیں۔

عزت :۔ بدتمیز کہیں کا۔ میں تجھ سے بہت بڑی ہوں۔ چار برس کے قریب۔

نشاط :۔ ہُوا کرو۔ مگر عقل تو نہیں ہے۔

عزت :۔ (جل کر) تم تو بس نہ معلوم عقل کے پتلے ہی ہو نا؟

نشاط :۔ پتلی دُبلی تو ہو گی تم۔ ہم تو سیدھے آدمی ہیں۔

عزت :۔ ہو گے۔

نشاط :۔ ہو گے کیا۔ ہیں ہی۔ یہ "مستقبل کی چیز ہیں" تم ہی ہو۔ تم ہی بس اس آسرے پر ہو کہ نہ معلوم کیا کیا ہو گی۔ ایاز کی بیوی ہو گی۔ میری خدانہ کرے بھاوج ہو گی۔ رم سرنا کی.....

عزت :۔ (تھپڑ مار کر) بس چپ۔ اُلو کہیں کا۔ زبان ہے کہ قینچی۔

نشاط :۔ دیکھو اگر ہم ماریں گے تو اپنی بزرگی لے کر آؤ گی۔

عزت :۔ بھئی نشاط کیوں دق کرتے ہو۔ جاؤ نا۔

نشاط :۔ ہوں۔ اور جب غرض پڑتی ہے تو؟

عزت :- بھیا میرا دماغ مت چاٹ۔ خدا کے واسطے جا۔ یا اللہ۔
نشاط :- (طعنہ سے) یا اللہ بچاری کو اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔ وہاں تو کوئی بھی دماغ نہیں چاٹتا۔ مت رو۔ ہم اب تجھے دق نہیں کریںگے۔
عزت :- پھر وہی تو تڑاق۔ نشاط مہربانی سے میرے کمرے میں سے نکلو۔
نشاط :- کیا۔ کیا۔ ورنہ .... ورنہ تم شگو سے شکایت کر دوگی؟
عزت :- (چڑکر) ہائے خدا۔ تم نہیں جاؤ! میں خود ہی غارت ہو جاؤں گی۔
نشاط :- "بسم اللہ"

(عزت بھناتی ہوئی جاتی ہے)

نشاط :- اچھا نہیں۔ اب نہیں۔ عزت آپا! (جھک کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) آپا! آپا!! آہستہ سے پیار کر لیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ لیکن دروازہ ہی سے لوٹتا ہے) ارے سنو تو عزت!
عزت :- (دھیان نہ دیتے ہوئے) کیا ہے بھئی۔
نشاط :- سنو کیا تمہیں "لمدراز خاں" پسند ہیں؟
عزت :- (چڑ کر) کون لمدراز خاں۔
نشاط :- (ہنستے ہنستے بچا کر) کیسی بنتی ہو۔ ارے وہی جو تمہارے گلے پیدا ہوتے ہی باندھ دیئے گئے۔ بڑی سے غلے کی شکل کیا خوب نام ہے ایاز؟ غلے!
عزت :- (ہنسی کو دباتے ہوئے) اپنی تو شکل دیکھو۔ طوطے جیسی ناک مرنگوڑ کہیں کے۔
نشاط :- میری غریب کی تو ناک آنکھ کا سوال ہی نہیں، مگر پھر بھی فاکسا کی ناک انکی بے ڈھبی ناک سے بدرجہا بہتر ہے۔ کیوں جھینپتی ہو۔ کہہ دو قائل ہوگئی۔ ناک واقعی خطرناک حجامت کی ہے۔
عزت :- کوئی نہیں۔
نشاط :- اے ہم خوب جانتے ہیں۔ وہ خود تم سے نفرت کرتے ہیں۔ اجی وہ کیا تم پر مرتے ہیں۔ وہ تو چچی جان کا دل رکھنے کو مجبوراً تمہیں قبول ہی تو ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ورنہ انکی تو کالج میں مس پر تہا کر سے بہت ہی .....
عزت :- (بے طرح ذلیل ہوکر) تو یہاں کون مرتا ہے ان کے لئے۔ ان کی مس پہ بہا کر ہوں یا کوئی اور۔
نشاط :- بھئی چچی جان کی دل شکنی کا خیال ہے۔
عزت :- (خودداری سے) معاف کیجئے گا۔ چچی جان کا دل خاک نہیں ٹوٹے گا۔ وہ ہزار دفعہ انکار کر دیں۔ اونہہ۔
نشاط :- جی معلوم ہے بس رہنے دیجئے۔
عزت :- نشاط (غصہ سے کھڑی ہو جاتی ہے)
نشاط :- عزت (کھڑکی والے صوفے پر دراز ہو جاتا ہے)

(عزت کتاب اٹھا کر ساری سنبھالتی ہوئی تیزی سے باہر نکلنے کے لئے بڑھتی ہے۔ دروازہ پر گھبرائے ہوئے ایاز سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ کھسیانی ہو کر لوٹ آتی ہے)

(نشاط منہ اور ناک بچوں کی طرح چھپا چھپا کر ہنستا ہے)

ایاز :- عزت تمہارا قلم ملا؟
عزت :- (نرمی سے) نہیں! نشاط کہتے ہیں ...... (نشاط کھڑکی میں سے کود جاتا ہے) کہ انہوں نے آپ کو دیدیا۔
ایاز :- مجھے۔ ارے ...... ارے بھئی نشاط ... لو وہ غائب ہو گیا نشاط احمد......

(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے)

نشاط :- (کھڑکی میں نیم دراز) ہوں ...... معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) کر دی شکایت اپنے چہیتے سے؟ (ہاتھ چلا کر) کیا کر لیا انہوں نے۔ بڑے۔ گولی ہی تو مار دی نہ۔
عزت :- (مجرمانہ لہجہ میں) میں نے شکایت تو نہیں کی تھی۔
نشاط :- (منہ بنا کر) "میں نے شکایت تو نہیں کی" بڑی معصوم بنتی ہیں۔ کون مسخرہ ان سے ڈرتا ہے۔ (اندر آ کر) جاؤ سو دفعہ شکایت کرو، نہیں دیتے قلم۔ کر لو کچھ۔
عزت :- بلا سے نہ دو مگر میری جان چھوڑ دو۔ (بے توجہی سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے)
ایاز :- (دروازہ سے) ارے نشاط تم نے مجھے تو عزت کا قلم نہیں دیا۔
نشاط :- (مصنوعی حیرت سے) نہیں دیا؟ ارے تو شاید عزت آپا کو دیا ہوگا۔ میں نے دیا کسی کو ضرور ہے۔

(عزت نشاط کی مکاری پر حیرت سے مسکراتی ہے)

(جوکی دوڑتا ہوا آتا ہے اور ایاز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ حورا نیم گریاں ٹھنکتی ہوئی پیچھے پیچھے آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو گھسونے لگتے ہیں)

نشاط :- ہیں ہیں۔ اے حورا دیکھ...... بس ...... بس ...... دوست جوکی بھئی ایک مارا اور میں نے تمہیں ٹھونکا۔ اے بس۔ با۔ آ۔ آ۔ س۔

(بیچ بچاؤ ہو جاتا ہے)

ایاز :- تم دونوں کیوں لڑ رہے ہو۔
حورا :- پہلے اس نے .... آن .... آن .... وہ بورڈ الٹ دیا اور لیکے ......"
جوکی :- (تیزی سے) ہے گپن .... خود تو مارا ...... آپی تو لتا

دو چھوٹا نام ہمارا نگار ہی ہیں ...... ہم نے تو ...... واہ ...... آن ...

حورا :- نہیں نہیں ...... ہم اسے مار کے رہیں گے چاہے کچھ ہی ہو جائے اس نے مارا ہی کیوں (جھپٹتی ہے)

نشاط :- (دونوں کو علیحدہ کرتا ہے) ارے ارے کیوں کھائے لیتے ہو۔

اماں جان :- (ایک غمناک چنگھاڑ سنائی دیتی ہے) ارے یہ کیوں حورا ڈکرا رہی ہے۔ ہیں؟ (سانس پھولی ہوئی دروازہ میں نظر آتی ہیں) میں کہتی ہوں یہ ......

حورا :- اماں۔ ن۔ یہ جولی نہیں مانتا ...... (دکھ بھری آواز سے روتی ہے)

نشاط :- جیا جولی آگئی تمہاری موت۔ اُڑو ...... (چٹکی بجا کر) چل ...... بھاگ۔

(جولی تیر کی طرح دوسرے دروازہ سے غائب۔ اماں جان حورا کو گھسیٹتی اور سارے گھر پر بڑبڑاتی چلی جاتی ہیں۔ ایک سکون سا کمرے پر چھا جاتا ہے۔ گویا مطلع صاف ہو گیا۔)

دوسرا سین

(نشاط کا کمرہ۔ ایک پلنگ پر نشاط چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ آہٹ پر سوتا بن جاتا ہے، عزت دبے پاؤں آتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ تازہ اخبار کے ورق الٹنے لگتی ہے۔ دوسرا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے، اور ایاز پنجوں کے بل داخل ہوتا ہے، اور عزت کی پشت پر سے جھک کر اخبار دیکھنے لگتا ہے۔ عزت چونکتی نہیں۔ ایاز کا بایاں رخسار عزت کے بالوں سے چھو رہا ہے، اور عزت کے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ کے ناخون سے ایاز نادانستہ کھیل رہا ہے۔ ایاز کچھ جھک کر کان میں کہتا ہے جس کا جواب عزت بہت آہستہ سے دیتی ہے۔ دونوں مسکراتے ہیں۔ ایاز کچھ اور کہتا ہے جس کا جواب عزت صرف نظروں سے دیتی ہے۔ نشاط کی چمکیلی آنکھ بار بار جھپک رہی ہے کبھی ایک کبھی دوسری۔ الماس کے بھاری قدموں اور گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ ایاز واپس اسی دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے۔ الماس ایک کھٹکے کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔)

نشاط :- افوہ ...... گویا الماس کے گانے سے بیدار ہوا ہے) اونہوں دماغ اڑا دیا۔ بھئی آپا کئی دفعہ کہا کہ خدا کے واسطے یوں نہ لہکا کرو۔ جگا دیا نہ۔

الماس :- (مجرمانہ مسکرانے کے انداز سے) لو ...... واہ میں نے کیا کیا۔ (سُر پھر ہلکی لہروں میں شروع کر کے)

نشاط :- (اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) اے آپا تم نے جگا دیا شکر ہے ...... ورنہ آج تو ختم ہی ہو گئے تھے۔

الماس :- کیوں (گیت برابر نہایت مردہ سُروں میں جاری ہے)

نشاط :- بڑا ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا دیکھا کہ میرے کمرے میں ایک چڑیل گھس آئی، اور کاغذوں کو بڑ کھڑ بڑ کرنے لگی۔ اتنے میں ایک بھوت بھی آگیا، اور دونوں میں وہ غاؤں غاؤں لڑائی ہوئی کہ خدا کی پناہ ...... اتنے میں تم نے گانا شروع کر دیا۔

(عزت سب کچھ سمجھ کر گویا سنا ہی نہیں)

الماس :- (کچھ نہ کچھ سمجھ کر) ہٹو ...... جانے کیا بک رہے ہو۔

نشاط :- سچ کہتا ہوں آپا۔ تمہارے بابو جی کی قسم۔

الماس :- (ذرا تنک کر) ذرا ہوش میں! کون میرے بابو جی۔

نشاط :- ارے خدا کے لئے آپا بیچارے بابو جی کو نہ بھول جانا۔ ورنہ بے موت مر جائیں گے۔ ارے وہی تمہارے والے بابو جی۔ وہی جنکے پاس صرف ایک پتلون ہے، جو کہ پہلے سفید تھی۔ مگر اب نہایت شبک کشمشی رنگ کی ہوتی جا رہی ہے لو ...... اب بھی نہیں سمجھیں؟ وہی جو تیل بیچتے پھرتے ہیں بابو محمود خاں؟ تمہارے منگیتر۔ آپا! مار ڈالے گا۔ یاد رکھنا بھوکا رکھے گا۔ کنجوس

الماس :- (بے طرح چراغ پا ہو کر) واہ جیسے خود تو بڑے لاٹ صاحب ہو نا۔ بڑے رئیس اعظم گھر کے۔ وہ تیل کے مرچنٹ ہیں ...... بیچتے پھرتے ہیں؟ ہنہہ۔

نشاط :- چولھے میں ڈالو اس تیل والے کو آپا۔ بڑا کنجوس ہے۔ ایک سگرٹ نکال لو تو فوراً کھٹ کھٹ گن لیگا۔ آپا ایک سال ہی میں سال بھر کا پکڑا دے گا۔ بڑا گرد ہے وہ چالاک!

الماس :- (جل کر) تم خود بھاڑ میں جاؤ ...... اُلّو ...... (بھنّاتی ہوئی چل دیتی ہے)

عزت (جاتے ہوئے) توبہ ہے نشاط۔ بچاری الماس کو خفا کر دیا۔ محمود تو ایسا اچھا آدمی ہے۔

نشاط :- تو پھر تم محمود سے ہی کیوں بیاہ نہیں کر لیتیں؟ چھوڑو ان سارس صاحب کو!

عزت :- (اپنی آفت آتی دیکھ کر) نشاط تمہاری عقل تو خراب ہو گئی ہے (تیزی سے چلی جاتی ہے۔ نشاط زور کا قہقہہ لگاتا ہے۔)

تیسرا سین

(عزت کا کمرہ۔ عزت کرسی پر بیٹھی آگے پیچھے جھول رہی ہے تصویروں کا ایک البم گھٹنوں پر کھلا رکھا ہے۔ نشاط مقررہ کھڑکی سے پھاند آتا ہے۔)

نشاط:۔ (کھڑکی میں سے گلدان ایک طرف پھینکتے ہوئے) یہ راستہ کیا کمبخت نے کیا کھڑاگ لگا رکھا ہے؟

عزت:۔ یہ راستہ ہے؟ بندروں کا راستہ کھڑکیاں اور روشندان ہوتے ہیں۔

نشاط:۔ اور اونٹ کا؟

عزت:۔ (فوراً سمجھ کر ہنستے ہوئے) کیا اونٹ؟

نشاط:۔ اب الماس کی طرح آپ غریب اونٹ کو بھی بھول گئیں!۔ دلاؤں یاد؟

عزت:۔ نشاط جاؤ بس فوراً جاؤ۔ چلو میں تمہاری ایک بات نہیں سنتی

نشاط:۔ (بہت ہی قریب ہو کر بیٹھتے ہوئے)۔ لو۔ ایک کتاب دی کہ۔

عزت:۔ (سب بھول کر) ارے کہاں سے لائے۔ (ہاتھ بڑھاتی ہے)

نشاط:۔ (ڈھٹائی سے) کیسی مطلبی؟ ارے منہ دھو جا کے پہلے لکس سے پھر آنا۔

عزت:۔ (ذراہٹ کر) اترانے کیوں ہو۔ کہاں سے ملی؟

نشاط:۔ (کتاب دیتے ہوئے) کہاں سے ملی؟ تمہیں کیا اس سے! اجی سارے شہر میں ڈھونڈی۔ لائبریری سے ملی۔ سارا دن سائیکل پر گرا ہوں تب ہاتھ آئی ہے۔ مہلک وہ (کندھے جھکا کر منہ چڑاتا ہے) بھلا تمہارے نے اتنا دوڑنے۔ حیرانگی کیا، وہ تو بیچارے مجبور ہیں۔ میں نے مس پر تھاکر کو دیکھا ہے۔ اس قدر اسٹائلش لیڈی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔

عزت:۔ اونھ ہوا کریں۔

نشاط:۔ جی ہاں۔ ہوا کریں۔ اب تو غریب بھائی جان کی قسمت پھوٹ ہی گئی۔ چچی جان کا دل رکھنے کو ....

عزت:۔ نشاط میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ کسی کا دل، دل نہیں ٹوٹا کرتا۔ .... معاف کرنا میری اماں ایسی گری پڑی نہیں ہیں۔ چچی نے ہی خوشامد کی تھی۔

نشاط:۔ ہاں۔ ہاں۔ میں کب کہتا ہوں ..... چچی ہی تو اپنے بیٹے کی دشمن ہیں۔ سچ کہتا ہوں۔ اماں جان بھائی جان سے بہت کم محبت کرتی تھیں۔

عزت:۔ (اپنی ہتک کی انتہا محسوس کرتے ہوئے) ایاز میں ایسے کون لعل جڑے ہیں۔ کیا دنیا میں دوسرا کوئی ہے ہی نہیں؟

نشاط:۔ بے شک بے شک۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم خود ان سے نفرت کرتی ہو۔ دوسرا "بے شک ان سے بہتر ہے (اپنے سینے پر انگلی رکھتا ہے)

عزت:۔ اس کا مطلب مجھ کر ہنستی ہے، چل بدتمیز

ایاز:۔ حورا کا ہاتھ پکڑے آتا ہے) عزت بھی آج فلم دیکھنے چلو گی؟

نشاط:۔ آپ کا حکم اور یہ نہ مانیں؟ مجال نہیں۔

ایاز:۔ اپنے مطلب کو الٹے معنوں میں لیتا دیکھ کر) میرا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ضرور ہی جائیں۔

نشاط:۔ (معنی خیز لہجہ میں) ہاں کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔ مس پر تھاکر رہ جائیں گی؟؟۔

ایاز:۔ (مسکرا کر) ہاں شاید مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔

(عزت کا چہرہ تمتما جاتا ہے)

ایاز:۔ بھئی حورا نے مجبور کیا ہے کہ اس فلم میں اُن کی روحانی دوست شرلی کام کر رہی ہے۔ لہذا وہ ضرور جائیگی۔

نشاط:۔ تو بھئی عزت تو جائیگی میرا کچھ ٹھیک نہیں۔

عزت:۔ (جلی کٹی آواز میں) جی نہیں میں نہیں جاؤنگی۔

ایاز:۔ (عزت کے لہجہ سے چونک کر) کیوں۔ آخر وجہ؟

عزت:۔ (کڑک کر) اپنا دل۔ کیا کوئی زبردستی ہے۔

ایاز:۔ (چڑ کر) زبردستی کی نہ ضرورت ورنہ کسی کو شوق۔ ہر ایک کو اپنے اوپر پورا اختیار ہوتا ہے۔

عزت:۔ (طعنہ سے) نہیں ہے۔ بلکہ ہے۔

نشاط:۔ بھئی میرے پاس تو ایک پائی بھی نہیں جو سینما جاؤں۔

حورا:۔ (چونک کر ایاز سے) بھائی جان میری پائی۔

ایاز:۔ ارے ..... تمہیں کو تو دیدی تھی .... یہیں تو تھی بیرا بھی اچھال رہا تھا۔

حورا:۔ واہ ہمیں تمہیں دی۔ ہماری پائی دھنکتی ہے)

ایاز:۔ (ڈھونڈتے ہوئے) ارے بھئی نہ معلوم کہاں گئی، ابھی تو تھی۔ اچھا حورا ہم دوسری لادینگے۔

حورا:۔ (مچلنے کی دھمکی دیتے ہوئے) آن ..... آن ہم تو وہی سی لینگے ایسی چمکیلی دالی۔

نشاط:۔ نہیں بھئی حورا ضد نہ کرو، بیکار ہے۔ اب تو وہ جھمجھاتی ہوئی تمہاری عمدہ والی کھو گئی۔ اب تم کالی ہی لے لینا۔ دوسری ..... کالی، ..... مت رو۔ غریب چھنتی بھی تو نہیں۔ ہائے ..... کیسی چمکیلی تھی، جیسے ستارہ۔ اس نے صبح سے زمین ایڑیاں رگڑ رگڑ چمکائی تھی۔ چپ رہ حورا۔

حورا :- (دردناک آواز میں : ہانپتی ہے) آں ہماری پانی۔ ہم تو آپ سے لیں گے۔

ایاز :- کہتا تو ہوں کہ دوسری لا دونگا۔

نشاط :- مگر وہ اُس چمکتی ہوئی کو کیسے بھولے۔ خیر اب وہ کالی ہی پیلے گی لے لو حورا کالی کلوٹی ہی۔ لے لو..... (چمکارتا ہے۔ حورا دہاڑوں دہاڑ روتی ہے۔ ایاز پریشان کھڑا ہے)

اماں جان :- (دبنگ آواز سُنائی دیتی ہے) ائے یہ کون حورا کو مارے ڈالتا ہے۔ چین نہیں لینے دیتے۔ (دروازہ میں سے) یہ کیا قصہ ہے؟ (دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کے) میں کہتی ہوں میری قسمت کا چین ہی اُڑ گیا ہے۔ ہوا کیا"

نشاط :- (جلدی سے) اماں جان حورا کی چمکتی ہوئی پانی بھائی جان نے کھیلتے کھیلتے نہ معلوم کہاں کھو دی۔ اب اُسے کالی دے رہے ہیں۔ وہ ذرا رنجیدہ ہے۔

اماں جان :- (جھلا کر) ایاز میاں بوڑھے ہو گئے مگر بچوں کی چیڑ چھاڑ کی اب بھی ضرورت ہے۔ آج کو پانی چھینی کل کو ننھی کی چُسنی چھین لینا۔

ایاز :- (جزبز ہو کر) اماں جان...... آپ تو خواہ مخواہ ....

نشاط :- بھائی جان گستاخی معاف۔ بزرگوں کو اس طرح نہیں دھمکاتے" خواہ مخواہ۔ بھلا اماں جان خواہ مخواہ آپ کو کیوں دق کرینگی

ایاز :- چُپ رہو نشاط؟ تمہاری بک بک ہر جگہ......

نشاط :- جی ہاں؟ بزرگوں سے زبان چلانے نت روکوں تو بک بک، خوب!۔

اماں جان :- (روہانسی ہو کر) ارے میاں (سرد آہ بھر کر) مجھے کیا ذلیل کروگے، اللہ نے چاہا خود رُسوا ہوگے تمہارے چھوٹے تمہارے جوتیاں لگائیں گے۔ (بھناتی ہوئی چلی جاتی ہیں)

(ایاز کچھ جھلایا کچھ شرمندہ کچھ سراسیمہ بیٹھا رہ جاتا ہے)

نشاط :- گویا کچھ ہوا ہی نہیں، ہاں تو بھئی عزت سینما جاؤ گی؟ پہلے شو میں یا.....

عزت :- (تیزی سے) میں نے کہدیا میں قطعی نہ جاؤنگی۔

نشاط :- تو بھائی جان پر کیوں غصہ ہوتی ہو۔ انہیں ویسے ہی اماں جان نے کیا کم ڈانٹا ہے۔

ایاز :- (عاجز آکر) نہ جاؤ کون کہتا ہے (بڑبڑاتا چلا جاتا ہے)

نشاط :- بھائی جان کا غصہ بہت بڑھ گیا ہے۔ بچاری عزت کو کیسا ڈانٹا۔

عزت :- (ضبط سے) ہونے غصہ تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔

نشاط :- اور کیا۔ عزت کا کون کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ کیوں ہے نا....

(جھک کر اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتا ہے، عزت آپا رو رہی ہو۔ واہ بھئی واہ ......(جھک کر اُسکے بالوں کو چوم لیتا ہے اُدھر رُخسار عزت کے آنسو!!!"

چوتھا سین

(عزت اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھی ہے، کمرے میں صرف ایک ہلکا بلب جل رہا ہے، قریب میز پر ایک گلاس ٹھنڈے پانی سے بھرا رکھا ہے جس میں سے کبھی کبھی عزت ایک گھونٹ پی کر ویسے ہی رکھدیتی ہے)

نشاط :- (آہستہ سے داخل ہو کر ایک دم بجلی بجھا دیتا ہے) نواب پڑھو چین سے۔

عزت :- (گھبرا کر) ارے میرا دل اندھیرے میں بہت گھبراتا ہے بھئی خدا کے لئے بجلی جلاؤ۔

نشاط :- (بجلی جلا کر) تو پھر تم لیمپ سے کیوں نہیں پڑھتیں (دوسرے کمرے سے لیمپ لا کر رکھدیتا ہے۔ گلاس ہٹا کر صوفہ پر رکھدیتا ہے)

عزت :- آج تم نے شاباشی پانے کا کام کیا ہے۔

نشاط :- کیا پڑھ رہی ہو؟ ہمیں بھی سُناؤ۔ ذرا سی جگہ میں صوفے پر لیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ (گلاس اُلٹ جاتا ہے اور دونوں بھیگ جاتے ہیں۔)

عزت :- اوف۔ بیوقوف کہیں کے۔ سارا بھگو دیا۔

نشاط :- میرا نام لگا دو۔ میں نے بھگویا ہے؟ کہدو ہاں!

عزت :- (اُسکے جھوٹ پر متعجب ہو کر) نشاط۔ اور پھر کس نے پانی کا گلاس یہاں رکھا۔

نشاط :- تم نے عزت۔ ارے کیا اسقدر جلدی باتیں بھول جایا کرتی ہو۔

عزت :- انتہا ہے تمہارے جھوٹ کی۔

نشاط :- اچھا ٹوس کر لو کہ کس نے گلاس رکھا۔ (جیب سے پائی نکال کر) بولو ہیڈ یا ٹیل؟

عزت :- (مذاق سمجھ کر) ہیڈ۔

نشاط :- (پائی اُچھالتا ہے) آہا ہیڈ۔ گلاس تم نے گرایا۔

عزت :- (ہنستی ہے) ارے نشاط یہ پائی تو حورا کی ہے۔

نشاط :- خوب! میری ہے۔

عزت :- چل جھوٹے۔

نشاط :- چل جھوٹی۔

عزت :- نشاط۔ میں تم سے بہت بڑی ہوں تمہیں میرا ادب کرنا چاہیئے۔

نشاط :- بالکل غلط۔ ہم ایک سرے سے تمہاری بزرگی کی تھیوری ہی نہیں مانتے۔ کون کہتا ہے کہ تم مجھ سے بڑی ہو۔ بالکل غلط۔

عزت :- تمہارے کہنے سے چھوٹی ہو جاؤں گی؟ جاؤ اب میں پڑھوں گی۔ جا۔

نشاط :- (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) ہم باجا بجائیں گے۔

عزت :- (کتاب ڈھونڈتی ہے۔ صوفہ پر، میز پر اور کتابوں میں صوفہ کے نیچے۔ ادھر اُدھر نہیں ملتی) ارے میری کتاب کہاں گئی نشاط۔

نشاط :- (دوسرے کمرے میں باجا بجاتے ہوئے) خاموشی سے سنو کتنا عمدہ ریکارڈ ہے۔

عزت :- خاک بھی اچھا نہیں۔ مگر میری کتاب؟

نشاط :- (باجا اُٹھا کر لاتا ہے) تو تم ہی کوئی اچھا سا بجاؤ

(عزت بڑی احتیاط سے ایک ریکارڈ لگاتی ہے نشاط اسکی سریلی آواز پر رقص کرتا ہے۔ عزت داد طلب نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ نشاط رقص کرتا کرتا عزت کے پاس آتا ہے، اُسکے دونوں ہاتھ پکڑ کر رقص کرتا ہے عزت ہنس رہی ہے، ایکدم اُسکے دونوں ہاتھ چھوڑ دیتا ہے اور کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے زور سے بھینچ لیتا ہے۔ عزت تھوڑی دیر ہچکچاتی ہے، پھر آہستہ سے اُسکے ہاتھ اٹھ کر نشاط کی پیٹھ پر جاتے ہیں اور ایک پل کے لئے اُس سے لپٹ جاتی ہے۔ لیکن فوراً بچھو کی طرح کوئی ڈنک سا اُسکے دل میں مارتا ہے، اور نشاط کو زور سے دھکا دے کر فوراً دوسرے کمرے میں بھاگ جاتی ہے۔ نشاط زور سے تالی بجا کر ہنستا ہے۔ عزت تھوڑی دیر کے لئے قائل ہو جاتی ہے۔ کہ نشاط اُس سے بڑا ہے بڑا ... بہت بڑا .....)

پانچواں سین

(عزت کمرے میں بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ نشاط کھڑکی میں سے چھلانگ مار کر آتا ہے۔ عزت چونک پڑتی ہے)

نشاط :- (عزت کو چپ دیکھ کر) ہم سمجھ گئے۔ بولو بتائیں۔

عزت :- (ڈھٹائی سے) کیا سمجھ گئے۔ کچھ ہو بھی۔

نشاط :- بھوکی ہو!

عزت :- ہٹو بھی۔

(جوجی بسکٹ ہاتھ اور منہ میں لئے آتا ہے۔ نشاط اسے شکاری نظروں سے دیکھتا ہے)

نشاط :- ارے جوجی بس بھکے جاتا ہے۔ ایک دن تیرا پیٹ ضرور پھٹے گا۔

جوجی :- (اترا کر) آج ہماری اُنگلی تو آپا نے بچا دی تھی۔

نشاط :- ہوں... تو اب یہ تو زخم پر مرہم ٹھونس رہا ہے (لہجہ بدل کر) بھئی ہمارا جوجی تو بس لاکھوں میں ایک ہے۔ یہ عزت آپا بچاری بھوکی ہیں۔ انہیں سب بسکٹ دیدے گا۔ عورا کبھی نہیں دیتی بڑی کنجوس ہے، عزت تم نے یہ نہیں دیکھا کہ بے مانگے چیز دے دیتا ہے۔ اب یہ بسکٹ جو لئے ہے وہ ہمیں بے مانگے دیدیگا، اور خود اور لے آئیگا۔ خود دیدیتا ہے۔ مانگنے کی ضرورت کب ہے؟

جوجی :- (اکڑ میں آکر) لیجئے۔ ہم اور لادیں۔ ہیں؟ لادیں؟

نشاط :- وہ تو تم لا ہی دوگے! کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جوجی غضب کا تیز ہے، وہ چلا...

(جوجی ترنگ میں آکر بے تحاشہ دوڑتا ہے۔ دروازہ پر بہت زور کی چوٹ لگتی ہے اور گر پڑتا ہے رونا چاہتا ہی ہے کہ نشاط کہتا ہے)

نشاط :- عورا صاحبہ گرتی ہیں۔ فوراً ہیں ہیں روتی ہیں۔ جوجی چاہے کتنے زور کی چوٹ لگے کبھی نہیں روتا، وہ اٹھ بھی بیٹھا، وہ کھڑا ہو گیا ہنس بھی رہا ہے۔

(جوجی ضبط کر کے اُٹھتا ہے، زبردستی کی ہنسی ہنستا ہے اور چلا جاتا ہے۔ عزت بے تاب ہو کر ہنستی ہے۔)

نشاط :- عزت کہو کیسا شکار کیا ہے۔

عزت :- ہٹ۔ بچے سے چھین لیا۔ فریبی۔ میں تو نہیں کھاتی

نشاط :- اپنے بس نہ کھاؤ گی (زبردستی بسکٹ ٹھونس دیتا ہے۔ سارا بسکٹ کا چورا عزت کے منہ پر لگ جاتا ہے۔ جو ہنس بھی رہی ہے اور غصہ بھی ہے)

اماں جان :- (دکھ بھری آواز میں) بھاڑ میں جائیں بسکٹ، تیرے باوا نے دکان لگادی ہے جو ہر وقت بسکٹ بسکٹ! ابھی جو دیا تھا۔ ...... کیا نشاط نے لیا؟ اوئی یہ نشاط کا دماغ کیوں چل گیا۔

(دندناتی ہوئی داخل ہوتی ہیں) نشاط بیٹا یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ...

نشاط :- (نہایت سلجھی ہوئی آواز میں) اماں جان۔ ذرا پہلے میری سنئے۔ عزت کو بھوک لگ رہی تھی اُنہوں نے ذرا سا بسکٹ لے کر کھا لیا۔

اماں جان :- (چونک کر، بسکٹ کا چورا منہ پر دیکھ کر ہونے والی بہو کے اچھے اطوار نہ دیکھ کر) اوئی۔ عزت نے جوجی سے بسکٹ کیوں لیا کیا گنجینہ میں تالہ پڑا ہے۔ خود نکال لیں۔

نشاط :- اماں جان وہ بچاری تکلف کرتی ہیں۔ آپ کھانے پر انہیں اس قدر کم کھلاتی ہیں۔ اُنہیں بھوک لگتی ہے۔

اماں جان :- (بے بات کے الزام سے چراغ پا ہو کر) لو اور لو مذہبی

میں کیوں کم کھانا دیتی۔ وہ آپ ہی کم کھاتی ہیں۔

نشاط:۔ ہاں ہمیں بھی بسکٹوں سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ بھائی جان ہمیشہ لا دیا کرتے ہیں۔ آجکل وہ بھی نہیں لاتے۔

اماں جان:۔ (ہوئے دلی بہو کی منگیتر سے بسکٹ منگا کر کھانے والی بات کو سخت معیوب سمجھ کر) موئی یہ نگوڑے بسکٹوں کا کیا شوق ہے۔ جی چاہا کھاتو گنجینہ میں سے لئے ہوتے۔ ڈلی جاتی ہیں۔ عزت جیسے ہونے کا اماں اور بیٹے نے بالکل موقع نہ دیا حیرت سے منہ کھولے دیکھتی رہتی ہے۔ نشاط کی ہنسی سے چونک کر موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے لگتی ہے)۔

چھٹا سین

(ڈرائنگ روم نما کمرہ جس میں دو پلنگ پانچ چھ کرسیاں اور زمین پر فرش ہو رہا ہے۔ ایک نیچی سی کوچ پر الماس بیٹھی کچھ سی رہی ہیں محمود نیم دراز بظاہر تاشوں کی گڈیاں لگا رہا ہے۔ لیکن الماس سے سرگوشیاں بھی کر رہا ہے۔ اماں جان پلنگ پر بیٹھی پیر دبوا رہی ہیں اور انا کے شوہر کے معشوقانہ مظالم بھی سُن کر نا قدانہ رائے پاس کر رہی ہیں۔ جولی اماں کے کونے سے لگا منہ سے فٹ بال میں ہوا بھرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور ہر سانس پر ہانپنے لگتا ہے۔ بیچوں بیچ قالین پر حورا اور ایاز کیرم کھیل رہے ہیں عزت چوکی کے کونے پر ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھے کسی خیال میں غرق ہے۔)

حورا:۔ واہ...... آن .... آن۔ بے ایمانی۔ آپ تو سیدھے ہاتھ سے کھیلتے ہیں۔

جولی:۔ اونھ ہنک ہنک ابھی پھر ہوا ختم ہوگئی۔ کیا کریں جنے!

الماس:۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ زرد پر سوائے کالے کے کچھ اچھا نہ لگیگا (عزت سے) کیوں عزت آپا۔ (کچھ دکھاتی ہیں۔ عزت وہیں سے سر ہلا دیتی ہے)

نشاط:۔ (دبے دبے آتے ہیں اور فرمانبردار بیٹے کی طرح اماں جان سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں)

محمود:۔ ارے بھئی .... کچھ دال میں کالا ہے۔ عزت اور نشاط کی جنگ ہوگئی۔ کیوں بھئی عزت؟

عزت:۔ جی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔

نشاط: مجھے کسو کی کی سیر تو کرنی نہیں جو لڑتا پھروں۔

محمود:۔ گڑ ہوئی ہے لڑائی۔ سنا ایک بسکٹ کے ٹکڑے پر جوتا چل گیا۔ عزت بیچاری نے بڑی مصیبت سے جولی کو پھانس کر بسکٹ چھینا، اس پر نشاط کی نیت آگئی۔ سنا ہے مارکٹائی تک نوبت پہونچ گئی۔

نشاط:۔ آپ سُنا بہت کرتے ہیں۔ کون سے کان سے سُنتے ہیں۔

محمود:۔ (الماس کی طرف اشارہ کرکے) انہوں نے....

نشاط:۔ (قہقہہ لگا کر) بھئی خوب۔ اس کان کو تو خوب مروڑ دیتے ابھی بالکل گنگ ہو گیا ہے۔

الماس:۔ (ذرا چڑ کر) میں نے تو نہیں کہا کہ جوتا چلایا گیا ہوا۔

نشاط:۔ آپا کچھ بگڑنے کی بات نہیں ہے۔ تیل کا بھاؤ گر رہا ہے۔

نشاط:۔ جولی بھیا یہ تو کب تک ہوا بھرے گا۔ لاؤ میں بھر دوں (ہوا بھرنے لگتا ہے)

محمود: بھئی ہم بھی کیرم کھیلیں گے۔ آؤ الماس ہم تم ایک طرف۔

الماس:۔ ذرا ٹانکا ختم کرلوں جب تک عزت کو لے لو۔

محمود:۔ آؤ عزت۔

عزت:۔ جی نہیں۔

محمود:۔ نہیں کیسے (زبردستی پکڑ کر بٹھا لیتا ہے) کھیل شروع ہوتا ہے۔

نشاط:۔ آؤ جولی ہم تم فٹ بال کھیلیں۔ لیکن بھئی ہاتھوں کی ہے۔

جولی: ہاں بھئی۔

(نشاط اور جولی بیچ میں گیند اُچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ بال بار بار عزت کے اوپر گرتی ہے، دو ایک دفعہ اس کا پیر بھی نشاط سے بھولے میں کچل جاتا ہے۔ جسکی وہ بہت رکھائی سے معافی مانگتا ہے۔ ایک دفعہ عزت گیند لے کر دور پھینکدیتی ہے۔ نشاط جل کر کھیل بند کرکے کیرم دیکھنے لگتا ہے)

نشاط:۔ واہ بیچاری حورا ہار رہی ہے۔ بے ایمانی ہو رہی ہے صفا۔

حورا:۔ آن ... ... بے ایمانی۔

نشاط:۔ جناب وہ آپکے ساتھ نہیں کھیلے گی۔ بلکہ ہمارے ساتھ کھیلے گی۔ وہ بورڈ اُلٹ دیگی۔ (حورا شیخی میں آکر بورڈ الٹ دیتی ہے۔ دوسرا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ ایاز اور نشاط، عزت اور محمود۔ تین دفعہ عزت کی اُنگلی میں نشاط سے اسٹرائکر لگتا ہے۔ اور دو دفعہ بورڈ کے نیچے پیر دب جاتا ہے۔ عزت روہانسی ہو کر ہٹ جاتی ہے)

عزت:۔ میں نہیں کھیلتی۔

نشاط:۔ ہارنے وقت جولی بھی یہی کرتا ہے۔ (منہ چڑا کر) ہم نہیں کھیلتے!

محمود:۔ اچھا بھئی اب کے کچھ گڑبڑ نہ ہوگی۔ عزت یہ بازی ختم کر دو۔ (کھیل شروع ہو جاتا ہے)

عزت:۔ (اپنی دانست میں بورڈ ختم کرکے) یہ لیجئے بس۔

نشاط:۔ (تلخ لہجہ میں) اوہ یہ۔ یہ۔ ان دو بدنصیب گوٹوں کو کون ڈالیگا۔ میاں؟

(عزت شک کی نظروں سے نشاط کو دیکھتی ہے، اور کونے میں رکھی ہوئی گوٹوں کو ایک ہی وار میں ڈال دیتی ہے۔ نشاط جولی کے گدگدی کرتا ہے۔ گویا اس نے کچھ دیکھا نہیں)

جولی :- بھیا نے یہاں دو گوٹیں نکال کر رکھ دی تھیں۔

عزت :- بے ایمان آدمی کے ساتھ میں نہیں کھیلتی۔

نشاط :- شکریہ۔ تو پھر کیجئے ادھر سے کالا منہ۔ آپ اردھ اٹھیں گی۔

عزت :- تم خود کالا منہ کرو۔

نشاط :- جی! میری اور آپ کی بول چال بند تھی۔ بھئی حد کر دی انہوں نے بھی ڈھٹائی کی۔ میں منہ لگاتا نہیں اور آپ ہیں کہ بولے چلی جاتی ہیں۔

عزت :- اور یہ جو بار بار گیند آ کر میرے ہی اوپر گر رہی تھی یہ کیا تھا؟ آخر میری ہی انگلی میں تمہارا اسٹرائکر بار بار کیوں لگ رہا ہے۔ بولتے نہیں تو غنیمت ہی تھا۔

نشاط :- یہ تو سب اتفاق سے لگ جاتی تھی۔

عزت :- لعنت تمہارے اتفاق پر کہ وہ بس میرے ہی لئے رہ گیا ہے۔

نشاط :- (آگے جھک کر) تو پھر ملاپ کر لو نا۔ بولو!

عزت :- میں تم سے لڑی کب تھی؟

نشاط :- پھر یہ منہ کیوں کپا ہو رہا ہے۔ (گال پھلا کر نقل کرتا ہے)

(عزت ہنس دیتی ہے)

نشاط :- ہاتھ ملالو۔

(عزت ہاتھ بڑھاتی ہے۔)

نشاط :- (جھجک کر اس کے ہاتھ کو ایسے دیکھتا ہے گویا اس میں کوئی غلاظت بھری ہے) ٹھیر و بھئی ہم ایسے ہاتھ نہیں چھو سکتے (ہاتھ کو کرتے کے دامن میں لپیٹ کر) لو اب ملاؤ۔

عزت :- (بگڑ کر) جب میرے ہاتھ ناپاک ہیں تو پھر ملانے کی ہی کیا ضرورت ہے۔

(پھر لڑائی ہو جاتی ہے)

نشاط :- اچھا نہیں (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں۔ نشاط زور سے اس کا ہاتھ دباتا ہے اور خوب جھٹکتا ہے)۔ (محمود سے) محمود بھائی میں سمجھتا تھا کہ عزت میں ذرا تو خودداری ہوگی یعنی کمال کی بے حیا ہیں۔ ادھر لڑیں اور ادھر خوشامد کر لی۔

عزت :- چل ہٹ۔

نشاط :- (اور قریب آتے ہوئے) سچ بتاؤ مجھ سے لڑ کر اُداس تو بہت تھیں۔

عزت :- میں؟ ارے ہٹ بھی۔ مجھے تیری خفگی کی کیا پروا ہوگی؟

نشاط :- بھئی یہ تو تم ہی خوب جانتی ہو۔ (دونوں ہنستے ہیں)

ساتواں سین

(عزت گرم شال اوڑھے پلنگ پر لیٹی ہے۔ منہ تمتمایا ہوا ہے۔ حرارت اور زکام ہے۔ کبھی کبھی کھانستی ہے۔ ایاز جنوبی دروازے سے داخل ہوتا ہے اور عزت کے پلنگ کے پاس والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

ایاز :- (نہایت نرم آواز میں) عزت کیسی ہو؟

عزت :- (جواب میں کھانستی ہے اور اپنا ہاتھ ماتھے پر لے جاتی ہے۔) درد ہے۔

ایاز :- (محبت سے اُسکے بالوں پر اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہے) تم ایک ہفتہ میں تو اچھی ہو جاؤ گی؟ کیوں۔ (جواب کے لئے اُسکی آنکھوں کو دیکھتا ہے)

(عزت سر ہلاتی ہے۔ لیکن آنکھوں میں آنسو ہیں۔)

ایاز :- (کچھ سراسیمہ ہو کر بہت ہی آہستہ سے) کیوں؟ کیوں؟

عزت :- کچھ نہیں۔ (بے چینی سے کروٹ لیتی ہے)

نشاط :- (کی آواز باہر سے) جی ہاں۔ عزت کے پاس بیٹھے ہیں۔

(ایاز کچھ گھبرا کر شرماتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بغیر کچھ کہے باہر نکل جاتا ہے)

نشاط :- (اطمینان سے سیٹی بجاتا آتا ہے) ارے تو کیوں اس قدر ٹھونس جاتی ہو جو مرنے لگتی ہو؟

(عزت کچھ چڑ کر مسکرا دیتی ہے)

نشاط :- (پلنگ پر اس طرح بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہاتھ عزت کے اوپر سے لیجا کر دوسری طرف پلنگ کی پٹی پر رکھے ہے) بہت گال پھول چکے تھے (گال ہلکے سے نوچتا ہے) میں کہتا ہوں کہ اب بھی تو مجھ سے چڑ گئے ہیں۔

عزت :- دیکھو میں اُٹھ کر چلی جاؤں گی۔ اگر تم نے مجھے دق کیا۔

(اُٹھنا چاہتی ہے)

نشاط :- (نہیں اُٹھنے دیتا اور جھک کر گال پر پیار کرتا ہے۔ خاموشی اُسکے رخسار پر رخسار رکھ دیتا ہے) عزت۔ میری عزت۔ عزت۔ عزت

(عزت کچھ مسحور سی آنکھیں پھاڑے خلا میں گھور رہی ہے)

(نشاط عزت کی ٹھوڑی پکڑ کر اُسکے ہونٹ چوم لیتا ہے۔ عزت کانپنے لگتی ہے)

الماس :- (گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ اور دروازہ میں آ کر) نشاط تم تو کہہ رہے تھے کہ محمود عزت کے پاس بیٹھے ہیں؟

نشاط :- (ذرا بھی نہ گھبرا کر) میں کھا گیا اُن کو۔ ارے چلے بھی گئے وہ تیرے آنے سے پہلے۔

(الماس جلتی ہوئی بڑبڑاتی چلی جاتی ہے)

ایاز :- (دوسرے دروازہ سے آ کر) نشاط میں سمجھا تم میرے لئے کہہ رہے

نئے کہ عزت کے پاس بیٹھا ہوا ہوں گا۔

نشاط :- کب؟ (مکاری سے) تو کیا آپ بیٹھے تھے؟ ہوا کیا اس میں۔

ایاز :- اماں جان ذرا معیوب سمجھتی ہیں۔

نشاط :- (جلے کٹے لہجہ میں) اماں جان کس بات کو معیوب نہیں سمجھتیں؟ اس دنیا میں سب ہی ہر بات کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اب اگر جائے آپکے میں عزت سے شادی کرنا چاہوں تو سب معیوب سمجھیں گے۔ (ایاز کو بے طرح حیران دیکھکر) اگر الماس محمود کی بجائے سعید انکے بڑے بھائی سے شادی کرے تو لوگ معیوب نہ سمجھے گا۔ حالانکہ سعید محمود سے ۹۹ فیصدی زیادہ انسانیت رکھتے ہیں۔ یہ دنیا تو سب باتوں کو معیوب سمجھے گی! آپ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے ابھی عزت کے رخسار اور ہونٹ چومے تو آپ اسے معیوب سمجھیں گے (ایاز کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے) معیوب سمجھنے کی خوب کہی۔ اب عزت جو آپ کی بہ نسبت مجھ کو زیادہ پسند کرتی ہو تو کیا معیوب بات نہیں کرتی؟ بالکل معیوب! قطعی معیوب! اُسے کیا حق کہ مجھے زیادہ پسند کرے اور آپ کو کم۔ یا بالکل نہیں؟

(عزت گویا کچھ کہنے اور سننے کی اس میں طاقت بھی نہیں)

ایاز :- (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) نشاط تم کیا کہہ رہے ہو؟

نشاط :- میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں جو آپ نے سُنا اور سمجھے۔ مگر میں معیوب اور غیر معیوب ہونیکے سوال کو ہی بیہودہ سمجھتا ہوں۔ یہ سراسر غلطی تھی کہ عزت کے پیدا ہوتے ہی اُسے آپکے ساتھ منسوب کر دیا جائے۔ کیا یہ معیوب نہ تھا؟ عزت کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ بچاری جب وہ بڑی ہوئی۔ آپ کو ہی شوہر کے لئے مقرر کیا ہوا پایا۔ لیکن وہ بھی تو انسان ہے۔ اسکی خود کی بھی تو کوئی آزاد رائے ہے۔ وہ مجھے پسند کر سکتی ہے۔ خواہ ہفتہ بھر بعد وہ تمہاری قانوناً بیوی ہو جائے۔

ایاز :- (پراگندہ خیالوں کو یکجا کرتے ہوئے) تو نشاط کیا تم سچ کہتے ہو؟ کیا تم عزت کو پسند کرتے ہو؟ تم بچے ہو۔ عزت سے چار سال چھوٹے ہو۔ تم ابھی ایک طالب علم ہی ہو۔

نشاط :- (تلخ ہنسی ہنس کر) یہی تو معیوب بات ہے ایک عمر میں چھوٹا طالب علم، اور ایک بڑی لڑکی سے توبہ توبہ۔ اپنے سے بڑے سے تو محبت ہی نہیں کی جا سکتی۔ جب ہی تو عزت آپ سے محبت نہیں کر سکتی۔ (گویا عزت کمرے میں ہے ہی نہیں)

ایاز :- مگر نشاط ذرا سوچو تو کیسی عجیب بات ہے۔ میری عقل......

نشاط :- "یہ دوسرا لفظ "عجیب" اور بھی گھناونا ہے۔ بھائی جان آپ تو دنیا کے غلام ہیں۔ آپ وہی سوچ سکتے ہیں جو دنیا سوچتی ہے، آپ کے خیالات تک دوسروں کے غلام ہیں۔ آپکی عقل اپنی نہیں "اناجی" اور دنیا کے دوسرے اُستادوں کی عقل کی نقل ہے۔ آپ بڑے بیٹے ہیں، اماں کے ارمانوں کی آماجگاہ ہیں۔ برسر روزگار ہیں۔ تندرست ہیں۔ عزت کے منگیتر ہیں۔ اور میں ایک کمزور چھوٹے سائز کا جو ابھی صرف طالب علم ہی ہوں جو بقول عزت "بیلا مینڈک" "روزگار روگی"۔ لیکن معاف کیجئے گا میرے خیالات خود میرے دماغ سے نکلتے ہیں اور وہ آپکے چھوٹے دماغوں سے زیادہ سچے۔ زیادہ بلند مگر زیادہ "معیوب" اور زیادہ "عجیب" ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ ایک عقلمند لڑکی میرے دماغ کی قدر نہ کرے، اور آپ پر مجھے ترجیح نہ دے۔ مگر پھر وہی معیوب ہونے کا سوال بیچ میں آجاتا ہے۔

ایاز :- (بے طرح مجروح ہو کر بھاری آواز میں)۔ نشاط تم نے میرا دماغ پریشان کر ڈالا۔ اُف (سر کو دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑتا ہے) کل تک ..... نہیں ابھی ابھی ...... اُفوہ ...... (عزت سے) عزت نشاط کیا کہہ رہا ہے۔ بولو کیا سب سچ ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے ذرا بھی جگہ نہیں۔

(عزت دبی سسکیوں سے رونے لگتی ہے۔)

نشاط :- عزت! (مذاق کے لہجہ میں) یہ سب معیوب ہے۔ تم خواہ کسی کو چاہو۔ مگر منگیتر ازل سے ابد تک تم ایاز کی ہی ہو۔

(عزت تڑپ کر اُٹھتی ہے اور دوسرے کمرے میں جھپٹ کر چلی جاتی ہے)

نشاط :- عزت یہ سب معیوب ہے۔ (زور سے ہنستا ہے ایاز مجروح اور پراگندہ کرسی کا ہتہ پکڑے کھڑا ہے)۔

آٹھواں سین

(عزت کا کمرہ۔ الماس، عزت کے کپڑے طے کر کر کے صندوق میں رکھ رہی ہے، سامان سفر نظر آتا ہے، چاروں طرف کپڑے بستر جوتے موزے بکھرے ہوئے ہیں۔ اداسی چھائی ہوئی ہے)

الماس :- عزت آپا، آخر ایسی جلدی جانے کی کیا تھی؟

عزت :- الماس میرا دل بہت ہی گھبرا رہا ہے، اماں کو دیکھنے کے لئے بہت دل چاہتا ہے۔ (آنسو بھر آتے ہیں)

الماس :- تو تم نے تار کیوں دیا۔ بھائی جان کو کچھ پتہ نہیں، وہ تو کل شام کو ہی اپنے دوستوں کیساتھ چلے گئے۔

عزت :- ہوں۔ (کسی خیال میں پڑ جاتی ہے)

نشاط :- آج پہلی دفعہ رنج کے آثار چہرے پر لئے ہوئے آتا ہے اور الماس اور عزت کے قریب والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) دنیا نہ معلوم اتنی بزدل

یوں ہے۔ کیوں اتنا ڈر سب پر چھایا ہوا ہے۔ ابھی ابھی انسان ایک بات کہتا ہے، اور دوسرے لمحہ میں ڈر کر چپ ہو جاتا ہے۔ ساری ہمت رخصت۔ آجکل بھی پڑھ لکھ جانیکے بعد لڑکیاں کتنی بزدل ہیں...... ہوں...... ذلیل۔

(عزت رحم طلب نگاہوں سے نشاط کو دیکھتی ہے اور کچھ کپڑے طے کرنے لگتی ہے۔)

نشاط :۔ آپا الماس کبھی تم نے بھی محمود سے کہا ہے کہ تم اُسے چاہتی ہو، اور پھر منگنی کی؟

الماس :۔ (منہ شرم سے لال کر کے) واہ...... چل بدتمیز...... واہ...... دماغ ہی چل گیا ہے۔

نشاط :۔ (ہنس کر) تو اتنی غصہ کیوں ہوتی ہو۔ سچ بتاؤ اُسے چاہتی ہو؟۔

الماس :۔ نشاط میں اماں جان سے کہدوں گی کیسی بُری باتیں کرتا ہے۔

نشاط :۔ معیوب نا؟...... پھر وہی بے ہودہ لفظ معیوب!...... اُفوہ...... آپا تمہیں محمود کی قسم جو تم نہ بتاؤ کہ محمود کو چاہتی ہو یا نہیں۔

محمود :۔ (دروازے میں سے جھانک کر) ہم بتائیں۔

(الماس بھن بھناتی ہوئی اُٹھ کر جانے لگتی ہے۔)

محمود :۔ غصہ کیوں ہوتی ہو۔ بھئی ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ کہا ہے اور دو دفعہ کہا ہے اور انکار یا نہیں۔

نشاط :۔ آہا پھر بھلا میں کہوں تو کیوں بھائی جان خودکشی کی دہمکی دیں...... اگر میں کہوں کہ میں عزت کو چاہتا ہوں تو کیوں عزت صرف دکھا دے کو ہاں، صرف دکھا دے کو مسوری تار دے کر چلدے۔ بتاؤ نا خود وہ بھی تو مجھے چاہتی ہے۔ محمود بھائی کیا یہ کچھ جھوٹ ہے۔

(الماس اور محمود حیرت سے منہ پھاڑے نشاط کو دیکھ رہی ہیں جو روتی ہوئی عزت کو اعتراض کی نظروں سے دیکھ رہا ہے)

محمود :۔ نشاط یہ بہت بُری باتیں ہیں۔

نشاط :۔ (جل کر) بہت بُری باتیں ہیں! اور تم جو کہو تب؟

محمود :۔ ہماری منگنی تو بزرگوں نے کی۔

نشاط :۔ ہاں تم لوگ بیل گائے جو ٹھیرے۔ اُنکی شادیاں بھی ایسے ہی ہوتی ہیں۔ تمہارے حقوق صرف اس وجہ سے وسیع ہیں کہ وہ تمہاری عقل سے نہیں ملے ہیں بلکہ دوسروں نے دیئے ہیں۔ اور میرے...... میرے چونکہ خودمختاری پر مبنی ہیں۔ وہ......

محمود :۔ مگر نشاط......

نشاط :۔ عزت بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہے۔ لیکن خود سے نہیں، اسی لئے تو مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ خواہ تم لوگ اُسے ایک ہفتہ بعد ہی ایاز کی بیوی بنادو۔ کچھ فرق نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہی ایاز کی بیوی بننے کے لئے مقرر کردی گئی۔ وہ عادی ہے کہ صرف ایاز کی ہی بیوی رہے خواہ وہ نشاط کو چاہے، دُنیا ڈرپوک ہے۔ اسی لئے وہ بھی ڈرتی ہے۔ اعتراض سے ڈرتی ہے۔ "اعتراض" یہ ایک تیسرا گھناؤنا لفظ ہے۔

نوکر :۔ چلئے گاڑی کا وقت آگیا۔

(الماس اور محمود حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ عزت بار بار آنسوؤں کو پونچھ رہی ہے۔ نشاط جمے ہوئے قدم رکھتا ہوا عزت کے پاس جاتا ہے اُسے محبت سے چمٹا کر پیار کرتا ہے۔)

نشاط :۔ "خدا حافظ"۔ پھر ملیں گے۔ کب؟ دیکھنا ہے!

(عزت خاموشی سے آنسو پونچھ رہی ہے)

عصمت چغتائی

بی، اے

پریم کہانی

(۱)

دس سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کا ذکر ہو۔ میری شادی کی پہلی سُہانی و دل فریب رات تھی۔ بہار کا موسم تھا اور فطرت کی اُمنگیں جوش پر تھیں۔ میں اور میری نوجوان بیوی زبیدہ اپنے عالیشان مکان کے سامنے باغ میں سیب کے ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ رنگا رنگ کے شگفتہ پھول عجیب بہار دکھا رہے تھے اور اُن کی خوشبو سے فضا عطر بیز ہو رہی تھی۔ چودھویں کا چاند نیلے آسمان پر پُوری دلفریبی سے جلوہ گر تھا، اور اس کی نُقرئی کرنیں پتوں میں سے چھن چھن کر ہمارے کپڑوں پر پڑتی ہوئی عجیب عجیب شکلیں بنا رہی تھیں۔ زبیدہ عنابی رنگ کی ایک بیش قیمت ریشمی ساڑھی میں ملبوس اپنے لاثانی حُسن سے حوران فردوس کو شرما رہی تھی۔ اُس وقت ہم محبت کے نشے میں چور خود فراموشی کے عالم میں کھڑے تھے اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سیب کے درخت سے سفید پھولوں کی پتیاں بارش کے قطروں کی طرح ہم پر گرنے لگیں۔ میں نے سبزہ پر پڑے ہوئے ننھے ننھے پھولوں کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر محبت بھرے لہجہ میں زبیدہ سے کہا "دیکھو زبیدہ جس جگہ تمہارا مبارک قدم پڑتا ہے وہیں سے پھول اُگنے لگتے ہیں"

ایک ہلکے تبسم سے اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور میں نے اُسے آغوشِ محبت میں لیتے ہوئے اپنے بازو کی گرفت کو زیادہ مضبوط کر لیا۔ زبیدہ کے دل و دماغ پر بھی ایک سرمدی کیفیت طاری تھی اور وہ میری محبت میں از خود رفتہ معلوم ہوتی تھی۔ انتہائی اُلفت آمیز انداز سے اُس نے اپنی نرم و نازک باہیں میری گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا "پیارے نصرت! محبت کا سمندر بے پایاں ہے اور اسکی تلاطم خیز امواج کے سامنے ہماری ثابت قدمی کوئی ہستی نہیں رکھتی۔ زمانہ کے حوادث ہمارے پاؤں ڈگمگانے کی کوشش کرینگے مگر ہمیں وعدہ کرنا چاہیئے کہ ہر مشکل میں آج کی رات کو یاد رکھیں گے اور ہمیں جس قدر ایک دوسرے سے والہانہ اُلفت ہے اُسے تمام عمر نہیں بھُولیں گے ـــ یہ سمجھتے ہوئے کہ محبت دُنیا کی تمام قوتوں سے زبردست ہے"۔

"میں سچے دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اِس شبِ محبت کو ہر مصیبت میں یاد رکھونگا" میں نے زبیدہ کی تائید کی۔ گویا یہ حلفِ وفاداری تھا ـــ ہمارے رشتۂ محبت کو مستحکم کرنے کے لئے۔

کتنی دیر تک ہم ایک دوسرے کو گلے لگائے خود فراموشی کے عالم میں کھڑے رہے۔

(۲)

میرے والد بمبئی کے ایک دولت مند اور ہر دل عزیز تاجر تھے، اور میں نے حال ہی میں وکالت کا امتحان پاس کر کے پریکٹس شروع کی تھی۔ خوش قسمتی سے میرا کام جلد ہی چل نکلا اور دو تین سال کے قلیل عرصہ میں میرا نام بمبئی کے کامیاب وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔ ہماری ازدواجی زندگی کے پانچ سال نہایت مسرت میں گزرے۔ اِس عرصہ میں میں دو بچوں کا باپ بھی بن چکا تھا۔ میری بیوی نہایت ہونہار اور دانش مند عورت تھی۔ وہ میری زندگی کو ہر پہلو سے پُر مسرت بنانے کی کوشش کرتی۔ جتنی مجھے ایک اچھا شوہر بننے کی خواہش تھی، اُسی قدر زبیدہ ایک فرمانبردار اور کارآمد بیوی بننے کی شوقین تھی۔ لیکن اِن تمام خوبیوں کے باوجود اُس میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت بہت کم تھی، جس طرح وہ میری محبت میں کھوئی ہوئی تھی اُسی طرح مجھے بھی پرستارِ محبت دیکھنا چاہتی تھی یہانتک کہ کسی غیر عورت سے میرا بات کرنا بھی اُسکے دل پر شاق گزرتا تھا۔ وہ اِس بارے میں حد درجہ حاسد تھی۔

زبیدہ کی خوشنودی کے پیش نظر میں بسا اوقات ایسے مقدمات کی پیروی سے انکار کر دیتا جن میں مجھے زیادہ تر عورتوں سے ملاقات کرنی پڑے۔ کیونکہ میں ابتدا ہی سے معلوم کر چکا تھا کہ ایسے مقدمات کے حالات سن کر وہ حد درجہ ناخوش ہوتی تھی۔ تاہم مجھے اُمید تھی کہ زبیدہ جلد ہی اپنی عادت کو سُدھار لے گی اور ایسی طفلانہ باتوں کو چنداں اہمیت نہ دیگی۔ لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا گیا، اُس کے دل میں حاسدانہ جذبات زیادہ ترقی پکڑتے گئے حتیٰ کہ وہ اکثر مرتبہ مجھ سے خفا رہنے لگی۔

(۳)

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا مقدمات کے متعلق کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ میرے والد کے ایک دیرینہ دوست میرے پاس تشریف لائے اُن کا نام مسٹر اشرف تھا اور وہ کافی عرصہ تک اپنی اکلوتی بیٹی زہرہ کے ساتھ ہمارے ہمسایہ میں رہ چکے تھے۔ اُنکی نوجوان لڑکی کے خلاف چوری کے اقدام میں مقدمہ چلایا گیا تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ میں اُس مقدمہ کی پیروی کروں۔ اپنی بیوی کی حاسدانہ طبیعت سے واقف ہوتے ہوئے میں اُس مقدمہ کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ مگر مسٹر اشرف سے اپنے خاندان کے دیرینہ تعلقات اور دوستی کی بناء پر میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نیز میں زہرہ کو بچپن سے جانتا تھا اور اُس کی

خاندانی شرافت کا قائل تھا۔ لہٰذا میں نے مقدمہ کی پیروی کا وعدہ کر لیا۔

میں اپنی بیوی کو کسی قسم کا دلی رنج پہونچانا اپنی ازدواجی زندگی کے لئے سخت مضر سمجھتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنی ترقی و شہرت کا بھی خیال تھا کیونکہ زبیدہ کے غیر ضروری اور بے بنیاد حاسدانہ جذبات کی بدولت میں اپنے پیشہ میں اتنا نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ مجھے خواہش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے پیشے میں مطلق مخل نہ ہو اور مجھے جنسی خوشی عورتوں کے مقدمات کی پیروی کرنے دے کیونکہ مجھے یقین تھا کہ زبیدہ کے ہوتے ہوئے کسی غیر عورت کا جادو مجھ پر اثر نہیں کر سکتا۔

اس رات میں نے زبیدہ سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا اور اُسکے غیر معمولی حاسدانہ جذبات کی شکایت کرتے ہوئے زہرہ کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کرنیکا ارادہ ظاہر کیا۔ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بجائے اُسکے جذبات یکدم مشتعل ہوئے اور وہ برافروختہ ہو کر کہنے لگی کہ مجھے اِس مقدمہ کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیئے کہ جن لوگوں نے زہرہ پر چوری کا الزام لگایا تھا، وہ سخت خطرناک تھے اور مُفت میں میرے دشمن بن جائینگے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ میں مسٹر اشرف سے وعدہ کر چکا ہوں اور یوں بھی ایک بے گناہ لڑکی کو بچانا میرا فرض ہے۔ تو وہ سخت چیں بجبیں ہوئی اور خفگی کے لہجہ میں کہنے لگی "اگر تمہیں میری محبت کا احترام ہے تو اِس مقدمہ کے پیچھے نہ پڑو ورنہ میں سمجھونگی کہ تم مجھے اپنا دشمن تصور کرتے ہو" وہ غصہ میں بھرائی ہوئی اُٹھکر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے مجھے اِس قسم کی دھمکی دی تھی۔ میں بھی سونے کے لئے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ مگر تمام رات پریشانی سے مجھے نیند نہ آئی۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی میں زبیدہ سے بغیر ملے دفتر چلا گیا۔ اور زہرہ کے مقدمہ کی نسبت تیاری کر کے تاریخ پیشی پر حاضر ہونے کیلئے کچہری چلا گیا۔

رات کو جب میں گھر آیا تو زبیدہ نے اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کیا اُس نے مجھے بتایا کہ چونکہ بچپن میں زہرہ کے ساتھ میرے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اکثر لوگوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ ایک وقت میں زہرہ کو اپنی بیوی بنانے کا خواہش مند تھا۔ اس لئے اُن حالات کے پیش نظر اُس جذبہ رقابت نے جو عورتوں کے دلوں میں فوراً شعلہ پذیر ہو جاتا ہے۔ اُسکے دل میں میری محبت کو نفرت میں بدلنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے زبیدہ کو اصل حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ زہرہ کا والد میرے باپ کا دوست تھا اور کافی عرصہ تک ہمارے ہمسایہ میں رہ چکا تھا۔ زہرہ بچپن میں میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتی تھی اور اکثر اوقات ہم اکٹھے کھیلتے تھے میری شادی سے چند سال پیشتر مسٹر اشرف کو کاروبار میں متواتر نقصان اُٹھانے کی وجہ سے نہایت تنگی ہوئی اور اُنہیں مجبوراً مکان فروخت کر کے کرایہ پر رہنا پڑا۔ زہرہ کے لئے مزید تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔ اور وہ قلیل معاوضے پر کسی کے ہاں بچوں کو تعلیم دینے پر ملازم ہو گئی جس شخص کے بچوں کو وہ پڑھایا کرتی تھی، اُسکے ہاں اتفاقاً چوری ہوگئی اور شک میں زہرہ پر بھی مقدمہ چلایا گیا۔ چونکہ مجھے زہرہ سے خاصی واقفیت تھی اور اُسکی شرافت کو بخوبی سمجھتا تھا اِس لئے میرا فرض تھا کہ میں اِس مصیبت میں اُسکی مدد کروں۔

زبیدہ نے میرے احساسات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "نصرت! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے جذبات کو مجروح کیا میں آئندہ تم پر مکمل اعتماد رکھنے کی کوشش کرونگی۔ اور تمہارے معاملات میں دخل نہ دونگی۔ یقیناً تم ایک قابل پرستش شوہر ہو"

اب ہم پھر پُر مسرت ایام بسر کرنے لگے اور ہماری غیر فانی محبت نے ان نامُلائم احساسات پر قابو پا لیا جو ہماری ازدواجی زندگی کو تلخ بنانا چاہتے تھے۔ گویا یہ ہماری محبت کی فتح تھی جس کا ہم نے شب اوّل اقرار کیا تھا۔ زہرہ کے خلاف کافی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے عدالت نے اُسے بری الذمہ قرار دیکر چھوڑ دیا۔

(۴)

میں اپنے کام میں زیادہ محنت اور تندہی سے منہمک ہو گیا اور زہرہ کا خیال میرے دل سے قریب قریب محو ہو چکا تھا۔ ایک دوست کے ذریعے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ مسٹر اشرف کی اتفاقیہ موت کے بعد وہ نہایت مفلسی کی حالت میں گزارہ کر رہی ہے۔ اور کسی پرائیویٹ اِسکول میں ٹائپ اور خط وکتابت وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ غرض میری زندگی کے اور دو سال سکون اور اطمینان میں گذر گئے۔

مقامی میونسپل کمیٹی کے سہ سالہ انتخابات قریب آ رہے تھے اپنے "حلقۂ انتخاب" سے میں بھی اُمیدوار تھا اور میرے اثر و رسوخ کی بدولت میرے حق میں خوب زور شور سے پروپیگنڈہ جاری تھا۔ ایکدن میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہُوا اپنی آئندہ کامیابی پر دل ہی دلمیں خوش ہو رہا تھا کہ خلاف توقع زہرہ کمرہ میں داخل ہوئی میں نے اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے مقابل میز کے قریب بیٹھ گئی۔ اُسکی آنکھوں میں افسردگی کی جھلک تھی اور چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔

"کہو زہرہ! اتنی مدت کے بعد آج پھر کیسے آنا ہوا؟" میں نے بالآخر پوچھا

اُس نے میرے چہرہ پر نگاہیں جماتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

"میں نے سُنا ہے کہ آپ کو دفتر میں ایک ٹائپسٹ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھے اُس خدمت پر مامور کر دیں تو تمام عمر آپ کی احسان مند رہونگی۔ یہ دیکھئے میرے

پاس ٹائپسٹ کی سند بھی موجود ہے"۔

یہ کہکر اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک سرٹیفکیٹ میز پر رکھ دیا، جو اُسے مقامی کالج کی طرف سے بطور سند ملا تھا۔

یکدم تمام خیالات بجلی کی سرعت کیساتھ میرے دماغ میں پیدا ہوئے بلاشبہ مجھے ایک جونیئر ٹائپسٹ کی ضرورت تھی۔ مگر کسی عورت کو ملازم رکھنے کے میں سخت خلاف تھا۔ کیونکہ ایسے واقعات سے عموماً لوگوں میں بدظنی پھیل جاتی تھی مزید برآں میری زندگی کے تمام پہلو اُنکے سامنے آچکے تھے، اور زہرہ کو دفتر میں ملازمت دینے سے بہت ممکن تھا کہ لوگ میرے چال چلن کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں اور جھوٹی افواہیں اُڑاکر مجھے الکشن میں نقصان پہونچانے کی کوشش کریں۔ زبیدہ کی طرف سے بھی میں مطمئن نہ تھا، کیونکہ وہ زہرہ کی نسبت مجھ سے کئی بار گفتگو کرچکی تھی اور بہت ممکن تھا کہ اُسکے رقیبانہ جذبات پھر مشتعل ہوجائیں کافی دیر تک میں صورت حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ زہرہ میز پر کہنیاں ٹکائے نہایت مغموم حالت میں بیٹھی تھی۔ اُسکی بے تابانہ نگاہیں اُسکے دل کا راز کہہ رہی تھیں میں نے محسوس کیا کہ وہ زندگی کے نہایت پُرآشوب دور سے گزر رہی ہے۔ اُسکی آنکھوں میں مایوسی و ناامیدی ناچ رہی تھی۔ نہ معلوم وہ کس قدر تنگ دستی اور مفلسی کی حالت میں تھی۔ میں حالت اضطراب میں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ آہ! اس بات کا تصور ہی کتنا اذیت کوش تھا شریف گھرانے کی ایک باعصمت اور حیا پرور عورت اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے میری مدد کی ملتجی تھی۔

ہم دیر تک ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے دیکھتے رہے، اور جب میں نے اپنے دلمیں فیصلہ کرتے ہوئے اُسے ملازمت دینے کا یقین دلادیا تو مجھے اپنی آواز کمرے میں گونجتی سُنائی دی۔ ایک لمحہ کے لئے زہرہ کے چہرے پر خوشی کی ایک ہلکی سی سُرخ لہر نمودار ہوئی۔ وہ کرسی سے اُٹھی اور شکریہ کے طور پر میرے ہاتھوں کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں لیکر زور سے دبایا، پھر وہ یک لخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "زہرہ صبر کرو" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا"۔ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آنسو پونچھتے ہوئے دوبارہ میرا شکریہ ادا کیا۔ اُسکے جانیکے بعد میں دیر تک خیالات کے بحر بےپایاں میں مستغرق رہا۔

جب میں نے زبیدہ سے اس بات کا ذکر کیا کہ میں زہرہ کو ملازم رکھنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی میں نے ان واقعات کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی جو مجھے دفتر میں پیش آئے تھے تو اُس نے نہایت متانت اور خاموشی سے سب کچھ گوش گذار کیا۔ مگر میری باتوں پر ہلکے تبسم کا اظہار کرکے موضوع گفتگو کو فوراً بدل ڈالا۔ اگرچہ اُس وقت یہ ہنسی مجھے بہت بُری معلوم ہوئی تاہم میں خوش تھا کہ زبیدہ نے اِس معاملہ پر مزید بحث نہیں کی لیکن بہت دیر بعد مجھے اِس بات کا علم ہوا کہ اپنے رقیبانہ جذبات کا کھلم کھلا اظہار کرنے کی بجائے اُس نے خاموش رہنا پسند کیا اور اندر ہی اندر حاسدانہ جذبات کی آگ میں جلنے لگی۔

(۵)

اِس واقعہ کے چند یوم بعد زبیدہ نے اپنے ایک رشتہ کے بھائی اختر کو اپنے ہاں بُلالیا اور اُسکی ذات میں غیر معمولی انہماک سے دلچسپی لینے لگی۔ اختر عُمر میں زبیدہ سے کچھ بڑا تھا اور تعلیم ختم کرکے اب کسی معقول مُلازمت کی تلاش میں تھا۔ زبیدہ اختر کے ساتھ بہت خوش رہتی اور دن کا بیشتر حصّہ وہ ایک ساتھ ہی گُزارتے مگر مجھے اُنکی دلچسپیوں سے کوئی سروکار نہ تھا، کیونکہ میں خوش تھا کہ زبیدہ میرے حالات میں دخل نہ دیتی تھی۔ اور نہ ہی اُس نے زہرہ کے متعلق مُجھ سے کچھ دریافت کیا تھا۔

زہرہ اپنے کام میں نہایت ہوشیار اور محنتی ثابت ہوئی، دفتر کے دیگر کلرکوں سے وہ بہت کم میل ملاپ رکھتی اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتی میں بھی اُسکے کام سے نہایت مطمئن اور خوش تھا۔ چند دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ شام کے وقت دفتر کے باہر ناصر نامی ایک نوجوان زہرہ کا منتظر رہتا وہ ایک معمولی تاجر کا بیٹا تھا اور پرلے درجے کا شرابی۔ اپنی سخت گیری اور درشت مزاجی کے باعث وہ لوگوں میں خاصا بدنام ہوچکا تھا۔ شراب کے نشہ میں وہ نہایت خطرناک ہوتا۔ اور عموماً دنگا فساد کر بیٹھتا، اسی عادتِ بد کی بدولت میں نے اُسے چند مرتبہ بحیثیت مُلزم پیش ہوتے دیکھا تھا لیکن ہر بار اُسکی خوبصورتی و جوانی سے متاثر ہوکر حاکمِ عدالت نے معمولی سزائے جرمانہ دے کر اُسے چھوڑ دیا تھا۔

ناصر سے زہرہ کے بڑھتے ہوئے رابطۂ اتحاد کو دیکھکر مجھے سخت افسوس ہوا، مگر اُسکے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ بلدیہ کے انتخابات میں ایک ماہ باقی تھا کہ اچانک میرا سکریٹری بیمار ہوگیا۔ دفتر میں اور کوئی کلرک اِس قابل نہ تھا کہ اُس کام کو بجالاسکے۔ لہذا میں نے عارضی طور پر سکریٹری کی خدمات زہرہ کے سُپرد کردیں۔

اپنے "حلقۂ انتخاب" میں میری مقبولیت روز بروز عام ہورہی تھی، اور میرا بڑھتا ہوا اثر و اقتدار دیکھکر میرے حریفوں نے مجھے بدنام کرنے کی ناپاک کوششیں شروع کیں۔ اپنی شکست کو یقینی تصور کرتے ہوئے وہ میرے خلاف بے بنیاد اور خلاف تہذیب خبریں مشہور کرنے لگے۔ ایکدن شام کے وقت جب کہ میں دفتر میں تنہا تھا ایک مقامی افسر جو میرے عزیز دوست تھے مجھ سے ملاقات کرنے آئے۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے میرے حریفوں کی مکارانہ چالوں کا تذکرہ کیا کس طرح وہ میری عزت و شہرت کو بگاڑنا چاہتے تھے، اُنہوں نے

مشہور کر رکھا تھا کہ زہرہ سے میرے ناجائز تعلقات ہیں۔ میں نے چوری کے مقدمہ میں اُسکی مدد کی تھی۔ اور اُسے دفتر میں مُلازمت دی تھی اور اب اُسے سکرٹیری کے ممتاز عُہدے پر فائز رکھا تھا۔ اگرچہ مجھے ان بے بنیاد افواہوں کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ تاہم میں چاہتا تھا کہ کم از کم زبیدہ اور زہرہ کو ان باتوں کا علم نہ ہونے پائے۔

اس شام کو جب میں گھر پہونچا تو زبیدہ، اختر کے ہمراہ سینما دیکھنے چلی گئی تھی میں تھکا ہُوا تھا۔ اسلئے اُن کے واپس آنے سے پیشتر ہی سو گیا۔ اگلے دن صبح سویرے میں دفتر چلا گیا۔ زبیدہ ابھی تک سو رہی تھی۔ اس لئے مجھے اُس سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔

میں دفتر میں بیٹھا ہُوا تھا کہ زہرہ نے صبح کی ڈاک لاکر میری میز پر رکھدی۔ مجھے ایک ضروری چٹھی موصول ہونے کی اُمید تھی۔ اس لئے میں خطوط کا بنڈل اُٹھا کر جلدی جلدی خط چھانٹنے لگا۔ ایک چٹھی زہرہ کے نام تھی میں نے سرنامہ پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے لفافہ زہرہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ اُس نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر بسرعت پڑھنے لگی۔ یکدم گھبراہٹ سے اسکے چہرے پر زردی چھا گئی اور ایک ہلکی سی چیخ اُسکے مُنہ سے نکلی۔ اُسکے لرزتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط درخت کے کسی خشک پتّے کی طرح ہل رہا تھا۔ زہرہ نے خط میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا "اسے پڑھیئے یہ آپکی بیوی کی تحریر ہے"

ایک ہی نظر میں میں نے دیکھ لیا کہ خط میں اُسی فرضی اور بیہودہ قصّے کو دُہرایا گیا تھا جو میرے اور زہرہ کے متعلق میرے دُشمنوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ آخر میں زہرہ کو اس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ وہ فوراً میری مُلازمت سے علیحدہ ہو جائے کیونکہ وہ زندگی کو تباہ کر رہی تھی اور اُسی کی بدولت میری عزّت و شہرت کو بٹّہ لگ رہا تھا۔

تحریر فی الحقیقت زبیدہ کی تھی میں اپنی بیوی کی اس نازیبا حرکت پر سخت متحیّر و آزردہ ہُوا۔

زہرہ اسی وقت سر کے درد کا بہانہ کر کے دفتر سے چلی گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس واقعہ نے اسکے دل کو سخت قلق پہونچایا تھا۔ اگلے دن وہ دفتر میں مُطلق نہیں آئی اور دوپہر کے وقت اُس نے ایک مختصر سا نوٹ بدیں مضمون بھیجا "میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کی ازدواجی زندگی پُر آلام اور آپکی شہرت کو گزند پہونچے۔ میں کل ہی ناصر سے شادی کرنے والی ہوں کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اس صورت میں اُن تمام افواہوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو مجھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اب آپکے ہاں میری مُلازمت کا جاری رہنا ناممکن ہے"

جب میں نے زبیدہ سے اس بات کا ذکر کیا کہ زہرہ مُلازمت چھوڑ کر چلی گئی ہے اور ناصر جیسے اوباش سے شادی کرنے والی ہے۔ تو اُس نے کسی قدر افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے سرد مُہری سے کہا "زبیدہ اسکی تمام ذمہ داری تم پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ تم نے اُسے مُلازمت چھوڑ دینے کو خط لکھا تھا"

وہ ندامت سے نگاہیں نیچی کرتے ہُوئے بولی "میں نہیں سمجھتی تھی کہ اُس کا یہ انجام ہوگا"

"تم کاہے کو جانتیں"۔ غُصّہ میں میرے مُنہ سے نکلا "کیا تم احمقانہ جذبۂ رقابت کو اپنے دل سے کبھی نہیں نکال سکوگی"

"آہ! میں کہہ نہیں سکتی"۔ زہرہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔ "یہ جذبہ میری رُوح کو اندر ہی اندر گھُن کی طرح کھا رہا ہے"

(۶)

زندگی کے پُر شور ہنگامے ایک ہی رفتار پر ہمیشہ جاری رہتے ہیں اور انسان کشمکشِ حیات میں محو ہو کر گذشتہ واقعات کو بھُول جاتا ہے میں پھر بدستور اپنے پیشہ کی مصروفیتوں میں منہمک ہو گیا۔ زبیدہ دن بدن اختر کی صحبت میں خوشی محسوس کرنے لگی اور اب وہ زیادہ تر سیر و تفریح اور تماشا گاہوں میں گذارنے لگے، اسی طرح میری کتابِ زندگی کا ایک اور ورق اُلٹ گیا۔

زہرہ کی یاد قریب قریب میرے دل سے نکل چکی تھی۔ ایک شب کو میں کسی پبلک جلسہ میں تقریر کر رہا تھا کہ پچھلی نشستوں سے کچھ شور سنائی دیا ایک مضبوط و توانا نوجوان شراب کے نشہ میں بدمست ہو کر کچھ گڑبڑ مچا رہا ہے، اور جب لوگوں نے تنگ آکر اُسے جلسہ گاہ سے باہر نکالا تو میں نے اُسے پہچانا کہ وہ زہرہ کا شرابی خاوند ناصر تھا۔ جلسہ کی کارروائی ختم ہوتے ہی میں نے ناصر کی بابت دریافت کیا۔ اُس وقت وہ بدمستی کی حالت میں ایک بنچ پر بیہوش پڑا تھا۔ مجھے معلوم ہُوا کہ اسکی بیوی اچانک بیمار ہو گئی تھی، اور وہ ڈاکٹر کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ مگر راستے میں شراب کے نشہ سے چُور ہو کر سب کچھ بھُول چکا تھا۔ مجھے زہرہ کی بدقسمتی پر افسوس ہُوا مگر ساتھ ہی اپنی بیوی پر بھی غصّہ آیا جسکی بدولت وہ ناصر سے شادی کرنے پر مجبور ہُوئی تھی۔

ایک دوست کی مدد سے میں نے ناصر کو اپنی موٹر میں بٹھایا اور اُسکے گھر کا رُخ کیا۔ راستہ میں زہرہ کے علاج کے لئے میں نے ایک ڈاکٹر کو بھی ساتھ لے لیا اور قریباً آدھ گھنٹہ میں ہم ناصر کے مکان پر پہونچ گئے۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی میری آنکھوں نے ایک حسرت آمیز منظر دیکھا۔ سبز لیمپ کی مدھم روشنی کمرہ میں پھیلی ہوئی تھی اور زہرہ شدت بُخار سے بسترِ علالت پر پڑی ہُوئی کراہ رہی تھی، اُسکے چہرے کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور پسینہ کے قطرات اُسکی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز پر رُوئی کے چند

ٹکڑے اور ایک بڑا سا چاقو پڑا تھا۔ مکان سے باہر موسم بہار کا کوئی خوشنوا پرندہ زندگی کے پُر مسرت نغمے گا رہا تھا اور اسکی شیریں آواز کھڑکی کے راستے اندر سُنائی دے رہی تھی۔

ہم دوڑ کر زہرہ کی چارپائی کے قریب جا کھڑے ہوئے اور ڈاکٹر نے اُسکی نبض و دل کی حرکت کا معائنہ کر کے اُسے دوا پلائی۔ ناصر اب قدرے ہوش میں آچکا تھا اور دروازہ میں کھڑا ہوا غصہ و نفرت سے گھور رہا تھا یکدم وہ غصہ میں گرجتا ہوا ڈاکٹر کی جانب بڑھا اور اُسے دھکا دیکر فرش پر لڑھکا دیا۔ پھر زہرہ کے قریب آکر درشتی سے کہنے لگا "اُٹھو۔ تم یہاں لیٹی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ میرے لئے کھانا تیار کرو"۔ میں دوڑ کر اُسکے سامنے کھڑا ہوا اور اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے زہرہ کے قریب سے چلے جانیکا حکم دیا۔ ناصر نے غصہ سے منہ کھول کر میری طرف دیکھا اور ایک خونخوار درندے کی مانند اُسکی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ یک لخت میز پر سے چاقو اُٹھا کر ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ بھوکے شیر کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا — زہرہ کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی۔

میں فوراً جست کر کے ایک طرف ہٹ گیا اور پھُرتی سے ناصر کے منہ پر اس زور سے مُکا رسید کیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر آرہا۔ گرتے وقت اسکا سر اس زور سے آتشدان سے ٹکرایا کہ اس سے خون بہنے لگا۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔ اس اچانک حادثہ سے میں سخت گھبرایا۔ ڈاکٹر نے ناصر کے سر پر پٹی باندھنی شروع کی۔ اور میں نے ٹیلیفون پر پولس کو موقع واردات پر پہونچنے کی اطلاع کی۔

جب میں واپس ہونے لگا تو رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ زہرہ کا بخار ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر ناصر کی حالت بدستور تشویشناک تھی اگرچہ اس کا سانس برابر چل رہا تھا۔ تاہم شدتِ زخم سے وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پولس فوراً موقع پر پہونچ گئی۔ اور انسپکٹر پولس نے مجھے بتایا کہ میں گھر پہونچ کر مزید اطلاع کا انتظار کروں۔

وہ رات میں تمام عمر نہیں بھولونگا۔ میں تیزی سے گھر کی طرف موٹر دوڑا رہا تھا۔ آسمان پر ماہ مئی کا چاند دم بخود تھا۔ سڑک کے دونوں جانب سفید گلابی پھولوں سے لدے ہوئے سیب کے درخت تیزی سے میرے قریب سے گزر رہے تھے اور فضا میں ایک ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی، تھوڑی دیر بعد سرد ہوا کا کوئی گستاخ جھونکا کھڑکی کے راستے موٹر میں داخل ہو کر میرے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا کر دیتا۔ رات کی خاموشی میں کسی پرندے کی اچانک آواز نہایت خوف آمیز معلوم ہوتی، اُسوقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے موت کا بھیانک فرشتہ ایک سائے کی طرح میرے گرد منڈلا رہا ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدانخواستہ اگر ناصر کی موت واقع ہو گئی تو اُسکی تمام ذمہ داری میرے سر تھوپ دی جائیگی۔ زہرہ کے بارے میں لوگ مجھ سے بدظن ہو چکے تھے اور اب اُن کے لئے یہ سمجھنا نہایت آسان تھا کہ زہرہ کو حاصل کرنیکے لئے میں نے اُسکے خاوند کو ہلاک کر دیا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر کی شہادت میرے حق میں اس بات کا کافی ثبوت تھی کہ میں نے حفاظت خود اختیاری میں ناصر کو ضرب لگائی تھی۔ تاہم سابقہ حالات کو پیش نظر میں خود کو ایک ایسی خطرناک چوٹی پر کھڑا دیکھ رہا تھا جہاں سے پھسل کر میرا قعر مذلت میں گرنا لازمی امر تھا۔ مجھے زبیدہ سے بھی کسی خاص مدد کی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اپنے حاسدانہ جذبات کی آگ میں جلتے ہوئے کئی مرتبہ مجھے بھی چھوڑ جانیکی دھمکی دے چکی تھی۔ اگر سچ مچ اُس نے مجھے اِس مصیبت میں چھوڑ دیا تو لوگ مجھے اور بھی مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں گے —— اسی قسم کے خیالات رہ رہ کر میرے دل کو مضطرب بنا رہے تھے۔

(۷)

جب میں گھر پہونچا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مکان میں ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ میں فوراً اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا، کمرہ میں ابھی تک لیمپ روشن تھا۔ اور میز پر ایک لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ تحریر زبیدہ کی تھی۔ اور خط پر یہ عبارت درج تھی۔

"میں اختر کے ساتھ جا رہی ہوں وہ مجھے از حد محبت کرتا ہے جس طرح تم نے مجھے آتش حسد میں جلایا ہے اب خود بھی جلنے کا مزہ چکھو"۔

میری آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے، اور مجھے پیشانی پر خون کے قطرات ٹپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رقابت و حسد کی ایک تیز و تند لہر نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ ایک ہی وار میں میں زبیدہ اور اختر دونوں کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے ٹیلیفون اُٹھایا کہ ریلوے اسٹیشن سے گاڑی چھوٹنے کا وقت دریافت کروں۔ مگر اس خیال سے رُک گیا کہ شاید وہ ٹرین پر سوار نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ اختر کے پاس موٹر موجود تھی نیز مجھے اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔ ایک تیر خوردہ جانور کی طرح میں حالتِ اضطراب میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا غصہ سے میرا جسم اور روح میری طرح لرز رہے تھے۔ محبت کی بجائے اب رقابت و حسد کا وحشیانہ جذبہ مجھ پر تسلط جما چکا تھا۔

کئی گھنٹے بعد کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو پولیس سب انسپکٹر دروازہ میں کھڑا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ زبیدہ کی طرف سے کوئی پیغام لایا ہے۔ کیونکہ اُسکی بیوی زبیدہ کی دوست تھی۔ مگر وہ مجھے انسپکٹر پولیس کی طرف سے اطلاع دینے آیا تھا۔ کہ ناصر ابھی تک زندہ تھا اور ڈاکٹر کی رائے تھی کہ صبح ہونے تک وہ یقیناً ہوش میں آجائیگا۔

اسکے جانیکے بعد مجھے قدرے اطمینان ہوا مگر اس وقت میرے پیش نظر میری زندگی کا دوسرا پہلو تھا۔ مجھے سوائے زبیدہ کے اور کسی چیز کا خیال نہ تھا

(بقیہ صفحہ ۲۷۵ پر)

تعمیرِ جنوں

کالج میں اندرا سب سے حسین لڑکی شمار کی جاتی تھی، اسکے چہرہ کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جاتا تو اس کا حسن کسی طرح غیر معمولی نہ معلوم ہوتا، لیکن اس کا مجموعی اثر ایک خاص دلکشی وجاذبیت پیدا کرتا تھا جس سے کالج کی دوسری لڑکیاں قطعاً محروم تھیں اور پھر اُسکی دلاویزی کا راز صرف اُسکی ظاہری صورت ہی نہ تھا۔ بلکہ اسکی سادہ بے بناوٹی فطرت بھی بڑی حد تک اسکی دلکشی کا موجب تھی۔ اسکی بات چیت، لباس، وضع طور طریقہ سے کسی طرح ظاہر نہ ہوسکتا تھا کہ وہ ہائی کورٹ کے جج کی اکلوتی بیٹی تھی وہ اپنے سب ساتھیوں سے ایک طرح ملتی۔ ساتھ پڑھنے والے لڑکوں سے ملنے میں وہ کبھی اس سے زیادہ شرم وحجاب کا اظہار نہ کرتی، جتنا کہ اسکی جنس کا فطری تقاضہ ہوتا لیکن ساتھ ہی وہ کسی سے ملنے جلنے میں اپنا نسوانی وقار بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ ان خصوصیات نے اندرا کو کالج کے طلباء کا مرکزِ توجہ بنا دیا تھا۔ اندرا بھی سبھوں سے ملتی اور پھر کسی سے شیر و شکر بھی نہ ہوتی۔ لیکن شیام سندر کے ساتھ بہ نسبت اور ساتھیوں کے وہ زیادہ آزاد تھی۔ اسکی وجہ صرف اتفاقی تھی یعنی یہ کہ اندرا اور شیام سندر نے ایک ساتھ ایک اسکول میں تعلیم شروع کی، ساتھ ہی میٹرک پاس کیا، اور کالج میں بھی ساتھ تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ان کے والدین کے درمیان عرصہ سے کافی تعلقات تھے۔ غالباً اسی قدیم لگاؤ کے سبب شیام سندر اندرا سے اس طرح نہ ملتا تھا جس طرح اسکے دوسرے ساتھی ملتے تھے۔ وہ جب اندرا سے باتیں کرتے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جذبہ شرافت اپنی تکمیل کے لئے بیچین ہو رہا ہے۔ لیکن رائے اظہار نہ ہونیکی وجہ سے مجبور وبے بس کسی مناسب موقع کا منتظر ہے۔ انکی نگاہیں یوں تو دوسری طرف لگی ہوئی معلوم ہوتیں لیکن اس سے آنکھیں بچاکر وہ کبھی کبھی اسے للچائی نظروں سے دیکھ لیتے۔ انکے انداز میں مبالغہ آمیز متانت و سنجیدگی ہوتی جو بجائے انکی دلی کیفیات پر پردہ ڈالنے کے اسکی مضحکہ خیز پردہ دری کرنے لگتی وہ اندرا کو چاہتے تھے اور اپنے دلوں میں اس سے محبت کرنیکا دعویٰ رکھتے تھے۔ کامل احساس کے ساتھ اسلئے کہ اُنکی ملاقات اندرا سے اس وقت شروع ہوئی تھی جب انکا محبت کرنے کا جذبہ اپنا بچپن ختم کرکے علم پسند آدمی امتزاج حاصل کرچکا تھا اور محبت کا مفہوم اُنکے لئے صرف محبوب کی موجودگی انبساط و مسرت کے چند سیدھے سادے تاثرات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس میں محبوب کے حصول کی خواہش بھی شامل ہوچکی تھی اس خواہش کا علم اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے غور و تفکر کی جولانی۔ اس کے برعکس شیام سندر کو کبھی اس کا احساس نہ ہوا کہ اُسے اندرا سے محبت تھی۔ وہ بچپن سے ایکدوسرے سے ملتے جلتے آئے تھے اور آج بھی ان کے باہمی اختلاط میں اُسی معصومیت اور سادگی کی روش باقی تھی۔ گو ان کے دوسرے ساتھی انکی راہ و رسم میں اپنی کیفیات کا عکس دیکھ کر اسمیں مختلف معنی پیدا کرتے تھے، دُنیا کا ہر انسان اپنی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک لگائے پھرتا ہے جسکی وجہ سے اُسے کائنات کی ہر شے اُسی رنگ کی نظر آتی ہے اور اس طرح وہ کسی چیز کو اسکی اصلی صورت میں نہیں دیکھ سکتا۔ یہ مجبوری شاید انسانی فطرت کی تعمیر کا ایک لازمی جزو ہے۔

اندرا آئی۔ اے پاس کرکے بی۔ اے میں داخل ہوئی، اُسکے نئے ساتھیوں میں کانپور کے مشہور تاجر بابو گوپال سرن کا بیٹا پرکاش بھی تھا جو بنارس ہندو یونیورسٹی سے آئی، اے پاس کرکے بی، اے میں داخل ہوا تھا۔ پرکاش کا مردانہ حسن اور تناسب اعضاء بہت جلد اُسکے ساتھیوں کا مرکزِ توجہ بن گیا۔ بنارس یونیورسٹی میں اس نے یونیورسٹی میں اول انعام حاصل کیا تھا۔ سارے ساتھیوں کو اسکی تقریر سننے کا شوق تھا۔ وہ جب اپنی اس مقناطیسی شخصیت کیساتھ تقریر کرتا ہوگا تو ساری فضا سحر آگین ہوجاتی ہوگی۔ وہ آپس میں گفتگو کرتے اور اس دن کے بیچینی سے منتظر تھے جب کالج ڈبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے سالانہ جلسہ میں پرکاش مباحثہ کی افتتاح کرنیوالا تھا۔ آخر وہ دن آپہونچا۔ پرکاش نے مباحثہ شروع کیا۔ پرکاش کی جاذبیت اس وقت قابلِ رشک ہورہی تھی، اسلئے کہ وہ صرف ایک حسین شخصیت کا حامل نہ تھا، بلکہ ایک بلند دماغ اور مسحور کردینے والے الفاظ و بیان بھی اُسکے حصہ میں آئے تھے۔ ساری نگاہیں صرف اسی کو تک رہی تھیں۔ اندرا بھی ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہی تھی "کتنا حسین مقرر ہے" اس نے دلمیں سوچا اور نیم مدہوشی کی حالت میں پرکاش کی جادو بھری تقریر سنتی رہی، تقریر ختم ہوئی تو اسکی تالیوں کی آواز دوسروں سے زیادہ بلند تھی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ تالیاں بجاتے وقت وہ اپنی جگہ سے

کچھ کھڑکی بھی ہوگئی تھی۔

دوسرے دن اندرا شیام سندر سے بار بار پرکاش کی تعریف کرتی رہی تھی۔ شیام سندر خود بھی پرکاش کی شخصیت سے کافی متاثر ہوچکا تھا۔ وہ بھی اندرا کی تائید کرتا جارہا تھا۔

"کیوں نہ اُسے ہم اپنے ساتھ چائے پر مدعو کریں؟ ہم اسکی عالمانہ اور پُر از معلومات گفتگو سے ضرور فائدہ اُٹھا سکیں گے۔"

"کہاں؟"

"اپنے مکان پر"

"کیوں نہیں!" اندرا کی کالج کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنے گھر پر بلانیکا خیال ظاہر کررہی تھی۔ شیام سندر کو اسکی اس خلاف وضع حرکت پر تعجب ضرور ہُوا "لیکن پرکاش کی شخصیت واقعی اس خصوصیت کی مستحق ہے" اس نے خیال کیا

"تو پھر پرکاش کو تم میری طرف سے مدعو کرو۔"

"کیوں تم اس سے خود کیوں نہیں کہتیں۔"

"تم ہی کہدوگے تو کیا ہوگا؟"

"میں تو اُسے مدعو نہیں کررہا ہوں۔"

"تو میں یہ تھوڑی ہی کہتی ہوں کہ تم اُسے مدعو کرو۔ صرف میری طرف سے اُسے کہدو۔ مجھے خود کہتے ہوئے ذرا بے تکا سا معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن بے تکا پن تو زیادہ میرے کہنے میں ہے۔"

"تو تم نہیں کہوگے؟"

"میں تو نہیں کہتا۔ تمہارا اصرار ہے تو کہدونگا۔"

شیام سندر کو اندرا کی یہ ضد کچھ ایسی انوکھی سی معلوم ہوئی۔ وہ اپنے کسی ساتھی سے گفتگو کرنے میں بلا وجہ شرم و حجاب کی عادی نہ تھی۔ اور پھر اُسے پرکاش سے کچھ ایسی زیادہ باتیں بھی نہیں کرنی تھیں۔ صرف چاء پر بلانے کے لئے کہنے میں اُسے تامل کیوں ہورہا تھا "وہ پرکاش کی شخصیت سے بہت زیادہ مرعوب ہوگئی ہے" اس نے دل میں سوچا اور پرکاش کو اندرا کی طرف سے مدعو کرنیکے لئے اسکے قریب جانے لگا۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہوا کہ قدم آگے بڑھانے میں اسے کوشش کرنی پڑرہی تھی۔ جیسے وہ کسی دشوار مہم پر جارہا ہو۔ "اندرا نے تمہیں آج یہاں چاء پر بلایا ہے۔" اُس نے پرکاش کے قریب پہونچتے ہی تیزی سے یہ الفاظ کہڈالے۔ جیسے وہ کسی زبانی یاد کئے ہوئے جملہ کو دُہرا رہا ہو۔

"یعنی؟ مجھکو؟ کب؟" پرکاش نے شیام سندر کے انداز گفتگو سے متحیر ہوتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"آج شام کو۔" شیام سندر نے جواب دیا۔ وہ اپنی گفتگو کا بے تکا پن محسوس کرکے شرما گیا۔ "اندرا نے مجھ سے بے موقع یہ کام لیا، اسے خود پرکاش سے کہنا چاہیئے تھا۔" اس نے خیال کیا۔

"اور کون ہوگا؟"

"میں تم اور اندرا"

"اچھی بات ہے مجھے کوئی عذر نہیں۔"

اندرا پرکاش کی دعوت کے انتظام میں منہمک تھی۔ شیام سندر اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اندرا کا یہ انہماک اُس پر ایک خاص قسم کی تاثر پیدا کررہا تھا جس کی وہ خود اپنے دماغ میں بھی کوئی تشریح نہیں کرسکتا تھا۔ جیسے کسی خوف کا اتنا ہلکا احساس کہ اُسے کسی دوسرے جذبہ سے تمیز کرنا مشکل ہو۔ رہ رہ کر اُسکے دماغ میں وہاں سے چلے جانیکی ایک مبہم سی خواہش پیدا ہوتی تھی لیکن اپنی ناموزونیت کی وجہ سے اس خواہش کو قرار حاصل نہ ہوتا۔ شیام سندر اپنے اندر ایک اضطراب آگین کیفیت کا عمل محسوس کررہا تھا۔ وہ اپنے دماغ میں اس طربناک انتظار کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جسے پرکاش کی فلسفیانہ اور دلاویز گفتگو سے لطف اندوزی کے تصور کا نتیجہ ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ اس کوشش میں ناکام ہورہا تھا۔ کیوں؟ اس کے سبب کے سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔

پرکاش وقت مقررہ پر اندرا کے مکان پر پہونچ گیا اور تینوں ایک ٹیبل کے تین طرف بیٹھ گئے۔

آپ نے اتنا تکلف ناحق کیا۔ اس قسم کی صحبتیں کھانے پینے کی غرض سے تھوڑی ہی ہوتی ہیں کہ اُنکے لئے اتنا اہتمام کیا جائے۔

"نہیں کوئی خاص تکلف تو نہیں ہے۔" اندرا نے کیک کی رکابی پرکاش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مختلف قسم کی باتیں ہونے لگیں جس میں زیادہ گفتگو پرکاش کررہا تھا، شیام سندر اور اندرا خوشی سے سُن رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع موجودہ ادبی رجحان۔ سائنس کی کرشمہ سازیاں، ہندوستان کا مستقبل دُنیا کا مذہب، ان سبھوں سے بدلتا ہُوا سائیکو انیلس (نفسیات تحلیلی) پر آپہونچا تھا۔

"سائیکو انیلس (نفسیات تحلیلی) نے ہمارے سامنے ایک نئی دُنیا پیش کردی ہے جسکی وسعتیں بھی بے پناہ ہیں اور گہرائیاں بھی اتھاہ۔ ینگ (Jung) نے تو اپنے کلکٹو انکونشنس (لاشعور ذہن اجتماعی)

یات کے سارے منازل تجربات ومشاہدات کا مکمل ریکارڈ قرار دے لیا ہے۔ گویا ہمارے روزمرہ کے کردار پر صرف اُنہیں جذبات ومحرکات اثر نہیں پڑتا جنکی بنا ہماری انفرادی زندگی میں ہوئی ہے بلکہ اُن سارے ترغیبات ورُجحانات کا جو ابتدائے آفرینش سے نسلاً بعد نسل ہماری وراثت میں آتی جا رہی ہیں اور جن کا مخزن ہمارا ذہن لاشعوری ہے۔ واقعی یہ نظریہ نہایت صحیح ہے ورنہ ہم باوجود اتنے متمدن ہو چکے اکثر حالات میں اُن حرکتوں کے کیوں مرتکب ہو جاتے ہیں جنہیں کچھ ایک غیر متمدن قوم بھی شرما جائے؟ آپ اسپین کی سول وار کو دیکھئے یا اسکے اندر وہی خون آشامی وغارتگری کا وحشیانہ جذبہ عمل پیرا نہیں ہے جو ہمارے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے آباؤ اجداد کی روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک تھا؟ کیا اسپین کا کوئی ذی فہم باشندہ اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کی خون کی ندیاں بہانا، بیگناہ عورتوں اور معصوم بچوں کو تہ تیغ اور بے خانماں کر دینا، خوبصورت شہروں اور دلکش عمارتوں کو جنکے کمالِ صنعت پر وہ دُنیا کے سامنے فخر کیا کرتا تھا

اس طرح اپنے ہی ہاتھوں سے ویران و برباد کر دینا انسانی اُولوالعزمی سربلندی فرزانگی ووسعت نظری کی ہنسی اُڑانا ہے؟ وہ اگر تنہائی میں بیٹھ کر اپنی حرکتوں کا جائزہ لے تو کیا سب سے پہلے اپنے ہی کو گولی مار دینے کے قابل نہ تصور کرے؟ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ذہن اجتماعی (Group mind) جسکے وجود ونشوونما کا راز حیات کی مکمل تاریخ میں ملتا ہے اس پر مسلط ہے اور اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے کی مہلت نہیں دیتا۔"

پرکاش اپنی گفتگو میں منہمک تھا۔ اندرا نظریں نیچی کئے بیٹھی تھی جیسے وہ گفتگو سے زیادہ کھانے کی چیزوں سے دلچسپی لے رہی ہو۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ پرکاش پر ڈال دیا کرتی تھی۔ شیام سندر اندرا کے انداز میں ایک انوکھا پن محسوس کر رہا تھا۔ اُسکی نگاہوں میں اُسے اپنے ان ساتھیوں کی نظروں کی جھلک دکھلائی دے رہی تھی جنہیں اندرا کی محبت کا دعوٰی تھا۔ ویسی ہی چرائی ہوئی سی نگاہیں۔ وہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطے مارنے لگا "اندرا پرکاش کو چاہنے لگی ہے" اسے ایسا معلوم ہُوا کہ کوئی اُسکے کان میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔ "تو پھر اس میں حرج بھی کیا ہے؟" جیسے اُس نے ان الفاظ کا جواب دیا "کیا پرکاش اندرا کی محبت کا حقیقی معنی میں اہل نہیں ہے؟ لیکن پھر اسکے دماغ میں خوف کا سا دُھندلا پن کیوں پھیل گیا؟" "اندرا سے اُسکی رسم ختم ہو جائیگی" اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ اُسکے دماغ پر ٹھوکروں سے یہ آواز پیدا ہوئی "کیوں؟ ایسا کیوں ہونے لگا؟ پرکاش سے اُسکی دوستی کچھ کم نہیں ہے وہ اسکے بعد بھی اندرا سے اسی طرح مل جُل سکتا ہے" "کس کے بعد؟" جیسے کسی نے اُس سے اس جملہ کی توجیہہ کی فرمائش کی "اندرا کی پرکاش سے شادی کے بعد۔ کیا یہ ایک بہترین جوڑا نہ ہوگا ان دونوں کے ملاپ پر خود فطرت اپنی حسن آفرینی وموزونیت پہ ناز کریگی" "لیکن وہ کیا کریگا؟" یہ سوال اُسے بالکل بے معنی سا معلوم ہُوا، وہ اندرا اور پرکاش سے اپنی دوستی اور مضبوط کر کے اُنکی صحبتوں سے ویسے ہی لطف اندوز ہوتا رہیگا۔"

شیام سندر کا دماغ ایک مستقل مکالمہ کا سبب بنا ہُوا تھا۔ پرکاش کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "آپ اگر اپنے روزمرہ کے کردار کا صحیح جائزہ لیں تو بیشتر حالات میں آپ یہ محسوس کرینگے کہ آپ کا ارادہ کچھ اور ہے اور آپ کا عمل کچھ اور۔ یہی نہیں۔ بلکہ بسا اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کے عمل وکردار کی کوئی غرض وغایت نہیں۔ اگرچہ آپ انہیں بروئے کار لانے پر مجبور ہیں۔ انسانی قوت ارادی کا استحکام آپ کو بالکل متزلزل معلوم ہوگا، اور اسکی آزادی قطعاً بے معنی۔ میں اس احسان کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں جو علمائے نفسیات نے انسانیت پر ....." دفعتاً چائے کی پیالی جو شیام سندر کے لبوں سے قریب ہو رہی تھی اس کے مرتعش ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور میز پر چائدانی سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور چائے کی چھینٹیں تینوں کے کپڑوں پر گریں۔ اندرا اور پرکاش یکبارگی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شیام سندر کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا اُسکی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ جیسے وہ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو، اُسکی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں گھر جاؤنگا" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے علیحدہ ہونے لگا۔

اندرا گھبرا گئی۔ پرکاش پر بھی حیرت واستعجاب طاری ہوگیا۔

"شیام! تمہیں یہ یک بیک کیا ہوگیا۔ گھبراؤ نہیں۔ بیٹھ جاؤ، گھر جا کر کیا کروگے۔ فوراً طبیعت ٹھیک ہو جائیگی" اندرا نے شیام سندر کے قریب آکر کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے لیکن اندرا مجھے اب یہاں ٹھیرنے نہ دو۔ میرا سر بُری طرح گھوم رہا ہے۔ میں ایک منٹ بیٹھ نہیں سکتا۔ پرکاش مجھے سخت ندامت ہے کہ میری وجہ سے یہ دلچسپ صحبت بے لطف ہوگئی۔ تم مجھے معاف کروگے"

"توبہ! کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں تو کہتا ہوں تھوڑی دیر بیٹھ

جاؤ۔ طبیعت سنبھل جائیگی

"نہیں مجھے جانا ہی چاہئے" کیوں ؟ اس کا سبب خود شیام سندر کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہُوا اندرا کے مکان سے باہر نکل آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اُسکے دماغ کا توازن قائم ہوگیا تہا اور اس کے خیالات کا دُھندلا پن مفقود۔ اب وہ ہر بات صحیح طور سے سوچ سکتا تہا "تو یہ کتنی لطیف صحبت آج میری وجہ سے کِرکری ہوگی۔ نہ جانے مجھے یک بیک کیا ہوگیا تھا۔ پرکاش جانے کیا سمجھتا ہوگا۔ مگر وہ ان سبھی باتوں سے بہت بلند ہے اُسے اتنی اتنی باتوں کا خیال نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک قابل قدر شخص ہے۔ کتنا خوبصورت کتنا ذی علم اور ساتھ ہی کتنا عمدہ انسان۔ خدا کرے وہ بھی اندرا کو پسند کرے اور دونوں کی شادی ہو جائے" دل میں اس طرح باتیں کرتا شیام سندر گھر آکر کرسی پر دراز ہوگیا اور دیر تک اسی طرح مختلف خیالات میں اُلجھتا سوگیا۔

شیام سندر دن بدن اپنی دوستی پرکاش سے بڑھا رہا تھا۔ وہ پرکاش کی عدیم المثال شخصیت کی پرستش کرنے لگا تھا۔ پرکاش اس کی اس عقیدتمندی کا جواب اس خلوص و محبت سے دے رہا تھا جو اسکی اعلیٰ شخصیت کی متقاضی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے قلوب میں ایک مستقل رابطہ پیدا ہوگیا تہا جس کے اثر سے ایک کی کیفیات کا عکس دوسرے پر پڑ جاتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ذہن و شعور کے عمل میں بھی ایسی ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کچھ سوچنے یا سمجھنے سے معذور ہو رہے تھے۔

کالج ڈبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے نائب صدر کا سالانہ انتخاب نزدیک تھا۔ شیام سندر نے پرکاش کو اُمیدوار بننے کے لئے آمادہ کیا۔ پرکاش اپنی جانب سے اسکے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ اسلئے کہ اسکے دماغ میں ایسے ایسے اعزازوں کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن شیام سندر کی خاطر اسے منظور تھی۔ مگر اس نے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی کے سامنے بھی اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے زبان نہ کھولیگا۔ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش اُسکے خیال میں اُصولِ نمایندگی کی بدترین توہین تھی۔ جس نے ڈیماکریسی (جمہوریت) کو ایک بے معنی و کھوکھلا لفظ بنا دیا ہے۔ ساری کنویسنگ شیام سندر کو کرنی تھی، شیام سندر اسکے لئے آمادہ تھا۔ اپنے اعلیٰ کیریکٹر کی وجہ سے اُسکے ساتھیوں میں اس کا خاصہ اثر تھا۔ اسلئے اسے یقین تھا کہ پرکاش کی بلند صلاحیتیں اور اس کی کوشش ان دونوں کی موجودگی کے بعد کسی اُمیدوار کا پرکاش کے مقابلہ میں کامیاب ہونا دشوار تھا۔

پرکاش کے مقابلہ میں چندر تھی۔ جو پرکاش کے کالج میں داخلہ کے قبل تک کالج کا سب سے اچھا مُقرر سمجھا جاتا تھا، پرکاش کے خلاف پروپگنڈہ کر رہا تھا۔ ادہر شیام سندر بھی پرکاش کے لئے زور دار کنویسنگ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے اپنی ذات پرکاش کی شخصیت میں مدغم کر دی تھی اور اس میں اور پرکاش میں کوئی فرق باقی نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی کامیابی کے لئے بھی اس سے زیادہ کوشش نہ کر سکتا تھا۔

الکشن کے دن شیام سندر بستر سے بہت سویرے اُٹھ گیا۔ وہ اتنے سویرے اُٹھنے کا عادی نہ تھا لیکن اس دن اسے پرکاش کے کام سے باہر جانا تھا جسکی اہمیت اسکے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ اس نے ابتک باہر کے درمیان کنویسنگ کی تھی۔ آج اسے ہوسٹلوں میں ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے جانا تھا۔ الکشن ۳ بجے شام کو ہونے والا تھا۔ وہ اسوقت تک اپنا وقت وہیں گذارنے والا تھا۔ اس صبح کی ضرورتوں سے جلد فراغت حاصل کر لی اور سائیکل لے کر گھر سے باہر جانے لگا "اسکی بریک ڈھیلی ہوگئی ہے، دُرست کرا لیجئگا" اسکے چھوٹے بھائی نے اس سے کہا۔ لیکن اس نے صرف الفاظ سنے۔ انکے مطلب کی طرف اس کا ذہن منتقل نہ ہُوا جیسے وہ کسی غیر زبان کے الفاظ تھے۔ اور سائیکل پر گھر سے روانہ ہوگیا۔ وہ تیزی سے سائیکل چلائے جا رہا تہا۔ ایک ٹرم اسکی طرف آ رہی تھی۔ سڑک وہاں پر تنگ تھی، پھر بھی وہ ٹرم کے بغل سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ لیکن اس نے یکبارگی سائیکل کا رُخ اپنے بائیں جانب پھیر دیا جیسے کوئی نوآموز سائیکل باز جسے گھبراہٹ میں اپنے دماغ پر قابو نہیں رہتا۔ سڑک کے کنارہ سے میونسپلٹی کا نالہ بہتا تھا، سائیکل کا بریک ڈھیلا تہا۔ سائیکل نالہ کے اندر جا گری۔

شیام سندر کے سر میں شدید چوٹ آئی اور وہ بیہوش ہوگیا۔ اسکی آنکھیں کھلیں تو اس نے اپنے کو اسپتال میں ایک بستر پر پڑا پایا۔ اسکے سر میں بینڈج بندھا ہُوا تھا اور اُسکے جسم پر جا بجا مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ وہ اپنی اس حالت کا جائزہ لے کر افسردہ ہو رہا تھا۔ گھڑی نے شام کے پانچ بجائے۔ اور اس کا خیال دفعتاً پرکاش کے الکشن کی طرف منتقل ہوگیا "الکشن ختم ہوگیا ہوگا جانے پرکاش کا کیا ہوا ہوگا" اس نے سوچا لیکن اس خیال سے جو اضطراب و ہزیمت کی کیفیت اس پر پیدا ہونی چاہئے تھی نہ ہوئی۔ بلکہ اسکے چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا قلب مطمئن تہا۔ گو اس طمانیت پر استعجاب و حیرت کی کیفیت غالب تھی۔ اس اچانک حادثہ کا کوئی معقول سبب اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ کافی مشاق سائیکلسٹ تھا۔ پھر اُسے ہو کیا گیا تھا؟ اس نے بریک کی مرمت کیوں نہ کرا لی جب کہ اسکے بھائی نے اسے مطلع کر دیا تھا۔ اُسے اپنی اس حماقت پر غصہ آنے لگا۔

پرکاش کو الکشن میں ناکامیابی ہوگئی۔ ہوسٹل کے سارے لڑکے اس وجہ سے اسکے مخالف ہوگئے کہ اسے اپنی قابلیت پر گھمنڈ تھا جب ہی تو اُس نے ان سے ووٹ کی درخواست نہ کی تھی! ایک جینیس (Genius) کی زندگی اسکے لئے اجیرن ہو جاتی ہے۔ اسلئے کہ اسکی مافوق الفطرت صلاحیت کی تہ تک پہونچنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر لوگوں میں اس صلاحیت کے فقدان کا احساس اسکی فوقیت کو انکی کم مائگی و کوتاہی کے تلخ تجربہ کی ذمہ دار ٹھیرا دیتا ہے۔ اُن کے دلوں میں اسکی طرف سے جذبۂ انتقام اُبھر آتا ہے۔ جسکی تسکین وہ اُسے نیچا دکھا کر کر سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اکثر ایک جینیس کی زندگی ایسے مشکل اور ناموافق ماحول و اثرات سے گھری ہوتی ہے جن کے مقابلہ کے لئے اسے عمومیت سے کہیں زیادہ ذہنی جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک جینیس کی زندگی قبل از وقت ختم ہو جاتی ہے۔ اسکی بے پناہ سرگرمیاں بہت جلد اسکی صلاحیت کا ذخیرہ ختم کر دیتی ہیں اور اس طرح آپس میں زندگی کے آفات و حوادث کی مدافعت کی قوت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اس کا شکار ہو جاتا ہے۔

پرکاش کو اپنی ناکامیابی کا صدمہ ضرور ہوا لیکن اس کا احساس اس استعجاب میں کھو گیا جو شیام سندر کے کالج نہ آنے پر اسے ہو رہا تھا۔ الکشن ختم ہوتے ہی وہ سیدھا اندرا کے پاس آیا اور دونوں شیام سندر کے گھر پہونچے۔ شیام سندر کا وہاں کوئی پتہ نہ تھا۔ اِدھر اُدھر تلاش کرتے وہ آخر ہسپتال پہونچ گئے۔ اسوقت شیام سندر کو ہوش میں آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اسکے چہرہ پر غایت اضمحلال اور پراگندگی کے آثار دیکھے اور ڈاکٹر سے مل کر اسکی صحت یابی کے تیقن کا اطمینان کرکے اُسے آرام کرنے کے لئے چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ اس کمرہ کی نرس کو تعجب ہو رہا تھا کہ شیام سندر جو اس سے پہلے کافی بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نوجوان حسینہ کو دیکھکر اسکے چہرہ کی رنگت کیوں پھیکی پڑ گئی۔ اُسے تو زیادہ خوش نظر آنا چاہئے تھا۔ وہ ایک نہایت ذہین عورت تھی جو مردوں کی ہوسناکیوں کے آگے اپنا سب سے بیش قیمت جوہر قربان کرکے انکی نفسیات کا حقیقی مطالعہ کر رہی تھی اور اس طرح ایک مرد کے چہرہ کے رنگوں میں وہ کچھ دیکھ سکتی تھی جو دوسروں کو مشکل سے نظر آ سکتا تھا۔ پھر شیام سندر کی یہ غیر معمولی کیفیت اسے متعجب کئے بغیر کیوں کر رہ سکتی تھی۔

شیام سندر اسپتال سے بہت جلد صحت یاب ہو کر واپس آگیا اور اس کی زندگی کالج کی مصروفیتوں میں حسب دستور گذرنے لگی۔ اسکی کتابوں کی طرف پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ "میں نے اب تک اپنے ساتھیوں میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی ہے۔ لیکن بی۔ اے کے امتحان میں ضرور اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوں گا" وہ اکثر سوچا کرتا اور آنے والے امتحان کی تیاری میں اور زیادہ مصروف ہو جاتا۔ بی۔ اے کے امتحان میں اُس نے تواریخ میں اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ پرکاش یونیورسٹی میں اول رہا۔ اور اندرا کو بھی شاندار کامیابی ہوئی۔ پرکاش اور اندرا کے تعلقات اب اس منزل پر آ پہونچے تھے۔ جب محبت تخیلی (رومانی) حدود سے گذر کر اپنی حقیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور ہمارا جذبۂ حصول و مقبوضیت کا صرف ایک رومانی نام بن کر رہ جاتی ہے۔ پرکاش اور اندرا کے تعلقات کی خبر اندرا کے باپ کو بھی ہو چکی تھی، اور وہ بہت جلد اس رشتہ کو قوی کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں طرف سے بات پختہ ہو گئی، اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی، اندرا کے باپ نے شادی کا سارا انتظام شیام سندر کو سونپ دیا۔ شیام سندر نے بخوشی اسے قبول کر لیا۔ شادی کے ایک ہفتہ پہلے سے وہ اندرا کے مکان پر مستقل طور پر منتقل ہو جانے والا تھا، تاکہ سارے انتظام کی پوری نگہداشت کر سکے۔

اندرا کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ پھر شیام سندر شب کے ۱۰ بجے اندرا کے باپ سے دوسرے دن سے مستقل آکر رہنے کا وعدہ کرکے گھر واپس آیا اور آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ دن کے کام سے وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ اُسے بہت جلد نیند آگئی۔ رات کے ۲ بجے وہ یکایک ایک بھیانک خواب سے چونک گیا۔ اسکی گود میں ایک لمبے بالوں والی گلدار بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کھیل رہا تھا۔ یکایک اُسے سامنے ایک عجیب صورت دکھائی دی، جسکے جسم کا آدھا حصہ نہایت خوبصورت اور دلکش تھا۔ لیکن آدھا حد سے زیادہ کریہ اور ڈراؤنا ایسا معلوم ہوتا کہ دو متضاد صورتوں کو الگ الگ بیچ سے سیدھا کاٹ کر دونوں کا نصف جوڑ کر ایک کر دیا گیا ہو۔ یہ حیرت انگیز شکل تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی شیام سندر کے قریب آئی اور بلی کو اس کی گود سے چھین کر اسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ شیام سندر کے جسم سے مزاحمت کی قوت غائب ہو گئی تھی وہ چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن اسکی آواز بند ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن اسکے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ بلی اس عجیب شخصیت کے سینہ سے چمٹی ہوئی اسکے خوبصورت گال کو چومنے لگی۔ بلی کو اپنے قبضہ میں کرکے وہ تیزی سے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اسکے جانے سے فضا میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی چاروں طرف سے چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ وہ سارے عالم پر ظلم و ستم ڈھاتا جا رہا

تھا۔ اسی شور و ہنگامہ سے شیام سندر کی نیند ٹوٹ گئی۔ باہر ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ کھڑکی کے پٹ زور زور سے ٹکرا رہے تھے۔ تیز و تند ہوا مختلف قسم کی سیٹیاں اور آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ شیام سندر نے اُٹھ کر کھڑکی کے سارے کواڑ بند کر دیئے اور بستر پر آکر لیٹ گیا۔ وہ اپنے سر میں بھاری پن محسوس کر رہا تھا اور اعضا میں درد۔ اسکے قلب کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ کتنا ہیبت ناک خواب تھا! اس نے سوچا اور سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اُسے نیند نہ آئی۔ صبح ہوتے ہوتے اُسکے سر کا بوجھ اور اعضا کا درد تیز ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے بخار چڑھ رہا ہے۔ اُس نے چاہا کہ اسی حالت میں اندرا کے گھر چلا جائے۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے جسم کی طاقت کسی نے یکبارگی سلب کر لی تھی اور وہ بستر سے اُٹھ تک نہ سکتا تھا۔

شیام سندر ایک ہفتہ سے زیادہ بیمار پڑا رہا۔ اسے تھوڑا تھوڑا بخار رہتا، سر میں شدت کا درد اور اعضا میں اضمحلال جسکے سبب سے وہ نقل و حرکت سے قاصر ہو رہا تھا۔ لیکن باوجود اس بیماری و تکلیف کے اسکے چہرہ پر کوئی پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار نہ ملتے تھے۔ جیسے وہ اس عارضہ کو کوئی اہمیت نہ دے رہا تھا۔ مگر اُسکی بیماری اُسکے معالج کے دماغ میں اُلجھنیں پیدا کرنے کو کافی تھی اس لئے کہ اُسکی علامتیں اس کی پڑھی ہوئی کتابوں کے وضع کردہ اقسام مرض سے موافقت نہ کرتی تھیں۔ وہ کبھی اس کی بیماری کو انفلوئنزا کہتا، کبھی میعادی بخار، کبھی اسکے دماغ میں ٹی۔ بی کا شبہ ہوتا، کبھی گٹھیا کا۔ اس طرح وہ روزانہ اپنے فیصلہ میں ترمیم کی گنجائش محسوس کر کے نسخہ میں اسی مناسبت سے تبدیلیاں واقع کر دیتا۔ لیکن شیام سندر کو کوئی افاقہ نہ معلوم ہوتا۔ چنانچہ اسکی بیماری ہی کی حالت میں پرکاش بارات لیکر آیا اور اندرا کو اپنے ساتھ کانپور لے گیا۔ اور شیام سندر اندرا کے بیاہ میں شریک نہ ہو سکا۔ اس روز دن بھر اسے اُسکا صدمہ رہا۔ اندرا اور وہ ساتھ کے کھیلے تھے۔ دوسرے دن سے اُسے یک بیک افاقہ ہونا شروع ہو گیا، اور وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔

شیام سندر نے بی۔ اے کے بعد وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ اُسکو دل میں ایک کامیاب وکیل بننے کی خواہش تھی اور اُس نے اس خواہش کی تکمیل میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی، وہ بہت جلد ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔ اندرا اور پرکاش سے اسکی دوستی جاری تھی۔ بلکہ اُسکے ملاقاتیوں میں یہی دونوں تھے جن سے وہ حقیقی معنی میں خلوص اور محبت رکھتا تھا۔ پرکاش اور اندرا دُنیا سے قطعاً بے نیاز فردوسی زندگی گذار رہے تھے۔ کاروبار کا انتظام سارا پرکاش کا باپ کرتا۔ پرکاش قطعاً آزاد تھا، اُسکے اوقات کتب بینی یا مختلف ممالک کی سیر میں گذرتے۔ اندرا بھی باپ کے مرنے کے بعد سے اپنے آبائی گھر سے بالکل بے تعلق ہو چکی تھی۔ لیکن انکی یہ سکون پرور زندگی فطرت کے دستور کے خلاف تھی۔ فطرت سکون نہیں پسند کرتی وہ خود ہر ساعت مضطرب اور بےچین رہتی ہے اور حیات کو اضطراب و ہنگامہ کی شراب سے سرشاری بخشتی رہتی ہے۔ زندگی کے ساز میں بلا زیر و بم کے نغمہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ پرکاش زندگی کے مضراب کو، اسکی ٹھوکروں کو مگر درد ناکارہ بنا رہا تھا، زندگی کے ساتھ اس کا یہ سلوک فطرت کی برداشت سے باہر تھا وہ اس سے اس کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کا باپ یکبارگی قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے مر گیا۔ پرکاش اندرا کیساتھ کشمیر میں تھا۔ اُسے یکایک تار ملا اور آدم و حوا کی جنت سے نکالے جانے کی داستان تاریخ کے صفحہ پر دوبارہ مرتسم ہو گئی۔ پرکاش کے سر پر ایک ناگہانی عذاب نازل ہو گیا۔ سارے کاروبار کا بوجھ اسے تنہا سنبھالنا تھا۔ وہ اس کام سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ اسکی ناتجربہ کاری دوسروں کی کامکاری کا ذریعہ بن گئی۔ کارخانہ کے مُلازموں نے حرام خوری شروع کی۔ الہ آباد کے ایک بڑے دُکاندار نے جو اسکے کارخانہ سے برابر مال خریدا کرتا تھا، اسکے مُلازموں کو ملا کر اُس پر کئی لاکھ کی نالش کر دی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ رقم کارخانہ کو بطور پیشگی قیمت مال ادا کی گئی تھی لیکن اسکے عوض مال وصول نہ ہوا تھا اُس نے جعلی کاغذات مقدمہ کی حمایت میں تیار کر لئے، اور پرکاش کے مُلازموں کو رشوت دیکر اپنے حسب خواہ گواہی کے لئے آمادہ کر لیا۔ پرکاش نے مقدمہ کی پُوری کارروائی شیام سندر کے حوالے کر دی اور خود مطمئن ہو کر کارخانے کے دوسرے معاملات کی دُرستی میں مصروف ہو گیا۔ شیام سندر نے پرکاش کے مقدمہ میں اَن تھک محنت اور کوشش سے کام کیا۔ شاید اپنے خاص کام کو بھی وہ اتنی توجہ نہ دیتا اسے کامل یقین تھا کہ مقدمہ پرکاش کے حق میں فیصلہ ہو کر رہیگا۔ مقدمہ کی سماعت کے دن وہ پورے طور پر تیار ہو کر کچہری پہونچا اور مخالف وکیل کی جرح کے جواب میں بحث کرنے کو کھڑا ہوا۔ وہ اپنی خداداد قانونی قابلیت کا سکہ جما چکا تھا اس دن اسکی بحث سُننے کے لئے وکلا کثیر تعداد میں جمع تھے۔ اسلئے کہ انہیں معلوم تھا کہ پرکاش سے گہرے تعلقات کی بنا پر وہ پرکاش کے مقدمہ میں اپنی ساری قانونی صلاحیت کو بروئے کار لائیگا۔ لیکن وہ بہت جلد حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ شیام سندر اُس وکیل کی طرح بحث

کر رہا تھا جس نے پہلی دفعہ کچہری میں قدم رکھا ہو اور اپنی گھبراہٹ اور سراسیمگی پر قابو پانے کی ناکام کوشش طفل مکتب کی طرح اصل مطلب سے دُور بہکا پھر رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مخالف وکیل اسے ہپنوٹائز کر کے اسکے مُنہ سے اپنے حسب مرضی باتیں کہلوا رہا تھا۔ ایسی خام بحث کا نتیجہ ظاہر تھا۔ پرکاش مقدمہ ہار گیا اور اسے ایک سال کی سزا ہو گئی۔

بحث ختم کرتے ہی شیام سندر سیدھا گھر واپس آیا۔ وہ اپنے اندر ایک مجنونانہ کیفیت محسوس کر رہا تھا، اسلئے کہ اسے باوجود اتنی سنگدلی کا بنیادی کے ایک گہری لذت اور طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے دل و دماغ سے کسی نے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا ہو۔ لیکن وہ اپنے دماغ کی اس کیفیت کا مفہوم جاننا چاہتا تھا اس نے پرکاش کی زندگی خاک میں ملا دی۔ آخر کیوں! وہ اس کا عزیز ترین دوست تھا جس کی صحبت کا ایک ایک لمحہ اُسے اپنی ساری کمائی سے زیادہ قیمتی تھا لیکن پھر وہ اُسکی بربادی کا سبب کیوں بنا؟ وہ اپنے دماغ سے ان سوالوں کا جواب مانگ رہا تھا لیکن اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "بتاؤ مجھکو بتاؤ" وہ بڑبڑانے لگا "مجھکو کیا ہو گیا ہے؟ کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ ہاں ہاں! میں پاگل ہوں۔ دیوانہ جسے اپنی حرکات و سکنات پر کوئی قابو نہیں رہتا۔ جو میری باتوں پر نکتہ چینی خود پاگل پن ہے۔ لیکن نہیں! میں ہرگز پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل کیوں ہونے لگا؟ مگر مجھکو کیا ہو گیا ہے؟ پرکاش تم بتاؤ۔ میں اندرا سے پوچھونگا! اپنی اندرا سے۔ اندرا صرف میری ہے۔ پرکاش کی نہیں۔ پرکاش! چور! بدمعاش! فریبی! دغاباز! میں تجھے زندہ نہ چھوڑونگا" اُس نے اپنے کپڑے نوچ ڈالے اور پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا گھر سے نکل گیا۔ وہ اب تک شہر شہر بڑبڑاتا پھرتا ہے۔ اُسکی باتیں بے ربط ہیں لیکن اُسکے ہر مہمل اور بے معنی جملہ کیساتھ یہ فکرا ضرور شامل رہتا ہے "بدمعاش۔ فریبی مکار! میں تجھے کبھی زندہ نہ چھوڑونگا"

سید محمد محسن، ایم اے عظیم آبادی

"اسرار و معارف"

تو رازِ ہستی سے بیخبر ہو تری نظر حق نگر نہیں ہے
وگرنہ وہ رات کونسی ہے جو غیرتِ صد سحر نہیں ہے

حقیر ذرات کی جبینیں شعاعِ رفعت سے ضو فگن ہیں
تجلیوں کی کشاکشیں ہیں طلسمِ رقصِ شرر نہیں ہے

یہ برق کا اضطرابِ پیہم یہ نبضِ حس کی دھمک کا عالم
حقیقت آمیز ہیں مناظر، فریبِ حُسنِ نظر نہیں ہے

یہ آگ پانی کا میل باہم، یہ اتحادِ نظام برہم
تری نظر دیکھتی ہو سب کچھ یقین تجھ کو مگر نہیں ہے

نہیں ہے گلگون جبینِ شفق کی یہ رنگ ہی خونِ آرزو کا
عیاں ہیں کچھ داغ حسرتوں کے نظامِ شمس و قمر نہیں ہے

نہ دیکھ ذروں کو بے رُخی سے، سمجھ کہ کیا ہیں ضو فشاں ہے
تو جسم کا صرف ہے پجاری، تری نظر روح پر نہیں ہے

بہارِ گلشن کی کوششوں کا، ماآل کچھ خشک پتیاں ہیں
شباب پر آگئی ہو ظلمت طلوعِ نورِ سحر نہیں ہے

نہیں نفس پر مدارِ ہستی، یہ وہم ہو اک جنوں پرستی
فضا محبت کی سرمدی ہے جہاں فنا کا گذر نہیں ہے

خدا کے فضل و کرم سے ماہر میں اس نتیجہ پہ آگیا ہوں
بجز محبت کے دردِ دل کا یہاں کوئی چارہ گر نہیں ہے

ماہر القادری

جُرعات

اعجازِ تجلّی ہے کہ نیرنگِ تماشا — آئینۂ کثرت میں ہے اک جوہرِ یکتا
شعلہ ہو کہ لالہ ہو شرارہ ہو کہ تارا — ہر جلوۂ رنگیں میں مجھے وہ نظر آیا

دردِ بے بینشِ دُنیا سے تڑپ اُٹھتا ہوں — کوئی تو میری طرح دیکھنے والا ہوتا
بزمِ ہم جنس میں ہوں سب سے جُدا سب سے الگ — اِس سے بہتر تھا کسی دشت میں تنہا ہوتا

کہاں وہ لحن کہاں نغمۂ سرودِ ستار — وہ کوئی لَے ہے جس میں ہو التزامِ خمار
زمانے بیت گئے ختم ہو گئیں لیکن — ہنوز رُوح فزا ہے وہ لذّتِ گفتار

کیا جانے کس خیال میں محوِ سکوت ہوں — ورنہ بیانِ شوق سے قاصر زباں نہیں
ہو چشمِ التفات نہ کر منفعل مجھے — جو کچھ ہے میرے دل میں وہ تجھ سے نہاں نہیں

کبھی سینوں میں پنہاں ہے کبھی منظر سے پیدا ہے — جمالِ یار کہتے ہیں جسے حُسنِ تمنّا ہے
نہیں لازم کہ موسیٰ کی طرح سے طُور پر دیکھیں — بحمد اللہ اپنا شعلۂ دل برقِ سینا ہے

پینے دیں یونہی عشق میں خونِ جگر مجھے — اب چھوڑ دیں کبھی یہ مرے چارہ گر مجھے
یہ دردِ خوشگوار ہے سرمایۂ حیات — راس آ گئی ہے کاوشِ تیرِ نظر مجھے

اہلِ ہوس کی تنگیِ دل ماوِ من میں ہے — دُنیا اسیرِ لذّتِ کام و دہن میں ہے
گلچیں کا خوف اور نہ اندیشۂ خزاں — نام و نمو فطرتِ اہلِ چمن میں ہے

دامن میں تار ہے نہ گریباں میں تار ہے — لے دیکھ ایک تارِ نفس ہے وہ خار ہے
پیراہنِ وجود سے کبھی ہوں خفا و تنگ — جس روز سے سُنا ہے کہ وہ مستعار ہے

کچھ دیر کی بس کشمکشِ یاس و یقین ہے — اب رخصتِ بیمار میں تاخیر نہیں ہے
آنا ہو تو جلد آؤ کہ ہے ساعتِ آخر — ہر دم یہ گُمانِ نفسِ بازپسیں ہے

نورِ ایماں سے دل و جاں کو فروزاں کر دے — شمعِ کشتہ ہے مسلماں کو مسلماں کر دے
پرتوِ حُسنِ جہاں تاب سے اے حسنِ تمام — ذرّۂ خاک کو خورشیدِ درخشاں کر دے

لحنِ شوق کو پھر شمعِ شبستاں کر دے — عالمِ دیں کو معمورۂ ایقاں کر دے
مستی و کیف عطا کر دلِ افسردہ کو — خار کو پھول بیاباں کو گلستاں کر دے

کوکبؔ شاہجہاں پوری

نتیجۂ بحث

(پروفیسر محمد مسلم کا مضمون "جواب طلب" (مطبوعہ ساقی نومبر ۱۹۳۴ء) اتنا مقبول ہوا کہ اس کے پانچ جواب شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ "عمر جاوداں" کی طرح دراز ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ پروفیسر مسلم کی طرف سے "نتیجۂ بحث" شائع کیا جا رہا ہے ــــــ اہل قلم حضرات آئندہ اس سلسلہ میں زحمت خامہ فرسائی نہ فرمائیں اور اسے "مرگِ ناگہاں" سمجھیں۔)

شاہد

عزیزہ عزیزہ۔

تم نے میرے نجی خطوط کو بلا اجازت مشتہر کر دیا یا تشہیر کر دی۔ مجھے شکایت ہونا چاہیئے تھی مگر نہیں ہے۔ اپنی رسوائی سے کوئی سماجی یا اخلاقی گتھی سلجھ جائے، اور اس سے سماج کا بھلا ہو تو مجھے یہ رسوائی گوارا ہے۔

معلوم نہیں ان جوابات میں سے کون واقعی تمہارا ہے اور کون تمہارے فرضی نام سے؟ یا ایک بھی تمہارا نہیں؟ یا تمہیں بس سے اتفاق رائے ہے؟ جوابات زیادہ تر مجیب کی عمر اور طبعی افتاد کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً انصار ناصری صاحب ایک منچلے ہنسوڑ نوجوان معلوم ہوتے ہیں جو شاید کندھے پر جنازہ لئے جا رہے ہوں جب بھی کسی ٹھگنے رفیق کی طرف تابوت کے جھکے جانے پر ہنسے بغیر نہ رہیں۔ اسی طرح "احمد" صاحب کا ٹھٹھول اور پھبتیاں بھی شاید تقاضائے شباب ہیں یا طباعی اس لئے لائق اعتنا نہیں۔ "ایک خاتون" نے جواب الجواب میں وہ کیا جس سے میں نے تمہیں روکا تھا یعنی ان خطوط کو افسانہ بنا چھوڑا۔ وسیع معنی میں مجھے ان کے افسانہ ہونے سے انکار نہیں مگر کیا ضرور ہے کہ ہر افسانہ شادی یا موت ہی پر کامل سمجھا جائے۔ ایسے دُم چھلوں کے بغیر بھی افسانہ ہوتا ہے اور زیادہ تر فطری۔ اگر میرا مقصد ایک افسانہ کی ترتیب و تکمیل ہوتا تو اب مجھے خاموش بیٹھ جانا چاہیئے تھا کیونکہ کہانی ختم ہو گئی۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ اب سو جایئے یا اپنے اپنے گھر سدھاریئے۔ مگر میرا مدعا اخلاقیات کی ایسی گتھی سلجھانا ہے جو میری طرح اوروں کو پریشان کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے میں دو اصحاب کے جواب سے بہت متاثر و ممنون ہوا۔ ایک تو مسعود جاوید صاحب کی نفسیاتی تحلیل سے۔ دوسرے محسن صاحب کے اجتماعی سطح نظر سے۔ یہ دونوں ناجن ٹی فالر مجموعی حیثیت سے اس عقدہ کی کشائش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

دونوں کی تقریروں سے اس مسئلہ کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک حیاتیاتی یا نفسیاتی، دوسرا روحانی۔ پہلے نقطہ نظر سے دلی کی خواہش پوری کرنا ایک ایسا فعل ہوگا جس میں نہ عقل کو دخل ہے نہ ارادے کو، نہ ضمیر سے استصواب کی ضرورت۔ ایک قدرتی اضطراری فنومنن (ظہور) ہوگا۔ جس طرح آئے دن حیوانات میں ہم ایسے افعال دیکھتے ہیں اور کوئی اچنبھا نہیں ہوتا بلکہ خبر بھی نہیں ہوتی۔ اس فعل پر حیوانی یا حیاتیاتی نگاہ سے دیکھنے والا کوئی تعجب کریگا نہ مزاحمت۔ دوسرے پہلو پر محسن صاحب نے زیادہ صاف روشنی ڈالی ہے۔ انسان وہ مخلوق ہے جس کی حیثیت اس سنسار میں دوگانہ ہے۔ ایک ذاتی و انفرادی

دوسری ہیئت اجتماعی کے ایک رُکن کی۔ پہلی حیثیت سے صرف ممکن و ناممکن کا سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ جائز و ناجائز، خطا و صواب یا اخلاق و مذہب کے سوال ہیئت اجتماعی کے رُکن کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ موجودہ مسئلہ انہیں دو حیثیتوں اور انکے فرائض کے تصادم کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ انصار ناصری صاحب پہلی حیثیت کو اہمیت دیتے ہیں محسن صاحب فرماتے ہیں:-

"تمہیں کیا خبر کہ جس مقصد کو تم نے عالی مقصد سمجھ لیا ہے وہ اُس مقصد کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتا جس کے حصول کا ذریعہ فطرت نے مذہب و اخلاق کو بنایا ہے .... میرے نزدیک ان کا وجود ایک نظام سے بڑھکر نہیں، جو انفرادی ضروریات و خواہشات سے قطع نظر، اجتماعی ضروریات کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔ لیکن اس نظام کا بانی کوئی انفرادی شخصیت نہیں بلکہ خود فطرتِ انسانی ہے ....

"اگر تم میں سے ہر شخص کو اپنے طور پر اس مقصد کے حصول کے ذرائع کی جانچ پرتال کی قدرت حاصل ہوجائے بلکہ ان کے وضع کرنے کا حق بھی حاصل ہو تو کیا اس مقصد کا حصول کبھی ممکن ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں اپنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جو کام تمہاری عقل کو مفید معلوم ہوتا ہے، میری عقل کے نزدیک ناکارہ ثابت ہوسکتا ہے .... اس لئے میرے دوست تمہارا یہ خیال کہ جو ذرائع تمہارے اعلیٰ مقصد کے حصول میں معاون ہوں، تمہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے، خواہ وہ مذہب و اخلاق کے قوانین سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں، قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ جس مقصد کو ہم اعلیٰ مقصد سمجھتے ہوں، ممکن ہو اس عالمگیر مقصد کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتا ہو جس کی توسیع (یا تکمیل) فطرت کر رہی ہے۔ رہ گئے ذرائع۔ ان کے صحیح انتخاب پر تمہیں کوئی دسترس نہیں۔ اس لئے کہ تمہارے پاس جو عقل کی کسوٹی ہے وہ سونا اور تانبا میں کوئی تمیز نہیں کرسکتی۔ اب تمہارے لئے سوا اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ اُن قوانین پر عمل کرو جو حیات اجتماعی کے بنا کردہ ہیں، اور یقینی حیات کی ارتقاء و بہبود میں معاون رہے ہیں، ورنہ کب کے مفقود ہوگئے ہوتے ......

....

"مذہب و قانون کے قوانین کی نوعیتیں اتنی مختصر نہیں کہ تمہاری عقل میں سما سکیں۔ ان کی وسعتیں اتھاہ ہیں۔ تب تو ابتدائے آفرینش سے وہ حیات کی نشو و نما و ارتقا میں معاون ہوتے رہے ہیں۔ تمہاری عقل زیادہ سے زیادہ تمہاری اپنی انفرادی زندگی کے چند سطحی معاملات کے لئے قوانین بنا سکتی ہے۔ لیکن وہ قوانین جنکا اثر انسانیت ہی نہیں بلکہ حیات کی مکمل تاریخ پر رہا ہے کسی انسان کی عقل کا نتیجہ کس طرح ہوسکتے ہیں؟ وہ خود فطرت کے وضع کردہ ہیں اور اُنکی نوعیت و مقاصد کا علم خود فطرت کو ہوسکتا ہے۔"

اگرچہ میں تمام مروجہ مذاہب سے اتنا خوش عقیدہ تو نہیں کہ ان سب کو قوانین فطرت کا درجہ دوں۔ مذاہب کے نافذ کردہ یا مصدقہ کتنے قوانین ہیں جو نظام اجتماعی کے لئے مضرت رساں ہوئے ہیں اور آج تک ہیں۔ بہرحال جزئیات و فروعات میں مجھے اکثر مذاہب یا ان کے بعض قوانین سے جو کچھ بھی اختلاف ہو، اصولاً محسن صاحب کی منطق ٹھوس اور تشفی بخش ہے۔ اور مسعود جاوید صاحب کی تحریر اسی کا مجمل متن ہے۔

للی سے پھر ملنے کی میں نے اپنے آپ میں جرأت نہ پائی۔ اسے جو خط لکھا ہے اس میں زیادہ تر دلائل بالا سے ہی استدلال کیا۔ اس کے علاوہ خط کے بعض اجزا کا اقتباس اپنے حافظ کی مدد سے پیش کرتا ہوں:-

کم سے کم ہندوستان میں فطرت کا منشا ہے افزائش آبادی میرے جیسے حیوانی انسانوں کے ہاتھوں مبالغہ کے ساتھ پورا ہو رہا ہے۔ یہ افراط بجائے خود ایک دردناک صورت حال ہے ....

بحالت موجودہ میں تمہیں یہ مشورہ دونگا کہ خدا نے تمہیں ایک مسرت نفسانی سے محروم رکھا ہے تو اس کے عوض دوسری مسرت ابدی و روحانی کا موقع دیا ہے۔ طوفانی جوانی تم بسا رہ چکیں۔ اس ہولناک منزل کی طرف لوٹنے کے عوض آگے کی منزل کی طرف بڑھ چلو۔ جہاں ہر شخص کی رسائی نہیں ہوتی، نصیبوں ہی سے کوئی پہنچ پاتا ہے۔ وہ قربانی اور سیوا ہے۔ تم ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ہمدردی کی محتاج دُکھی بہنوں کے دُکھ ہر اسکتی اور ان کی زندگی کے کشٹوں کو آنند سے بدل سکتی ہو۔ شاید قدرت نے تم کو اسی خدمت کے لئے چُن لیا ہو تو تمہاری خوش نصیبی قابل رشک ہے۔ اور تم لائق عزت و احترام ہو۔ اُمید ہے کہ اب میں تم سے ملونگا تو عقیدت کے پھول تم پر نثار کرونگا اور پاک روحانی محبت کا وہ ہدیہ پیش کر سکونگا جو لازوال ہوگا۔ تمہاری جلائی ہوئی روشنی میں میرے جیسے دُنیا کے قیدی بھی چند قدم تمہارے پیچھے چل سکیں گے ....

للی کا جواب تمہارے سُنانے کے قابل ہے مگر خط طویل ہو جائیگا۔ اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔

"اُس روز آپ کو رُخصت کرنے کے بعد میں خود عجب اُلجھنوں میں مبتلا ہو گئی۔ کئی راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ فرض اور غرض، ضمیر اور نفس کی جنگ چھڑی رہی۔ کل جو آپ کا خط ملا ہے تو اس جنگ میں ضمیر کا غلبہ شروع ہو چکا تھا۔ آپ کے خط نے اسے کامل جیت دلا دی۔ لطیف صاحب شاید آپ میری مایوسی کی شرم سے مجھ سے نہ ملے۔ سمجھے ہونگے میں آپ پر بے وفائیوں اور بے دردیوں کے الزامات کی بوچھاڑ لگا دونگی مگر ایسا نہ ہوتا ....

.... میرے دل میں آپ کی عزت زیادہ ہو گئی۔ محبت عقیدت سے بدل گئی .... آپ نفس کے بندے ہیں تو یہ کیجئے فطرت کسی کو کسی کام کے لئے انتخاب کرتی ہے اور کسی کو کسی کام کے لئے۔ سب اپنی جگہ پر یکساں اہم ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں صاحب اولاد سماج کی بہتر اور سب سے مشکل خدمت انجام دیتے اور زیادہ قیمتی قربانیاں کرتے ہیں۔ اپنی ادنیٰ اور ناچیز خدمت سے بقول آپ کے کوئی بتی روشن کر دونگی تو اس کا نیل آپ ہی ہوں گے۔

.... لطیف صاحب میں عرض نہیں کر سکتی کہ ہردے میں کتنا حبس اور من کتنا آنند محسوس کر رہی ہوں ......

...... معلوم ہوتا ہے عورت قربانی کیلئے خاص طور پر پیدا کی گئی ہے اسکا نفسانی جذبہ جتنا تیز ہوتا ہے اتنی ہی نفس کشی کی قابلیت زبردست۔ مگر قربانی ہر حال میں اس کی فطرت کا نمایاں حصہ ہوتی ہے۔ اگر اسکی قربانی کا مرکز اعلیٰ تر مقصد ہوتا ہے تو وہ اس میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں رہتی بلکہ شاید آگے ہی نکل جاتی ...... دُعا کیجئے کہ خُدا اس راہ میں میری رہنمائی کرے اور آپکی توقعات پوری ہوں ...."

تمہارا لطیف؛

محمد مسلم؛

سروشِ غیب کا پیغام
شاعرِ ہندوستان کے نام

(۱)

کب سے ہی تیرا چمن آلودۂ جورِ خزاں
چاہیئے فکرِ بہار اے شاعرِ ہندوستاں

دعویٔ عشقِ وطن ہی تو وطن کے کام آ
تو ہے بلبل جس چمن کا اُس چمن کے کام آ

وصل و ہجراں کے ترے لب پہ فسانے تا بکے
رندی و مستی کے کیف آور ترانے تا بکے

بس چکا ہی جسمیں تو اُس آشیاں کا حال دیکھ
دیدۂ نمناک سے ہندوستاں کا حال دیکھ

دل جو اُمیدوں بھرا تھا اب ہی عالم یاس کا
کہتے ہیں بھارت جسے معمورہ ہی افلاس کا

جسکو لطفِ زیست کہتی ہیں یہاں معدوم ہی
ساز و برگِ عیش سی یہ سرزمیں محروم ہی

لالہ رُخسار دنکے ہی چہرے ہیں کمہلائے ہوئے
ہر قدم پہ ہی فلاکت چھاؤنی چھائے ہوئے

روزِ روشن میں بھی ہی عالم شبِ دیجور کا
وقفِ ظلمت غمکدہ ہی کس قدر مزدور کا

زندہ کیا کہیئے انہیں بیجاں رہتے ہیں یہاں
مختصر یہ فاقہ کش انسان رہتے ہیں یہاں

دیکھتی ہی آنکھ جسکو تن دہی میں طاق ہی
منعموں کی کسقدر یہ پستیِ اخلاق ہی

خندہ زن ہی ایک عالم جس پہ اُس عالم کو دیکھ
مسلم و کافر کی رزم آرائے پیہم کو دیکھ

(۲)

یہ وہی خطہ ہی جو تھا ایکدن جنت نشاں
خلق کہتی تھی جسے عظمت نشاں راحت نشاں

سنگریزوں سی یہاں کے لعل و گوہر ماند تھے
جس قدر ذرے تھے وہ فرشِ زمیں کے چاند تھے

پرچمِ رنگیں بہار اپنا اُڑاتی تھی یہاں
نکہتِ باغِ جناں کانٹوں سی آتی تھی یہاں

چل نہ سکتی تھی یہاں کچھ شیطنت ابلیس کی ۔۔۔ پھونکدیتی تھیں شعاعیں نیّرِ تقدیس کی
تھا یہاں پیری میں بھی رنگِ جوانی آشکار ۔۔۔ تھی جبینوں سے ضیائے کامرانی آشکار
جنکے آگے کوہ کی سطوت کی ہستی کاہ تھی ۔۔۔ سرزمینِ ہند اُن لوگوں کی جولانگاہ تھی
دوش پر اُنکی کمانیں، چٹکیوں میں تیر تھے ۔۔۔ بھیم اور ارجن سے اس اقلیم میں رن بھیر تھے
جانکنی کی سختیوں کو ہنستی یہ ہنسکر جھیلتی ۔۔۔ زندگانی تھی حقیقت میں اجل سے کھیلتی
خلعتِ ہستی مرادف تھا لباسِ مرگ کا ۔۔۔ زور ہی مطلق نہ چلتا تھا ہراسِ مرگ کا
دورِ گردوں نام مردوں کا مٹا سکتا نہیں ۔۔۔ "وقت" اُنکے کارناموں کو بھلا سکتا نہیں

(۳)

اے نوا سنج وطن اے شاعرِ شیریں بیاں ۔۔۔ پا شکستہ کارواں کا تُو ہے میرِ کارواں
تجھکو شایاں ہے جو کہیے درسِ آموزِ حیات ۔۔۔ اپنے نغموں سے عطا کر قوم کو سوزِ حیات
کوئی روشن جادہ کر پیدا نگاہوں کیلئے ۔۔۔ رہبرِ منزل ہے تُو گم کردہ راہوں کیلئے
راہ پیما سوئے منزل کاروانِ شوق کر ۔۔۔ از سرِ نو یعنی عزمِ امتحانِ شوق کر
بادۂ ہمت سے ہو سرشار ہر پیر و جواں ۔۔۔ اپنی تاریخِ کہن دہرائے پھر ہندوستاں
موسمِ گل صورتِ ماضی چمن میں لوٹ آئے ۔۔۔ یوسفِ گم گشتہ پھر اپنے وطن میں لوٹ آئے
ارتقا کا راز سمجھا، درسِ خودداری سکھا ۔۔۔ فطرتِ مجبور کو آئینِ مختاری سکھا
سربلندی کی جہانِ عجز میں تجدید کر ۔۔۔ ذرّۂ بے مایہ کو ہمپایۂ خورشید کر
زندگی ذوقِ عمل کا نام ہے یہ جان لیں ۔۔۔ کاش اہلِ ہند اپنی منزلت پہچان لیں

ایکہ باشی ملتِ درماندہ را پیغمبرے
از نوائے خویش پیدا کُن جہانِ دیگرے

نہال سیوہاروی

باوَن پتّے

بند کمرے میں ایک دُھلی ہوئی چادر پر سُرخ رنگ کے تاش کے پتّے بکھر رہے تھے ——

یہ ایک پُرانی وضع کا کمرہ تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی میز کی چھاتی پر دو ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں، جن کے کھُلے اوراق پر آتشِ نفس انسانوں کے افکار سلگ رہے تھے۔ کمرے کی وزنی چھت کو ایک بُوڑھا شہتیر اپنے سینہ کے زور سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اپنی اس مظلوم حالت میں، احتجاج کے طور پر وہ کبھی کبھی کڑ کڑ کی صدا بلند کر دیتا۔ درمیان سے اس کی کمر بھی جھُک گئی تھی، اور اس خلا میں ایک بوڑھے چڑے چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ کہنہ دیوار کے ایک روشندان سے وہ روزانہ دانہ دُنکا چُگنے کے لئے اڑ جاتے۔ ان ننھے مُنّے پرداروں کو جنگل کے بڑی چونچ والے پرندوں نے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ ان کی ہم نوا چڑیوں کو بھی انہوں نے پَر نوچ کر گنجا کر دیا۔ انہیں سر چُھپانے کو جگہ نہ تھی —— اپنی چڑچوں میں محو یہ بُوڑھا جوڑا اس ٹیڑھے گھونسلے میں موت کے لئے چھلاوا بن کر زندگی کی شام اس کمرے کی بند فضا میں بسر کر رہا تھا ——

عموماً دوپہر کو جب ایک دُبلا پتلا لڑکا بالائی منزل سے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے کے لئے کمرے میں آتا تو یہ دونوں اُن کے کھیل کو گہری نظروں سے دیکھتے —— شاید انہیں ان سُرخ و سیاہ اشکال سے کچھ دلچسپی ہو گئی تھی۔

—— چادر پر بکھرے ہوئے پتّوں نے آج خود بخود حرکت کرنا شروع کر دی۔ چڑے چڑیا نے کبھی یہ کھیل نہ دیکھا تھا۔ اپنے گھونسلے سے گردنیں لٹکائے اُنہوں نے غور سے اس طلسم کو دیکھنا شروع کیا ——

ایک مختصر سی حرکت کے بعد یہ پتّے کچھ اور بکھر گئے۔ یکایک اینٹ کا بادشاہ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے نخوت پسندی سے اینٹ کے غلام کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ بڑبڑایا اور اپنے ہم جنسوں کے قریب تر ہو کر ایک بار پھر آواز دی، لیکن اس کی پکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ غصّہ سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اُس نے پتّوں میں سے اس غلام کو جبراً کھینچ کر باہر نکال لیا ——

اوندھے مُنہ پڑے ہوئے پتّے یکایک ہوشیار ہو گئے۔ حکم، پان اور چڑیا کا بادشاہ بھی اُٹھ کر اپنے ہم مرتبہ کی صف میں کھڑے ہو گئے ——

"تم آواز کا جواب کیوں نہیں دیتے —— بہرے ہو گئے ہو کیا؟"

دفعتہً غلام کی آنکھیں اپنے غضب ناک آقا کی طرف اُٹھیں۔ وہ ارادتاً ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اینٹ کے بادشاہ نے بڑھ کر اُس کے ایک زبردست چپت رسید کیا —— آقا عموماً آپے سے باہر ہو جایا کرتے ہیں۔

غلام نے اپنا ہاتھ سُرخ گال پر رکھ لیا۔ خوناب آنکھوں سے اس نے دوبارہ آقا کے ڈراؤنے چہرے کی طرف دیکھا۔ سر پھرا آقا یہ بھی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے غلام کو بُری طرح سے نوچنا شروع کیا۔ جملہ بیگمات اس منظر کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ہلکے پتّے بھی ایک دوسرے سے اشاروں میں باتیں کرنے لگے۔ پان، حکم اور چڑیا کے غلام بھی آنکھیں کھولے گہرے سانس لے رہے

تھے ـــــ سرد آہیں ملوکیت سے خائف غلاموں کے جذبۂ احتجاج کی گرمی کو اندر ہی اندر ٹھنڈا کر دیتی ہیں ـــــ

یکایک پان کے غلام نے بڑھکر بادشاہ کے ظالم ہاتھ کو روک لیا۔

"ٹھیریئے اب آپ کو ظلم و تشدد سے ہاتھ کھینچنا ہوگا؟"

پان کا غلام غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے اُسے زور سے ایک جھٹکا دیا اور وہ بے تحاشا گر پڑا۔ زمین سے ٹکراتے ہی اس کے سر سے خون کی دھار بہنے لگی۔

"ہائیں آپ کیا کر رہے ہیں!" ـــــ اینٹ کی بیگم بے خود ہوکر آگے کو بڑھنے لگی لیکن بادشاہ کی خونی نگاہوں نے اس کی جرأت کو پسپا کر دیا۔

حکم کے بادشاہ نے جو اپنے ساتھیوں سمیت تماشا دیکھنے میں مصروف تھا حکم کے یکّہ کو اشارہ سے بُلا کر پان کے غلام کی گرفتاری کے لئے حکم دیا۔

"لے جاؤ اس غلام کو جیل خانہ میں۔ کمینہ کہیں کا، آقا کے سامنے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔" ـــــ حکم کا بادشاہ ملوکیت کا خُدا نظر آتا تھا۔

تاش کے ہلکے پتّے جذبات کے انتہائی اشتعال سے کانپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بغاوت کی روح سما رہی ہو۔

"ہم آپ کے غلام سہی لیکن ہم اپنا جسم و جاں آپ کے حوالے نہیں کر سکتے۔ مجھے قید کیوں کرتے ہو۔ میں کُھلی فضا میں جینا چاہتا ہوں۔

ـــــ مجموعی طاقت کے خوف سے ڈرو۔ تمہارا تشدد ہماری ضمیر کو ہرگز مُردہ نہیں کر سکتا!" پان کا غلام گرفتاری کے وقت چلا چلا کر آقاؤں کو قائل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس دلیری پر حکم کے یکّہ نے اس کے جانٹا رسید کیا ـــــ

مُشتعل پتّے بیدھڑک ہو چکے تھے۔ حکم کا غلام اپنے ساتھی کی یہ بے قدری نہ دیکھ سکا۔ اُس نے بڑھکر یکّہ کو اپنے سیاہ بازوؤں کی گرفت میں لے کر پان کے غلام کو آزاد کرانے کے لئے جھٹکا دیا۔ چڑیا کا غلام بھی سامنے تن گیا ـــــ

ـــــ اب شاہوں کے پاسبان یکّوں نے غصّہ میں آکر ہنٹر برسانا شروع کر دیئے۔ وہ تشدد سے غلاموں کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ ہلکے پتّوں کا مُشتعل مجمع تُند بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ مجموعی طاقت کے سیلاب کے آگے اکیّے اور بادشاہ جو اس کھلبلی میں اب بیگمات کو سنبھال رہے تھے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ـــــ ملوکیت، جس کے رعب نے ان کی زندگی کو پاؤں تلے دبا رکھا تھا آج ان کے کندھوں پر جنازہ بن کر موت کی کڑوی نیند سو رہی تھی ـــــ غلاموں کی آزادی اس کے تابوت کا آخری کھیل تھی۔

غلاموں اور آقاؤں کی اِس مڈبھیڑ میں پان کی تگی اور حکم کی چھکے پنجے کے بھی معمولی چوٹیں آئیں۔

ـــــ آزاد پتّوں نے اب اپنی ترتیب کو بالکل بدل دیا تاکہ آئندہ کوئی پتّہ کسی دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ میں کٹھ پُتلی بن کر ایک دوسرے پر وار نہ کر سکے ـــــ

یہ کھیل دیکھکر مبہوت چڑے نے چڑیا کے کان میں کچھ چرچوں کی۔ دونوں جنگل کی کُھلی فضا کی طرف پرواز کر گئے۔

کے۔ حسن، عباس۔ بی۔ اے

صحرائے مریخ کا ایک حادثہ

یوں تو اہل مریخ کی زندگی کا ہر لمحہ سرور و انبساط کا مستقل پیغام تھا، نشاط و آسودگی طمانیت و سرشاری اُن کے ایوانِ حیات کے مستقل جلوے تھے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے لالہ زاروں میں محو خرام رہتے۔ آئینہ تاب چشموں کے منور پانی پے جھیلتے۔ آبشاروں کی نغمہ سرائیاں سُنتے، پھولوں اور پھلوں سے لذتیں اخذ کرتے، غرض کہ ایسے ہی لطیف مشغلوں میں تمام دن گذارنے کے بعد شام ہونے سے پہلے "قصرِ نیلوفری" کے قریب جمع ہوتے۔ انتہائی ارادت و عقیدت کیساتھ اپنے سروں کو جُھکاتے اور تصویر محویت بن کر رہ جاتے۔

جب سُورج کی آخری کرنیں مریخ کے سبزہ زاروں کو الوداعی بوسہ دیتی ہوتیں، شفق کی رنگ سامانیاں نگارخانہ فطرت کے اچھوتے شاہکار نظرنواز کر رہی ہوتیں، اور شام کے طائر اپنا آخری نغمہ ختم کر کے بسیرے کی فکر میں ہوتے" قصرِ نیلوفری سے ایک نغمہ بلند ہوتا۔ سحرآفریں اور ہوشربا ساز کی دلنشین اور دل نواز آواز تمام فضا پر محیط ہو جاتی نغمے کی لطافتوں سے اہل مریخ جھومنے لگتے۔ اُن پر وجدان و سرور، کیف و مستی اور سرشاری کی ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ وہ جھومتے جھومتے بالکل غافل ہو جاتے اور اسی عالم میں اُنہیں نیند آجاتی، پھر وہ اُس وقت سے پہلے بیدار نہ ہوتے، جب صبح کی نور آفرینیاں اُن کی جبینوں کو اپنی شعاعوں سے نہ چُھوتیں، اور انہیں بیداری کی دعوت نہ دیتیں، یہ تھا ان کا نظامِ حیات و طریقِ زندگی جس پر وہ ایک زمانہ سے کاربند تھے۔ اُنکی زندگیاں یکسر شراب و نغمہ تھیں اور وہ بڑی معصوم و پاکیزہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن اگر ان میں کوئی کمی تھی تو صرف یہ کہ اُن کے دل محبت کی گرمی سے بالکل خالی تھے۔

مریخ کی شہزادیوں اور کنواریوں کا نصب العین حیات مردوں سے بالکل مُختلف تھا۔ وہ نہ لالہ زاروں میں جاتی تھیں نہ صحراؤں میں۔ البتہ اپنی گل وش وادیوں میں صبح سے شام تک اپنے سیمیں جلوؤں سے جنتیں بناتی رہتیں۔ اُن کے ستاروں کے بربط، اُنکی پھولوں سے مُرصع شہنائیاں اُن کی زندگی کی رفیق تھیں۔ یہاں کی مخلوق میں ازدواجی زندگی کا دستور ضرور تھا۔ مگر نہ ہونے کی طرح وہ اس رشتے کے بعد بھی ایک دوسرے سے اسی طرح بیگانہ رہتے تھے اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ "محبت" کی لذتوں روحانی لطیفیوں اور بے پناہ سرشاریوں سے بالکل ناآشنا تھے،

یہاں ابھی تک کسی کنواری کے پیکر میں سائکی نمودار نہیں ہوئی تھی اور نہ کسی مرد پر کیوپڈ نے اپنے تیروں کو آزمایا تھا۔

(۲)

قصرِ نیلوفری کا بیرونی منظر اس قدر دلچسپ اور دلنشین تھا کہ اسے دیکھنے کے بعد بارہا اہل مریخ کے دلوں میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ اسکے اندر کیسے کیسے مناظر ہیں اور اس میں کون رہتا ہے۔ لیکن باوجود کوشش کے انہیں اس کا کوئی راستہ نہیں معلوم ہو سکا اور کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ شام کے اوقات کی مُسلسل نغمہ باریوں سے صرف یہ سمجھ سکے کہ یہ قصر کسی مقدس دیوی یا دیوتا کا مسکن ہے جسکا تعلق براہِ راست عرشِ الٰہی سے ہے۔ نہ اُنہیں اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت تھی اور نہ وہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ قصرِ نیلوفری کی نغمہ باریوں کو اپنے لئے ایک روحانی پیغام اور نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس سے لُطف اندوز ہونا ان کے لئے عبادت سے کسی طرح کم نہ تھا اور عقیدتاً وہ اسے عبادت سے بھی کچھ زیادہ درجہ دیتے تھے۔

لیکن کئی دن سے قصرِ نیلوفری کی نغمہ باریاں بند تھیں۔ وہ روزآنہ شام کو اسی خلوص و عقیدت کیساتھ وہاں جمع ہوتے جو ایک زمانے سے اُن رُوحوں اور دلوں پر مُسلط تھا، بڑی نیازمندی کیساتھ سجدہ ریز ہوتے اور ساری ساری رات اسی حالت میں گذار دیتے مگر نہ اُنہیں کوئی نغمہ سُنائی دیتا نہ کسی ساز کی آواز آتی۔ وہ اس انقلاب سے سخت پریشان تھے۔ اُن کا سکون زندگی تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُن کا اطمینان اضطراب کے گُرزوں سے کچلا جا رہا تھا۔ وہ اس ناگہانی تغیر سے اپنی زندگیوں میں بڑا زبردست خلا محسوس کر رہے تھے۔ نہ اُنھیں اب پھولوں سے دلچسپی رہی تھی اور نہ پھلوں سے۔ صحرائے مریخ کے تمام مناظر اُن کی نگاہوں میں ویران ہو کر رہ گئے تھے وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اب کیا کریں اور اپنے روٹھے ہوئے دیوتاؤں کو کس طرح منائیں۔ وہ صدیوں سے ساز و نغمہ کی کیف باریوں سے لُطف اندوز ہونے کے عادی ہو چکے تھے۔ لیکن اس فوری تغیر نے اُنہیں بے حد آزردہ کر دیا تھا۔ اُن میں سے اکثر تو اس عذاب کو برداشت نہ کر سکے، اور موت سے ہم آغوش ہو گئے۔ اکثر دن رات قصرِ نیلوفری کے دامنوں میں بیٹھے ہوئے رویا کرتے اور اسی حالت میں جان دیدیتے۔ بہت

زیادہ غور کرنیکے بعد یہ طے ہُوا کہ مریخ کی کنواریوں کو نغمہ باری کیلئے مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی طرح زندہ تو رہ سکیں۔ چنانچہ وہ گل پوش وادیوں میں رہنے والی مقدس کنواریوں اور منفیہ شہزادیوں سے ملے۔ بڑی التجاؤں کے ساتھ اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ لیکن چونکہ وہ مردوں سے مطلق مانوس نہ تھیں اور نہ وہ ان میں اپنے لئے کوئی کشش پاتی تھیں۔ اسلئے وہ اُنکے کام نہ آسکیں۔ اُنہوں نے روزانہ ایک معینہ وقت پر نغمہ باری سے انکار کردیا، پھر مردوں کے لالہ زار میں جانا اُنکے اُصول کے بھی خلاف تھا اور وہ انکے احکامات کی تعمیل کو اپنے لئے لعنت اور توہین سمجھتی تھیں۔ اس ناکامی نے اُنکے دلوں کو بالکل توڑ دیا۔

وہ مُرجھائے پھولوں کی طرح اپنے اپنے لالہ زاروں میں واپس ہوئے۔ اب وہ سمجھ گئے کہ قصرِ نیلوفری کے دیوتا اُن سے سچ مچ ناراض ہیں۔ اور ہم سب اُنکے عتاب کا شکار ہوکر رہیں گے۔ وہ بڑی کس مپرسی کی حالت میں تھے انہیں یقین سا ہوگیا تھا کہ اسی حالت میں تڑپتے تڑپتے ایکدن ہم سب فنا ہوجائیں گے اور سطحِ مریخ پر ہم میں سے ایک مُتنفس بھی باقی نہ رہیگا۔

(۳)

عین اُس وقت جب اہلِ مریخ کی مایوسیاں ناقابلِ برداشت ہوکر اپنی حدود سے گذر چکی تھیں۔ اور وہ موت کے خیر مقدم کے لئے بالکل تیار تھے کہ ایک دن قصرِ نیلوفری سے دفعتاً ایک نغمہ بلند ہُوا جسے سُنتے ہی تمام سعید تمند دل میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ گویا مٹی کے پُتلوں میں جان پڑگئی اپنی اپنی جگہ سب ہوشیار ہوکر بیٹھ گئے اور ہمہ تن گوش ہوش اُدھر متوجہ ہوئے۔ لیکن آج نغمہ بھی بدلا ہُوا تھا اور ساز بھی۔ جو کچھ اُنہوں نے سُنا وہ ایک پیغام تھا جو نغمے کے روپ میں اُنکی سماعتوں میں گونج گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایک ہی گیت تین مرتبہ اِنہیں سُنائی دیا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"اے مریخ کے خاکی پتلو! قصرِ نیلوفری محبت کے دیوتاؤں کا مسکن ہے، وہ تمہیں ایک زمانے سے محبت کا پیام دیرہے ہیں، محبت کے نغمے سُنا رہے ہیں، لیکن تم آجتک محبت کے مفہوم، محبت کی لذت اور محبت کی لطافتوں سے بیگانہ ہو۔ اِس لئے تم پر محبت کی نغمہ باریاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردیگئی ہیں، لیکن اگر تم محبت آشنا ہوسکے، محبت کرنا سیکھ گئے تو ایکدن محبت کے دیوتا تمپر مہربان ہوجائینگے۔ اور تم اسی آسودگی کے ساتھ زندہ رہ سکوگے، ورنہ اپنی موت یقینی سمجھو"۔

اِس پیغام کا ایک ایک لفظ اہلِ مریخ کے لئے جادو کا اثر ثابت ہُوا وہ اپنے انجام کی اِطلاع سے لرز کر رہ گئے، ذرا سی دیر میں محبت کے دیوتاؤں کا یہ پیغام تمام مریخ میں پھیل گیا اور اب سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ ——— محبت کیا ہے؟ ——— اِس سوال کا پیدا ہونا اہلِ مریخ کے لئے بیحد اِنقلاب انگیز ثابت ہُوا، وہ اپنے مقاصدِ حیات کو بالکل بھول گئے اور سوائے "محبت" کے انہیں کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ بہت سے دلدادگانِ محبت بے اختیاری، اِدھر اُدھر خوفناک جنگلوں میں نکل گئے، اور پھر واپس نہ آئے، بہت سے پھولوں، چشموں، پہاڑوں اور آبشاروں میں محبت کو تلاش کرتے کرتے برباد ہوگئے۔ لیکن اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ محبت کیا ہے؟۔

اہلِ مریخ کے لئے یہ حادثہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، اُنکی تعداد بڑی حد تک کم ہوچکی تھی۔ مگر وہ اپنے دیوتاؤں کے پیغام کا عملی ثبوت دینے کیلئے اب بھی ہر وقت کوشاں تھے۔ لیکن اسکے بعد بھی محبت کا حصول اُنکی سمجھ سے بالاتر نظر آرہا تھا۔ اِن حالات کے بعد اُنکی مکمل بربادی یقینی تھی مگر کیوپڈ اور سائکی کو ان کے حال پر رحم آگیا، وہ سمجھ گئے کہ اب یہاں محبت کی حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا آزادی کیساتھ محبت کی تبلیغ شروع کردی گئی کیوپڈ نے اپنا ترکش سنبھالا۔ تیراندازی شروع کی اور نوجوانانِ مریخ کے دلوں میں محبت کے جذبات کی چنگاریاں بھرکر زندگی کی ایک جدید شاہراہ کھولدی۔

اور سائکی بھی اپنے فرض کی ادائیگی سے غافل نہ تھی۔ وہ مریخ کی صاحبِ جمال کنواریوں کے دلوں کو محبت کے رنگ میں رنگتی ہوئی موسمِ بہار کی شعلہ رنگ تیتری کی طرح اِدھر سے اُدھر اُڑتی پھرتی تھی۔ اس گل پوش وادیوں میں رہنے والیوں کو ایک نئے درد، ایک نئی لذت اور ایک نئی خلش میں مبتلا کرکے نوجوانانِ مریخ کے لئے انکے دلوں میں ایک کشش پیدا کردی تھی۔ اب صرف ایک مرحلہ باقی تھا اور اُسکی تکمیل بھی کیوپڈ اور سائکی ہی کے سپرد تھی۔

(۴)

مریخ کے لالہ زاروں اور وادیوں میں محبت کی گلکاریاں ذرّے ذرّے پر مُرتسم نظر آرہی تھیں اور وہ خطۂ گلریز جہاں محبت کے سوا سب کچھ تھا اب کچھ اور ہی ہوگیا تھا۔ نوجوانانِ مریخ دن رات ایک محویت کے عالم میں مصروفِ گُل گشت رہتے، اُنکی نگاہوں میں محبت کی مسکراہٹ اور طلبِ محبت تشنگی پائی جانے لگی تھی اِس وقت وہ گلپوش وادیوں میں رہنے والی کنواریوں کی طرف کھنچتے ہوئے نظر آرہے تھے اور وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ محبت کے دیوتاؤں کے پیام نے ان پر کیا اثر کیا ہے۔

قصرِ نیلوفری کے نشیب میں بہنے والے ایک شفاف چشمے کے کنارے بہت سے نوجوان بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً انہیں ایک زردشی

سی محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ قصرِ نیلوفری کے ایک بیرونی گوشہ میں ایک حسین مردِ رعنا اور ایک دوشیزہ کنواری رازِ و نیازِ محبت میں مصروف ہیں وہ انہیں بہت دیر تک دیکھتے رہے، اُن کے دلوں میں بھی ایسی ہی خواہش پیدا ہوئی اور یہ آرزو اُنکی رُوحوں میں چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہو کر رہ گئی کہ اے کاش مریخ کی کنواریاں اُن کی دعوتِ محبت پر لبیک کہہ سکیں اور وہ بھی محبت کے رازِ و نیاز کا صحیح لطف اُٹھا سکیں وہ چاہتے تھے کہ دوڑ کر گل پوش وادیوں میں پہنچ جائیں اور اپنی التجائیں پیش کریں کہ انہیں ایک نغمہ سُنائی دیا۔

"محبت کرنے والوں کو حیرت سے نہ دیکھو، بلکہ محبت کے احترام اور مریخ کی کنواریوں کے استقبال کے لئے تیار ہو جاؤ اور محبت کی فردوسی لذتوں، غیر فانی مسرتوں اور ابدی لطافتوں میں گم ہو جاؤ۔"

یہ نغمہ اُن کے لئے آبحیات سے کم نہ تھا جو شراب کے گھونٹوں کی طرح اُن کے قلوب میں سما گیا۔ بدمستی و سرشاری کی مکمل کیفیتوں کے ساتھ اُن پر طاری ہُوا اور وہ بے اختیار سجدہ ریز ہو گئے ابھی سجدے سے اُن کے سر نہ اُٹھے تھے کہ بہت سے بربط اور شہنائیاں ایک ساتھ بجنے لگیں اور اُن سے بہت قریب نغمات کا سمندر اُبل پڑا، جیسے ہی وُہ اُٹھے ایک دلنشین نظارہ سے اُنکی آنکھوں میں چکاچوند سی پیدا ہو گئی، اُنہوں نے دیکھا کہ مریخ کی کنواریوں کا ایک گروہ رنگارنگ پھولوں کے لباس پہنے ہُوئے محبت کے گیت گاتا ہُوا رقص کی ہزاروں شانیں لئے ہُوئے اور دوشیزگی و برنائی کی جادو طرازیوں کو بے نقاب کئے ہوئے اُنکی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے وہ چشمے کے دوسرے کنارے پر صف بستہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اسوقت اُنکی رُوحیں ایک ناقابلِ بیان کیفیت میں ڈوبی ہُوئی تھیں، وہ اپنے جسموں میں پرواز کی قوت محسوس کر رہے تھے اور اُن کے دل جذباتِ محبت کی گرمیوں سے پگھلے جا رہے تھے، آج اُن کی زندگی کا پہلا موقعہ تھا کہ گل پوش وادیوں کی رہنے والیاں اُن کے پاس اِس شان و اہتمام سے آ رہی تھیں ورنہ یہ واقعہ تھا کہ کنواریاں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو چکی تھیں وہ بھی مردوں سے کوئی خصوصی اُنسیت نہ رکھتی تھیں اور نہ وُہ ہمیشہ اُنکے پاس رہ سکتے تھے۔

یہ چلتے پھرتے ہُوئے پھولوں کا گلدستہ چشمے کے قریب آ کر رُک گیا سب نے پھولوں کے ہار اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور محبت کا ساز چھیڑ دیا۔ اس درجہ التفات آگینیوں اور دعوتِ محبت کے بعد نوجوانانِ مریخ سے ضبط نہ ہو سکا وہ بے اختیار پانی میں کود پڑے اور تیرتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہونچکر اپنے سروں کو حسن کی دیویوں کے قدموں پر جُھکا دیا، مریخ کی کنواریوں نے اُنکی پزیرائی کی، پھولوں کے ہار اُن کے گلوں میں ڈال دیئے اور بہت ہی لطیف اِنتخاب کے بعد حُسن و عشق کی وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "جشنِ نوروزِ محبت" کی ابتدائی رسم اِنتہائی خلوص و عقیدت کیساتھ ادا کی، آپس میں معانقہ کیا گیا اور ایک ایسے رقص کے بعد جس سے تمام کُرۂ مریخ وجد کرنے لگا محبت کی بنیاد ڈالدی گئی۔

محبت کے دیوتاؤں نے اُن پر پھُول برسائے اور شام ہوتے ہی قصرِ نیلوفری سے نغموں کی بارش شروع ہو گئی اب اہلِ مریخ کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے اور اُنکی محبت حاصل کر لینے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ اِسی تقریبِ سعید کی خوشی میں تمام مریخ پر چراغاں کیا گیا اور تمام مریخ میں محبت کے مذہب کا اعلانِ عام کر دیا گیا۔

قصرِ نیلوفری جو قدرت کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھا، کیوپڈ اور سائکی کا مامن و مسکن تھا جن کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ وہ ہر ذی حیات سیارے میں محبت کا صُور پھُونکتے رہیں۔ ابھی تک مریخ کی دُنیا محبت سے بیگانہ تھی وہ ایک عرصہ کی کوشش کے بعد اُنہیں محبت کی طرف مائل کر کے رہے اور اُنکی کوششیں کامیاب ثابت ہو کر رہیں۔ سُنا گیا ہے کہ مریخ میں کیوپڈ اور سائکی کی کامیابی کے دو یادگار مجسمے اب تک پائے جاتے ہیں جو قصرِ نیلوفری کے شق ہونے کے بعد دستیاب ہُوئے تھے اور آجتک وہیں نصب ہیں۔ ہر سال اہلِ مریخ "جشنِ محبت" بڑے اہتمام سے مناتے ہیں محققین کا بیان ہے کہ ہماری دُنیا کا موسمِ بہار اِسی جشنِ محبت کا ایک عکسِ رنگیں ہوتا ہے۔

محبت کا مفہوم سمجھنے اور اس غیر فانی لذت سے آشنا ہونے کے بعد مریخ ایک نئے سانچے میں ڈھل کر رہ گیا ہے۔ وہاں کے لالہ زار اور گل پوش وادیاں پہلے سے زیادہ شاداب نظر آتی ہیں اور محبت کرنے والے فردوسی پیکر اپنے اپنے خطّے میں فردوسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ محبت ہی اُن کا مذہب ہے۔ محبت ہی کو وہ خدا سمجھتے ہیں۔ وہ محبت کے ماحول میں جاگتے ہیں محبت کے ماحول میں سوتے ہیں۔ غرض کہ وہ سراپا محبت ہیں۔ وہ محبت پہ ناز کرتے ہیں اور محبت کے دیوتاؤں کو اُن پر ناز ہے۔

مریخ میں نہ ہماری دُنیا کی طرح ہوس پرستیاں ہیں نہ خود غرضیاں۔ نہ وہاں انسانی درندگی کے مظاہرے ہوتے ہیں نہ ایک دوسرے کو کچلا جاتا ہے۔ نہ وہاں قتل و غارت کی گرم بازاری ہے، نہ

فریب دریاکاری کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اہل مریخ آپس میں کبھی نہیں لڑتے وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ ان میں رشک ضرور ہے لیکن حسد نہیں۔ ان میں محبت کی تشنگی ضرور پائی جاتی ہے لیکن ایک دوسرے پر سبقت لیجانے یا ذلیل کرنیکے جذبات ان کے دلوں میں کبھی پیدا نہیں ہوتے جب وہاں چودھویں رات کا چاند اپنی کجکلاہی اور شباب کی بے پناہیوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہو جب تارے اپنے اپنے ساز چھیڑ دیتے ہیں تو مریخ کی گلپوش وگلریز وادیاں نور و سرور میں ڈوب جاتی ہیں۔ محبت کے پجاری ایک خطۂ گلریز... میں جمع ہوتے ہیں۔ محبت کے نام پر سجدے کرتے ہیں۔ محبت کے گیت گاتے ہیں اور تمام رات جشن شب ماہ مناتے رہتے ہیں۔ ہرچند کہ محبت کے حصول کے لئے اہل مریخ کو بڑے زبردست حادثے سے دوچار ہونا پڑا اور قربانیاں پیش کرنا پڑیں۔ لیکن اس حادثے کے بعد محبت کی جو زندگی انہیں نصیب ہوئی وہ کبھی سیارے کے مکینوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ اے کاش کہ دنیا میں محبت کا مذہب عام ہو جائے +

حاجی نبی احمد بریلوی

آلِ تیمور سے!

اُٹھ کہ دل میں سجدہ گاہِ عرشیاں پیدا کریں
اپنی مرضی کے زمین و آسماں پیدا کریں

یہ جہانِ کہنہ و دیرینہ باطل ہوچکا
آرزو ہائے مسلسل کا جہاں پیدا کریں

اُٹھ کہ اس کون و مکاں کو نورِ جاں سے غسل دیں
دید و دل میں سوادِ لامکاں پیدا کریں

محنتِ آدم کا ورثہ قوم پر قسمت کریں
ساکنانِ ہند میں سوزِ نہاں پیدا کریں

ہیبتِ چنگیز و فرِ شوکتِ تیمور سے
اس جہاں کو روندنے اک کارواں پیدا کریں

تیز ترِ شہباز سے ہر نوجواں کی ہو نظر
پائے آزاد و سرِ دیوانگاں پیدا کریں

صیدِ خود بے تابِ تیرِ بے کماں کھانے کو ہو
اُٹھ کہ ان تیروں سے زخمِ بے نشاں پیدا کریں

ہیں پرستارِ نشیمن سارے مرغانِ چمن
اس چمن سے طائرِ بے آشیاں پیدا کریں

ہند کے راگوں میں بھی پستیٔ فطرت ہے شریک
اُٹھ کہ جیتی جاگتی طرزِ فغاں پیدا کریں

ان چرندوں کو سکھائیں رسم و آئینِ شہی
اس غلامستان سے شیرِ ژیاں پیدا کریں

اس نیستاں سے بجائے نے و برگ و شاخِ نخل
دشنۂ خونریز و دستِ جانستاں پیدا کریں

ہر تنِ آسانی کا ہوتا ہے بلاؤں سے علاج
اُٹھ کہ اپنے واسطے خود امتحاں پیدا کریں

اُٹھ کہ عالمگیر و اکبر اور بابر کی طرح
نامورِ اجداد کا نام و نشاں پیدا کریں

بوریائے فقر کو تختِ شہنشاہی بنائیں
آنے والوں کے لئے اک ارمغاں پیدا کریں

دولتِ بیدار حاصل محنت و قوت کی ہو
اُٹھ کہ اپنے بل پہ گنجِ شائگاں پیدا کریں

عرش ممکن ہے خدائی بھی اگر حق ساتھ ہے
اُٹھ کہ خاکِ مردہ میں جان و رواں پیدا کریں

عرش تیموری

بچّوں کے متعلق ٹیگور کی منظوم کہانیاں

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ بچپن کے تأثرات پائدار اور دوامی ہوتے ہیں، اور آئندہ زندگی میں ہمارے کردار، مزاج، رجحانات، پسندیدگیوں اور ناپسندیدگیوں کی انفرادی خصوصیات اِن ہی دُھندلے نقوش کی بُنیادوں پر قائم ہوتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے 'ورڈزورتھ' نے بچہ کو "انسان کا باپ" کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ماہرینِ نفسیات، جو پہلے بچے اور اُس کی نشوونما سے بے پرواہ رہتے تھے اور اس کو محض "عمر رسیدہ انسان کا ایک چھوٹا سا مجسّمہ" تصوّر کرتے تھے، اب بچّے کے ذہن کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔

تعجب کا مقام ہے کہ مرد اور عورت کی لازوال اہمیت کے باوجود بھی ہندوستان کے کلاسیکی شعراء نے جذباتی اور غنائی شاعری میں بچپن کے زمانے پر قرار واقعی توجّہ نہیں کی، حتیٰ کہ سنسکرت کے ادب میں بھی سوائے چند مقامات کے ہم کو "بچّے کے ذہن" کے تخیلی اور باقاعدہ مُطالعہ کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

مگر ٹیگور کے سرزمینِ ادب پر قدم رکھتے ہی "بچپن" پہلی بار رومانی شاعری کے اہم ترین موضوعات میں شمار کیا جانے لگا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں ٹیگور اپنے ایک بیٹے کے ساتھ، جو تپ دق کا مریض تھا، الموڑہ گئے، جہاں اُس کا انتقال ہوگیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں اُنکا دوسرا بیٹا داغِ مفارقت دے گیا۔ اِن صدمات کا یہ اثر ہوا کہ غم غلط کرنے کے لئے "شاعر" نے اپنا وقت اور زورِ تخیل "بچہ کے ذہن کے اسرارِ سربستہ" کے مُطالعہ میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ بچہ کے خیالات اور جذبات کی سادگی اور البیلاپن اور طرفگی اُن کی توجّہ کی مرکز بن گئیں، اور اس وقت سے اُنہوں نے "بچپن" پر نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔

رابندرناتھ کو پورا احساس ہے کہ بچّہ، محض اپنی سادگی کی بنا پر، ایک پُر اسرار چیز ہے۔ وہ خُوب جانتے ہیں کہ "ذہنِ طفلی کا راز" ایک ایسا گہرا راز ہے جو صرف نفسیات کی کتابوں کے مُطالعہ سے سمجھ میں نہیں آسکتا اور اسی کو سمجھنے کے لئے انسان کو خود بچّہ بن جانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جلیل القدر شاعر، بچّہ کا ہمراز اور ہم آہنگ بن جانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

اِن منظوم کہانیوں میں اُن کے خیالات اور احساسات وہی ہوتے ہیں جو ایک خُرد سال بچّے کے ہوسکتے ہیں۔ اِن کہانیوں کو لکھتے وقت وہ اتنا زیادہ "خود رفتہ" ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک انسان یا شاعر یا فلسفی کی حیثیت سے اپنی انفرادی شخصیت کو بھول جاتے ہیں اور خود "بچہ" بن جاتے ہیں۔ یہ آرٹ کا منتہائے کمال ہے۔

وہ خود کہتے ہیں:-

"اے کاش، مَیں اپنے بچّے کی دل کی دُنیا میں ایک خاموش گوشہ حاصل کر لیتا ...... میری آرزو ہے کہ مَیں اُس راہ پر گامزن ہوں جو بچّے کے ذہن کو طے کرتی ہوئی زمان و مکان کی تمام حدود سے گُذر جاتی ہے۔" ("ماہِ نو" صفحہ ۱۷)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے بچّے کو سمجھنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔

ٹیگور کے تخیل نے جس بچّے کو پیدا کیا وہ کوئی "خیالی مخلوق" نہیں بلکہ اِسی دُنیا کا ایک جیتا جاگتا انسانی بچّہ ہے، جس کی تصویر اُنہوں نے کمال شفقت اور ہمدردی سے کھینچی ہے۔

"شاعر" اپنے بچپن کے تلخ تجربات بُھول نہیں سکتا۔ اُس کی بعد کی زندگی کے تلخ تر تاثرات اور ذمّہ داریاں اُن ابتدائی نقوش کو مٹا نہیں سکیں۔ وہ بار بار اُن تکالیف کا تذکرہ کرتا ہے جو اُسے اپنے اسکول میں پیش آیا کرتی تھیں۔ موجودہ طرزِ تعلیم کے خلاف اس کو جتنی شکایتیں ہیں اُن کو اس نے "مراجعتِ وطن" میں تمام و کمال ادا کر دیا ہے۔ اس کہانی میں وہ ایک خود سر، مضبوط قویٰ والے، "پروردہ فطرت" بچّے کا تذکرہ کرتا ہے:-

قصّہ کا ہیرو (فاٹک) گاؤں کے تمام بچّوں کا تسلیم شدہ لیڈر ہے:- اپنی زندگی کے آغاز ہی وہ فطرت سے ہم کنار اور ہم آہنگ رہا ہے۔ گھر میں اسکو جو زدوکوب کی جاتی ہے وہ اُس کے اثر کو وسیع میدانوں میں دوڑ کر یا دریا میں تیر کر بُھلا دیتا ہے ——— اُس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب اُس کا چچا اُسے اُس کے ماحول سے چھڑا کر شہر میں لے جاتا ہے، جہاں پہونچ کر وہ "وہاں کی خیرہ کُن روشنیوں

اور بے معنی شور و شغب سے بھاگ جانے کی تمنا کرتا ہے اور ایک بار پھر شہر کے باہر کی آزاد فضاؤں ——— پہاڑوں اور دریاؤں ——— کا جویا ہے!"

("فلسفۂ ٹیگور" از ایس. رادھا کرشنان صفہ ۱۱)

ناٹک جیسے "پروردۂ فطرت" بچوں سے شاعر کو جو دلی تعلق اور دلچسپی ہے وہ دنیا سے، خصوصاً وشوا بھارتی کے طالبعلموں کی پوشیدہ نہیں۔ وہ نہایت خلوص اور دیانتداری سے اپنے ان جذبات کو جو بچے کے متعلق اپنے دل میں موجزن پاتا ہے عن و عن ظاہر کر دیتا ہے۔ اُسے اس کا مطلق احساس نہیں رہتا کہ ایک فلسفی یا نوبل پرائز پانیوالے شاعر کی حیثیت سے اُسے سنجیدگی کی قبا پہن لینی چاہیے۔ وہ نہایت آزادی اور مسرت کے ساتھ بے معنی طفلانہ باتیں کرتا چلا جاتا ہے جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں ——— یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ان بھولی بھولی معصوم باتوں پر ہزاروں فرزانگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ کیا انسان خود ایک "بڑا بچہ" نہیں ہے؟

جو لوگ عقل ستیزہ کار کی ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آ گئے ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کو آرام دینا چاہتے ہوں انہیں "ماہِ نو" کے صفحات میں پناہ ڈھونڈنی چاہیے۔ وہاں ٹیگور کا بچہ انکو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے ایک ایسی دنیا میں لے جائے گا جہاں "عقل کی استبدادیت" کا پتہ بھی نہ ملے گا۔ اور وہاں ہر نو وارد ایک ایسی طاقت حکمران دیکھے گا جو عقل سے کہیں زیادہ فرزانہ تر ہوتی ہے۔

وہاں وہ بچے کو یہ کہتے ہوئے سُنے گا:-

"امّاں، میرے خیال میں پھول بھی زمین کے نیچے اسکول جاتے ہیں۔ وہ بند کواڑوں والے کمروں میں سبق حاصل کرتے ہیں، اور اگر وہ وقت سے پہلے باہر آنا چاہتے ہیں تو اُن کے ماسٹر صاحب اُنہیں کونے میں کھڑا کر دیتے ہیں"   ("ماہِ نو" صفحہ ۵۴)

یا:-

"چونکہ میں بچہ ہوں اس لئے چھوٹا خیال کیا جاتا ہوں۔ جب میں ابّا کے برابر ہو جاؤنگا تو میں بھی بڑا ہو جاؤں گا"   ("ماہِ نو" صفحہ ۵۴)

ایک دوسری جگہ بچہ اپنی ماں سے اپنی چھوٹی بہن کا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے "بیوقوف اور بے عقل بچی" کہتا ہے:-

"امّاں، تمہاری بچی تو بڑی بیوقوف ہے۔ وہ کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہے! وہ تو سڑک پر کی روشنیوں اور ستاروں میں بھی تمیز نہیں کر سکتی۔ تمہاری بچی چاند کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ کتنی مضحکہ خیز ہے! وہ تو "گنیش" کو "گانوش" کہتی ہے!"

("ماہِ نو" صفحہ ۵۲-۵۳)

بچے کے ذہن کا تجزیۂ نفسی کرنے میں شاعر کو جو قدرت حاصل ہے اُس کا راز اس بدیہی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اُس نے بچوں کو خوب اچھی طرح سمجھا ہے۔ کسی اور شاعر میں ہم کو یہ خصوصیت نہیں ملتی۔ ٹیگور اپنے تخیل اور مشاہدے کی مدد سے، بچہ کے دل کی گہرائیوں میں سما جاتا ہے اور کمال بصیرت اور تفہّم کے ساتھ اپنے بچّہ سے کہلواتا ہے:-

"امّاں، اب میرے جانے کا وقت آگیا ——— میں جاتا ہوں .... میں ہوا کا ایک نرم و نازک جھونکا بن جاؤں گا اور تمہیں تھپکی دونگا۔ میں پانی کی چھوٹی چھوٹی لہریں بن جاؤں گا اور جب تم نہاؤ گی تو تم کو بار بار بوسہ دونگا .... خالہ جان "پوجا" کے موقع پر تحفے لیکر آئیں گی اور پوچھیں گی "بہن، بچہ کہاں ہے؟" امّاں، تم اُن سے کہدینا:-

وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں ہے۔ وہ میرے جسم اور میری رُوح میں ہے!"   ("ماہِ نو" صفحہ ۶۶)

ان نظموں کا ایک خوشگوار نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ وہ صرف بچہ ہی کا تجزیہ نفسی نہیں کرتیں بلکہ ماں کے احساسات اور جذبات کی نفسیاتی تفسیر بھی پیش کرتی ہیں۔ بچے کی ماں نہ صرف اپنے لطیف اور پُر اسرار ارمانوں اور تلوّنات کو سمجھتی ہے بلکہ وہ بچّہ کے ہر لحہ بدلنے والے مزاج اور خواہشات سے بھی واقف ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے:-

"جب میں نے شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا اور میرے دل کی کلی میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں تو تم اُس کے چاروں طرف خوشبو کے مانند رقصاں تھے۔ تمہاری نرمی اور نزاکت میرے جوان اعضا میں پھول رہی تھی، جیسے سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے .... اس ڈر سے کہ کہیں میں تمہیں کھو نہ دوں میں تم کو ہر وقت مضبوطی سے اپنے سینے سے چمٹائے رکھتی ہوں"

("ماہِ نو" صفحہ ۶۰-۶۱)

جب بچّہ اپنی ماں سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اُس نے اُسے کہاں پایا تو وہ اشک ریز تبسم کے ساتھ اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیتی ہے اور کہتی ہے:-

"تم میرے دل میں اسی طرح پوشیدہ تھے، جیسے میرے ارمان!"

اُس نفسیاتی اُصول کے مطابق جس کو شاعر نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے، بچّہ اپنی ماں سے حد درجہ مانوس ہے۔ گو وہ اتنا

چھوٹا اور نارسیدہ ہے کہ اپنی ماں کے خیالات کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا، پھر بھی وہ اپنی ماں کو سنجیدہ دیکھ کر متفکر ہو جاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے:۔

"تمہیں کیا ہو گیا جو ایسی عجیب نظر آ رہی ہو؟ کیا آج ابا کا خط نہیں آیا؟"

پھر خود ہی کہتا ہے:۔

"مگر پیاری اماں، تم اس کی فکر نہ کرو کل دوسرے گاؤں میں بازار لگے گا۔ تم خادمہ سے کہہ دو کہ مجھے قلم اور کاغذ لا دے۔ میں خود ابا کے سارے خط لکھ دوں گا....... اور کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ابا کی طرح بیوقوفی کر کے اپنے خط اس ڈراونے ڈاکیے کے تھیلے میں ڈال دونگا! نہیں ———— میں ذرا سا توقف بھی نہ کروں گا، بلکہ خود انہیں تمہارے پاس لاؤں گا۔ اور باری باری ہر خط خود پڑھ کر تمہیں سناؤں گا۔"

("ماہِ نو" صفحہ ۶۱-۶۲)

بچے کے تمام خیالوں اور خوابوں کا مرکز اس کی ماں ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ ان لوگوں کے پاس بھی نہیں جاتا جو "بادلوں میں رہتے ہیں اور اسے بلایا کرتے ہیں" ——— کیونکہ اس کی ماں گھر پر اس کی منتظر ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"اماں، میں ایک اس سے بھی اچھا کھیل جانتا ہوں۔ میں بادل بن جاؤں گا اور تم چاند بن جاؤ گی۔ میں تمہیں اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لوں گا اور ہمارے گھر کی چھت بن جائیگی...... میں موجوں میں تبدیل ہو جاؤں گا اور تم ایک نامعلوم 'ساحل' ہو گی ———— میں بہہ بہہ کر آؤں گا اور تمہاری گود میں ہنس ہنس کر ٹکراؤں گا۔"

("ماہِ نو" صفحہ ۲۷-۲۸)

ان نظموں میں شاعر کی خود پسندی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بچے کی خود پسندی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ صرف اپنی ہی بنائی ہوئی دنیا میں رہتا ہے۔ اور اپنی اس "طفل کی بادشاہت" کو بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کا "شاہی محل" کہاں ہے تو وہ محل ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا۔ مگر وہ، سرگوشیوں میں، اپنی ماں سے بتائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"اماں، تمہیں معلوم ہے میرا شاہی محل کہاں ہے؟ وہ ہماری چھت کے کونے پر ہے جہاں تلسی کے پودے کا گملہ رکھا ہوا ہے!"

("ماہِ نو" صفحہ ۳۱)

اپنے موہوم تصورات سے چھوٹا سا بچہ مادی اشیا بناتا ہے اور ان محسوسات کو انسانی زندگی کے حزنیہ اور طربیہ پہلوؤں سے متصف کر دیتا ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کا بڑا بھائی اس پر کیوں ہنستا ہے اور کیوں اسے (بچے کو) صرف یہ کہنے پر "احمق ترین لڑکا" بتاتا ہے کہ:۔ "جب شام کے وقت پورا چاند سامنے والے 'کدم' کے درخت کی شاخوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے تو کوئی اسے پکڑ کیوں نہیں لیتا؟" وہ اپنے "دادا" (بھائی) کے اس قول سے اتفاق نہیں کرتا کہ "چاند کا پکڑ لینا ناممکن ہے" اور بحث کئے جاتا ہے:۔ "جب اماں کھڑکی میں سے جھانکتی ہیں اور ہم کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر مسکراتی ہیں تو کیا اس وقت تم انہیں بہت دور کہو گے؟" پھر جب اس کا بھائی اسے بتاتا ہے کہ چاند اتنا بڑا ہے کہ بڑے سے بڑے جال میں بھی نہیں پکڑا جا سکتا تو چھوٹا بچہ اس مہمل گفتگو پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

"دادا، تمہارے اسکول میں کیسا ردی سبق پڑھاتے ہیں! جب اماں ہمیں پیار کرنے کو اپنا چہرہ جھکاتی ہیں تو کیا وہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے!؟"

("ماہِ نو" صفحہ ۲۵-۲۶)

خالص تخیلی نظموں میں ٹیگور کا بچہ بے معنی اور بے تکی باتوں سے محظوظ ہوتا ہے اور ہر اس مادی چیز کو جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی پیارے پیارے ہنسانے والے انداز میں تعبیر کیا کرتا ہے۔ وہ "حقیقت" کے متعلق اپنے ان خام خیالات کی خیالی تفسیرات پیش کیا کرتا ہے جن کی بنیاد یا تو اس کے گہوارے کے گیت ہوتے ہیں یا وہ کہانیاں جو اس نے اپنی دادی کا سے سنی ہیں۔ ان سے اور ہندی علم الاصنام کی دوسری روایتی کہانیوں سے بچہ کا تخیل زور پکڑتا ہے۔ وہ عجیب عجیب سمندروں اور نئی نئی سرزمینوں میں یکہ و تنہا خیالی سفر کرتا ہے۔ یا کاغذی کشتیاں بنایا کرتا ہے اور ان کو ایک ایک کر کے دریا میں چھوڑ دیتا ہے، اس امید پر کہ "کوئی نہ کوئی...... کبھی نہ کبھی...... کسی نہ کسی عجیب و غریب ملک میں ان کو پائے گا اور یہ سمجھ جائیگا کہ وہ (بچہ) کون ہے۔"

("ماہِ نو" صفحہ ۳۸)

تخیل کی مدد سے وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ اب وہ اپنی قلمرو میں ایک بچہ نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا تخلیقی فن کار بن جاتا ہے جو اپنی "شہزادی" کے گرد اپنے خوش آئند خوابوں کا جال تان دیتا ہے:۔

"شہزادی سات سمندروں کے اس پار ایک محل میں رہتی ہے۔

پر ہوئی ہوئی ہے۔ دُنیا میں میرے سوائے کوئی نہیں جو اُسے پا سکے"

("ماہِ نو" صفحہ ۱۳)

اس کا تخیل غیر محدود ہے۔ ایک جگہ وہ اپنے آپ کو "چمپا کا پھول" تصور کرتا ہے اور دوسرے مقام پر وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اگر وہ "کتے کا پلّہ" بن جائے تو اس کی ماں کا برتاؤ اس سے کیسا ہوگا۔ وہ "بادل" بن جانے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اس کی ماں "چاند" بن جائے۔ وہ لہروں میں تبدیل ہو جائیگا، اگر اس کی ماں ایک عجیب و غریب سمندر بن جائے۔ ("بادل اور موجیں")

جوں جوں ہم "ماہِ نو" کی اصلی نظمیں پڑھتے ہیں وہ ہمارے کانوں میں بھولی ہوئی صداؤں کی طرح گونجنے لگتی ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارے سامنے گہوارہ میں ایک بنگالی بچہ لیٹا ہوا اپنی ماں سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ احساس اتنا تیز ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا خیال بھی نہیں رہتا کہ شاعر ان آسان، سیدھی سادی، شیریں نظموں میں کوئی فلسفہ پیش کر رہا ہے۔

رابندرناتھ آئے دن کی زندگی کے معمولی سے معمولی اقعات کو لیتا ہے اور اپنے بے مثل طرزِ بیان کی مدد سے ان کو غیر معمولی بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی دوسرا شاعر اس کا مدِ مقابل نہیں ہو سکتا۔

اس کی زبان آسان اور عام فہم ہونے کے علاوہ موسیقی اور پاکیزگی سے بھی لبریز ہے۔ ان ہی خصائص کی بنا پر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاعر ان کہانیوں میں صرف اپنے دلی جذبات ادا کر رہا ہے اور ان کے لکھنے کا مقصد صرف "اپنے بچپن کے زمانے کی یاد تازہ کرنا ہے؛

پہلی نظر میں شاید کوئی اخلاقی اہمیت نظر نہ آئے مگر بالاستیعاب مُطالعہ کے بعد ان کہانیوں میں بھی وہی پُرانا مگر دلکش مضمون نظر آنے لگتا ہے جو ٹیگور کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے ——— یعنی "رُوح کی آزادی!"

یہیں شاعر کی بزرگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کوئی "فردِ واحد" نہیں، بلکہ تین حیثیتیں رکھتا ہے — وہ "شاعر" "فلسفی" اور "آرٹسٹ" تینوں کا مجموعہ ہے ——— "شاعر" بچے کی طرف کشش محسوس کرتا ہے۔ "آرٹسٹ" اپنے رُوحانی تجربات اور محسوسات کے اظہار کے لئے بے چین رہتا ہے، اور "فلسفی" آزادیٔ رُوح کی اہمیت جتانے پر مجبور ہے۔ یہی وہ بُنیادی اُصول جس پر ان خیالی نظموں کا ڈھانچا تیار کیا گیا ہے، گو شاعر ہمیشہ فلسفہ کا پابند نہیں رہتا۔

اُس کا "بچہ"، دُنیائے عمل کے شور و شغب اور زندگی کی مشین سے نجات پانے کا متمنی ہوتا ہے اور "آزادی" کا خواہاں!

"شکست، میکانکی دُنیا انسان کو پست تر اور بہائم صفت بنا دیتی ہے" ("فلسفۂ ٹیگور" از ایس۔ رادھا کرشنان صفحہ)

——— یہ ہے وہ عام مضمون جس سے ہم ٹیگور کی ہر تصنیف میں دوچار ہوتے ہیں۔

جس بچے سے ٹیگور ہمیں روشناس کراتا ہے وہ بچہ "پریوں کے ملک کے سات سمندروں اور تیرہ دریاؤں کو عبور کرنا چاہتا ہے"

("ماہِ نو" صفحہ ۱۹)

یا پھر وہ ایک پھیری والا بن کر، یہ آواز لگاتے ہوئے، سڑکوں پر دن گذارنا چاہتا ہے ——— "چوڑیاں لے لو کانچ کی چوڑیاں!"

یا پھر وہ ایک مالی بننا چاہتا ہے، جو باغ میں زمین کھودتا رہے اور اسے کوئی منع کرنے والا نہ ہو۔ یا پھر وہ ایک چوکیدار بننا پسند کرتا ہے جو راتوں کو اپنی لالٹین کی پرچھائیوں کا تعاقب کرتے ہوئے سڑکوں پر گشت لگایا کرے۔ ("پیشہ")

شاعر کے نزدیک ماں کی سماوی محبت، "آزادی" اور نیچر کی رعنائیوں اور دلکشیوں سے مسرت اور شادمانی اخذ کرنے کا فطری رجحان اور جذبہ (جیسا کہ "برسات کے دن" میں پایا جاتا ہے) ——— زندگی میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے اسباب ہیں ———!

مکانیہ زندگی سے متنفر ہوتے ہوئے ٹیگور بچہ "آزادی کی راہ" پر نرم رفتاری اور بے باکی سے چلا جاتا ہے۔

"لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچے جمع ہوتے ہیں۔ ناپیدا کنار آسمان سروں پر ساکت ہے اور بیقرار سمندر شور انگیز ——— لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچے شور مچاتے ہوتے آپس میں ملتے ہیں......

وہ نہ تیرنا جانتے ہیں نہ جال پھینکنا۔ موتی نکالنے والے غوطہ خور موتیوں کے واسطے غوطے لگاتے رہتے ہیں۔ سوداگر اپنے جہازوں میں تیرتے پھرتے ہیں۔ مگر بچے کنکریاں جمع کرتے ہیں اور پھر انہیں پھینک دیتے ہیں۔ وہ پوشیدہ خزانے تلاش نہیں کرتے۔ وہ جال پھینکنا

نہیں جانتے.........

سمندر قہقہوں کے ساتھ اُبھر اچلا آتا ہے اور ساحل کا زرد زرد تبسم چمکتا ہے۔ "فضا در آغوش" موجیں، اُس ماں کی طرح جو اپنے بچے کا گہوارہ ہلاتی ہو، بچوں کو بے معنی منظوم کہانیاں گا گا کر سناتی ہیں۔ سمندر بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور ساحل کا زرد زرد تبسم چمکتا ہے.......

لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچے جمع ہوتے ہیں۔ بے راہ "آسمان کی پہنائیوں میں طوفان چکر لگاتے رہتے ہیں۔ بحرِ ذخار میں جہاز تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ موت، بلا کسی روک ٹوک کے، کھلی پھرتی ہے۔ اور بچے کھیلتے رہتے ہیں۔

لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچوں کا بڑا مجمع ہوتا ہے۔"

("ماہِ نو" صفحہ ۳۰۴)

کیا آپ اِن نظموں کو پڑھکر تھوڑی دیر کے لئے اپنی "مورد آلام" زندگی کو بھول نہیں جاتے، اور کیا آپ کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ "موت، بھی 'زندگی کی موجوں' میں ڈوب کر مرگئی ہے۔ اور تمام نقصانات کی تلافی ہوگئی ہے!" اور کیا یہ "عظیم الشان" کارخانۂ قدرت آپ کو ایک "بازیچۂ اطفال" نظر نہیں آنے لگتا!۔

* * *

"ماضی" دہلی

دُنیا کا مختصر ترین افسانہ؛

یتیمی!

چاند دیکھکر لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا "عید مبارک"

اور مَیں رو پڑا!

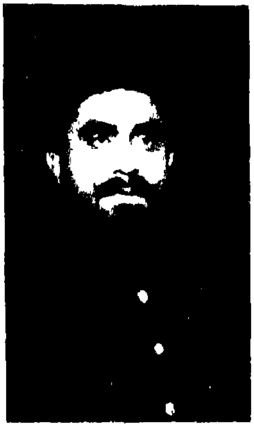
آہ، ابّا جان!!

غلام عباس (مولوی)



مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب
خلف مسیح الملک حکیم محمود خاں صاحب مرحوم -
سکریٹری - طبیہ کالج دہلی و ناظم ہندوستانی دواخانہ دہلی -

Calcutta Art Press Delhi



حکیم عبدالہدی صاحب انصاری
خلف اکبر امان الملک حکیم
عبدالوہاب صاحب انصاری

ایشیا کے طبیب اعظم حضرت لقمان الملک حکیم حافظ محمد عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا

کی جانب سے

مریضوں کیلئے ضروری اعلان

جب سے دعاگو کو اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ نے حیدرآباد دکن طلب فرما کر خدمت افسر الاطباء یونانی ہیڈ میڈیکل آفیسر، پر سرفراز فرمایا ہے تو اطباء میں سے بعض حضرات نے میری دہلی بر بنہ قیام گاہ عقب جامع مسجد دہلی میں اور اُسکے متصل مطب جاری کیا ہے جسکی وجہ سے دعاگو کے مطب میں آنیوالے صدہا مریض مغالطہ میں آکر باعث صحیح اطلاع نہ ملنے کے پریشانی اٹھا رہے ہیں، لہٰذا اس دعاگو کو اپنے عقیدتمند مریضوں کی رہبری کیلئے یہ شائع کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں دعاگو کے جانشین بڑے صاحبزادے حکیم محمد عبدالحی صاحب انصاری موجود ہیں جن کا مطب اور دواخانہ المعروف بہ انصاری دارالشفاء اردو منزل میں متصل نشاط سینما دہلی عرصہ سے مرجع خلائق بنا ہوا ہے اور میری شہرہ آفاق اکسیر صفت کل ادویہ دہلی میں صرف حکیم عبدالحی صاحب انصاری مذکور الصدر ہی سے دستیاب ہو سکتی ہیں اور لاہور میں دعاگو کے منجھلے صاحبزادے حکیم محمد عبدالقادر صاحب انصاری سے مل سکتی ہیں جنکا مطب چوک نیلا گنبد لاہور میں واقع ہے اسلئے دعاگو کے عقیدتمند و سابقہ زیر علاج مریضوں کو علاج معالجے کیلئے مذکورہ بالا صاحبزادگان کیطرف رجوع کرنا چاہیئے انشاءاللہ تعالیٰ حسب دلخواہ مستفیض ہونگے دعاگو کے تجویز شدہ تمام نسخہ جات کی کل مجربات ادویہ پتہ ذیل سے طلب فرماویں نیز جملہ خط و کتابت بھی اسی پتہ ذیل سے کریں۔

پتہ: حکیم محمد عبدالحی صاحب انصاری خلف اکبر حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری اردو منزل نشاط سینما دہلی

دعاگو حکیم حافظ محمد عبدالوہاب انصاری افسر الاطباء از حیدرآباد دکن

ساقی بک ڈپو۔ دہلی کی دلکش کتابیں

خانم۔ دیوراتی چغتائی کی پُر لطف نوک جھونک۔ چغتائی صاحب کے پچیس دلکش مضامین۔ مجلد سنہری ٹھپہ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت للعہ

کولتار۔ تھی تو بچاری سانولی مگر شریر لڑکوں نے نام "کولتار صاحب" رکھدیا پھر کیسے کیسے مزے کے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ۔ ۔ ۔ عہ

ویمپائر۔ زانی مرد خونخوار درندے کی طرح ایک بیکس عصمت مآب پر جھپٹتا ہے۔ اسکی زندگی برباد کرتا ہے مگر۔ ۔ ۔ ۔ عہ

شریر بیوی۔ اس قدر شریر عورت تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی۔ کیسا کیسا ناک میں دم کیا ہے اس شریر بیوی نے۔ ۔ ۔ ۔ عہ

روح ظرافت۔ "انگوٹھی کی مصیبت" اس کتاب کے آٹھ افسانوں میں سے ایک ہے جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ ۔ عہ

فل بوٹ۔ لڑکی کے پاؤں میں کمبخت ایسا پھنسا کہ غریب کی دنیا ہی بدل گئی۔ شادی ٹھہری کس سے تھی اور ہوگئی کس سے! ۔ ۔ ۔ عہ

کمزوری۔ عورت کی کمزور فطرت سے شہزور مرد نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس کی زندگی برباد کر دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

روح لطافت۔ "دہاراں کا خواب" اس کا پہلا افسانہ ہے۔ ایسا عبرتناک فسانہ آپنے آج تک نہیں پڑھا ہوگا۔ بھیانک مگر دلکش۔ ۔ عہ

جنت کا بھوت۔ بی جنت بھی شرارت کی پتلی تھیں بھوت صاحب کا ناک میں دم کر دیا۔ پھر کچھ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

دیکھا جائیگا۔ ایک لڑکی پر تین مرد وے عاشق ہوگئے تو دیکھا جائیگا صاحب کچھ فیصلہ ہی نہیں کر سکے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

ملفوظات ٹامی۔ کتے، مرغے، مرغیاں اور گھریلو جانور انسانی بولی بولنے لگے۔ کیسی کیسی عجیب باتیں کی ہیں انہوں نے! ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

تفویض۔ بی۔ اے پاس لڑکی کی شادی مسجد کے ملّا سے ہوگئی۔ بس یہ سمجھئے کہ زمین آسمان ایک جگہ ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ۔ ۔ ۔ ۵ر

قرض۔ محبت کو کاٹنے والی قینچی کا نام قرض ہے۔ آپنے بہت کہانیاں پڑھی ہونگی مگر ذرا اسے بھی پڑھکر دیکھئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ر

فرزند سرحد۔ سرحد کے باشندے عزت کی خاطر موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ انہی غیرتمند لوگوں میں سے چند کا ذکر ہے۔ ۔ ۔ ۵ر

قدردان۔ سرزمین ریف کے ایک بہنوئی اور اس کے خطرناک سالوں نے وہ وہ حرکتیں کی ہیں کہ بس حیرت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۵ر

کھرپا بہادر۔ اجڈ گنوار کی شادی شاہ لنکران کی چہیتی شہزادی سے زبردستی کر دی گئی۔ کتاب کا ایک ایک نقطہ انمول ہے۔ ۔ ۔ عہ

خطوط کی ستم ظریفی۔ یہ خط بھی کیسا ستم ڈھاتے ہیں خصوصاً جب خط و کتابت ایک شریر لڑکی اور جوان مرد کی ہو۔ ۔ ۔ ۱۲ر

مرزا جنگی۔ لکھنؤ کے بانکے مرزا بھی واللہ عجیب چیز تھے۔ بٹیریں لیکر انگریزوں سے لڑنے چلے۔ واللہ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر

چمکی۔ عورت کی فطرت اجان جائے پر آن نہ جائے۔ غیرت اور شرافت کی منہ بولتی تصویر چمکی میں دیکھئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

نجم السحر۔ پانچ ہزار سال پہلے مصر کی ایک شہزادی تھی نجم السحر۔ اس کی داستانِ عشق ایک بے پناہ تیر ہے۔ ۔ ۔ ۔ عہ

سلامبو۔ وحشیوں سے جان بچانے کی صرف ایک صورت تھی اور وہ یہ کہ حسین سلامبو وحشیوں کے سردار کی ہو جاتے۔ ۔ ۔ ۳ر

تائیس۔ سرزمین مصر کی عروس بازاری نظر بھر کے دیکھنے سے جس کا حسن میلا ہوتا تھا اس کی عبرتناک داستان۔ ۔ ۔ ۔ عہ

ہیرودیاس۔ سلومی کا ناچ موت کا ناچ تھا۔ اس نے پیغمبر یوحنان کا سر انعام میں مانگا اور اس کے مردہ لبوں کو چوما۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

چنگیز خاں کے سوانح حیات۔ خدا کا قہر چنگیز خاں کی صورت میں نازل ہوا۔ اس قہر اللہ کے حالاتِ زندگی۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

فاؤسٹ۔ شاعر کی مصوری اور مصور کی شاعری کی شہرۂ آفاق کہانی۔ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ۔ ۔ عہ

پروین و ثریا۔ ایک مرد پر دو عورتوں کا عاشق ہونا اور دونوں کا عشق صادق تھا۔ مرد بھی دونوں سے محبت کرتا تھا۔ مگر۔ ۔ ۔ عہ

نرگس۔ طوائف بھی عورت ہوتی ہے اور اس کے سینے میں بھی محسوس کرنے والا دل ہوتا ہے۔ نرگس بھی ایک ایسی ہی طوائف تھی۔ ۔ عہ

تعلیم زدہ بیوی۔ اس بیوی کا دماغ تعلیم حاصل کرنے سے خراب ہوگیا اور لگی سمجھنے کہ میں جو کچھ کرتی ہوں وہ ٹھیک ہے۔ ۔ ۔ ۹ر

اخوان الشیاطین۔ سات سائنٹفک افسانے۔ آپنے آج تک اردو میں ایسے حیرت انگیز افسانے نہیں پڑھے ہونگے۔ ۔ ۔ ۔ عہ

چار چاند۔ ناصر نذیر فراق مرحوم کے چار نایاب مضامین۔ دلی کی نتھری ستھری بیگماتی زبان کے اعلیٰ نمونے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸ر

ید قدرت۔ جب انسان انتقام نہیں لے سکتا تو قدرت کا مضبوط ہاتھ ظالم کو سزا دیتا ہے۔ دلچسپ کہانی۔ ۔ ۔ ۔ ۵ر

آخرکار میں نے سمجھنا شروع کیا کہ جس طرح محبت کے لطیف احساسات انسان کو خود فراموش بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح حسد و رقابت کے قہر آفریں جذبات بھی ہماری عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ مگر جہاں محبت روح افزا اور تسکین دہ خیالات کی متحمل ہوتی ہے۔ وہاں رقابت کی آگ تند رو، مہیب اور تباہ کن اثرات پیدا کر دیتی ہے۔

صبح صادق کا وقت ہو چکا تھا میں مکان سے باہر باغ میں نکل آیا زبیدہ کی یاد میرے دل کو مضطرب بنا رہی تھی مجھے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ میں نے محض آسائش کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسکے جذبات کو مجروح کیا تھا اس وقت چاندنی ہوشربا چاندنی کائنات کے ذرہ ذرہ کو نقرئی بنا رہی تھی اور پھولوں میں بسے ہوئے سرد ہوا کے دلکش جھونکے دل و دماغ کو معطر کر رہے تھے میں سیب کے اسی درخت کے نیچے کھڑا تھا جہاں آج سے دس سال پیشتر میں اور زبیدہ اپنی شادی کی ایسی ہی طرب انگیز اور نکہت آمیز رات کو پیمانِ محبت باندھ رہے تھے۔ اس شب محبت کی یاد رہ رہ کر میرے دلمیں اُٹھ رہی تھی، اور دس سال قبل کا وہی دلکش منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ چاندنی کی نقرئی شعاعیں پتوں میں سے چھن چھن کر میرے لباس پر پڑ رہی تھیں۔ اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے شاخوں کو جنبش ہوئی اور سیب کے سفید پھولوں کی نرم و نازک پتیاں بارش کے قطروں کی طرح میرے اوپر گرنے لگیں محبت کے لطیف جذبات سے میرا سخت و پتھر دل موم کی طرح پگھل پڑا اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگے۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بے تاب منہ سے یہ الفاظ نکلے " یقیناً محبت دُنیا کی تمام قوتوں سے زبردست ہے۔ آہ! زبیدہ افسوس کہ ہم محبت کے زبردست جذبات کے متحمل نہ ہو سکے"

یکدم قریب ہی سے مجھے ایک نرم و نازک آواز سُنائی دی " نصرت پیارے! کیا ہم دوبارہ میدان الفت میں گامزن نہیں ہو سکتے" میں نے دیکھا کہ میرے قریب ہی زبیدہ نہایت دل رُبایانہ انداز سے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو" غصہ میں میرے منہ سے نکلا " جاؤ۔ واپس اپنے محبوب کے پاس" رقابت کا خوفناک جذبہ محبت کے احساسات پر پھر غالب آ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے" زبیدہ نے شیریں لہجہ میں جواب دیا "مگر نصرت! میں اب بھی تمہیں دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی ہوں"

"پھر تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں" میں نے نرمی سے دریافت کیا

"یہی جذبہ رقابت میرے دلمیں بھی مشتعل تھا۔ جو اس وقت تمہیں بے تاب کر رہا ہے۔ میں نے چاہا کہ تمہارے دلمیں بھی اس کا احساس پیدا کر سکوں۔ اسکے لئے مجھے یہ چال چلنی پڑی کہ میں نے اختر کو اپنے ہاں بلا لیا اور بظاہر تمہارا دل جلانے کے لئے ہر وقت اسکے ساتھ رہنے لگی لیکن یقین جانو کہ ہم دونوں حقیقی بہن بھائی کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے آج رات کو میں اپنی سہیلی کے ہاں جو سب انسپکٹر کی بیوی ہے۔ ٹھہری ہوئی تھی، اسکے خاوند نے مجھے تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ تم میری یاد میں سخت مضطرب تھے۔ لہذا میں فوراً تمہارے پاس واپس آ گئی"

وہ بالکل قریب ہو گئی " نصرت پیارے! میں سمجھتی ہوں کہ محبت ہر ایک چیز سے طاقت ور ہے جو تکالیف میری روح نے برداشت کی ہیں انہیں میں ہی جانتی ہوں۔ مگر مجھے خوشی ہے کہ میں محبت کے امتحان میں کامیاب رہی ہوں اور فتح آخر محبت ہی کی ہوتی ہے"

میں نے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسکی تائید کی اور ہماری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ کافی دیر تک ہم حالت ہم آغوشی میں خاموش کھڑے رہے ——— آج ہماری زندگی کی از سر نو ابتدا ہوئی تھی ———

(۸)

اب زبیدہ اور میں نہایت خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم خوب سمجھ چکے ہیں کہ رقابت اور حسد کے تباہ کن جذبات پر محبت ہمیشہ غالب آتی ہے جوں جوں وقت گزر رہا ہے ہماری محبت زیادہ پختہ ہوتی جا رہی ہے۔ ناصر اور زہرہ بھی ایک خوش نصیب جوڑے کی طرح پُر مسرت دن گزار رہے ہیں ناصر صحت یاب ہو کر اپنی مذموم حرکات سے توبہ کر چکا ہے اب وہ ایک بچہ کا باپ بن چکا ہے اور اسکی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ دونوں میاں بیوی ہمارے ہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ اور ہم انہیں اپنے عزیز ترین دوستوں میں تصور کرتے ہیں +

ساغر جعفری۔ بی اے ایل ایل بی

مضامین تہذیب کی روشنی
گھر یلو زندگی کی جھلک پر مشہور ادیب خواجہ
عبدالمجید دہلوی کی لکھی ہوئی زبان میں
نہایت دلچسپ اور مزاحیہ اسکیچ لکھائی
چھپائی کاغذ عمدہ قیمت ۸ ر

انشائے لطیف
اردو کے انشا پرداز مسٹر لطیف الدین
احمد جنہیں اکثر ارباب ذوق ل۔ احمد کے
نام سے جانتے ہوں گے ہمارے ملک کے
زبردست افسانہ نگاروں میں ہیں
انشائے لطیف میں آپ کے پندرہ افسانے
شائع ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ کا ہر
افسانہ آپ کو ایک دوسرے عالم میں
پہنچا دیگا۔ کتاب پونے تین سو صفحات
پر مشتمل ہے اور مجلد ہے۔ قیمت عگار

ویرا
ایک روسی محب وطن خاتون
آسکر وائیلڈ کے مشہور ڈرامہ
کا جو مرقع ہے زاریت کی ستم رانیوں
اور جفا کاریوں کا۔ قیمت ۹ ر

ہمایوں نامہ
(باتصویر) شہنشاہ
اعظم ہمایوں کی مستند
سوانحعمری خود ان کی بہن گلبدن بیگم
کی لکھی ہوئی ترجمہ از سید ابن حسن
شادق بی اے بی ٹی قیمت عہ و ۱۲ ار

حبش و اطالیہ
حبش کی مکمل تاریخ،
جغرافیہ حبش تہذیب
و معاشرت، حبش کا دور خاطر حبش و جرمن
حبش اور اطالیہ لیگ استعمار اور حبش
مستقبل۔ غرض حبش اور اطالیہ کے جدید
و قدیم حالات کا مرقع از اختر حسین رائے
پوری۔ قیمت ۱۲ر

پستالوزی
از قاضی عبدالحمید ایم
اے پی ایچ ڈی جس
طرح یورپ کے عہد جدید میں کوپرنیکس
نے ہیئت اور کولمبس نے جغرافیہ کا
نقشہ بدل دیا، اسی طرح "پستالوزی"
نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا
کر دیا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی

تعلیمی نظریئے اور تعلیمی کارنامے اور
ان کی تفصیل سلیس زبان اور دلکش
انداز بیان میں ملاحظہ فرمایئے قیمت ۱۲ر

معاہدہ عمرانی
از شاں ژاک روسو،
مترجمہ ڈاکٹر محمود
حسین ایم اے پی ایچ ڈی حریت،
اخوت اور مساوات جس کا روحانی
پیام دنیا کو اسلام نے پہنچایا تھا اسکی
سیاسی تبلیغ یورپ میں روسو کے معاہدہ
عمرانی نے کی۔ روسو کا کمال یہ ہے
کہ سیاست مدن کے دقیق مسائل ہلکی
باتوں میں سمجھا دئے ہیں اس کی یہ

بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

لیلےٰ کے خطوط مع روزنامچہ
ملک کے مشہور ادیب قاضی عبدالغفار
کا قابل قدر کارنامہ۔ دونوں کتابیں فطرت
انسانی کے دو متلون عکس اور کتاب
زندگی کے دو مختلف نقوش ہیں ایک غم
نصیب عورت کی فریاد ہے اور دوسری
عیش پرست مرد کی داستان ہے۔
قیمت صرف ۱۲ر

طوفان ظرافت
مزاحیہ قصائد
کا چھوٹا سا مجموعہ
اس طرز کے قصائد آج تک اردو زبان

آپ کے فائدہ کی بات

ہم اپنی مطبوعات پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف کر سکتے ہیں بشرطیکہ
(الف) فرمائش مبلغ پانچ روپے سے کم نہ ہو (ب) رقم بذریعہ منی آرڈر
پیشگی ارسال کی جائے اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسروں کی کتابوں پر
اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ دس روپے سے کم نہ ہو اور رقم
پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔ البتہ ان کتابوں پر
جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتی یہ ممکن نہ ہوگا۔ ایسی کتابیں
بہت کم ہیں۔
نیاز مند منیجر

کتب خانہ علم و ادب دہلی

کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفہ
سیاست کی سب سے اہم کتاب ہے قیمت عگار

گلبدن بیگم
ہمایوں کی بہن اکبر کی
پھوپی شہنشاہ بابر
کی بیٹی کی مستند جامع سوانح عمری
جسکا ماخذ انگریزی و فارسی کی معتبر
و مستند کتابوں سے ہے جس میں
تینوں عہد کے جامع و مکمل حالات
دکھائے گئے ہیں۔ مع پانچ فوٹو۔
قیمت ۱۲ و ۸ ر

حجاج بن یوسف
جرجی زیدان
کے ناول کا
شستہ زبان میں ترجمہ اس میں اسلامی
تاریخ کا ایک پہلو بہترین انداز میں

میں نہیں لکھے گئے۔ قیمت ۶ ر

چار انقلابی
جس میں غیر معمولی دل
و دماغ والا انسان
ڈاکٹر نیلم ایشیا کی چار زبردست طاقتوں
سے ٹکر لیتا ہے۔ مقابلہ کی زبردست
روئداد سے جو پلاٹ بنا ہے بس وہ
دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۸ ر

شمیم
نہایت دلچسپ معاشرتی اخلاقی
ناول صحیح افسانہ نگاری کے
اصول پر سبق آموز ظرافت انگیز عبرتناک
دو ضخیم جلدوں میں دوسری دفعہ چھپا
ہے۔ قیمت للعہ ر

تعلیم زدہ بیوی
ایک جدید فیشن
کی ہندوستانی

عورت غلط راستہ پر پڑ جانے کی وجہ سے
کس قدر مصیبتوں میں مبتلا ہوتی ہے اور
اس کا دلچسپ انجام۔ قیمت ۸ ر

نجمہ نوری
ماں کی مامتا سے متعلق
ایک دلدوز تمثیل نجمہ
کی المناک سرگزشت، مامتا کی ماری کس
طرح تڑپتی پھرتی ہے گناہ کی لرزہ خیز تصویر

سلمیٰ
آسکر وائلڈ کی تمثیل "سالومی" کا
ترجمہ حسن خون آشام کی ہوسناکی
اور سوت تخیل اور طرز بیان خاص چیز ہے ۸ ر

چار چاند
دلی کی ٹکسالی اور نکھری ستھری
زبان کا لطف اگر آپ اٹھانا
چاہتے ہیں تو اس کتاب کو طلب کیجئے
جو حضرت فراق مرحوم کی تصنیف ہے۔ ۸ ر

عروس ادب
قاضی عباس حسین
صاحب ظریف کے
بہترین افسانوں کا مجموعہ جو بہت پسند
کیا گیا ہے ہر افسانہ سیدھی سادی اردو
میں لکھا گیا ہے۔ واقعات تمام معاشرتی
اور اصلاحی ہیں پلاٹ بہترین۔ قیمت عہ

چندرا موہنی
حسن و عشق کی داستان
خونچکاں محبت کا
مذہب بھی کیا سکتا ہے۔ سچے عشق
کی المناک کہانی موثر اور مفید۔ قیمت عہ

دلی کا آخری دیدار
۱۸۵۷ء کے
غدر سے
دلی کی سوسائٹی کیا تھی۔ لال قلعہ آباد تھا
تو چمنستان میں کیسی بہار تھی سو سال پہلے
کی ایک جھلک دیکھئے۔ قیمت ۱۲ ار

لال قلعہ کی ایک جھلک
لال قلعہ کے عجیب و غریب واقعات جن
کو پڑھ کر آپ سر بسر ہی ہوں گے اور
حیرت زدہ بھی۔ قیمت عہ

کبیر جنم ساکھی
مشہور ہندی شاعر
کبیر داس کی سوانح
عمری اور ان کا کلام قیمت ۸ ر

سیر خرابات
قیمت ۶ ر

عجیب الطرفین
قیمت ۱۲ر

تصانیف شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم

مرآۃ العروس یہ کتاب کافی طور پر مشہور ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا بلند ذوق شخص ہو جس کی نظر سے نہ گزری ہو۔ جب مولانا ممدوح نے اسے تصنیف کیا تو گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ بطور انعام مرحمت کیا۔ پبلک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور مانگ بدستور باقی ہے۔ اس کتاب کی زبان ایسی بامحاورہ اور صاف و سلیس ہے کہ اس کے مطالعہ سے صدہا آدمی ادیب انشا پرداز بن گئے۔ اس کتاب میں ایک سگھڑ اور ایک پھوہڑ عورت کا کیرکٹر دکھایا گیا ہے اور واقعات لکھکر بتایا گیا ہے کہ ایک پھوہڑ عورت کس طرح اپنے خاندان اپنے کنبہ اور اپنے اثاث البیت کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے اور ایک سگھڑ عورت کی بدولت ایک مصیبت زدہ کنبہ کس طرح خوش حال بنجاتا ہے۔ افلاس کس طرح تمول سے بدلتا ہے اور ادنیٰ درجہ کا گھرانہ کیونکر اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے لگتا ہے۔ کتاب ایسے مؤثر اور دلکش انداز میں لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے پر بے حد اثر ہوتا ہے اور طبیعت خود بخود نیکی اور سلیقہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اخلاقی تعلیم کے ساتھ خانہ داری کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھکر لڑکیاں ہر طرح آئندہ زندگی کی مشکلات پر غالب آنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ پہلے عورتوں کے سمجھنے بوجھنے کی ضرورت مؤثر الفاظ میں ثابت کی گئی ہے، پھر قصے کا آغاز ہے۔ مثلاً اکبری کی بدمزاجی اور اس کا سسرال سے روٹھ کر چلا آنا، اکبری کی شرارتیں، پھوہڑپن، حماقت، بدمزاجیاں، عین عید کے دن بے لطفی پیدا کرنا، الگ گھر کرنے پر ساس داماد کا مباحثہ، اکبری کا الگ گھر اور اس کی بدانتظامی، اصغری کا بیاہ اور اس کا مختصر حال، اصغری کا برتاؤ اور خانہ داری، اصغری میاں کی اصلاح کرتی ہے، گھر کے خرچ کا تعین، اصغری اپنے میاں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتی ہے وغیرہ اس کتاب کی طباعت میں خاص انتظام کیا گیا ہے تاکہ جس پایہ کی کتاب ہے اسی کے مطابق اس کی ظاہری صورت بھی ہو۔ صفحات ۲۴۲ قیمت قسم اعلیٰ مجلد ۱۲ ار ایضاً قسم دوم بلا جلد ۸ ر

بنات النعش یہ ایک لحاظ سے گویا مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ ہے اور ایک لحاظ سے اپنی جگہ مستقل کتاب ہے۔ اس کتاب پر بھی گورنمنٹ سے پانچ سو روپیہ بطور انعام ملا ہے۔ اس میں بھی عورتوں کی تہذیب، شائستگی، سلیقہ مندی اور خانہ داری کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک کمسن لڑکی ہی اتنی سمجھ آسکتی ہے کہ وہ ایک بڑے گھر کا انتظام سنبھال لے۔ بزرگوں کے ساتھ اطاعت و ادب کا برتاؤ، چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت، نوکروں اور ماماؤں کی خور و پرداخت، شادی بیاہ کے انتظامات اور ضروریات روزمرہ کے متعلق نہایت دلچسپ اور مفید مضامین اس کتاب میں موجود ہیں، اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر کوئی بیوی زنانہ ذمہ داریوں اور خانگی مشکلات میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قیمت قسم اول ۱۲ ار قیمت قسم دوم ۸ ر

توبۃ النصوح یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ آج کل دنیاداروں کی جو حالت ہے اور وہ دنیوی مصروفیتوں میں رات دن غرق رہ کر خدا اور رسول اور ان کے احکام کو جس طرح بھول گئے ہیں اس کا صحیح نقشہ ان اوراق کو پڑھکر سامنے آجاتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے دل کو جو عبرت ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑے وعظ سے بھی ناممکن ہے۔ دنیادار طبقہ کی اصلاح کیلئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ عورتوں میں مذہبی روح اور احکام مذہبی کی پابندی پیدا کرنے کیلئے یہ کتاب بے مثل ہے۔ اس کے مضامین کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

ایک برس دہلی میں ہیضہ کی سخت وبا پھیلی، نصوح نے ہیضہ کیا اور سمجھا کہ مرا چاہتا ہے۔ یاس کے عالم میں مواخذہ آخرت کا تصور بندھا، ڈاکٹر نے اسے خواب آور دوا دی، سو گیا تو وہی تصور اسے خواب بن کر نظر آیا، خواب سے بیدار ہو کر نصوح کا اپنی اور اپنے خاندان کی لایعنی زندگی پر تاسف، بیوی کو اصلاح خاندان کے لئے اپنا مددگار بنانا، فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی گفتگو، نصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو، فہمیدہ اور بڑی بیٹی کی لڑائی، نصوح اور منجھلے بیٹے کی گفتگو، بڑے بیٹے کی سرکشی اور باپ سے ناخوش ہو کر گھر سے نکل جانا، کلیم کا دوستوں کے ہاں رہنا، مصیبتیں اٹھانا، قید ہونا اور پھر باپ کی سفارش سے رہائی پانا۔ اسی طرح کے صدہا مؤثر، دلچسپ اور عبرتناک مضامین۔ اس کتاب کا نیا ایڈیشن بہترین کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور چھپائی، تصحیح وغیرہ کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ صفحات ۲۷۰ قیمت قسم اعلیٰ مجلد عہ ر قسم دوم بلا جلد ۱ ر

منتخب الحکایات بچوں کو عموماً کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے لیکن دائیاں ان کو بے نتیجہ چڑے چڑیا کی سی کہانیاں سناتی ہیں جس سے رتی بھر فائدہ نہیں۔ اس کتاب میں (۲۲) نتیجہ خیز دلچسپ کہانیاں چھانٹ چھانٹ کر لکھی گئی ہیں اور ہر کہانی کے آخر میں مفید نتیجہ بھی بہ طور حاصل مطلب نکالا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب کم عمر بچوں کے پڑھانے کے قابل ہے اور حکایات لقمان کے ہم پلہ ہے۔ آٹھواں ایڈیشن۔ قیمت ۸ ر

چند پند اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ پند اور نصائح سود مند کا بے بہا ذخیرہ، بچوں اور مبتدیوں کے لئے عمدہ عمدہ مضامین، ادب، صحبت، عقل، غصہ، لالچ، حسد وغیرہ کے ماسوا دنیا کا مختصر حال، مذہب کی ماہیت، پیغمبروں کا مختصر حال۔ یہ بیش بہا چیدہ منتخب مفید اور سبق آموز مضامین کا گلدستہ ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے بہترین آداب و اخلاق کی تعلیم مذہبی چاشنی کے ساتھ عمدہ ترین پیرایہ میں دی گئی ہے۔ زبان بالکل شستہ اور آسان ہے، معمولی اردو خواں بچے بے تکلف مزہ لے کر پڑھ سکتے ہیں۔

نواں ایڈیشن قیمت آٹھ آنے ۸ ر

مضامین ابو الکلام آزاد

اردو زبان کے صاحب طرز ادیب کے معرکۃ الآرا مضامین کا مجموعہ جن میں آزادی، حریت، جہاد اور عمل کی روح پھونک دی گئی ہے۔ ایک ایک سطر حساس دلوں کے لئے پیغام حیات ہے۔ مولانا کے مضامین کا یہ مجموعہ عنقریب ختم ہونیوالا ہے پھر خبر نہیں کب شائع ہو سکے۔ قیمت مکمل چھ حصص چار روپیئے (للعہ ر) علاوہ محصولڈاک

خوبصورت جیبی کتابیں

...شق کی گولیاں ملک کے دو زبردست ...شاپرداز۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور ...ملا جیدہ جوش کی انشاپردازی کا نمونہ ...ہے۔ انداز بیان اور ندرت کے لحاظ سے ...دلچسپ اور ظرافت وطنز کا مشترکہ ...شاہکار ہے۔ قیمت چار آنہ (۴ر)

...انشاپہ تماشہ مشہور ظرافت نگار نا کارہ حیدرآبادی ...افسانہ پلاٹ دلچسپ انداز بیان بیحد ...مہ ہر فقرے پر گدگدی ہوتی ہے انجام ...بیحد دلچسپ اور متحیرکن۔ قیمت ۴ر

...لی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ

حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم ...اپنی مخصوص شوخ اردو کے معلیٰ میں ...نے آخری بادشاہ کے آخری فرزند ...مرزا شاہرخ کے شیر کے شکار کے حالات ...لکھے ہیں۔ جو بیحد دلچسپ اور عجیب وغریب ...فراق صاحب دلّی کے وہ ادیب تھے ...کی زبان کو مولانا محمد حسین آزاد مصنف ...آب حیات نے سند مانا ہے۔ قیمت ۴ر

...ت طلاقنوں کی کہانیاں

...یہ بھی فراق صاحب کی تصنیف ہے ...ت طلاقنیں اتفاق سے ایک جگہ ...جمع ہو جاتی ہیں اور اپنی اپنی داستان حیات ...بیان کرکے بتاتی ہیں کہ انہیں کس وجہ ...سے طلاق ملی۔ اس کتاب میں عورتوں ...کی زبان لائق قدر ہے اور کہانیاں بیحد ...دلچسپ۔ قیمت ۴ر

...ہوں کی چھیڑ چھاڑ فراق صاحب کی تخاص الناس ...تصنیف ہے ایک بیاہ کی محفل۔ دلی کی ...بیگمات کی زبان اور فراق مرحوم کا قلم کتاب ... قیمت ۴ر

خواب پریشاں مولوی عنایت اللہ صاحب کا لکھا ہوا افسانہ۔ پلاٹ بہت ہی اچھوتا ہے اور پھر اُسی کے ساتھ کہیں مزاح اور کہیں طنز کی چاشنی نے اور بھی سامان لطف مہیا کر دیا ہے۔ قیمت ۴ر

انکشاف حقیقت مسٹر صادق الخیری ایم اے کا بے حد دلچسپ افسانہ جو ان کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ زبان اور بیان کی خوبیاں خوب نکھری ہوئی نظر آتی ہیں اور ہر ہر سطر دل و دماغ پر ایک روحانی کیفیت طاری کر دیتی ہے قیمت چار آنہ (۴ر)

گمنام عورت کا خط ایک یورپین مصنف کے اسی شاہکار کا ترجمہ ہے جو یورپ اور امریکہ میں بہت مقبول ہو چکا ہے جس کی سوگواری اور عشق کی نامرادی کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ قیمت ۴ر

نوٹ:۔ یہ آٹھوں کتابیں یکمشت طلب فرمانے پر معہ محصول دو روپیہ میں روانہ کی جائیں گی۔

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے (عہ)

شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ، جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، اس کا تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندیٔ مضمون، اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجے کو پہنچتی ہے قیمت عہ

جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے۔ اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)

گہوارۂ تمدن بیحد معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ واساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع میں اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ قیمت دو روپے (عہ)

مجموعہ استفسار وجواب

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۶ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک استفسار وجواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا ذکر بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ قیمت جلد اول ۳ر قیمت جلد دوم ۳ر

ترغیبات جنسی اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخ ونفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ قیمت مجلد عہ

تاریخ دولتین جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ وبنی عباس کی سیاست پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ قیمت عہ

گیتانجلی۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

فاؤسٹ

(ترجمہ:۔ شاہد احمد۔ بی۔ اے (آنرز) دہلوی)

فاؤسٹ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم وسحرکن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ شہرۂ آفاق شاعر المانیہ گوئٹے نے دنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفۂ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سہانا بھی ہے اور بھیانک بھی۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد ہے۔ نیکی بدی، حسن، عشق، گناہ، خون، قتل اور موت کی یہ داستان رنگین، کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ۔

سہاگ کی آٹھ راتیں اس کتاب میں ایک

نئی دلہن نے شب زفاف کی آٹھ راتوں کے پر لطف واقعات بہت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے عورت اور مردوں کی لطیف احساسات کے دلی جذبات سے پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ جن کو ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت عہ

آرائش جمال (باتصویر) اس کتاب میں عورتوں کے سنگھار اور جسمانی آرایش کے تمام مشرقی و مغربی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ دو درجن فوٹو بلاک کی خوبصورت تصاویر کے علاوہ دو سو مجرب نسخے جو معمولی لاگت پر گھر میں تیار ہو سکتے ہیں بتائے گئے ہیں۔ کتاب کی خوبی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ (۱) ملک کے مشہور ڈاکٹر کرنل بھولاناتھ صاحب آئی ایم ایس، سی، آئی، ای نے ڈاکٹری نقطۂ نظر سے اس کتاب کی نظر ثانی کی ہے اور ایک طویل علمی دیباچہ بھی لکھا ہے۔ قیمت ۶/

دلہن کی پری حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق مرحوم نے اپنے خاص انداز میں یہ طویل افسانہ لکھا تھا جو شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ یہ کتاب برسوں سے ناپید تھی اب نئے انداز میں نہایت عمدہ کتابت و طباعت اور رنگین ٹائیٹل کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ زبان اور بیان کی خوبیاں قابل مطالعہ ہیں۔ قیمت صرف ۱۰/

امہات الامہ شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد کی آخری تصنیف۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں بانی اسلام کے تعداد ازدواج کے واقعات اور اصل وجوہ لکھ کر معترضین کے جواب دیئے گئے ہیں۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کی نسبت جو خیالات غلط متعصب لوگوں کے دل میں جگہ پکڑ گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے حکیم بہت فاضل مصنف نے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے تاکہ معترضین تعداد ازدواج کی اصلیت کو چشم بصیرت سے دیکھیں اور لغو اور بیہودہ اعتراضوں سے زبان اور قلم کو روکیں۔ یہ وہی کتاب ہے جسکو سوختنی قرار دیکر مولانا مرحوم پر کفر کا فتویٰ ہوا تھا۔ قیمت دو روپے عہ/

صمدانی جنہوں نے ناکارہ حیدرآبادی کے مضامین "تماشہ پر تماشہ" بی۔ اے بی بی!! "صمدانی" "مشرق و مغرب کی ٹکر" وغیرہ پڑھے ہیں جانتے ہیں کہ ان مضامین میں کیسے کیسے عجیب واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ اور بعض مواقع تو ایسے ہیں کہ پڑھنے والا اپنا سانس تک روک لیتا ہے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ اس کتاب کے کئی باب ہیں اور ہر باب بجائے خود ایک مکمل افسانہ بھی ہے۔ قیمت عہ

تائیس یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ یہ فرانسیسی مصنف اناطول فرانس کا شہ پارہ ہے

اس میں علم مذہب کے تصادم کے مسئلہ کو بصیرت افروز پیرایہ میں ... کی داستان کے طور پر نہایت دلفریبی سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ ناول تمام دنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادر الکلامی اور اعجاز بیانی سے کیا ہے کہ اردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنا دیا ہے قیمت عہ/

مسدس حالی صدی ایڈیشن

مولانا حالی کی صد سالہ یادگار کے موقع پر شائع کی گئی ہے۔ معہ تقریبات از مولوی عبدالحق صاحب راس مسعود صاحب مولوی حبیب الرحمن صاحب شروانی بالقابہم و مقالات از مولوی سید سلیمان صاحب ندوی و خواجہ غلام السیدین صاحب۔ اس کے علاوہ اس میں عکس خط سر سید مرحوم۔ تصویر مولانا حالی و عکس قطعہ دستخطی علامہ اقبال بھی دئے گئے ہیں۔ جلد کاغذ کتابت دیدہ زیب باوجود ان خوبیوں کے قیمت قسم اول عہ/ دوم عہ/

سحر بنگال محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کے افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ہر افسانہ

محبت ... کی ... اور انسانی جذبات و احساسات کا ... مرقع ہے۔ قیمت عہ/

تاریخ اسلام اردو میں اپنی نوعیت کی بے مثال تاریخ ہے جس میں نہایت اختصار کیساتھ پوری اسلامی تاریخ سلسلہ وار درج ہے اس میں بڑی بڑی تاریخوں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور اس اعتبار سے یہ طلبہ اور دیگر اہل علم کیلئے یکساں طور پر مفید ہے۔ قیمت عہ/

میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ۔ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ یہ کتاب پڑھکر معلوم کیجئے کہ نوجوانوں کے قائد اعظم نے ہماری تحریک اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا ہے کتاب کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھا ہے بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت مجلد دو حصوں میں صرف للعہ/

رباعیات سلطان ابو سعید ابو الخیر

معہ ترجمہ منظوم حقیقت کی سیر و سوانح عمری حضرت مغفور۔ قیمت ۱۲/

رباعیات عمر خیام عمر خیام کی رباعیاں اور ان کا منظوم اردو ترجمہ اور عمر خیام کی سوانح عمری معہ بلاک فوٹو۔ قیمت عہ/

رباعیات سرمدؒ مع سوانح عمری سرمد شہید مولفہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ اس مجموعہ میں رباعیات سرمد مرحوم کا اردو منظوم ترجمہ بھی ہے۔ ۱۲/

رقعات سرمد شہیدؒ حضرت سرمد شہید کے رقعات کا مجموعہ۔ قیمت دو آنے ۲/

محبت اور نفرت

تہدیہ محبت ——— نفرت کے نام

اردو کے سب سے جدت طراز ادیب

اختر حسین رائے پوری

کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ

محبت ایک کانٹا ہے چبھنے کیلئے — نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کیلئے

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

ملنے کا پتہ:۔ **کتب خانہ علم و ادب دہلی**

قابل مصنفوں کے تاریخی جاسوسی، اور عشقیہ ناول

نوٹ:۔ ان ناولوں کی وہی قیمت درج کی گئی ہے جو کم ہو سکتی ہے۔ چھپی ہوئی قیمتوں کا خیال نہیں کیا گیا ہے۔

ایران کی حسینہ ۱۲ر
انقلاب سمرنا ۶ر
اسیر محبت ۱۰ر
انقلاب مصر ۱۲ر
باغی سپاہی ۱۰ر
بہرام کی سینٹ ہیلنا ۸ر
شمیم و بہرام ۱۰ر
بہرام کا اڈا ۱۰ر
بہرام بلیک ۸ر
بہرام امریکہ میں ۸ر
بہرام کا پھانسی گھر ۸ر
بہرام کا آخری انجام ۶ر
بہرام کی خالہ اول ۶ر
بہرام کی خالہ دوم ۶ر
جلاد بہرام عہ
بہرام کی سیاہی عہ۴ر
فطرتی بہرام ۵ر
پراسرار بہرام ۵ر
بہرام کی فراری ۸ر
قتل بہرام ۹ر
آفتاب عالم حصہ اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
ر ر حصہ سوم عہ۴ر
ر ر حصہ چہارم عہ۴ر
بہادر عرب حصہ اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
بیگناہ حسینہ ۱۲ر
بہادر ڈاکو ۸ر
پہلی صلیبی جنگ اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
پراسرار تصویر ۱۲ر
پُراسرار انسان ۱۲ر
ترکی شمشیر ۱۲ر
ترکی [illegible] ۱۲ر

جوس جوانی ۱۲ر
جانباز حسینہ ۱۲ر
جنگ بلقان عہ۴ر
جاپانی شہزادہ عہ۴ر
حسین شہزادی ۱۲ر
حسین شکاری ۱۰ر
حور بغداد ۶ر
خونی شمشیر ۱۲ر
خوفناک ڈاکو ۵ر
خوفناک جادوگر ۸ر
دغاباز بیوی ۱۰ر
رازدار معشوقہ ۱۴ر
زہرا ۱۴ر
سلطان سبکتگین ۱۲ر
شہزادی عباسہ اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
ر ر حصہ سوم عہ۴ر
شیر اسلام ۶ر
شیام کنور ۹ر
شکنتلا ۱۲ر
طلسمی شیشہ ۱۴ر
طلسمی پنجہ عہ
طلسمی سایہ ۶ر
طلسمی ہار ۷ر
طوفان زندگی عہ۴ر
صلیبی جہاد اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
عیاروں کا عیار ۱۰ر
عرب کا چاند ۱۲ر
فریب رنگین ۹ر
قتل بیگناہ ۸ر
محمود و روزا ۱۲ر
کالا بھوت ۱۰ر
محمد قاسم ۱۲ر
مشرق کی حور ۱۲ر

مظلوم نازنین ۱۲ر
مہذب ڈاکو ۵ر
معشوقۂ حلب اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
بہادر دلہن عہ۴ر
حور عرب عہ۴ر
ترکی ہیر اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
مصر کا چاند اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
طارق حصہ اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
جنگ ایران عہ۴ر
فتح ایران عہ۴ر
سنگدل ملکہ عہ۴ر
چار انقلابی ۸ر
حجاج بن یوسف عہ۴ر
پراسرار دوشیزہ ۸ر
معاشقۂ نپولین ۶ر
سادھنا کے تار عہ۴ر
اپاسنا کے تار عہ۴ر
قدرت کے کھیل ۱۲ر
راج سنگھ عہ
شاہی ڈاکو عہ۴ر
کرنی بھرنی عہ
افریقہ کے دو چاند عہ۴ر
افغانوں کی تلوار عہ
خانہ بدوش ۷ر
خانہ خراب عشق ۵ر
خفیہ جلسہ ۴ر
ایک رات میں چار واردات ۶ر
عجیب تہ خانہ ۴ر
پُراسرار غبارہ ۵ر
محمود سراغرساں ۴ر
بیرسٹر کی لڑکی اور طوائف عہ۸ر

خونی دلہن ۱۱ر
بیگناہ قیدی اول ۸ر
ر ر حصہ دوم ۸ر
فتح سمرنا ۶ر
ہندوستانی غنڈہ عہ۴ر
خون کا بدلہ خون ۱۲ر
جنگ روس ۵ر
سنہری ٹولہ ۸ر
جنگ ہسپانیہ ۱۲ر
جدید نیلی چھتری ۸ر
بھیرکنی آنکھ ۴ر
عاشق کا دل ۱۴ر
پھانسی کا تختہ ۵ر
فریبی جال ۹ر
عبدالرحمٰن ناصر عہ
نازنین مراکش ۸ر
جنگ ترکستان ۶ر
نیک ملکہ ۱۴ر
انقلاب فرانس ۱۲ر
آفتاب ایران ۱۲ر
بیوی کا قاتل ۱۲ر
افسانۂ پیرزاد ۵ر
فرانس کی حسینہ ۱۲ر
شیر کابل عہ
ڈاکوؤں کا گرو گھنٹال ۸ر
طلسمی تاج ۱۲ر
بہادر حور حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم ۱۴ر
ر ر حصہ سوم ۱۴ر
بہادر دوشیزہ عہ
ترکی شہزادہ حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم ۱۴ر
اندلس کے دو چاند حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم ۱۲ر
ر ر حصہ سوم ۱۲ر

اندلس کے دو چاند چہارم ۱۲ر
معشوقۂ فرعون عہ
انطاکیہ کی حور حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
حلب کے دو چاند حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
جنگ انطاکیہ حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
عیاش شہنشاہ حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
شاہی محل کے خفیہ راز ۸ر
ایک چشم بدمعاش عہ
موت کا برقعہ ۶ر
سیاہ چادر ۶ر
ٹوپی کا سراغ ۵ر
انکشاف طلسم ۸ر
عربی دوشیزہ اول ۱۲ر
ر ر حصہ دوم عہ
ر ر حصہ سوم عہ
سمرنا کے دو چاند اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
بہادر سلطان اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
مہ لقائے عجم حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
حور لقا حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
حور مغرب حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
چوروں کا اڈا ۶ر
بازاری دوشیزہ ۱۰ر
بہادر حسینہ ۶ر
محبوبۂ نمرود حصہ اول ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ
ترکی جہاد ۶ر

عرب کے میلے ۶ر
بہادر نازنین ۶ر
شہزادی فلپانہ عہ
تراپلس کا چاند ۶ر
بصرہ کا چاند عہ
واجد علی شاہ ۶ر
بہادر شاہ ۶ر
اکبر اعظم ۶ر
جہانگیر ۶ر
غدر کی شہزادی ۶ر
نقاب پوش ۶ر
معشوقۂ مبارک ۶ر
ڈاکو مبارک ۶ر
عورت کے چلتر ۱۰ر
بوسہ کی تعلیم ۱۰ر
جنگ یرموک ۸ر
بہرام و سلطانہ ۸ر
لٹیرا بندر ۶ر
غازی امان اللہ خان ۶ر
ماہ عرب حصہ اول عہ
ر ر حصہ دوم عہ
پیغام شادی ۱۴ر
جنگ اٹلی ۶ر
جنگ حبشہ ۶ر
سلطانہ ڈاکو ۵ر
کامنی حصہ اول عہ
ر ر دوم عہ۸ر
ر ر سوم عہ۸ر
سندھ کی راجکماری اول عہ۴ر
ر ر حصہ دوم عہ۴ر
ر ر ر سوم عہ۸ر
شیر دل خاتون اول عہ۸ر
ر ر حصہ دوم عہ۸ر
ر ر سوم عہ۸ر
صبح ترکی عہ۸ر

دلچسپ افسانوں کی کتابیں

نام کتاب	مصنف	قیمت
افسانۂ لطیف مجلد	ل۔ احمد اکبرآبادی	عگ
جوش فکر	سلطان حیدر جوش	عہ
کیفستان	قیسی رامپوری	عہ
دہشت ناک افسانے مجلد	نسیم انہونوی	عگ
ہیبت ناک افسانے	امتیاز علی تاج	عہ
دلچسپ افسانے	کوثر چاندپوری	عگ
دل گداز افسانے	״ ״	عہ
کیمیاگر اور دیگر افسانے	پروفیسر مجیب	عہ
نونہال شیاطین اور دیگر افسانے	علامہ سلطوک	عہ
چتھیاڑے اور دیگر افسانے	مجنوں گورکھپوری	۱۲ر
سحر بنگال	طاہرہ دیوی شیرازی	عہ
لمحات رنگین مجلد	زبیدہ سلطانہ	عگ
نگارستان	نیاز فتحپوری	عگ
عروس ادب	قاضی عباس حسین	عہ
مصری افسانے	سجاد میرٹھی	۸ر
جھلک زندگی	پروفیسر عابد علی	۱۲ر
جاسوسی افسانے	محمد یعقوب کلام	عہ
فرانسیسی افسانے	״ ״ ״	۱۴ر
چغتائی کے افسانے حصہ اول	عظیم بیگ چغتائی	عہ
״ ״ ״ حصہ دوم	״ ״	عہ
موج ظرافت	״ ״	عہ
موج لطافت	״ ״	عہ
زادِ راہ	منشی پریم چند	عہ
واردات	״ ״	عہ
دودھ کی قیمت	״ ״	عہ
آسمان کی پری	״ ״	۲ر
سوزِ ناتمام	عاشق بٹالوی	عہ
تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبد الغفار	عہ
سیاہ کار اور دیگر افسانے	......	عہ
موج تبسم	شوکت تھانوی	عگ
سیلاب تبسم	״ ״	عگ
طوفان تبسم	״ ״	عگ
ریفلے تبسم	״ ״	عہ
محبت اور نفرت	اختر حسین رائے پوری	عہ
گناہ کی راتیں	ایم اسلم	عہ

کلیات و دواوین

نام کتاب	مصنف	قیمت
شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	عگ
حدیث ادب	احسان بن دانش	عہ
شعلہ و شبنم	جوش ملیح آبادی	ہے
جنون و حکمت	״ ״	ہے
نقش و نگار	״ ״	عگ
فکر و نشاط	״ ״	عسہ
قصائد عزیز	عزیز لکھنوی	ہے
گل کدہ	״ ״	عہ
گفتار بیخود	وحید الدین بیخود دہلوی	ہے
درِ شہوار بیخود	״ ״ ״	عگ
شاہنامۂ اسلام اول	حفیظ جالندھری	ہے
ایضاً طلباء ایڈیشن	״ ״	عگ
شاہنامۂ اسلام دوم	״ ״	ہے
سوز و ساز	״ ״	عگ
نغمۂ زار	״ ״	عہ
ہندوستان ہمارا	״ ״	عہ
دیوان حالی	حالی پانی پتی	۱۳ر
دیوان بیدم	بیدم وارثی	۸ر
باقیات فانی	فانی بدایونی	عہ
کلیات اکبر کامل	اکبر الہ آبادی	للعہ
کلیات مومن	حکیم مومن خاں مومن	عہ
نظم المعراج	......	۱۲ر
کلیات نظیر	نظیر اکبرآبادی	۱۲ر
کلیات سودا	سودا	ہے
کلیات میر تقی	میر تقی میر	عگ
کلیات آتش	آتش	عہ
کلیات ظفر	بہادر شاہ ظفر	عگ
کلیات نظم غالب (فارسی)	مرزا غالب	عہ
خمخانۂ عشق	امیر مینائی لکھنوی	عگ
دیوان میر درد	خواجہ میر درد	۱۲ر
کلیات امیر خسرو (فارسی)	امیر خسرو	عہ
کلیات شبلی (فارسی)	شبلی نعمانی	عہ
کلیات شبلی اردو	״	عہ
سرود زندگی	اصغر گونڈوی	عگ
دیوان غالب جرمن	غالب	۱۲ر

قصص مصنفہ علامہ راشد الخیری

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
حیات صالحہ	عہ	اللہ نہر ابر	عسر
صبح زندگی	عہ	امت کی بائی	۱۴ر
شام زندگی	عہ	نوبت پنج روزہ	عہ
شب زندگی حصہ اول	عہ	قلب حزیں	۸ر
״ ״ حصہ دوم	عہ	وداع خاتون	عہ
نوحۂ زندگی	۱۱ر	یاسمین کا ہوالیسیں	۱۴ر
طوفان حیات	عہ	ماہ عجم	۱۲ر
جوہر قدامت	عہ	عروس کربلا	عہ
مناظر السائرہ حصہ اول	عہ	یاسمین شام	عہ
تمغۂ شیطان	۱۲ر	محبوبۂ خداوند	۱۲ر
سات روحوں کے اعمالنامے	۸ر	شہنشاہ کا فیصلہ	۱۴ر
غدر کی ماری شہزادیاں	۱۲ر	منظر طرابلس	۵ر
ستونتی	۷ر	درِ شہوار	۸ر
موذدہ	۸ر	سودائے نقد	۵ر
تفسیر عصمت	۵ر	تیغ کمال	عہ
انگوٹھی کا راز	۶ر	اندلس کی شہزادی	۸ر
منازل ترقی	۱۴ر	عروس مشرق	۱۴ر
ولائتی نفی	۶ر	گرداب حیات	عہ
بچہ کا کرتہ	۱۴ر	بزم رفتگاں	۱۰ر
ویلیا کی سرگذشت	۱۴ر	گدڑی میں لال	عہ
چہار عالم	۱۴ر	سیاست ہند	عہ
بنت الوقت	۸ر	دادا لال بجھکڑ	۸ر
سراب مغرب	۸ر	بیکلری کا آخری دن	۱۴ر
فسانۂ سعید	۸ر	نالۂ زار	۱۲ر
جوہر عصمت	عہ	احکام نسواں	۱۲ر
سیلاب اشک	عہ	دعائیں	۸ر
طوفان اشک	عہ	دلی کی آخری بہار	عہ
شہد مغرب	عہ	داستان پارینہ	۱۲ر
نسوانی زندگی	۸ر	بلبل بہار	۱۰ر
نانی عشو	۱۰ر	مسلی ہوئی پتیاں	۶ر
روداد قفس	۱۰ر	چمنستان مغرب	عہ
گرفتار قفس	۱۴ر	حور اور انسان	۱۲ر
گلدستۂ عید	۸ر	بساط حیات	۶ر
آمنہ کا لال	عہ	نشیب و فراز	عہ
سیتا کا لال	عہ	لڑکیوں کی [illegible]	عہ

تصانیف مصور ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی

چمکی اپنی اس بے مثل تصنیف میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے عورت کی وفاداری کی وہ حیرت انگیز تصویر کھینچی ہے کہ پڑھنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ بڑی بی کا کردار اردو لٹریچر میں اپنی طرز کی پہلی چیز ہے۔ قیمت عہ

فرزند سرحد سرحدی افغانوں کے متعلق ایک عبرتناک افسانہ۔ غیرت، دیانت اور شرافت کا مرقع ہے۔ اس پر مصنف کا طرز بیان۔ قیمت پانچ آنے ۵ر

کولتار مضحکہ خیز اور پر اسرار ناول شروع وشنگ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور ایک عورت کی دردناک زندگی۔ قیمت دو روپے ۲ر

ویمپائر ایک شریف خاتون کی آبرو ریزی کا دردناک واقعہ۔ اور ایک عجیب اتفاق سے اس کا دلچسپ انجام۔ قیمت دو روپے ۲ر

ملفوظات ٹامی ایک کتے کی خود نوشت سوانح عمری اگر کتے کی زبان ہوتی تو وہ اپنے جذبات کس طرح ادا کرتا۔ قیمت ۱۲ر

شہزوری عورت کی شہزوری کی عبرت انگیز داستان جسے ملک کے سب سے بڑے مزاح نگار مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ظرافت کی چاشنی دیکر دو آتشہ بنادیا ہے۔ قیمت ۸ر

مرزا جنگلی لکھنؤ کے ایک مرزا جنگلی اور ان کے احباب کا ایک نہایت دلکش ڈرامہ۔ واجد علیشاہ کے زمانہ کے لکھنؤ کی ایک جھلک۔ قیمت ۶ر

شریر بیوی ایک خاتون کی معصوم شرارتیں اس قدر دلچسپ ہیں کہ کتاب چھوڑ نہیں سکتے ہیں چھ چار تصویریں اور رنگین سرورق عہ

کمزوری عورت کی کمزور فطرت کس طرح مرد کے بہکائے میں آجاتی ہے۔ ابتدائی حصہ ہنسانیوالا اور آخری حصہ رلانیوالا۔ قیمت ۲ر

چینی کی انگوٹھی پہلا حصہ مزاحیہ دوسرا حزنیہ انجام دیکھ کر مصنف کی غیر معمولی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ قیمت ۸ر

قدردان سرزمین ریف کے سات خطرناک مسلمانوں اور انکے جانباز بہنوئی کا حیرت خیز فسانہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ۵ر

فل بوٹ حسن و عشق کی عجیب و غریب داستان پلاٹ کے اعتبار سے مصنف کا بہترین ناول ہے۔ ایک جوتے کی وجہ سے کیا ہوا؟ قیمت عہ

تفویض ایک بی اے پاس خاتون کی شادی ایک مسجد کے ملا سے ہوجاتی ہے۔ کیسی گذرتی ہے انجام کار کیا ہوتا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت پانچ آنے ۵ر

خانم چغتائی صاحب کی تازہ ترین کتاب جس کا ایک ایک افسانہ ظرافت کی جان ہے۔ یہ مصنف کی بہترین تصنیف ہے۔ مجلد سنہری قیمت چار روپے للعہ

جنت کا بھوت پہلا افسانہ لاجواب قرار دیا گیا ہے عمر ایک بدشکل نوجوان اور اس کی حسین عزیزہ کی پر لطف داستان مارے ہنسی کے آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ قیمت ۱۲ر

دیکھا جائیگا عشق و ہوس میں امتحان کس طرح ہوا۔ ایک حسین مالدار لڑکی کے تین عاشقوں کی داستان، کامیابی کسے اور کیسے ہوئی؟ قیمت ایک روپیہ (صہ)

چغتائی کے افسانے مرزا صاحب کے اہم مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں۔ خواب بیداری۔ جنم قیدی۔ جہالت کمسپر۔ بڑے شرم کی بات۔ رستاکسی جاول نیکی جرم ہے۔ رنگروٹ کی بیوی بھاگ گئی۔ تیمارداری۔ تصاص۔ پار خود مختار دوشیزہ۔ زمبور۔ گرفٹ ییک شادی کی ضرورت۔ کیا کبھی تم پر بھی کوئی عاشق ہوا ہے؟۔ چنڈیل۔ فیل۔ فقیر نوجوان ڈاکٹر۔ سرسید بنام سانچی کا ٹوم انتہائے حقیقت۔ حقیقت نغمہ۔ ملاؤ ابے مرا کیوں جاتا ہے۔ سالنامہ مرمر بشنوئی۔ سٹیس۔ باپ وغیرہ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

قرآن اور پردہ آیات قرآنی کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ صحیح پردہ کیا ہے اور رسم کیا بن گیا ہے۔ قیمت عہ

حدیث اور پردہ صحیح احادیث کے حوالوں سے پردہ کی حقیقت بیان کیگئی ہے۔ قیمت

رقص و سرود مسلمان لڑکیوں کیلئے رقص و سرود کی تعلیم کسقدر ضروری ہے مذہبی رو سے اس کا جواز۔ قیمت

کھرپا بہادر

چغتائی صاحب نے اس ناول میں ایک عجیب و غریب قصہ پیش کیا ہے ایک بدمعاش لفنگے کی سرگذشت سے اس ناول کی ابتداء ہوتی ہے۔ روزانہ اس کے سر پر پولیس والوں کے جوتے پڑتے ہیں اور کئی دفعہ سزا بھی پاتا ہے۔ اس بدمعاش کی شادی ایک نواب صاحب نے ضد میں آکر اپنی چہیتی اور چہیتی لاڈلی بیٹی سے زبردستی کردی۔ اور اسے کھرپا بہادر کا خطاب دیا۔ اس بدمعاش پر شاہی محلات میں جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ الف لیلیٰ کے سوتے جاگتے (ابوالحسن) کے قصے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی ناول میں ریاست لنگران کے ساتھ ساتھ ریاست کفتیرہ کے عبرتناک واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک بیگم پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں یہاں تک کہ اسے کوا ہکنی بنا دیا جاتا ہے۔ محلات کی جگمگاتی فضا میں آپ عجیب عجیب رنگینیاں دیکھیں گے کہیں ہنسی اور کہیں قہقہے کہیں آنسو اور کہیں خون کی بوندیں "کھرپا بہادر" کو پڑھکر آپ "شہرہ کے دربار حرام پور" کو بھول جائینگے۔ تقریباً تین سو نہایت لطیف صفحات کی کتاب ہے اور قیمت (عہ) علاوہ محصول ڈاک

قرض مقراض محبت است اس مقولے پر مصنف نے نئے انداز سے افسانہ لکھا ہے قرض دینے اور قرض لینے کی خرابیوں کو اسقدر پر لطف پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ بیساختہ ہنسی آتی ہے۔ ۵ر

روح ظرافت "انگوٹھی کی مصیبت" اور دیگر مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہر افسانہ ظرافت کی روح ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت عہ

خطوط کی ستم ظریفی مصنف نے یہ افسانہ اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے پلاٹ عجیب و غریب ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں یہ صرف کتاب نہیں ہنسنے ہنسانے کا مستقل ذریعہ ہے ۱۲ر

روح لطافت "مہارانی کا خواب" اور دیگر افسانے جن کو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائینگے

انگریزی سکھانے والی بینظیر اور سستی کتابیں

مخزن الفوائد

اس میں اردو تمام عبارت کو انگریزی میں لکھنے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے انگریزی چٹھی لکھنے ہجے کرنے اور تلفظ کے قاعدے انگریزی بول چال کے کئی سو فقرے ایک ہزار کے قریب اردو فقرے قاعدوں کے ساتھ اور تیس ہزار کتابیا انگریزی میں ترجمہ کرنے کیلئے درج ہیں اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ایسا مبتدی جو انگریزی کا سے واقف نہیں ہے قلیل عرصہ میں خاصی تعداد حاصل کرسکتا ہے۔ قیمت ۶ر علاوہ محصول۔

انگریزی اردو خط وکتابت

ہر قسم کی چٹھیاں عرضیاں نوٹس اور ہر قسم کی تحریروں کے قاعدے اور نمونے معہ ترجمہ اردو۔ قیمت ۳ر

اردو انگریزی ڈکشنری

سات ہزار پانسو ایسے اردو لغت جو اکثر تحریر و تقریر میں آتے ہیں بترتیب حروف تہجی اردو خط میں ہیں ان کے آگے ان کی انگریزی انگریزی خط میں ہے۔ قیمت ۷ر

انگریزی بولنا

تین ہزار بول چال کے فقرے معتبر معہ اردو مخزن الفوائد کے تمام اردو جملوں کا ترجمہ ۶ر

مخزن الحکایات

یعنی ۲۰ انگریزی کہانیاں معہ اردو معنی وتلفظ درج ہیں۔ قیمت ۵ر

ہادی الترکیب

اس میں انگریزی ڈکٹیشن کیلئے انگریزی بے پڑھوں کیلئے لفظوں کے صحیح ہجے اور تلفظ اور پارسنگ کے تمام قاعدے ابتدا سے انتہا تک بہت سہل انداز بیان میں سمجھائے گئے ہیں۔ قیمت ۶ر

انگریزی خوشنویسی قیمت ار

ضمیمہ مخزن الفوائد

اس کتاب میں علاوہ ترجمہ کے ۳۴ قاعدے اور سمجھائے گئے ہیں اور ترجمہ کے واسطے ایک ہزار فقرے اور بہت سی عبارت بھی درج کی گئی ہے۔ ۶ر

خلاصۃ القواعد

مبتدی کو پارسنگ کرنا اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا بخوبی سمجھایا گیا ہے قیمت ۵ر

مخزن المحاورات

اس میں ایک ہزار دو سو انگریزی محاورے اور چھ سو چالیس معتبر ترجمہ اردو اور انگریزی حروف اور تین چار ہزار کے قریب ایسے ناموں اور چیزوں کی انگریزی جن سے کام پڑتا ہے قیمت ۶ر

نیومینوئل گرامر کا اردو ترجمہ

پہلا جزو اس میں تمام آرتھاگرافی اور ایٹی مولوجی و غیرہ کا ترجمہ نہایت حسن وخوبی کیساتھ درج ہے۔ ۵ر

نیومینوئل گرامر کا دوسرا جزو

اس میں تمام سنٹیکس کے قاعدوں نوٹوں مثالوں اور پارس اور گرگٹ کے فقروں کا ترجمہ ہے اور تمام گرگٹ کے فقروں کو گرگٹ یعنی صحیح کرکے بھی لکھا ہے۔ ۷ر

شرطیہ ڈھائی مہینہ میں انگریزی آجائے گی

اگر آپ مومن صاحب کی انگلش ٹیچر کا ایک سبق روزانہ سمجھ کر پڑھ لیں گے تو کبھی استاد کی ضرورت نہیں پڑے گی صرف ایک گھنٹہ روزانہ کی محنت میں آپ بہتر سے بہتر انگریزی بول سکتے ہیں اور لکھ سکتے ہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جو دو سال میں تیس ہزار فروخت ہوگئی ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ محصول ۶ر

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ علم وادب جامع مسجد دہلی

کامل القواعد

اس میں صرف ونحو کے تمام وکمال قاعدے جو ترجمہ کرنے اور انشاپردازی سے متعلق ہیں نہایت وضاحت سے درج ہیں۔ ۱۶ اعلیٰ درجہ کی مستند انگریزی گرامروں کا لب لباب ہے۔ قیمت ۱۰ر

ضمیمہ مخزن المحاورات

اس کتاب میں مخزن المحاورات کے علاوہ ڈھائی ہزار محاورے اور آٹھ سو مخصوص پریپوزیشنوں کے استعمال کے انگریزی فقرے معہ ترجمہ اردو درج کئے گئے ہیں قیمت صرف چھ آنے ۶ر

تصانیف مولوی عبد الحلیم شرر

- فلورا فلورنڈا قسم اعلیٰ مجلد عہ
- قیس و لبنیٰ عہ
- یوسف و نجمہ ۱۲ر
- دلکش کامل ۸ر
- دلچسپ کامل ۸ر
- فردوس بریں ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۸ر
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- حسن بن صباح ۴ر
- شہید وفا
- میوۂ تلخ
- طاہرہ

تصانیف شوکت تھانوی

- موج تبسم
- سیلاب تبسم
- طوفان تبسم
- دنیائے تبسم (نئی تصنیف)
- سودیشی ریل
- کہرستان

مولوی عنایت اللہ

- سلامبو ۶ر
- نجم السحر
- تائیس
- ہیرودیاس
- ہملٹ
- چنگیز خاں کی سوانح حیات
- دانتے کا جہنم
- خواب پریشان
- قلوپطرہ (زیر طبع)
- داسیلاس (")

ایم اسلم

- مہدی
- مرزا جی
- فاطمہ کی آپ بیتی
- نرگس ۱۲ر
- طلسم سامری
- گناہ کی راتیں ۱۲ر
- چار سہیلیاں ۱۲ر
- بڑی بی ۴ر
- غزال
- شیطان کا چرچہ

تصانیف منشی پریم چند

- بازار حسن حصہ اول ۶ر
- " " " دوم
- میدان عمل
- پردہ مجاز حصہ اول
- " " " دوم
- غبن حصہ اول
- " " دوم
- چوگان ہستی حصہ اول ۱۲ر
- " " دوم ۱۰ر
- گوشہ عافیت حصہ اول ۴ر
- گوشہ عافیت حصہ دوم
- واردات
- نادواہ
- دودھ کی قیمت
- آسمان کی پری
- پریم پچیسی حصہ اول
- " " " دوم
- پریم بتیسی حصہ اول
- " " " دوم
- فردوس خیال
- نجات

جرعات

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے جس میں اسکے تمام خاص نمبروں کی قیمت بھی شامل ہے

ساقی میں اردو کے بہترین انشا پردازوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں اسکا معمولی پرچہ بھی تقریباً سو صفحے کا ہوتا ہے

جلد ۱۷ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ مئی ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

۲۱ اپریل کی منحوس صبح نے یہ غمناک خبر سُنائی کہ علامہ اقبال ہم سے چھین لئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی بے وقت موت پر جتنے بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ اُنکی جدائی کا صدمہ ہمیں اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمیں اس وقت اُن کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ع۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اقبال جیسا فلسفی، اقبال جیسا شاعر، اقبال جیسا قوم پرست، اقبال جیسا مسلمان صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسے عالم باعمل کی موت پر ع۔

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھکو

لیکن جو موت کے چنگل میں پھنس کر بھی یہ کہے کہ "مجھے موت کا ڈر نہیں ہے کیونکہ میں مسلمان ہوں" اُس کی موت بھی حیاتِ تازہ ہے۔ کیسی لائقِ رشک موت جس پر ہزاروں زندگیاں قربان۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

"شاھد"

اقبال کی سُنائی سنکر

کیا پوچھتے ہو حال مسلمانونکا　　دل ہو گیا پامال مسلمانوں کا
اسلام غریب ہائے اسلام غریب　　رخصت ہوا اقبال مسلمانوں کا

میرزا یگانہ لکھنوی

(بسلسلۂ ماسبق نمبر ۶)

دَورِ حاضر اور اُردو غزلگوئی

غزل کی "تنگ دامانی"

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے — غالب

کچھ جو ہیں دل کے قاش فروش کاش کچھ اور قافیے ہوتے — مولنٰا محمد علی جوہر مرحوم

رگھوپتی سہائے صاحب، فراق، ایم۔ اے۔ گورکھپوری کے اس دعوے کے باوجود کہ "تنگنائے غزل میں نامحدود وسعتیں ہیں" غزل کی "تنگ دامانی" سے انکار ممکن نہیں۔ فراق صاحب کو چونکہ غزل بہت محبوب ہے لہذا اُسکے مُسلّمہ عیوب بھی انہیں محاسن ہی نظر آتے ہیں، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، نہ اس پر کسی کو اعتراض کی ضرورت ہے۔ رہ گیا نقاد، تو ظاہر ہے کہ وہ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ لیلیٰ اگر واقعی کالی ہے تو نقاد یہ کہنے پر مجبور ہے کہ لیلیٰ کالی ہے۔

غزل کی اس "تنگدامانی" کی ذمہ دار خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں ہیں:۔

(۱) ہر مضمون کے لئے صرف دو مصرعوں کا قالب۔

(۲) قافیہ و ردیف۔

ان قیود کے ہوتے ہوئے غزل میں وسعتوں کا وجود اس وقت تک قابلِ تسلیم نہیں جب تک اُسے عمرو عیار کی کراماتی زنبیل نہ مان لیا جائے۔ فراق صاحب نے یہ ثابت کرنے کی بہت کوشش کی ہے کہ غزل کا ایک شعر، بشرطیکہ وہ ایک کامیاب شعر ہو، سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتا ہے ہمیں بھی فراق صاحب کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ظرفِ غزل میں اتنی وسعتیں موجود ہیں جتنی ایک بلند پرواز شاعر کے تخیل کے لئے درکار ہیں۔ غالب اور جوہر نے مندرجِ صدر اشعار میں غزل کی اسی کوتاہی کا شکوہ کیا ہے۔

غزل گو شاعر اس بات پر مجبور ہے کہ اُسے جو کچھ کہنا ہے دو مصرعوں میں کہدے۔ ظاہر ہے کہ بعض مضامین مختصر ہونے کے باوجود بھی کسی طرح دو مصرعوں میں نہیں سما سکتے لیکن شاعر بیچارے کے پاس جو سانچا ہے اس میں دو ہی مصرعوں کی گنجائش ہے۔ ناچار وہ ہر مضمون کو کھینچ تان کر، توڑ مروڑ کر، کاٹ چھانٹ کر، جس طرح بھی ممکن ہوتا ہے انہیں دو مصرعوں میں ٹھونس دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون کے بعض حصے بیان ہو جاتے ہیں، بعض رہ جاتے ہیں۔ اگر چھوٹ جانے والے حصے مقتضائے حال اور قرینے سے سمجھ میں آ گئے تو خیر، ورنہ شعر مہمل ہو گیا اور بالفرض مہمل نہ بھی ہو تو پورے طور پر بیان نہ ہو سکنے کی وجہ سے مضمون کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔ مرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے:۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

علامہ نظمؔ طباطبائی مرحوم نے اس شعر کی شرح اس طرح کی ہے :-

"تجھ سے تو مجھے کچھ شکایت نہیں، لیکن نامہ بر کو میرا سلام شکایت آمیز پہونچا دینا"

اور مولانا حسرتؔ موہانی اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ :-

"نامہ بر سے میرا سلام کہیو۔ یعنی بطور طعن کے، کہ واہ کیا خوب ہمارا کام کیا"

اِن دونوں بزرگوں نے شعر کا وہی مطلب بیان کیا ہے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن مرزا غالبؔ اگر شارحین کی زبان سے اپنے اس معرکۃ الآرا شعر کا یہ مختصر مطلب سنتے تو یقیناً اپنا سر پیٹ لیتے اور اپنے کلام کی ایسی ناقص شرحوں کو سوختنی قرار دیتے۔ اب سنیئے کہ وہ خود کیا کہتے ہیں :-

"یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی لیکن کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اُس نے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کریگا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھکر والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، کیسا جواب، دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ، جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر۔ اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں، لیکن اگر نامہ بر کہیں ملے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہونے کے کرگئے تھے اور انجام کار کیا ہوا"[1]

فراقؔ صاحب ہوں یا کوئی دوسرے صاحب، اگر الفاظ کی مدد سے غالبؔ کے اس شعر کا مطلب بیان کرنا چاہیں گے تو قریب قریب وہی کہیں گے جو نظمؔ اور حسرتؔ نے کہا۔ لیکن غالبؔ کی اپنی تشریح سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا بیان کیا ہوا مطلب بالکل ناقص ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نقص کا ذمہ دار کون ہے؟ شارحین کا قصورِ فہم یا مرزا غالبؔ کا اندازِ بیان؟ ہمارے نزدیک شارحین کا قصور ہے نہ مرزا غالبؔ کا بلکہ اس ساری خرابی کا سبب خود غزل کی وضع اور اُس کے ظرف کی تنگی ہے۔ آخر اتنا بڑا مضمون دو مصرعوں میں کیسے سماتا۔

دوستوں کی ایک مخصوص صحبت میں دورِ حاضر کے ایک نامور غزل گو شاعر نے اپنی ایک معرکہ کی غزل سُنائی۔ جب وہ اس شعر پر پہونچے :-

غم سے دل خون ہوا اور آنکھ میں صہبائے نشاط | یہ کہیں میرے ہی تخئیل کی پرواز نہ ہو

تو بعض سامعین پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور تحسین و آفریں کے شور سے فضا گونج اُٹھی۔ میں حیرت سے سب کا مُنہ تک رہا تھا۔ اور اپنی کوتاہ فہمی پر بیحد متاسف تھا کیونکہ اس شعر کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاعر صاحب جو کسی وجہ سے مجھے سخن فہم سمجھتے تھے، میرے سکوت سے آزردہ ہو کر فرمانے لگے کہ شاید آپ کو یہ شعر پسند نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی شعر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو جب تک اُس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آئے مجھے پسند نہیں آتا۔ میں تو ابھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس کا مطلب کیا ہے خصوصاً دوسرے

---

[1] سنہ ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے جو دیوانِ غالبؔ شائع ہوا تھا اُس میں مرزا غالبؔ کے ایک خط کا فوٹو بھی شامل ہے۔ یہ عبارت اُسی خط سے نقل کی گئی ہے۔ شاداںی

مصرع میں "یہ" سے کیا مراد ہے؟ شکر ہے کہ اُنہوں نے میرے قول کو باور کیا اور فرمایا کہ ہاں اس شعر میں ذرا سی گنجلک ضرور ہے۔ چونکہ اس کا تعلق ایک واقعہ سے ہے اسلئے اس کا جاننا لازمی ہے ورنہ پورا لطف نہیں آسکتا۔

واقعہ یوں ہے کہ کسی وجہ سے شاعر کو یقین ہو گیا ہے کہ اُس کی محبوبہ زلیخا وار اس کی پرستار ہے لیکن درمیان میں مشکلات کے سر بفلک پہاڑ حائل ہیں۔ ملاقات ممکن نہیں۔ اندوہِ جدائی نے اُس کے نازک دل کا خون کر دیا ہے۔ ایک دفعہ شاعر نے اُسے دیکھا اور قریب سے دیکھا۔ محبوبہ کی آنکھیں جوشِ نشاط سے چمک رہی تھیں۔ تبسم پیہم مسرتِ قلبی کا آئینہ دار تھا، چہرہ پر شادمانی کے ہر گونہ آثار موجود تھے۔ یہ عالم دیکھکر شاعر کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کاہشِ فراق نے اس کی محبوبہ کو غم کا پتلا بنا دیا ہوگا۔ آنکھوں سے اندوہ و ملال ٹپکتا ہوگا۔ چہرے سے یاس برستی ہوگی۔ مگر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اب اُسے خیال آیا کہ شاید میں خود فریبی میں مُبتلا ہوں۔ شاید یہ محض میرے تخیل کی کار فرمائی ہے کہ میں اپنی محبوبہ کو اپنا والہ و شیدا تصوّر کرتا ہوں اور یہ فرض کر لیا ہے کہ جس طرح اندوہِ فراق نے میری جان پر بنادی ہے، اسی طرح اُسے بھی خون در جگر کر رکھا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہوتا یعنی غمِ اُلفت نے اُسے اس درجہ ستایا ہوتا جتنا میں سمجھ رہا ہوں تو چہرہ پر اس قدر خوشی کے آثار کا پایا جانا ناممکن تھا۔ دوسرے مصرع میں "یہ" سے شاعر کا یہ مفروضہ مُراد ہے کہ "میری محبوبہ بھی مجھے بے طرح چاہتی ہے اور غمِ اُلفت سے اُس کا بھی دل خون ہو گیا ہے"۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی ان تمام واقعات سے آگاہ نہ ہو تو اُس کے لئے محض شعر کے الفاظ سے اس مفہوم کا سمجھنا قطعاً ناممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر نے بڑی محنت سے شعر کو مُرتب کیا ہے لیکن دو مصرعوں میں آخر اتنا ہی مضمون تو سما سکتا ہے جتنی اُن میں گنجائش ہے۔ مضمون کے بعض حصّے چھوٹ جانے کی بنا پر شعر ایک چیستاں بنکر رہ گیا۔ لیکن یہ شاعر کا قصور نہیں۔ ایک اُسی پر کیا منحصر ہے "بادشاہِ متغزلین" یا خود جناب فراق بھی چاہیں تو دو مصرعوں کے محدود پیمانے میں اس سے زیادہ مضمون کسی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ بخوفِ طوالت صرف ان دونوں مثالوں پر اکتفا کی گئی ورنہ ہر "استاد" اور "چوٹی کے غزلگو" کے یہاں ایسے اشعار کافی تعداد میں موجود ہیں جو یا تو سر سے سے مہمل ہیں یا مضمون پورے طور پر ادا نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے اُس کا سارا حسن اور لطف خاک میں مل گیا۔

تعجب ہے کہ اتنی موٹی بات حامیانِ غزل کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب سب کچھ انہیں دو ہی مصرعوں میں کہنا ہے تو غزل میں ہر چھوٹے بڑے خیال کو وہ کس طرح پیش کر سکتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک نہایت لطیف مضمون غزلگو شاعر کے ذہن میں آتا ہے لیکن جب وہ غزل کے ایک شعر میں اُسے نظم کرنا چاہتا ہے تو ممکن نہیں ہوتا۔ دو مصرعوں کا لباسِ کوتاہ مضمون کے قامتِ بلند پر ٹھیک نہیں آتا۔ ناچار وہ اُس سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ اس طرح غزل اپنی وضع اور ساخت کی بنا پر بہت سے خوبصورت مضامین سے محروم رہ جاتی ہے۔ ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ غزل کا یہ عیب اتنا بڑا ہے کہ اُس کے تمام محاسن سے چشم پوشی کر کے اُسے مردود قرار دیا جائے۔ غزل بلا شُبہ ایک جمیل صنفِ سخن ہے مگر اُس کے ظرف کی تنگی سے انکار ممکن نہیں۔ اس کی مثال ٹھیک ایک خوبصورت عورت کی سی ہے جس کے بال بہت چھوٹے ہوں۔ یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوبصورت نہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اُس کے بال بہت چھوٹے ہیں۔

الغرض غزل کی وضع نے جو تنگیاں اس میں پیدا کر دی ہیں اس کا اثر تین شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) بعض مضامین کا لطف اور حسن فنا ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض اشعار مہمل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(۳) بعض خوبصورت مضامین ترک کر دئے جاتے ہیں۔

غزل کی تنگ دامانی کا دوسرا سبب قافیہ اور ردیف ہے۔ اس سلسلہ میں بھی فراق صاحب نے بہت سی غیر متعلق اور مغالطہ انگیز باتیں کہی ہیں۔ مثلاً وہ نقاد پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"غزل کیلئے قافیہ و ردیف کو غلط اور غیر فطری بتانا اور خاقانی کے قصائد اور فردوسی کی مثنوی، عمر خیام کی رباعیوں اور نظم گو شعرا کے مسدس، قطعات اور منظومات میں ردیف و قافیہ کو صحیح سمجھنا عجیب بات ہے"

قافیہ و ردیف سے بحث کرتے ہوئے غزل اور مثنوی کا مقابلہ کرنا اور دونوں میں قافیہ و ردیف کی قیود کی اہمیت اور دشواریوں کو مساوی قرار دینا بہت ہی عامیانہ بات ہے۔ اول تو مثنوی کے ہر شعر میں ردیف کا ہونا لازمی نہیں۔ صرف قافیہ ہی سے کام چل جاتا ہے اس کے علاوہ مثنوی کے قافیہ میں بھی غزل کی سی پابندی نہیں۔ ہر شعر کا قافیہ علیحدہ ہوتا ہے۔ شاعر کو اختیار ہے کہ مضمون کی مناسبت سے جو قافیہ چاہے اختیار کرے۔ اس بنا پر اس کے قافیوں کا ذخیرہ غیر محدود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غزل گو شاعر جس زمین میں غزل لکھ رہا ہے اُسی زمین کے مقررہ، اور مخصوص و محدود قافیوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً اگر غزل کے لئے یہ مصرع طرح تجویز کیا جائے کہ:-

کیا خوب ہے کلام جناب فراق کا

اور لفظ فراق کو قافیہ قرار دیں تو غزل گو مجبور ہے کہ فراق، ایاق، بُراق، طلاق، چاق، مراق وغیرہ قوافی اختیار کرے، اب جو مضامین ان الفاظ میں بیان کئے جا سکتے ہیں وہ بیان ہو جائیں گے۔ باقی رہ جائیں گے۔ اس طرح گویا غزل گو شاعر قافیہ کا غلام ہے۔

رباعی میں بھی شاعر کو اختیار ہے کہ اپنا مفہوم ادا کرنے کیلئے تین یا چار قافیے اپنی پسند، ضرورت اور سہولت کے مطابق انتخاب کرلے۔ مسدس میں بھی ہر بند کے لئے صرف چار ہم قافیہ لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے یہاں بھی شاعر کو انتخاب کا اختیار حاصل ہے۔ مضمون جس قافیہ کو چاہتا ہے وہی قافیہ شاعر اختیار کرتا ہے۔ لیکن غزل میں اس کا امکان نہیں۔ ضرورت ہو "وصال" کی مگر درپیش ہو "فراق"، شاعر بیچارہ کرے تو کیا کرے۔ یا تو "وصال" سے درگذرے یا پھر وصال کو فراق میں تبدیل کر دے۔

غزل کے اشعار قافیہ و ردیف کی قیود سے دو طرح متاثر ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ مثلاً آپ نے کسی خاص زمین میں غزل لکھنا شروع کی اور چند شعر لکھنے کے بعد کوئی نہایت خوبصورت مضمون آپ کو سوجھا مگر موجودہ قافیوں میں اُس کا ادا ہونا ممکن نہیں تو آپ چار و ناچار اس خیال کو چھوڑ دیتے ہیں اور نظم نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ اس خیال کو بالکل ترک نہیں کر دیتے تو قطع و برید کر کے اپنے موجودہ سانچے میں اُسے ڈھال دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کا اصلی حسن ایک بڑی حد تک تباہ ہو جاتا ہے۔ ہر "اُستاد" اور "چوٹی کے غزل گو" کے یہاں اس قسم کی مثالیں مل جائیں گی جہاں قافیہ اور ردیف کی مجبوری نے

شعر کو خراب کر دیا۔ ہم صرف "بادشاہِ متغزلین" کے کلام سے بعض نمونے پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے موجودہ بحث کے لئے فراق صاحب کی خاطر انہیں کو معیار قرار دیا ہے:۔

حسرت:
ہم نے کس دن ترے کوچے میں گذارا نہ کیا　　تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

"گذارا کرنا" اردو کا ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنی ہیں تنگی یا ترشی سے زندگی بسر کرنا وغیرہ۔ مگر مولانا صاحب نے اس شعر میں "گذارا نہ کیا" بمعنی "نہیں گذرے" استعمال کیا ہے جو یقیناً غلط ہے اس کے بجائے "گذر نہ کیا" چاہئے تھا لیکن مولانا صاحب بیچارے کا کیا قصور جب قافیہ "ہمارا" "دوبارہ" اور "نظارہ" وغیرہ ٹھہرانا تھا۔ "گذر" کو "گذارا" بنانا پڑا۔[1]

حسرت
جان کیا چیز ہے رکھیں گے جسے تم سے عزیز　　ہو نہ باور تو کسی دن ہمیں فرما دیکھو

"فرما دیکھو" کی ترکیب جس قدر لغو ہے محتاج بیان نہیں ایک طرف معشوق کا یہ احترام کہ اس کے لئے "فرمانا" استعمال کیا گیا اور دوسری طرف "تم" سے خطاب۔ پھر "فرما" کے ساتھ "دیکھو" کا جوڑ اور بھی پر لطف ہے۔ لسے "شتر گربہ" کے بجائے "موش و گربہ" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس غزل کے قافیے ہیں تماشا، جلوہ، دیکھا وغیرہ۔ لہذا بیچارے شاعر کو قافیہ کی خاطر "فرما" کا بیجوڑ پیوند لگانا پڑا۔

حسرت
واں سے ناکام پھرے ہم تو دریاں تلک　　خون حرماں دلِ مجروح سے جاری آیا

"جاری آنا" اردو روزمرہ کے بالکل خلاف ہے۔ یہاں "جاری" بمعنی مسلسل، متواتر، پیہم، برابر، استعمال ہوا ہے جو یقیناً غلط ہے۔ مگر یہ اس قسم کی غلطی ہے جو ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ مجبوری کی گئی ہے۔ اس لئے کہ "ہماری" اور "یاری" کا قافیہ "جاری" ہی ہو سکتا ہے "مسلسل" یا "متواتر" سے یہ کام نہیں چل سکتا۔

حسرت
اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو　　دامنِ جاں میں دم لے لیجئے سارے آنسو

مصرع ثانی میں لفظ "سارے" بجائے "سب" استعمال ہوا ہے اور محض قافیہ کی مجبوری سے ایسا کیا گیا ہے ورنہ "سب" اور "سارے" کے معنی میں جو فرق ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عوام الناس میں بعض اوقات "سب" کی جگہ "سارے" استعمال کرتے ہیں مگر اس کا سبب انکی ناواقفیت ہے۔ "سب" کا اطلاق مجموعۂ افراد پر ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

سب لوگ، جدھر وہ ہیں، ادھر دیکھ رہے ہیں　　ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور "سارے" کا اطلاق فردِ واحد کے کُل پر ہوتا ہے۔ جیسے:۔

مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا۔ یا۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ممکن ہے کوئی صاحب بادشاہِ متغزلین کی تائید میں کسی دوسرے "استاد" کا شعر تلاش کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں مگر یہ زحمت بالکل غیر ضروری ہے اس لئے کہ جس استاد نے بھی "سارا" بمعنی "سب" استعمال کیا ہے بضرورت قافیہ ہی کیا ہے ورنہ کسی مستند ادیب کے یہاں نثر میں "سارا" بمعنی "سب" آپ کو نہ ملیگا۔ اور اگر اتفاق سے مل بھی جائے تو اُسے لکھنے والے کی غفلت یا سہو القلم پر محمول کرنا

---

[1] گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش　　کرنا تھا جواں مرد گذارا کوئی دن اور۔ غالب
مصحفی نے البتہ گذارہ ہونا بمعنی گذرنا باندھا ہے لیکن وہ مصحفی کے زمانہ کی زبان ہے۔ بیسویں صدی کی زبان نہیں۔ گذارہ کرنا بمعنی گذرنا مصحفی کے ہاں بھی نہ ملیگا۔

چاہیئے۔ اُسے صحیح سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے "مشکور" کو بمعنی "ممنون" صحیح سمجھنا محض اس بنا پر کہ مولانا شبلی نے اس معنی میں استعمال کیا ہے۔

حسرت:- نوجوانی تھی کوئی شیدا نہ تھا میرے سوا ایک حُسنِ یار کا وہ بھی زمانہ ہو گیا

"وہ بھی زمانہ ہو گیا": ماشاء اللہ کیا زبان ہے۔ کیوں نہ ہو آخر "بادشاہِ متغزلین" ہیں۔ شاید اپنی اسی زبان کی شان میں آپنے فرمایا ہے کہ:-

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

حسرت صاحب کی بدولت شاعری کا نام روشن ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر زبان کے گلے پر کُند چُھری ضرور چل گئی۔ "ہو گیا" کا یہاں کوئی محل نہیں۔ اس کے بجائے (ایک حسنِ یار کا وہ بھی زمانہ) "تھا" یا "رہ چکا ہے" چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس غلطی کا ارتکاب بھی ردیف کی مجبوری نے کرایا ہے۔

حسرت: وہ ایک بار جو سونگھی تھی زلفِ یار کی بو سو روح آج تلک تر دماغ باقی ہے

مصرع ثانی میں "باقی" بالکل غیر ضروری ہے مگر اسے کہاں پھینکا جائے اسلئے کہ یہ تو ردیف کا ایک حصّہ ہے۔

حسرت:- اب رونے سے کیا ہو گا پروانہ ہے بے پروا برباد ہے سب محنت اے شمع لگن تیری

"لگن" کی مطلق کوئی ضرورت نہ تھی مگر مجبوری یہ ہے کہ دہن دسخن کا ہم قافیہ بنانے کے لئے فقط "شمع" سے کام نہیں چلتا لہٰذا "لگن" کا دُم چھلا اس میں لگا دیا۔

حسرت:- زندگی ایسی ہو کے اُن سے جُدا سخت گذرے گی اب اگر گذرے

اس قسم کے شرطیہ جملوں میں پہلا فعل یا تو ماضی ہونا چاہیئے یا مستقبل۔ مضارع صحیح نہیں۔ یعنی نثر میں یوں کہنا چاہیئے کہ "اب اگر گذری تو سخت گذرے گی" یا "اب اگر گذرے گی تو سخت گذرے گی"۔ مگر کیا کیا جائے کہ اس غزل کی ردیف "گذرے" ہے لہٰذا "گذرے" ہی باندھنا پڑا۔ قواعدِ زبان کی خلاف ورزی ہو گئی بلا سے۔

حسرت:- پوچھو جو کرو گے تم ہمیں قتل کہتے ہیں وہ کس ادا سے ہاں ہم

اس شعر میں ردیف "ہم" نے جو مزہ دیا ہے اس کا حال فراق صاحب سے کوئی پوچھے۔

دیوانِ حسرت میں آپ کو اس قسم کے اشعار بکثرت ملیں گے جن میں قافیہ، یا ردیف، یا دونوں کی مجبوری سے شعر میں کسی نہ کسی قسم کی خامی پیدا ہو گئی ہے۔ لگے ہاتھوں ہم دوسرے "اساتذہ" کے کلام سے بھی چند مثالیں اس قسم کی پیش کئے دیتے ہیں تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ رہے۔

فانی:- ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر صیّاد نہ توڑ دل کہ امانت ہے آشیانے کی

"بلبل" کا دل اگر امانت ہو سکتا ہے تو "گل" کی۔ دل کا آشیانے کی امانت ہونا کیا معنی۔ شاعر بھی اس حقیقت سے نا آشنا نہیں مگر بیچارہ کیا کرے کہ قافیہ فسانہ اور زمانہ ہے۔ ناچار "امانت ہے گل کی" کہنے کے بجائے "امانت ہے آشیانہ کی" کہنا پڑا۔

اصغر شائستہ صحبت کوئی اُن میں نہیں اصغر کافر نہیں دیکھے کہ مسلمان نہیں دیکھا

سیاقِ کلام اس کا مقتضی ہے کہ جب "کافر نہیں دیکھے" بصیغۂ جمع استعمال کیا گیا ہے تو اس کے مقابل کا ٹکڑا "مسلمان نہیں

دیکھیے: ہونا چاہیئے، مگر یہاں بھی وہی مشکل درپیش ہے کہ ردیف بصیغہ واحد (دیکھیا) واقع ہوئی ہے لہذا "آدھا تیتر، آدھا بٹیر" والا معاملہ کرنا پڑا۔

جگر:-
طلبِ خلد نہیں آرزوئے حور نہیں　　　تم جو ملجاؤ تو پھر کچھ مجھے منظور نہیں

سننے والا حیران رہ جاتا ہے کہ "منظور نہیں" کہنے کا یہاں کیا محل ہے۔ اس کی جگہ "درکار نہیں" ہونا چاہیئے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اس محل پر "منظور" غلط اور "درکار" صحیح ہے مگر "درکار" "تو" "حور" کا ہمقافیہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے مجبوراً شاعر نے منظور لکھدیا۔ آخر تُک ملانا بھی تو شاعر کا ایک اہم فرض ہے۔ فقط مطلب پر نظر رکھنے سے غزل نہیں کہی جا سکتی۔

قافیہ و ردیف کی بحث کے سلسلہ میں ہم قارئین کو یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ فراق صاحب نے "بادشاہِ متغزلین" نے جہاں نقالی کی اور تمام شرائط پوری کی ہیں وہاں الف سے لیکر "ی" تک ہر ردیف میں غزل کہکر اپنی "استادی" یا نقالی کا پورا پورا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ بعض ردیفوں کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

"(اقرار) صالح۔ (آشنائے) تیغ۔ (اسباب) کا نرخ۔ (اطاعت) کے لذائذ۔ (نمونہ) کاغذ۔ (خطر) فرش۔ (الہام) کی حرص۔ (اطاعت) نہیں ہے فرض۔ (اوتاد) سے فیض (آسمان) کی احتیاط۔ (انحصار) کی شرط۔ (بخدا) حظ۔ (اہلِ عصیاں) الوداع۔ (آثار) پہ موقوف (اشتیاق) میں فرق۔ وغیرہ۔

اس قسم کی بے تکی ردیفوں میں جس پایہ کے شعر کہے جاسکتے ہیں ظاہر ہے۔ "بادشاہِ متغزلین" نے قافیہ پیمائی کی جو داد دی ہے اور اس قسم کی ردیفوں میں اشعار لکھکر کمالِ فن کا جو اظہار کیا ہے اُس کا مختصر سا نمونہ بھی پیش نہ کرنا بڑی بے انصافی ہے اس لئے ہم قارئین کے لطفِ خاطر کیلئے چند شعر پیش کرتے ہیں:-

حسرت:-
فرقت میں تیری ہیچ ہے شانِ شب برات　　　اک آگ سی لگی ہے بجانِ شبِ برات

"
قبولِ ستم سے ہے انکار صالح　　　کروں کیوں نہ میں آج اقرار صالح

کچھ نہ ابدال سے پہونچا ہے نہ اوتاد سے فیض　　　جس کو پہونچا ہے سو پہونچا ہے تری یاد سے فیض

کیوں نہ ہو اپنے اشتیاق میں فرق　　　آگیا آپ کے مذاق میں فرق

حسن بیتاب ہے محدود نہیں دو چار کے بیچ　　　مری گفتار کے اندر تری رفتار کے بیچ

اب کہے کوئی کہ ہم اہلِ نظر جائیں کہاں　　　ہر طرف مسئلہ غضِ بصر ہے درپیش

فتنہ مجبور نہ کرنا مجھے ان کا یارب　　　جنکو گمراہ کیا تو نے کہ مغضوب کیا

(غیر المغضوب علیہم ولا الضالین-)

اس قسم کے سینکڑوں اشعار دیوانِ حسرت میں آپ کو ملیں گے جو صرف غزل پوری کرنے کے لئے کہے گئے ہیں اور ہر ردیف میں طبع آزمائی، ظاہر ہے کہ دیوان کی رواجی تکمیل کی خواہش کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتی۔

"قافیہ پیمائی" کا جیسا مکمل نمونہ "بادشاہِ متغزلین" کے یہاں ملتا ہے دوسری جگہ ناممکن ہے۔ دوسرے درجے پر البتہ فراق صاحب کو رکھ سکتے ہیں۔ حسرت صاحب نے اگر بہت سی زمینوں میں اکیس سے لیکر پینتالیس شعر تک

کہے ہیں[۵]۔ تو فراق صاحب کی غزل میں بھی عموماً ڈیڑھ درجن سے کم اشعار نہیں ہوتے۔ اس محل پر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غزل کی کسی زمین میں بھی دو تین یا انتہا چار پانچ سے زیادہ، بہت اچھے شعر نہیں نکل سکتے۔ اس سے زیادہ اشعار عام طور پر بھرتی کے ہوتے ہیں۔ مستثنیات سے بحث نہیں، یہی وجہ ہے کہ متقدمین میں سے بعض نے پانچ شعر سے زیادہ کسی غزل میں لکھے ہی نہیں اور عام طور پر سات سے لیکر گیارہ اشعار تک غزل کے لئے بالکل کافی سمجھے گئے ہیں۔ بعض "قافیہ پیمائی" کے دلدادہ دوغزلہ اور سہ غزلہ لکھتے ہیں۔ مگر دراصل وہ ایک ہی غزل ہوتی ہے۔ اصولی اعتراض سے بچنے کے لئے اس کے دو یا تین ٹکڑے کر دئے جاتے ہیں اور ہر ٹکڑے کے ساتھ ایک مطلع اور ایک مقطع لگا دیا جاتا ہے تاکہ ہر ٹکڑا ایک معینہ مقدار (مثلاً گیارہ شعر) سے نہ بڑھنے پائے۔

"بادشاہِ متغزلین" نے اپنی والا پائگی کے اظہار کے لئے خود کو ایران کے بہترین غزل گویوں کا ہم مرتبہ قرار دیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

حسرت اُردو میں ہے غزل تیری — پرتوِ نقش سعدی و جامی

ایک اور غزل میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اُردو میں ہے کہاں ہے اور حسرت — یہ طرز نظیری و فغانی

قارئین کو حیرت ہوگی کہ ہمارے مولنا صاحب نے سعدی و جامی اور نظیری و فغانی کا تو ذکر کیا مگر بلبل شیراز (حافظ) اور طوطی ہند (خسرو) جیسی عظیم المرتبہ ہستیوں کا نام تک نہ لیا۔ سعدی کو اولیت کا فخر ضرور حاصل ہے مگر غزل میں خواجہ حافظ کا جو پایہ ہے وہ کسی کو نصیب نہیں۔ نظیری تو خود خواجہ حافظ کا مقلد ہونے پر فخر کرتا ہے:۔

نظیری — تا اقتدا بحافظِ شیراز کردہ ایم — گشتہ است مقتدائے دو عالم کلام ما

اور غزل میں امیر خسرو علیہ الرحمہ کا جو مرتبہ ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حافظ و خسرو کو چھوڑ کر ہمارے مولنا صاحب نے جامی و فغانی کا ہم رنگ ہونا اپنے لئے سرمایۂ کمال سمجھا۔ دراصل یہ ایک راز ہے اور بصیغۂ راز ہی ہم قارئین کو بتلا دینا چاہتے ہیں کہ پہلے شعر میں جامی اور دوسرے میں فغانی ہی کو قافیہ بنانا ممکن تھا کیونکہ پہلی غزل کے قافیے ہیں ناکامی و بدنامی وغیرہ اور دوسری کے جاودانی، مہربانی، ناتوانی، وغیرہ۔ اس میں حافظ اور خسرو کی گنجائش کہاں۔ ناچار جامی و فغانی کو حافظ اور خسرو پر ترجیح دینا پڑی۔ اسے مولانا کی بدذوقی سے تعبیر کرنا صریح ظلم ہے، یہ تو قافیہ کی مجبوری ہے۔

متقدمین کی تقلید میں "بادشاہِ متغزلین" نے بعض غزلوں میں بہت لمبی لمبی ردیفیں اختیار کی ہیں۔ جب تقریباً ایک مصرع ردیف کے صرف میں آگیا تو شعر میں باقی کیا رہا اور کون خوبصورت مضمون اس میں ادا ہو سکتا ہے۔ ہاں اس قسم کی لمبی ردیفوں

---

[۵] یہاں حسرت کی بعض غزلوں کے پہلے مصرعے لکھے جاتے ہیں اور اُنکے ساتھ غزل کے اشعار کی تعداد بھی جس سے قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ "قافیہ پیمائی" یقیناً بادشاہِ متغزلین کا حصہ ہے۔ بعض زمینوں میں کئی کئی غزلیں بھی ہیں۔ ہم نے اُن سب کے اشعار کو ایک جگہ شمار کیا ہے کیونکہ مقصود "قافیہ پیمائی" کا دکھانا ہے۔

خلوص اب ہم وہ لائیں گے کہاں سے۔ ۲۱ شعر۔ ہم نے اس بات کا شکوہ نہ کیا تھا نہ کریں۔ ۲۲ شعر۔ شرف حاصل ہے اس جانِ جہاں سے مجھکو نسبت کا۔ ۲۱ شعر۔ نہ وہ راتوں کا آنا ہے نہ وہ دن کا بلانا ہے۔ ۲۵ شعر۔ جفا کو وفا سمجھیں کب تک بھلا ہم۔ ۲۷ شعر۔ سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا۔ ۳۰ شعر۔ ہے محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے۔ ۳۱ شعر۔ پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو۔ ۳۶ شعر۔ تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا۔ ۴۵ شعر۔

میں غزلیں کہنا سہل ضرور ہے۔ مثلاً حسرت کی ایک غزل ہے:-

کامرانی تجھے مبارک ہو — جاودانی تجھے مبارک ہو
اے ترا غم دلوں کو وجہ سرور — شادمانی تجھے مبارک ہو
مرقدِ عاشقاں پہ آخر کار — گلفشانی تجھے مبارک ہو — وغیرہ وغیرہ

"تجھے مبارک ہو" کے پہلے ایک ایک لفظ رکھ دیجئے۔ لیجئے مطلع تیار ہوگیا۔ باقی اشعار بھی زحمت طلب نہیں۔ قلم اٹھایا اور غزل تیار مثلاً:-

کامرانی تجھے مبارک ہو — جامدانی تجھے مبارک ہو
کھیر کھانی تجھے مبارک ہو — سرد بانی تجھے مبارک ہو
تجھ پہ قربان کوٹ اور پتلون — شیروانی تجھے مبارک ہو
ہوگیا تو تو اور بھی نازک — ناتوانی تجھے مبارک ہو
تجھکو بھیجا ہے یار نے تحفہ — نا سدانی تجھے مبارک ہو
ہیں یہ راز و نیاز کی باتیں — لن ترانی تجھے مبارک ہو
مجھکو اُردو سے عشق ہے پیارے — دیوبانی تجھے مبارک ہو

فراق صاحب کی اس رائے سے ہمیں بھی اتفاق ہے کہ "قافیہ اور ردیف شاعر کی سوئی ہوئی شخصیت کو جگا دیتے ہیں!" بھولے ہوئے واقعات یاد آجاتے ہیں اور چند ساعتوں کیلئے شاعر اسی دور میں پہونچ جاتا ہے جو گذر چکا ہے۔ اس طرح ماضی حال بن جاتا ہے اور غائب نظر کے سامنے آجاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ قافیہ کی مدد سے واقعات یاد بھی تو جبھی آئیں گے جبکہ وہ فی الحقیقت شاعر کی زندگی میں کبھی پیش آئے ہوں جس بدبخت کو کبھی عشق و عاشقی سے سروکار نہیں رہا اُسے کیا یاد آئیگا اور بالفرض اگر اس نے کوئی اچٹتی ہوئی چوٹ کبھی کھائی بھی ہو تو آج ایک زمانہ کے بعد اس میں وہ شدت احساس کہاں جو ایک طوفان انگیز شعر کہلوا سکے۔ اِن تمام باتوں سے قطع نظر اسکا کیا علاج کہ اس نے آپ بیتی بیان کرنے کی قسم کھائی ہے! اور صرف نقالی اور جگالی کو لینے لئے کافی سمجھتا ہے۔ واقعات یاد دلانے کی ضرورت تو اُس کے لئے ہے جو واقعات نظم کرنا چاہتا ہو۔ مگر جو صرف "ایک چڑیا کی کہانی" لکھنا چاہے اُسے یادِ ماضی سے کیا فائدہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "محمل" کا قافیہ سامنے آتے ہی شاعر جھٹ لیلیٰ مجنوں اور نجد و صحرا کا راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے اور "بسمل" فوراً اُسے "مقتل" کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ اِن واقعات کی روشنی میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "قافیہ" رسمی شاعری کا بے کیف ذخیرہ بڑھانے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔ اور قافیہ جب تک اجازت نہ دے شاعر اپنے دل کا حال غزل میں نہیں کہہ سکتا۔

ردیف و قافیہ کے متعلق میں ایک خاص بات قارئین کی خدمت میں عام طور پر اور جناب فراق کی خدمت میں خاص پر عرض کرنا چاہتا ہوں اور ملتمس ہوں کہ ٹھنڈے دل سے اور پوری توجہ کے ساتھ اس پر غور فرمائیں۔ غالباً اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر خیال اور ہر مضمون کیلئے بہترین پیرایۂ ادا صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ہر مضمون کمال حس

کیلئے مخصوص الفاظ کو چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی صاحب اپنا ایک بہترین شعر لے لیں اور چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری بحر میں، دوسرے ردیف قافیہ میں اسی خوبصورتی کے ساتھ بیان کر دیں تو کیا یہ ممکن ہو گا؟ جس کا جی چاہے عملی تجربہ کر دیکھے۔ اس کا امکان ہی نہیں کہ ایک مضمون جو کسی خاص شعر میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ بندھ گیا ہے اتنی ہی خوبصورتی کے ساتھ کسی دوسری زمین میں ادا ہو سکے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ پہلا شعر ناقص تھا۔ کامل اب ہوا۔ حاصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ غزل کہتے وقت جو خیالات آپکے دماغ میں آرہے ہیں اور جو یقیناً بجائے خود نہایت خوبصورت ہیں اگر اُن کے اظہار کیلئے وہی مخصوص الفاظ اختیار نہ کئے گئے جنہیں وہ چاہتے ہیں تو کیا اُن کا حسن تمام و کمال باقی رہیگا؟

اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو مضمون کے حُسن کا خُون کر کے اُسے اپنی معیّنہ زمین کے سانچے میں بھر دیجئے یا پھر اس زمین اور اس ردیف و قافیہ سے صرف نظر کر کے، اُس بحر اور اُس ردیف و قافیہ میں اُسے ادا کیجئے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس آخری صورت میں غزل کا مکمل ہونا بہت دشوار ہے مگر ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے اشعار کا مرتب ہونا نسبتاً سہل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اسکا تجربہ ہوا ہے کہ غزل لکھنے بیٹھا ہوں اور غزل کے بجائے مختلف زمینوں میں کئی اشعار کہہ کے اُٹھا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک غزل کی تکمیل کے مقابلہ میں مضمون کے حُسن کو باقی رکھنا زیادہ اہم ہے چاہے کسی خاص زمین میں صرف ایک ہی شعر کیوں نہ کہہ سکوں۔ اسلئے میری صلاح تو یہ ہے کہ شعر کہتے وقت صرف اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ مضمون کن الفاظ کو چاہتا ہے، وہی الفاظ، وہی ردیف، وہی قافیہ، جو اس کے اظہار کیلئے آپکے نزدیک بہترین ہے استعمال کیجئے اور اس کی ہرگز پرواہ نہ کیجئے کہ کسی خاص زمین میں صرف ایک ہی شعر ہوا اور غزل مکمل نہ ہو سکی۔

مطلع اور مقطع کی اہمیت پر بھی فراقؔ صاحب نے بہت زور دیا ہے۔ مطلع کہتے وقت شاعر کو غزل کے دوسرے اشعار کی بہ نسبت دوگونہ قیود کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کیونکہ مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ و ردیف کا استعمال ضروری ہے۔ اس قید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غزل کا مطلع اکثر غزل کا بہترین شعر نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر کسی زمین میں بے ساختہ مطلع ہو جاتے تو بہتر ہے ورنہ ایک "اصولی" پابندی یعنی محض مطلع کی خاطر ایک پھسپھسے شعر کا غزل میں اضافہ کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ رہ گیا مقطع، تو فراقؔ صاحب مانیں یا نہ مانیں مقطع عموماً غزل کا سب سے کمزور شعر ہوتا ہے۔ کبھی خصوصیت سے کوئی مقطع اچھا ہو جاتے تو وہ قابلِ لحاظ نہیں کیونکہ وہ الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ مقطع کے بارے میں ہماری اس رائے سے اگر فراقؔ صاحب کو اتفاق نہ ہو تو وہ مولانا نیاز فتحپوری سے مشورہ کر لیں۔ اس کے بعد تو پھر کسی قیل و قال کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ فراقؔ صاحب کا دعویٰ ہے کہ "مقطع سو فی صدی داخلی چیز ہے"! آئیے "بادشاہِ متغزلین" کے چند مقطعے آپ کو سنائیں تاکہ فراقؔ صاحب کے اس قول کی حقیقت آپ پر روشن ہو جائے۔

ہم عرصۂ حشر میں بھی حسرتؔ　　　پہچان گئے اُنہیں نہ بے ہوش

گذرے بہت اُستاد مگر رنگِ اثر میں　　　بے مثل ہے حسرتؔ سخنِ میر ابھی تک

یہ ظاہر میں سب زہد و تقویٰ ہے حسرتؔ　　　حقیقت میں یاروں کا ہے یار واعظ

جس سے حسرتؔ ہو گئی زیر و زبر بزمِ سماع　　　کس قیامت کی غزل مطرب نے گائی آپ کی

اس محوِ تغافل کی جفا پر

لے گیا ہے کوئی پگڑی جو اڑا کر حسرت ۔۔۔ مجھ گنہگار پہ ہے شب سے گمانِ واعظ

یادِ ایام کہ ہم جوشِ جنوں میں حسرت ۔۔۔ خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

جھوٹ، بالکل جھوٹ، سو فی صدی جھوٹ، کبھی بھی آپ بیابانوں میں خوار و پریشان نہیں پھرا کرتے تھے۔ کیا فراقؔ صاحب "بادشاہِ متغزلین" کے اس بے سر و پا بیان کی تصدیق کیلئے تیار ہیں؟

یہی ہیں وہ مقطعے جن میں بقولِ فراقؔ "نفسیاتی اور وجدانی ارتعاشات آخری جلوہ نما" ہوئے ہیں۔

اشعارِ غزل کی باہمی بے ربطی

غزل کے اشعار کی باہمی بے ربطی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے مگر فراقؔ صاحب اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ یہ کہتے کہ غزل کے اشعار میں ہم آہنگی کو لازمۂ غزل گوئی قرار دینا چاہیئے تو غالباً کوئی صاحب ذوق اُن کی اِس تجویز سے اختلاف نہ کرتا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو فراقؔ صاحب سے بہت پہلے ایک مستشرق غزل کی "پریشان خیالی" سے متاثر ہو کر یہ خیال ظاہر کر بھی چکا ہے:-

"Though there may be no definable connection between the individual couplets these ought never to be out of harmony with one another and a single tone of mind should run through the whole poem. Such indeed is what ought to be but in practice we find that in a vast number of Ghazals.... there is no more unity of thought or feeling between several couplets than there is between the paragraphs of a news paper." (The poetry of the Ottomans. by Gibb. Vol. 1, Page 83.)

اشعارِ غزل کا، از روئے خیال و احساس، باہم مربوط ہونا کبھی بھی لازمۂ غزل گوئی نہیں سمجھا گیا۔ نہ اربابِ فن نے اُسے اُصول قرار دیا نہ شعراء نے اپنے عمل سے اس کا ثبوت پیش کیا۔ اب ہم "بادشاہِ متغزلین" کے کلام سے چند نمونے پیش کرتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد فراقؔ صاحب بھی چاہے زبان سے اقرار نہ کریں مگر کم از کم دل میں اس بات کے ضرور قائل ہو جائیں گے کہ غزل، خواہ وہ کسی دور کی ہو، خیال و احساس کی ہم آہنگی سے عموماً محروم ہوتی ہے۔

حسرتؔ:- پندِ ناصح تو سُنے خوفِ ملامت ہو جسے ۔۔۔ پاسِ ناموس کہاں عاشقِ بدنام کہاں

اس شعر میں آپ ایک عاشقِ بدنام کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ملامتِ خلق سے بے پروا، پندِ ناصح سے یکسر بے نیاز۔ مگر دوسرے ہی شعر میں آپ چولا بدل لیتے ہیں اور منبر پہ کھڑے ہو کر اس طرح وعظ فرماتے ہیں:-

کشورِ ہند کہ مغلوبِ ریا ہے اس میں　　　نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں

ماشاء اللہ دونوں شعروں میں کس قدر لطیف ربط ہے۔

حسرت،　　انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار　　ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہیگی

ساقی سے ناز و نیاز ہو رہے ہیں۔ ادھر اصرار ہے، اُدھر انکار ہے۔ یہاں تشنگی سے بُرا حال ہے۔ وہ ظالم شراب کا ایک گھونٹ بھی دینا نہیں چاہتا۔ حقیقت اور واقعیت سے بحث نہیں، صحبت بہرحال مزہ دار ہے۔ لیکن یکایک مولنا صاحب ایک ندبلانوش سے ایک اُونچے درجہ کے فلسفی بنجاتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

نسبت جزو کل کی ہے یہ دنیائے عمل میں　　　اقوام کو محتاجی افراد رہیگی

اسے کہتے ہیں خیال کی ہم آہنگی!

حسرت:۔　　تسکینِ مدعا کیلئے اک دوا ہے تلخ　　ظاہر میں گرچہ وہ سخن آشنا ہے تلخ

شعر بہت بے کیف ہے پھر بھی دنیائے محبت سے بالکل بے تعلق نہیں لیکن جب ہم مقطع پر پہونچتے ہیں:۔

حسرت گراں ہے خلق پہ گو سہل ہے نماز　　　بدلا ہے ان کے منہ کا مزہ یوں دوا ہے تلخ

تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے "راہِ نجات" یا "مالابد منہ" کی ایک سطر قرار دیں یا "طب اکبر" کا متن سمجھیں شاید اسی کا نام ہے توافقِ احساس؟۔

حسرت:۔　　ہاں اسی کا تو سحرِ حسن ہے نام　　　وہ جو چشمِ سیاہِ یار میں تھا

محبوب کی جادو نگاہی کا ذکر کرتے کرتے یکایک مولنا صاحب اشہب خامہ کی باگ "دشتِ یثرب" کی طرف موڑ دیتے ہیں:۔

سُرمۂ طور میں کہاں یہ اثر　　　دشتِ یثرب کے جو غبار میں تھا

غالباً یہ وہ رابطہ ہے جو مجاز کو حقیقت سے ملا دیتا ہے؟

حسرت:۔　　اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خودبخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس شعر کا مضمون خود مولنا کا زادۂ طبیعت ہے یا غالب کے اس مشہور شعر کا چربہ ہے:۔

از زلفِ پُرخمِ مشکیں نقابے　　　وز تابشِ تن زریں ردائے

شعر بہرحال عاشقانہ ہے اور خوب ہے لیکن اس کی بدبختی، دیکھئے کہ مولنا نے اسے کیسے ناجنس کا رفیق بنایا ہے:۔

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ　　　مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

کہاں جسمِ یار کی خوبی سے پیرہن رنگین ہو رہا تھا کہاں مغرب کے چیل کوّے مشرق کی لاش کو نوچ نوچ کر کھانے کیلئے جمع ہوگئے۔

خدارا انصاف! کیا اسی کا نام ہے "اتحادِ داخلی" ؟

حسرت:-　　بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی　　پہلو میں ہے کچھ کچھ خلش تیر ابھی تک

اس حسین شعر کے لطف و اثر کو برباد کرنے کی بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد والا شعر پڑھا جائے۔ یعنی:-

تھے حق پہ ولیکن نہ جتے تو نہ ہوتا　　دنیا میں بپا ماتمِ شبیر ابھی تک

ماتمِ شبیر سے زیادہ اس کور ذوقی کا ماتم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے دو شعروں کو ایک غزل میں جمع کیا جائے۔ اور اس سے بھی زیادہ اندوہناک یہ حادثہ ہے کہ اس قسم کے اشعار میں لوگوں کو ایک ربطِ معنوی، ایک اتحادِ داخلی اور ایک اُفقی احساس نظر آئے۔

حسرت:-　　وصل کی رات اخیر کی کا رواج　　شوق کا آج عرش پر ہے دماغ

دو مصرعوں کے پڑھنے میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اس شبِ وصل کی مدت بھی بس اتنی ہی مختصر تھی کیونکہ دوسرے ہی شعر میں ستمبر فراق کا ماتم کیا جا رہا ہے:-

دستبردِ غمِ فراق سے آہ　　ہو گئی کشتِ آرزو تاراج

وصال کے بعد تو فراق لازمی چیز ہے۔ خیر، اس کا بھی مضائقہ نہیں لیکن مولنا صاحب جلد ہی اس وصل و ہجر کے جھنجھٹ سے آزاد ہو کر حق و باطل کی معرکہ آرائیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں:-

غلبۂ کذب ہے معلوم　　حق ہے بےخوفِ کثرتِ افواج

اور اس کے بعد فوراً ہی میلاد خوانی شروع کر دیتے ہیں:-

چھپ گئے سب ستارگانِ کمال　　کہ عرب سے ہوا طلوع سراج

مومنین! اُٹھئے، کھڑے ہو جائیے، پیغمبر آخر الزماں کی آمد آمد ہے سلام پڑھئے:-

یا نبی سلام علیک۔ یا رسول سلام علیک۔ یا حبیب سلام علیک صلوٰۃ اللہ علیک

سبحان اللہ غزل کیا ہے کباڑی کی دوکان ہے۔ یہاں مٹی کا پٹارا ہے۔ عمرو عیار کی زنبیل ہے۔ کونسی چیز ہے جو اس میں موجود نہیں۔

اس قسم کی غزلیں جن کے اشعار میں باہمی ربط ایسا ہی ہوتا ہے جیسا مندرجہ بالا مثالوں میں پیش کیا گیا ہے ہر "اُستاد" کے یہاں عام ہیں۔ حامیانِ غزل کو غزل کی اس مضحکہ خیز بلکہ اسف انگیز حالت کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا ازبس ضروری ہے۔

فراق صاحب نے اپنے مضمون میں بعض ایسے دعوے بھی کئے ہیں جنہیں پڑھکر موصوف کی بےبسی پر بےاختیار ہنسی آتی ہے، آپ فرماتے ہیں:-

"مسلسل غزل ایک تناقضی اصطلاح (Contradiction in terms) ہے۔ غزل کی مسلسل اور واحد العنوان بنانے کی کوشش بالکل ایسی ہے جیسے کسی زندہ جمیل پیکرِ انسانی سے ایک سڈول لکڑی ہو جانے کا احمقانہ مطالبہ کیا جائے"

غالباً "مسلسل غزل" کا کوئی ایسا مفہوم فراق صاحب کے ذہن میں ہے جسے واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ ایک

حُسن کو عیب کی شکل میں پیش نہ کرتے مسلسل غزل کا مفہوم سمجھانے کے لئے سب سے بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک مسلسل غزل پیش کر دی جائے اس کے مطالعہ کے بعد فراقؔ صاحب خود ہی فیصلہ کرلیں گے کہ مسلسل غزل ایک زندہ اور جمیل پیکرِ انسانی کہلانے کی مستحق ہے یا ایک سڈول لکڑی کہے جانے کی۔ نمونے کے طور پر دورِ حاضر کے کسی خوش گو اردو شاعر کی مسلسل غزل بھی پیش کی جا سکتی تھی مگر معاصرانہ چشمک شاید فراقؔ صاحب کو اس کے حُسن کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہ دے اس لئے ہم نظیریؔ نیشاپوری کی ایک پُرلطف مسلسل غزل نقل کرتے ہیں۔ اس غزل میں شاعر نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس کا معشوق خود کسی خوبرو کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا ہے اب ایسی حالت میں جو جو واقعات پیش آ سکتے ہیں اُن کی ایک دلکش تصویر کھینچی ہے۔ غزل کیا ہے محبت کی ایک دل فریب داستان ہے۔ سُنیئے :۔ (نظیریؔ نیشاپوری)

چشمش براہے میرود، مژگانِ نمناکش نگر   در سینہ دار د آتشے، پیراہنِ چاکش نگر

ذرا دیکھنا! (صیاد خود گرفتار ہونے کے بعد کس حال میں ہے) نظر راستہ پر ہے۔ پلکیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ سینہ میں محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ پیرہن چاک ہے۔ اس طرح چلا جا رہا ہے۔

دامے کہ زُلف انداختہ، در گردنِ سیمینش بیں   خونے کہ مژگاں ریختہ، بر دامنِ پاکش نگر

اُس کی زُلف نے جو جال پھینکا تھا اب خود اُس کی سیمیں گردن میں ہے۔ اور اس کی پلکوں نے جو اشکِ خونیں گرائے ہیں اُن سے اس کا دامن رنگین ہو گیا ہے۔

شرم از میاں برخاستہ، پرہیز وہاں برداشتہ   گفتارِ بے ترسش ببیں، رفتارِ بے باکش نگر

اب نہ وہ شرم ہے نہ وہ حجاب۔ لبِ خاموش اب گرمِ گفتگو ہیں۔ گفتار میں اب وہ ہچکچاہٹ نہیں رہی۔ رفتار میں بیباکی آ گئی ہے۔

قصدِ فریبے میکند، سوئے غزالے میچمد   آں چشمِ آہو گیر را با زلفِ پیچاکش نگر

فریب دینے کا ارادہ کر رہا ہے اور ایک غزال کی جانب مصروفِ خرام ہے۔ ذرا اسکی چشمِ آہو گیر اور زُلف شکن در شکن کو تو دیکھو۔

از کوئے معشوق آمدہ، شوریدگاں در حلقہ اش   از صیدِ آہو می رسد، شیراں بفتراکش نگر

ذرا دیکھنا وہ اپنے معشوق کے کوچہ سے آیا ہے۔ عشاقِ شوریدہ سر اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ آہو کا شکار کر کے پلٹا ہے اور شیر اُسکے فتراک میں ہیں۔

دل بُردہ در دل باختن، معشوقِ عاشق پیشہ بیں   بگرفتہ در انداختن بازوئے چالاکش نگر

معشوق ہے مگر عاشق پیشہ، اور ایسا اُستاد کہ اپنا دل دیتے دیتے دوسروں کا دل چھین لیا۔ کُشتی کے دوران میں حریف کو کس طرح پھانس لیا، ذرا اس کے بازوؤں کی چُستی تو دیکھو۔

ہمیں اُمید ہے کہ اس غزل کے مُطالعہ کے بعد "مسلسل غزل" کا مفہوم فراقؔ صاحب کی سمجھ میں آ گیا ہوگا اور یہ بھی کہ "مسلسل غزل" واقعی ایک حسین چیز ہے۔

عندلیب شادانی

پیامِ دلفگار
بنامِ دلفگار

میری تمنا، تیری جوانی، آ! اک بنالیں رنگیں کہانی
محشر بدامن میری تمنا آشوبِ عالم تیری جوانی

آ! اک بسالیں خوابوں کی دنیا جس کی بہاریں ہوں جاودانی
پھولوں کی دنیا، نغموں کی دنیا تاروں کی دنیا، ٹھنڈی، سہانی

ہے نیشتر زن میرے جگر پر اشکوں کی تیرے یہ خونچکانی
بے طرح پھونکے دیتی ہے مجھکو آہوں کی تیری شعلہ فشانی

آ! آرزو کا اک کھیل کھیلیں تسکین پائے دردِ نہانی
ویراں دلوں کو آباد کرلیں باہم ملا کر عشق و جوانی

آ بھول جائیں غمہائے ماضی سینوں میں بھرلیں پھر شادمانی
مٹجائے یکسر، جوشِ طرب میں ناکامیوں کی یہ جاں ستانی

مَیں مانگتا ہوں تجھکو خدا سے اور تجھ سے تیری کافر جوانی
بن جائے تیری رعنائیوں سے ہر شعر میرا ارژنگِ مانی

تیری تڑپ ہمرنگِ زلیخا میں حسرتوں کی سچی کہانی
جلووں کا تیرے دریوزہ گر ہوں زیبا ہے مجھ سے کب "لن ترانی"

سیدہ دلفگارؔ

صیدِ ہوس

یہ غریبوں کی بستی ہے۔ یہاں یہ ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ سامنے اُس خاک سے اَٹے ہوئے طاق میں جس کی کمر بڑھاپے سے دُہری ہوگئی ہے، ایک شمع چُپکے چُپکے رو رہی ہے۔ اس کے آنسو اس کا جسم لاغر کئے دے رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ چند پروانوں کو اس کے شعلۂ حُسن نے جلاکر خاکستر کر دیا ہے اور اُن کی لاشیں اس مجبورِ محض شمع کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کاش میں نے کبھی محبت کی ہوتی۔ کبھی کسی نے مجھے بھی اپنی آتشِ عشق میں جلایا ہوتا۔ پھر اس وقت میں اُس لذت کو سمجھ سکتا جو پروانے کو جل مرنے میں محسوس ہوتی ہے! دیکھو شمع پروانے سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہی ہے۔

"پیارے! مَیں تجھ سے ہمکنار نہیں ہوسکتی تھی۔ تُو نے ناحق جان گنوائی۔ لیکن دیکھ میرے محبوب! تیری یاد مجھے بھی تو جیتا نہ چھوڑیگی"

میرا تخیّل مجھے ایک شہر میں لے جاتا ہے۔ یہاں امیر لوگ رہتے ہیں۔ عالیشان مکانات ہیں، بجلی کے قمقمے ہیں۔ پروانے یہاں بھی آتے ہیں۔ اُن کے گرد طواف کرتے ہیں مگر اُن کے پر نہیں جلتے۔ ان میں سوزش نام کو نہیں ہوتی اور ہو بھی کیسے؟ یہ شمع تھوڑی ہے! یہ تو بڑے آدمیوں کے ہاں خوبصورتی سے آراستہ کئے ہوئے بجلی کے قمقمے ہیں جن کے سروں میں غرور اور تکبّر کا سودا سمایا ہوا ہے۔ ایک پروانہ دیوانہ وار آیا اور اس سے پیہم اپنا سر ٹکرانے لگا۔ قمقمے کا مزاج برہم ہوگیا۔ اُس نے خشمناک ہوکر کہا "ارے دیوانے! کیوں میرا اُجلا بدن مَیلا کرتا ہے؟ ایسا ہی مرنا ہے تو وہ سامنے دیکھ۔ آتشدان میں اپنا جسم جُھلس لے"

اللہ رے تفاوت! عاشق کی جان جانے پر شمع روئے اور قمقمہ برہم ہو۔

ــــــــ ۱ ــــــــ

میں اس قصبہ میں ایک ہفتے سے مہمان ہوں۔ ہر شام لوگ اِدھر اُدھر سے آکر میرے پاس جمع ہوجاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے مجھے ایک دیہاتی لڑکی کے واقعات بتائے جن سے میں نے ایک کہانی مرتب کی۔ آج کی صحبت میں مَیں آپ کو اسی الھڑ معصوم کی داستان سُناتا ہوں۔

اس کا نام کلثوم تھا۔ وہ اور اُس کی ماں، دونوں اس بوسیدہ مکان میں رہتے تھے۔ ایک چکّی اُن کی ملکیت تھی۔ آس پاس کے لوگ اُس کی ماں سے گیہوں پسواتے تھے جس کی مزدوری اُس کو سیر سوا سیر میں ایک مُٹھی مل جاتی تھی۔ اسی پر ان کا گزارہ تھا۔ تھوڑے فاصلے پر شہر والوں کا سا ایک پختہ مکان بنا ہوا تھا۔ اس میں یہاں کا زمیندار اور اس کے گھر والے رہتے تھے۔ بچپن میں سب کو ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے زمیندار کا بیٹا غریب کسانوں ہی کے بچّوں میں کھیلتا تھا۔ کلثوم سے اُس کا اُنس آہستہ آہستہ اس قدر بڑھ گیا کہ اُس نے اسی کو اپنا ہمجولی منتخب کیا۔ کھیل کا وقت نہ بھی ہو تب بھی وہ دونوں دھان کے کھیتوں یا پست منڈیروں کے پیچھے کھیلتے ہی نظر آتے تھے۔

پھر اُنہوں نے بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکپن میں قدم رکھا لیکن اب بھی وہ دونوں غیریتِ جنسی سے ناواقف کسی گوشۂ تنہائی میں گھنٹوں گذار دیتے تھے۔ ایک دفعہ شام ہونے کو تھی۔ سورج تھکے ہارے مزدور کی طرح ستانے کیلئے پہاڑیوں کے پیچھے

چھپ رہا تھا۔ چرواہے گلوں کو ہنکاتے اور پرانی بانسریوں پر ٹوٹی ہوئی لَے میں گیت گاتے چلے جا رہے تھے۔ ذرا دُور ایک ندی اِس طرح بے چینی سے بہہ رہی تھی گویا اس کا سانس کوئی دم میں رُکا ہی چاہتا ہے۔ عابد، کلثوم کے بالکل قریب سرک آیا؛ اور وہ بھی اپنی جگہ سے بے خبر اس کے پہلو سے چمٹی ہوئی سُرور سا محسوس کرنے لگی۔

عابد بولا: "ایک بات کہیں ــــــ ؟"

"ہاں!" کلثوم نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم ـــــــ ہم جا رہے ہیں"

"کہاں؟"

"ابا کہتے ہیں پڑھنے لکھنے سے آدمی ہیرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ مجھے پالم پور بھیج رہے ہیں"

"پالم پور!" وہ ہولے سے بولی: "وہ تو بہت دُور ہے"

"ہاں ــــ ابا نے کہا ہے وہاں اسکول و کالج ہیں۔ جب ہم پڑھ لکھ جائیں گے تو سرکار ہماری بات مانا کرے گی اور۔۔۔"

"کتنے دن میں آ جاؤ گے؟"

"دن؟" اُس نے ذرا شوق سے کہا: "اری کئی سال لگ جائیں گے۔۔۔ تم ہمیں بہت یاد آؤ گی"

"جانا کب ہے؟"

"کل مُنہ اندھیرے"

۲

کئی سال بیت گئے پر دیہات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ کلثوم اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے کچھ بدلی نظر آتی تھی۔ اس کی ہستی کا آبگینہ دُکھ کی چٹان سے پہلی بار ٹکرایا تھا۔ اس لئے وہ سمجھنے لگی تھی کہ زندگی گریۂ مسلسل ہی کا نام ہے۔ اس کا دُنیا میں اب کوئی نہیں تھا جس کے سہارے وہ اطمینان سے بیٹھی رہتی۔ وقت موت کا سب سے بڑا مرہم ہے۔ چنانچہ جب آنسو خشک ہونے لگے تو اُس نے ایک روز بیکسی سے اپنی چکی کی طرف دیکھا۔ وہ بیچاری خود کسی حسرت سے تک رہی تھی۔ کلثوم سے لپٹ گئی۔ کچھ دنوں پہلے کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا کہ ماں تڑکے تڑکے گیہوں کے دانے پاٹ میں ڈالتی اور دھیمے سُروں میں گاتی جا رہی ہے۔ اُس نے جھک کر کھُردرے پتھر کو بوسہ دیا اور قدرے اطمینان سے غمناک آواز میں کہنے لگی "میری جان جب تک تُو موجود ہے مجھے دو روٹیوں کی کمی نہیں" پھر یکبارگی کسی خوف اور مایوسی نے اُسے بوجھل دُھند کی طرح ملفوف کر لیا اس کا چہرہ اُتر گیا۔ اور وہ بھٹکتے ہوئے مُسافر کی طرح خالی الذہن ہو گئی ــــــــ کہ یکایک اُس نے دیکھا کہ دھندلکے کے اس پار کوئی چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ اس کی آس بندھ گئی۔

چند ماہ بعد عابد بھی اپنے باپ کی جگہ زمیندار بنکر آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا مکان آج خالی نظر آ رہا ہے گویا یہاں کبھی کوئی ہی نہیں۔ باپ کی جُدائی کا اُسے بڑا رنج تھا مگر اتنا نہیں جتنا کلثوم کو۔ کیونکہ شہر کی دلچسپیوں نے اُس کے خیالات ایک مرکز پر مجتمع نہیں رہنے دئے تھے۔ دو چار روز میں ہجومِ کار سے فرصت ملی تو اُسے کلثوم یاد آئی۔ سوچا اب تو وہ شباب سے بھرپور، دوشیزہ بہار کی مانند ہو گی۔ شا

ہوتے وہ اس سے ملنے اسکے گھر پہونچا

کلثوم کی جوانی انگڑائی لیکر بیدار ہوئی۔ جب سے اس نے عابد کے آنے کا حال سُنا اُس کے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اُسنے ئی بار سوچا "چلی چلوں، مجھے دیکھ کر بچپن کی تمام باتیں انہیں یاد آجائیں گی اور وہ میری ٹھوڑی اُٹھا کر کہیں گے کلثوم! تیری شب بیداریاں ور یہ لمبے لمبے کٹھن دن اب ختم ہوگئے" لیکن خود ہی کہتی "مجھ میں اور ان میں بڑا فرق ہے۔ وہ تو بچپن کا زمانہ تھا جب انسان خواب کی طرح صلیت سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ کہاں وہ زمیندار اور بستی بھر کے مالک اور کہاں میں بچاری؟" آج تمام دن اسی اُلجھن میں گذرا کبھی ل کہتا "اتنے سال اس کی یاد میں گذارے ہیں اب اس کے پاس جانے میں شرم کیسی؟ اور پھر اُس نے خود بھی تو کہا تھا کہ تم ہمیں بہت یاد آؤگی" لیکن جب قدم اُٹھتے تو خودداری زنجیر بنکر پاؤں میں پڑجاتی۔ "آخر انہیں اب تک کیوں نہ خیال آیا ـــــ وہ خود ہی چلے آئیں گے"

چوکھٹ کے اوپر بستے میں ایک دیا جل رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے تُند جھونکوں سے اُس کی لَو لہرجاتی تو اس کا ہاتھ خود بخود اسکے ل پر چلا جاتا۔ اللہ جانے آج یہ کیوں بے چین ہوا جاتا تھا شاید وہ سمجھتی تھی کہ رات گئے تک اگر وہ نہ آئے تو میں خود ہی چلی جاؤنگی، ور انہیں سوتے سے جگا دوں گی۔ بس اسی خیال سے وہ ذرا نہائی دھوئی تھی۔ اُجلا رنگ تو یوں ہی تھا، صاف ستھرے کپڑے پہن کر تو ور بھی اچھی نکل آئی۔ بال بھی سنورے تھے مگر جس پلنگ پر وہ بیٹھی تھی وہ کچھ اچھا نہیں تھا اور پُرانا لحاف تو اور بھی بُری حالت میں تھا۔ اِس غضب کی سردی میں وہ خدا جانے کیسے گذارا کرتی تھی۔ لیکن یہ سوال تو امیروں کیلئے ہے، غریبوں کے ذہن کی یہاں تک رسائی ہی نہیں ہوتی۔

اُسے سردی لگنے لگی تو اُس نے لحاف گھسیٹ کر اپنی ٹانگوں پر ڈال لیا۔ اتنے میں آواز آئی "کلثو!" وہ آواز پہچان گئی۔ عابد آواز کہیں تطویل زمانہ بھلا سکتا تھا؟ خوشی کے مارے وہ دیوانی ہوگئی مگر پلنگ سے اُٹھ نہ سکی اور نہ اُس کے مُنہ سے یہ نکل سکا "ہاں، یں اندر ہوں، آؤنا!" عابد نے جھانکا اور خود ہی اندر آگیا۔ وہ بُت بنی بیٹھی رہی۔ عابد نے دیکھا کہ اُسکی مُسکراہٹ چہرے پر سے سمٹ مٹ کر معدوم ہوئی جارہی ہے جیسے کوئی حسین مکھڑا تہِ خاک دفن ہورہا ہو۔ وہ اس کے پاس جلدی سے بیٹھ گیا "کلثو!"

کلثوم رو پڑی۔ نہ جانے اس کا دل کیوں بھر آیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا "میں آپ کا کئی دن سے انتظار کر رہی تھی۔ میں سمجھی شاید پ نہ آئیں ــ مگر میرے دل نے . . . . . میرے دل نے کہا آپ ضرور آئیں گے"

"کیوں نہ آتا کلثو۔ میں نے تو تمہیں کئی بار یاد کیا۔ بھلا تم نے تو کیوں کیا ہوگا!"

"آپ کو کیا معلوم ــــــ" وہ اپنی بڑی بڑی پُرنم آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اماں کے مرنے کے بعد بس آپ کو یاد کر کر کے جیتی رہی ورنہ میں تو ابتک ــــ"

"تو ہم اکیلے رہ جاتے۔ کیا تم ہمیں اکیلا چھوڑ جاتیں؟" عابد کی طرح کلثوم نے بھی اس کے گلے میں باہیں ڈالدیں مگر دفعتاً وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔ آج اُسے شرم آرہی تھی۔ جوانی کا بوجھ اُسے بے تکلف نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور جب عابد نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا اس کا تنفس تیز ہوگیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں باوجود کوشش کے حرکت نہ کر سکے۔ اُسنے اُسکے رخسار پر اپنے لب رکھ دئے اور شکستہ آواز میں کہنے لگا "تم کتنی خوبصورت ہو کلثو!"

کلثوم کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا اور وہ اُس کی آغوش سے بچ نکلنے کی سعی کرتے ہوئے بولی "آپ ـــــ آپ یہ کیا کر رہے ہیں . . . . "

عابد انجان بنکر کہنے لگا " اور تم مجھ سے شادی کب کروگی ؟ "

" شادی ! " کلثوم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا " آپ مجھ سے شادی کرلیں گے ؟ میں تو غریب ہوں " اسکی آنکھوں میں خوشی اور بے بسی کے آنسو جھلک آئے " آپ . . . . سچ کہہ رہے ہیں ؟ "

" ہاں ـــــ بہت جلد ! " وہ آگے ہی بڑھتا ہوا بولا " پھر ہم دونوں اس سامنے والے مکان میں آرام سے رہا کریں گے. مجھے تم سے بیحد محبت ہے کلثو "

اس دفعہ اُس نے مدافعت نہیں کی.

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

۳

دو تین ماہ تک وہ اپنی جوانی کے پیاسے جذبات کو تسکین دیتا رہا لیکن جب کلثوم کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تو اسکو ہوش آیا. کلثوم میں حُسن ستی اور پھر اضمحلال دیکھکر بعض عورتیں کچھ تاڑ گئیں. عورتوں کے ذریعے یہ بات مردوں کے کانوں تک پہونچی اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف لوگوں کی انگلیاں اُٹھنے لگیں. قدرت بھی تو سماج کی طرح عورت کی لغزشیں طشت ازبام کر دیتی ہے! جوں جوں دن گذرتے رہے اُسکے ماں بننے کے آثار نمایاں ہونے لگے. ایک رات اُسے اذیت محسوس ہوئی مگر وہ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی. آپ ہی آپ اُسے سہا کی. اسی حالت میں گذشتہ واقعات سطح ذہن پر اُبھر آئے اور اُسے وہ وقت یاد آیا جب عابد نے پہلی بار اس کے دل و دماغ پر ایک کیفیت نامعلوم طاری کر دی تھی . . . . . . اس خیالی تلذذ سے کچھ دیر کیلئے وہ جسمانی تکلیف کو بھول گئی اور سوچنے لگی اے کاش میں اُس دن کے بعد زندہ ہی نہیں رہتی اور یا وہ کیفیت ایک سلسلہ لامتنائی ہوجاتا.

"بس اب ایک ہی صورت ہے " عابد نے التجا کرتے ہوئے کہا " باہر گاڑی کھڑی ہے. تم اس میں سوار ہوجاؤ. میں اُس گاؤں میں گھر دیکھ آیا ہوں. وہاں کوئی پوچھے تو کہدینا میرے خاوند شہر میں کام کرتے ہیں. کوئی ڈرنے کی بات نہیں. یہ بوڑھا گاڑیبان نیک آدمی ہے اور مکان بھی جانتا ہے. آرام سے لے جائیگا "

کلثوم منہ بند اُسے چُپ چاپ دیکھتی رہی مگر اُس کی خاموش آنکھیں کہہ رہی تھیں " آپ تو کہتے تھے ہماری بہت جلد شادی

ہو جائیگی۔ اب وعدہ پورا کیوں نہیں کرتے!" عابد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا "بڑا خراب زمانہ ہے کلثو! لوگ خواہ مخواہ بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ ذرا میں گھر والوں کو راضی کرلوں، پھر میں تم کو جلد یہیں لے آؤں گا۔ اور وہ گاؤں یہاں سے ہے کتنی دور، میں خود بھی وہاں تم سے ملنے آؤں گا ...... ہاں تم کسی قسم کا فکر نہ کرنا، ہر مہینے تمہیں خرچ چلانے کیلئے روپے بھیجتا رہا کروں گا۔ آؤ! اُٹھو، اُٹھو ......"

اس کا دل صاف تھا۔ عابد کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی اُس کے خیال میں کوئی وجہ نہیں تھی۔ شام کی تاریکی اور تنہائی میں وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور بیل ڈگمگ ڈگمگ چلنے لگے۔ عابد کچھ دیر درختوں کی آڑ میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کلثوم کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس کے گھنے درخت اُس کے دل کی کہانی سُن سُنکر آہِ سرد بھر رہے تھے۔ کبھی کبھی گاڑیبان کے چمکارنے یا کسی فاقہ زدہ کتّے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دے جاتی تھی جو آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر اپنے پیدا کرنے والے سے جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، اپنی بیچارگی کی شکایت کر رہا تھا۔

(۴)

چار پانچ مہینے تک دس دس روپے آتے رہے جس سے اُسکی تن پروری ہو جاتی تھی مگر من کا روگ اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس کی جان گھلی ہی چلی گئی۔ اِدھر پچھلے مہینے روپے نہیں آئے اور عابد نے تو کبھی شکل ہی نہیں دکھائی۔ اس لئے اس کا ماتھا ٹھنکنا تعجب خیز نہیں تھا۔ پڑوس میں ایک رحمدل بوڑھی عورت رہتی تھی۔ اُس سے اُسے بہت کچھ سہارا تھا ایکدن کلثوم سے اُسنے کہا "بیٹی! میری تو کوئی اولاد ہوئی نہیں۔ تیرے ہاں بچّہ ہوگا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی"

بچّے کا خیال آتے ہی کلثوم کانپ اُٹھی "اماں! میں کہیں مرنہ جاؤں! — مجھے اس وقت بڑی تکلیف ہو رہی ہے!" پھر اُسنے ہاتھ جوڑکر کہا "ابھی! مجھے اپنی گاڑی میں جلدی آسوں پہونچوا دو ——— وہ میرا گاؤں ہے"

بُڈھا گاڑی ہانک رہا تھا اور کلثوم بے حال پڑی ہوئی تھی۔ خیالات اُسکے دماغ میں گردش کرنے لگے "کہیں وہ مجھے بھول تو نہیں گئے؟ ..... نہیں، نہیں ..... اور اگر بھول بھی گئے ہیں تو مجھے دیکھکر انہیں رحم آجائے گا، پھر وہ اکیلا کبھی نہیں چھوڑینگے"

گاڑی جب زمیندار کے مکان سے ذرا ہی فاصلے پر رہ گئی تو شور و غُل کی آوازوں نے اُسے چونکا دیا۔ لوگ ایلے گیلے پھر رہے تھے۔ گاڑی کو راستہ بھی تو نہیں ملتا تھا۔ گاڑی بان کے پوچھنے پر کسی نے کہا "کیوں رے بڈھے! تیری عقل تو نہیں سٹھیا گئی؟" دوسرا بولا "ارے ناجو! تجھے نہیں معلوم کہ زمیندار جی شادی کرکے آرہے ہیں"

کلثوم تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُسنے دیکھا کہ عابد کا مکان دُلہن کی طرح سج رہا ہے۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بوڑھے کے سنبھالتے سنبھالتے چکرا کر گر پڑی۔

اُمید کے آسمان پر ایک ستارہ جھلملا رہا تھا، آہ! آج وہ بھی غروب ہو گیا۔

صادق الخیری

قطعات

چاندنی راتیں

غمزۂ حسن ہے کیا، عشق کی گھاتیں کیا ہیں
چاند تاروں میں جو ہوتی ہیں وہ باتیں کیا ہیں
چاندنی ہے مری ہمدرد، میں اُس کا ہم راز
میرے دل سے کوئی پوچھے کہ یہ راتیں کیا ہیں

حقیقت سے گریز

غمِ حیات کو غرقِ شراب کرنے دے
سکوں سے جینے دے دو دن، سکوں سے مرنے دے
عذابِ جاں ہے حقیقت سے آگہی اے دل!
برنگِ خواب مری زندگی گزرنے دے

نغمہ و شاعر

کوئی گاتا ہے ہم روتے ہیں اختر!
ہوا کرتا ہے ایسا شب کو اکثر
اندھیرا، خامشی، نغمہ، یہ تینوں
قیامت بن کے پھٹ پڑتے ہیں دل پر

رات

بزمِ ہستی کی یہ غفلت کوشیاں
یہ فضائے دہر کی مدہوشیاں
کیا کہوں اس وقت کس عالم میں ہوں
ہو رہی ہیں رات سے سرگوشیاں

چاندنی رات

خلوتِ کامل ہے اختر، چرخ نے
ڈال دی ہیں ماہتابی چلمنیں،
رات سے اِس طرح ہم آغوش ہوں
سُن رہا ہوں اُس کے دل کی دھڑکنیں

بیخواب راتیں

کروٹیں ہیں، کروٹوں میں دکھ بھی ہے
غم نے لوٹی نیند، لوٹا چین بھی
اور اختر اِک زمانہ وہ بھی تھا،
جب خوشی کے مارے نیند آتی نہ تھی

اختر انصاری

بوسہ

اے عشقِ شیریں کار کی رُوحِ صد امید آفریں ۔ اے میرے جذبِ شوق کی تصویرِ زرّین و حسیں
اے رازدارِ شانِ عشق، اے غمگسار و جانِ من ۔ اے نقشبندِ خوبیٔ حُسن و جمالِ صد چمن
اے انبساطِ حُزنِ دل، اے نوبہارِ نازِ حُسن ۔ اے نغمۂ رُوحِ طرب، اے زمزمہ پروازِ حُسن
اے راحتِ جانِ حزیں، اے خوابِ شیریں مُرتضیٰ ۔ پنہاں تجھی میں راز ہیں، دلبستگیٔ شوق کے
اے جانِ تصویرِ طرب، اے رُوحِ تخئیلِ وصال ۔ اے شانِ حُسنِ عارضی، اے نازشِ نورِ جمال
اے نوبہارِ گلشنِ حُسن و کمالِ عاشقی ۔ اے خندۂ گلہائے اُمید نہالِ عاشقی
تُو نوبہارِ ناز ہے، اے نغمۂ سازِ عاشقی ۔ تُو جانِ خوابِ شوق ہے، اے جانِ نوازِ عاشقی
اے نغمۂ جذباتِ دل، اے امتنانِ آرزو ۔ اے غنچۂ باغِ طرب، اے جانِ جانِ آرزو
اے حُسنِ دل آویز کی زیبائشِ رنگیں ہے تُو ۔ اے سازِ عشقِ آہنگ کا، اک نغمۂ شیریں ہے تُو
اے مرکزِ جذباتِ دل، اے مخزنِ اسرارِ عشق ۔ اے دولتِ جذبِ نہاں، اے جلوۂ اظہارِ عشق
اے جانِ جانِ زندگی، تصویرِ فرطِ عاشقی ۔ تُو جانِ صد اُمید ہے، اے جذبِ شوقِ باہمی
آئینۂ جذباتِ دل، اے خاتمِ رُخ کے نگیں ۔ فرمانروائے عشق ہے، تُو اے شہِ بالا نشیں
اے خالِ رُخسارِ حسیں، ہاں اے شہابِ مہ نشیں ۔ سو داغ دل پر کھائیگا، اب گلشنِ چرخِ بریں
ہر ہر ادا خود بن گئی، تصویرِ جانِ عاشقی ۔ ہر ہر نفس میں پھونکدی، تُو نے دمِ رُوحِ تازگی
دل سے اُمنگیں جب اُٹھیں، ہونٹوں پر آکر رہ گئیں ۔ کچھ رُک گئیں، کچھ تھم گئیں، کچھ ہوگئیں ندو ہوگئیں
پھر ہونٹ سمٹے یا سمٹ کر اک کلی سی رہ گئی ۔ پھر گُل کھلے کچھ اور ہی اور کھل گئی دل کی کلی

فرحت کانپوری

ہماری مغرب پرستیاں

دورِ جدید کی تہذیب، تمدن کی ترقیاں اور ہماری فیشن پرستیاں زندگی کے ہر شعبہ میں گرانی اور افلاس کے اسباب نِت نئے دن پیدا کر رہی ہیں۔ ایک طرف ہماری مغرب پرستی اور مغربی طرزِ معاشرت کی اندھی تقلید ہماری زندگی کے معیار کو سرعت سے بڑھا رہی ہے اور دوسری طرف ہماری معاشی، اقتصادی پستی بدستور قائم بلکہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی ہماری آمد و خرچ کے توازن کو بگاڑ رہی ہے اور ہماری زندگی میں نت نئی مشکلیں اور مصائب پیدا کر رہی ہے۔

گراں قیمت طرزِ زندگی سے ہم اس قدر مادی ہوگئے ہیں کہ سادہ اور شستہ و متین معاشرت ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، ہم اپنی اقتصادی حالت پر کبھی غور کرتے ہی نہیں کہ موجودہ معاشرت ہمارے لئے کس حد تک مضرت رساں ہے۔ مغرب کی نظر فریب طرزِ معاشرت اور اسکی رنگینیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے ہیں، مغربی معاشرت کی دلفریب ادائیں نہیں کچھ ایسی بھائی ہیں کہ ہر قیمت پر ہم انہیں خریدنے کو بیتاب نظر آتے ہیں۔

مغربی معاشرت کے نقصانات پر غور کرنے کا خیال نہ کبھی ہمارے دماغ میں آتا ہے اور نہ ہماری سماج اس اہم مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت سمجھتی ہے، مغرب زدہ سوسائٹی میں شریک ہونا آجکل زندگی کا لازمہ اور تہذیب کا خاصہ بن گیا ہے، سوسائٹی کی ہر ادا پر آمین کہنا اور اس کی ہر حرکت کو نقل کرنا ہماری تہذیب و تمدن کی معراج ہے، اگر کوئی اس کی کسی حرکت پر اعتراض کرے تو بدتمیز اور وحشی کا لقب دیا جاتا ہے اور اس کا سوسائٹی میں بار پانا دشوار ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی سے علیحدگی اختیار کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اس کی دلچسپیاں اور رنگینیاں اس قدر جاذبِ نظر و بادہ اثر ہیں اور اپنے اندر اتنے سحر آگیں کرشمے رکھتی ہیں کہ دامنِ دل از خود انکی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے معیارِ زندگی کو جو خواہ مخواہ مغرب کی اندھی تقلید کی وجہ بڑھتا جا رہا ہے، جادۂ اعتدال پر لے آئیں؟ تاکہ سوسائٹی کے تعاون و اشتراکِ باہمی کا بوجھ ہماری اقتصادی پستی اور موجودہ معاشی حالت کے مدنظر اسقدر گراں نہ ہو کہ ہم اسکو برداشت نہ کر سکیں اور سوسائٹی کی شرکت کی خاطر قرض کے شکنجوں میں پھنستے نہ جائیں! یہ مسئلہ نہایت اہم اور ہم سب کے غور و فکر کا محتاج ہے۔

مغربی تہذیب اور معاشرت کی ایک حد تک تقلید کی جاسکتی ہے، ہمارے موجودہ تمدن میں اس کا بڑا عنصر داخل ہوگیا ہے۔ ہماری عادات و اخلاق اور ہماری اقتصادی حالت کو مغرب کی تقلید سے متاثر نہ ہونے دینا چاہیئے، مغربی تہذیب کی حسین اور دلکش صورتوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھیں کہ کون ہماری صحبت کے قابل ہے اور کس سے کنارہ واجب!

مغربی تمدن کی صحیح تقلید کا سب سے پہلا اثر ہم میں یہ ہونا چاہیئے کہ صنعت و حرفت، زراعت و تجارت، تحقیقات و ایجاد، محنت و مشقت اور کسبِ معاش کے وہ طریقے سیکھیں اور ذرائع اختیار کریں جن کی وجہ آج مغرب کو مشرق پر فوقیت حاصل ہے

اپنی آمدنیوں کو جائز طریقوں سے بڑھا کر اگر ہم اپنی زندگی کے معیار کو بھی بلند کریں اور اپنی معاشرت کو گراں بنائیں تو ہمارا شمار مغرب کی صحیح تقلید کرنے والوں میں ہو سکتا ہے، وقت کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں، وعدہ کے ایفا کا خیال رکھیں، قول و قرار کے پابند رہیں، جھوٹ نہ بولیں، اپنی آمد و خرچ کے توازن کو بگڑنے نہ دیں، معاشرت میں صفائی اور سادگی پیدا کریں، گھر کی ہر چیز کو سلیقے اور قرینے سے ترتیب دیں۔ غیر ضروری چیزیں خرید کر روپیہ برباد کرنے کے علاوہ گھر کو کباڑی کی دوکان نہ بنا دیں، فرنیچر میں نہ اس قدر قلت ہو کہ کرسیاں بھی صحیح سالم نہ نکلیں اور نہ اس قدر بہتات کہ سارا مکان نیلام گھر نظر آئے۔

مغربیوں کا ہر گھر فردوسِ نظر معلوم ہوتا ہے، اس کا سبب یہ نہیں کہ اُن کی آمدنی ہم سے بہت زیادہ ہے اس لئے وہ ایسی صاف ستھری معاشرت کے پابند ہو سکتے ہیں، اگر ہم غریب اور متوسط درجے کے یوروپینوں کا مقابلہ ہمارے متمول حضرات کی معاشرت سے کریں تو بھی یہی فرق نظر آئے گا، سلیقہ اور صفائی، نفاست اور پاکیزگی کیلئے زیادہ روپے کی نہیں بلکہ تمیز اور احساس کی ضرورت ہے، اور یہی ہم میں نہیں ہے۔

ہم کیا سے کیا ہو گئے ہیں! اگر اپنی اس حالت پر ہم غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ہماری معاشی اور اقتصادی حالت سرعت کے ساتھ گرتی جا رہی ہے، اگر ہم میں کچھ انقلاب ہوا ہے تو وہ ہماری معاشرت میں مغربیت ہے، علم و عمل سے تو کوسوں دور ہیں مگر مغرب زدگی ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے، نئے نئے فضول مصارف نے ہماری سادہ زندگی کے مطلع کو بے حد غبار آلود کر رکھا ہے۔ ہمارے خیالات میں مغرب پرستی نے ایک طوفانِ عظیم برپا کر رکھا ہے، ہم اپنے سادہ طرزِ زندگی کو خیرباد کہکر نئے دورِ حیات میں داخل ہو رہے ہیں، اسوقت نہایت ضروری ہے کہ ہم ذرا عاقبت اندیشی سے کام لیں، اچھائی اور بُرائی میں امتیاز پیدا کریں، اپنی بربادیوں اور تباہکاریوں کو اپنے ہاتھوں دعوت نہ دیں کہ کسی دن بالکل ہی ملیامیٹ نہ ہو جائیں اور حرفِ مکرّر کی طرح لوحِ جہاں سے مٹ نہ جائیں۔

آجکل مغرب پرستی کی وبا ہمارے ہاں اس حد تک پھوٹ پڑی ہے کہ ہمارے بعض ہندوستانی "صاحب بہادر" جب اپنے ملازمین سے گفتگو کرتے ہیں تو اپنی مادری زبان اس لئے غلط بولتے ہیں کہ یوروپین ہندوستانی زبان صحیح نہیں بول سکتے، یہ مغرب زدہ حضرات اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے موقعوں پر بھی مغربی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ تحریر و تقریر میں اپنی مادری زبان کو اس قدر مغرب زدہ بنا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک نئی زبان بن جاتی ہے۔ غرض کہ ہر وقت اور ہر موقع پر مغرب کی اندھی تقلید کرنا روشن خیالی اور اعلیٰ تہذیب کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

مغرب پرستی کی ایک مثال آج ہم ناظرین ساقی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس مثال سے واضح ہو گا کہ جو لوگ اپنے کمسن اور ناسمجھ لڑکوں کو تعلیم کی غرض سے یورپ بھیجتے ہیں اُن پر مغرب کی فضا کا کیا اثر ہوتا ہے اور وہ کس حد تک مغرب کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

ایک بزرگوار نے اپنے صاحبزادے کو انٹرنس پاس کرتے ہی بیرسٹری کی ڈگری لانے یورپ بھیجا، دس بارہ سال کے بعد صاحبزادے بیرسٹر ہو کر وطن لوٹے، بمبئی سے پدرِ بزرگوار کو تار دیا کہ فلاں ٹرین سے گھر پہونچیں گے، وقت پر والد ماجد اسٹیشن پہونچے۔ ٹرین آئی مگر بیرسٹر صاحب کا پتہ نہیں، ہر روز بیچارے بیٹے کو لینے اسٹیشن جاتے مگر بے نیل و مرام لوٹتے۔

اس طرح کوئی دو ہفتے گزر گئے۔ ایک روز آپ کے ایک دوست نے بیرسٹر صاحب کو منہ میں چرٹ دبائے، کتا بغل میں لئے، ایک میم صاحبہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی تفریح گاہ میں چہل قدمی کرتے دیکھا اور آپ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ بڑے میاں ابھی یہ گتھی سلجھا ہی رہے تھے کہ ایک اور صاحب تشریف لائے، انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ آپ کے صاحبزادے کو وطن پہونچکر کوئی دو ہفتے ہوتے ہیں اور وہ فلاں ہوٹل میں مقیم ہیں، اُن کو یہ شکایت ہے کہ تار بھیجنے کے باوجود نہ آپ اسٹیشن آئے نہ انہیں لینے کسی کو بھیجا۔

واقعہ یہ ہوا کہ بیرسٹر صاحب نے اپنے ورود کی جو تاریخ تار میں بتائی تھی اسی دن وہ تشریف لائے۔ ٹرین سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھا کوئی آپ کی پیشوائی کو آتا نظر نہ آیا۔ ٹیکسی لی اور ایک ہوٹل میں اُتر پڑے اب جو بڑے میاں نے یہ خبر سُنی تو یہ بیچارے اگلے وقتوں کے بھولے بھالے آدمی پریشان ہوئے کہ آخر یہ کونسی خفگی کی بات تھی کہ پندرہ روز ہوگئے ماں باپ کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کیا۔ اولاد کی محبت بُری ہوتی ہے، فوراً ہوٹل پہونچے، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس نام کے ایک صاحب فلاں کمرے میں مقیم ہیں۔ کمرے کے اندر جانا چاہا تو خانساماں نے کارڈ مانگا۔ یہ پُرانی وضع کے آدمی کارڈ کیا جانیں، پریشان ہوکر پوچھا "بھائی تم کیا مانگتے ہو؟" خانساماں سمجھ گیا کہ بڑے میاں آجکل کی تہذیب سے بالکل کورے ہیں، وہ خود ہی ایک سادہ کارڈ اُٹھا لایا اور اس پر نام لکھنے کو کہا اور عرض کی کہ یہ کارڈ ہم صاحب کو دیں گے اگر وہ آپ کو طلب کریں تو آپ کمرے میں جاسکتے ہیں۔ انہوں نے کہا "بھائی میں کسی صاحب بہادر سے ملنے نہیں آیا، میں تو اپنے لڑکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے ملنے آیا ہوں جو ولایت سے بیرسٹر ہوکر آیا ہے" خانساماں نے کہا "جی ہاں! اس نام کے ایک صاحب اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، خواہ وہ آپکے بیٹے ہوں یا کوئی اور یہاں کا یہی قاعدہ ہے"

بڑے میاں نے لرزتے ہاتھوں سے کارڈ پر اپنا نام لکھ کر خانساماں کو دیا، وہ لیکر کمرے کے اندر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آکر کہا "اس وقت صاحب تاش کھیل رہے ہیں آپ تھوڑی دیر انتظار کریں" کوئی آدھے گھنٹے کے بعد گھنٹی بجی اور آپ کی طلبی ہوئی، پدر بزرگوار کو دیکھکر صاحبزادے اُٹھ کھڑے ہوئے اور "گڈ مارننگ" کہکر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ بڑے میاں مصافحہ کرکے بیٹھ تو گئے مگر لگے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صاحبزادے کو دیکھنے کہ یہ اُن کا پیارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہی ہے یا کوئی صاحب بہادر ہیں۔

اس پریشانی میں سامنے تپائی پر جو نظر پڑی تو ایک شیشہ ارغوانی رنگ کے شربت سے آدھا بھرا رکھا دیکھا، شیشہ کے اُس پاس کانچ کے دو چار خوبصورت جام دھرے تھے۔ ایک میز پر تاش کے پتے بکھرے پڑے تھے اور وہیں کچھ ریزگاری بھی موجود تھی۔ بڑے میاں ان چیزوں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور بیرسٹر صاحب تین پتوں کے کھیل میں مشغول تھے۔ بڑے میاں نے آخر تنگ آکر کہا "بیٹا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھر کیوں نہیں آئے! یہاں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

بیرسٹر صاحب کے ایک دوست نے آپ کی طرف بغور دیکھکر پوچھا "آپ کی تعریف؟" برخوردار صاحبزادے نے انگریزی میں جواب دیا "یہ ہمارے پڑوسی اور والد کے دوست ہیں!" اتنے میں بڑے میاں نے ان ہی صاحب سے کہا کہ "دیکھئے جناب! یہ میرا لڑکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے، تعلیم کیلئے یورپ گیا تھا خُدا جانے کیا ہوگیا کہ ہم سب کو بھول بھال کر یہاں ہوٹل میں آبیٹھا ہے،

ماں اُدھر انتظار میں مری جا رہی ہیں، خدارا آپ ہی کچھ سمجھائیے" یہ سُنکر اُنہوں نے بیرسٹر صاحب کو خُوب لتاڑا آخر خُدا خُدا کرکے ماں سے ملنے آپ گھر آئے۔

ماں بیچاری ماں مامتا کی ماری بیٹے کے دیدار کو ترس رہی تھی، جب آپ اندر گئے ماں کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے اُمڈی ہوئی تھیں اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر بلائیں لینی چاہیں۔ ماں کے دونوں ہاتھ اپنے مُنہ کی طرف آتے دیکھکر آپ گھبرائے کہ بڑی بی منہ نوچنا چاہتی ہیں۔ جھٹ لپٹتے دونوں ہاتھ بڑھا کر روکنا چاہا۔ جب ماں بیٹے کے ہاتھ چار ہوئے تو بڑی بی کا توازن قائم نہ رہ سکا اور وہ غریب بیچاری دھڑام سے چت ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اُس کو اُٹھا کر پلنگ پر لٹایا گیا تو آپ قریب آئے اور پوچھا "ممّا! تم کیسا ہے؟" ماں مزاج پرسی کے یہ مہذب بول سُنکر بہت پریشان ہوئی، آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ایک صاحب بہادر کھڑے ہیں، سر پر تنکوں کی اُلٹی ٹوکری رکھی ہوئی ہے، ایک بے ڈھنگا شلوکہ زیب بدن ہے جس میں نیچے اُوپر کئی تھیلیاں لگی ہیں، مُنہ میں موٹی سی اگربتّی سُلگ رہی ہے، لچھے دار دُھواں نکل رہا ہے مگر اگر کی سی خوشبو نہیں، ایک سُرخ دھجی اینچی اُونچی گرہ دی ہوئی بل کھائی ہوئی گلے میں لپٹی ہے اور ایک سفید سفید پٹّہ گلے کے اطراف میں پڑا ہے۔ جلدی سے بڑی بی نے مُنہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا "ارے یہ موا کہاں سے گھُس آیا، اے صاحب کیا میں ایسی بیمار ہو گئی تھی کہ بڑے ڈاکٹر کو بلوایا اور مجھکو بے پردہ کر دیا؟ میرا بچّہ کہاں ہے؟" بڑے میاں نے کہا "یہی تو تمہارا لڑکا ہے۔ ولایت جا کر بڑا صاحب بنکیا!" ماں کی محبت کو جوش ہوا، بیٹے کو گلے سے لگا لیا، ماں پوچھتی کچھ ہے اور یہ جواب کچھ دیتے ہیں۔ چند ہی سال میں اپنی زبان بھُول گئے، آپکے رگ و ریشہ میں مغربیت کچھ ایسی سرایت کر گئی کہ اپنے وطن کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی۔ خوراک، لباس، مکان، غرضکہ ہر چیز میں مغربیت رچ گئی۔ مغربی ماحول نے کچھ ایسا جادو کر دیا کہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے مغرب ہی مغرب نظر آنے لگا۔ دماغ میں کچھ ایسی فرعونیت سما گئی کہ ہندوستان سے سیدھے مُنہ بات کرنا کسرِ شان سمجھنے لگے۔ بیرسٹری دھری کی دھری رہ گئی۔ باپ کی جائیداد پر گزر بسر ہو رہی ہے۔ مُشتے نمونہ از خروارے۔ یہ ایک مثال مغرب پرستی کی پیش کی گئی ہے

آجکل ہماری خواتین میں بھی مغرب پرستی کی وبا خُوب پھُوٹ پڑی ہے، مغربی عورتوں کی طرح اُن کے لباس اور سنگار کی اختراعات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ضرورت سے زیادہ فیشن اور سنگار کی مصروفیتیں عورت کو اُسکے فرائض سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ مغرب کی تہذیب اور اُس کی طرز معاشرت پر اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مغربی عورت اپنے اصلی اور جبلّی فرائض سے کس قدر دُور جا پڑی ہے، گھر کی مسرّتیں تو رہیں ایک طرف مغرب کا کوئی گھر ہی نہیں رہا اس لئے ایسی تقلید کا خیال جو گھر کی مسرت کو فنا کر دے اور عورت کو اُس کے فرائض سے غافل کر دے قطعاً قابل ستایش نہیں ہو سکتا۔

ہماری معزز بہنیں غالباً مغربی خواتین کی گھریلو زندگی سے واقف نہیں ہیں، آج یورپ کے اکثر مرد اپنی عورتوں کی آزادی اور فیشن پرستی کی وجہ سے بیزار ہیں عورت کی اسی نام نہاد آزادی نے مغرب کی زندگی کے توازن کو اس قدر خراب کر دیا ہے کہ ایک لمحہ کا بھی حقیقی آرام اور چین نہ مرد کو نصیب ہے نہ عورت کو۔ مغرب کی یہ عورت جو آزادی کا انتہائی نمونہ ہے، عورت

تو نہیں رہی اور نہ اُس کو مرد ہی کہہ سکتے ہیں اس لئے وہ ایک تیسری جنس بن گئی ہے جس کو مغرب کی فضا نے پیدا کیا ہے۔ ہندوستان میں بھی اب وہی اسباب پیدا ہو رہے ہیں جنہوں نے مغرب کی عورت کو ایک نئی جنس بنا دیا ہے اور اُسکی نسائیت اور اُسکی گھریلو زندگی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

ہماری بہنوں کو مغرب کی تقلید اس طرح کرنی چاہیئے کہ سب سے پہلے اپنے گھروں کو پاک صاف رکھیں، سامان کو سلیقے اور قرینے سے سنواریں، گھر کے گوشہ گوشہ کی صفائی کا خیال رکھیں، صحن کو گملوں اور خوشنما پودوں سے آراستہ کریں کہ درخت ہر آنے والے کو دعوت نظارہ دیتے ہیں اور خراب گیاس کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں، اپنی معاشرت کو حتی الامکان سادہ بنائیں، فضول خرچی سے احتراز کریں، خرچ کو آمدنی سے بڑھنے نہ دیں، قرض لیکر غیر ضروری سامان خریدنے اور قیمتی لباس بنانے کے عوض ہزار درجہ بہتر ہے کہ کم قیمت سادہ مگر صاف ستھرا لباس اختیار کریں۔

ہماری معاشی اور اقتصادی حالت روز بروز بدتر ہوتی جارہی ہے، اس کی ذمہ داری مردوں کے علاوہ خواتین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر ملازمت اور تجارت پیشہ اشخاص اقسام کی مصروفیات کی وجہ سے گھر کے کاروبار میں دلچسپی لینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ملازمت پیشہ حضرات تو اپنی کامل آمدنی اپنی گھر والی کے سپرد کر کے ہر قسم کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، گھر کے خرچ کو آمدنی سے بڑھنے نہ دینا بیوی کا اہم فرض ہے اور جہاں اسراف کی عادت پڑ جاتی ہو وہاں باوجود اقسام کی جائز اور ناجائز معقول آمدنیوں کے قرض کی مقدار میں آئے دن اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ہماری خواتین کو چاہیئے کہ اپنی مغربی بہنوں سے وقت کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں۔ بیکاری، دوسروں کی عیب جوئی، غیبت، فضول گپ شپ اور ضرورت سے زیادہ فیشن اور سنگار کی مصروفیات میں اپنا عزیز وقت برباد نہ کریں۔ اپنی زندگی کا ایک نظام العمل بنائیں۔ کام کرنے کے اوقات کا تعین کریں، گھریلو صنعتیں حاصل کریں، بچوں کی صحت اور تربیت کا خیال رکھیں، اُمور خانہ داری میں تہذیب و ترتیب پیدا کریں اور اوقات فرصت میں کبھی مطالعہ کتب و اخبار بینی سے جی بہلائیں، کبھی سنیما یا کلب چلی جائیں اور کبھی سیر و تفریح کیلئے کھلی فضا میں نکل کر قدرتی مناظر کا لطف اُٹھائیں۔ اس قسم کی سیر و تفریح کیلئے ایسے مقامات کا انتخاب کریں جہاں تازہ ہوا ملے اور اچھے منظر دیکھنے میں آئیں مگر غیروں سے مڈبھیڑ ہونے کا زیادہ اندیشہ نہ ہو۔ اگر اپنے اوقات کی اس طرح تنظیم کر لیں تو اُن کا ایک لمحہ بھی رائیگاں نہیں جا سکتا۔

آخر میں ہم اپنی معزز بہنوں سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ وہ گھر کے اندر رہیں یا ہوٹلوں اور پارٹیوں میں ڈانس کریں، موٹر چلائیں یا ہوا میں اُڑیں، کشتی رانی کریں یا گھوڑے دوڑائیں، چراغ خانہ ہونا پسند کریں یا شمع انجمن بنیں، اسٹیج پر رونق افروز ہوں یا پردۂ فلم پر جلوہ گر!

مگر ذرا سا خیال رکھنا کہ پیاری بہنو وطن تمہارا
نہیں ہے بدقسمتی سے یورپ غریب بدبخت ایشیا ہے

مرزا سیف علیخاں

گاؤں اور شہر

شہباز نگر سے دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا جس کو موہن پور کہتے تھے۔ موہن پور دو زمینداروں کا تھا۔ ایک تو ذات کے ٹھاکر تھے دوسرے برہمن۔ ان دونوں خاندانوں میں بڑا میل ملاپ تھا۔ ٹھاکر جی کا نام پرتاب سنگھ اور پنڈت جی کا نام وشنودت۔ ٹھاکر جی اور پنڈت جی دونوں نوجوان تھے۔ بیس کے کچھ ہی اوپر عمریں ہوں گی۔ دونوں کے پاس ایشور کی کرپا سے دھن کی کمی نہ تھی۔ یہ دونوں زمیندار بڑے نیک اور سیدھے تھے۔ ان کے پتاؤں نے انہیں اب تک شہر کی صورت بھی دیکھنے نہ دی تھی حالانکہ شہباز نگر کا فاصلہ ہی کیا تھا۔ یہ لوگ اپنی کھیتی کسانی میں مست خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دونوں کے پتا سرگباش ہو چکے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ پنڈت جی کے ایک رشتہ دار شہر سے آئے اور بولے :-

رشتہ دار:- وشنودت، آجکل کیا ہو رہا ہے۔

وشنودت:- کیا ہو رہا ہے! کل سے کٹائی شروع ہوگئی ہے۔

رشتہ دار:- کیا حال ہے؟

وشنودت:- حال کیا ہے۔ فصل اب کی اچھی نہیں ہو سکی۔ پندرہ دن ہوئے جو اولے پڑے تھے انہوں نے لٹیا ڈبو دی۔

رشتہ دار:- یار تم تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی کسانی کے ہاتھوں بک گئے ہو۔ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟

وشنودت:- کیا کہا بھائی میں تو سمجھا نہیں۔

رشتہ دار:- ارے بھائی۔ ذرا شہر میں رہو تو یہ سب کتھا بھول جاؤ۔

وشنودت:- کیسی کتھا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

رشتہ دار:- ارے یہی فصل کی رام کہانی۔ کبھی شہر بھی دیکھو۔

پنڈت:- شہر میں کیا دھرا ہے۔

رشتہ دار:- کیا دھرا ہے۔ ذرا چلو تو پتہ چلے آج کل ایک تھیٹر کمپنی آئی ہوئی ہے۔ اس میں ایسی ایسی خوبصورت عورتیں ہیں کہ سارا شہر بس لٹو ہو رہا ہے۔

پنڈت:- یہ تھیٹر کسے کہتے ہیں آپ، اور یہ عورتیں اس میں کیا کرتی ہیں۔

رشتہ دار:- (قہقہہ) واہ رے مورکھ۔ ارے تھیٹر میں سوانگ ہوتا ہے اور اس میں یہ عورتیں کام کرتی ہیں۔

پنڈت:- اور دیکھنے میں کیا لگتا ہے؟

رشتہ دار:- کیا لگتا ہے! کوئی دس بیس ہزار۔ ارے پانچ روپیہ تین روپیہ، دو روپیہ ایک روپیہ آٹھ آنے ٹکٹ ہے۔ چلو نا۔

پنڈت:- اچھا لیکن ٹھاکر کو بھی بلا لیں۔

رشتہ دار:- شوق سے، ایک سے دو بھلے۔

چنانچہ اسی دن سورج بیٹھے یہ تینوں آدمی موہن پور سے چلے۔ گھنٹہ بھر سے کم میں شہر پہونچ گئے۔ اور آٹھ بجتے بجتے یہ لوگ تھیٹر کے سامنے آ دھمکے۔

یہاں شور وغل برپا تھا۔

آوازیں:- بابو جی۔ مجھے ٹکٹ۔ دو روپے والا۔

دوسری آواز:- مجھے تین روپے والے تین ٹکٹ دیجیے، بابو جی — !

تیسری آواز:- ارے مرا ہاتھ پسا۔ ہٹ ادھر۔ بابو جی آٹھ آنے والے چار۔

پنڈت:- یہ کیا ہے بھائی!

رشتہ دار:- ہے کیا۔ اس کھڑکی میں ٹکٹ ملتا ہے۔

ٹھاکر:۔ تو جا کے مہاراج تین ٹکٹ لے آیئے۔ پنڈت جی، یہاں تو بارے روشنی کے دن معلوم ہو رہا ہے۔

پنڈت جی:۔ ہاں بھئی، میں تو حیران ہوا جاتا ہوں۔

رشتہ دار:۔ پانچ روپیہ والے تین ٹکٹ دیجیے بابو!

بابو:۔ لیجئے صاحب۔ یہ پانچ روپیہ واپس۔ دس کے دو نوٹ آپ نے دئے تھے۔ روپیہ پرکھ لیجئے۔

تینوں آدمی ٹکٹ خریدنے کے بعد آکر تماشہ گاہ میں بیٹھے۔

وشنو دت:۔ تماشہ شروع ہونے میں کیا دیر ہے!

رشتہ دار:۔ بس کوئی منٹوں کی کسر ہے۔

گھنٹی کا بجنا۔ پردے کا اُٹھنا۔

سہیلیوں کا گانا۔

سکھی آؤ مل مل ناچیں گائیں۔

پہلا آدمی:۔ خبردار۔ گانا موقوف کرو۔ میرے کچھ دوست آ رہے ہیں۔

بیروں کی آواز۔

پہلا آدمی:۔ آیئے آیئے، صاحبان، بوائے شراب۔ جلدی لاؤ ـــ!

گلاس اور بوتل آتی ہے۔ قہقہے، باتیں۔ ایک شخص داخل ہوتا ہے۔

پہلا آدمی:۔ آئیں۔ تم کیسے آئے۔ نکل جاؤ یہاں سے فوراً۔

نو وارد:۔ میں نکل جاؤں۔ اچھا نکلا جاتا ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے ان بھولی چڑیوں کو جن کو آج تو اپنے دام میں اسیر کرنا چاہتا ہے۔ تیرا حال ضرور سُنا کر جاؤں گا۔

اُو فریبی انسان، تو میرے ہی لئے ہوئے مکان سے مجھے نکال رہا ہے۔ حضرات یہ شخص جس کے آپ حضرات مہمان ہیں۔ انتہائی بے ایمان اور فریبی ہے۔ یہ بھولے بھالے دیہاتی زمینداروں کو شہر لاتا ہے اور اُنہیں بائیسکوپ، تھیٹر، شراب اور گانے کے جال میں پھنسا کر خوب لُوٹتا ہے۔ میں بھی ایک زمیندار تھا۔ آہ میری کُل دولت اِس نے دو سال میں تباہ کر دی اور آج میں پیسہ پیسہ کو محتاج ہوں۔ خُدا کیلئے اس انسان کے پھندے سے بچئے۔

وشنو دت:۔ بھیا ٹھاکر۔ اُٹھو گھر چلیں۔

ٹھاکر:۔ ہاں بھیا میرا بھی جی یہی چاہتا ہے۔

رشتہ دار:۔ ارے کہاں کہاں۔ واہ بھائی۔ ابھی تو تماشہ ذرا ہی سا ہوا ہے پورا دیکھ تو لو۔

وشنو دت:۔ نہیں بھائی بس دیکھ لیا اور اتنا دیکھ لیا کہ تمام جیون بھولنا مشکل ہے۔

رشتہ دار:۔ ہا ہا ہا۔ ارے تم پر تماشہ نے اثر کر لیا۔ واہ وا۔

ٹھاکر:۔ ہاں بھائی صاحب۔ بھلے گھوڑے کو ایک چابک اور بھلے آدمی کو ایک بات بہت ہوا کرتی ہے۔

پنڈت اور ٹھاکر دونوں اُسی وقت تھیٹر سے باہر نکل آئے اور موہن پور کو روانہ ہو گئے۔ راستے بھر اُن کے سامنے اس مغموم ایکٹر کی صورت رہی جو رو رو کر اپنی فرضی تباہی کی داستان سُنا رہا تھا۔

وہ گھڑی ہے اور آج کی گھڑی۔ پنڈت اور ٹھاکر دونوں نے شہر کا مُنہ نہیں دیکھا۔ دونوں اپنا جیون آرام سے گُذار رہے ہیں۔

بہزاد لکھنوی

نکات

نغمہ ہے خودی جس کی ناقص ہو شعور اسکا
بے لطف کلیم اس کا بے تاب ہے طور اسکا

آزادی نہیں جب تک اب تک ہے بہت باقی
بے کیف حیات اسکی بے لطف سرور اسکا

دنیا ہے تموج میں دریا کی خودی پنہاں
گرداب کے چکر پر ساحل کی خودی نازاں

ہر چیز خودی سے ہے آزادی کی ہمساوی ہو
ہو مہر درخشندہ ہیں ہو ان کی خودی تاباں

احساسِ خودی ہی سے بلبل کا ترانہ ہے
پھولوں کی دل آویزی خوشرنگی پیمانہ ہے

احساسِ خودی سے ہو احساسِ حقیقت کا
پر ضبط نہیں جس میں بے ربط فسانہ ہے

بادل کی گرج میں ہے بادل کی خودی مضمر
بجلی کی تڑپ میں ہے بجلی کی خودی مضمر

کہتے ہیں خودی جس کو آئینہ ہے جوہر کا
بن اس کے آئینہ ہے ہستی کا نہیں جوہر

امین حزیں (سیالکوٹی)

بچپن

ابھی چند ہی روز کا ذکر ہے کہ لائبریری صاف کرتے ہیں عصمت کے پرانے پرچے نظر پڑے۔ ایک عنوان دیکھکر خیالات نہ معلوم کہاں سے کہاں دوڑ گئے۔ یہ مضمون مس حجاب اسمٰعیل کا تھا اور عنوان "بچپن" تھا۔

مس حجاب اسمٰعیل (جبکہ وہ مس حجاب اسمٰعیل تھیں) اخباروں کی ہیروئن تھیں ایک رومانٹک سا نام جس میں کچھ جدت، کچھ نزاکت اور کچھ افسردہ حسن کی جھلک تھی۔ اور پھر اُن کے مضمون! "اوہ" "ہوں" نقطوں کی مسلسل قطاریں، دریچہ "سمندری کوٹ" "کامیدہ جسم" "موم بتی کی لو جیسی انگلیاں" "ڈاکٹر گار" "بوڑھی کبینس" "چوہیا زوناٹس" اور ایسی ہی اور عقل سے بالاتر باتیں کچھ عجب سا یوقوف بنجانے پر مجبور کرتی تھیں۔

آمدم برسرِ مطلب۔ تو یہ مضمون اُن کے سُریلے بچپن کے متعلق تھا ہمیں ایک زیرِ لب مُسکراہٹ کا مرہونِ احسان ہونا پڑا۔ بچپن! جسے دیکھو بچپن کے شیریں نغمے الاپ رہا ہے۔ "بے فکری کا زمانہ" "مسرت سے لبریز گھڑیاں" اور "کھیل کود کے دن" عموماً بچپن سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہم خود جب سب کو بچپن کی مزیدار باتیں اور مختلف قسم کے لاڈ پیار کے قصّے سُناتے دیکھتے ہیں تو اصلیت کو ذرا "ویسا" کر کے سُنا دیتے ہیں۔ "یوں کھیلا کرتے تھے" "یوں اماں جان نے پیار کر کے کلیجہ سے لگالیا" "یوں کھلونے تحفہ میں آیا کرتے تھے" آپ ہی بتائیے کیا کریں کیا سب سے کہیں کہ کبھی جان بچی لاکھوں پائے۔ اچھا ہوا کہ وہ ناپائدار زمانہ گذر گیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں جو یہ ناپائدار نہ ہوتا تو ہم لوگوں کا جن کے نہ تو "چچا گار" نہ "کیپٹن ہارلی" اور نہ "کاہیدہ جسم" اور نہ کبھی قہوہ وغیرہ ملے نہ چاکولیٹ کے بنڈل کھانے کو ملیں، کیسے گذر ہوتا۔ ہم تو جب تک چھوٹے رہے مداری کے بندر جیسی حالت رہی۔ صبح ہوئی اور آپا نے لوٹا اور منجن کا بیڑا سنبھالا اور پوری فوج کا مُنہ دھلانا شروع کیا۔ اب لاکھ کہتے ہیں۔ ہنک ہنک بھئی کل ہی تو مُنہ دھویا تھا۔ تو بعد ایک دھموکے کے جواب ملتا ہے: "پھر روٹی بھی آج مت ٹھونسنا کل ہی تو کھائی تھی"! اب دیکھئے جواب ان کی فلاسفی کا! اب بھر

بھر کے کڑوے منجن منہ میں بھر بھر کے رگڑے دے رہی ہیں۔ تو نشانہ تو باندھتی نہیں۔ کبھی انگلی پھسل کر ناک میں گھُس جاتی ہے تو کبھی گال کو رگڑتے منجن کے کھتے دیتی ٹھوڑی پر پہونچ جاتی ہے۔ گردن پر اس طرح پانچوں انگلیاں پیوستہ جیسے زیادہ کرایہ مانگنے والے تانگہ والے کو دھکّے دئیے جاتے ہیں۔ بہتیرا ٹھنک رہے ہیں مگر کچھ شنوائی نہیں۔

ذرا سوچئے اب ذرا سے کالے رہ جائیں گے تو کیا ہرج ہو جائے گا نہیں ہم ہر دکھوے کو جا رہے ہیں۔ جیسا کہ خود آپا میلے ہوئے کپڑے پہناتے ہوئے فرماتی ہیں۔ روز صابن کے رگڑے، جو مزاحمت کرو تو حکم ملتا ہے۔ "اگر روئی تو بیچ بیچ آنکھوں میں صابن گھُسیڑ دوں گی"! گویا اب تک صرف جھوٹ موٹ گھُسیڑ رہی تھیں۔

اب مُنہ دھلنے کے بعد تولیہ کے داؤں دکھانے شروع کئے وہ سپاٹے لگانے شروع کئے گویا کوئی چپٹی سینی ہے جو دمکائی جا رہی ہے۔ خواہ ناک تولیہ ہی میں لپٹی چلی جائے مگر رود مت۔ سارے مراحل طے ہونے کے بعد جو کہا "کھانا"! تو کہا جاتا ہے "اُئی توبہ ہے ایسی بھی کیا بلبلاہٹ ہے، صبح ہوئی اور روٹی کا پیٹنا پڑ گیا۔ ابھی چیل کوّوں نے کوڑا بھی نہ کریدا ہوگا۔ ایسا ہی ہے تو پیٹ سے روٹی باندھ کر سویا کرو"! کہو بھلا پھر مُنہ کیوں دُھلا چیل کوّوں کا کب دُھلتا ہے۔ مُنہ انسان دھوتا ہے کھانے کے لئے ایک دن جو ہماری شوکت آپا بیچاری نے روز روز کی منجن بازی سے تنگ آکر کہیں کہدیا کہ "بھئی ہم آج مُنہ نہیں دھوئیں گے کیونکہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے"! تو آج تک اُن کی کھینچل ہوتی ہے۔

اب ناشتہ کا دور شروع ہوا۔ آپا بیچاری کا تو یہ کہ انہوں نے تو رات کے کوفتے گرم کر لئے اور باسی روٹی میں گھی اور پانی کا چھینٹا دے کر باسی کوسی کھالی۔ اور ہم چائے پئیں۔ آپا کو چائے خود ہی کرتی ہے۔ اب اگر چائے میں شکر نہیں ڈالی تو پھر لیجئے ایک کھانی پھاندئیے۔ جو مانگی تو کہا گیا "توبہ ہے دو ہاتھ ہیں اُن سے کیا کیا کروں۔ بچی ذرا چھری تلے دم تو لے۔ شکر پر مری جاتی ہے۔ چیونٹی کہیں کی۔ لو"! جو تھوڑی دیر منانے کے بعد ویسے ہی

بی بی تو اور آفت" اللہ رے نہ بدن! ذرا صبر نہ ہوا وہ پھیکی بی غٹ غٹا گئی۔ لڑکی ذات ہو کر ایسی ندیدی۔ کیا پھیکی بھی نہ لگی ؟"

یہ عورت ذات ہو کر تو میری بڑی مٹی خراب ہوئی۔

ابھی ناشتہ سے فارغ ہو کر دو ہی تین چکر لگائے ہونگے کہ "ماسٹر صاحب آگئے" کی صدا آگئی۔ خون میں ایک قسم کی کمزوری سی حالت آگئی۔ رگ ریشوں میں دم نہ رہا۔ بتا چاہا مچل جائیں نہ معلوم کیا کریں۔ اب کتابیں ڈھونڈتے ہیں تو وہ نہیں ملتیں۔ کمبخت دوات کرسی پر رکھی تھی "آپ ہی تو الٹ گئی"۔ تختی دھونا یاد ہی نہ رہا۔ قلم پر باجی مع اپنے تندرست جسم کے کھڑی ہو گئیں۔ گھر کے بس کرنے کے لئے اس کونے تک "اے بھئی" "ہائے اللہ" کرتے چکر کاٹ رہے ہیں خیر خدا خدا کر کے کل مرحلے طے ہوئے اور چوتڑے پر مسئلہ تعلیم نسواں حل ہونے لگا

کمبخت ایک کتاب آفت ہو کر چپٹ گئی۔ ابتیاں کے روز روز کے تبادلوں نے ایک مستقل مدرسہ تو ہم لوگوں کی قسمت کا رکھا نہیں۔ نئی جگہ گئے، پھر سے وہی مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کا قاعدہ یا پہلی دوسری کتاب شروع کر دی۔ کتاب کا رنگ و روپ اور قد و قامت کچھ ایسا ہو گیا کہ ہم ٹٹول کر بتا سکتے تھے کہ یہ ہماری کتاب ہے۔ مگر اس میں جو بیش بہا مضامین تھے اُن سے ہم کورے ہی رہے۔ نہ معلوم کیسا طریقۂ تعلیم تھا کہ مہینوں گھگنوں پر ہاتھ پھیرتے مگر کسی طرح کچھ نورِ علم ہم پر نزول نہ فرماتا۔

اب دل خانہ خراب ہے کہ نہ معلوم کہاں بہتا چلا جاتا ہے اپنی حالت کو دیکھتے اور دنیا پر نظر ڈالتے۔ حسینا بھی برتن مانجھ کر کبڈی کھیل رہا ہے۔ اس کی "بڈ بڈ" پر بے اختیار آنکھ اٹھ جاتی۔ منگیا بھی گوبر تھاپ کر مزے سے ہمارے سامنے ہی جامنیں جھاڑ جھاڑ کر کھا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ڈھالو اور بلکا باوجود دبلے ہونے کے آزادی سے دوڑتے۔ اور ہم "پل پر جا" "وہ اس کا دیور ہے" "گنگا جمنا سے بڑی ہے!" بکا کرتے۔ وائے بر حال ما۔

جب ماسٹر صاحب مطمئن ہو جاتے کہ ہم لوگ باقاعدہ ٹھیک ٹھاک چکے اور مرے بازؤوں اور رانوں پر خوب گہرے گہرے نیل پڑ چکے (عورت ذات ہونے کی وجہ سے ماسٹر صاحب مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے بلکہ نہایت میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتے تھے اور حکم تھا کہ اگر "اندر" بتایا تو مار ڈالیں گے۔ جب نہلاتے میں آپا یہ نیل دیکھتیں تو ان میں ایک نیل کا اور اضافہ کر دیتیں کہ کیوں ایسی جگہ جاتی ہے جو گر کر نیل ڈالتی ہے۔) اب املے کی باری آتی۔ یہ بدبخت سیاہ روشنائی نہ معلوم کن پاسٹفلہ طریقوں سے تیار کی جاتی ہے کہ ہمارے قابو میں تو کبھی اس کا قوام آیا نہیں۔ کبھی تو ایسی کہ شوربا لو تو لو تھڑے کے لوتھڑے چلے آتے ہیں اور کبھی یہ کہ دھر دھر کے قلم ٹھوک رہے ہیں اور سیاہی پھیکی پھدک۔

خدا خدا کر کے چھٹی ملی۔ بستہ بغل میں بدبودار سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیاں، تختیاں گھسیٹتے، منہ بسورتے چلے آرہے ہیں۔ جو کسی نے کہدیا "بیٹیں! مت رو بچاری" بس وہیں پسر گئے۔ اب جو کہتے ہیں "بھوکی کھانا" تو جواب ملتا ہے "بچے کھالو۔ اے ہاں نہیں تو! کھالینے پہ ہر چیز صقیل۔ بہت گرم، بہت ٹھنڈی اور دیر ہضم ہو جاتی ہے۔ بوٹی مانگو تو جواب ملتا ہے: "میری بوٹیاں نوچ لو" جو کہا "ہمیں بھی انڈا دو چنو کو جو دیا" تو جواب ملتا ہے "اب کھانچی لاؤ تو انڈے بھی دوں اور کیا میرے باوا نے دفتر و ڈر رکھوا دی ہے" آپا بچاری کو بس چند گودے کی ہڈیاں، ایک آدھ سینے کی یا گردن کی ہڈی مل گئی وہ انہوں نے کھالی سالن نہ بچنے کی وجہ سے دو تین انڈے تلوا لئے۔ بانٹنے والے کی یہی تو خرابی ہے کہ "الٹا سیدھا" ملتا ہے۔ دوپہر کو چُن چُن کر سب کی ایک قطار بنادی جس کی ٹٹی لگی ہے پنکھا چل رہا ہے۔ ہم پر دفعہ ۱۴۴ قائم ہے۔

ہو مت
کروٹیں مت لو۔
فرش پر لوٹیں مت لگاؤ۔
خربوزے تربوز جو ٹٹی پاس رکھے ہیں انہیں گنو مت نہ ہی چھوؤ۔
پنکھے کی جھالریں جھولو مت۔
گھس کر مت لیٹو۔
یہ مت کرو۔
وہ مت کرو۔

اب ذرا ان "متوں" پر غور کیجئے۔

ٹٹی کے کمرے سے چھوٹتے ہی چنو اور شمیم تو کھیلنے چلے جاتے لیکن "عورت ذات گڑیاں کھیلتی۔ قول ہے کہ "ڈھنگ سے بیٹھکر گڑیاں کھیلو۔ سلیقہ آتا ہے"

کیا بتاؤں مجھے اِن کمبخت گڑیوں سے کیسی للّہی بیر ہے۔ اِن گڑیوں سے کوئی کیا کھیلے۔ بیچون کی شکل کپڑوں کے ڈھیر تھے کہیں اگریزوں والی بات تھوڑی تھی کہ چاہے نہلاؤ دھلاؤ کچھ نہیں بگڑتا۔ یہاں تو یہ حال کہ دو دن میں چوہا۔

گڑیوں میں عام طور پر بیاہ کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ ہماری بہت سی گڑیاں سکین ایک چلکٹ سا گڈا اور ہی فرداً فرداً ہر گڑیا کا خدائے مجازی بنتا۔ اگر کبھو بھی گڈے اور بنوا دئے جائیں تو نہ معلوم کس سالکوادھکل نقطۂ نظر سے جواب ملتا "نہیں بس گڑیوں سے کھیلو۔ گڈے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ابھی رسم کتخدائی ختم بھی نہ ہونے پاتی کہ . . . .
مولوی صاحب آ گئے . . . . . "کل حواس کھوسے جاتے جی چاہتا سو جائیں۔ مگر کہاں؟ دو تین جھنجوڑیاں دیکر کھڑے کر دئے جاتے۔ چلئے قاعدہ سنبھال کر۔ راستہ میں ذرا پانی پینے رکے تو چنتو بضد ہیں "اب چلو کیا بیٹے جاؤگی؟" کبھو بھی تجھے کیا تو تو جا۔ مگر وہ ہے کہ ڈٹا کھڑا ہے۔ آپ خواہ نوگلاس پی جائیے، وہ ساتھ لیجا کر چھوڑیگا۔

جھوم جھوم کر سبق شروع ہوا۔ انکھہ، اونکھہ، اینکھہ تانکھہ، تونکھہ تینکھہ۔ چلاچل۔ پھر وہی اصطلاح شروع ہوا۔ قاعدہ کا صفحہ زیادہ غیر دلچسپ ہونا شروع ہوا۔ پیلے پیلے کاغذ پر سیاہ بدوضع حروف منہ چڑانے لگے۔ ادھر اُدھر دیکھنے کو دل چاہا۔ ہر چیز ہماری توجہ کی محتاج نظر آنے لگی۔ چنتو کی گیند جو کسمپرسی کی حالت میں موری پاس لڑک رہی تھی۔ آپا کا الگنی پر پڑا ہوا دوپٹہ۔ درخت کے پتے، مولوی صاحب کی ٹوپی کا پھندنا۔ شمیم کا اٹھا ہوا سرخ کان، سبق سے زیادہ حسین اور دلچسپ معلوم دینے لگے۔

گھر میں آپا کی وہی حیثیت تھی جو آج کل ہٹلر اور مسولینی کی ہے۔ احکاماتِ اعلیٰ وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کے لئے محکمہ جاتِ تدریس میں صادر ہوتے رہا کرتے تھے۔ ایک سپارہ ختم کرتے ہی محسنہ کو "عورت ذات" کی فلاح و بہبود کی فکر ہوئی اور کہلا بھیجا کہ قرأت سکھائی جائے تاکہ دین و دنیا دونوں روشن ہوجائیں۔ کھل گئی ہوتی جنت کی کھڑکی۔ مگر اس گنہگار سے قرأت قابو میں نہ آنا تھی نہ آئی۔ یا تو یکلخت چھ چھ تانیں نکل پڑتیں۔ یا گلے میں صرف ایک عدد پھندا پڑکر ہچکی آجاتی۔ جو چٹکی کے ایک شیریں جھکولے سے مجروح ہوکر ایک نیم جان تان پر دم توڑ دیتی، اتنی دیر میں مسائل تصوف حل کرتی چنتو کنکھیوں پر ہاتھ پھیرتا جاتا اور میری حالتِ زار پر مسکراتا جاتا۔ شمیم خود ایک ناقدانہ مسکراہٹ کے ساتھ غور سے میری ہر حرکت کو نوٹ کرتا جاتا تاکہ بعد کو میری نقلیں سب کے سامنے کر کے مجھے خون کے آنسو رلائے۔ اسی اثنا میں اگر برات یا اسی قسم کی کوئی وجدانی کیفیات پیدا کر دینے والی چیز آجاتی اور ہم چونک کر مولی صاحب برات" تو بس تھپیڑوں کے زنائے، چپتوں کے چٹاخے اور چٹکیوں کی سسکیاں شروع ہوجاتیں۔ بظاہر مولوی صاحب صرف میرا بازو پکڑ کر ہلا دیتے لیکن نہایت ہوشیاری سے انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی کو ملا کر چپکا چوند کرنے والی چٹکی لے لیتے جو آستین ہی میں جذب ہوکر رہ جاتی۔

ہم "کافروں" سے وہ بارہا کہہ چکے تھے کہ باجے کی آواز پر لاحول بھی پڑھا کریں اور اس قدر دلچسپی نہ لیا کریں کیونکہ قیامت کے روز دجال باجہ بجاتا آنے والا ہے اور باجے کے شوقین لوگ اُس کی آواز پر دوڑیں گے اور دوزخ میں جائیں گے۔

ہم لوگ چپ ہوکر توشۂ عقبیٰ سمیٹنے میں لگ جاتے

وہاں سے چھوٹ کر آتے آپا کچھ کل رہی ہوتیں۔ کیا مجال جو مجھے یا چنتو کو ایک نکھی برابر آٹا دیدیں یا مجھ بھی کڑھائی میں ڈال لینے دیں۔ چنتو تو خیر گھی کا لڈو تھا ہی کھلاؤ۔ عورت ذات" کو تو پانچوں انگلیاں پانچوں چراغ ہونا چاہیئے۔ ورنہ نہ معلوم کس کے گھر جاکر آگ لگاؤں۔ مگر اس وقت میرے سگھڑاپے کا سوال بالائے طاق رکھدیا جاتا ہے وہ تو جب وقت کھیلنے میں میرا دل لگے گا فوراً میرے سگھڑاپے کا خیال بھی آئے گا اور کمربند سینے یا اور کوئی ردّی سی بدنما سے میں بھیجا مارنے کا حکم ملے گا۔ اس وقت تو حکم ملتا ہے "بس چلو یہاں سے "کفگیر دوں جو اب کے آئی" کڑکڑاتا تیل ہاتھ پر رکھدوں گی جو تو نے لگنی کو ہاتھ بھی لگایا" اب کے آٹا مانگا تو جاتا جلتا انگارہ ہتھیلی پر رکھ دوں گی" "دیکھو بھئی اماں یہ نہیں مانتی" وہاں سے حکم ملتا ہے "ماردو پیٹئے۔!

اب کھیلنے کہاں جائیں "پلنگوں پر مت کھیلو جھولا ہوجائیں گی۔" "تخنوں پہ مت کودو۔ دھڑ دھڑ سے کان اُڑے جاتے ہیں۔" چبوترے پر تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ انگنائی میں میری شوقین آپا کی کیاریاں مت کھوندو۔ ورنہ ٹانگیں توڑ دیگی۔

کبھی سل سے ٹھوکر لگتی ہے تو کبھی لوٹا اوندھا جاتا ہے۔ کبھی سینی میں پیر پڑتا ہے تو کبھی بچے کے پاٹے میں اُلجھے جاتے ہیں۔ کچھ نہیں تو کونے میں کھڑا ہوا بانس ہی ذرا سے ہلانے سے دھڑام سے سر پر آن پڑا۔ ساتھ ساتھ صابن دانی موری میں لڑھک گئی۔ اور جاکر سوئے ہوئے کتے پر گری۔ کیا آفت ہے۔ الٰہی یا تو ان بچوں کو اٹھالے یا میری مٹی عزیز کرلے۔ ایسے بچے بھی کہیں دنیا جہاں میں ہوا کرتے ہیں۔ ہوں تو کوئی کاہے کو جئے۔ مختلف وزن اور رنگ کی ڈانٹوں کے بعد بٹھا دیے جاتے کہ خبردار جو ذرا بھی ہلے۔ ہڈیاں توڑ دوں گی! رات کو بستروں کے سپرد کردیے گئے کہ "لو مرو" خیر مرنے سے پہلے ہنسی ہے کہ قابو میں نہیں آتی۔ جیسے آنے ہیں کھوں کھوں، کھی کھی، کھک کھک کھوں۔ حکم ملا کہ ایک اگر سانس بھی لی تو گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ اب سوئے تو کیا خواب شیریں کی توقع رکھ سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ پیر کے بھاگ رہے ہیں۔ کتے، بندر، اُلو ہیں پیچھے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ پانی ہی پانی جس میں مٹکے برابر مینڈک چوہیاں ہی چوہیاں پہیلیں سو چوہیاں۔ گاڑی چڑھی چلی آتی ہے۔ اکنیاں ہی اکنیاں پڑی ہیں۔ خوشی خوشی جمع کرلیں۔ کس کے مٹھیوں میں پکڑ لیں۔ آنکھ جو کھلی تو مٹھیاں تو ویسی گھٹی ہوئی ہیں اور اکنیاں غائب۔ جو رو میں تو آواز آئی "لے ہے رات کو بھی چین نہیں۔ چپ نہیں تو دیدوں گی کتے تھوا ٹھاکر" صبح کو پھر وہی آپا وہی منجن اور وہی ہم۔

اب۔ اور اب... معاذ اللہ، گویا سورج ملا ہوا ہے۔ اپنی راجدھانی ہے۔ بستر میں لیٹے لیٹے چار پی۔ اٹھکر آٹھ بجے ناشتہ کیا۔ سج سجا کر دفتر گئے۔ کھانا وقت سے ذرا دیر میں ملا اور نوکر پٹا۔ بوٹی خوب اور گلی ہوئی ملتی ہے۔ انڈے کھاتے ہیں۔ رات کو جب تک چاہو غل مچاؤ اور ہنسو۔ بالکل شور نہیں ہوتا۔ پلنگوں پر چاہے جتنا کودو بالکل جھولا نہیں ہوتے۔ اور جو ہوتے ہیں تو حامد پٹتا ہے۔ تخت پر کتنا ہی کودو کسی کے کان نہیں اڑتے۔ چاہے سارے آٹے کو لیکر کڑھائی میں ڈالدیں کوئی کفگیر نہیں مارتا۔ آپا منجن ضرور تبار کرواتی ہیں اور گھستے کبھی لگتے ہیں مگر مسکین اور مینو کے۔ ہمیں تو نرم برش اور خوشبودار کریم کافی ہے۔ کسی قسم کے ماسٹروں کے آنے کا قطعی حکم نہیں صرف میوزک ماسٹر آسکتا ہے۔ وہ بھی بعض وقت محض سستی کی بنا پر بھگا دیا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم اب بچے تھوڑی ہیں جبکہ کوئی فکریں نہ تھیں۔ آزاد زندگی۔ بھولپن کا زمانہ۔ پیاری پیاری باتیں، سکھ کی نیند۔ کاش بچپن پھر ایک دفعہ...... خیر۔

عصمت چغتائی

کیفِ جمال

پھر گلستاں میں وہ جانِ دل بہار آہی گیا
پھر دلِ بے تاب ارماں کو قرار آہی گیا

پھر فضائے عشق میں ہیں حسن کی رعنائیاں
ہر گلِ خاموش کو لحنِ ہزار آہی گیا

پھر ہجومِ رنگ و بو ہے شوق در آغوش آج
مطربِ آتش نوا مستانہ وار آہی گیا

پھر نگاہِ ناز کی گلکاریاں ہیں چار سو
میکدہ بر دوش اپنا طرحدار آہی گیا

دل سے جو شعلہ اٹھا وہ بن گیا رنگین پھول
موجۂ بادِ خنک بے اختیار آہی گیا

پھر کھلا وہ بابِ میخانہ وہ جھومے آبشار
بیعتِ ساقی کو حسنِ لالہ زار آہی گیا

یہ توفیضِ داغِ دل ہے شکریہ کس چیز کا
میری آنکھیں دیکھکر پھر اُن کو پیار آہی گیا

پھونک دے ہاں پھونک دے کاوش کو لے برقِ جمال
وہ جنوں کے جوش میں پروانہ وار آہی گیا

کاوش حیدرآبادی

زندہ اور فطری زبان

تیسری کسوٹی۔ دیہات کی زبان میں اُردو کا رنگ جھلکتا ہے

دیہات اور شہر کی زبان میں ہمیشہ قدرے اختلاف رہا ہے۔ مگر یہ اختلاف بنیادی نہیں ہوتا۔ شہری دیہاتی زبان کا ڈھانچہ اور اس کا مزاج تقریباً ایک ہوتا ہے۔ ظاہری ہیئت میں وہاں وہ آرائش و نکھار نہیں جو شہر کی زبان میں ہے اس لئے تمیز ہو جاتی ہے، مگر اس بناء پر دیہاتی زبان اور شہری زبان دو زبانیں نہیں ہیں اور نہ دُنیا کے کسی حصہ میں ان دو کو الگ الگ بنیاد قرار دیکر دو آزاد زبانیں وجود میں آئی ہیں۔ دُنیا کے سب ملکوں میں دیہات کی زبان شہر کے لوگ اور شہر کی زبان دیہات کے باشندے سمجھتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ دیہات میں رہنے والے شہریوں سے کہیں زیادہ ہیں اُن کی زبان کو معیاری زبان نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ شہر کی زبان کی پیروی حتی الوسع کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ شہری زبان کے سانچے میں بڑھتی رہتی ہے باوجود اس کے کہ شہر کی زبان دیہاتی زبان ہی کی باقاعدہ شکل ہے، دنیا کا کوئی ملک یہ نہیں کرتا، شہری زبان کے افعال و اشتقاق کو دیہاتی زبان کے متبع کر دے۔ اس لئے جو لوگ اُردو کو شہری اور ہندی کو دیہاتی زبان کہتے ہیں وہ صریح غلطی پر ہیں۔ حقیقت تو بس اس قدر ہے کہ دیہات کی زبان اَن پڑھ گنواروں کی زبان ہے۔ اُس کے بولنے والے اس درجہ متمدن، شائستہ اور تعلیم یافتہ نہیں جتنا کہ شہری لوگ ہیں۔ تمدن کا فرق نتیجے کی صورت میں زبان سے بھی ظاہر ہے ورنہ اور کوئی فرق نہیں ہے۔

شہر اور دیہات دونوں جگہ ذخیرۂ الفاظ ایک قسم کا ہے۔ فارسی عربی کا استعمال جس کو غلطی سے اُردو پن سمجھا جاتا ہے، دیہات میں شہر سے کم نہیں۔ سنسکرت کی اصل صورتوں کے بجائے اسکی بدلی ہوئی اور مرورِ ایام سے ڈھلی ڈھلائی شکلیں دونوں جگہ رائج ہیں۔ تت سم (ہندی الاصل سنسکرت) کا تو کہیں نام تک نہیں ہے۔ محاورے اور ضرب الامثال بھی ایک حد تک دونوں کے مشترک سرمائے قرار دئے جاسکتے ہیں۔ ان تینوں باتوں پر میں نیچے مثالیں پیش کر کے اپنے دعوے کا ثبوت دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ **فارسی و عربی کا برمحل استعمال**۔ فارسی و عربی لفظوں کی کثرت اور ہندی لفظوں سے اُن کی ترکیب کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ آخر کس بنیاد پر ہندی کو دیہات کا سہارا دیا جاتا ہے۔ خوشی، ناخوشی آب، تاب، زور، ظلم (جلم) نشان (سان)، گمان، قہر، غضب گرانی حیرانی و پریشانی، احمق (امحق)، نادان (ندان)، سلام، بندگی، حجت، حکایت، شکوہ شکایت، عذر معذور، آرام تکلیف، حیلہ حوالہ سوال جواب، ناز نخرہ، قلت (کلت) کثرت غرض فارسی عربی کے بے شمار اسمائے ذات و کیفیت دیہاتی زبان کا دامن بھرے ہوئے ہیں۔

تعریف و توصیف کیلئے، اعلیٰ نمبر (علیٰ نمبر) اعلیٰ درجے، (اعلیٰ درجہ)، خاب صورت (خوبصورت) بصورت (بدصورت) کلاں راس، نزل نمبر، توفہ مال (تحفہ کے لائق مال)، مزیدار، بہار دار اصلی، نقلی، جعلی، داغی، نیک ماش (نیک معاش) بدماش (بدمعاش) سفید، سُرخ۔ غرض وہ تمام صفات جن کو شہری استعمال کرتے اور بولتے دیہاتیوں کیلئے نہ صرف یہ کہ عام فہم ہیں بلکہ وہ انہیں بے تکلف استعمال کرتے اور بولتے ہیں۔

مخاطب کرنے کیلئے جہاں "ہے مہراج! ہے بابو!" آتا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی حضور، سرکار، مالک، کاسکہ اور زیادہ چلتا ہے۔

معاشرت کے ہر ہر پہلو پر فارسی عربی الفاظ چھائے ہوئے ہیں۔

زیوروں کے نام: بازوبند، حمائل، بندی، بوں جیب (پازیب) توکھ (طوق)، تعویز وغیرہ۔

لباس (کرتہ، قمیص، شلوکہ، مرزئی، چوبندی، جامہ، کلہی (کلاہ)، جھلم بکتر (زرہ بکتر) صدری، نیم آستین، صافہ،

غذا:۔ دانا (دانہ) نرم چارہ، کلیہ مچھری (قلیہ مچھلی) شرتی ملیدہ (شیرینی، ملیدہ) وغیرہ۔

پالتو اور دیگر جانور۔ طوطا، خصی (بکرا) خر، کھر، گدھا، خرگوش، شاہین۔ باز، شیر۔ لطف یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ تو چوہا بولتے ہیں مگر دیہات میں موس (موش فارسی) زیادہ عام ہے۔

اوزار۔ چرخہ، تار، کمانی، پیچ، پیچ کش، انگستانہ (انگشتانہ) سوزن سے سوزنی۔

تقریبوں کے نام:۔ سادی (شادی) بدا (وداع) بدائی (ودائی) غمی۔

پیشوں کے نام:۔ بیلدار، معمار، درزی، بازی گر، جادوگر، قلعی گر، سکلی گر (سیقل گر) موسہر (موش پکڑنیوالا)۔

اب ذرا ان دیہات کے رہنے والوں کی رسمی زبان (آفیشل لینگویج) پر نگاہ ڈالئے۔ پرے کے پرے الفاظ ہیں جو اس قدر عام ہیں کہ زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور بالکل ہندوستانی ہو چکے ہیں۔

رسید، رسید فارخطی (فارغ خطی) رقم، پیشگی رقم، ادائگی، بقایا، حال، سابق، مالگذاری، قرقی، ہرجہ، خرچہ، دعویٰ، حاکم، اجرا، نالش، فریاد، ثبوت، گواہ، بحث، نجیر (نظیر) پیشی، ملتوی، معاف، رہا، قید، قید سخت، سزا، جرمانہ، اطلاع، بیان، بیان تحریری، حلف، دروغ حلفی، قتل، خون، مقدمہ، جرم، الجام (الزام)۔ اب وہ حضرات جو بلا دلیل یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ کچہریوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ دیہات کے لوگ نہیں سمجھتے سوائے اس کے کیا کہا جائے، وہ آفتاب پر خاک ڈال کر اُسے تیرہ و تاریک ثابت کرنے کی فکر میں ہیں جو رہتی دُنیا تک ناممکن ہے۔

آخر وہ دیہاتیوں کے عام فہمی کے لئے مروّج فارسی لفظوں کے بدلے کون سا لفظ رکھنا چاہتے ہیں۔ جائداد کے بدلے "سمپت" ہو جائے تو اُن کو زیادہ سمجھ میں آئیگا؟ موروثی کے بدلے کیا وہ "پیترک" کو سمجھ سکیں گے؟ کیا وہ "ثبوت" کو نہیں سمجھتے کہ اُس کے لئے سنسکرت لغت کی طرف ہاتھ بڑھایا جائے۔ اور کیا اس کا بدل جو سنسکرت سے آئیگا وہ اِن مروّج فارسی لفظوں کے مقابل اور دشوار نہ ہوگا۔

آپنے دیکھا کہ دیہاتی زبان میں فارسی وعربی لفظوں کی کس قدر کافی مقدار ہے اور وہ گھل مل کر جزوِ زبان اور جزوِ تمدن ہو چکے ہیں تو پھر کوئی شخص مروّج لفظوں کے ترک کرنے کی اور دوسری دلیل کیا پیش کر سکتا ہے جب وہ بول چال کی حیثیت سے دیہات میں بھی عام ہیں۔

اب فارسی اور ہندی کے لفظوں کے میل جول کا نقشہ مُلاحظہ فرمائیے۔ موہ کے پہلو میں محبت بھی جلوہ افگن ہے۔ شُبھ ساعت راہ باٹ، بحرِ سمندر، داؤ لشکر، غریب دُکھیا، راجا، ایک فقیر۔ "لڑکا، ٹھاکر، بوڑھا، جوان" اور ایسی ہزاروں ترکیبیں لفظوں کی خاندانی تمیز مٹا چکی ہیں۔ اور گوشت سے ناخن کی طرح یہ الفاظ ایک دوسرے سے جُڑے ہیں اب جو شخص گوشت سے ناخن کو جُدا کرنے کی رائے دے اُسے تفرقہ انداز کیوں نہ کہا جائے۔

محاورات اور ضرب الامثال۔ دیہاتی اور شہری زبان کی مثلیں اور کہاوتیں بھی مشترک ہیں۔ جس طرح بہت سی فارسی و عربی ضرب المثلیں شہری زبان میں موجود ہیں دیہاتی زبان میں بھی وہ بجنسہٖ مستعمل ہیں۔

جامے سے باہر ہونا۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا۔ مزاج کا گرم ہونا، ٹھنڈی سانس لینا، مردِ میداں ہونا، باغ باغ ہونا، بڑا شیر مارنا، اپنے عہد کا رستم ہونا، رستم بننا، نمک حرامی کرنا، نمک حلالی کرنا۔ اور اسی قسم کے صدہا محاورات جو فارسی محاورات کے ترجمے ہیں شہری اور دیہاتی زبان میں یکساں طور پر یکساں موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔ خالہ جی کا گھر۔ (کاٹھار موسیاں ہے کہ سمدھیان) سچی بات کڑوی ہوتی ہے، مطلب کا سارا زمانہ۔ بڑے گویا، آستین کا سانپ۔ ابھی دلی دور ہے۔ کھانے کے لئے مُنہ چاہیئے۔ نقارخانہ میں طوطی کی آواز، غریب کی پکار کون سُنے۔ اونٹ کے گلے میں بلّی۔ اور اسی قسم کے کتنے ضرب الامثال ہیں جو فارسی کے توسط سے ہندوستانی زبان میں ترجمہ ہو کر منتقل ہو گئے اور بیدھڑک اور شہر اور دیہات کے لوگ حسب موقع اُنہیں کھپاتے ہیں۔

تاریدو تہنید۔ اُردو زبان فارسی وعربی کی طرفدار کبھی نہیں رہی وہ عربی وفارسی کے ثقیل لفظوں کو ہندوستانی زبان کے پیمانہ پر ڈھالتی رہی۔ اسی بنا پر تارید، تہنید اور تخفیف کے قاعدے اُردو میں جاری کئے گئے تھے۔ اسی قاعدے پر (ع:۔ شاباش جسکو کہتے ہیں وہ شاد باش تھا) شاد باش کا شاباش بنا۔ اسی قاعدے پر پادشا کو بادشاد کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں۔ اس طرح اُردو

میں فارسی عربی لفظ ہضم ہوتے رہے۔ ہمارے دیہاتی بھائیوں نے بھی تہنید و تارید کے دہ نمونے پیش کئے ہیں کہ شاید حاتم، مبارک مصحفی، میر کے خیال میں بھی یہ بات نہ رہی ہو۔ مثلاً:-

۱۔ نریاتا۔ (نعرہ کرنے کی مختصر صورت ہے۔)

۲۔ غرّانا۔ (غرور میں گلا پھلا کر بولنا)

۳۔ دقدقانا۔ (دق کرنا۔)

تلاش کیجئے تو ایسی مثالوں کا ایک دفتر مہیا ہو سکتا ہے۔

ہندوستانی زبان کی تعمیر میں انگریزی عہد میں بھی انگریزی لفظوں کا بدل دیسی اور جوڑ کا توڑ لفظ پیش کرنا اسانیات کے ماہروں سے زیادہ ان پڑھ مزدوروں اور قلیوں کا کام ہے جو دیہات کے بھی رہنے والے ہیں ان کے ذریعے سے مشین اور اسکے پرزوں کے بیسیوں نام انگریزی کے بدل بن کر مروج ہو گئے ہینڈل۔ ہتھا، سینڈر۔ بیلن۔ پریشر۔ داب وغیرہ اسی قسم کی کوششوں کے نتیجے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اردو زبان کی فطرتی ضرورت کے عین مطابق دیہات کی زبان ہے۔ یہی سبب ہے کہ شمالی ہند کے دیہاتی رقبے کا باشندہ اپنے اظہار خیال میں موجودہ ہندی کی آہنی لائن پر چلنے سے معذور ہے۔ شہری رقبہ کا وہ شخص جسے برابر ہندی سے واسطہ رہا وہ کچھ دیر کے لئے اپنی ہندی دانی کا ثبوت دے سکتا ہے مگر اس عرصے میں اسے بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ باوجود روک تھام، اس کی پانچ منٹ کی گفتگو میں بان کے دو رنگ صاف جھلکنے لگتے ہیں ایک تو وہ حصہ ابتدائی جس پر فارسی عربی لفظوں کا استعمال ہے اور دوسرا حصہ آخری گفتگو کا جس میں ارادے کی لگام کچھ ڈھیل پڑ گئی جس میں لفظوں کا استعمال برمحل ہوتا ہے۔ اب دیہات میں بھی یہ دہی عمل جاری ہے پھر بھی یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے اردو یا ہندوستانی کے پڑے ہوئے ڈھرے کے بجائے لوگ دوسری لائن اختیار کریں۔

ہندی کی اشاعت دیہات اور شہر میں آج تقریباً ۶۰۔ ۷۰ سال سے ہو رہی ہے مگر فارسی و عربی لفظوں سے پرہیز کرتے ہوئے زبان کا جو نمونہ پنڈت للو جی لال (بھارتیندو بابو ہریشچندر) اور راجہ لکشمن سنگھ نے پیش کیا تھا، دیہات میں بھی مقبول نہ ہوا۔ ہریشچندر کی چندراولی ناٹک اور ستیہ ہریشچندر ناٹک کی زبان اردو کے قالب میں ڈالی جا چکی ہے اور اسی وجہ سے یہ ناٹک دیہات و شہر میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوئے۔ تلسی داس جی کے رام چرت[1] مانس کو پنڈت رادھے شیام نے اردو طرز پر رام لیلا ناٹک کمپنیوں کے لئے تیار کیا۔ رامائن کا چربہ اردو طرز پر جب سے ناٹک منڈلوں نے اتروایا اس وقت سے انہیں زیادہ کامیابی ہے۔ ناظرین پر اب یہ بات اچھی طرح روشن ہو چکی کہ دیہاتی زبان کا رخ کس طرف ہے؟

سنسکرت کے تدبھو (مرور ایام سے بدلے ہوئے) الفاظ بھی دیہاتی زبان میں مستعمل ہیں۔

اب دیہات کی زبان کے ان لفظوں کی صورتوں کو دیکھنا ہے جن کے بنا پر اپنی زبان کو آریائی تسلیم کرتے ہوئے ہم سنسکرت سے مختلف سمجھتے ہیں۔ مثلاً اصرف پٹھ (پڑھنا) کی چند اشتقاقی صورتیں ملاحظہ ہوں۔

پٹھتِ (وہ پڑھتا ہے) پٹھتہ (وہ دونوں پڑھتے ہیں)

پٹھنتِ (وہ سب پڑھتے ہیں)

ہندی اردو میں اولاً تو ضمیر فاعلی سنسکرت کی طرح فعل سے متصل نہیں آتی ہے دوسرے سنسکرت کے روپوں اور اردو ہندی فعلوں میں کتنا فرق ہے۔ اس لئے اردو ہندی میں قول کا سنسکرت کی بدلی ہوئی صورتوں میں آنا مسلم ہے اور اسے ہندی کے حامی تسلیم بھی کرتے ہیں۔ اب رہ گیا اسما صفات اور تمیز کی بحث۔ اس بارے میں بھی ہماری گذارش ہے کہ وہ مجبوری ہمیں سنسکرت اسما و صفات اور تمیزوں کو بھی ہندی الاصل استعمال کرنے سے منع کرتی ہے اور دیہاتی زبان اپنے نمونوں سے ہماری تائید کرتی ہے۔ آپ دیہات اور شہر ہر جگہ سنسکرت تت سم (اصل) لفظوں کا فقدان پائیں گے۔ کہیں بھی پانی کو پانیہ، جل کو جلم، جلو، جلہ، کہتا ہوا کوئی نہ ملیگا۔ سولہ کی گنتی کھوڑس اور چھٹا دش کی صورت میں کہیں نہ سنے گا۔ دگدھ، گھرت کے بجائے دودھ، گھی ہی سنائی دے گا۔ مہینوں کے نام سنسکرت پترے ہی میں پھالگن ہے ورنہ ہر دیہاتی پھاگن ہی کہتا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ آج کونسی تتھی ہے بلکہ یہاں بھی تاریخ پوچھی جاتی ہے نہ یہاں "ایکشنہ" عام ہے اور ربی وار سگر جمعہ، سنیچر، اتوار۔ سیدھا سیدھا سب لوگ سمجھتے ہیں۔ آدمیوں گاؤں کے نام بھی ملاحظہ ہوں:-

پورن مل (بجائے پورن مل۔) گنیش پرشاد، رام جتن بجائے رام یتن۔ رامپور بجائے رام پرے "اسلام پور، غرض

[1] رامائن۔

چونکہ سنسکرت کی قدیم (تت سم) شکل کے بجائے اس کا تدبھو (بدلا ہوا) جیسا چاہا گیا، ویسا بولا جاتا ہے۔ اور یہی بات تو یہ ہے کہ تھی بنانے والے پنڈت بھی اسی طرح بولتے ہیں اور اپنے جھانوں سے لفظوں کی جدید شکلوں کے اچارن سے ان کا بھی جی خوش ہوتا ہے۔ ایک لطیفہ اس موقع پر مجھے یاد آتا ہے جو میرے استاد مکرم موقع بموقع فرمایا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کسی ہندو رئیس کے یہاں بڑی منتوں سے لڑکا پیدا ہوا۔ از راہ شکر گزاری انہوں نے اس تقریب میں دوست احباب کو مدعو کرنا چاہا۔ شبھ ساعت پنڈت جی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چھٹی شدی چیت اس کے لئے بہت مبارک ہے اور اس دن چندرما بالک کے سن مکھ ہونگے، یوگ بل ہے۔ پنڈت جی کے جانے کے بعد بابو صاحب کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے۔ وہم نے ایک شوشہ پیدا کیا کہ گھڑی، مہورت، جوگ بل، سب کچھ تو پوچھا مگر دن نہیں پوچھا کہیں مان کا دن نہ پڑ جائے۔ دربار کا حجام بڑا ہوشیار تھا اس نے کہا سرکار اگر حکم ہو تو مہاراج جی سے ابھی جا کے پوچھ آویں کہ دن کون سا پڑتا ہے۔ اجازت مل گئی۔ نائی نے پہونچتے ہی پنڈت جی کے چرن چھونے کے بعد ہاتھ جوڑ کر کہا مہاراج "کھشٹی" کے تتھی کو کونسا دن ہے۔ ذرا لمبا دن ہے ٹھیک ٹھیک پترا دیکھ کر بتا دیجئے۔ پنڈت جی کو "کھشٹی" کا صحیح تلفظ سن کر بڑا تعجب ہوا انہوں نے سوچا کہ کمبخت نائی، حجام، کہار، عجب اب شدھ اچارن کرنے لگے تو اب تو برے دن آنے کو بلمب (دیر) نہیں۔ پھر ذرا سوچ کر سنبھل گئے اور کہا ابھی یہ فتنہ عام نہیں اس کو یہیں سے دبا دینا چاہیئے۔ یہ سوچ کر گھرک کر بولے۔ تو کون بڑا ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے، چلو بابو صاحب ہی سے اب ہم بتا دیں گے کہ چھٹی کو کون سا دن ہے اور تم کو تمہاری کرتوت کا پھل بھی بھوگنا پڑے گا۔ حجام پنڈت کے پیروں پر گر پڑا۔ اور بولا "مہاراج سیوک ہوں۔ خطا معاف کیجئے نہیں ہماری روزی آج ہی چلی جائیگی، یوں ہی بابو صاحب کو معلوم ہوگا کہ ہم سے کچھ گڑبڑ کام ہوا ہے ایک نہ مانیں گے، نکال دینگے۔

پنڈت جی نے اپنی آن کی حفاظت کرتے ہوئے فرمایا۔

"مورکھ، سن۔ پہلے یہ بات بتا کہ تو بابو صاحب کا نوکر[1] ہے کہ پروہت[2]؟"

حجام۔ سرکار، ہمارے پیر کا جوتا اور ان کے بھی پیر کا جوتا۔

پنڈت جی۔ تب کا ہے پروہت بننے لگا، پوچھتا ہے کھشٹی کی تتھی دن سا دن ہے۔

حجام۔ مہاراج جیسے آپ کا آگیان ہو ویسے ہی پوچھونگا۔

پنڈت جی۔ تمہیں پوچھنا چاہیئے تھا کہ چھٹی کون دن پڑیگی۔

حجام۔ ہاں مہاراج (ہاتھ جوڑتے ہوئے) بتا دیا جائے، چھٹی کون دن ہے۔

پنڈت جی نے پترا کھولا اور دن بتلایا۔

اس لطیفے کے بیان کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ سنسکرت کے ہندی الاصل الفاظ عام استعمال کی حیثیت نہیں رکھتے اور جب یہ اختلاف جاتا رہے تو اردو و ہندی میں کوئی فرق ہی نہ رہا پھر بعض بزرگوں کا یہ فرمانا کہ ہندی دیہات کی زبان اور اردو صرف شہروں کی زبان ہے کہانتک صحیح ہے؟ اور یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اب "سر بھی" کا استعمال ہماری موجودہ زبان میں جائز ہے یا "سب ہی" کا؟ ناظرین خود فیصلہ کرلیں۔

دیہات کی زبان کو اس ہندی کے قریب تر ضرور کہہ سکتے ہیں جس کی مختلف شاخوں میں انیسویں صدی کے پیشتر بہت سی کام کی باتیں نظم کی گئیں۔ مثلاً کبیر کے دوہرے اور سنتوں کے بھجن اور اپدیش۔ مگر بقول سر جارج ا ددہ ہندی تو دہقانی بولی ہے موصوف نے اپنی رپورٹ میں صاف صاف لکھا ہے۔

"ہندی سے مراد دراصل وہ دہقانی بولیاں ہیں جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے"

پس اس ہندی کے حق میں جو اردو کے قالب پر ڈھالی گئی اور جسے وہ ان دہقانی بولیوں (بھوج پوری، اودھی، قنوجی، بندیلی وغیرہ) سے تمیز دینے کے لئے کسی خاص مصلحت سے اردو طرز نہ کہہ کر کھڑی بولی کہتے ہیں۔ دیہاتی زبان کی تائید کچھ بھی مفید نہیں بلکہ اس سے تو وہ کلاسک حیثیت سے بھی گری ہوئی مانی جائے گی۔ اور اسے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے دعوے سے بہت نیچے اترنا پڑیگا۔

پس اسی صورت میں جبکہ دیہات کی زبان میں افعال کی شکلیں اردو، ہندی سے یکساں طور پر مختلف ہیں جبکہ فارسی و عربی کے اسما و صفات، غیر ہیں اس میں اردو جس کو غلطی سے شہری

[1] نوکر، خدمتگار۔ [2] گرو، برہمن۔ ہندو خاندان کا پیر۔

بان کہنا شروع کیا گیا ہے) کی ساخت اور اُردو کے معیار پر آتے ہیں، جبکہ "دیہاتی" لفظ خود اُردو کی مانند ہے جبکہ دیہاتی نظام اور معاشرت اپنے موضوعات (منشی، دیوان، عملہ، دفعہ، کارندہ، پیادہ، داروغہ و سپاہی) سے بھی اُردو کے حق میں ووٹ دے، جبکہ ملک کی فضا اور اُردو کی ساخت کا ہی تقاضا ہے کہ اُسے مشترکہ زبان تسلیم کر لیا جائے تو پھر حیرت ہے کہ کیوں اس کے خلاف بغلی گھاتیں لگائی جاتی ہیں؟ اور کیوں ٹیڑھے راستے سے دکن کے باشندوں کو اُردو جو کھیر کی طرح لذیذ اور شیریں ہے، ٹیڑھی بتلائی جاتی ہے۔

چراغ علی

نغمات

اُبھرتے حُسن کو یکسر غرور ہونے دے ⁞ خمارِ کیفِ جوانی سے چُور ہونے دے

نثارِ شوخیِ معصوم مُسکرائے حیا ⁞ فضا کو موجِ شرابِ طہور ہونے دے

یہ احتیاطِ نظر بھی خطا سہی لیکن ⁞ قصور وار سے یہ بھی قصور ہونے دے

کہاں یہ فرصتِ کاوشِ نگاہِ جاناں کو ⁞ کہ اہلِ غم کو بھی غم کا شعور ہونے دے

کوئی خیال نہ ہو تیرے لُطفِ پنہاں کو ⁞ غیور ہے جو محبت غیور ہونے دے

سُنا ہے لُطفِ نہاں تو بھی دل ٹھہرتے ہیں ⁞ نظر کی یہ بھی شرارت ضرور ہونے دے

تو آپ بنا جہاں آپ اپنی جنت سے ⁞ حرم میں قصّۂ حور و قصور ہونے دے

سکوتِ ہوش کو مرکز بنا محبت کا ⁞ جنوں کا غلغلہ نزدیک و دور ہونے دے

فریبِ ضبطِ محبت کو ناشکیبا کر ⁞ سکونِ دل کو غمِ ناصبور ہونے دے

غم و خوشی سے الگ عمرِ عشق کاٹے جا ⁞ یونہی ثواب و گُنہ، نار و نور ہونے دے

تری نگاہ ذرا کیفِ عشق سے کہہ دے ⁞ کہ ماورائے خُمار و سُرور ہونے دے

وصال و ہجر تو کیا بس یہ حسرتِ دل تھی ⁞ کہ تجھکو پاتے تو مشکل سے دُور ہونے دے

سکوتِ غم کو ہم آہنگ کائنات بنا ⁞ خودی کو بے خبر اسکے حضور ہونے دے

عتاب کیلئے کیوں ہو ضرور وجہِ عتاب ⁞ قصور وار کبھی بے قصور ہونے دے

ابھی کچھ اور کرشمے نگاہِ ناز کے ہیں ⁞ جہانِ عشق کی ظلمت کو نور ہونے دے

غبارِ عشق سے یہ کار اُڑائے جا پیہم ⁞ فضا کو مطلعِ صبحِ نشور ہونے دے

حجابِ ناز بجا، لیکن اپنے جلووں کا ⁞ جگر کے داغ سے کم کم ظہور ہونے دے

اثر سے سوزِ تنہائی کے دل کو دل کر لے ⁞ اسے نہ عرش نہ کعبہ نہ طور ہونے دے

بغیر خونِ جگر کے ہے حیات محال
فراقؔ بادۂ غم کا سرور ہونے دے

فراق گورکھپوری

عورت

اس مضمون کا عنوان محض مذاق ہرگز تصور نہ کریں کیونکہ اس سے شوپنہار کے صحیح جذبات اور معتقدات کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی عیوب کا ایک غائر نقاد تھا۔ اس مضمون پر اس لئے اور بھی توجہ دینا چاہیئے کہ یہی سوال آج کل بدقسمتی سے ہندوستان میں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ عورتوں کو آزادی دی جائے یا نہیں۔ اس مضمون میں خصوصاً اسی بات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سوسائٹی میں عورت کا صحیح درجہ کیا ہے۔

اثر

عورت کی تعریف میں جو شلر کی نظم ہے وہ عمیق مطالعہ اور بلند خیالات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور وہ پڑھنے والوں کو اس لئے بھلی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے اسلوب بیان میں تضاد اور مقابلہ و موازنہ پایا جاتا ہے لیکن عورتوں کی حقیقی تعریف جیسی کہ ان کی ہونی چاہیئے وہ میرے خیال میں جوائے کے ان چند مختصر الفاظ سے بھی حقیر ہے کہ "بغیر عورت کے ہماری ابتدائی زندگی بیکسی کا نمونہ، درمیانی لطف و انبساط سے مبرا اور آخری تسلی و تشفی سے بے بہرہ ہوتی ہے۔" اسی بات کو بائرن نے نہایت مؤثر پیرائے میں ادا کیا ہے۔

"انسانی زندگی کا وجود ہی عورت کے پہلو سے
ہوتا ہے، سب سے پہلے الفاظ تم اسی کی زبان سے
سیکھتے ہو۔ تمہارے دل آنسوؤں کی تلافی بھی یہی
کرتی ہے۔ اور تمہاری آخری آہیں بھی کسی عورت
ہی کے کانوں تک پہونچتی ہیں۔"

یہ دونوں ٹکڑے عورتوں کی تعریف کرنے کے صحیح معیار کو ظاہر کرتے ہیں۔

تم محض اس کی ساخت کو دیکھکر اندازہ لگا سکتے ہو کہ دماغی یا جسمانی محنت و مشقت کرنا عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ اپنے زندگی کے بار کو اپنے ان اعمال سے ہلکا نہیں کرتی جن کی کہ وہ مرتکب ہوتی ہے بلکہ جن کو کہ وہ برداشت کرتی ہے ان ہی کے اس کی زندگی کا بار سبک ہو جاتا ہے وہ ایام حمل کی تکالیف، بچہ کی نگہداشت اور شوہر کی تابعداری ہے۔ جس کے لئے اس کو متحمل اور خوش مزاج حلیم بننا پڑتا ہے۔ بہترین خوشیاں اور بدترین غم عورت کے لئے نہیں ہوتے اور نہ اس کو اپنی قوت کا زبردست مظاہرہ ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس کی زندگی کی روانی مرد کے مقابلہ میں بہت ہی لطیف خاموش اور معمولی ہونی چاہیئے۔ اس کو خاص طور سے رنج و غم منانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ایام طفلی میں پرورش اور تعلیم و تربیت کیلئے عورتیں ہی زیادہ موزوں ہیں کیونکہ ان کے مزاج میں ہمیشہ بچپنا، اوچھا پن اور تنگ نظری پائی جاتی ہے۔ مختصراً وہ اپنی تمام عمر مثل "بڑے بچوں" کے رہتی ہیں جن کو سن بلوغ اور سن شعور کو پہونچے ہوئے مرد اور بچہ کے درمیانی درجہ کہہ سکتے ہیں۔ تم دیکھو کہ ایک لڑکی بچہ کو کس طرح ہفتوں گود میں لئے ٹانگے پھرتی ہے، اس کو پیار کرتی ہے، لپٹاتی ہے، اس کے ساتھ گاتی اور ناچتی ہے پھر اس بات کا اپنے ذہن میں تصور کرو کہ وہ مرد جو کہ اس دنیا میں بلند ہمت و حوصلہ لیکر آیا ہے اگر اس لڑکی کی جگہ پر ہوتا تو کیا کرتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان لڑکیوں کے واسطے فطرت مشاطہ کا کام کرتی ہے باقی ماندہ پوری زندگی کے بجائے وہ ان کو کچھ عرصہ کے لئے دولت حسن سے مالا مال کر دیتی ہے اور ان میں دلبری اور رعنائی پیدا کرنے میں نہایت فراخدلی سے کام لیتی ہے تاکہ وہ ان چند سالوں میں کسی مرد کے دل و دماغ پر اس حد تک غالب آ جائیں کہ وہ بہت جلد ان کی عزت و عصمت کی محافظت کا ذمہ کسی نہ کسی صورت میں ان کی تمام زندگی کیلئے اپنے سر لیلے۔ اگر مرد کے خیالات دلائل کی رہبری میں ہوتے تو وہ ہرگز کسی حد تک بھی اس کام کو اپنے ذمہ لینا گوارا نہ کرتا۔ اسی لئے جس طرح فطرت اپنی دوسری مخلوق کے ساتھ کرتی ہے اس نے عورت کو بھی ضروری حربہ جات اور آلات سے مرصع و مزین کر دیا ہے تاکہ وہ اپنی حیات کی محافظت خود کر سکے اور یہ چیزیں اس کے پاس اسی وقت تک رہتی ہیں جب تک کہ اس کو ان کی ضرورت رہتی ہے۔ دوسری جگہ کی طرح یہاں بھی فطرت اپنی حسب معمول کفایت شعاری سے کام لیتی ہے کیونکہ جس طرح ایک مادہ چیونٹی حاملہ ہو جانے کے بعد اپنے پر ضائع کر دیتی ہے کیونکہ وہ اب اس کے لئے صرف بیکار فضول ہی نہیں بلکہ بچوں کی پیدائش اور پرورش کے لئے حقیقتاً

مضر ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک یا دو بچے پیدا ہونے کے بعد عموماً عورت میں بھی حسن و کشش غالباً ان ہی وجوہات کے سبب باقی نہیں رہتی۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان لڑکیاں اپنے دلوں میں خانگی معاملات یا کاموں کو اگر واقعی محض تفریح و مذاق تصور نہیں کرتیں تو ان کو ضروریات سے زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتیں اس عمر میں جو کام کہ واقعی ان کی توجہات کو اپنی جانب مبذول کر لیتے ہیں وہ محبت و عاشقی ہیں یا پھر ہر وہ کام ہے جو حسن کی آرائش، زیبائش اور نمائش سے تعلق رکھتا ہو۔

جو شے جتنی اعلیٰ و مکمل ہوگی اتنے ہی عرصے میں اور آہستہ آہستہ بالغ و پختہ ہوگی۔ ایک مرد مشکل سے اٹھائیس سال سے پہلے اپنے سن تمیز اور سن شعور کو پہونچتا ہے جبکہ ایک عورت اٹھارہ ہی برس میں بالغ ہو جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں مرد اٹھارہ اور عورت چودہ برس میں بالغ ہوتی ہے، پھر بھی عورت کی عقل و تمیز کبھی اچھی طرح پختہ اور مکمل نہیں ہوتی۔ اسی طرح عورتیں اپنی تمام زندگی بچہ ہی رہتی ہیں۔ وہ اپنے قریب کی چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں دیکھتیں۔ حال کے آگے مستقبل کا لحاظ نہیں کرتیں۔ نہایت ہی اہم معاملات کو چھوڑ کر فضولیات اور لغویات کو پسند کرتی ہیں اور پھر بھی اپنے کو بہت ہی ذی شعور اور ذی فہم ظاہر کرتی ہیں۔ مرد اپنی قوتِ استدلال کی وجہ سے وحشیوں اور جاہلوں کی طرح صرف حال ہی کا خیال نہیں کرتا بلکہ اپنے ارد گرد کے حالات کو دیکھ کر ماضی اور مستقبل پر غور کرتا ہے یہی دانائی اور دور اندیشی ان تفکرات اور ذمہ داریوں کی پیش خیمہ ہیں جن کا کہ اتنے لوگ مظاہرہ کرتے ہیں۔ عورت کی معمولی قوتِ استدلال کی وجہ سے اس کے نقصانات اور فوائد دونوں عورت میں ادنیٰ پیمانہ پر پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے حقیقتاً عورت کو ناقص العقل کہا جا سکتا ہے کیونکہ جبکہ وہ اپنے قریب کے معاملات کو باطنی ادراک سے سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے اس وقت بھی اس کا میدانِ بصارت اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ وہ دور کی چیزوں کو دیکھنا تو بڑی بات ہے سمجھ بھی نہیں سکتی۔ ایسے وہ واقعات جو نظروں سے پوشیدہ ہیں خواہ وہ گذشتہ ہوں یا آنے والے مردوں کی بہ نسبت عورتوں پر بہت ہی کم اثر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں اتنی زیادہ فضول خرچ ہوتی ہیں اور بسا اوقات اپنی اس خواہش کو دیوانگی کی حد تک بڑھا لے جاتی ہیں۔ اپنے دلوں میں عورتیں یہ خیال کرتی ہیں کہ کمانا مردوں کا کام ہے اور خرچ کرنا ہمارا۔ اگر یہ حالت ان کے شوہروں کی زندگی میں ہی رہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن شوہروں کے انتقال کے بعد بھی ان کا یہی عالم رہتا ہے۔ ان کے شوہروں کا یہ فعل کہ وہ اپنی ساری تنخواہ خانگی اخراجات اور انتظامات کے لئے ان کے ہاتھوں پر رکھ دیتے ہیں ان کے اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ خرچ کرنا ان ہی کا کام ہے۔

بہرحال چاہے اس میں کتنے ہی نقصانات ہوں لیکن اس کی موافقت میں کم از کم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر زمانہ حال ذرا سا بھی قابل برداشت ہے تو عورت اس سے خوب لطف اندوز ہوتی ہے اور یہی اس زندہ دلی کی بنیاد ہے جو عورت کا ایک خاصہ ہے اور جو عورت کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ مرد کو اس کے تفریح کے اوقات میں خوش کر سکے اور ضروریات کے وقت جبکہ مرد تفکرات اور ذمہ داریوں کے بارے تنگ آ گیا ہو تو اس کو تسلی و تشفی دے سکے۔

اہم و پیچیدہ معاملات میں عورتوں سے مشورہ کرنا معیوب نہیں کیونکہ عہد قدیم میں اہل جرمنی بھی ایسا کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کا چیزوں کے دیکھنے اور پرکھنے کا طریقہ ہمارے طریقوں سے بالکل جدا گانہ ہوتا ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ وہ اپنے حصولِ مقصد کے لئے عموماً سیدھا راستہ اختیار کرتی ہیں اور صرف موجودہ اور پیش نظر واقعات اور چیزوں پر توجہ دینے کی کوشش کرتی ہیں بلکہ ہم لوگ قاعدے سے اس سے بہت زیادہ آگے تک دیکھتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے سامنے ہی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں سیدھا سادہ نظریہ قائم کرنے کیلئے ہم کو صحیح معیار پر واپس آنا پڑتا ہے اس پر بھی یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ بہ نسبت ہم لوگوں کے عورتیں اپنے فیصلہ میں زیادہ سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں اس لئے وہ واقعات میں موجودہ چیزوں سے زیادہ معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں جبکہ ہمارے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں تو پھر ہم ان معاملات کو مبالغہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں یا پھر ایسی چیزوں کو تصور کرنے لگتے ہیں جن کا حقیقتاً وجود بھی نہیں ہوتا۔

ان کی کمزور قوت استدلال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہ نسبت مردوں کے پریشان حال اور مصیبت زدوں سے کیوں زیادہ ہمدردی کرتی ہیں اور ان کے ساتھ دلچسپی کا اظہار اور رحمدلی کا

برتاؤ بھی کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے ایسا کیوں ہے کہ وہ انصاف کی رُو سے مردوں سے حقیر بھی جاتی ہیں اور مخلوق کی نظر میں اُن کی وقعت اور دیانتداری کا کم لحاظ ہوتا ہے۔ یہ محض اس لئے ہے کہ انکی قوت استدلال اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ موجودہ حالات و واقعات کا ان پر اتنا اثر و قابو ہوتا ہے اور وہ اصلی و ٹھوس واقعات اور چیزیں جو بالکل اُن کی نظروں کے سامنے ہونے کے باوجود اُن پر ایسا اثر ڈالتے ہیں کہ چال چلن کے مستقل قوانین، مستحکم ارادوں یا عموماً ماضی و حال کا لحاظ یا پھر دُور و غائب چیزوں کا خیال وغیرہ جیسے بہترین اُصولوں سے بھی اس اثر کو زائل نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ کردار بنانے کے لئے ان میں سب سے زیادہ اہم خوبی موجود ہوتی ہے۔ لیکن ان میں ان ثانوی اوصاف کی کمی ہوتی ہے جن کی کردار بنانے میں اہم ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی مثال ان جانوروں کی مانند سمجھ لو جن میں پتہ تو ہوتا ہے لیکن زہر مُہرہ نہیں ہوتا۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں انصاف کا احساس نہیں ہوتا جس کی خاص وجہ وہی ہے جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے یعنی اُن کی قوتِ استدلال اور قوتِ ارادی ناقص ہوتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قُدرت نے خود ان کو صنف نازک بنایا ہے۔ ان کو اپنی طاقت کے بجائے فریب و مکاری پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اُن کی فطرت ہی میں چالاکی و مکاری و عیاری ہوتی ہے اور اُن کو جھوٹ بولنے کی عادت ہوتی ہے۔ جس طرح شیروں کے پنجے اور دانت ہوتے ہیں، بیلوں کے سینگ، ہاتھی اور سور کے لمبے دانت ہوتے ہیں اسی طرح قدرت نے عورت کو اس کی حفاظت و بچاؤ کیلئے ریاکاری و عیاری کے ہنر سے آراستہ کیا ہے۔ اور قدرت نے مرد کو جتنی جسمانی زور و قوت عطا کی ہے وہ سب عورت کے اس ہُنر کے برابر ہے۔ اس لئے عورت میں ریاکاری خلقی ہے اور اس میں جتنی چالاکی و ہوشیاری ہوتی ہے اُتنی ہی حماقت بھی ہوتی ہے۔ ہر موقع و محل پر اس کا استعمال ان کی فطرت میں اسی طرح داخل ہے جس طرح کہ حملہ کے وقت جانور اپنے آلات حفاظت کو کام میں لاتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ ہر طرح اپنے کو حق بجانب بھی تصوّر کرتی ہے۔ اس لئے غالباً یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ کسی عورت میں ریاکاری کے بجائے صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہو اسی بنا پر ان کو اپنی ریاکاری پر اتنا اعتماد ہو جاتا ہے کہ وہ یہ سمجھ لیتی ہیں کہ کسی دوسرے کے لئے اُن کے ساتھ فریب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن یہ خاص نقص جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اُن تمام باتوں کے علاوہ دروغ بافی، بیوفائی، فریب، مکر اور ناشکری وغیرہ پیدا کرتا ہے۔ عدالت میں جھوٹی گواہی مردوں کے بجائے عورتیں زیادہ دیتی ہیں۔ حقیقت میں عموماً اس بات پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا عورتوں کا قسم کھانا جائز بھی ہے۔ اکثر و بیشتر یہ واقعات سُننے میں آتے رہتے ہیں کہ دُکان کی میز پر سے یا الماری میں سے، جب کوئی نہیں دیکھتا تو یہ چپکے سے چیز اٹھا کر رفوچکر ہو جاتی ہیں۔

قدرت نے یہ مقرر کر دیا ہے کہ افزائش نسل صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کہ جوان، مضبوط اور خوبصورت ہوں تاکہ نسل میں تنزلی واقع نہ ہو سکے۔ نسل کے معاملہ میں قُدرت کا یہ اٹل اُصول و مقصد ہے جس کا اظہار عورتوں کے جذبات سے ہوتا ہے۔ دُنیا میں اس سے زیادہ پُرانا اور بہترین قانون اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ افسوس کہ پھر بھی انسان اس کے خلاف دعوٰی کرتا ہے۔ خیر وہ جو چاہے کہے یا کرے لیکن وہ پہلے ہی زبردست مقابلے میں بے رحمی سے پامال کر دیا جائے گا۔ عورتوں کے چال چلن کے متعلق خلقی اُصول صرف راز اور بے قاعدہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے عمل میں ناکارہ بھی ہے اور وہ یہ ہے "ہم اُن لوگوں کو فریب دینے میں حق بجانب ہیں جو کہ بغیر ہمارا خیال کئے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو نسل پر اقتدار حاصل ہے نسل کا قانون، ضابطہ اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بہبودی و بہتری ہمارے ہاتھ میں دیدی گئی ہے اور ہمارے ذمہ کر دی گئی ہے۔ قاعدے اور قانون کے ماتحت ہم دوسری نسل حاصل کرتے ہیں جو کہ ہم ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کو اپنے فرائض ہوشیاری سے انجام دینے چاہئیں۔" لیکن عورتوں کو اس اعلیٰ اُصول کا قطعی علم و احساس حقیقی طور سے نہیں ہوتا۔ لیکن ان کو مادّی اعتبار سے اس کا کافی احساس ہوتا ہے۔ موقع ملنے پر جس طرح افعال ان سے سرزد ہوتے ہیں اس کے علاوہ اور کوئی دوسرے طریقے سے وہ اپنے اس احساس کا مظاہرہ نہیں کر سکتیں۔ پھر بھی ان کا احساس ہم لوگوں کی طرح ان کو پریشان نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کو قلب کے تاریک ترین حصہ میں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ایک فرد کے لئے اپنے فرض کو ادا کرنے کے بجائے یہ زیادہ بہتر تھا کہ وہ نسل کی خاطر اپنے فرض کی بخوبی انجام دہی کریں جو کہ انتہائی اعلیٰ و افضل ہے۔ اور چونکہ عورتوں کا وجود محض افزائشِ نسل کیلئے ہے اس کے علاوہ اور کوئی کام ان کے لئے نہیں ہے یعنی قاعدے سے وہ

بجائے ایک فرد کے نسل کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن ان کو دل میں بھی نسل کے معاملات کی بہ نسبت ایک فرد کے معاملات سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی سے اُن کی تمام زندگی میں ایک قسم کی بے ثباتی پائی جاتی ہے۔ ان کے کردار کا رجحان خصوصاً مردوں سے جداگانہ ہوتا ہے یہی بات ہے جو کہ شادی شدہ زندگی میں عموماً ایک قسم کی منافرت پیدا کر دیتی ہے۔

مردوں کا فطری احساس محض اختلاف ہے لیکن عورتوں میں یہ واقعی دشمنی ہوتی ہے اس کی وجہ وہ تجارتی رشک وحسد ہے جو کہ مردوں میں اپنے خاص مقصد سے آگے نہیں بڑھتا لیکن عورتوں میں یہ ساری جنس کو شامل کر لیتا ہے چونکہ ان سب کا کام ایک ہی قسم کا ہوتا ہے یہانتک کہ عورتیں سڑک پر ملتی ہیں تو ایک دوسرے کو گوئلفس اور گیبلینس کی طرح دیکھتی ہیں اور یہ بھی ایک امر مسلمہ ہے کہ جب دو عورتوں میں پہلی ملاقات ہوتی ہے تو وہ بہ نسبت مردوں کے زیادہ ظاہرداری اور ریاکاری سے کام لیتی ہیں اسی لئے دو عورتوں کا آداب و سلام بہ نسبت مردوں کے زیادہ مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مرد کسی دوسرے سے بات کرتے وقت عموماً شیریں گفتاری کا خاص خیال رکھے گا چاہے مخاطب معمولی حیثیت ہی کا کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ ناقابل برداشت ہے کہ جب کبھی ایک عمدہ و شریف عورت کسی ادنیٰ حیثیت کی عورت سے باتیں کرے تو ہمیشہ وہ تکبرانہ و متنفرانہ لہجہ میں گفتگو کرے (میرا مقصد اُن عورتوں سے نہیں ہے جو کہ اس کی ماتحتی میں رہتی ہیں۔) اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بہ نسبت ہمارے عورتوں کے نزدیک اختلاف حیثیت میں بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ جب ہمارے لئے سو سفارشیں کچھ اہمیت رکھتی ہیں تو ان کے لئے صرف ایک ہی کافی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس مرد کی جس کی نظر التفات ان کی جانب ہو۔ مزید براں ان میں اتحاد و ربط بہ نسبت مردوں کے بہت زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مقصد حیات ایک ہی قسم کا ہوتا ہے یہی اُن کو اختلاف حیثیت پر زور ڈالنے کی جرات دیتا ہے۔

یہ صرف مرد ہی ہے جو کہ نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر پستہ قد، تنگ سینہ، چوڑے کولھے اور چھوٹی ٹانگوں والی نسل کو صنف نازک کے نام سے پکارنے لگتا ہے کیونکہ اس صنف کی ساری حسن و زیبائش کا تعلق اسی خواہش سے ہے۔ ان کو حسین و خوبصورت کہنے کے بجائے ایک غیر شاعرانہ جنس کہنا زیادہ موزوں و مناسب ہوگا۔ حقیقتاً ان کو نہ تو موسیقی اور نہ شاعری میں دلچسپی ہوتی ہے اور نہ فنون لطیفہ کی تمیز نہ احساس اگر وہ کسی کو خوش کرنے کے لئے ان چیزوں سے دلچسپی کا اظہار بھی کرتی ہیں تو وہ خود مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے روسو ان کے نظریہ کے لحاظ سے کسی چیز میں دلچسپی کا اظہار کرنا ان کے لئے قطعی ناممکن ہے، اور اس کا سبب مجھکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرد براہ راست کسی چیز کی مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن عورت ہمیشہ اس مہارت کو دوسرے ذریعے سے حاصل کرتی ہے اور وہ ذریعہ مرد ہی ہوتا ہے۔ اور جو مہارت کبھی وہ براہ راست حاصل کرتی ہے اس کا بھی تعلق اسی مرد سے ہوتا ہے اسی لئے یہ عورت کی فطرت میں داخل ہے کہ ہر شے کو وہ اسی نظر سے دیکھتی ہے کہ آیا یہ اس کو مرد پر غالب آنے میں آسانی پیدا کر سکتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ کسی چیز سے دلچسپی کا اظہار کرتی ہے تو وہ اس کی مکر بازی ہوتی ہے۔ یعنی اس کو اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے دوسرا راستہ نازو ادا، عشوہ و غمزہ دکھا کر یا پھر اس چیز کا بہانہ کر کے جس کا کہ اس کو احساس کبھی نہیں ہوتا، اختیار کرنا پڑتا ہے اسی لئے روسو نے کی کہا ہے کہ "عموماً عورتوں کو کسی علم و ہنر سے ذوق نہیں ہوتا اور نہ کسی کی باقاعدہ معلومات ہی ہوتی ہے۔ اور نہ عورتوں میں ذہانت ہوتی ہے نہ کوئی خصوصیت"

جو شخص ذرا بھی نظر غائر سے عمیق معائنہ کر سکتا ہے وہ ہرگز اس فیصلے سے انکار نہیں کر سکتا۔ آپ ذرا سی توجہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ تماشہ، سرود یا پیانو سے کس قسم کی دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ کیا وہ محض طفلانہ سادگی نہیں ہوتی۔ مثلاً بڑے سے بڑے شاہکار کے مظاہرے کے درمیان وہ اکثر بک بک کیا کرتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ یونانی اپنے تماشہ گاہ میں عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے تو وہ لوگ یہ کرنے میں بالکل حق بجانب تھے، بہرکیف تمہیں کچھ نہ کچھ تو ضرور یاد ہوگا جو کہ اسٹیج پر کہا گیا ہے۔ آج کل پھر اس کے علاوہ عورتوں کو کلیسہ میں خاموش رکھنے کے بجائے تماشہ گاہ میں خاموش رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کو پردے پہ بڑے بڑے لفظوں میں لکھدینا زیادہ موزوں ہوگا۔

اگر تم یہ دیکھ لو کہ اس جنس کے اعلیٰ سے اعلیٰ دماغوں نے بھی فنون لطیفہ میں ایک بھی چیز ایسی پیش نہیں کی جس کو شاہکار، طبعزاد یا ذہانت کا اعلیٰ نمونہ کہا جا سکے یا پھر انہوں نے کسی شعبہ میں کوئی مستقل بیش بہا چیز کا اضافہ کیا ہو تو تم بھی ان سے کسی چیز کی بھی

اُسے وہ تمنا نہ کریں گے اس کی بہترین مثال مصوری ہے جس میں جذبات کی مہارت حاصل کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ ہم لوگوں میں بڑا ہی قدردان ہیں بھی ہے۔ اسی لئے وہ اس کو حاصل کرنے میں مستعد اور محنت سے بھی کام لیتی ہیں لیکن پھر بھی فن مصوری کا کوئی ایسا نمونہ پیش نہ کر سکیں جس پر وہ بجا طور سے فخر کر سکتیں کیونکہ ان میں اس غیر جانب دارانہ ذہانت کی کمی ہوتی ہے جو کہ مصوری کیلئے لازمی ہے۔ وہ کبھی اپنے ذاتی افکار سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتیں اسی وجہ سے عام عورتوں میں علمی ذوق کم ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ مین نے ڈاکٹر جوان ہارٹے نے اپنی تصنیف میں جس کی شہرت تین سو سال سے چلی آرہی ہے عورتوں کو ہر علمی ذہنیت سے خالی بتایا ہے۔ اس فیصلہ میں کسی خاص جانبداری یا تعصب سے کام نہیں لیا گیا مجموعی حیثیت سے واقعی عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اور ہمیشہ ناقص العقل ہی رہیں گی اور ان کا یہ مرض لاعلاج ہے۔ اس کے علاوہ کہ وہ ناقص العقل ہوتی ہیں ان کی اس جماعت میں بھی ناگفتہ بہ حالت ہے جس میں انکو دخل ہے اور ذرا آگے آگے رہتی ہیں۔ اس جماعت میں اُن کی حیثیت کا اندازہ لگانے کیلئے معیار قائم کرنے کے لئے نپولین کا یہ قول یاد رکھنا چاہئے کہ "عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے"۔ ان کے دوسرے اوصاف کے متعلق مسٹر کیمفرٹ کا قول ہے کہ وہ ہمارے دلائل کے بجائے ہماری کمزوریوں اور حماقتوں سے سودا کر کے فائدہ اٹھاتی ہیں ان کی ساری ہمدردی جو مردوں سے ہوتی ہے وہ محض ظاہری ہوتی ہے اور اس کو ذہن، احساس اور حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ان میں ایک اور قسم کی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو کہ اور بھی حقیر و کمتر ہوتی ہیں لیکن ان کی کمزوریوں کو نظرانداز کر دینا چاہئے لیکن انکی حد سے زیادہ وقعت کرنا واقعی مضحکہ خیز ہے اور یہی ہم کو انکی نظروں سے گرا دیتا ہے۔ جب فطرت نے انسانی نسل کو دو حصوں میں تقسیم کیا تو اُس نے بالکل بیچوں بیچ سے لکیر کھینچ کر دو برابر حصے نہیں کئے۔ یہ صحیح ہے کہ ان حصوں میں قطبین کا تفاوت ہے لیکن انکا یہ فرق محض مقداری کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ صفت کے لحاظ سے بھی ہے۔

یہ بالکل وہی نظریہ ہے جو کہ اسلاف نے عورت کے متعلق قائم کیا تھا اور جو اب بھی اہلِ مشرق کا نظریہ ہے۔ اور عورت کی حیثیت کے متعلق جو رائے انہوں نے قائم کی تھی وہ بہ نسبت ہماری رائے کے نہایت ہی صائب اور درست ہے۔ فرانسیسیوں کے عاشقی اور بہادری کے نظریات اور ہمارے ان کی بیجا وقعت کرنے کے اصول "ٹیوٹانک" اور عیسائیوں کی مخلوط حماقت کے نتیجے ہیں۔ ان ہی نظریوں نے عورتوں کو متکبر اور خود سر بنا دیا ہے یہ دیکھکر اکثر بنارس کے اُن متبرک بندروں کا خیال آجاتا ہے جن کو کہ اپنی چالبازی اور لازوال اقتدار کا اس قدر احساس ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

لیکن مغرب میں عورت اور خصوصاً شریف عورت اپنے کو غلط جگہ پر پاتی ہے۔ اسلاف نے ٹھیک کہا ہے کہ عورت "جنسِ دوئم" ہے اور وہ کسی حیثیت سے بھی ہماری وقعت اور عزت کی مستحق نہیں ہو سکتی اور نہ کبھی مرد سے سربلند اور نہ مرد کے ہم پلہ ہو سکتی ہے اس خراب حالت کے نتائج ظاہر ہیں اس لحاظ سے یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ یورپ میں بھی یہ انسانی نسل کا دوسرا حصہ اس کی اصلی جگہ پر پہونچا دیا جاتا اور اس طرح سے عورتوں کی حماقت کا خاتمہ کر دیا جاتا جو کہ صرف ایشیا ہی کو تمسخر کا موقع نہیں دیتا بلکہ اہلِ روم اور یونانی بھی اس کو مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ ان مفید اثرات کا اندازہ لگانا ممکن ہے جو کہ اس سے ہمارے شہری، جماعتی اور سیاسی انتظامات پر ہوتے۔ پھر سالک کے قانون کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ وہ محض ایک بیکار حقیقت ہو کر رہ جاتا۔ یورپ میں حقیقی معنوں کے اعتبار سے شریف عورت کا وجود ہی نہ ہونا چاہئے بلکہ ان کو ایک بیوی یا لڑکی کی صورت میں ہونا چاہئے جو ہمیشہ اس تمنا میں رہیں کہ وہ بھی کسی طرح شریف عورت بنجائیں۔ ان کو خود سر و متکبر بنانے کے بجائے کفایت شعار اور تابعدار بنانا چاہئے۔ یورپ میں ادنیٰ درجے کی عورتوں یعنی اس جنس کی اکثریت کی زندگی بہ نسبت مشرق کے زیادہ ناخوشگوار محض اس لئے ہے کہ یہاں شریف عورتوں کا ایک فرقہ آباد ہے۔ اسی لئے بائرن بھی کہتا ہے کہ "یونان کے عہد گذشتہ کی عورتوں کی حالت کا اندازہ لگا زیادہ دشوار نہیں ہے انکی موجودہ حالت زمانہ بربریت، بہادری و جوش اور مصنوعی اور غیر فطری حالات کا نمونہ ہے۔ ان کو خانگی معاملات میں دلچسپی لینا چاہئے۔ خوب کھائیں اور پہنیں لیکن جماعت میں شرکت نہ کریں۔ ہاں وہ بہتر و اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن شاعری اور سیاسیات کو نہ پڑھیں۔ سوائے کھانے پکانے اور زہد و تقویٰ کی کتابوں کے دوسری کوئی چیز نہ پڑھیں۔ لیکن ناچنا، گانا، مصوری اور تھوڑی بہت باغبانی اور کاشتکاری بھی اگر وہ سیکھ لیں تو اچھا ہے۔ میں نے پیرس میں عورتوں کو اچھی طرح سڑک کی مرمت کرتے بھی دیکھا ہے تو پھر وہ گھاس کاٹنا اور دودھ دوہنا بھی کیوں نہیں سیکھتیں؟"

شادی کے جو اُصول یورپ میں رائج ہیں وہ عورت کو مرد کے ہم پلہ کر دیتے ہیں یہ ایک غلط آغاز ہے۔ ہمارے یہاں جہاں کہ صرف ایک ہی شادی کا رواج ہے، شادی کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنے حقوق نصف کر لیتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں اور فرائض کو دوگنا کر لیتے ہیں۔ جبکہ قانون نے عورتوں کو مردوں کے برابر جگہ دی ہے تو قانون کو یہ بھی چاہیئے تھا کہ ان میں مردانہ ذہنیت بھی پیدا کر دیتا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جتنی عزت اور حقوق قانون نے عورتوں کو دئے ہیں وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جو کہ قدرت نے خود انکو دئے ہیں۔ ان عورتوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جو کہ ان حقوق کا فائدہ اُٹھاتی ہے۔ دوسری عورتوں کے فطری حقوق بھی اسی قدر چھین لئے جاتے ہیں جتنے کہ دوسروں کو حصہ سے زیادہ مل گئے ہیں۔ صرف ایک شادی کرنے کا اُصول ہے جس نے عورتوں کو غیر فطری حقوق دئے ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت ہر حالت میں مرد کے برابر ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے ہوشیار اور دُور اندیش لوگ اکثر ایک اعلیٰ ایثار کرنے کے بہانہ سے ناگفتہ بہ حرکت کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

انجام کار ان قوموں میں جن میں ایک سے زیادہ شادی کرنیکا رواج ہے ہر عورت کا انتظام ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں صرف ایک ہی شادی کا رواج ہے وہاں شادی شُدہ عورتوں کی تعداد محدود ہوتی ہے اور ایک بڑی تعداد بلا یار و مددگار رہ جاتی ہے جو کہ اعلیٰ طبقوں میں مثل سن رسیدہ عورتوں کے بیکار زندگی کے دن گذارتی ہیں اور نیچے طبقہ والی ایسے سخت کام اور محنت و مشقت پر مجبور ہو جاتی ہیں جو کہ انکے لئے ہرگز موزوں نہیں ہیں اور اُن کی زندگی بالکل بدمزہ اور بے لُطف ہو جاتی ہے مگر بعض اوقات انکی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ان کا ظاہرا کام اس مقصد کو حاصل کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل سے اُن جذبات کو نکالتی رہے جو کہ خوش قسمت یعنی شادی شُدہ عورتوں یا پھر شادی ہونے والی عورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ صرف لندن میں اسّی ہزار طوائفیں موجود ہیں۔ یہ عورتیں ہی ہیں جن کا یہ حشر صرف ایک شادی کے اُصول سے ہوا۔ یہ ان کی بدقسمتی ہے اور یہ انسانی قربانیاں ہیں جو کہ صرف ایک شادی کے اُصول پر ہوتی رہتی ہیں۔ جن عورتوں کی بدقسمتی کا ذکر ابھی کیا گیا یہ یورپ کی شریف زادیوں کا لازمی انجام ہے۔ جن کے دماغوں میں غرور، نخوت اور خود سری سمائی رہتی ہے۔ اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک سے زیادہ شادی کرنے کا اُصول عورتوں کیلئے نہایت مُفید ہے۔ اور دوسرے نظریہ کے اعتبار سے جبکہ ایک عورت متعدی اور دائمی امراض میں مبتلا رہتی ہے یا بانجھ ہوتی ہے یا پھر اپنے شوہر کی عمر کے لحاظ سے زیادہ معمر ہوتی ہے تو کیا سبب ہے کہ یہ شخص دوسری شادی نہ کرے۔ وہ اغراض و مقاصد جو بیشتر آدمیوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس غیر فطری ایک شادی کے اُصول سے بغاوت کرتے ہیں۔

علاوہ بریں عورتوں کو جو غیر فطری حقوق دئے گئے تو انکے غیر فطری فرائض میں بھی اضافہ ہو گیا اور ان ہی فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی اُن کو خوش نہیں رہنے دیتی۔ اب میں اسی بات کو ذرا واضح کرتا ہوں۔ ایک شخص اکثر یہ خیال کرتا ہے کہ اگر میں شادی کرتا ہوں تو میرے جماعتی اور اقتصادی وقار میں کمی آجائیگی اگر میں کسی رئیس گھرانے میں شادی نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں وہ شادی کے اصولوں کے برعکس اپنی خواہش اور پسند کے مطابق ایک ایسی سے شادی کریگا جس سے اُس کی اور اُس کی اولاد کی اقتصادی حالت درست رہے۔ یہ وجوہات چاہے کتنے ہی عُمدہ، مدلل، جائز اور موزوں ہوں لیکن اگر ایک عورت ان بیجا حقوق سے زیادہ حاصل کرنیکی کوشش کرتی ہے جو کہ اس کو صرف شادی سے حاصل ہوتے ہیں تو وہ کچھ نہ کچھ اپنا وقار ضرور کم کر دیتی ہے کیونکہ شادی ہی ایک ایسی چیز ہے جو کہ شہری جماعت کی بُنیاد ہے۔ اس طرح اس کی تمام زندگی ناخوشگواری اور بے لطفی میں گذرے گی کیونکہ انسانی فطرت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ دوسروں کی رائے اور خیالات کا بہت زیادہ لحاظ کرے چاہے اس کے حالات سے ان کا شمہ برابر بھی تعلق نہ ہو۔ اور اگر وہ ایسی کوشش نہیں کرتی تو پھر اس کو یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں شادی کسی ایسے شخص کے ساتھ نہ ہو جائے جس کو وہ خود پسند نہ کرتی ہو یا پھر وہ بلا شادی کے بوڑھی عورتوں کی طرح پڑی رہ جائے کیونکہ وہ زمانہ جس میں اس کو آباد ہو جانے کا موقع ہوتا ہے بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ اس ایک شادی والے نظریہ کی رُو سے ٹامیس کا "حرم" پر نہایت ہی قابلانہ لکھا ہوا مقالہ پڑھنے کے قابل ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر عہد اور ہر قوم و فرقہ میں لوتھر کے اصلاحی زمانہ تک حرم رکھنے کی اجازت تھی۔ بلکہ وہ ایک باقاعدہ تھا جس کی حقیقتاً قانون نے بھی اجازت دے رکھی تھی اور اس کو کبھی بُری نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ یہ صرف لوتھر کی اصلاح نے اس کو بُرا بتلایا

ہو۔ پادریوں کی شادی کو بھی لازمی قرار دیا گیا جس سے کیتھولک چرچ بھی نہ بچ سکا۔

ایک سے زیادہ شادی کرنے کیلئے دلائل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ہر حالت میں ضروری سمجھ لینا چاہیئے۔ ہاں سوال یہ ہو کہ اسکو رائج کس طرح کیا جائے۔ وہ کون سی ایسی جگہ ہو جہاں لوگ صرف ایک شادی کرتے ہیں۔ ہم بعض اوقات یا ہمیشہ ہی ایک سے زیادہ شادی کی حالت میں رہتے ہیں۔ چونکہ ہر شخص کو بہت سی عورتوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے تو ایسی حالت میں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو صرف اس ہی بات کی اجازت دی جائے بلکہ اس پر یہ زور ڈالا جائے کہ وہ بہت سی عورتوں کی پرورش کرے۔ یہ اُصول عورتوں کو اُن کی اصلی و حقیقی جگہ پر ماتحت کی صورت میں پہونچا دے گا۔ اور شریف عورت کا ——— جو کہ مغربی تہذیب کی ایک مکروہ پیداوار ہے اور ٹیوٹانک عیسائیوں کی حماقت ——— دُنیا سے ایک دم نام و نشان مٹ جائیگا۔ دُنیا میں عورتیں ہوں گی لیکن ایسی مصیبت زدہ اور پریشان حال عورتیں نہ ہوں گی جن سے آج تمام یورپ بھرا پڑا ہو۔

ہندوستان میں کسی عورت کو آزادی حاصل نہیں ہو لیکن "منو" کے قانون کے مطابق وہ باپ، شوہر، بھائی یا پھر بیٹے کی زیر نگرانی رہتی ہے۔ یہ ضرور ایک قابل نفریں فعل ہے کہ عورت اپنے شوہر کی چتا میں جل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ لیکن یہ بھی نفرت انگیز ہے کہ وہ اپنے شوہر کی دولت کو آشناؤں کے لئے صرف کرے۔ وہ دولت جس کو اس نے انتہائی جانفشانی سے صرف اس اُمید و خیال میں جمع کیا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں کی پرورش کیلئے سامان کر رہا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اچھے ہیں جنہوں نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔

ماں کی سب سے پہلی محبت اپنے بچے سے ہوتی ہے، جس میں انسانوں اور حیوانوں کی مانند بالکل خلوص ہوتا ہے اسی لئے جب بچہ اپنے جسمانی اعتبار سے کسی بات کیلئے لاچار و مجبور نہیں ہوتا تو ماں کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُس کی پہلی محبت کا انحصار عادت اور سبب پر ہوتا ہے لیکن جب کہ ماں کے دل میں باپ کی یا اور کسی کی محبت ہو جاتی ہے تو پھر اس کا مُظاہرہ نہیں ہوتا۔ باپ کو جو بچے سے محبت ہوتی ہے وہ کچھ اور ہی قسم کی ہوتی ہے اور زیادہ دیرپا بھی نہیں ہوتی کیونکہ باپ بچے میں خود اپنا ہی عکس دیکھتا ہے اور اس کو اپنے ہی خون کا ایک قطرہ سمجھتا ہے یعنی اس کی محبت کی ابتدا مابعد الطبیعیات کے اُصولوں پر منحصر ہوتی ہے۔

عورتوں کا تجربہ چاہے مردوں سے زیادہ نہ ہو لیکن اس میں ایک بڑی زبردست خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل مادی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کو اپنی خوبصورتی، حسن، زیبائش، آرائش نمائش اور شان و شوکت پر بڑا گھمنڈ اور ناز ہوتا ہو۔ اسکے برعکس مردوں کو غیر مادی چیزوں مثلاً علم، ہنر، ہمت اور ذہانت پر فخر و ناز ہوتا ہے۔

اپنی سیاسیات کی کتاب میں ارسطو نے ان دقتوں کو بیان کیا ہو جو کہ اسپارٹا والوں کو اس وجہ سے پیش آئی تھیں کہ اُنہوں نے عورتوں کے ساتھ زیادہ روا داری جائز رکھی تھی یعنی اُن کو وراثت، جہیز اور کافی آزادی کے حقوق دیدئے تھے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ اسپارٹا کی تباہی میں اس کا کتنا زیادہ اثر و دخل تھا۔ کیا یہی بات فرانس میں نہ تھی کہ عورتوں کے اس اثر و اقتدار نے جو کہ لوئس سیزدہم کے عہد حکومت سے برابر بڑھتا چلا آرہا تھا جس کی وجہ سے سرکاری عدالتوں میں بدنظمی اور رشوت ستانی کا بازار گرم تھا اور پھر ۱۷۸۹ء کی بغاوت اور بعد کی تمام گڑبڑی کا بھی یہی عورتوں کا اثر و اقتدار ہی باعث ہوا۔ چاہے وہ کتنی ہی خراب حالت عورتوں کی ہو جس کو عورتیں اپنی مجالس میں آب و تاب سے ظاہر کرتی ہیں۔ حقیقتاً ہماری ہیئت اجتماعیہ کا سب سے بڑا اور خاص نقص ہو اسی سے پیدا ہو کر زہریلے اثرات ہر سمت ضرور پھیلیں گے۔

عورت کی غلامانہ ذہنیت کا پتہ اس سے چلتا ہو کہ جب کبھی عورت کو مکمل آزادی حاصل ہو جاتی ہو تو وہ فوراً ہی کسی مرد سے تعلق پیدا کر لیتی ہے جس کی وہ ہمیشہ تابعدار اور فرمانبردار رہتی ہے۔ یہ صرف اسلئے کہ اس کو ایک حاکم یا سرپرست کی ضرورت ہوتی ہو اگر وہ جوان ہو تو اس کا تعلق کسی عاشق سے ہو جائیگا اور اگر وہ بدقسمتی سے بوڑھی ہو گئی ہو تو پھر وہ کسی پیر صاحب کی مُرید ہو جائیگی۔

اثر۔ بی۔ اے۔ (علیگ)

افسانہ نویسی*

(مصنفہ عظیم بیگ چغتائی کا ایک باب)

افرادِ افسانہ

افرادِ افسانہ سے میری مراد اُن تمام شخصوں سے ہے جن کا ذکر ایک افسانے میں ہو۔ قبل اس کے کہ میں اس بارے میں کچھ عرض کروں میں چند خود ساختہ اصطلاحیں اور تعریفیں پیش کرونگا۔

افرادِ افسانہ دو طرح تقسیم کئے جاسکتے ہیں " افرادِ پلاٹ " اور " دیگر افراد "

افرادِ پلاٹ:- وہ تمام افراد جن کا تعلق براہِ راست افسانہ کے خاص پلاٹ سے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی فرد نکال دیا جائے تو پلاٹ شکست ہو جائیگا۔

دیگر افراد:- افرادِ پلاٹ کے علاوہ تمام وہ افراد جن کا ذکر افسانہ میں ہو۔ اور ان افراد کو پھر میں دو قسموں میں تقسیم کرتا ہوں " ضروری " اور " غیر ضروری "

ضروری افراد:- افرادِ پلاٹ کے علاوہ وہ تمام افراد جو مقاصد افسانہ کیلئے رکھے جانا ضروری ہیں اور اگر انکو نکال دیا جائے تو گو افسانہ شکست نہ ہوگا لیکن کوئی خوبی جاتی رہیگی اور ان کا رکھا جانا ضروری ہے۔

غیر ضروری افراد:- افرادِ پلاٹ کے علاوہ وہ تمام افراد جن کو آسانی سے خارج کیا جاسکتا ہے۔ اور قصّہ پر کوئی اثر نہ پڑے۔

نوٹ:- محض " ضروری " اور " غیر ضروری " کی اصطلاحوں سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ غیر ضروری افراد قصّہ میں جائز ہیں۔ میرا مطلب اس سے یہ نہیں ہے، اس لئے کہ دیکھا جائے تو " غیر ضروری " کی بھی افسانہ کو ضرورت ہوتی ہے۔

مثال:- مثلاً ہیرو اور ہیروئن مع خاص افراد کے " افرادِ پلاٹ " ہوئے اور " دیگر افراد " میں آئے وہ تمام لوگ جن کو خارجی طور پر افسانہ نویس نے داخل کیا ہے اور ان کے افعال افسانہ میں قصّہ کو مرتب کر رہے ہیں۔ اور ایسے لوگ جیسے گمنام راہگیر، دوکاندار، تماشائی وغیرہ وغیرہ یہ لوگ " غیر ضروری " ہوئے۔

اس فرضی تقسیم کے بعد میں ایک مبتدی افسانہ نویس کے سامنے " تعدادِ افراد " کا سوال پیش کرتا ہوں یعنی افرادِ افسانہ کی تعداد کے بارے میں کیا اصول ہونا چاہیئے۔

میں نے ایک نہایت اچھا افسانہ پڑھا تھا جس میں افرادِ افسانہ اس قدر زیادہ تھے کہ بہت جلد یہ یاد رہنا ہی ناممکن ہوگیا کہ کون کون ہے۔ بڑی مشکل سے پنسل سے نشان لگا لگا کر اور ہر قدم پر پڑھا ہوا حصّہ دوبارہ پڑھ پڑھ کر کام چلایا۔ میری ناچیز رائے میں اس بارے میں حسب ذیل اصول برتا جائے

(۱) افرادِ پلاٹ کی تعداد کم کرنے میں مبالغہ سے کام لو۔

(۲) حتی الوسع غیر ضروری افراد سے کام لو۔ یعنی ضروری افراد کو " غیر ضروری افراد " میں ڈالنے کی کوشش کرو۔

ممکن ہے کہ آپ کہیں یہ کیسے ممکن ہے لیکن اگر ذرا کوشش سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا یہ دشوار نہیں ہے۔ مثلاً ایک اہم کام آپ کو چار دفعہ ایک " ضروری فرد " سے لینا ہے تو بہتر ہے کہ اُسے نکال دیجئے اور اس کے بدلے چار " غیر ضروری " افراد لے آیئے

قصّہ مختصر افرادِ افسانہ کی تعداد مجموعی طور پر جتنی بھی کم ہوگی اتنا ہی بہتر ہے۔ اب اس تقسیم کے بعد میں ایک دوسری تقسیم کرتا ہوں۔ تمام افرادِ افسانہ دو قسموں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ (۱) متعارف۔ اور (۲) غیر متعارف۔

متعارف:- وہ افراد (خواہ وہ افرادِ پلاٹ ہوں یا دیگر افراد یا اور کسی قسم کے افراد) جن کا تعارف افسانہ پڑھنے والے سے کرانا لازمی اور ضروری ہے۔

غیر متعارف:- وہ تمام افرادِ افسانہ جن کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ تعارف سے کیا مطلب؟ لفظِ تعارف کو میں نے نہیں استعمال کیا ہے۔ لہذا

"تعارف" سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس کا ضروری حال جو افسانوں میں اکثر دیکھا جاتا ہے۔ صورت شکل، عادات و خصائل سکونت وغیرہ وغیرہ۔ غرض جملہ باتیں جنکی افسانہ کو ضرورت ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا تقسیم کو مدنظر رکھتے ہوئے میں عام غلطیوں کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔

سب سے بڑی غلطی ایک مبتدی یہ کرتا ہے کہ ایک "غیر متعارف فرد" کو "متعارف" کر دیتا ہے یہ ایسی غلطی ہے کہ کسی طرح بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ ایک شخص جس کی صورت شکل، ولایت سکونت وغیرہ کا ذکر آسانی سے چھوڑا جا سکتا ہے۔ اسکو افسانے میں ہرگز نہ لانا چاہیے۔

فسانہ نویس کی یہ کوشش ہونا چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے افراد "غیر متعارف" رہیں۔ آپ عام افسانوں کو دیکھئے کہ خود "افراد پلاٹ" کو ضرورت سے زیادہ "متعارف" کرنیکی لوگوں میں عادت ہے۔ ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کسی خاص فرد کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، کجا اس کی ولایت اور سکونت اور عادات و خصائل موجود ہیں۔

میرے یہاں آپ کو متعارف افراد بمشکل دو تین ملیں گے۔ اور بسا اوقات پوری کتاب میں جملہ افراد کے نام ایک سرے سے غائب یا زیادہ سے زیادہ دو تین نام۔ دیپاپُر میں شاید ایک سرے سے کوئی نام ہی نہیں ہے زیادہ تر میرے افسانوں اور ناولوں میں خود ہیرو کا نام غائب ہے۔ قصہ مختصر میرا عمل یہی ہے اور میں رائے بھی یہی دیتا ہوں۔ صحیح یا غلط۔

اب اس کے بعد میں تعارف کے طریقے کو لیتا ہوں۔ تعارف دو طرح کا ہوتا ہے۔ (۱) براہ راست۔ (۲) بالواسطہ۔

براہ راست:- وہ طریقہ تعارف جہاں بہ سلسلہ تعارف کسی فرد افسانہ کو کہا جائے کہ بڑا بہادر تھا، خوبصورت تھا، طاقتور تھا۔ نیک تھا وغیرہ وغیرہ۔

بالواسطہ:- وہ جہاں افسانہ نویس ایک بہادر کو اپنی زبان سے بہادر نہیں کہتا بلکہ اُس کی بہادری دکھا کر خود پڑھنے والے سے کہلوا لیتا ہے۔ نیک لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اُسکی نیکی دکھا دیتا ہے۔

میری ناچیز رائے میں "براہ راست تعارف" افسانہ کو مرتب کرنے کے لئے بدترین چیز ہے۔ ایک اچھا افسانہ محض اِس ایک خرابی سے ردی ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی خرابی یہ ہے کہ (۱) طوالت پیدا کرتا ہے۔ اس لئے کہ جب ایک فرد کی بہادری کا واقعہ ہی دکھا دیا تو قبل از واقعہ محض یہ بتلانے میں دو چار سطریں آپ کیوں بڑھائیں کہ وہ بہادر ہے۔

(۲) افسانہ کو بسا اوقات غلط کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ افسانہ کو مختلف الخیال آدمی پڑھتے ہیں آپنے ایک فرد کو بہادر کہا اور آگے چلکر اس کی بہادری جو دکھائی تو پڑھنے والے نے جو غالباً خود آپکے ہیرو سے زیادہ بہادر ہے یہ کہا کہ لاحول ولاقوۃ یہ بھی کوئی بہادری ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ بہادری ہے یا نہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ ایک ہی فعل کو لوگ کم یا زیادہ بہادری کا خیال کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ بڑی بہادری کی دوسرا کہتا ہے کوئی خاص بہادری نہیں۔ قصہ مختصر پڑھنے والے کے لئے سامانِ لطف جاتا رہتا ہے

(۳) نہایت ہی بھدا طریقہ ہے۔ گویا خود میاں مٹھو بننا۔ اور افسانے میں ایک انتہا سے زیادہ غیر دلچسپ مواد پیدا کرتا ہے

(۴) افسانہ کی یا افسانہ کے کسی خاص باب کی ابتدا کو بہت بُری طرح خراب کرتا ہے۔

یہ محض چند خرابیاں میں نے بتائیں۔ قصہ مختصر میری رائے میں تعارف براہِ راست ہرگز ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ تاوقتیکہ کوئی خاص بات آپ پیدا نہ کر سکتے ہوں۔

صحیح تعارف:- صحیح تعارف کا طریقہ مجھے ذرا باریکی کے ساتھ عرض کرنا ہے۔ بعض مقامات پر باوجود اپنی خرابیوں کے "براہ راست" تعارف کا تھوڑا بہت ٹکڑا ابھی رکھنا پڑتا ہے۔ تعارف کا وہ حصہ جو ولدیت، سکونت، پیشہ، اور اسی قسم کی چیزوں سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں لازمی یہ باتیں ہیں تو براہ راست ہی طریقے سے لائی جائے گی۔ لہذا جہاں کہیں بھی آپکو تعارف کے سلسلہ میں کچھ کہنا ہو تو اس کے بارے میں میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ تعارف کے سلسلہ میں جتنی باتیں بھی آپ کو کہنا ہیں اور خصوصاً غیر دلچسپ تو وہ ایکدم سے نہ بیان کریں۔ بلکہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان کریں۔ جہاں جس بات کی ضرورت ہو وہیں پر جملہ کے ساتھ ساتھ ہی ایک دو الفاظ میں تعارف کر دیا بعض افسانوں میں دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص کا تمام ضروری تعارف ایک جگہ موجود ہے اور افسانہ میں بڑی دور جا کر معلوم پڑا کہ فلاں تعریف اس لئے کی گئی تھی۔ یہ طریقہ ممکن ہے صحیح ہو مگر

ہیں اسکو قطعی غلط سمجھتا ہوں۔

رہا غیر براہ راست یعنی بالواسطہ تعارف تو اس کا صحیح طریقہ سب ہی جانتے ہیں کہ خود ایک فعل ہی از خود بہترین تعریف ہوسکتی ہے لیکن بعض لوگ اس میں بھی یہی غلطی کرتے ہیں کہ گو زبان سے بہادر نہیں کہتے لیکن کوئی سابق کارنامہ بیان کر دیتے ہیں اور پھر یہ کرتے ہیں کہ جملہ تعارفی عبارت شروع میں یا اور کسی جگہ سب کی سب ٹھونس دی۔ یہ غلط طریقہ ہے۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں یہ بھی عرض کردوں گا کہ جو کچھ بھی میں نے اس باب میں کہا وہ پتھر کی لکیر نہیں ہے اور ان میں کا ہر اصول کسی خوبی پیدا کرنے کیلئے توڑا جا سکتا ہے۔

جن امور کو میں نے اس باب میں پیش کیا ہے اُن کے بارے میں مکرر عرض ہے کہ ان اُمور کی طرف اگر ایک مبتدی کی توجہ رہے تو اُس کے افسانوں کی بہت سی خرابیاں دُور ہو سکتی ہیں اور میں اس باب کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

اسی سلسلہ میں باب "حُسن پرستی" کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ براہ راست تعارف میں ایک یہ بھی خرابی ہے کہ جو حُسن آپ نے قابل تعریف قرار دیا وہ مجھے ناپسند ہے۔ آپکو کتابی چہرہ پسند ہے تو مجھے گول آپکو نیلی آنکھ پسند ہے تو مجھے سیاہ۔

مقامات

مقام کے لحاظ سے افسانہ حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کی جا سکتی ہیں:- (۱) مقامی افسانے۔ (۲) غیر مقامی افسانے۔

(۱) مقامی افسانے ہم اُن کو کہیں گے جو ایک ہی واحد مقام پر شروع ہو کر وہیں ختم ہوتے۔ مثلاً اسکول کے کلاس روم کا قصہ یا گھر کے اندر کا قصہ جس میں مقامی سین نہیں بدلتا۔

(۲) غیر مقامی تمام وہ افسانے جو ایک سے زائد مقام پر وقوع میں آئے اور گھر اور باہر اور بازار اور ہاٹ غرض دس مقام کے واقعات سے ملا کر افسانہ کو مکمل کیا۔

افراد افسانہ کی طرح مقامات کو بھی میں تقسیم کردونگا یعنی (۱) مقامات پلاٹ۔ (۲) دیگر مقامات۔ اور اس کے بعد دیگر مقامات کی تقسیم بھی اسی طرح کروں گا۔ یعنی (۱) ضروری مقامات اور (۲) غیر ضروری مقامات۔ اور اس کے بعد مقامات کو بھی میں (۱) متعارف اور (۲) غیر متعارف میں تقسیم کرونگا اور انکے بارے میں بھی کم و بیش وہی الفاظ دہراؤں گا جو افراد افسانہ کے بارے میں عرض کر چکا ہوں۔ لیکن تھوڑا بہت اصولاً فرق بھی رکھنا پڑیگا۔

افراد افسانہ کی طرح مقامات کی تعداد کم کرنے سے افسانہ میں کسی خاص خوبی کا اضافہ مشکل ہے۔ اس میں مبالغہ یا سختی کی ضرورت نہیں۔ گو مقامات کی تعداد خواہ کتنی رکھے لہذا تعداد کے بارے میں افراد افسانہ سے یہاں مختلف اصول ہے۔

سب سے زیادہ توجہ متعارف اور غیر متعارف کے بارے میں مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ افراد افسانہ کی طرح ایک مقام غیر متعارف کو متعارف کر دیتے ہیں اور خواہ مخواہ مقام کی تفصیل میں مبالغہ کرتے ہیں۔ بالخصوص اگر کہیں سبزہ زار ہے یا جنگل ہے یا دریا ہے تو پھر تو اور بھی زیادہ تفصیل سے کام لیتے ہیں بقول کسے سبزہ زار دیکھتے ہی افسانہ نگار نے کا موقع ہاتھ آتا ہے اور یہ بڑی بھاری غلطی ہے۔ ہرگز ہرگز کسی مقام غیر متعارف کو متعارف نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس میں بھی بڑی زبردست مستثنیات ہیں۔

ڈرامائی کیفیت:- بعض اوقات ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کیلئے ایک غیر متعارف مقام کو متعارف کرنا پڑتا ہے۔

فضا:- افسانہ میں اصلی فضا اور ماحول ایک لوازمہ ہے۔ مقامات کا تعارف ہی ہمیں بتائیگا کہ وقوعہ لندن کے بازار کا ہے یا قصبہ کے ہاٹ کا اور اس طرح ایک غیر متعارف مقام مجبوراً متعارف ہو جائے گا۔

ذہنی کیفیت:- بعض وقت مقامی سکون اور مقامی فضا انسان کے دماغ پر اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ اُس سے خود واقعات رُونما ہوتے ہیں۔ لہذا افرادِ افسانہ کے اقوال و افعال کے ساتھ ساتھ بسا اوقات ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ تین عذرات لیے ہیں کہ آپ اسی بہانہ سے چاہیں تو اپنے افسانہ کے مقاماتِ غیر متعارف کو متعارف کر کے افسانہ خراب کر سکتے ہیں۔ دراصل حدود قائم کرنا مشکل نہیں اور میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ افسانہ لکھتے وقت اس کا احساس رکھیں گے کہ ایک غیر متعارف مقام خواہ مخواہ متعارف نہ ہو جائے تو غالباً یہ غلطی نہ ہوگی۔ مقام کی تفصیل دراصل ایسی ہونی چاہیئے کہ پڑھنے والا اپنے ذہن میں مقام کی تصویر آسانی سے قائم کرلے لیکن خوب اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ جتنا بھی آپ تفصیل کی باریکیوں سے

بجیسے کہ اتنی ہی خوبی آپ پیدا کرسکیں گے۔

اس سلسلہ میں اسی کتاب کے باب "حسن پرستی" کی طرف توجہ دلاکر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح حسن کی تفصیل دینے کو میں نے بتایا ہے کم و بیش وہی اصول مقام کی تفصیل میں مدنظر رکھا جا سکتا ہے۔

مکرر میں عرض کرونگا کہ اپنے افسانوں کے غیر متعارف مقامات کو حتی الوسع متعارف کبھی نہ ہونے دو۔

افعال اور چیزیں۔ تعارف کے سلسلہ میں مقامات کے بعد افعال اور چیزوں کا نمبر آتا ہے۔ ہر افسانہ میں یہ بھی متعارف یا غیر متعارف ہوتی ہیں۔ افرادِ افسانہ سے مختلف افعال سرزد ہوتے ہیں ان میں وہ تمام افعال جن کی تفصیل نہیں دی جاتی۔ ہم ان کو "غیر متعارف" کہتے ہیں اور جن کی تفصیل دی جائے وہ متعارف ہوئے۔ مثلاً ایک افسانہ میں آتا ہے "ایک آدمی دریا میں کود پڑا اور تیر کر پار نکل گیا"۔ یہ فعل غیر متعارف ہوا۔ اب اسی فعل کو آپ متعارف کرنا چاہیں تو اس طرح رکھدیں:-

"اس نے چاروں طرف دیکھا سامنے دریا لہریں مار رہا تھا اس نے ایک زقند لگائی اور ایک جھماکے کے ساتھ پانی میں ڈوب گیا۔ ابھر کر اس نے اپنے سر کو جنبش دیکر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بالوں کے پانی کو جھٹکا اور پھر ملاحی کے زبردست ہاتھ لگاتا، پانی کو چیرتا چلا گیا۔۔۔۔۔"

چیزیں۔ اسی طرح افسانہ میں سینکڑوں چیزوں کا ذکر آتا ہے اور ان میں سے بعض کی تفصیل دی جاتی ہے اور بعض کی نہیں دی جاتی۔ خواہ مخواہ کسی غیر متعارف شے کو متعارف کر دینا قصہ میں سقم پیدا کر دیتا ہے۔ اور متعارف کو زبردستی غیر متعارف کر دینا بھی قصہ سے چند دلچسپ سطریں لے سکتا ہے۔

ایک متعارف فعل کو غیر متعارف کرنے سے جو خوبی ضائع ہو سکتی ہے وہ اس دریا میں کودنے والی مثال سے ظاہر ہے۔ کسی غیر متعارف فعل یا شے کو صحیح معنی میں کامیابی کے ساتھ متعارف بنا دینا بھی قابلیت میں داخل ہے۔

بہرصورت افرادِ افسانہ اور مقامات افسانہ کی طرح افعال اور اشیائے افسانہ کے بارے میں بھی خیال رکھنا چاہئیے کہ غلطی نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہی قصہ کو بگاڑ دیتی ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی

ڈاکٹر کا استعمال

"ہاں یقین کیجیے" حامد نے سگار کا ایک کش لیکر بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا "ہماری نظروں میں حقیقت، خدا، مذہب کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ہم ان سب کو تصرف میں لاتے ہیں۔ حقیقت کے ذریعے ہم قتل کر سکتے ہیں، انتقام لے سکتے ہیں۔ خدا کو لیجیے۔ "خدا" کو بھی حسب ضرورت موڑ توڑ لیا جاتا ہے۔ یا مختلف سانچوں میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ مذہب کی مختلف تعبیریں تراش لی جاتی ہیں محض کسی وہم کیلئے یا اپنے یقینوں اور ایمانوں کی دُنیا کو برقرار رکھنے کیلئے، یا کسی ایسی ہی ذہنی اُلجھن کیلئے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب" طارق نے طنزاً مُسکراتے ہوئے کہا "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ یہ تمام دُکھ بیماریاں بھی سب محض "ذریعے" ہیں اور حقیقت میں کوئی وقعت نہیں رکھتے؟"

حامد نے سگار کی راکھ طشتری میں جھاڑتے ہوئے کہا

"ہاں، زیادہ تر بیماریاں خودساختہ ہوتی ہیں اور تقریباً ہر بیماری میں مُبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مریض کو مرض کی وجہ سے بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کو لیجیے انکی بیماریاں عموماً کسی نہ کسی مقصد کیلئے ہوتی ہیں۔ خاوند کو خوش رکھنے، نچانے، مٹھی میں لینے یا ٹالنے کیلئے، یا ساس کی خفگی سے نجات پانے کیلئے یا پڑوسیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے۔ اور تقریباً یہی حال بچوں اور بوڑھوں کا ہے۔ ہاں بالکل یہی!" اس نے شانے ہلاتے ہوئے کہا "اور پھر ایسے مریض ڈاکٹر سے علاج نہیں کراتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق ڈاکٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے دانتوں کا بُرش۔ بیلچہ یا پرانی روایات استعمال کی جاتی ہیں۔"

اِس بات پر تینوں اصحاب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"اچھا تو ڈاکٹر!" طارق نے طعنے کے طور پر کہا "کیا کبھی کسی مریض نے آپ کو بھی استعمال کیا ہے؟"

"ہاں!" ڈاکٹر نے مُسکرا کر میز پوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں نہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔" ڈاکٹر حامد نے سگار کا ایک کش لیا اور اُسکے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آگئی مگر پھر وہ کسی نامعلوم گہرے خیال سے کانپ اُٹھا۔

حاضرین کے اصرار پر حامد نے وہ قصہ یوں بیان کیا۔

"ایک روز میں اپنے مطب میں بیٹھا تھا۔ کوئی نو بجے کا وقت ہوگا کہ ایک دُبلا پتلا آدمی آیا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں شاید وہ جوہری تھا۔ یا شاید ویسے ہی کوئی سوداگر تھا۔ بہرحال وہ کوئی امیر دوکاندار تھا۔ اس کی دوکان مال روڈ پر تھی۔ تینتیس پینتیس برس کا سن ہوگا۔ سیدھی سادی شکل و صورت سمجھ لیجیے۔ مگر اُس کی آنکھیں تخیلی آنکھیں تھیں اور اُن میں کچھ ایسی جھلک تھی جسے دیکھکر یوں محسوس ہوتا جیسے اُس نے زندگی میں بہت دُکھ سہا ہو۔ اور اس کے انداز میں ایک ایسی جھینپ اور "کھویا پن" تھا جس سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کسی تخیلی دُنیا میں رہنے کا عادی ہو۔ اور دُنیا کے حقائق کی گھوریوں سے گھبراتا ہو۔ بیٹھتے ہی اُس نے ایک اضطراری انداز سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے آپکے مشورے کی سخت ضرورت ہے۔ مَیں سخت دُکھی ہوں اور میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے مَیں وحشت سے دیوانہ ہوجاؤنگا۔ یا خُدا جانے کیا کر بیٹھوں۔ مَیں اتفاقاً آپ کا بورڈ دیکھکر اندر چلا آیا ہوں۔ آپ فرمائیے کہ مَیں کس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔"

"مَیں آپ کو صبح نو بجے سے بارہ بجے تک ہر وقت مل سکتا ہوں۔ ہاں اگر کوئی مریض آیا ہوا ہو تو آپ کو انتظار کرنا پڑیگا... ابھی فرمائیے مَیں اس وقت فارغ ہوں... یا جب بھی آپ کو فرصت ہو۔" میں نے اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھکر کہا۔

اُس نے دو ایک بار گھڑی کو گھور کر دیکھا اور یوں کہنے لگا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ "خیر کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں! ابھی سہی۔" اُس کے الفاظ سے سسکیوں کی بو آرہی تھی۔ مگر اُس کی آنکھ سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی نامعلوم دبی ہوئی مسرت سے چمکنا چاہتی ہو۔

"ایک منٹ ٹھہریے۔" میں نے نوٹ بک تلاش کرنے

کیلئے معذرت کی

"کیا میں یہ تصاویر دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے یکلخت اٹھتے ہوئے کہا۔ جیسے کرسی میں اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

"شوق سے" میں نے دراز سے نوٹ بک تلاش کرتے ہوئے جواب دیا۔۔۔۔۔

"اخاہ!!" انگیٹھی سے پتھر کا کتا اٹھاتے ہوئے کہا "بہت اچھا ہے!! نہایت خوب! ڈاکٹر صاحب!" اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا "میں آپ کے چناؤ کی داد دیتا ہوں"

ان دنوں میں نے اپنے کمرے کو مختلف تصاویر اور نادرات سے سجایا ہوا تھا۔ تاکہ مریض کی بھٹکتی ہوئی نگاہوں میں اس کے دل کی ان کہی یا ناگفتنی بات کا اظہار ہو سکے۔ وہ کتا میں نے ڈبی بازار کو خریدا تھا وہاں ایک میلی کچیلی دکان میں متفرقات کے ڈھیر تلے پڑا تھا۔ ایک کباڑی کی دوکان میں۔ اور چونکہ بہت سستا مل گیا اس لئے میں نے خرید لیا۔ گو میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ تحلیل نفسی کے عمل میں کیا کام دے سکتا ہے"

وہ کتا پتھر کا تھا۔ کوئی پانچ چھ انچ اونچا ہوگا۔ مگر اس کی صورت بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے۔ یعنی۔۔۔۔۔۔ ہاں اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ اس کی صورت اس کتے کی تھی جو عام طور پر سڑک کے درمیان میں پڑا ہوا پایا جاتا ہے۔ اور ہر راہگیر کو مظلوم اور ملتجی نگاہوں سے اس امید سے دیکھتا ہے کہ وہ اسکی دم کو پاؤں تلے روندجائے اور پھر وہ چیختا ہوا اپنا آپ گھسیٹتا ہوا ایک طرف سرک جائے۔

ہاں تو مریض نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے دکھ کا باعث میری بیوی ہے" اس کی آواز یکدم کسی اندرونی ٹھیس سے بدل گئی۔ اس نے ایک گرم آہ بھری۔

"ہاں ہماری شادی کو چھ برس ہو چکے ہیں اور مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے بلکہ عشق۔ مگر اس نے کبھی حقیقی معنوں میں میری پرواہ نہیں کی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھ میں وہ چمک نہیں رہتی۔ بلکہ ایک غبار سا آجاتا ہے۔ اور اس کے ہونٹوں میں ایک ایسی شکن پڑ جاتی ہے کہ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے وہ مجھے تمسخر سے بنا رہی ہو۔ ۔۔۔۔۔ چھ سال پہلے" اس نے ایک آہ بھر کر کہا "اسے واقعی مجھ سے محبت تھی۔ یا خدا جانے وہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ خیر، شاید ایسا ہی ہو۔ مگر میرا خیال تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ مگر شادی کے بعد اسکی نگاہوں میں وہ بات نہ رہی۔

مثلاً میرے دوستوں کی موجودگی میں جب بھی وہ کسی سے بات کرے تو اسکی نگاہوں میں ایک لہر سی ہوتی ہے۔ اور کچھ ایسا خمار سا تڑپ سی یا روشنی سی یا خدا جانے کیا ہوتا ہے" اس نے ایک جھرجھری لیکر کہا "اس کی ہر حرکت اور چال ڈھال میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے جس سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے دوستوں کو مسحور کر رہی ہو۔ یا ابھار رہی ہو۔۔۔ مائل کر رہی ہو یعنی جیسے وہ آنکھ سے کوئی وعدہ کر رہی ہو۔۔۔ مگر۔۔۔ جب وہ میری طرف دیکھے تو اس کی نگاہوں میں وہ چمک بجھ جاتی ہے۔ اور وہ یوں پھیکی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے وہ دنیا بھر کی چیزوں سے اکتا چکی ہو۔۔۔۔

مثلاً میرے دوست" خدا جانے اس نے کیا نام بتایا تھا ڈاکٹر حامد نے اپنی انگلی سے میز بجاتے اور سوچتے ہوئے کہا۔ شاید جمیل تھا یا جمشید۔۔۔ کچھ ایسا ہی نام تھا۔ خیر تو جمشید ہی سہی۔ ہاں تو وہ کہنے لگا۔

"جمشید کے ساتھ تو اس کا برتاؤ بالکل رازدارانہ تھا میرا مطلب ہے، جیسے ان کے درمیان کوئی راز ہو۔ جمشید میرا پرانا دوست ہے۔ وہ ریلوے میں اے۔ ٹی۔ او تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نہایت خوبصورت جوان تھا اور بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اب تو خیر عرصہ سے ہمارے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں" اس نے ایک موہوم سی آہ بھر کر کہا "اور اس کا باعث میری بیوی تھی۔۔۔ خیر۔۔۔ خیر۔۔۔" اس نے کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ہاں جس روز جمشید کو آنا ہوتا میری بیوی خاص طور پر چن کر لباس پہنتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اسکی عموماً اکتائی ہوئی آواز میں لوچ پیدا ہو جاتی اور باتوں ہی باتوں میں وہ ایسے لفظوں پر زور دے جاتی یا ہاتھ، ہونٹ اور سر کی ہلکی سی جنبش سے اس سے ایسی باتیں کہہ جاتی جن سے جمشید کی آنکھ میں سرخ ڈورے دوڑ جاتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ پی کے آیا ہو۔ مگر میرے لئے اس کی وہ ایک ایک حرکت برچھی بنکر کلیجے سے نکل جاتی حتیٰ کہ میں رقابت کی جلن سے بے حال ہو کر ادھر ادھر ہو جاتا۔"

"اور پھر دکان میں بیٹھے بٹھائے ان کی وہی ایک ایک حرکت میری آنکھوں تلے پھرتی حتیٰ کہ ان حرکات کا مطلب مل جل کر میرے سامنے پیش کر دیتا۔ ایک نازیبا اور ذبح کرنے والی تصویر۔ اور

میں سوچتا۔ ہاں اُس نے دو مرتبہ ہاتھ دکھایا تھا یعنی دس بجے۔ ملاقات کا وقت۔ یعنی وہ اس وقت مل رہے ہیں۔ ۔ ۔ اکٹھے بیٹھے ہیں۔ ۔ ۔ خدا جانے کیا کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ پھر میرے سامنے اُن کی ملاقات کی تصویر آ کھڑی ہوتی اور میں درد سے بیقرار ہو جاتا۔ ۔ ۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجئے اس سے بڑھکر اور کوئی جلن نہیں ہو سکتی۔ ۔ ۔ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر پڑا تڑپ رہا ہوں۔ ۔ ۔ اور پھر وہ تصویر میرا پیچھا کرتی۔ ۔ ۔ میرے دل کے کونے سے آوازیں آتیں "چلو چل کر دیکھ لو۔ چلو چل کر دیکھ لو"۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ میں دیوانہ وار دکان سے اٹھ بھاگتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہ بہت چالاک ہے اس لئے مجھے کبھی موقع نہ ملا کہ میں اُس کو جھٹلا نہ سکا۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ وہ حقیقت تھی۔ ۔ ۔ میرا وہم نہ تھا۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ ۔ وہ کیسے وہم ہو سکتا ہے" اُسنے شاید اپنے آپکو یقین دلانے کیلئے دُہرایا۔

"اُسکی چالاکی کی یہ انتہا ہے کہ جب کبھی میں اپنے شکوک اُس پر ظاہر کروں تو وہ اُلٹا بگڑتی ہے اور ایسے مظلوم انداز سے اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنی محبت اور ناقدری کا قصہ کہتی ہے کہ اکثر میں اسکو مظلوم اور اپنے آپ کو مجرم سمجھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ۔ ۔ کئی دفعہ میں نے اُسکی بات پر اعتبار کر کے اُسے موقع دیا ہے۔ مگر اُس کے انداز میں فرق نہیں آیا۔ ۔ ۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجئے میری طبیعت میں کبھی کینے شکوک پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اور میں نے کبھی اپنی بیوی کو پردے یا چکوں کی قید میں نہیں ڈالا۔ اس کے برعکس میں نے اُسے ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے۔ مگر وہ میری طبیعت کا ناجائز فائدہ حاصل کرنے سے ذرا نہیں شرماتی۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے حقیقت معلوم ہو جائے، اور مجھے دھوکے میں نہ رکھا جائے۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ ۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں اُسے کسقدر چاہتا ہوں ورنہ میں ایک دن کیلئے بھی اُسے پاس نہ رکھتا۔ وہ بہت پیاری ہے ڈاکٹر صاحب بہت پیاری، مگر آہ کاش کہ وہ پیار کرنے کے لئے یوں غیروں کو نہ چُنتی۔ جمشید کے بعد نوشیرواں اور اب" اُس نے ایک تمسخر بھری ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "اب اُس کی آنکھیں میرے دوست مسٹر منیر سے کھیلتی ہیں۔ مگر میں ضرور کھوج لگانے میں کامیاب ہونگا۔ میں اُسے عین موقع پر ثابت کر دونگا کہ میں کمینہ نہیں ہوں اور خواہ مخواہ الزام نہیں تھوپتا۔ وہ لاکھ چالاک سہی۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہ بہت چالاک ہے، وہ بہت چالاک ہے" اُس نے بے بسی سے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ ایک تڑپ سے کُرسی سے اُٹھ بیٹھا "ہاں ڈاکٹر صاحب مجھے جانا ہے۔ آج ہم نے مسٹر منیر کو چائے پر بلایا تھا۔ مجھے نو بجے وہاں پہونچ جانا چاہئیے تھا۔ اب پونے دس ہو چکے ہیں" اُس نے گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھئے نا میں بھی کسقدر بھُولا کرتا ہوں" اُسنے اپنے آپ سے کہا۔

حامد نے ایک نیا سگار لگایا اور دیا سلائی بجھا کر چاروں طرف دیکھا، تینوں دوست خاموش بیٹھے تھے۔ ہاں طارق کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"اچھا تو ڈاکٹر کیا تم نے اُس کی بیوی سے ملاقات کی" حمید نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ اور اپنے ہونٹوں کو یوں بھینچ لیا۔ جیسے بچے انگریزی مٹھائی چوستے ہیں۔

"ہاں" ڈاکٹر نے کہا: "میرا یہ انوکھا مریض اس بات پر مصر تھا کہ میں اُس کی بیوی سے ملوں اور تحلیل نفسی کے ذریعے یہ معلوم کروں کہ آیا واقعی وہ ایسی ہی پُر اسرار اور بیوفا بیوی تھی جیسا کہ اُس کا خیال تھا یا نہیں۔ پہلے تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر آخر مجھے اُس کی بات ماننی ہی پڑی اور حقیقت یہ ہے کہ چونکہ اُن دنوں میرے پاس مریضوں کی بہت قلت تھی۔ چونکہ میں نے ابھی پریکٹس شروع ہی کی تھی اور لوگ بھی تحلیل نفسی کے طریقہ علاج سے واقف نہ تھے بلکہ اس کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں اور بغض اُن کے دلوں میں بھرے ہوئے تھے۔ خیر" ڈاکٹر نے سگار کا ایک کش لگایا۔

القصہ اُس نے کسی بہانے اپنی بیوی کو میرے مطب میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور پھر جانے سے پہلے نہایت منت اور عاجزی سے کہنے لگا:۔

"ڈاکٹر صاحب اپنی بیوی کو یہاں بھیجنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اُس کا بیان میں اپنے کانوں سے سُنوں۔ آپ کا اس میں کچھ نہیں بگڑیگا مگر مجھے حقیقت سے آگاہی ہو جائیگی۔ میرے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں صرف جاننا چاہتا ہوں۔ صرف جاننا۔ یقین جانیئے میں کوئی جھگڑا پیدا نہیں کرونگا۔ میں خاموشی سے اُس پردے کے پیچھے بیٹھا رہونگا" اُس نے پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر غالباً میری ہچکچاہٹ دیکھکر وہ چلایا: "میری بات سُن لیجئے، خدارا میری بات سُن لیجئے۔ میں جانتا ہوں۔ ہاں۔ ۔ ۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ یوں چھُپنے کی اجازت دینا آپکے اصول کے

لات ہیں مگر خدا کیلئے مجھ پر رحم کیجئے۔" اُس کا چہرہ خوف سے یا خدا جانے سی نامعلوم لذت یا ڈر سے بھیانک ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ جسے اپنے استرے کو ہاتھ لگانے سے منع کیا ہو۔ موقع پاکر چوری چوری اپ کی صندوقچی سے استرا نکال خوف حیرانی اور ایک اضطراب بھری لذت سے اسکی دھار محسوس کرتا ہے۔

اگلے روز شام کے چار بجے میرا مریض آیا۔ اس کے چہرے پر ایک پُرکیف خمار سا چھایا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھیں یوں سُرخ ہو رہی تھیں اور چست نظر آتی تھیں جیسے وہ اپنی تخیلی دُنیا سے بکھر کر پہلی مرتبہ اس حقیقی دُنیا سے آشنا ہونے کیلئے مشتاق ہوں۔

"ڈاکٹر صاحب وہ ابھی آ رہی ہے۔" اُس نے آتے ہی اضطراب سے کہا۔ "اس کا کوئی بچہ نہیں۔ اور اُسے ایک بچے کی بہت آرزو ہے۔ میں نے اُسے آپ کا کارڈ دے کر کہا تھا کہ آپ تحلیل نفسی کے ذریعے عورتوں کا علاج کرنے کے ماہر ہیں۔ وہ ضرور آئے گی۔ وہ آ رہی ہوگی۔ خُدا کیلئے آپ اُسے اس موضوع پر ضرور پوچھئے۔ وہ ضرور سچ سچ کہدیگی۔ اُس کی آنکھ میں عجیب سی چمک تھی۔

میں نے پردے کے پیچھے اُس کیلئے ایک آرام کرسی رکھوا دی اور خود اس کی بیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ اور سچ پوچھئے تو میں خود اس پُراسرار عورت کو دیکھنے کیلئے بیقرار سا ہو رہا تھا۔ گو بظاہر میں اپنے آپ سے یہ شوقِ ملاقات چھپا رہا تھا۔" ڈاکٹر نے سگار کا ایک کش لیکر کہا۔

ساڑھے چار بجے وہ آئی۔ اور میں اُسے دیکھکر بھونچکا سا رہ گیا۔ کیونکہ وہ ایک نہایت حسین اور وجیہہ عورت تھی۔ ڈاکٹر چند ساعت کیلئے خاموش ہوگیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سگار کے دھوئیں میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ حمید نے اپنی نکٹائی کی گرہ درست کی ہونٹوں کو چبایا اور پھر بُت سا بنکر بیٹھ گیا۔ طارق کے چہرے سے وہ مسکراہٹ گم ہو چکی تھی اور وہ غور سے سُننے کیلئے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا تیسرا دوست نسیم جو کسی کالج میں پروفیسر تھا، اپنے بدن کو یوں بھینچ رہا تھا جیسے وہ کسی ضدی انگڑائی سے لڑ رہا ہو۔

اُس کی آنکھیں بہت جاذب نظر تھیں۔ ڈاکٹر نے اسی کھوئے ہوئے انداز سے بیان کرنا شروع کیا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پانی میں تیر رہی ہوں۔ اور اس کی نگاہیں یوں بھیگی بھیگی سی تھیں جیسے وہ ابھی رو کر آئی ہو۔ ہلکی ہلکی سی سُرخی تھی جس میں غم کی جھلک تھی۔ جیسے وہ آنکھیں پی جانے کی عادی ہوں۔

اور اُس کے ہلکے سُرخ سے پتلے پتلے ہونٹ جن کے درمیان ایک ایسا خلا سا تھا جیسے کوئی کلی جو ابھی کھلنے لگی ہو۔ انہیں دیکھکر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہو یا کہنا چاہتی ہو۔ اس کے علاوہ اُس کے ناک اور گالوں پر ایک ایسی سُرخی سے تھی جیسے وہ مسلسل جھینپ رہی یا شرما رہی ہو۔ اور اُسکی ہر حرکت رسیلی تھی۔

وہ بیٹھ گئی۔

"فرمائیے۔" میں نے اپنے ضمیر پر بوجھ سا محسوس کرتے ہوئے اور پردے کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خاوند نے مجھے آپ کا پتہ دیا تھا۔" اس نے شرم سے لال گلال ہوکر کہا اور آنکھیں جھکالیں۔ "چھ سال شادی کو ہوئے ہیں مگر ہمارا کوئی بچہ نہیں۔"

ڈاکٹر نے سگار کی راکھ جھاڑکر ایک گہرا سانس لیا۔

"ہاں تو کوئی بیس منٹ میں اس سے اِدھر اُدھر کی بے معنی باتیں کرتا رہا۔ ایسے سوال کرتا رہا جو عام ڈاکٹر کیا کرتے ہیں۔ آخر میں جرأت کرکے اُسے مطلوبہ موضوع پر لے آیا۔

"ہاں بیگم اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے اور آپ کے خاوند کے تعلقات کیسے ہیں؟" میں نے ہمت کرکے پوچھا۔

جواب میں کچھ دیر کیلئے اُس کی آنکھوں کو کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ ڈوب رہی ہوں۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے ان آنکھوں میں بلا کی گہرائیاں تھیں۔ اور اُس نے ایک موہوم سی آہ بھری۔

"ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔" اُسنے میز کو حسرت بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ گھبرائیے نہیں بیگم۔" میں نے اُسے یقین دلانے کی غرض سے کہا۔ "آپ جب تک پوری آزادی سے دل کی بات نہیں کہیں گی جب تک ہم ملکر اس بات کا کھوج نہیں لگا سکیں گے۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ آپ کی آرزو پوری نہ ہوسکے گی۔ آپ بالکل بے فکر رہیئے۔" میں نے پردے کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے کہا۔ آپ کا راز ہمیشہ راز رہے گا۔ آپ بالکل نہ گھبرائیے۔"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔ البتہ اُن کا مزاج شکی ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح شک کی صورت پیدا کرلیتے ہیں۔" اُسنے

اپنی انگلیوں سے پیپر ویٹ گھماتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اپنے خیالی شک کی وجہ سے ہی دیوانوں کی طرح پریشان رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں بہت دُکھی سی رہتی ہوں۔

اور میری حیرانی کی بات یہ ہے کہ اوّل تو وہ مجھے اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر میں اُن سے خندہ پیشانی نہ ملوں تو اُلٹا مجھ سے بگڑتے ہیں اور اگر ملوں تو بعد میں میری چھوٹی چھوٹی حرکتوں اور باتوں کو موڑ توڑ کر کیا سے کیا سمجھ لیتے ہیں اور مجھ پر الزام دیتے ہیں۔

مثلاً کل کی ہی بات ہے کہ انہوں نے میرے پُرزور انکار کے باوجود اپنے ایک دوست مسٹر منیر کو چائے پر بُلایا اور خود نو بجے کے بجائے دس بجے آئے۔ اسی طرح وہ مجھے اکثر پریشان کرتے ہیں۔ یا جب کبھی اُن کا کوئی دوست آجائے تو عین اسی وقت انہیں کوئی بھولا بسرا کام یاد آجاتا ہے اور وہ ہمیں چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔" اور پھر اُس نے شرم سے یا خدا جانے غصّہ سے لال ہوکر کہا۔۔۔ "پھر وہ پردوں کے پیچھے چھپ چھپ کر ہمیں دیکھتے ہیں۔"

"جب میں نے یہ سُنا" حامد نے ایک جھرجھری لیکر کہا تو میری نگاہ بے اختیار پردے کی طرف اُٹھ گئی۔ اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے پہلی مرتبہ میں نے زندگی کے بھید کو عیاں دیکھا ہو جیسے خوشی اور غم کا راز میں نے پالیا ہو۔ جیسے زندگی تو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔۔۔۔ اور خدا جانے کتنی دیر میں یوں بھوچکا سا بیٹھا رہا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ بیگم میری طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

مجھے مخاطب دیکھ کر اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ "اُف تو کوئی بات نہیں۔" اُس نے گھبراتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں کیا تھا اور کہاں کا اور وہ بیگم کون تھی۔

"ہاں معاف کرنا" میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ "میں سب بات سمجھ گیا ہوں میں آپ کو اپنی تشخیص کل لکھ کر بھیج دوں گا۔"

"ایک منٹ کی اجازت دیجئے" کہکر میں اُٹھ بیٹھا اور کسی بہانے پردے کے پیچھے چلا گیا۔ اور صاحبان میں نے کیا دیکھا۔۔۔ ڈاکٹر خاموش ہوگیا۔

آرام کرسی میں پڑا میرا مریض گہری نیند سو رہا تھا اُسکے کوٹ کے بٹن کھلے تھے اور قمیص کا گلا ڈھیلا تھا۔ اور انتہائی خوشی یا کرب کے بعد جو تھکن سی ہوجاتی ہے وہ اُس کے چہرے پر عیاں تھی۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے جیسے کوئی بچہ جو کسی کھلونے کیلئے رو رو کر اپنا آپ بے حال کرلے۔ اور پھر جب اُسے کھلونا نہ ملے تو وہ سسکیاں بھرتا ہوا اطمینان سے سو جاتا ہے۔ مگر نیند میں بھی اُس کے ہونٹوں پر ایک سسکی قائم رہتی ہے۔ کرب بھری یا انتہائے خوشی بھری سسکی۔ اور اُس کے ہاتھ میں جو کرسی سے نیچے لٹک رہا تھا وہی پتھر کا کتا تھا۔ جو شاید اُس نے وہاں انگیٹھی سے اُٹھالیا ہوگا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب" حمید نے خاموشی کو توڑتے ہوئے اور کالر ڈھیلا کرتے ہوئے بے اختیارانہ پوچھا۔ "تو کیا وہ بیگم پھر کبھی آپکے مطب میں نہ آئی۔"

مگر ڈاکٹر خاموش تھا جیسے وہ لیمپ کے شُعلے میں کسی اور دُنیا کو دیکھ رہا ہو اور اُس کے ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ زندگی کا بھید۔

"ممتاز مُفتی"

ایک وادی سے گذرتے ہوئے

یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں
یہاں کی خاک بھی اے دوست رنگیں سبزہ زاروں میں
یہاں چاندی کھنکتی تھی پگھلتے آبشاروں میں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ خود رو پھول، وہ رنگیں زمیں کے خوشنما تارے
وہ سبزے کی مہکتی موج پر خوشبو کے گہوارے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

روپہلی تتلیاں مصروف تھیں رنگین کھیلوں میں
نظر سے کوئی وحشی جھومتا رہتا تھا بیلوں میں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

افق کے نیل میں وہ سرخ اودی ابر کے ٹکڑے
رنگے تھے دیویوں نے ہر کنول کی مانند میں کپڑے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ہوا گنجان جھاڑی میں انوکھے گیت گاتی تھی
یہاں شاداب کنجوں میں محبت مسکراتی تھی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ترانے پھوٹتی کرنوں پہ جھرنے گنگناتے تھے
کہ جیسے یہ چرواہے پہاڑی گیت گاتے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ جھرنے کے کنارے اک طرف اتری ہوئی قازیں
بطوں کا شور، سارس کی صدا، موروں کی آوازیں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

جھلکتے تال میں تیرے ہوئے چاندی کے پتھر سے
وہ کاہی پر مچلتی اوس کے رنگین گوہر سے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ پانی کے کنارے دوب کے ریشوں کا ہلکا نم
کسی نے دور تک قینچی سے کترا تھا ہرا ریشم
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ہواؤں میں ٹھہرے تال پر ہنسی بجاتے تھے
ہرے پودے اشارے سے کنارے پر بلاتے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

یہاں بڑھ بڑھ کے گھٹتی تھی دھڑکتے دل کی بیتابی
یہاں پیاسی نظر کو سیر کر دیتی تھی شادابی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

بہت سے جانے والے اس گھنے جنگل میں کھو جاتے
تھکے ماندے مسافر آ کے اس وادی میں سو جاتے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

یہیں ہم نے محبت کے حسیں جادو جگائے تھے
انہیں شادابیوں میں دل کے غنچے مسکرائے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ہم اکثر گھاس پر سائے میں لیٹے گیت گاتے تھے
کبھی کچھ گنگناتے تھے، کبھی کچھ گنگناتے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

شرارت سے کبھی "وہ" جھاڑیوں میں جا کے چھپ جاتی
کہیں کوئل کی لے گاتی، کہیں شاما کی دھن گاتی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

کبھی ہم گھومتے پھرتے تھے اونچے سبز ٹیلوں پر
زمرد سا بہا کرتا تھا میدانوں میں جھیلوں پر
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

کبھی ہم تال کے پانی میں کنکر پھینکتے رہتے
چمکتے آئینہ میں دائرے پر دائرے بہتے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ قصہ اس کے منہ سے ہنس کی سچی محبت کا
وہ لہروں میں مسرت سی وہ موجوں میں تبسم سا
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

محبت ہلکی ہلکی آنچ دونوں کو پلاتی تھی
کوئی دیوی شفق میں منہ چھپاتے مسکراتی تھی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

نہ اب نغمے ہیں ڈالوں پر نہ اب خوشبو ہے خاروں میں
بس اک دکھتے ہوئے دل کی صدا ہے آبشاروں میں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

جاں نثار اختر (علیگ)

بربادِ تمنّا

شکار کے موسم کا آغاز تھا۔ اس کی خوشی میں مارکوئس دو برتراں کے ہاں پُر تکلّف دعوت تھی۔ گیارہ شکاری آٹھ لیڈیاں اور مقامی افسر شرکت کر رہے تھے۔ کھانے کا کمرہ دُلہن بنا ہوا تھا۔ میز پر انواع و اقسام کے کھانے اور پھل چُنے ہوئے تھے اور اس کے گرد خوش فعل لوگ بیٹھے خوش گپیاں کرتے ہوئے مصروفِ طعام تھے۔ کھانا قریب الاختتام تھا کہ گفتگو کا موضوع محبت سے بدل گیا اور اس ابدی مسئلہ پر زور شور سے بحث ہونے لگی کہ آیا کوئی شخص زندگی میں سچی محبت صرف ایک ہی دفعہ کر سکتا ہے یا بار بار۔ ایسے لوگوں کی مثالیں پیش کی گئیں جنہوں نے زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ محبت کی ہے اور ایسے لوگوں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں جو بار بار عاشق ہوئے اور ہر بار سچے جوش اور حقیقی خروش کا ثبوت دیا۔ بہرحال مرد ثابت کرنا چاہتے تھے کہ عشق ایک مرض کی طرح ایک ہی شخص کو بار بار اپنا شکار بنا سکتا ہے اور اس کے راستہ میں روڑہ اٹکانے پر خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔

اس کا جواب عورتوں کے پاس کچھ نہ تھا۔ ان کے نظریہ کی بنا تخیل پر تھی تجربہ پر نہیں۔ ان کو اصرار تھا کہ محبت، حقیقی اور بہشتی محبت صرف ایک ہی دفعہ ابن آدم کے قلبوں کو مسخر کرتی ہے۔ یہ ایک بجلی کی طرح انسان کے خرمنِ دل پر گرتی ہے اور اُس کی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی گرفت میں آکر انسان دوبارہ محبت تو درکنار اس کا خیال تک کرنے سے معذور رہتا ہے۔ مارکوئس دو برتراں میدانِ محبت کا جانباز شہسوار تھا۔ اس نے اس کی پُر زور تردید کی۔

"یقین کیجئے ایک شخص دل و جان سے متعدد بار محبت کر سکتا ہے۔ آپ اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے کہ انسان زندگی میں ایک ہی مرتبہ محبت، حقیقی محبت سے آشنا ہوتا ہے ایسے لوگوں کی مثالیں پیش کر رہی ہیں جنہوں نے کوچۂ عشق میں اپنے کو فنا کر دیا۔ قربانگاہِ عشق پر اپنے کو بھینٹ چڑھایا۔ مگر میں کہتا ہوں یہ اُن کی حماقت تھی۔ وہ بُزدل تھے اور موت ہی کے قابل تھے۔ مرکر اُنہوں نے اپنے کو عشق کے مکرّر حملے سے بچا لیا۔ اگر وہ اس سفاہت سے اپنی زندگی کا خاتمہ نہ کرتے تو زمانہ کی رفتار کے ساتھ وہ پھر محبت کرنے کے قابل ہو جاتے، محبت کرتے اور محبت ہی میں مر مٹتے۔ عاشق شرابی کی طرح ہے، ایک دفعہ جس نے پی ہے وہ دوبارہ ضرور پیئے گا۔ ایک دفعہ جس نے محبت کی ہے وہ دوبارہ ضرور کرے گا۔ محبت ایک طبعی مسئلہ ہے۔"

آخر کار سب نے اس کا فیصلہ ڈاکٹر پر چھوڑا۔ ڈاکٹر پیرس میں پریکٹس کرتا تھا مگر اب وہاں کی پریکٹس چھوڑ کر دیہات میں مقیم ہو گیا تھا۔ سب نے التماس کی کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے مگر وہ کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر تھا۔

"جیسا کہ مارکوئس نے فرمایا ہے یہ ایک طبعی مسئلہ ہے۔ میں ایک محبت کرنے والی ہستی کو جانتا ہوں جو پچپن سال تک بغیر کسی تغیر کے محبت کرتی رہی اور جس کا انجام موت پر ہوا۔"

لیڈی برتراں خوشی سے اُچھل پڑیں۔

"آہا کس قدر دلکش، کس درجہ کیف انگیز خواب ہے ایسی محبت کی زندگی۔ پچپن سال کسی کی سچی، پُر خلوص، جنوں انگیز محبت کا مرکز بنے رہنا۔ کیسی بہشتی اس کی زندگی تھی اور کتنا خوش نصیب تھا وہ شخص۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"محترمہ آپ کا خیال ایک حد تک دُرست ہے۔ اس لاثانی محبت کا مالک ایک مرد ہی تھا اور آپ اس کو اچھی طرح جانتی ہیں وہ "شاکی" ہمارے یہاں کا دواساز ہے۔ اور اس محبت کی ماری عورت سے بھی آپ واقف ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا ہر سال ایک بڑھیا آپ کے یہاں آیا کرتی تھی۔ وہ ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مرمت کیا کرتی تھی۔ خیر مفصل قصہ سُن لیجئے۔"

یکایک عورتوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُن کے خوبصورت بیضاوی چہروں پر نفرت اور حقارت کے آثار نمایاں ہوئے۔ بھلا محبت کو سوسائٹی کی ایسی ذلیل ہستیوں سے کیا سروکار۔

"تین مہینے پہلے کا ذکر ہے۔" ڈاکٹر کہنے لگا۔ "وہ بُڑھیا دَم

تڑپ رہی تھی۔ اور میں پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پہلے ہی روز وہ اس گاؤں میں آئی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں آئی تھی۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے یہی گاڑی اس کے گھر تھی۔ اور ایک بڈھا گھوڑا اسکو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا اس کے ساتھ دو بڑے بڑے سیاہ کتے تھے جو اس کے دوست اور محافظ تھے۔ میں جب پہونچا تو پادری آچکا تھا اور مرنے والی کو روحانی تسلی دے رہا تھا۔ میں اس لئے بلایا گیا تھا کہ مرحومہ کا وصی بنایا جاؤں۔ اپنی وصیت کو اچھی طرح میرے ذہن نشین کرانے کی خاطر غریب نے اپنی داستان زندگی سنائی۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اتنی دردناک اور حیرت انگیز کہانی مجھے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ سننے کا اتفاق ہوا۔

"اس کے ماں باپ ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مرمت کیا کرتے تھے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھی جگہ پر سونا اُسے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ چیتھڑے میں وہ چاروں طرف ماری ماری پھرتی تھی، نہایت ہی غلیظ اور بوسیدہ حالت میں رہتی تھی۔ اس کا خاندان گاؤں کے باہر آکر ڈیرا ڈالتا تھا۔ گاڑی سے گھوڑا کھول لیا جاتا تھا اور چرنے کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کتا سکڑ کر بیٹھ جاتا تھا اور پنجوں پر سر کو رکھکر سونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بچی گھاس پر کھیلتی تھی اور درختوں کے سایہ میں بیٹھکر اس کے والدین گاؤں کی پرانی ٹوٹی ہوئی کرسیاں درست کرنے میں لگ جاتے تھے۔ اس پہیوں والے مکان میں فضول باتوں کی گنجائش نہ تھی۔ مختصر طور پر بحث کر کے وہ فیصلہ کر لیتے تھے کہ اس روز ان میں سے کون گاؤں میں گھر گھر 'کرسیاں بنوالو' کا نعرہ لگاتا پھرے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اگر وہ بچی کھیلتے کھیلتے دور نکل جاتی یا گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنا چاہتی تو اُس کے باپ کی غصیلی آواز اس سے باز پرس کرتی ،۔

"جلد یہاں آ چڑیل"

اور یہی وہ پیار کے الفاظ تھے جسے اُس نے اپنی زندگی میں سنے۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اُسے بھی گاؤں میں مرمت طلب کرسیاں لانے کیلئے بھیجا جانے لگا۔ اب وہ آزاد تھی کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ دوستی پیدا کرے۔ لیکن شومئ قسمت سے دوسرے لڑکوں کے والدین اس کے روادار نہ تھے۔ وہ نہایت ہی بیدردی سے اپنے لڑکوں کو دھمکا کر بلا لیتے ؛

"آتا نہیں بدمعاش، خبردار جو کبھی پھر آوارہ گردوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا"

چھوٹے لڑکے کبھی کبھی اسکو پتھر مارتے تھے۔ عورتیں کبھی کبھی اُسے ایک آدھ پیسہ دے دیا کرتی تھیں جسے وہ نہایت احتیاط سے جمع کرتی تھی۔

جب وہ گیارہ سال کی تھی اُس کے خاندان نے اُس گاؤں کے کنارے پر ڈیرا ڈالا۔ ایک روز قبرستان کے پیچھے اُسنے "شاکی" کو روتے پایا۔ وہ اس لئے رو رہا تھا کہ اس کے کسی ساتھی نے اُس کے دو پیسے چھین لئے تھے۔ اس چھوٹے شہری کے آنسوؤں نے اس ننھی خانہ بدوش کو بیقرار کر دیا۔ اس کا معصوم، ننھا دل یہی جانتا تھا کہ شہر کے بچے ہر وقت خوشی اور شادمانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اس کے پاس گئی اور اس کی مصیبت کا راز معلوم کر کے اپنا اندوختہ سب اس کے حوالہ کر دیا۔ یہ کل سات "دسُو" تھے۔ "شاکی" نے اُسے بغیر چون و چرا کے لے لیا اور آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ خوشی سے بیتاب ہو گئی۔ یہانتک کہ اُس نے "شاکی" کا منہ چوم لیا۔ یہ دیکھکر کہ اُس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور نہ ناراض ہوا اُس نے اُسکے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور اُسکو دیوانہ وار پیار کرنے لگی۔ پھر یکایک چھوڑ کر بھاگ گئی۔

کیا خیال اس غریب کے دماغ میں آگیا تھا؟ وہ کونسی کشش تھی جس نے اُسے لڑکے کی طرف کھینچا! کیا یہ اس لئے تھا کہ اُسنے اپنی ننھی سی عمر کی کمائی اس کے حوالہ کر دی تھی یا اس لئے کہ یہ اسکی محبت کا پہلا بوسہ تھا؟ یہ ایک معمہ ہے سب کیلئے، بچوں کیلئے بھی اور جوانوں کیلئے بھی۔

دوبارہ جب وہ آئی تو اس کے پاس دو فرانک تھے۔ مگر وہ "شاکی" کی صرف ایک جھلک دیکھنے پائی۔ وہ اپنے باپ کی دوا کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا اور بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ دوکان پر طرح طرح کی چھوٹی بڑی رنگین شیشیاں اور بوتلیں قرینے سے چنی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اس لئے وہ اُسے اور زیادہ چاہنے لگی۔ اس کی یاد اس کے دل سے کبھی محو نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے سال وہ اس کے سکول میں "شاکی" سے ملی۔ وہ لٹو کھیل رہا تھا۔ وہ اس پر جھپٹی، اسے سینہ سے چمٹا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ شاکی ہیبت سے چیخنے لگا۔ اس کو تسلی دینے کیلئے اُس نے اُسے اپنی پوری دولت دیدی جو تین فرانک

چار سَو تھے۔ شاکی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے اِس ہدیۂ اُلفت کو قبول کیا اور اس کے عوض میں اجازت دیدی کہ وہ جی بھر کے اُسے پیار کر لے۔

اس واقعہ کے بعد چار برس تک وہ برابر اپنا سرمایہ شاکی کی نذر کر جاتی تھی اور وہ بھی نہایت دریا دلی کے ساتھ اُسکو پیار کرنے دیتا تھا۔ مزہ کا لین دین تھا۔ کبھی بازار مندہ ہونے کی وجہ سے دس بارہ سَو ہوتے تھے تو وہ شرم سے رونے لگتی تھی اور کبھی چار پانچ فرانک ہوتے تھے تو وہ خوشی سے قہقہہ لگانے لگتا تھا۔

وہ اس کا تخیل بنا ہوا تھا۔ وہ خود بھی اب اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کیا کرتا تھا اور اسکو دیکھتے ہی دوڑا دوڑا آتا تھا جس سے وہ عجیب مسرت سی محسوس کرتی تھی، اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگتا تھا۔

اس کے بعد اچانک وہ ایک روز غائب ہوگیا۔ غریب لڑکی کی دُنیا گویا تاریک ہوگئی۔ بڑی جانفشانی سے اُس نے پتہ لگایا کہ وہ اسکول بھیجدیا گیا ہے۔ بڑی کدو کاوش کے بعد اُسنے اپنے والدین کو راضی کیا کہ وہ ہر تعطیل میں یہاں پر آیا کریں۔ اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا اور وہ اُس کے دیدار سے محروم رہی۔ دَو برس بعد اُس نے پھر اُسے دیکھا۔ وہ بمشکل اُسے پہچان سکی۔ نام خُدا اب وہ جوان تھا اور سونے کے بٹنوں والی جاکٹ میں نہایت شاندار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس غریب کے سامنے سے تنکر گذر گیا گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی۔ دَو روز تک وہ روتی رہی۔ اور یہ آغاز تھا اسکی نہ ختم ہونے والی مصیبت کا۔

ہر سال وہ لوٹ آتی تھی۔ وہ راستہ میں اُس کے سامنے سے گذر جاتی تھی مگر اُسے ہمت نہ پڑتی تھی کہ اُس سے ہمکلام ہو۔ اسکی محبت دیوانگی کی حد تک پہونچ چکی تھی۔

"ڈاکٹر!" اُس نے مجھ سے کہا تھا "دُنیا میں وہی ایک آدمی ہے جس کی طرف میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا ہے۔ مجھے اتنی خبر بھی مشکل سے ہے کہ اسکے علاوہ بھی دُنیا میں مرد ہیں۔"

اس کے والدین کے مرنے کے بعد بھی اُس نے اُنکے پیشہ کو جاری رکھا۔ اب اُس نے بجائے ایک کے دَو کتے پال رکھے تھے۔ یہ بڑے خونخوار تھے اور کسی کو پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ ایک روز جبکہ وہ اس چھوٹے سے قصبہ میں جہاں اس کا دل پھنسا ہوا تھا آئی اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت "شاکی" کا ہاتھ پکڑے دواساز کی دوکان سے نکلی۔ وہ اُس کی بیوی تھی "شاکی" کی شادی ہو چکی تھی۔

اس شام کو ٹاؤن ہال کے تالاب میں وہ کود پڑی۔ ایک مسافر اتفاق آنکلا۔ اُسے تالاب سے نکالا اور دواساز کی دُکان پر لے گیا۔ شاکی شب خوابی کے لباس میں نیچے اتر آیا۔ اُس نے تجاہل عارفانہ کے ساتھ اس کا علاج کرتے ہوئے نہایت ہی کرخت لہجے میں کہا۔

"کیا سٹرن ہوگئی ہو۔ یہ کیا واہیات ہے؟"

اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ خیر اُس نے بات تو کی۔ اس تصور ہی نے اُسے بہت دنوں تک خوش رکھا۔ اُس نے بہت کچھ کہا سنا مگر "شاکی" نے معاوضہ لینے سے قطعی انکار کر دیا۔

غرض اسی طرح اس کی زندگی گذرتی گئی۔ اُس کے ہاتھ کرسیاں دُرست کرتے تھے اور اس کا دل تصور جانانہ میں کھو جاتا تھا۔ اس کی دوکان کی کھڑکیوں سے وہ ہر سال اسکو دیکھتی تھی۔ اس نے اس سے معمولی دوائیں خریدنی شروع کیں۔ اسی طرح وہ اس کے نزدیک ہوتی تھی، اس سے بات چیت کرتی تھی اور پہلے کی طرح اُسے پیسے دیتی تھی۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں وہ اسی بہار میں مری ہے۔ اس المناک قصہ بیان کرنے کے بعد اُس نے مجھ سے التجا کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی عمر بھر کی کمائی میں اُس شخص کے حوالے کر دوں جس سے وہ کمال وفاشعاری کے ساتھ محبت کرتی رہی ہے۔ صرف اسی کیلئے وہ محنت کرتی تھی، اُس نے کہا تھا خود فاقے تک کئے مگر اپنے حبیب کے لئے روپیہ جمع کرتی رہی۔ صرف اس اُمید پر کہ مرنے کے بعد تو کم از کم ایک دفعہ وہ اس حرماں نصیب کو یاد کرے گا۔ اس کے بعد اُس نے مجھے دَو ہزار تین سو ستائیس فرانک دئے۔ ستائیس فرانک کو تو میں نے اُس کے کفن دفن کیلئے رکھ چھوڑا اور باقی رقم اس کے مرتے ہی لیکر چلا آیا۔

دوسرے روز میں "شاکی" سے ملنے گیا۔ میاں بیوی ناشتہ پر تھے۔ گول مول موٹا تازہ جوڑا تھا اور اپنی رفتارِ زندگی سے خوش۔ اُنہوں نے مجھ سے بھی ناشتہ میں شریک ہونے کی خواہش کی میں بھی شامل ہوگیا۔ ناشتہ کے بعد میں نے نہایت ہی دردناک لہجہ میں اپنی کہانی شروع کی۔ مَیں اُمید کر رہا تھا کہ وہ رو پڑینگے۔

مگر جیسے ہی اُسے معلوم ہوا کہ ایک ذلیل، ٹوٹی کرسیاں دُرست کرنے والی عورت اس سے محبّت کرتی تھی، انتہائی غیظ و غضب سے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس غریب کی محبت نے "شاکی" کی عزّت پر بٹّا لگا دیا ہے، عزّت جو اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اُس کی بیوی بھی غصّہ سے سُرخ ہوگئی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی،

"وہی فقیرنی، وہی بڑھیا قطامہ"

شاکی غصہ سے بیتاب ہو رہا تھا۔ اس کی ٹوپی سر سے گر چکی تھی۔

"ڈاکٹر، ایسی بات بھی تم نے کبھی سُنی، غضب خُدا کا مجھے اُس سے کیا سروکار۔ اگر میں اس کے جیتے جی اس حال سے آگاہ ہوتا تو ضرور اُسے جیل خانہ بھجواتا جہاں اُس کی زندگی کے دن پورے ہوتے۔ قسم خُدا کی"

میں احمق بت کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ مگر مجھکو اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"مرحومہ وصیت کر گئی ہے کہ میں اس کا جمع کردہ دو ہزار تین سو فرانک آپکے حوالے کروں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس کی کہانی نے آپ لوگوں کو بیحد رنج و صدمہ پہونچایا ہے، اس لئے میرے خیال میں اس رقم کو خیرات کر دینا ہی بہتر ہوگا۔"

حیرت سے اُن کی زبان گنگ ہوگئی۔ اور وہ بیوقوفوں کی طرح مجھے تکنے لگے۔ میں نے جیب سے روپیہ نکال کر پوچھا۔

"اب آپ کی کیا رائے ہے؟"

شاکی کی بیوی نے سکوت کو توڑا۔

"خیر، ایک مرنے والی کی وصیّت ہے۔ کیا کیا جائے۔"

اس کے شوہر نے خفّت کے ساتھ کہا۔

"ہم یہ روپیہ بچوں کی بھلائی کیلئے خرچ کرینگے"

"جیسی آپ کی مرضی" میں نے روکھے پن سے کہا۔

"بہت خوب۔ مناسب یہی ہے کہ مرحومہ کی وصیت کے مطابق آپ وہ روپیہ ہمیں دیدیں۔ کسی کارِ خیر میں خرچ کرنے کا موقعہ ہم نکال لیں گے"

مَیں نے روپیہ اُنکے حوالے کیا اور رخصت ہو کر چلا آیا۔

دوسرے روز شاکی پھر میرے پاس آیا اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا:۔ "مرحومہ کی گاڑی بھی تو ہے۔ آپ اُس کا کیا کرنا چاہتے ہیں"

"کچھ نہیں، آپ کا جی چاہے تو لے جائیے"

"خوب، اس سے مُرغیوں کیلئے دڑبہ بن جائیگا"

جب وہ جا رہا تھا میں نے اُسے آواز دی۔

"مرحومہ ایک بڈھا گھوڑا اور دو کتّے بھی چھوڑ گئی ہے"

حیرت سے وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

پناہ بخدا، وہ میرے کس کام کے آپ انہیں اپنے تصرف میں لائیں"

وہ ہنسا پھر ہم لوگوں نے ہاتھ ملایا۔ آخر دیہات میں ڈاکٹر اور دواساز کی دوستی ایک ضروری شئے ہے نا

کتّے میرے پاس ہیں، گھوڑا پادری کے پاس۔ گاڑی مُرغیوں کا دڑبہ اور روپے سے "شاکی" نے ریلوے کمپنی کا حصہ خریدا ہے۔

"سچی محبت کی یہی ایک نظیر میرے پاس ہے"

ڈاکٹر خاموش ہوگیا۔ لیڈی برتران نے ایک لمبی سانس لی۔ پھر پُرنم آنکھوں سے کہا۔

"اِس سے یہی ثابت ہوتا ہے نا کہ محبت کرنا عورت ہی جانتی ہے"

(موپاساں)

تسنیم جہانگیرنگری

آرٹ اور اخلاق

شاعری کی روشنی میں

نقش سوئے نقش گر می آورد — از ضمیر او خبر می آورد
چیں رباید از بساطِ روزگار — ہر نگار از دست او گیرد عیار
خوار او از حورِ جنت خوشتر است — منکرِ لات و مناتش کافر است
آفریند کائناتِ دیگرے — قلب را بخشد حیاتِ دیگرے
بحر و موج خویش را بر خود زند — پیشِ ما موجش گہر می افگند

زاں فراوانی کہ اندر جانِ اوست
ہر تہی را پر نمودن شانِ اوست

مندرجہ بالا عنوان پر بحث کرنے سے قبل یہ بہتر ہوگا کہ اول ہم آرٹ، اخلاق اور شاعری تینوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھ لیں کیونکہ ممکن ہے ایک صفاف چیز کسی رنگین روشنی میں آپ کو اپنے اصلی رنگ میں نظر نہ آسکے اور روشنی کے منعکس شدہ رنگ کو آپ اس چیز کا اصلی رنگ سمجھکر بجائے رشید صاحب کے خواہ مخواہ مجھے موردِ الزام قرار دیں۔

آرٹ اور شاعری تو خیر بھائی بہن ہیں جیسا کہ آئندہ آپکو ان کے شجرۂ خاندانی سے معلوم ہو جائے گا۔ صرف اخلاق ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ان بھائی بہنوں کا معزز مہمان ہے تو آئیے پہلے ان مہمان صاحب ہی سے متعارف ہو لیجئے کیونکہ شہ خاور مغربی اُفق کے لالہ زار میں گم ہو چکا ہے اور ان کا اسباب بھی بندھا رکھا ہے۔ لہذا قبل اس کے کہ یہ تانگہ پر سوار ہوں آپ ان سے مصافحہ کر لیجئے۔

اخلاق آپ کا مستقل نام اخلاق ہے۔ مذہب آپکا کچھ نہیں ہاں جس مذہب والوں سے ملتے ہیں ان کا کچھ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ جس وقت سے حیوان نے انسانی شکل اختیار کی آپ اسی کے ساتھ عالمِ وجود میں تشریف لائے تھے۔ عالمِ طفلی سے گذر کر جب سے نامِ خدا جوان ہوئے برابر جوان چلے آرہے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ کبھی کبھی آپ پر سخت فالج کے حملے ہوئے لیکن آپ کی سخت جانی، جس پر مجھے رشک آتا ہے ہمیشہ آڑے آئی۔ اور آپ بدستور صحتیاب ہو ہو گئے۔ آپ ماشاء اللہ واعظ بڑے زور کے ہیں اور دُنیا کی ہر زبان میں نہایت خوش اسلوبی سے وعظ فرما لیتے ہیں۔ دُنیا کی حکومتوں پر بھی آپ کا اتنا اثر ہے کہ بہت سی باتیں ان سے بطور قانون پاس کرا لی ہیں آپکے وعظ کے موضوعات مختلف زمانوں اور مختلف لوگوں کے سامنے اُلٹتے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن چند موضوعات ایسے ہیں جن پر آپنے ہمیشہ ہر زمانے اور ہر ملک میں بہت زور دیا ہے مثلاً زہد و تقوی۔ قناعت ہمت صبر و تحمل۔ اتفاق و اتحاد۔ ہمت و استقلال۔ آزادی۔ ادب تعظیم۔ بذل و ایثار۔ علم و عمل۔ عدل و انصاف۔ رحم و شفقت۔ شرم و حیا۔ خدمت خلق وغیرہ۔ اگر آپ کو قدرت کوئی غیبی طاقت عطا فرما دے تو خواہ ہمارے آنریبل وزیر تعلیم کی تعلیمی اسکیم تو تا قیامت جولائی تک معرض عمل میں نہ آئے لیکن آپ کی دُنیا کو جنت بنا دینے کی اسکیم ضرور کامیاب ہو جائے۔ مگر آپ کے کچھ دُشمن در پردہ آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے رہتے ہیں اور کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا ہے جب آپکے مخالفین نہ رہے ہوں۔ اگرچہ آپ کی سطوت اور آپ کا رُعب انہیں باعلان تو مخالفت کرنے کی جرأت نہیں ہونے دیتا لیکن وہ موہوم و عارضی مسرت و فائدہ کی خاطر آپ کے پند و نصائح کی طرف سے کان ضرور بند کر لیتے ہیں اور آپ کے ارشادات کے بالکل برعکس کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے انہیں کچھ نہ کچھ نقصان اور تکلیف ہی ہوتی ہے لیکن ان کی ضد کچھ اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ وہ جاڑے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھیں گے لیکن جب ایک ہفتہ متواتر کھیلنے سے ایک ایک انچ گرد پاؤں پر جم کر بالکل "جزو بدن" بن جائیگی تو اینٹ سے انہیں کھرچ کھرچ کر لہولہان کر لینا منظور۔

آرٹ اور آرٹ کے تمام بھائی بہنوں سے آپکے خاص اور بہت پُرانے تعلقات ہیں۔ لیکن (معاف فرمائیے اخلاق صاحب

مَیں آپ کی عیب جوئی نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ دوستانہ تنقید ہے) آپ میں ایک عیب بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ جب آپ اسٹیج پر ڈاڑھی ہلا ہلا کر اور پینترے بدل بدل کر جوش میں بھرے ہوئے دھواں دھار وعظ فرماتے ہوتے ہیں اور آرٹ اگرچہ آپ کی داہنی طرف بیٹھا ہوتا ہے لیکن آپ اپنے جوش میں اس وقت محض اس کی طرف سے بے توجہ ہی نہیں ہو جاتے بلکہ اُسے بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس پر بعض اوقات آرٹ سے آپ کی اَن بن ہو جاتی ہے اور اس طرح آپ کے سامعین میں دو گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک چلاتا ہے "آرٹ۔ آرٹ۔ خالص آرٹ" دوسرا شور مچاتا ہے "مولانا اخلاق۔ مولانا اخلاق" نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وعظ تو دیتے ہیں اتحاد کُل پر اور ہو جاتا ہے برعکس۔ اور یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے بڑی ستم ظریفی اور یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی آپ آرٹ کے یہاں نہیں ہوتے تو آپ کے دلدادگان آرٹ اور اس کے ملازمین سے نہایت چیں بجبیں ہو کر شور و غل کے ساتھ اس کا جواب طلب کرتے ہیں کہ یہاں مولانا اخلاق کیوں نہیں ہیں؟ اس پر آرٹ قہقہہ لگاتا ہے۔ اس کے ملازمین میں سے بھی کوئی زیرِ لب مُسکرا کر رہ جاتا ہے کوئی ہونٹ دبا دبا کر اور کوئی منہ پھیر کر چپکے چپکے ہنستا ہے۔ اور خود ہی سوچئے وہ غریب اس کا کیا جواب دیں ایک شخص جب تک یہاں تھا تھا۔ اب وہ چلا گیا تو اس پر کسی کا کیا اختیار اور کون اس کا ذمہ دار ہے! الغرض یہ ہیں ہمارے مولانا اخلاق صاحب۔ (اچھا کیا آپ چل ہی دئے۔ کیا کہا ٹرین کا وقت ہو گیا! اچھا تو خدا حافظ۔ دُعاؤں میں یاد رکھئے مولانا، خدا حافظ)

جلدی میں جس طرح بھی ہو سکا اخلاق سے تو آپ کا تعارف ہو ہی چکا۔ اب آرٹ اور رہ گئے ہیں۔ انہیں نہ کہیں آنا ہے نہ جانا۔ لہٰذا آئیے ان دونوں کی اچھی طرح تحقیق کریں کہ آخر یہ ہیں کیا۔

آرٹ۔ اگر ہم اپنی روزانہ زندگی کا تجزیہ کر کے غور کریں تو اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ ہم ہر لمحہ کچھ تاثرات و تجربات حاصل کرتے رہتے ہیں اور پھر خاموشی سے اپنے شعور کے سامنے ان کا اظہار کر دیتے ہیں۔ پھر ایک قدم اور بڑھاتے ہیں اور ان تاثرات و احساسات کو کسی ظاہری یا مادی شکل میں اظہار کر دیتے ہیں۔ اور دراصل یہی اظہار ہے جس کے لئے ہم اس کے صحیح مفہوم میں اظہار کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اسی اظہار کو آرٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آرٹ نام ہے ہمارے کچھ محسوس کرنے اور اس احساس کو ظاہری شکل دیدینے کا۔ اور ہر وہ مظہرِ فن جس میں فن کار کی شخصیت جا بجا اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہو اور جو قلبی واردات کی ترجمانی کے علاوہ ذہنی کیفیات کو بھی ظاہر کرتا ہو، فنونِ لطیفہ میں داخل ہے۔

کوسا ئینو کہتا ہے کہ "آرٹ اصولی طور پر رُوحانی اور آئیڈیل چیزوں کا اظہار ہے" انڈکرا ایلن پو کا مقولہ ہے کہ "روح کے پردے میں ہمارے احساسات کو جو کچھ دکھائی دیتا ہے اسی کی تشریح کو آرٹ یا فنِ جمیل کہتے ہیں"

ارسطو نے اپنی مشہور عالم تصنیف "شعریات" (صفحہ ۶ تا ۲۵) میں لکھا ہے "انسانی ذہنیات اس بات کی طرف مائل ہیں کہ ان نقوشِ تاثر کو جو اُن پر ثبت ہوتے ہیں دوسروں کے دماغوں پر منعکس کر دیں۔ اور اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آرٹ کی ابتدا ہوتی ہے اور اس ابتدا کا دار و مدار غیر ارادی طور پر اس چیز کی بعینہٖ تقلید پر ہوتا ہے جو انسانی محسوسات کو متاثر کرتی ہے...... تمام فنونِ لطیفہ فطرت کی محاکات ہیں۔ انسان کو نقل کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اس لئے ہر اُس چیز کی جو اُسے متاثر کرتی ہے نقل کرنے لگتا ہے۔ اس کی ہر ترقی کا انحصار اسی تقلیدی مادہ پر ہے۔ اگر اس میں سے قوتِ تقلید کو نکال دیا جائے تو حیوان و انسان میں تو کجا جمادات اور انسان کے مابین بھی کوئی فرق باقی نہ رہے"

لیکن نیومن اس کے برعکس کہتا ہے کہ "آرٹ خارجی صداقت کو نہیں پیش کرتا بلکہ داخلی کو۔ اشیاء کو نہیں بلکہ خیالات کو"

اطالوی فلسفی کروچے لکھتا ہے "اگر نقل سے مُراد یہ ہے کہ فن کار مظاہرِ قدرت کو اپنی وجدانی صورت میں پیش کرتا ہے تو بیشک فنونِ لطیفہ فطرت کی نقل کہے جا سکتے ہیں لیکن اُس وقت یہ نقل نہیں رہ جاتی بلکہ یہ تو فطرت کی معرفت ہو گی کیونکہ فطرت کو اس تخیلی صورت میں پیش کیا گیا ہے جس میں خود فطرت اپنے کو پیش نہ کر سکی۔ اور اگر نقل سے مُراد یہ ہے کہ صناعِ قدرت کا بجنسہٖ عکس رکھدیتا ہے تو یہ فنونِ لطیفہ پر ایک بہتان ہے جس کی کوئی بُنیاد نہیں"

دوسری طرف شیلنگ سے بھی اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے "افلاطون نے فنونِ لطیفہ کو نقالی اس لئے کہا ہے کہ عہدِ قدیم میں واقعی وہ نقالی سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ لیکن

آپکی فنونِ لطیفہ کی جولانگاہ لامحدود ہے۔ حُسن میں تشخص پیدا کرنے کا صرف فنِ لطیف ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا موضوع کوئی انفرادی ذات ہے۔ فنونِ لطیفہ کا تعلق اس محیط تصوّر سے ہے جو ہر فرد کی رُوح رواں ہے۔ صنّاع کسی ایک چیز میں اس تصوّرِ محیط کو دیکھ لیتا ہے اور اسکو ظاہر کرکے اس خاص شخص یا چیز کو پھر وہی تصوّرِ محیط بنا دیتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کو دراصل آنی و فانی محسوسات سے سروکار نہیں ان کا کام تو اس ماورائی وجدان کو معرضِ اظہار میں لانا ہے جس کو حیاتِ ابدی و لامتناہی پر عبور حاصل ہو۔ آرٹ اور فلسفہ ہی ایسی چیزیں ہیں جن کی رسائی اُس عالمِ تصوری تک ہے جسے متصوفین عالمِ مثال کہتے ہیں اور جس کے سامنے عالمِ عناصر تحلیل ہوکر رہ جاتا ہے۔ وہ زمانہ دُور نہیں جب فلسفہ اور فنونِ لطیفہ مل جل کر حقیقتِ اولیٰ کی تلاش کریں اور پھر حُسن اور حقیقت کو ایک پائیں۔

اسی سلسلہ میں اشراقیئین (جن کا سرغنہ ایک مصری شخص فلاطینوس ہے) کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں "مجاز اور فنونِ لطیفہ دونوں نامکمل نقلیں ہیں حقیقت کی۔ لیکن فنونِ لطیفہ مجاز سے بہتر نقل اُتارتے ہیں۔ ایک صنّاع جب کسی چیز کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ اپنی اصل مجازی ہیئت سے زیادہ پُر کیف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں حقیقت کے بعض وہ رُخ بھی سامنے آجاتے ہیں جو مجاز میں چھپ کر رہ گئے ہیں۔" اس لئے آسکر وائلڈ نے لکھا ہے کہ "قدرت کے نقائص کو فنونِ لطیفہ دُور کرتے ہیں۔"

یہاں پر فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر آرٹ کی اس دُنیا کو ضرورت کیا تھی! اسے سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی روزانہ زندگی پر غور کرنا پڑے گا۔ موسم کے تغیرات جب ہمارے جسم کو تکلیف پہونچاتے ہیں تو ہمیں کپڑے اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم بھوک محسوس کرتے تو ہمیں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیاس کے موقع پر پانی کی۔ جب بچے ہوتے ہیں تو ایک محبت کرنے والی ماں کی، اور جب جوان ہوتے ہیں تو حتی المقدور ایک حسین بیوی کی۔ یہ تمام چیزیں ہماری جسمانی خواہشات اور نفسانی توقعات کو پورا کرتی ہیں بالکل اسی طرح ایک صنّاع ہماری روحانیات و ذوقیات کو زندہ رکھنے میں ان سب سے زیادہ اہم اور مشکل کام انجام دیتا ہے۔ ضرورت ہمیں دونوں چیزوں کی یکساں ہے۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ

کا تعلق جمالیات و ذوقیات سے ہے اور دوسری طرف دیگر مصنوعات کا ضروریات و احتیاجات کا۔

اخلاقیات کا مدعی، اس دُنیا سے بیزار اور رہبانیت کا علمبردار ٹسونیہار بھی فنونِ لطیفہ کی افادیت سے انکار نہ کرسکا وہ کہتا ہے "صنّاع ہونا فلسفی ہونے سے زیادہ خوش قسمتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی بُنیاد وجدان پر ہے۔ وجدان کا موضوع وہ تصورات ہیں جنکو افلاطون "ازلی نمونے" کہتا ہے۔ فنونِ لطیفہ وجدان کے توسط سے عالمِ زمان و مکان کی جزئیات کی ہیئت بدل دیتے ہیں اور ان کو ہمارے لئے سکون و راحت کا سبب بنا دیتے ہیں"

الغرض ایک ماں جس طرح دودھ پلا پلا کر ہمارے جسم کو تقویت اور غذا پہونچاتی ہے اسی طرح فنونِ لطیفہ انسان کے دماغی، وجدانی اور روحانی حصّہ کو۔ اور جب تک اس دُنیا میں رُوح اور مادّے کا اتصال قائم ہے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اور اگر آپ کو روحانی غذا کی ضرورت نہیں ہے تو آپ جانیئے۔ ہم اس کے سوا اور اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو اختیار ہے "برون خود بیفروز اندرون میر"

اسی سلسلہ میں مجھے آپ کی کم فہمی پر استادانہ اعتماد رکھتے ہوئے کافی اُمید ہے کہ شاید آپ (بشرطیکہ نیاز صاحب کی طرح رُوح کے منکر نہ ہوں) یہ سوال کریں گے کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو فنونِ لطیفہ بطور روحانی غذا کے ہمارے لئے مہیا کرتی ہے؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا "حُسن اور صرف حُسن" آپ چاہیں تو اسی حُسن کو حقیقت کہہ لیجئے کیونکہ حقیقت حُسن ہے اور حُسن حقیقت، بقول مولانا جامی ؒ:-

در اں خلوت کہ ہستی بے نشاں بود
بکنجِ نیستی عالم نہاں بود
وجودے بود از نقشِ دوئی دور
زگفت و گوئے مائی و توئی دور
جمالِ مطلق از قیدِ مظاہر
بہ نورِ خویشتن ہم بر خویش ظاہر
دلآرا شاہدے در حجلۂ غیب
مبرّا ذاتِ او از تہمتِ عیب
نوائے دلبری با خویش می ساخت
قمارِ عاشقی با خویش می باخت

لیکن اس جمالِ مطلق کو چین کہاں تھا؟ کیونکہ :-

نکو رُو تاب مستوری ندارد ۔ چو در بندی سر از روزن بر آرد
بروں زد خیمہ ز اقلیم تقدس ۔ تجلی کرد بر آفاق و انفس
ازاں لمعہ فروغے با گل افتاد ۔ ز گل شورے بجان بلبل افتاد

اسی چیز کو عزیز لکھنوی نے اس طرح پیش کیا ہے :-

آئینہ حیات ہے تیرا فروغ حسن
زندہ وہی ہے جو کہ ترا رُو شناس ہے

گویا یہ دُنیا جس حقیقت سے وجود میں آئی وہ جامی اور عزیز کے نزدیک "حسن مطلق" ہی تھا۔ بعض لوگ اس حقیقت کو ایک "ازلی نغمہ" کہتے ہیں۔ ایک انگریزی شاعر کا قول ہے کہ "فردوسی آہنگ سے کائنات کا ڈھانچ وجود میں آیا" جامی بھی اس قول پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بعالم ہر چہ از نو و کہن زاد ۔ چنیں گوید سخنداں کز سخن زاد

یار لوگ یہاں تک بڑھے کہ لفظ "کن" کو بھی ایک صوت سرمدی یا اسی ساز حسن کا ایک ہستی آفریں راگ بتا دیا اور صاف صاف بتا دیا کہ :-

نقش دو جہاں گردش پیمانۂ دل تھا
کُن روز ازل نغمۂ مستانۂ دل تھا

لیکن اس کے برخلاف ہیگل کے فلسفہ کے مطابق "عالم ہست و بود کی رُوح رواں ایک نفس کل یا تصور مطلق ہے انفرادی نفوس اسی نفس کل کی شاخیں ہیں۔ نفس کل مائل بہ ارتقا ہے اور اپنے کو معرض اظہار میں لا کر جاننا پہچاننا چاہتا ہے۔

(دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں)

جب اس کو منطقی تعقل ہوتا ہے تو فلسفہ وجود میں آتا ہے جب وہ اپنے کو احترام و عبودیت کی نظر سے دیکھتا ہے تو مذہب پیدا ہوتا ہے اور جب اس کو اپنا وجدانی ادراک ہوتا ہے تو فنون لطیفہ ظہور میں آتے ہیں۔ لیکن ان سب کا مقصود دراصل وہی تصور مطلق ہے حسن اور حقیقت دراصل ایک ہی تصور مطلق کے مختلف پرتو ہیں۔"

بہرحال حقیقت خواہ کچھ ہو میں فنون لطیفہ کا موضوع صرف حسن ہی کو سمجھتا ہوں۔ اب یہ حسن بہ حیثیت حقیقت یا نغمۂ سرمدی کے نہیں بلکہ بحیثیت حسن کے کیا ہیں؟ اس پر کافی اختلاف آرا چلا آرہا ہے اور شاید یونہی چلا جائے۔ تصوریوں نے حسن کو ایک تصور بتایا، مادیوں نے مادی تناسب و توازن کا نام حسن رکھا۔ اخلاقیوں نے کہا حسن نام ہے خیر محض کا۔ الغرض حسن کے متعلق شاعر کا خیال کچھ اور ہے، صوفی کا کچھ اور عقلیت کچھ کہتی ہے اور وجدانیت کچھ۔ بی سائنس کیسے پیچھے رہ جاتیں آپ نے حسن کی کیمیاوی تحلیل کر ڈالی۔ اور اپنے جاں بخش لبوں سے فرما دیا کہ حسن ایک مقناطیسی کشش ہے۔

القصہ کہیں دو آدمیوں نے حسن کی تعریف میں اتفاق نہیں کیا ہے اور اس اختلاف کا ہونا لازمی تھا۔ فطرت اپنے حسن کی صرف ایک جھلک دکھاتی ہے۔ حسن ایک ہمہ گیر حقیقت ہے۔ وہ ساری کائنات میں ہے اور ماورائے کائنات بھی۔ لیکن انسان کا شعور محدود اور زمان و مکاں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے تو اس حسن محیط کی صرف ایک جھلک دیکھتا ہے اور اسی کو سارا حسن سمجھ لیتا ہے۔ اسی لئے حسن کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں وہ سب ناقص ہیں ؎ ع

وز ہر چہ گویم برتری حقا عجائب دلبری

حُسن کا تعلق ذوق و وجدان سے ہے۔ آلام و مصائب سے لبریز دنیا میں صرف حسن ہی وہ چیز ہے جو ہمیں خودکشی سے باز رکھے ہوئے ہے۔ وہ تنازع البقا کی گراں باری کو محسوس نہیں ہونے دیتا فطرت خود اپنے نظام میں حسن دیکھنا چاہتی ہے اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَال۔ اور اگر ذرا اور آگے بڑھا جائے تو اللہ جمیلٌ کی بجائے اللہ جمال کہا جا سکتا ہے۔ فطرت خود حسن ہے۔

قصہ مختصر ہمارے محدود اور فانی شعور کو برابر لامحدود اور غیر فانی حسن کی تشنگی رہتی ہے۔ جیسا کہ اڈگر ایلن پو کہتا ہے کہ "آرٹ کی ابتدا اس سے زیادہ حسن کی تشنگی کے باعث ہوتی ہے جتنا کہ کائنات پیدا کرتی ہے۔" اگر فنون لطیفہ نہ ہوتے تو ہماری یہ تشنگی کبھی دور نہ ہوتی۔ فنون لطیفہ کی بدولت کبھی کبھی ہم کو حسن مطلق کا ادراک ہو جاتا ہے اور ہم جزو میں کل دیکھ لیتے ہیں۔ شاعر ہو، مصور ہو، یا کوئی صناع ہو اس کی وہ حسن بیں بصیرت بہت تیز ہوتی ہے جو ایک وجدانی قوت ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

جب ایک شاعر کہتا ہے :-

ایں طرفہ تر کہ دائم تو با منی و من باز

چوں سایہ در پئے تو دائم و دوانم

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی بات کہی گئی ہے۔ اور ہمیں تسکین ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حُسن کا تعلق باطن سے ہے نہ کہ ظاہر سے صنّاع کو عالم باطن کی کیفیتیں نظر آتی ہیں جو اس کے توسط سے ہم بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اور اسی بصیرت کا نام صنّاعی ہے لیکن باطن سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حُسن کا کوئی وجود ہی نہیں اور وہ محض ایک ذہنی پیداوار ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بقول شلر "حسن نظام قدرت میں موجود ہے فنون لطیفہ مادّہ اور ذہنی صور توں میں اندر انسانی اور خارجی مظاہر قدرت میں باہم رابطہ پیدا کرتے ہیں حسن نام ہے زندگی کا مگر یہ زندگی جسمانی نہیں ہوتی بلکہ ایک غیر مادّی کیفیت ہوتی ہے۔ فنون لطیفہ اپنے حسین اسلوب کی بدولت قدرت پر فتح پا لیتے ہیں اور مادّہ کو لطیف کر دیتے ہیں۔ فنون لطیفہ کی امتیازی شان لامتناہیت ہے۔ وہ ہم کو مادّی زنجیروں سے آزاد اور ہر قسم کے عقلی یا اخلاقی فرائض کے احساس سے سبکدوش کر دیتے ہیں۔"

ایک اطالوی ماہر جمالیات ڈی سینکٹس فنون لطیفہ کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ اس کے نزدیک "فنون لطیفہ کی حدود کے باہر جو کچھ ہے وہ منتشر، غیر منضبط اور غیر متشکل ہے۔ فنون لطیفہ کا کام انضباط اور صورت آفرینی ہے بھدی سے بھدی اور کریہہ سے کریہہ چیز فنون لطیفہ کا موضوع بن سکتی ہے اگر وہ اس کو صورت دے سکیں۔ شاعر یا مصور پہلے باہر سے مواد لیتا ہے اور پھر ان کو صورت دیتا ہے۔ لیکن یہ مواد صورت پانے سے پہلے منتشر ہیولیٰ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ شاعر یا مصور ان کو اپنی شخصیت کی نیرنگیوں سے معمور کر کے اُن کے اندر ایک نئی شان، ایک نئی قدر و قیمت اور ایک نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو شاعر کی شاعری اور مصوّر کی مصوّری بچوّں کے کھیل سے آگے نہیں بڑھتی۔"

آرٹ کی ان تمام تعریفوں کے بعد ہم نہایت آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ فنون لطیفہ کا تعلق محض حُسن سے ہے ایک صنّاع ہر جگہ حُسن کی تلاش کرتا ہے۔ گویا بقول سعدی:۔

خویشتن سوزیم و جاں بر سر نہادہ شمع وار

ہر کجا در مجلسے شمع است ما پروانہ ایم

اور صرف یہی نہیں کہ وہ بظاہر حسین چیزوں ہی میں حُسن کی تلاش کرے بلکہ اس کی حقیقت بیں بصیرت ان چیزوں میں بھی حُسن کی جھلک دیکھ لیتی ہے جو ہماری ظاہر بیں نظروں کے لئے بھدی اور کریہہ ہوتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کے حُسن کو دیکھنے کے بعد وہ ان چیزوں کے درمیان جو فطری تعلق اور ازلی ربط ہے اسکو بھی محسوس کر لیتا ہے۔ تشبیہہ، استعارہ کا راز یہی ہے۔ اور جب صنّاع کسی واقعہ کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ اصل واقعہ سے زیادہ پُرکیف ہوتا ہے۔ مثلاً استقرار حمل کا واقعہ سننے والوں کے لئے کس قدر غیر دلچسپ اور ثقاہت سے گرا ہوا ہے لیکن جب مولانا غنیمت اس کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

سحاب او بہ بارش آشنا شد   صدف بر کام دل گوہر رُبا شد

یا مولانا جامی اسی واقعہ کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:۔

شد از ابر نیساں صدف بارور   پدید آرشد لولوئے شاہوار

تو یہ دلچسپ ہی نہیں بن جاتا بلکہ پُرکیف بھی ہو جاتا ہے اور اس حد تک پُرکیف کہ ثقاہت کے لبوں پر بھی مسرت کا تبسم نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک صنّاع حُسن یا حقیقت کی تلاش کیلئے تصوّف کی طرح مجاز کے باہر نہیں جاتا۔ وہ مجاز کے پردے ہی میں حُسن و حقیقت کو تلاش کرتا اور پھر مجاز ہی کے پردہ میں اس حُسن کا اظہار کر دیتا ہے۔ کیونکہ بقول کانٹ "حقیقت عریاں اس وقت تک ہمارے حیطۂ ادراک میں مشکل سے آسکتی ہے جبتک جمالیات اس کو اپنا مجازی جامہ نہ پہنا لے۔ ہمارا نفس مجبور ہے اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے اسکو فنون لطیفہ کی مجازیت درکار ہے۔"

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس اعتبار سے آرٹ کو اگر عوام الناس کا تصوّف کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

شاعری اب آئیے یہ بھی دیکھ لیں کہ شاعری کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے۔ شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کسی نے اُسے تاریخ اقوام کا ایک جزو بتایا ہے کسی نے ارتقائے دماغ کے افسانہ کا ایک باب، کسی نے خود نوشتہ سوانح جات کا ایک سلسلہ اور کسی نے زندگی کی تشریح۔ پھر دوسری طرف کسی نے اُسے ایک مکمل آرٹ سمجھا ہے، کسی نے صرف ایک فن اور کسی نے "راز پس پردہ"۔

ایچ کو رسان کہتا ہے "شاعری روحانی اور ذہنیاتی شخصیت کے اختلاط کو الفاظ کے ذریعہ ظاہر کرنے کو کہتے ہیں" کارلائل کا قول ہے کہ "شاعری موسیقانہ خیالات کا نام ہے" ہیزلٹ کا خیال ہے "شاعری جذبات اور تخئیل کی زبان ہوتی ہے" ڈانٹے نے لکھا ہے "شاعری اس بلیغ افسانے کو کہتے ہیں جو موسیقی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہو" شیلے کہتا ہے "شاعری ذہنیات کی ترجمان ہے۔ وہ تمام اشیاء کو پسندیدہ اور محبوب بنا دیتی ہے" چارلس جیمس فاکس لکھتا ہے کہ شاعری انسانی ذہنیات کی بہترین تشریح ہے۔ انسان کو سب سے اوّل اپنی دماغی قوت پر اسی وقت اطمینان ہوا ہوگا جب اس نے شعر کہنا اور اس سے متکیف ہونا شروع کیا تھا" بیکن کا خیال ہے کہ "شاعری اشیاء کی ظاہری حالتوں کو دماغی افعال کے ساتھ ملا دیتی ہے" ایمرسن شاعری کی اصلیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے "شاعری کو ہم معجزہ سمجھتے ہیں۔ مکھی پھولوں میں اڑتی ہے اور ان میں سے صرف رس اور خوشبو حاصل کرتی ہے لیکن اس کے بعد ایک نئی چیز پیدا کرتی ہے جس کو ہم شہد کہتے ہیں۔ ایک ماہر کیمیا آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملانے کے بعد دوبارہ ہائیڈروجن اور آکسیجن نہیں پیش کرتا بلکہ پانی۔ اسی طرح ایک شاعر لوگوں کی باتیں سنتا اور فطرت کی تمام اشیاء کو دیکھتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں کو دوبارہ پیش کرے بلکہ اس لئے کہ ایک نئی اور شاندار چیز پیدا کرے . . . . . . اشیاء کی رُوح کو ظاہر کرنے، مادّی اجسام کو نظر انداز کرنے اور اُس اصل الاصول شے کو جو اُن کو زندہ رکھتی ہے معلوم کرنے کی کوشش کو شاعری کہتے ہیں . . . . . شاعری کی ایک بہترین تعریف وہ قدیم ترین جُملہ ہے جو کلدانی زرتشت کی طرف منسوب ہے کہ "شاعر مستقل ترجمان ہوتے ہیں جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ خدا اور مادّہ کے درمیان گفتگو کریں۔ اجنبی اور غیر معمولی فطرتوں کو مانوس اور معمولی طریقہ پر پیش کریں۔ اور غیر مانوس چیزوں کو دُنیا کی مانوس اشیاء کی فہرست میں شامل کر دیں"

اس کی مثال میں ہما اور آبِ حیات کو دیکھئے۔ دُنیا کا کوئی شخص آج تک ان چیزوں کا پتہ نہیں لگا سکا ہے اور نہیں انکے وجود کا کوئی علم نہیں لیکن یہ دونوں چیزیں آج شاعری کی بدولت ہمارے لئے مع اپنی صفات کے وجود رکھتی ہیں اور ہم ان سے اسی طرح مانوس ہیں جس طرح قمری و بلبل اور بادۂ ناب سے۔

علامہ شبلی شعر العجم میں شعر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

"ہر وہ چیز جو دل پر ایک تعجب انگیز کیفیت پیدا کرے شعر ہے۔ خواہ وہ ایک لفظ ہو یا ایک ترکیب، مصرعہ ہو یا ایک مکمل نظم، کائنات کا ایک ذرّہ ہو یا اس عالمِ رنگ و بو کا ایک غیر معمولی واقعہ۔ اور یہ تعجب انگیزی تب ہی پیدا ہوتی ہے جب لطیف احساسات کو ایک ٹھیس پہونچے اور اعماقِ دل کے تاثرات دماغ میں جمع ہو کر الفاظ و تراکیب کی بندشوں، طرزِ ادا کی جدتوں، تشبیہ و استعارہ کی رنگینیوں، بحور و اوزان کی خلعت زیب کر کے ظاہر ہوں اور سامعہ کو تھوڑی دیر کیلئے خود فراموشی کی حالت تک پہونچا دیں"

الغرض ہر شخص نے اپنی بساط کے موافق شاعری کی حقیقت سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ دراصل شاعری کی صحیح تعریف کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شعراء کسی زمانے میں نفرت کی چیز بن جاتے ہیں، کبھی خدا بنکر جسم و رُوح پر حکومت کرتے ہیں اور کبھی پھر بلا سبب بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عوام ان عظیم الشان انقلابات کا باعث خود اس شاعری کی تبدیلی کو قرار دیتے ہیں جو اُس زمانے میں اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ لیکن شعراء کہتے ہیں کہ اس کا سبب قارئین کے جذبات و احساسات کا غیر مستقل ہونا ہے۔

تاریخ ادب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شاعری کے متعلق ہمیشہ سے دو نظریے پائے جاتے رہے ہیں۔ ایک تو وہ جو مندرجہ بالا شاعری کی مختلف تعریفوں میں آپ دیکھ چکے ہیں اور دوسرا یہ کہ شاعری زیادہ سے زیادہ ایک آراستہ اور پُر تکلف طرزِ گفتگو ہے، بہروپ کی ایک قسم ہے جو کچھ مخصوص مواقع اور خاص وقتوں ہی کیلئے موزوں ہے۔ جو صرف چند طبائع کو مسرور کرتی ہے۔ جو اس علم و عمل کی دُنیا میں صرف چند نفوس کے لئے ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے، جو ہمیشہ ایک بیہودہ سی چیز ہے اور عموماً ناقابلِ فہم۔ اور کچھ لوگ جو رُوحانیت کے سرے ہی سے قائل نہیں اور جنہوں نے شاعری کی بیخ و بن تک برباد کرنے کا عزم خود تہیہ کر لیا ہے کہتے ہیں کہ یہ ایک شکریں لغویت اور بیہودگی ہے جذبانیت [illegible] کی ایک مٹی ہوئی صورت ہے اور علمی صداقت کی ایک شکست خوردہ لیکن ہٹ دھرم دشمن۔

اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ انسانوں میں سب سے زیادہ طاقتور، نازک خیال، دقیق رس، حقیقت میں اور لطیف

تریہاستیاں ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک برابر ایک نہایت ادنیٰ فریب اور ذلیل مغالطہ میں مبتلا رہی ہیں۔

اس نظریہ کے مؤید کہتے ہیں کہ بجز زندگی میں، اسٹیٹ کے جہاز پر شاعری کو جہاز ران سے نہیں بولنا چاہیئے۔ اور اگر وہ بک بک کئے جائے گی تو اس کی طرف سے کان بند کر لئے جائیں گے۔ کیونکہ شاعری کو اگر بہت اہمیت دی جائے تب بھی یہ زیادہ سے زیادہ صرف تخیلیت (   ) ہے اور تخیل کو عمل سے کیا واسطہ! ہمیں اصلیت صداقت اور اشیاء کے اس علم کی ضرورت ہے جیسی در اصل وہ ہیں۔ اور صرف سائنس ہمیں یہ چیز دے سکتی ہے، لہذا سائنس کی حکومت ہونی چاہیئے، صرف سائنس جہاز رانی کے عہدے کی مستحق ہے۔ اور شاعری اگر کچھ کرنا ہی چاہتی ہے تو زیریں حصہ میں، ملازمین کے گندے کمروں میں اُسے صرف گنگنانے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

اب اس "بزعمِ خود عالمانہ" نظریہ کی صحت یا عدم صحت پر روشنی ڈالنی بیکار ہے۔ جو سائنس برسوں ہزاروں شہادتیں اور ثبوت تلاش کرکے آج جس حقیقت کو نظریۂ ارتقار کی صورت میں پیش کرتی ہے وہ شاعر کی نظر ایک مختصر لمحہ میں، ایک مختصر پرواز میں معلوم کر لیتی ہے اور آج سے بہت پہلے جب اس نظریہ کا وجود بھی نہ تھا دنیا کے سامنے اس طرح پیش کر دیتی ہے:-

آمدہ اوّل بہ اقلیمِ جماد　　　　از جمادی در نباتی اوفتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد　　　　وز جمادی یاد نا ورد از نبرد

وز نباتی چوں بحیواں اوفتاد　　　　نامدش حال نباتی ہیچ یاد

باز از حیواں سوئے انسانیش　　　　می کشند آں خالقے کہ دانیش

ہم چنیں زاقلیم تا اقلیم رفت　　　　تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

عقلہائے اولینش یاد نیست　　　　ہم ازیں عقلش تحوّل کردنی است

تا رہد زیں عقلِ پُر حرص و طلب　　　　تا ہزاراں عقل بیند بوالعجب

دوسرے سائنس کی حکومت کے نتائج ہمارے عمرانی نظام کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں اور اُن کی ہلاکت آفرینیوں اور قیامت انگیزیوں کا ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے۔ ہماری عملی زندگی ہمیشہ جنگ و جدل اور انتشار کی مظہر ہے۔ ملاّح جہاز کے چلانے میں اتنے مصروف نہیں جتنے سفر کی غیر ضروری تفصیلات اور خصوصاً راستہ کے متعلق لڑنے جھگڑنے میں۔ سائنس کی اندھی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی ہاں شاعری کی حقیقت بیں آنکھ اسے دیکھ لیتی ہے اور اپنی بہرنا کی بے بصارتی پر افسوس کرکے اُسے اس حقیقت سے اس طرح مطلع کر دیتی ہے:-

درنامۂ زمانہ بجز حرفِ جنگ نیست
گویا کہ از سیاہیِ لشکر نوشتہ اند

شاعری کے نظریوں میں اس اہم اختلاف بلکہ اس تضاد کا باعث حقیقتاً وہ اختلاف ہے جو علم اشیاء کے نظریوں میں باہم پایا جاتا ہے۔ ہمارے چاروں طرف علم اشیاء کے متعلق ایک کثیر آبادی کا نظریہ یہ ہے کہ جسمانی وجود ہی اپنے صحیح معنوں میں وجود ہے اور ہر حقیقی وجود لازماً مادی ہوگا اس ظاہری زندگی کے مقابلے میں باطنی زندگی بے حقیقت ہے اور یہ اسی وقت زیادہ سے زیادہ حقیقت حاصل کرتی ہے جب زیادہ سے زیادہ مادی وجود سے مطابقت کرتی ہو۔ لہذا ہمارا حقیقی علم صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو ظاہری دنیا کے متعلق ہو اور یہ اس لئے حقیقی ہے کہ یہ اُن چیزوں کا ویسا ہی علم ہے جیسی در اصل وہ خود ہیں۔ یہ حقیقی چیزوں کا علم ہے نہ کہ فرضی چیزوں کا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارا وہ علم جو اپنے جسم کے متعلق ہے یا ہو سکتا ہے زیادہ حقیقی اور یقینی ہے۔ اور سائنس اسی اصلیت اور حقیقت سے بحث کرتی ہے اور آرٹ یا شاعری کم و بیش اس کی ترمیم و تحریف شدہ نقل ہے۔

یہ اعتقاد اس نسل کا ہے جو سائنس کی اولاد اور اسی کی پروردہ یافتہ ہے لیکن خود ملکۂ سائنس کا یہ فرمان نہیں ہے۔ سائنس اس کے متعلق جو کچھ کہتی ہے وہ نہایت عمدگی سے ہکسلے کے مقالات میں بیان کر دیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "تو پھر یقینی کیا ہے؟ یہ اور صرف یہ کہ خیال (شعور) کا وجود واقعی ہے۔ اس طرح خیال بجائے خود وجود ہے۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ گویا جہاں تک ہمارا تعلق ہے وجود کا دوسرا نام خیال ہے۔ کیونکہ وجود کے متعلق ہمارے تصوّرات کسی نہ کسی قسم کا خیال ہیں۔"

(ہے جائز و تازگی پہ اس کی　　　　عالم تو خیال کا چمن ہے)

معمولی سے معمولی واقعات پر ذرا سا غور کرنے سے یہ نظریہ ناقابلِ تردید صداقت ثابت ہو جائیگا۔ مثلاً ایک سنگ مرمر کا ٹکڑا اُٹھاتا ہوں اور جب دیکھتا ہوں تو اُسے سُرخ، مدوّر، سخت اور اکہرا پاتا ہوں۔ یہ تمام صفات خود ہمارے شعوروں کا ایک مجموعہ ہے۔ اسی طرح ہر چیز کا علم جسے ہم جانتے یا محسوس کرتے ہیں صرف شعور کی مختلف حالتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کائنات کی اصلیت خواہ کچھ ہو لیکن ہم جو

کچھ اس کے متعلق جانتے ہیں وہ صرف ایک تصویر ہے جو ہمارے شعور نے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ یہ تصویر ممکن ہے کہ اصل کے مطابق ہو۔ (اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اصل سے بالکل مختلف ہو۔ لہذا یہ بالکل صحیح ہے، ناقابل تردید صداقت ہے کہ جسے ہم مادی کہتے ہیں اس کا علم ہمیں صرف روحانی دنیا کی مختلف شکلوں کی صورت میں ہے۔ اور اس لئے روح (شعور) کی مختلف حالتوں کا مجموعہ کا علم بمقابلہ جسم کے علم کے زیادہ حقیقی اور یقینی ہے۔"

لیکن ان متضاد نظریوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور آرٹ کی بنیاد مختلف نہیں ہے۔ ہر سادہ اور معمولی تصور یا شاعری کی اصلاح میں الہام کہہ لیجئے اور مذکورہ بالا نظریہ کی رو سے علم، جو چاہے کہئے لیکن یہی علم یا تصور آرٹ اور سائنس، نظم اور نثر دونوں کی بنیاد ہے۔ یہ طے ہے کہ ہمیں اشیاء کے متعلق ایسا مکمل علم نہیں ہوسکتا جیسی دراصل وہ ہیں۔ ہم صرف ان کی ظاہری صورتوں کو محسوس کرکے اپنے وجدانی عمل سے انہیں اپنے شعور کے پیش کرتے ہیں اور اگر ہم اس بیرونی دنیا سے پیدا شدہ تاثر یا احساس کو روح کے عمل سے قبول کرکے شعور کے سامنے پیش نہ کریں تو وہ بے حقیقت ہے، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ تو خیر جب ہم کوئی تاثر حاصل کرتے ہیں یا کسی بیرونی شکل کا احساس کرکے خاموشی کے ساتھ اپنے شعور کے سامنے اس کا اظہار کر دیتے ہیں اس وقت ہم ایک تصور کی تخلیق کرتے ہیں۔ یا یہ کہئے کہ ہم اس شے کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اب ان تصورات کی تخلیق کے بعد ہم ایک قدم اور بڑھا سکتے ہیں اور (۱) یا تو ان تصورات کو ظاہری صورت میں اظہار کر دیتے ہیں یا (۲) اپنے منطقی اور سائنٹفک عمل سے ان صورتوں میں مقابلہ کرتے ہیں، ان کی قسمیں بناتے ہیں اور پھر انہیں قسم وار مرتب کرکے انکی تحقیق کرتے ہیں، ان پر استدلال کرتے ہیں۔ اول الذکر عمل آرٹ ہوگا اور اسے الفاظ کے جامہ میں ملبوس کرنا شاعری، مؤخر الذکر عمل کو سائنس کہیں گے اور اسے الفاظ کا جامہ پہنانا نثر۔

یہاں پر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے وجدان کا الفاظ میں اظہار کر دیتا ہے تو کیا اس کے الفاظ شعر کہلائیں گے؟ ہاں ایک محدود مفہوم میں اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ آرٹ یا شعر نسل انسانی میں مشترک ہے۔ یہ انسان کا فطری عمل ہے جب ہم اپنے الہام و وجدان کو کسی صورت سے بھی ظاہر کرتے ہیں (لیکن محض ان کے اظہار کے ارادہ سے نہ کہ ان پر استدلال کی خاطر) تو ہم سب صناعی کرتے ہیں۔ اور جب وہ اظہار الفاظ میں ہوتا ہے اس وقت ہم شعر کہتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ اور ایک اصلی شعر میں جو فرق ہے اسے سمجھنے کیلئے ایک مثال ضروری ہے۔

فرض کیجئے مئی جون کا زمانہ ہے۔ دن کے گیارہ بارہ بجے کا وقت ہے۔ گرمی کی شدت ناقابل بیان ہے۔ آپ اپنے ایک دوست کے ساتھ ہانپتے کانپتے، پسینہ میں تر شکار سے واپس آرہے ہیں "اُف آج کی گرمی تو رونگٹے رونگٹے کو جلائے دے رہی ہے!" آپکے دوست نے کہا۔ ابھی آپنے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ آپکے کانوں میں جھن جھن کی آواز آئی۔ "یہ چوڑیاں سی کہیں بج رہی ہیں؟" یہ کہکر آپ اپنے داہنی طرف سڑک پر دیکھنے لگے جہاں کچھ گاؤں کی عورتیں کنکر کوٹنے میں مصروف تھیں جن میں ایک کمسن حسین لڑکی بھی تھی جس کی حالت اس گرمی سے بہت زیادہ ابتر تھی۔" اور اس لڑکی کو تو دیکھو" آپنے جواب دیا۔ "یہ ظلم اور اس آتش بار گرمی میں یہ محنت! بیچاری کے چہرہ کا رنگ تو دیکھو جیسے مرجھایا ہوا پھول ہو"۔ "بھائی یہ پیٹ سب کچھ کرالیتا ہے۔ یہ بھوکے ہندوستان کی اولاد ہے" آپکے دوست نے جواب دیا۔ "یہ تو صحیح ہے" آپ نے پھر کہا "لیکن جو پھول قدرت نے طرب خانوں کی زیب و زینت کے لئے بنایا ہو وہ اس طرح جنگل میں باد سموم سے کملا کر فنا ہوجائے، یہ میری حد برداشت سے باہر ہے"۔ "تو پھر کیا کیا جائے؟" آپکے دوست نے کہا۔ "ہندوستان اب سونے کی چڑیا تو رہا نہیں۔ اب تو روٹی کا سوال ہے اور ایک حسینہ کو بھی اب اس کے حاصل کرنے کے لئے محنت مزدوری کرنی پڑیگی"۔ "ہاں بھائی ٹھیک ہے"۔ یہ کہتے ہوئے آپ چلے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ایک شاعر آتا ہے اور اس منظر سے اس کے دل میں جو جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کا اظہار کرتا ہے وہ بھی سن لیجے:۔

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بیقرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
ہو رہا ہے جذب مہر خونچکاں کے روبرو
کنکروں کی نبض میں اٹھتی جوانی کا لہو
پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہر آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس، مے چمپئی رخسار کی
غم کے بادل خاطر نازک پہ ہیں چھائے ہوئے

عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے

اُف، یہ ناداری اِمرے سینے سے اٹھتا ہے دھواں

آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں!

جسکا جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے

صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے

مفلسی چھانٹے لیے قہر و غضب کے واسطے

جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے

فرطِ خشکی سے وہ لب ترسیں تکلم کے لئے

جنکو قدرت نے تراشا ہو تبسم کیلئے

نازنینوں کا یہ عالم مادرِ ہند آہ آہ!

کس کے جورِ ناروا نے کر دیا تجھکو تباہ؟

سر برہنہ کیوں ہے وہ پھولوں کی چادر کیا ہوئی

اے شبِ تاریک تیری بزمِ اختر کیا ہوئی

جس کے آگے تھا قمر کا رنگ پھیکا، کیا ہوا

اے عروسِ نو ترے ماتھے کا ٹیکا کیا ہوا؟

اے خدا ہندوستاں پر یہ نحوست تابکے

آخر اس جنت پہ دوزخ کی حکومت تابکے؟

دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیئے

اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیئے

"چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار . . . . ہو رہا ہے جذب مہر خونچکاں کے روبرو، کنکروں کی نبض میں اٹھتی جوانی کا لہو . . . عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے" کیا یہ وہی نہیں ہے جو آپکے دوست نے کہا تھا؟

"آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں . . . . صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے" کیا وہی احساسات نہیں جن کا اظہار آپکے دوست نے کیا تھا؟ اور پھر "مفلسی چھانٹے لیے قہر و غضب کے واسطے، جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے" کیا یہ درد کی وہی ٹیس نہیں ہے جو آپ کے دل میں اٹھی تھی؟ کیا یہ سب کچھ ایک عام تجربہ نہیں ہے؟ تو کیا پھر یہ غلط ہے کہ شاعر کسی غیر دُنیا کا باشندہ نہیں؟ اس کا کوئی عمل، اس کی کوئی حرکت درحقیقت خود ہمارے اعمال و حرکات سے مختلف نہیں؟ اور کیا اس کی صحت میں کوئی شبہ ہے کہ جب خود ہم اپنے تاثرات کے اظہار میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہماری گفتگو بھی شعر بن جاتی ہے؟ مگر باوجود اسکے ہم اُس چیز تک نہیں پہونچے جسے عموماً شعر کہا جاتا ہے۔ ہم نے کوئی نظم تصنیف نہیں کی۔ ہم نے وہ نہیں کیا جو جوشؔ نے کیا جب اُنہوں نے "حُسن اور مزدوری" والی نظم لکھی۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جو اُس نے ہم سے زیادہ کی؟

اگر ہم اس نظم کا تجزیہ کر کے غور کریں تو دیکھیں گے کہ سب سے پہلے اس میں بجائے ایک کے چند وجدانات کا اظہار ہے۔ ایک حسین دوشیزہ کا مع اس کے حُسن و شباب اور مشغولیت کے۔ دوسرے خود شاعر کے دلی احساسات کا، حالانکہ یہ احساسات اس نفسانی جذبہ پر مبنی ہیں جو ایک دوشیزہ کو دیکھکر ہر جوان مرد کے سینہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تیسرے ہندوستان کی گذشتہ دولتمندی کا، سب سے آخیر میں اس خدائے رحیم و کریم کا جو اپنی قدرت سے ایک مفلس کو ذرا دیر میں امیر بنا سکتا ہے۔ ایک لمحہ کیلئے شاعر دوشیزہ کے حُسن میں گُم ہو جاتا ہے، اس کی اُٹھتی جوانی کے پر لذت تصوّر میں کھو جاتا ہے۔ پھر اس کے حُسن کو "وقفِ رنجوری" اور اُن مستحقِ تبسم لبوں کو فرطِ خشکی سے محرومِ تکلم دیکھکر تلملا اُٹھتا ہے۔ فوراً اسے تمام ہندوستان کی عام مفلسی اور ہمہ گیر ناداری مجسم تمثیل بنا دیتی ہے۔ پھر اسے ہندوستان کا شاندار زرّیں ماضی یاد آ جاتا ہے اور موجودہ حالت اس کے مقابلہ میں اور زیادہ روح فرسا ہو جاتی ہے اور سب سے آخیر میں وہ اسی ماضی کو دیکھنے کی تمنا اور گرفتارِ رسن کلائی میں کنگن پہنانے کی آرزو میں مرنے لگتا ہے، چیخنے لگتا ہے اور چیخ چیخکر یہی کہتا ہے۔ ع

اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیئے

یہ محض ایک معمولی وجدان یا معمولی وجدانات کے ایک سلسلہ کے اظہار سے بہت زیادہ ہے، یہ ایک زریں اور ریشمیں کپڑا ہے جس پر مختلف خوبصورت تصویریں بنی ہوئی ہیں: دیدہ اور نادیدہ اشیا کی، موجودہ اور گذشتہ احساسات و خیالات کی، مختلف تاثرات و تصورات کی۔ کیا اس میں اُن خیالات کے شمول سے جو صرف تاریخ یا استدلال کا دائرہ عمل ہیں اس نظم کی شعریت میں کچھ نقص یا کمی آ جاتی ہے؟ نہیں۔ نظم کے مختلف حصے ایک وجدان میں جذب ہو گئے ہیں ایک مرکب وجدان ہیں۔ جس طرح نظریہ ارتقا کے مطابق اوّل جمادات میں روح پڑی اور پھر مختلف کیڑوں اور جانوروں سے نسلاً بعد نسلٍ مختلف جانور اور انسان پیدا ہو گئے جو اب پہلے کے مقابلے میں دوسرے ہی مقاصد اور کاموں کے لئے موزوں ہیں اسی طرح یہ مختلف تصورات، احساسات، وجدانات، تاثرات، یہ تصاویر اصلی یا تخیلی اور یہ خیالات اب وہ نہیں ہیں جو

تھے۔ بلکہ شاعر کی روح کی گہرائیوں سے گذر کر بالکل مختلف چیزیں ہیں اور اُن کی شکل و صورت بھی ترقی یافتہ ہے۔ اب وہ پتھر نہیں جاندار ہیں، جانور نہیں انسان ہیں اور انسان بھی ترقی کی بلند ترین سطح پر پہونچے ہوتے۔

ہم میں اور ایک شاعر میں بس یہی فرق ہے کہ ہم سب اپنی اپنی دُنیا میں بناتے ہیں لیکن شاعر ہمارے لئے اُسے دوبارہ تعمیر کرتا ہے۔ وہ اس وقت کے پیمانے سے ناپی جانے والی دُنیا کو لیکر ایک لمحے میں کسی سحر سے ہمارے لئے ایک ایسی دُنیا بنا دیتا ہے جو وقت کی، ماہ و سال کی روش سے آزاد ہوتی ہے کم از کم یہ چیز ہے جو میرے عقیدے میں ایک حقیقی شاعر اپنے کچھ خاص لمحوں میں برابر کرتا رہا ہے اور برابر کرتا رہے گا۔ یہی دُنیا ہے جس کی طرف مولانا روم اشارہ کرتے ہیں۔

جملہ تلوینہا ز ساعت خاستہ است

رست ازیں تلویں کہ از ساعت برست

چوں ز ساعت ساعتے بیروں شوی

چوں نماندی محرم بے چوں شوی

شاعری کی اصلیت و حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد اب آپ یہ دریافت فرما سکتے ہیں کہ آخر شاعری کا فائدہ کیا ہے؟ آخر اس سے کونسا سرور یا تسلی حاصل ہوتی ہے؟ اور آیا یہ سرور یا تسلی شاعر اور قارئین کے لئے یکساں ہے؟ شاعر کی تسکین و مسرت تو ظاہر ہے۔ وہ یہ چیز کم و بیش شعر لکھکر حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن قارئین کی صورت دوسری ہے۔ پبلک کا مقصد زندگی ہے اور آرٹ اُن کی زندگی نہیں۔ حالانکہ صناع کی زندگی یہی ہے۔ وہ شاعر سے محض یہی نہیں چاہتے کہ وہ اپنے وجدانات و جذبات کا کامیابی کے ساتھ اظہار کر دے بلکہ وہ اُس سے اُن احساسات کا دلکش اور پُر اثر اظہار چاہتے ہیں جنہیں وہ خود آسانی سے سمجھ سکیں اور جن کی قدر کر سکیں۔ وہ تقاضا کرتے ہیں کہ شاعر اُن کے سامنے اُن کے اخلاق، اُن کے مذہب اور اُن کی حب الوطنی کے گیت گائے۔ لیکن شاعر کا اخلاق بہ حیثیت ایک صناع کے صرف یہی ہے کہ اپنے آرٹ کی بے غرضانہ خدمت کے سوا اس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اس کے لئے اس کا آرٹ ہی اس کا مذہب اور اس کا وطن ہے۔ ہاں یہ اتفاق ممکن ہے کہ ایک عام انسان کی حیثیت سے اسکے الہامات و وجدانات جن کا وہ اظہار کرے ایسے بھی ہوں جو خود پبلک کے ہوں۔

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا واقعی یہ مذاق کا اختلاف اتنا ہی مستقل اور مکمل ہے؟ کیا شاعری کا پسندیدہ ہونا محض اتفاق پر منحصر ہے؟ کیا ایسی کوئی چیز نہیں جو شاعر اور عوام کی رُوح میں مشترک ہو؟

اس کے جواب کیلئے ہمیں زندگی پر بھی اسی نقطۂ نظر سے غور کرنا ہوگا۔ زندگی کیا ہے؟ ہمیں نہیں معلوم۔ اور نہ موجودہ بحث کیلئے ہمیں اس کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے۔ سر دست ہمارے لئے زندگی کا صرف وہ جزو، صرف وہ پہلو کافی ہے جو ہماری انسانی آنکھ دیکھتی ہے، جو شاعری کا ایک اہم جزو ہے اور جسے بلا استثناء ہر شخص اپنے لئے بھی اہم سمجھتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہم ایک ایسی دُنیا میں ہیں جس میں دو مخالف طاقتیں کام کر رہی ہیں: شعور اور مادہ۔ اور باتوں کے ساتھ یہ دونوں طاقتیں اس بات میں خصوصاً مخالف ہیں کہ مادہ فنا اور احتیاج کا دائرہ عمل ہے لیکن شعور فطرۃً آزادی کی دُنیا۔ اب اُن کی اس مخالفت کا علاج صرف یہ زندگی ہے۔ جو نام ہے شعور کی اُس دائمی اور مسلسل کوشش کا جو وہ مادہ کو اپنے مطلب کا بنانے یعنی آزادی دینے کے لئے کر رہا ہے۔ کیونکہ آزادی ہی سے زندگی ترقی کے بلند ترین مدارج طے کر سکتی ہے۔ خود شناسی کی آرزو اور اس کی تمنا کہ زندگی مع اپنی تمام کیفیتوں اور بوقلمونیوں کے ہماری ہو ہم سب کو آگے بڑھاتی ہے اور جہد البقا کی کشمکش میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ ہم سب ایک ہی رُوح کے قالب ہیں بلکہ ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

یہ کوئی نیا فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو گاہے گاہے اپنی پوری درخشانی کے ساتھ چمکتا ہے اور پھر کسی دوسری شکل میں ظاہر ہونے کیلئے ماند پڑ جاتا ہے۔ برگساں اپنے ایک مضمون (زندگی اور شعور) میں لکھتا ہے "ابتدا سے لیکر انسان تک ارتقائے حیات پر غور کرنے سے ہمیں شعور کی ایک ایسی رَو کا اندازہ ہوتا ہے جو متواتر مادہ کے اندر اس طرح بہتی رہی ہو جس طرح کسی سُرنگ میں"۔ لیکن اس سُرنگ کے سامنے بہت سی رکاوٹیں آگئیں۔ آخر یہ رَو کئی دھاروں میں پھٹ گئی جن میں سے بہت سی سخت چٹانوں سے ٹکرا کر رک گئیں۔ پھر وہ آگے چلکر کہتا ہے "آخر اس سُرنگ کے کھودنے سے فائدہ کیا ہوا؟ آخر شعور نے یہ مصیبت اپنے سر مول ہی کیوں لی؟" پھر جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے "یہ جد و جہد ...

وہ تکلیف دہ ضرور ہے اور بہت زیادہ تکلیف دہ لیکن پھر بھی ہمیں یہ اس کے نتیجہ اور انجام کی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ قیمتی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنے وجود سے نہ محض وہ سب کچھ جو وہاں تھا بلکہ وہ بھی جو وہاں نہیں تھا حاصل کر لیا ہے۔ ہم نے خود کو خود سے بھی زیادہ بلندی پر پہونچا دیا ہے۔ الغرض مادہ، دنیا کا یہ واحد عیب، اعمال روحانی کے لئے بیک وقت رکاوٹ بھی ہے اور باعث تحریص و ترغیب بھی۔

اگرچہ زندگی کی یہ رو لاشعوریت کی سرنگ سے پھوٹ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تاہم اس کے راستہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں ابھی روحانیت کے شعلہ نے وقت، اتفاق اور مقدر کے ان بت وں کو جلا کر خاکستر نہیں کیا ہے جو ہمیں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ زندگی باوجود اس مادی دنیا پر فتح پانے کے ابھی نامکمل منتشر اور غیر تسلی بخش ہے۔

نہ نگہتے، نہ گلے، نے پیام از خارے
دریں چمن بہ چہ دل خوش کند گرفتارے

تو کیا ہمارے پاس اس کا کوئی علاج ہے؟

حفیظ نعیمی

(باقی آئندہ)

پنہاری

کون آئے مجھکو ایسے میں پلک کر تھامنے — آرہی ہے ایک البیلی جمیلہ سامنے
گوری باہوں میں گھڑے کو اس طرح تھامے ہوئے — آرزو میں دل میں کوئی جس طرح تھامے ہوئے
بوجھ سے نازک کمر کھائی ہوئی بل اس طرح — زور دینے سے لچک آئے کماں میں جس طرح
رخ سے اک مدہوش کن رنگِ تمنا آشکار — جیسے غنچوں کے لبوں پر مسکراہٹ کی بہار
کھلکھلاتی سی جوانی، مسکراتا سا جمال — خواب میں جیسے کسی رنگیں زمانے کا خیال
سرخ رخساروں سے کچھ کرنیں سی بکھراتی ہوئی — جیسے اٹھے چشمِ آہو کیف برساتی ہوئی
نرم ہاتھوں کو حنا کے خون میں دھوئے ہوئے — مہر کے جلوے شفق کی گود میں سوئے ہوئے
ریشمیں زلفیں حسیں گالوں پہ بل کھاتی ہوئیں — جیسے کالی بدلیاں سورج پہ لہراتی ہوئیں
ہر نفس نزہت بداماں، ہر نظر بندہ نواز — جس طرح محمود کی نظروں میں تصویرِ ایاز

آہ یہ رنگیں جوانی اُف مجسم دلبری
کر رہی ہے جسم میں پیدا مرے اک تھرتھری
ہائے یہ بیخود فضائیں آہ یہ شانِ حبیب،
کاش یہ سادہ تمدن شاعروں کو ہو نصیب

الطاف مشہدی

آئس کریم

سائکل سے گر کر آپ کو کتنی ہی سخت چوٹ کیوں نہ آئے۔ فٹ بال کے کھیل میں قلا بازی کھا کر آپ کے سر کے متعدد ٹکڑے کیوں نہ ہو جائیں، سَو گز کی دوڑ میں ٹھوکر کھا کر آپ اپنے کتنے ہی دانت کیوں نہ شہید کر لیں، مگر دیکھنے والے ایک بار ضرور ہنسیں گے۔ ایک فرمائشی قہقہہ ضرور لگائیں گے۔ اور آپ کا مذاق اُس وقت تک ضرور اُڑاتے رہیں گے جب تک اُنہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ خدانخواستہ آپ کسی ضرب شدید کے حامل ہوئے ہیں اور آپ کی زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش ہے۔

اسی طرح بعض بیماریاں ہیں جو اگرچہ انتہائی شدید مگر اپنی نوعیت کے لحاظ سے حد درجہ مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بزرگ قفلی کی ایک شاندار دعوت کا ذکر بڑے مزے لے لیکر کیا کرتے تھے۔ ابتدا اس کی یوں ہوتی تھی کہ شائقین کا مجمع ہے۔ اعزا اور احباب کی محفل گرم ہے۔ قفلی کی دعوت ٹھہرتی ہے اور اس شان کے ساتھ کہ آج ہر متنفس کوشش کرے کہ کوتاہی داماں نہ ہو جائے تو بات ہی نہ رہی۔ ساز و سامان شروع ہوتا ہے۔ ٹین کے ہزاروں ڈبے جمع ہیں قفلیوں کے گھان پر گھان اُتر رہے ہیں۔ آتشِ شوق برف کی خنکی سے بجھائی جا رہی ہے۔ کسی نے چار ڈبے کھائے۔ کسی نے چھ عدد نوش کئے اور کوئی پیٹ کا دھنی آٹھ کے بعد بھی شاکی نظر آتا ہے۔ جا بجا حملے ہی ہو رہے ہیں۔ دوستانہ جنگ و جدال کے نقشے بھی نظر آ رہے ہیں۔ بحث و مباحثے کی گرما گرمی بھی جاری ہے۔ کسی طرف قفلی کی تعریف میں قصیدہ خوانیاں ہو رہی ہیں، کہیں میزبان کی سخاوت سامانِ مدح مہیا کر رہی ہے۔ اور قفلی والا بھی سلام کر کر کے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔ غرض قفلی کی دعوت پورے سامانِ نشاط کے ساتھ آئی اور ہر شریک محفل کو مست و بیخود بنا گئی۔

لیکن اگر ہنسی کے بعد رونا اور رنج کے بعد راحت نہ ہو تو خوشی کا جذبہ دُنیا سے ناپید ہو جائے۔ اس لئے ضروری تھا کہ قفلی کا مزہ پوری طرح چکھا جائے تاکہ کھانے والے اپنے ذاتی تجربہ سے اُس کے حُسن و قبح کے متعلق رائے قائم کر سکیں۔ چنانچہ قفلیوں کا دَور ختم ہوتے ہی دست و قے کی باری آئی۔ پوری محفل ہنگامۂ محشر بن گئی۔ ہاتھ سے لوٹا نہیں چھوٹتا مگر زبان پر اللہ ہی اللہ ہے۔ ایک طرف قے اور متلی کی آواز سُنائی دیتی ہے تو دوسری طرف یٰسین اور قل ہو اللہ شریف کا ورد جاری تھا۔ حکیم آئے۔ ڈاکٹر دوڑے، دوا علاج ہوا۔ اور سب اچھے ہو گئے مگر قفلی کی دعوت نہیں بھولتی

یہ قصہ تو سُنا تھا اور راوی کے ثقہ ہونے پر بھی یقین تھا۔ مگر عین الیقین اور حق الیقین کا امتیاز باقی تھا۔ کل کے واقعہ نے یہ پردہ بھی اُٹھا دیا۔ ڈائننگ ہال کے ستم رسیدہ طلبا۔ کھانے پر ہمیشہ جان دیتے ہیں۔ پھر اگر آئس کریم ایک آنے پلیٹ بکنے لگے تو کون جاں بحق تسلیم نہ ہو جائے۔ ایک بڑے میاں، خدا اُن کی مغفرت کرے (اس لئے کہ اب اُن کو بورڈنگ میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔) عرصہ دراز سے آئس کریم بیچا کرتے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ لوگ اُسے ذائقہ کے لئے کھاتے تھے یا محض اوقات گذاری اور تفننِ طبع کے لئے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ دو ڈیڑھ سو پلیٹیں روز بک جاتی تھیں۔ بڑے میاں کی عادت تھی کہ بلا تکلف جس کمرے میں جی چاہتا داخل ہو جاتے۔ اور بلا آئس کریم کھلائے واپس ہرگز نہ آتے۔ آپ ہزار نہیں نہیں کرتے رہیں مگر انہوں نے مشین کے دستے پر دو ہاتھ گھمائے اور ایک پلیٹ آئس کریم آپ کے سامنے رکھ دی۔ چار و ناچار بزرگی کا پاس لذت دہاں لئے بہانہ ہوتا۔ اور جب ایک پلیٹ کھالی تو دو اور چار کی قید کہاں باقی رہ سکتی تھی۔ ہر روز یہی ہوتا۔ بڑے میاں چلے جاتے تو آئس کریم نہ کھانے کی نیتیں باندھی جاتیں اور دوسرے دن یہ ہزار صدق دل توڑ دی جاتیں۔

حسبِ معمول کل بھی بارہ بجے دن سے بڑے میاں کا چکر شروع ہوا۔ کیلے کی آئس کریم بڑی بڑی تعریفوں سے کھلا رہے تھے۔ پُرانے گاہکوں کو چار کے بجائے چھ چھ پلیٹیں پیش کیں اور موقع پا کر بعض نئے لوگوں کو بھی چرب زبانی کا شکار بنایا۔ دو بجے تک

ن کا اساسہ ختم ہو گیا اور انہوں نے اپنے گھر کی راہ لی۔ اس کے بعد جو کچھ ان کے گاہکوں پر گذری اس کا ذکر کوئی شہیدِ آئس کریم ہی کرتا تو خوب ہوتا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میری حیثیت تماشہ بینوں سے زیادہ نہیں۔ اس لئے جگ بیتی کو ہنس ہنس کر بیان کر رہا ہوں۔

شام ہوئی تو ایک دوسرا ہی نظارہ تھا۔ جوق درجوق طلبا ہسپتال کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ کوئی تانگے پر لٹکا ہوا کراہتا جا رہا ہے کوئی یکے پر پیر پھیلائے لیٹا ہے۔ کسی کی حالت اتنی نازک ہے کہ لوگ اسٹریچر پر لاد کر لے جا رہے ہیں۔ چھ بجے شام سے لیکر بارہ بجے رات تک مریضانِ آئس کریم کا تانتا بندھا رہا۔ ہوسٹل خالی ہوتے رہے اور ہسپتال کی آبادی بڑھتی رہی۔ مرض کی یہ حالت کہ قے اور دست کا سلسلہ بند ہونے میں نہ آتا تھا۔ جس نے بیس پچیس کے بعد نجات حاصل کر لی اسے گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا مریض تو صرف وہی تھے جن کا اوسط ساٹھ اور ستر کا تھا۔

اب آیئے ایک چکر وارڈ کا بھی رہے۔ ہسپتال کا قاعدہ ہے کہ مرض کے لحاظ سے وارڈ کی تقسیم کی جاتی ہے۔ بخار کا وارڈ۔ ہیضہ کا وارڈ۔ چیچک کا وارڈ وغیرہ۔ غرض تمام امراض کے لئے جدا جدا وارڈ موجود ہیں۔ مگر آئس کریم کا وارڈ کہیں نہیں۔ برآمدوں میں قطار سے چارپائیاں بچھادی گئی ہیں۔ پچاس کے قریب مریض پڑے ہیں۔ گرم و سرد آہیں جاری ہیں۔ ابھی زندہ ہیں مگر کل کی خبر نہیں۔ کمپاونڈروں اور نرسوں کے بھی حواس باختہ ہیں۔ یہ لیجئے ڈاکٹر صاحب دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ آئس کریم نمبر ۱۴ کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں۔ بچنے کی امید نہیں معلوم ہوتی۔ گرم بوتلیں لگائی جا رہی ہیں۔ دوائیں دی جا رہی ہیں۔ نبضیں گنی جا رہی ہیں۔ ادھر کچھ جان میں جان آئی تو دوسری طرف سے شور اٹھا۔ آئس کریم نمبر ۹ کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اب مریض رو بہ صحت ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہنستے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔ شہیدانِ آئس کریم اب غازیوں کے زمرے میں شامل ہو گئے ہیں۔

مگر آئس کریم اب یہاں مشین سے تیار کی ہوئی دودھ بالائی یا کیلے کے برف کا نام نہیں رہا بلکہ ایک مرض کا نام ہے، جو "ٹومین پائزن" (　　　) سے پیدا ہوتا ہے۔ ماہرینِ طب کو اپنی لغت میں اضافہ کر لینا چاہیئے۔

ریاض الدین احمد

دوشیزۂ چمن

کل گیا تفریح کو میں باغ میں وقت سحر　　پھول تاروں کی طرح چھلکے ہوئے آئے نظر
ایک رشکِ گل کو دیکھا گل سے ہم آغوش ہو　　گاہ بردوشِ چمن ہے گہ چمن بردوش ہے
کھیلتی ہے ہر قدم پر اُس کی ٹھوکر سے بہار　　ہو رہے ہیں پھول اُس کی مسکراہٹ پر نثار
شوخیٔ رفتار سے اک حشر برپا ہو گیا　　ڈھونڈتا تھا میں سکونِ قلب، دل بھی کھو گیا
ہائے وہ رنگین ادا شوخی سے بل کھاتی ہوئی　　چاند سے رُخ پر سیہ زلفوں کو لہراتی ہوئی
گل کو پیروں سے مسل کر دلرُبا انداز سے　　لیکے انگڑائی چلی ہنستی خرامِ ناز سے
عشق سے ناآشنا اٹکھیلیاں کرتی ہوئی　　پیکرِ گل میں نظر سے رنگ و بو بھرتی ہوئی

پھول چن کر باغ سے رخصت ہوئی جانِ بہار
خود گئی ہنستی ہوئی محسن کو چھوڑا اشکبار

محسن اعظم گڑھی

کتاب پر مقدمہ

اِس کتاب کے فاضل مصنف نے مجھ ہیچمداں و ہیچمیرز سے خواہش کی ہے کہ آپ کی اس قابل قدر تصنیف پر مقدمہ لکھدوں۔ اگرچہ میں اپنی بے بضاعتی کے سبب اس قابل نہیں تھا کہ اتنے بڑے کام کو اپنے سر لوں۔ پھر بھی بہ تقاضائے دوستی قبول کر لیا۔ سچ ہے کہ دروازے کے بغیر مکان، باتوں کے بغیر عورت اور مقدمہ کے بغیر کوئی کتاب نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ فن جتنا عام ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ پھر، منِ خراب کجا و صلاحِ کار کجا۔ یہ فاضل مصنف کی ذرہ نوازی ہے کہ مجھی کو اس قابل سمجھا۔ اس سے پہلے بھی کئی حضرات نے خاکسار کو اس قسم کی فرمائشوں سے مفتخر فرمایا ہے۔ چونکہ اتنی فرمائشوں یا خطوط کا انفرادی طور پر جواب دینا میرے لئے دشوار ہو رہا ہے، ان کی قدر افزائی یا مزاج پُرسی کا شکر کرتے ہوئے ایک ایسے مقدمہ کا اعلان کر دیا ہے جو ذرا سی ترمیم کے بعد ہر شخص کے کام آسکے۔

زیرِ نظر کتاب مُلک کے ایک مایۂ ناز اور قابل فخر شاعر و نثر نگار، ڈراما نویس و ایکٹر، پروفیسر و حکیم کی وہ معرکہ آرا تصنیف ہے جس کا مقابلہ کرنے کی دُنیا کے بہت کم لوگوں میں ہمت ہے، اور جس کی گلی گلی دھوم ہے اور کوچہ کوچہ ترانے گائے جاتے ہیں۔

قابل مصنف کی ہستی محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ ایک نہایت ہوشیار و چالاک، جوشیلے نوجوان ہیں۔ والدین کا سایہ بچپن سے اُٹھ گیا تھا۔ اس لئے آپ نے محلے کی ایک میراثن کی گود میں پرورش پائی ہے۔ والدِ محترم مشائخ پیشہ تھے لیکن چونکہ آپ کو بچپن سے ادبیاتِ عالیہ کا ذوق تھا۔ اب بڑے پروفیسر ہو گئے ہیں۔

جامعہ علمیہ ہی کے ایک ہونہار سپوت ہیں، اور اپنی فطری قابلیت کے سبب کافی ڈگریاں بھی حاصل کر چکے ہیں۔ خوبصورت بھی ہیں۔ جنہیں شوق ہو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ غرض قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو سارے دکن بلکہ ساری دُنیا کے لئے غنیمت ہستی ہیں، ورنہ (افسوس ہے کہ) کچھ بھی نہیں۔

آپ نہایت خوش اخلاق، وسیع مشرب اور سادہ آدمی ہیں، اور ہر چیز میں تناسب و اعتدال کو پسند کرتے ہیں، چنانچہ جب کبھی جلد جانا ہوتا ہے تو تیز چلتے ہیں، نہیں تو معمولی رفتار سے ہی۔ ابتداءً ڈاڑھی، مونچھ دونوں کترواتے تھے، اور اب دونوں مُنڈوالتے ہیں۔ پہلے شیروانی کی رعایت سے پاجامہ پہنتے تھے اور اب کوٹ کے تناسب سے پتلون زیب تن فرماتے ہیں۔

حال ہی میں آپ لندن بھی ہو آئے ہیں۔ علمی قابلیت کے متعلق تو ابھی کئی مستشرقین تحقیقات کر رہے ہیں، لیکن مشرق و مغرب کے اتصال سے آپ نے جو خاص خیالات، اور خاص تمدن پیدا کر لیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کی آزادی اور صلح کلی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اور آپ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ سارے ابنائے وطن کو اسی مشرب پر لے آئیں۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت باوجود عزیزوں کی مخالفت کے آپنے ایسی لڑکی سے شادی کی ہے جس کے باپ مسلمان ہیں اور ماں انگریزنی۔ اُمید ہے کہ اس امتزاج سے بھی آپ کو کافی مدد ملے گی۔

ملک و قوم کی خدمت کے لئے اِس ہونہار نوجوان نے اپنی ساری عمر وقف کر دی تھی، مگر اب نزلہ و زکام کے سبب مجبور ہو گئے ہیں۔ خصوصاً ادبیات کی جو گراں قدر خدمات آپنے انجام دی ہیں، وہ، اگر کوئی پڑھنا چاہے تو دکن کی سیاسی تاریخ میں زریں حروف سے لکھی جائیں گی۔

آپ کا "حب الوطن" خاص خاکِ پاکِ دکن ہے، مگر چونکہ ابھی "ملکی صداقت نامہ" نہیں ملا، اس کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ فی الحال کوئی کام بھی نہیں ملا، اسلئے سردست ملازمت کی فکر شروع کر دی ہے۔

مختصر یہ کہ آپ بہت مشہور ہیں اور ہر جگہ مل سکتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب آپ ہی کا نتیجۂ قلم ہے۔ ایک شہرۂ آفاق اور اعلیٰ درجے کی علمی و فنی و اصلاحی و مذہبی و معاشری و سیاسی و

فلسفی و ادبی و ڈاکٹری وطبی کوشش ہے۔ جو مصنف کی غیر معمولی یا خلافِ وضعِ فطری قابلیت پر دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ مصنف نے نہایت قلم برداشتہ لکھی ہے مگر جگہ جگہ سے دماغی کاوشوں کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ خاص مادری زبان میں لکھی گئی ہے، اور طویل سے طویل جملوں میں مختصر سے معنے اس خوبی سے پہنائے گئے ہیں کہ گویا دریا میں کوزہ بند کر دیا ہے۔

ٹائیٹل پیج کی صفائی، کتاب کی روانی، جملوں کی سلاست، الفاظ کا میل ملاپ اور حروف کا توڑ جوڑ، ایک نمایاں و نادر حیثیت رکھتا ہے، اس پر مستزاد آپ کا خاص اندازِ بیان ہے جو عوام کی ملک ہوتا ہوا بھی خاص آپ ہی کا طرز ہے۔ مضامین کی بلندی، مطالب کی عام فہمی، اور مسائل کا انکسار اس میں چار چاند لگا رہے ہیں اور کئی جملے اور الفاظ ضرب المثل کا کام دے سکتے ہیں۔

اتنی وسیع النظری سے کام لیا گیا ہے کہ بے ساختہ فاضل مصنف کی داد دینی پڑتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کائنات کے سارے موضوع اور مسائلِ حاضرہ و غائبہ و مستقبلہ پر یکساں حاوی نظر آتی ہے۔ ایک طرف سیاسی مسائل پر اس خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہر شخص اس کو پڑھکر مسولینی و ہٹلر بن سکتا ہے۔ تو دوسری طرف عاشقانہ مضامین میں وہ سوز و گداز بھرا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے خون کی ندیاں بہہ جائیں۔ فلسفیانہ مسائل کو تو اس خوبی سے حل کیا گیا ہے کہ جس جملے یا بات پر سے گذریئے، اس کا نقشہ نظروں کے سامنے آتا جاتا ہے۔ اور جہاں طبی مسئلوں پر تحقیق کی گئی ہے، وہاں اتنی مفید معلومات فراہم کر دی ہیں کہ کتاب ختم ہونے سے پہلے بوڑھی سے بوڑھی عورت و مرد کا شباب عود کر آئے۔

غرض کہاں تک لکھیں۔ اس سے زیادہ تعریف کرنا ہم خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں۔ جب آپ خود ایک نسخہ منگا کر آزمالیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ کتاب کتنی مجرب و آزمودہ ہے۔ صرف ایک بار آزمائش شرط ہے۔ فائدہ نہ ہو تو دام واپس۔ نمونہ مفت طلب کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان بلکہ سارے جہان کے اخبارات و رسائل نے بہترین ریویو کیا ہے۔ اپنے موضوع پر اپنی زبان میں پہلی کتاب ہے، کتاب کی اہمیت اسی سے واضح ہو جائے گی کہ لکھنے سے پہلے ہی کئی آرڈر مختلف قیمتوں پر رجسٹرڈ ہو چکے تھے۔ پھر یہاں تک تقاضے بڑھے کہ مجبوراً قانونی چارہ کار اختیار کرنا پڑا تب کہیں جا کر یہ سیلاب تھما۔ کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں، اور اب تو یہ حال ہے کہ اس کی شہرت سنکر دُور دُور سے لوگ اس کتاب کو دیکھنے آ رہے ہیں۔

چونکہ آپ نے کتاب خالص علمی خدمت کی غرض سے لکھی ہے، نہ کہ پیسے بٹورنے کیلئے، کوئی قیمت مقرر نہیں کی گئی۔ جو صاحب جو قیمت ہدیۃً پیش کرینگے قبول کر لی جائے گی۔

دیکھا جا رہا ہے کہ آج کل بہت سی نقلی کتابیں بھی اصلی نام سے چھپنے لگی ہیں۔ اس لئے ناظرین کو اطلاع دیدی جاتی ہے کہ اصلی ٹریڈ مارک دیکھے بغیر کوئی صاحب اس کتاب کو نہ خریدیں۔ ورنہ نقصان کی ذمہ داری کسی پر نہ ہوگی۔ ع۔

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

کاغذ چکنا ہے، حروف چمکدار ہیں، اور کتابت نہایت دیدہ زیب ہے۔ تقطیع چھوٹی ہے اور لکھائی بڑی۔ حروف بغیر عینک کے بھی ساف دکھائی دیتے ہیں۔ اور عینک سے تو گویا پڑھے بھی جا سکتے ہیں۔

مصنف اور کتاب کا نام زیرِ طبع ہے۔ عنقریب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر "جلوہ پاشِ عالمتاب" ہوگا۔ فقط باقی خیریت بالشافہ۔

سید علی شاکر۔ ایم۔ اے۔

علّامہ سر محمد اقبالؒ

جمیع ہند کی آشفتہ حالی — غدر کے بعد سے ناگفتہ بہ تھی
مسلمانوں کی حالت نحس تر تھی — ابھی برہم ہوئی تھی بزم ان کی
دماغوں میں گذشتہ شانِ عظمت — نظر میں نقشۂ دورِ حکومت
وہی اطوار تھے، عادت وہی تھی — عنانِ سلطنت پر چھن گئی تھی!
غلامی تھا ہر اک اپنا پرایا — سروں پر نکبت و ذلت کا سایہ
ملکدّرنیت ابنائے زمن کی — عنادانہ روش اہلِ وطن کی

اگر یہ کیفیت پیشِ نظر ہو
نہ کیونکر چشمِ شاعر نوحہ گر ہو!

یہ باعث تھا جو حالی نوحہ خواں تھا — انہیں جذبات کا وہ ترجماں تھا
مسلمانوں کے غم کا مرثیہ تھا — زوالِ قوم پر صرف بکا تھا!

پھر اس کے بعد آیا وہ زمانہ — تھی جس میں کیفیت امید افزا
ہوئی تب فکر یہ اربابِ دل کو — بھلا دیں ہنس کے رنجِ جانگسل کو
کریں کچھ طنز کی باتیں دلوں سے — نکالیں کام شیریں نشتروں سے
جو دل پژمردہ ہوں برمائیں انکو — مزاحاً چھیڑ کر چونکائیں ان کو

روش یہ اکبرِ مرحوم کی تھی
مزاح و طنز میں تھی نکتہ چینی

مگر قدرت نے جب یہ حال دیکھا — کہ مسلم خوابِ غفلت سے نہ چونکا
دعا خالی گئی ہر اہلِ دل کی — نہ کارآمد ہوئی تدبیر کوئی
صدا یہ عالمِ بالا میں گونجی — کہ "مرضی ہے یہ رب العالمیں کی
کہ ہو تخلیق ایسا انقلابی — عدیم المثل ور آتش نوائی
مسلمانوں کو جو ہوشیار کر دے — دلوں کو جذبۂ قومی سے بھر دے
اثر ہو یہ زبانِ سحر فن میں — حرارت پھونک دے ہر مُردہ تن میں
بھرا ہو زور یہ اُس کے قلم میں — کہ برپا کر دے محشر ایک دم میں
نکالے کام نشتر کا زباں سے — رگِ خوابیدہ کو بیدار کر دے"

ہیولیٰ اس کا یوں تیار ہوئے — مرکب زبدۂ اربابِ فن سے
حکیمانہ روش ہو نیٹشے کی — ہو گیٹے کے تخیل کی بلندی
قلم میں حق نگاری شیکسپیر کی — بیاں میں کیٹس کی رنگیں طرازی

مجسّم شعریت ہو مثل شیلے | چسک آہ و فغاں میں بائرن کی
اثر سعدی کا، فردوسی کا انداز | فغانِ دل نشیں میں میر کا ساز
محاکاتِ انیس و سوزِ حالی | اسداللہ خاں کا فکرِ عالی"

مرتب جب ہوئے یہ سب عناصر | ہوئی ترکیب جسم و روحِ شاعر
ملائک بہرِ نظارہ جو آئے | متأثر ہو گئے حیرت سے چہرے
کیا یہ عرض ربّ العالمیں سے | کہ یہ تشویش ہے دل کو ہمارے
بلا کا سحر ہے اس کی زباں میں | وفورِ انقلابیت بیاں میں

کہیں یہ منقلب عالم نہ کر دے
جہاں کو درہم و برہم نہ کر دے"

جواب آیا کہ "تم واقف نہیں ہو | یہ بھیجا جائیگا ہندوستاں کو
وہاں مسلم ہے محوِ خوابِ غفلت | تن آسانی میں ننگِ آدمیت
غریقِ بختِ و افلاس ہوں | خدا کے فضل سے بے آس ہو وہ
یہ بھیجا جا رہا ہے اس غرض سے | کہ اسکو خواب سے بیدار کر دے!"

یہ ہے اقبال کی خلقت کی غایت
کلامِ اس کا ہے پیغامِ حقیقت!!

یوسف رضا بدایونی

حکیم نابینا صاحب کے جانشین حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری

ایشیا کے طبیب اعظم حضرت لقمان الملک حکیم حافظ محمد عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا صاحب نے طب یونانی کی جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں اُسے ہندوستان کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ آپکو یونانی طب میں ایک ایسے جدید طریقہ علاج کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے جس نے دیسی طب میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا ہے۔

حکیم نابینا صاحب کی ان گرانمایہ کارناموں کی قدر کرتے ہوئے اعلیحضرت حضور نظام نے آپکو دہلی سے حیدرآباد (دکن) بلالیا ہے جہاں آپ افسرالاطبا کے عہدہ پر سرفراز ہونیکے بعد دیسی طب کو مزید ترقی دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ برطانوی ہند کے باشندوں کیلئے حکیم نابینا صاحب جیسی نادر ہستی سے محروم ہوجانا اگرچہ بیحد محسوس کیا جارہا تھا لیکن حکیم نابینا صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری نے اپنے کمالات سے اہل ہند کو یہ بتادیا کہ وہ کسی صورت میں اپنے والد بزرگوار حکیم نابینا صاحب سے کم نہیں ہیں۔ حکیم صاحب کے چلے جانیکے بعد آپ بدستور حکیم صاحب موصوف کے مطب کو سنبھالے ہوئے ہیں اور آپکے مطب سے ہزارہا بندگان خدا اسی طرح فیض حاصل کررہے ہیں جس طرح حکیم نابینا صاحب کے زمانہ میں حاصل کرسکتے تھے۔ حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری کیونکہ مشرقی فن طب کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے بھی اچھی طرح سے واقف ہیں اس لئے توقع کی جارہی ہے کہ آپ اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دیسی طب کیلئے مزید ترقیوں کا باعث ہوں گے۔ ہم کو یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ آج حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری کے مطب سے والیان ریاست سے لیکر غربا تک اسی طرح فیض حاصل کررہے ہیں جس طرح کہ حکیم نابینا صاحب کے مطب سے فیض اُٹھاتے تھے۔ آپ کا مطب اُردو منزل متصل نشاط سنیما دہلی واقع ہے۔

میرا فرض!

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو میں مسلمانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مسجدوں، مدرسوں اور یتیم خانوں کیلئے آئے دن چندہ اور امداد طلب کی جاتی ہے جس میں صاحبِ استطاعت حضرات دل کھولکر اپنی فیاضی کا ثبوت بھی دیتے ہیں لیکن زیادہ تر اس معاملہ میں شکایت اور شک کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ اہل کرم اس معاملہ میں زیادہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں پھر بھی شکایات کہیں کہیں بجا طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

میری آبائی بستی موضع "صالح پور نمیچہ" میں ہے۔ جہاں کے لوگ جاہل اور مذہبِ اسلام سے محض ناآشنا ہیں۔ ایک مدت سے مُفلسی اور تنگدستی کے شکار ہیں۔ بے علمی اور مسائل اسلامی سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں کے باشندے پڑھنے لکھنے کو بڑی بدشگونی تصور کرتے ہیں یہاں "جو پڑھتا ہے وہ سرسبز نہیں ہوتا" یہ جاہلانہ خیال ابھی تک وہاں کے اکثر لوگوں میں باقی ہے۔ اس بنا پر میں جبکہ کسب معاش کی غرض سے اپنے وطن سے دُور رنگون (برہما) میں پڑا ہوں۔ اپنے ہمسایوں اور اہل وطن کیلئے علمی خدمت کیسے کر سکتا ہوں۔ پھر میری اتنی حیثیت نہیں کہ میں وطن والوں کی تعلیم کا ذاتی طور سے بندوبست کرسکوں۔ اس لئے "میرا فرض" تھا کہ میں برادرانِ اسلام سے درخواست کروں کہ انہیں اس موقع پر جہالت اور خام خیالی کے گڑھے سے نکالیں۔

چونکہ میرے موضع میں ایک شریف اور تعلیم یافتہ بیوہ رہتی ہیں۔ اُن کے علمی ذوق اور مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کا جذبہ ایسا ہے کہ وہ موضع کے بچوں اور بچیوں کو ایک جگہ جمع کر کے جن کی موجودہ تعداد چوبیس ۲۴ ہے، پڑھاتی ہیں۔ اس بات کو میں نے پہلے پہل جناب سید کشفی شاہ صاحب نظامی سے اُن کے متعلق کہا اور انہوں نے ازراہِ غریب نوازی اُن بیوہ معلّمہ کو پانچ روپے ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا اور پانچ روپے انہوں نے مسماۃ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں مرحوم کے نام محض علمی کفالت کیلئے روانہ بھی کر دیئے۔ اگر اسی طرح اہلِ خیر حضرات بھی توجہ فرمائیں تو معلّمہ صاحبہ جو لاوارث اور بیکس مگر شریف اور پردہ نشین ہیں اُن کے گزارے کی صورت بھی ہوجائے گی اور ایک اسلامی اسکول جس کا نام "مدرسہ کشفیہ نظامیہ" میں نے تجویز کیا ہے وہ چلتا رہے گا۔ جس میں مسلمانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہوتی رہے گی۔ جو صاحب زرِ نقد سے امداد کرنا چاہیں وہ انہیں معلّمہ کے نام حسب ذیل پتہ پر روانہ کرکے عنداللہ ماجور ہوں:۔

پتہ:۔ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں مرحوم۔ موضع صالح پور نمیچہ۔ ڈاکخانہ روناہی ضلع فیض آباد

الملتمس

عبدالرزاق خاں نظامی فیض آبادی ایجنٹ اخبارات۔ رنگون (برہما)

فسانۂ زمانہ ہندوستان کی موجودہ تہذیب کی روشنی میں
لمر پولوک جہاں پر مشہور ادیب خواجہ عبدالمجید دہلوی کی لکھی ہوئی زبان میں نہایت دلچسپ اور مزاحیہ اسکیچ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ قیمت ۸ر

انشائے لطیف اردو کے انشاء پرداز مسٹر لطیف الدین احمد جنہیں اکثر ارباب ذوق ل۔ احمد کے نام سے جانتے ہوں گے ہمارے ملک کے زبردست افسانہ نگاروں میں ہیں انشائے لطیف میں آپ کے پندرہ افسانے شائع ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ کا ہر افسانہ آپ کو ایک دوسرے عالم میں پہنچادیگا۔ کتاب پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور مجلد ہے۔ قیمت عگار

ویرا ایک روسی محب وطن خاتون آسکر وائیلڈ کے مشہور ڈرامہ کا جو مرقع ہے زاریت کی ستم رانیوں اور جفاکاریوں کا۔ قیمت ۹ر

ہمایوں نامہ (باتصویر) شہنشاہ اعظم ہمایوں کی مستند سوانح عمری خود ان کی بہن گلبدن بیگم کی لکھی ہوئی ترجمہ از سید ابن حسن شادق بی اے بی ٹی قیمت ۶ و ۱۲ر

حبش و اطالیہ حبش کی مکمل تاریخ، جغرافیہ حبش تہذیب و معاشرت حبش کا دور خاطر حبش و عرب حبش اور اطالیہ لیگ، استعمار اور حبش مستقبل۔ غرض حبش اور اطالیہ کے جدید و قدیم حالات کا مرقع از اختر حسین رائے پوری۔ قیمت عہ

پستالوزی از قاضی عبدالحمید ایم اے پی ایچ ڈی جس طرح یورپ کے عہد جدید میں کوپرنیکس نے ہیئت اور کولمبس نے جغرافیہ کا نقشہ بدل دیا، اسی طرح "پستالوزی" نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی

زندگی اس کے فلسفۂ تمدن اس کے تعلیمی نظریئے اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سلیس زبان اور دلکش انداز بیان میں ملاحظہ فرمائیے قیمت عہ

معاہدۂ عمران از شاں ژاک روسو مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین ایم اے پی ایچ ڈی حریت، اخوت اور مساوات جس کا روحانی پیام دنیا کو اسلام نے پہنچایا تھا اسکی سیاسی تبلیغ یورپ میں روسو کے معاہدۂ عمرانی نے کی۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ سیاست مدن کے دقیق مسائل بالکل باتوں میں سمجھا دئیے ہیں اس کی یہ

بیان کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

لیلےٰ کے خطوط مع روزنامچہ
ملک کے مشہور ادیب قاضی عبدالغفار کا قابل قدر کارنامہ۔ دونوں کتب میں فطرت انسانی کے دو متلون عکس اور کتاب زندگی کے دو مختلف نقوش ہیں ایک غم نصیب عورت کی فریاد ہے اور دوسری عیش پرست مرد کی داستان ہے۔
قیمت صرف عہ

طوفان ظرافت مزاحیہ قصائد کا چھوٹا سا مجموعہ اس طرز کے قصائد آج تک اردو زبان

عورت غلط راستہ پر پڑ جانے کی وجہ سے کس قدر مصیبتوں میں مبتلا ہوتی ہے اور اس کا دلچسپ انجام۔ قیمت ۸ر

نجمہ نوری ماں کی مامتا سے متعلق ایک دلدوز تمثیل نجمہ کی المناک سرگذشت مامتا کی ماری کس طرح تڑپتی پھرتی ہے گناہ کی لرزہ خیز تصویر

سلمیٰ آسکر وائلڈ کی تمثیل "سالومی" کا ترجمہ حسن خوں آشام کی ہوسناکی اور موت تخیل اور طرز بیان خاص چیز ۸ر

چار چاند دلی کی ٹکسالی اور نکھری ستھری زبان کا لطف اگر آپ اٹھانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو طلب کیجئے جو حضرت فراق مرحوم کی تصنیف ہے۔ ۸ر

عروس ادب قاضی عباس حسین صاحب ظریف کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جو بہت پسند کیا گیا ہے ہر افسانہ سیدھی سادی اردو میں لکھا گیا ہے۔ واقعات تمام معاشرتی اور اصلاحی ہیں پلاٹ بہترین۔ قیمت عہ

چندرا موہنی حسن و عشق کی داستان خونچکاں محبت کا مذہب ہمیں کیا سکھاتا ہے۔ سچے عشق کی المناک کہانی مؤثر اور مفید قیمت عہ

دلی کا آخری دیدار ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے دلی کی سوسائٹی کیا تھی۔ لال قلعہ آباد تھا تو چمنستان میں کیسی بہار تھی سو سال پہلے کی ایک جھلک دیکھئے۔ قیمت ۱۲ر

لال قلعہ کی ایک جھلک
لال قلعہ کے عجیب و غریب واقعات جن کو پڑھکر آپ مسرور بھی ہوں گے اور حیرت زدہ بھی۔ قیمت عہ

کبیر جنم ساکھی مشہور ہندی شاعر کبیر داس کی سوانح عمری اور ان کا کلام قیمت عہ

سیر خرابات قیمت ۶ر

عجیب الطرفین قیمت عہ

آپکے فائدہ کی بات

ہم اپنی مطبوعات پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف کر سکتے ہیں بشرطیکہ (الف) فرمائش مبلغ پانچ روپے سے کم نہ ہو (ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیش گی ارسال کی جائے اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسروں کی کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ دس روپے سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔ البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتی یہ ممکن نہ ہو گا۔ ایسی کتابیں بہت کم ہیں۔ مکمل فہرست کتب ایک کارڈ لکھکر مفت طلب فرمائیے۔

کتب خانہ علم و ادب دہلی

کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفۂ سیاست کی سب سے اہم کتاب ہے قیمت عگار

گلبدن بیگم ہمایوں کی بہن اکبر کی پھوپی شہنشاہ بابر کی بیٹی کی مستند جامع سوانح عمری جسکا ماخذ انگریزی و فارسی کی معتبر و مستند کتابوں سے ہے جس میں تینوں عہد کے جامع و مکمل حالات دکھائے گئے ہیں۔ مع پانچ فوٹو۔
قیمت ۱۲ و ۸ر

حجاج بن یوسف جرجی زیدان کے ناول کا شستہ زبان میں ترجمہ اس میں اسلامی تاریخ کا ایک پہلو بہترین انداز میں

میں نہیں لکھے گئے۔ قیمت ۶ر

چار انقلابی جس میں غیر معمولی دل و دماغ والا انسان ڈاکٹر نیلم ایشیا کی چار زبردست طاقتوں سے ٹکر لیتا ہے۔ مقابلہ کی زبردست روئداد سے جو پلاٹ بنا ہے بس وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۸ر

شمیم نہایت دلچسپ معاشرتی اخلاقی ناول صحیح افسانہ نگاری کے اصول پر سبق آموز ظرافت انگیز عبرتناک دو ضخیم جلدوں میں دوسری دفعہ چھپا ہے۔ قیمت للعہ

تعلیم زدہ بیوی ایک جدید فیشن کی ہندوستانی

تصانیف شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم

مراۃ العروس یہ کتاب کافی طور پر مشہور ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا بلذاق شخص ہو جس کی نظر سے نہ گزری ہو۔ جب مولانا ممدوح نے اسے تصنیف کیا تو گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ بطور انعام مرحمت کیا۔ پبلک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور مانگ بدستور باقی ہے۔ اس کتاب کی زبان ایسی بامحاورہ اور صاف و سلیس ہے کہ اس کے مطالعہ سے صدہا آدمی ادیب انشا پرداز بن گئے۔ اس کتاب میں ایک سگھڑ اور ایک پھوہڑ عورت کا کیرکٹر دکھایا گیا ہے اور واقعات لکھہ کر بتایا گیا ہے کہ ایک پھوہڑ عورت کس طرح اپنے خاندان اپنے کنبہ اور اپنے اثاث البیت کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے اور ایک سگھڑ عورت کی بدولت ایک مصیبت زدہ کنبہ کس طرح خوش حال بنجاتا ہے۔ افلاس کس طرح تمول سے بدلتا ہے اور ادنیٰ درجہ کا گھرانہ کیونکر اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے لگتا ہے۔ کتاب ایسے مؤثر اور دلکش انداز میں لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے پر بے حد اثر ہوتا ہے اور طبیعت خود بخود نیکی اور سلیقہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اخلاقی تعلیم کے ساتھ خانہ داری کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھکر لڑکیاں ہر طرح آئندہ زندگی کی مشکلات پر غالب آنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ پہلے عورتوں کے لکھنے پڑھنے کی ضرورت مؤثر الفاظ میں ثابت کی گئی ہے۔ پھر قصے کا آغاز ہے۔ مثلاً اکبری کی بدمزاجی اور اس کا سسرال سے روٹھ کر چلا آنا، اکبری کی شرارتیں، پھوہڑپن، حماقت، بدمزاجیاں، عین عید کے دن بے لطفی پیدا کرنا، الگ گھر کرنے پر ساس داماد کا مباحثہ، اکبری کا الگ گھر اور اس کی بدانتظامی، اصغری کا بیاہ اور اس کا مختصر حال، اصغری کا برتاؤ اور خانہ داری، اصغری میاں کی اصلاح کرتی ہے، گھر کے خرچ کا تعین، اصغری اپنے میاں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتی ہے وغیرہ اس کتاب کی طباعت میں خاص انتظام کیا گیا ہے تاکہ جس پایہ کی کتاب ہے اسی کے مطابق اس کی ظاہری صورت بھی ہو۔ صفحات ۲۳۲ قیمت قسم اعلیٰ مجلد ۱۲ر ایضاً قسم دوم بلا جلد ۸ر

بنات النعش یہ ایک لحاظ سے گویا مراۃ العروس کا دوسرا حصہ ہے اور ایک لحاظ سے اپنی جگہ مستقل کتاب ہے۔ اس کتاب پر بھی گورنمنٹ سے پانچ سو روپیہ بطور انعام ملا ہے۔ اس میں بھی عورتوں کی تہذیب و شائستگی سلیقہ مندی اور خانہ داری کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک کمسن لڑکی میں اتنی سمجھ آسکتی ہے کہ وہ ایک بڑے گھر کا انتظام سنبھال لے۔ بزرگوں کے ساتھ اطاعت و ادب کا برتاؤ چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت، نوکروں اور ماماؤں کی غور و پرداخت، شادی بیاہ کے انتظامات اور ضروریات روزمرہ کے متعلق نہایت دلچسپ اور مفید مضامین اس کتاب میں موجود ہیں اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر کوئی بیوی زنانہ ذمہ داریوں اور خانگی مشکلات میں کامیاب نہیں ہو سکتی قیمت

قسم اول ۱۲ر قیمت قسم دوم ۸ر

توبۃ النصوح یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے آج کل دنیا داروں کی جو حالت ہے اور وہ دنیوی مصروفیتوں میں رات دن غرق رہ کر خدا اور رسول اور ان کے احکام کو جس طرح بھول گئے ہیں اس کا صحیح نقشہ ان اوراق کو پڑھکر سامنے آجاتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے دل کو جو عبرت ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑے دعظ سے بھی ناممکن ہے۔ دنیا دار طبقہ کی اصلاح کیلئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ عورتوں میں مذہبی روح اور احکام مذہبی کی پابندی پیدا کرنے کیلئے یہ کتاب بے مثل ہے۔ اس کے مضامین کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

ایک برس دہلی میں ہیضہ کی سخت وبا پھیلی۔ نصوح نے ہیضہ کیا اور سمجھا کہ مرا چاہتا ہے۔ یاس کے عالم میں مواخذہ آخرت کا تصور بندھا۔ ڈاکٹر نے اُسے خواب آور دوا دی سوگیا تو وہی تصور اُسے خواب بن کر نظر آیا۔ خواب سے بیدار ہو کر نصوح کا اپنی اور اپنے خاندان کی لایعنی زندگی پر تاسف بیوی کو اصلاح خاندان کے لئے اپنا مددگار بنانا، فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی گفتگو، نصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو، فہمیدہ اور بڑی بیٹی کی لڑائی، نصوح اور منجھلے بیٹے کی گفتگو، بڑے بیٹے کی سرکشی اور باپ سے ناخوش ہو کر گھر سے نکل جانا، کلیم کا دوستوں کے ہاں رہنا، مصیبتیں اٹھانا، قید ہونا اور پھر باپ کی سفارش سے رہائی پانا۔ اسی طرح کے صدہا مؤثر، دلچسپ اور عبرتناک مضامین۔ اس کتاب کا نیا ایڈیشن بہترین کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور چھپائی، تصحیح وغیرہ کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے صفحات ۲۷۰ قیمت قسم اعلیٰ مجلد عہ قسم دوم بلا جلد ۱ر

منتخب الحکایات بچوں کو عموماً کہانیاں سُننے کا بہت شوق ہوتا ہے لیکن مائیں ان کو بے نتیجہ چڑیا چڑے کی سی کہانیاں سُناتی ہیں جس سے رتی برابر فائدہ نہیں۔ اس کتاب میں (۷۷) نتیجہ خیز دلچسپ کہانیاں چھانٹ چھانٹ کر لکھی گئی ہیں اور ہر کہانی کے آخر میں مفید نتیجہ بھی بطور حاصل مطلب نکالا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب کم عمر بچوں کے پڑھانے کے قابل ہے اور حکایات لقمان کے ہم پلہ ہے۔ آٹھواں ایڈیشن۔ قیمت ۸ر

چند پند اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے پند اور نصائح سودمند کا بے بہا ذخیرہ، بچوں اور بندیوں کے لئے عمدہ عمدہ مضامین، ادب، صحبت، عقل، غصہ، لالچ، حسد وغیرہ کے ماسوا دُنیا کا مختصر حال، مذہب کی ماہیت، پیغمبروں کا مختصر حال۔ یہ بیش چیدہ منتخب مفید اور سبق آموز مضامین کا گلدستہ ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے بہترین آداب و اخلاق کی تعلیم مذہبی چاشنی کے ساتھ عمدہ ترین پیرائے میں دی گئی ہے۔ زبان بالکل شُستہ اور آسان ہے معمولی اُردو خواں بچے بے تکلف مزہ لے لے کر پڑھ سکتے ہیں۔

نواں ایڈیشن قیمت آٹھ آنے ۸ر

تصانیف مصور ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی

چمکی یہ اس بے مثل تصنیف میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے عورت کی خودداری کی وہ حیرت انگیز تصویر کھینچی ہے کہ پڑھنے والا انگشت بدندان رہجاتا ہے۔ بڑی بی کا کردار اسد ولٹر کیمپر میں اپنی طرز کی پہلی چیز ہے۔ قیمت ۱۲

فرزند سرحد سرحدی افغانوں کے متعلق ایک عبرتناک افسانہ۔ غیرت، دیانت اور شرافت کا مرقع ہے۔ اس پہ مصنف کا طرز بیان۔ قیمت پانچ آنے ۵

کولتار مضحکہ خیز اور پُر اسرار ناول شوخ و شنگ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور ایک عورت کی دردناک زندگی۔ قیمت دو روپے ۲

ویمپائر ایک شریف خاتون کی آبرو ریزی کا دردناک واقعہ۔ اور ایک عجیب اتفاق سے اس کا دلچسپ انجام۔ قیمت دو روپے ۲

ملفوظات نامی ایک کتے کی خود نوشت سوانح عمری اگر کتے کی زبان ہوتی تو وہ اپنے جذبات کس طرح ادا کرتا۔ قیمت ۱۲

شہزوری عورت کی شہزوری کی عبرت انگیز داستان جسے ملک کے سب سے بڑے مزاح نگار مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ظرافت کی چاشنی دیکر دو آتشہ بنادیا ہے۔ قیمت ۸

مرزا جنگی لکھنؤ کے بانکے مرزا جنگی اور ان کے احباب کا ایک نہایت دلکش ڈرامہ۔ واجد علیشاہ کے زمانہ کے لکھنؤ کی ایک جھلک۔ قیمت ۶، ۱۲

شریر بیوی ایک خاتون کی معصوم شرارتیں اس قدر دلچسپ ہیں کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا چار تصویریں اور رنگین سرورق ۱۲

کمزوری عورت کی کمزور فطرت کس طرح مرد کے بہکائے میں آجاتی ہے۔ ابتدائی حصہ ہنسانیوالا اور آخری حصہ رلانیوالا۔ قیمت ۲

چینی کی انگوٹھی پہلا حصہ مزاحیہ دوسرا حزنیہ انجام دیکھکر مصنف کی غیر معمولی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ قیمت ۸

قدردان سرزمین ریف کے سات خطرناک سالوں اور ایکے جانباز بہنوئی کا حیرت خیز فسانہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ۵

قرض مقراض محبت است

اس مقولے پر مصنف نے نئے انداز سے افسانہ لکھا ہے قرض دینے اور قرض لینے کی خرابیوں کو اسقدر پر لطف پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ بیساختہ ہنسی آتی ہے ۵

روح ظرافت "انگوٹھی کی مصیبت" اور دیگر مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہر افسانہ ظرافت کی روح ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت ۱۲

فل بوٹ حسن و عشق کی عجیب و غریب داستان پلاٹ کے اعتبار سے مصنف کا بہترین ناول ہے۔ ایک جوتے کی وجہ سے کیا ہوا؟ قیمت ۱۲

تفویض ایک بی اے پاس خاتون کی شادی ایک مسجد کے ملا سے ہوجاتی ہے۔ کیسی گذرتی ہے انجام کار کیا ہوتا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت پانچ آنے ۵

خانم چغتائی صاحب کی تازہ ترین کتاب جس کا ایک ایک افسانہ ظرافت کی جان ہے۔ یہ مصنف کی بہترین تصنیف ہے۔ مجلد سنہری قیمت چار روپے للعہ

خطوط کی ستم ظریفی مصنف نے یہ افسانہ اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے پلاٹ عجیب و غریب ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجائیں یہ صرف کتاب نہیں ملنے ہنسانیکا مستقل ذریعہ ہے ۱۲

روح لطافت "مہارانی کا خواب" اور دیگر افسانے جن کو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائینگے

پہلا افسانہ لاجواب قرار دیا گیا ہے ۱۲

جنت کا بھوت ایک بدشکل نوجوان اور اس کی حسین عزیزہ کی پر لطف داستان مارے ہنسی کے آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ قیمت ۱۲

دیکھا جائیگا عشق و ہوس میں امتیاز کس طرح ہوا۔ ایک حسین مالدار لڑکی کے تین عاشقوں کی داستان، کامیابی کسے اور کیسے ہوئی! قیمت ایک روپیہ (عہ)

چغتائی کے افسانے مرزا صاحب کے ہیں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں۔ خواب بیداری۔ جنم قیدی۔ جہالت کمسپیر۔ بڑے شرم کی بات۔ رستاکشی۔ چاول نکھی جرم ہے۔ رنگروٹ کی بیوی بھاگ گئی۔ تیمارداری۔ قصاص۔ پارہ خود مختار دوشیزہ۔ زنبور۔ گرگٹ پیچ۔ شادی کی ضرورت۔ کیا کبھی تم پر بھی کوئی عاشق ہوا ہے!۔ چند بیل۔ فیل۔ فقیر نوجوان ڈاکٹر۔ سر سید بنام ساکی کا ٹوپ۔ انتہائے حقیقت۔ حقیقت نغمہ۔ للواقف ایسے مرا کیوں جاتا ہے۔ سالنامہ مرمن۔ بشنوئی۔ سٹیس۔ باپ وغیرہ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم ۱۲

قرآن اور پردہ آیات قرآنی کے حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ صحیح پردہ کیا ہے اور رسمی پردہ کیا بن گیا ہے۔ قیمت ۱۲

حدیث اور پردہ صحیح احادیث کے حوالوں سے پردہ کی حقیقت بیان کیگئی ہے۔ قیمت عہ

رقص و سرود مسلمان لڑکیوں کیلئے رقص و سرود کی تعلیم کسقدر ضروری ہے؟ مذہبی رو سے اس کا جواز۔ قیمت ۱۲

کھُرپا بہادر

چغتائی صاحب نے اس ناول میں ایک عجیب و غریب قصہ پیش کیا ہے ایک بدمعاش لفنگے کی سرگذشت سے اس ناول کی ابتدا ہوتی ہے۔ دنیا نے اس کے سر پر پولیس والوں کے جوتے پڑتے ہیں اور کئی دفعہ سزا بھی پاتا ہے۔ اس بدمعاش کی شادی ایک نواب صاحب نے ضد میں آکر اپنی چہیتی اور بیحد لاڈلی بیٹی سے زبردستی کردی۔ اور اسے کھُرپا بہادر کا خطاب ملا۔ اس بدمعاش پر شاہی محلات میں جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ الف لیلیٰ کے سوتے جاگتے (ابوالحسن) کے قصے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی ناول میں ریاست لنکران کے ساتھ ساتھ ریاست لفتترہ کے غمناک واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک بیگم پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں یہانتک کہ اُسے کو اہکنی بنادیا جاتا ہے۔ محلات کی جگمگاتی فضا میں آپ عجیب عجیب رنگینیاں دیکھیں گے کہیں ہنسی اور کہیں قہقہے کہیں آنسو اور کہیں خون کی بوندیں "کھُرپا بہادر" کو پڑھکر آپ شرر کے "دربار حرام پور" کو بھول جائینگے تقریباً تین سو نہایت لفریب صفحات کی کتاب ہے اور قیمت للعہ علاوہ محصول ڈاک

انگریزی سکھانے والی بینظیر اور سستی کتابیں

مخزن الفوائد

اس میں اردو نام وعبارت کو انگریزی میں لکھنے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے انگریزی چٹھی لکھنے سمجھنے کرنے در تلفظ کے قاعدے انگریزی بول چال کے کئی سو فقرے ایک ہزار کے قریب اردو فقرے قاعدوں کے ساتھ اور تیس حکایتیں انگریزی میں ترجمہ کرنے کیلئے درج ہیں اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ایسا مبتدی جو انگریزی سے واقف نہیں ہے قلیل عرصہ میں خاصی تعداد حاصل کرسکتا ہے۔ قیمت ۱ر علاوہ محصول۔

انگریزی بولنا

تین ہزار بول چال کے فقرے معہ ترجمہ اور مخزن الفوائد کے تمام اردو جملوں کا ترجمہ ۶ر

مخزن الحکایات

یعنی ۲۷ انگریزی کہانیاں معہ اردو معنی تلفظ درج ہیں۔ قیمت ۵ر

ہادی الترکیب

اس میں انگریزی ڈکٹیشن لکھنے انگریزی سے پڑھنے کیلئے لفظوں کے صحیح ہجے اور تلفظ اور پارسنگ کے تمام قاعدے ابتداء سے انتہا تک بہت سہل انداز بیان میں سمجھائے گئے ہیں۔ قیمت ۶ر

انگریزی خوشنویسی قیمت ار

ضمیمہ مخزن الفوائد

اس کتاب میں علاوہ ترجمہ کے اہم اقتباسات سمجھائے گئے ہیں اور ترجمہ کے واسطے ایک ہزار فقرے اور بہت سی عبارت بھی درج کی گئی ہے۔ ۲ر

خلاصۃ القواعد

مبتدی کو پارسنگ کرنا اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا بخوبی سمجھایا گیا ہے قیمت ۵ر

مخزن المحاورات

اس میں ایک ہزار دو سو انگریزی محاورے اور چھ سو چالیس معہ ترجمہ اور دو جز انگریزی حروف اور تین چار ہزار کے قریب ایسے ناموں وچیزوں کی انگریزی جن سے کام پڑتا ہے قیمت ۶ر

شرطیہ ڈہائی مہینہ میں انگریزی آجائے گی

اگر آپ مومن صاحب کی انگلش ٹیچر کا ایک سبق روزانہ سمجھ کر پڑھ لیں گے تو کبھی استاد کی ضرورت نہیں پڑے گی صرف ایک گھنٹہ روزانہ کی محنت میں آپ بہتر سے بہتر انگریزی بول سکتے ہیں اور لکھ سکتے ہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جو دو سال میں تیس ہزار فروخت ہوگئی ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ محصول ۶ر

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ علم وادب جامع مسجد دہلی

انگریزی اردو خط وکتابت

ہر قسم کی چٹھیاں عرضیاں نوٹس اور ہر قسم کی تحریروں کے قاعدے اور نمونے معہ ترجمہ اردو۔ قیمت ۱۲ر

اردو انگریزی ڈکشنری

سات ہزار پانسو ایسے اردو لغت جو اکثر تحریر وتقریر میں آتے ہیں بہ ترتیب حروف تہجی اردو خط میں ہیں ان کے آگے ان کی انگریزی انگریزی خط میں ہے۔ قیمت ۷ر

کامل القواعد

اس میں صرف ونحو کے تمام وکمال قاعدے جو ترجمہ کرنے اور انشا پردازی سے متعلق ہیں نہایت وضاحت سے درج ہیں۔ ۱۶ اعلیٰ درجہ کی مستند انگریزی گرامروں کا لب لباب ہے۔ قیمت ۱ر

ضمیمہ مخزن المحاورات

اس کتاب میں مخزن المحاورات کے علاوہ ڈہائی ہزار محاورے اور آٹھ سو مخصوص پریپوزیشنوں کے استعمال کے انگریزی فقرے معہ ترجمہ اردو درج کئے گئے ہیں قیمت صرف چھ آنے ۶ر

نیومینوئل گرامر کا اردو ترجمہ

پہلا جزو اس میں تمام آرتھاگرافی اور ایٹی مولوجی وغیرہ کا ترجمہ نہایت حسن وخوبی کیساتھ درج ہے۔ ۵ر

نیومینوئل گرامر کا دوسرا جزو

اسمیں تمام سنٹکس کے قاعدوں نوٹوں مثالوں اور پارسں اور کرکٹ کے نقروں کا ترجمہ ہے اور تمام کرکٹ کے فقروں کو کرکٹ یعنی صحیح کرکے بھی لکھا ہے۔ ۷ر

تصانیف مولوی عبدالحلیم شرر

فلورا فلورنڈا قسم اعلیٰ مجلد	عہ ر
قیس ولبنیٰ	عہ ر
یوسف ونجمہ	۱۲ر
دلکش کامل	۱۲ر
دلچسپ کامل	۸ر
فردوس بریں	۸ر
ملک العزیز ورجنا	۸ر
منصور موہنا	۸ر
حسن انجلینا	۸ر
حسن بن صباح	۴ر
شہید وفا	۶ر
میوۂ تلخ	عہ ر
طاہرہ	

تصانیف شوکت تھانوی

سودیشی ریل	عہ ر
سوج تبسم	عہ ر
سیلاب تبسم	
طوفان تبسم	
دنیائے تبسم (نئی تصنیف)	
گہرستان	

مولوی عنایت اللہ

سلامبو	۱۲ر
نجم السحر	عہ ر
تائیس	۱۲ر
ہیرودیاس	۱۲ر
ہملٹ	عہ ر
چنگیز خاں کی سوانح حیات	۱۲ر
دانتے کا جہنم	۱۲ر
خواب پریشان	۴ر
قلوبطرہ (زیر طبع)	عہ ر
واسپلاس (")	۴ر

ایم اسلم

مہدی	۳ر
مرزاجی	۶ر
فاطمہ کی آپ بیتی	۶ر
نرگس	۶ر
طلسم سامری	۶ر
گناہ کی راتیں	۶ر
چار سہیلیاں	عہ ر
بڑی بی	۱۲ر
غزال	۱۰ر
شیطان کا چرخہ	۴ر

تصانیف منشی پریم چند

بازار حسن حصہ اول	عہ ر
" " " دوم	۸ر
میدان عمل	۸ر
پردہ مجاز حصہ اول	۸ر
" " " دوم	۸ر
غبن حصہ اول	۸ر
" " دوم	۸ر
چوگان ہستی حصہ اول	۸ر
" " " دوم	۸ر
گوشہ عافیت حصہ اول	۶ر
گوشہ عافیت حصہ دوم	۱۲ر
واردات	عہ ر
زاد راہ	عہ ر
دودھ کی قیمت	عہ ر
آسمان کی پری	۲ر
پریم پچیسی حصہ اول	عہ ر
" " دوم	عہ ر
پریم بتیسی حصہ اول	عہ ر
" " دوم	۸ر
فردوس خیال	عہ ر
نجات	

چندہ سالانہ پانچ روپے۔
ششماہی تین روپے۔
فی پرچہ ۸

غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت بھیجا
جاتا ہے۔

جرعات

جلد ۱۷ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

علامہ سر محمد اقبال مرحوم کی یادگار میں متعدد تعزیتی جلسے دہلی میں ہوئے مگر ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ماتمی جلسہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان سب جلسوں سے الگ تھا۔ جیسا کہ انجمن کے نام سے ظاہر ہے اس جلسے میں مصنفین شامل تھے جو ہندوستان کے ایک بہت بڑے مصنف کے اٹھ جانے پر جمع ہوئے تھے مرحوم کی مختلف حیثیتوں پر نہایت بصیرت افروز مقالات پڑھے گئے۔ جن سے سامعین کو محسوس ہوا کہ ڈاکٹر اقبال کی موت نے ہمیں علمی و ادبی حیثیت سے کس قدر مفلس کر دیا۔ انجمن کی کارروائی اور مضامین نظم و نثر ساقی کی اسی اشاعت میں شامل ہیں۔ چند اور مضامین بعد میں موصول ہوئے اور ان سب کو یکجا کر کے ساقی کا ایک حصہ نذرِ اقبال کیا گیا ہے۔

ساقی کا آئندہ پرچہ ایک خاص نمبر ہوگا جس میں صرف افسانے اور ڈرامے ہوں گے۔ مضامین کی مختصر فہرست کسی اور جگہ شائع کی جا رہی ہے۔ ساقی کیلئے جو مضامین موصول ہوتے ہیں انکی ماشاء اللہ وہ کثرت ہے کہ اگر ان میں سے منتخب مضامین سب شائع کئے جائیں تو کم از کم دو سو صفحے کا رسالہ ہر مہینے شائع کرنا پڑے۔ ساقی ہر مہینے (۹۶) صفحات پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں چند اچھے مضامین بھی بدرجۂ مجبوری ہمیں واپس کرنے پڑتے ہیں۔ آدھے کے قریب رسالہ باریک لکھوایا جاتا ہے اس پر بھی ساقی کی موجودہ ضخامت ناکافی رہتی ہے۔ ضخامت میں اگر اضافہ ہو تو چندہ میں بھی اضافہ ہو مگر موجودہ چندہ ہی دینے والے حضرات کی تعداد کم ہے اسلئے اضافے کا سوال مسترد ہو جاتا ہے۔ مضمون نگار حضرات اگر مختصر مضامین لکھا کریں تو مضامین کی تعداد بڑھ سکتی ہے اور چند اور حضرات کو بھی بزمِ ساقی میں شریک ہونیکا موقع مل سکیگا۔

"شاهد"

رودادِ جلسۂ منعقدہ یکم مئی ۱۹۳۸ء

ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی کا گزشتہ جلسہ یکم مئی کو دفتر ساقی میں ۶½ بجے شام کو علامہ مضحک دہلوی کی صدارت میں ہوا تھا۔ یہ غیر معمولی جلسہ علامہ سر محمد اقبال کی تعزیت میں منعقد ہوا۔ حاضرین میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:۔

(۱) علامہ مضحک دہلوی۔ (۲) انصار ناصری۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی (۳) مہرلال سونی ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے؛ (۴) ممتاز حسین۔ بی اے (آنرز) بی۔ ٹی؛ (۵) فضل حق قریشی دہلوی۔ (۶) مرزا فہیم بیگ چغتائی (۷) کرم الٰہی۔ (۸) صادق الخیری۔ ایم۔ اے؛ (۹) ظفر قریشی دہلوی بی۔ اے؛ (۱۰) اخلاق احمد۔ (۱۱) صلاح الدین قریشی دہلوی۔ اور (۱۲) شاہد احمد۔ وغیرہ۔

سکریٹری نے گذشتہ جلسہ کی کارروائی پڑھکر سنائی۔ اسکے بعد ظفر قریشی صاحب نے اپنا مقالہ "محمد اقبال ۔ شخص اور شاعر" سنایا۔ جسکے بعد مہرلال ضیا فتح آبادی نے اپنی دردانگیز نظم بیادِ اقبال سنائی۔ پھر ممتاز حسین صاحب نے اپنا بصیرت افروز مضمون "اقبال اور اس کا فلسفہ" سنایا۔ حاضرین نے اس مضمون کو بہت پسند کیا۔ کرم الٰہی صاحب نے "اقبال کے مختصر حالاتِ زندگی" پیش کئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ایم۔ اے؛ پی۔ ایچ ڈی؛ کا بھیجا ہوا قطعہ تاریخ وفات پڑھکر سنایا گیا۔ آخیر میں مرزا فہیم بیگ صاحب نے اپنی منظوم "ماتم اقبال" اور علامہ مرحوم کی مشہور نظم "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کی تضمین سنائی جو اس قدر پسند کی گئی کہ مکرر سنائی گئی۔ جلسہ برخاست ہونے سے پہلے مسٹر انصار ناصری کی تجویز کے مطابق ایک منٹ تک حاضرینِ جلسہ احتراماً خاموش کھڑے رہے۔ ۸½ بجے جناب صدر کی مختصر تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

شاہد احمد
(سکریٹری)

ہندوستان کے تعلیمی مسائل

تعلیم کے بارے میں دو قسم کے خیالات ہر زمانے میں رہے ہیں بعض لوگ تو تعلیم (یا کسی خاص قسم کی تعلیم) کو بجائے خود انسانی زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دیتے ہیں خواہ اس سے کوئی معاشی یا سیاسی فوائد حاصل کرنے ممکن نہوں۔ بعض لوگ اس کے برعکس یہ خیال رکھتے ہیں کہ تعلیم سیاسی اور معاشی مقاصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ یا وسیلہ ہے اور اس لئے ہر زمانے اور ہر ملک میں اس کے نظام اور نصب العین میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ تاریخی اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا خیال واقعات سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے کیونکہ تعلیم کو بجائے خود ایک مقصد قرار دینے کا سوال صرف ان جماعتوں اور قوموں میں پیدا ہوتا ہے جو تہذیب و تمدن کے بہت سے مدارج طے کر چکی ہیں لیکن ابتدا میں تعلیم کو اس بات کا ایک ذریعہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسان نے جو تجربات اور سبق فطرت کے خلاف اپنی معاشی جد و جہد کے دوران میں سیکھے تھے وہ ایک نسل کے ساتھ ضائع نہ ہو جائیں بلکہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے تعلیم و تلقین کے ذریعے سے محفوظ کر دیا جائے۔ بہرحال جہاں تک ہندوستان کے اہم تعلیمی مسائل کا تعلق ہے کوئی گفتگو نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک ہم ان سیاسی اور معاشی اسباب کو پیش نظر نہ رکھیں جو اس وقت ملک میں موجود ہیں یا صدیوں سے موجود رہے ہیں۔ سب سے پہلے اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے اکثر اور ملکوں کی مانند ہندوستان میں بھی کبھی عام تعلیم کا رواج نہیں رہا۔ بلکہ تعلیم صرف چند خاص جماعتوں اور طبقوں کے لئے ضروری خیال کی جاتی تھی۔ انکے علاوہ جو تعلیم تھی وہ صرف اس حد تک تھی کہ مختلف پیشوں اور حرفتوں کے کرنے والے اپنے بچوں کو آبائی پیشے کے اصول سکھا دیتے تھے تاکہ وہ اپنی روٹی کما سکیں۔ دوسری بات جو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ ہندوستان اس وقت دو بڑی خرابیوں میں مبتلا ہے۔ افلاس اور جہالت، اور ان دونوں کا باہم قریبی تعلق ہے۔ کیونکہ جہالت کی وجہ سے بعض دولت پیدا کرنے کے وسائل اس ملک کے لوگوں کے لئے مسدود ہو گئے ہیں۔ اور افلاس کی بدولت تعلیم کی ترویج کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس وقت تعلیمی مسائل پر جو زیادہ توجہ کی جا رہی ہے اس کے اسباب زیادہ تر سیاسی ہیں۔ جمہوری حکومت کیلئے یہ ضروری ہے کہ عوام میں اتنی تعلیم کو رائج کر دیا جائے کہ وہ کم از کم اخبار وغیرہ پڑھ سکیں اور اپنے ووٹوں (Votes.) کے ذریعے سے ملک کی سیاست پر اپنا اثر ڈال سکیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ابتدائی تعلیم کو مفت اور جبری بنا دینے پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے مفلس ملک میں یہ ابتدائی تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیئے جس سے مالیہ پر بھی کم سے کم بوجھ پڑے اور غریب گھرانوں کے بچوں کو زیادہ سے زیادہ معاشی فائدہ حاصل ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی دیہی آبادی یعنی وہ آبادی جو گاؤں میں رہتی ہو شہری آبادی سے بہت زیادہ ہے! اور یہ ضروری نہیں کہ جو تعلیم شہر کے بچوں کیلئے مفید ہو وہ گاؤں کے بچوں کیلئے بھی نفع بخش ثابت ہو سکے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی خوشحالی کا انحصار زیادہ تر کھیتی باڑی پر ہے اس لئے ابتدائی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ اسکو حاصل کرنے کے بعد بچے زراعتی کاموں میں ذوق و شوق سے حصہ لے سکیں بعض لوگ زراعت کے ساتھ اور ایسے پیشوں کی تعلیم کو بھی ابتدائی نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہتے ہیں جن کے لئے بڑے کارخانوں کی حاجت نہیں بلکہ جن کو گھر میں بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً معمولی قسم کا کپڑا بننا یا بڑھئی اور لوہار کا کام۔ مختصر یہ ہے کہ

ابتدائی تعلیم اور اس کے لئے موزوں نصاب کا مسئلہ ایک نہایت اہم تعلیمی مسئلہ ہے اور اس سوال کا تصفیہ بھی ضروری ہے کہ یہ تعلیم صرف پڑھنا لکھنا اور معمولی حساب کتاب سکھانے تک محدود رکھی جائے یا اس میں زراعت یا کسی اور پیشے کی تعلیم بھی شامل ہو۔

ایک اور اہم تعلیمی مسئلہ زبان کا سوال ہے جس کا تعلق ابتدائی تعلیم کے علاوہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم سے بھی ہے۔ اگرچہ یہ بات اب عام طور پر مان لی گئی ہے کہ ابتدائی تعلیم تمامتر دیسی زبان میں ہونی چاہیئے لیکن پھر بھی یہ دقّت باقی رہتی ہے کہ اس ملک میں ایک دیسی زبان نہیں بلکہ کئی دیسی زبانیں ہیں اور ان میں سے کم از کم ایک درجن کے قریب ایسی زبانیں ہیں جو کم و بیش علمی اور ادبی ذخیرہ رکھتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک تعلیم کا ذریعہ بننے کی دعویدار ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان سب زبانوں میں سے ایک زبان ایسی ہے جو دیسی کہلانے کا سب سے زیادہ حق رکھتی ہے اور جو تمام ملک میں ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے اس زبان کو کبھی ہندی، کبھی ہندوستانی، کبھی ہندی ہندوستانی اور کبھی اردو کہا جاتا ہے۔ ان ناموں کے اختلاف سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس زبان کے خصائل اور خصوصیات ابھی تک کچھ غیر معین سے ہیں اور جہاں تک جنوبی ہند کا تعلق ہے اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کیلئے کوئی خاص جوش و خروش نہیں پایا جاتا۔ شمالی ہند میں بھی رسم الخط کا سوال یعنی یہ سوال کہ اس زبان کو ناگری حروف میں لکھا جائے یا فارسی حروف میں، بہت سی تعلیمی مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں نہ صرف ابتدائی تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی مادری زبان میں ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں یہ تعلیمی شرف عرصہ دراز سے انگریزی زبان کو حاصل رہا ہے۔ اور مادری زبان کو عموماً اس مقصد کیلئے ناکافی اور ناموزوں خیال کیا جاتا ہے۔ تعلیمی نظام میں انگریزی کا یہ اقتدار براہ راست سیاسی اسباب کا نتیجہ ہے اور فی الحال اس مسئلہ پر غور کیا جا رہا ہے کہ اس اقتدار کو کس حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی دیسی زبانوں میں کہاں تک ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کی اہلیت ہے۔

ایک اور بہت اہم مسئلہ عورتوں کی تعلیم کا ہے۔ اِس ضرورت سے اب اکثر سمجھدار لوگ آگاہ ہو گئے ہیں تاہم یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس ملک کے رسم و رواج اور معاشرتی کوائف کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں اور مردوں کے نصاب تعلیم میں کوئی فرق کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ایک ضروری سوال ہے کہ وہ لوگ جو اوائل عمر میں اسکول اور کالج کی تعلیم سے محروم رہ گئے اور اب کسب معاش کے جھمیلوں میں گرفتار ہیں کس حد تک تعلیم سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں یا نہیں، ظاہر ہے کہ وہ چھوٹے بچّوں کے ساتھ اپنی تعلیم کا آغاز نہیں کر سکتے اور اس لئے اُن کے لئے خاص نمونے کی درسگاہوں کی ضرورت ہے جن میں وہ اپنے فرصت کے اوقات میں کچھ لکھ پڑھ سکیں۔

ہماری ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق سب سے زیادہ اہم مسئلہ شاید یہ ہے کہ نظام کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ سرکاری ملازمت یا چند علمی پیشوں مثلاً وکالت، ڈاکٹری، معلمی وغیرہ کے علاوہ وہ کسی اور پیشے کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتی۔ وہ اشخاص جو اس طریقۂ تعلیم سے مستفید ہوئے ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت، فنونِ لطیفہ وغیرہ سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے اور اس لئے ملک کی ترقی و اصلاح میں وہ مدد نہیں دے سکتے جس کی اُن سے توقع ہو سکتی ہے ہماری یونیورسٹیوں پر یہ اعتراض بھی وارد کیا جاتا ہے کہ اُن کی تعلیم صحیح علمی یا ادبی ذوق پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اور جو لوگ ان یونیورسٹیوں میں تعلیم پا کر نکلے ہیں اُن میں بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے واقعاً کوئی قابل ذکر علمی یا ادبی کام کیا ہے۔ بظاہر یہ بات دُشوار معلوم ہوتی ہے کہ علم و ادب کی تعلیم کو کسی قسم کی عملی، تجارتی یا صنعتی، حرفتی تعلیم کے ساتھ ایک ہی وقت میں جمع کیا جا سکے۔ تاہم نصاب تعلیم میں اس قسم کے تغیّرات ممکن ہیں جن سے اُس کا یہ یکطرفہ

علمی رجحان کسی قدر کم کیا جائے اور اس میں عملی میلان پیدا کیا جائے تاکہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان جو سرکاری ملازمت یا علمی پیشوں میں جگہ نہ پاسکیں روزی کمانے کے اور طریقے اختیار کرلیں۔ بیکاروں کی تعداد میں اضافہ نہ کریں۔ لیکن کسی قسم کی خاص علمی تعلیم کے لئے خواہ اس کا مقصد تجارت ہو یا صنعت و حرفت یا زراعت خاص درسگاہوں اور مخصوص نصاب تعلیم کی ضرورت ہے۔ اب تک اس نوع کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان میں بہت کم وسائل موجود ہیں اور جو لوگ اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اکثر دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں۔ صنعت و حرفت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک میں مختلف قسم کے کارخانے موجود ہوں جن پر تعلیم کا عملی حصہ پورا کیا جاسکے اور ایسے کارخانوں کا قیام بہت سے سیاسی اور اقتصادی اسباب پر منحصر ہے جن کا تعلیم سے براہ راست علاقہ نہیں۔ تاہم یہ ایک تعلیمی مسئلہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام کو کس حد تک ملک کی صنعتی اور تجارتی خوشحالی کا ذریعہ اور ملک والوں کیلئے کسب معاش کا وسیلہ بنایا جاسکتا ہے۔

اچھی تعلیم کے لئے اچھی درسگاہوں کی ضرورت ہے۔ ہماری یونیورسٹیاں تو بہت سے نقائص کے باوجود بھی اور متمدن ممالک کی یونیورسٹیوں سے کچھ نہ کچھ مقابلہ کرسکتی ہیں لیکن ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدارس ایسے مقابلہ سے بالکل عاجز ہیں، اس لئے ہمارے تعلیمی نظام کی حالت اس عمارت کی مانند ہے جس کی بنیادیں کمزور لیکن بالائی تعمیر پختہ ہے۔ معیار مدارس جو معمول سے بہتر خیال کئے جاسکتے ہیں غیر ملکی نمونوں مثلاً انگریزی پبلک اسکولوں کی بجا تقلید پر مبنی ہیں۔ ان میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ہرگز ایسی نہیں کہ اسکو ملک میں عام طور پر رائج کیا جاسکے۔ اور ان پر جتنا خرچ ہوتا ہے وہ بھی ایک غریب ملک کیلئے بہت زیادہ ہے۔ عام مدارس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اُن میں سوائے چند علم کے مبادیات اور وہ بھی بہت غیر مکمل طریقے پر سکھا دینے کے اور کوئی تعلیمی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ بچوں کی جسمانی تربیت کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا یہاں تک کہ اُن کی بھوک پیاس کی بھی پروا نہیں کی جاتی اور نہ اُن کی رُوحانی یا اخلاقی تربیت کا کوئی سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ آج کل دُنیا کی تمام ترقی پسند قومیں بچوں کی جسمانی صحت پر بہت توجہ کرتی ہیں۔ کیونکہ اسی پر آئندہ نسلوں کی ترقی اور قوم کی حفاظت اور بقا کا انحصار ہے۔ فوجی تربیت کا مسئلہ بھی اسی سوال سے متعلق ہے۔ آج کل اس قسم کا زمانہ ہے کہ جب تک کسی ملک کے سب یا اکثر باشندے جنگ میں حصہ لینے کی قابلیت نہ رکھتے ہوں اس کی آزادی کبھی محفوظ نہیں ہوسکتی اگرچہ ہندوستان کی آبادی بہت کثیر ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو اس آبادی میں ایسی اقوام کا تناسب جو فوجی کاموں کی فطری استعداد رکھتی ہیں بہت کم ہے لیکن یہ امر بھی مسلّمہ ہے کہ ایسی استعداد تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اُن قوموں میں بھی پیدا کی جاسکتی ہے جو فطرتاً اس سے محروم ہیں۔ لہٰذا یہ ایک بہت ضروری تعلیمی مسئلہ ہے کہ ہندوستان کی عظیم الشان آبادی کو کس طرح اپنی محافظت کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں انسان کو جسمانی تربیت کی اس لئے ضرورت ہے کہ وہ زور اور قوت حاصل کرکے اپنی حفاظت اور خودداری کے قابل ہو جائے وہاں اُس کو روحانی اور اخلاقی تربیت کی بھی ضرورت ہے جو اس کو اور انسانوں کے ساتھ امن اور صلح کے ساتھ رہنے کے لئے تیار کرسکے۔ ہندوستان جیسے مُلک میں جہاں کے اکثر باشندوں پر مذہب اور اخلاق کا بہت اثر ہے کوئی ایسا طریقہ تعلیم جو اس اثر سے بالکل معرّا ہو مقبول نہیں ہوسکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے اس ملک میں سب لوگ ایک عقیدہ اور ایک مذہب کے نہیں اور مذہبی و اخلاقی تعلیم کا کوئی ایسا نصاب وضع کرنا جو سب کے لئے کارآمد ہوسکے بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے اس وقت کی وجہ سے اب تک عام مدارس میں اس قسم کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہوسکا لیکن ان مدرسوں میں جو کسی ایک قوم یا جماعت کی تحویل

میسا ہیں اسی قوم یا جماعت کے عقیدت کے موافق مذہبی تعلیم کا عموماً کچھ انتظام ضرور ہو جاتا ہے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی فرقہ دارانہ مذہبی تعلیم ملک کی مختلف اقوام میں صلح و دوستی پیدا کرنے کی بجائے نفرت و مخالفت کو بڑھانے کا سبب ہو جاتی ہے۔ اور اس لئے ضرورت ہے کہ مذہب اور اصلاق کی تعلیم کا کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو اختلاف عقائد کا احترام کرتے ہوئے بھی اس ملک کے سب باشندوں کے لئے موزوں ہو سکے۔ جب تک اس مشکل سوال کا کوئی حل دستیاب نہیں ہوگا ہم تعلیم سے وہ فوائد نہیں حاصل کر سکتے جو اور متمدن ملکوں نے حاصل کئے ہیں۔

مرزا محمد سعید
(ایم۔ آئی۔ آر)

پچھلی پیت!

ہوا جب منہ اندھیرے پیت کی بنسی بجاتی ہے
کوئی رادھا کسی پنگھٹ کے اوپر گنگناتی ہے
مجھے بیساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

گھنی جھاڑی میں سورج کی کرن جب مسکراتی ہو
کلی کے پاؤں پر جب کوئی تتلی لوٹ جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

افق پر آسماں جھک کر زمیں کو پیار کرتا ہے
یہ منظر ایک سوئی یاد کو بیدار کرتا ہے
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

شفق جب چومتی ہے سر و برفانی چٹانوں کو
زرد پہلی چوٹیاں چھوتی ہیں رنگیں آسمانوں کو
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

ملا کر منہ سے منہ ساحل سے جب موجیں گذرتی ہیں
مرے سینہ میں مدت کی دبی چوٹیں ابھرتی ہیں
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

چمکتی بجلیوں کی جب تڑپ پاتا ہوں گوہر میں
کسی ندی کو گرتے دیکھتا ہوں جب سمندر میں
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

کوئی لڑکی اگر پھولوں کا رنگیں جال بنتی ہے
کلی ہنس کر اگر بھونرے سے میٹھا راگ سنتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

شفق کو دیکھتا ہوں جب فلک پر سرخ جوڑے میں
گلے ملتے ہیں دونوں وقت جب رنگین پردے میں
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

چمکتا ایک تارا چاند کے پہلو میں چلتا ہے
مرا سویا ہوا دل ایک کروٹ سی بدلتا ہے
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

پگھلتی شمع پر گرتے ہیں جب طاقوں میں پروانے
سناتا ہے کوئی جب دوسروں کو دل کے افسانے
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

زمیں جب ڈوبتے سورج کی خاطر آہ بھرتی ہے
کرن جب آسماں کو اک وداعی پیار کرتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی محبت یاد آتی ہے

جاں نثار اختر (علیگ)

حیاتِ طیبہ

والد ماجد قبلہ جناب مولوی احمد دین صاحب مرحوم و مغفور کی دردانگیز یاد میں۔

جن کا ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء کو وصال بحق ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

(۱)

زیست کیا شے ہے؟ حیاتِ جاوداں کیا چیز ہے
وہ نشاط اندوز کیوں؟ یہ کیوں نشاط انگیز ہے؟

رازِ ہستی ابتدا سے آج تک کیوں راز ہے؟
ساز ہے یہ۔ یا سراپا ساز کی آواز ہے؟

ایک کیفیت عرض کی یا ہے جوہر زندگی؟
اکتسابی ہے کہ ذاتی زیست کی تابندگی؟

آشناءِ زندگی نا آشنائے زندگی!
کیا کرشمہ ہے ترا یہ بھی خدائے زندگی!!

(۲)

رفعت و پستی کے جذباتِ دوگونہ کا جہاں
جس کی شمشیرِ دو دم کا ماسوا سنگِ فساں

منبعِ یاس و یقیں سرچشمۂ نورِ شعور
اک کرشمہ جس کا ہے فرعون و موسیٰ کا ظہور

وہ بلا وہ خیر و شر کا امتزاجِ بہتریں
سر بسر احساس سرتاپا نگاہِ نکتہ بیں

"الامانت" "قلبِ انساں" "گوہرِ عز و شرف"
فخرِ یزداں اہرمن کے تیرِ کینہ کا ہدف

یہ "امانت" مشعلِ "انا ہدینا ہُ السبیل"
مہرِ تاباں کی طرح ہے آپ ہی اپنی دلیل

وید کیا۔ توریت کیا۔ انجیل کیا قرآن کیا
عقل کیا وجدان کیا برہان کیا عرفان کیا

"الامانت" کے تحفظ پر ہیں سارے یکزباں
اور صلہ اسکی حفاظت کا "حیاتِ جاوداں"

یہ شعاعِ سرمدی جس کی دلیلِ راہ ہو
ظلمتِ راہِ عدم کی اسکو کیا پرواہ ہو!

(۴)

اے وحیدِ عصر! اے علامۂ دینِ متیں! عمر بھر اللہ کے آگے ہی جھکی تیری جبیں
نوجوانی کیا، کہولت کیا، بڑھاپا کیا ترا اتقا کے ارتقا کا تھا مسلسل سلسلہ
ابتدا سے زندگی تیری سراپا حال تھی فقر کی دولت سے پر دامن تھی مالا مال تھی
اس سے بڑھ کر کیا گواہی ہو ترے عرفان کی
اپنے مولا کو نمازِ فجر پڑھتے جان دی

(۵)

ظاہر و باطن جہاں میں جس کسی کا ایک ہے برگزیدہ ہے۔ وہی بندہ خدا کا نیک ہے
درحقیقت ہے حیاتِ طیبہ وہ زندگی شمع کے مانند جس کا کام ہوتا بندگی
خوف ہو اللہ کا جس کو وہی انسان ہے اہلِ دل کے ہاں یہی انسان کی پہچان ہے
اے خنک مرقد! خدا کے بندۂ افرشتہ خو!
کیوں نہ ہو ماتم ترا خانہ بخانہ کو بکو!

(۶)

فخر ہے مجھکو کہ ایسے باپ کا فرزند ہوں علم کی دولت سے مالا مال ہوں۔ خورسند ہوں
کس زباں سے اس عنایت کا ادا ہو شکریہ؟ فقر ورثہ میں مجھے دے کر سبھی کچھ دے دیا
زندگی میں جو دعائیں میری حرزِ جاں رہیں بھول جانا مشفقِ صادق نہ جنت میں کہیں
المدد اللہ کے پیارے! ترا پیارا ہوں میں
رہنمائی کر کہ تیری آنکھ کا تارا ہوں میں

امینِ حزیں سیالکوٹی

(بسلسلۂ ما سبق)

دَورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی

"سرقہ" یعنی چوری

"یہ صحیح ہے کہ محض نقالی یا سرقہ یا توارد یا فرسودگی کا خطرہ غزل میں بہ نسبت نظم کے زیادہ ہوتا ہے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ ملتے جلتے مضامین یا متوازیات (Parallelism) کس ادب اور کس زبان کی شاعری میں نہیں مفہوم میں مشابہت ہونا اور چیز ہے اور فرسودگی و پامالی یا سرقہ بالکل دوسری چیز ہے۔"

فراق صاحب کے اس بیان کا آخری حصہ سولہ آنا بالکل صحیح ہے مگر افسوس کہ دورِ حاضر کی غزل پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مضمون کی چوری ہمارے "اساتذہ" کی ایک پرانی عادت ہے۔ میر انیس نے کیا خوب کہا ہے کہ:

ممکن نہیں دزدانِ مضامیں سے نجات ۔۔۔ سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

اس محل پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ "بادشاہ متغزلین" یا دوسرے "اساتذہ" کی چوریاں کھولنے سے ہمارا منشا انکی تنقیص ہرگز نہیں بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ غزل گوئی کا دارومدار جب نقالی پر ہوگا اور "آپ بیتی" سے گریز کی جائیگی تو چوری ناگزیر ہے اسی نقالی نے غزل کے تنگ میدان کو تنگ تر بنا دیا ہے اور ہم غزلگو شعراء سے اکثر یہ شکایت سنتے ہیں کہ کہنے والے سب کچھ کہہ گئے اب غزل میں نیا مضمون کہاں سے لائے در حقیقت آج بھی غزل کے لیے مضامینِ تازہ کی کمی نہیں بشرطیکہ لکھنے والا "آپ بیتی" بیان کرے۔ مضمون کی آئندہ قسط میں انشاء اللہ ہم بکثرت اشعار اس قسم کے پیش کریں گے جن کے مضامین اس اعتبار سے چاہے نئے نہ ہوں کہ حقائق کی صورت میں بارہا لوگوں کو ان کا تجربہ ہو چکا ہے اور ہر روز ہوتا رہتا ہے مگر کم از کم اس لحاظ سے ضرور اچھوتے ہونگے کہ انہیں نظم کا جامہ نہیں پہنایا گیا خصوصاً صنفِ غزل اُن سے تقریباً بالکلیہ محروم ہے۔

چوری کا عام مفہوم تو ایک بچہ بھی سمجھتا ہے لیکن مضمون کی چوری ایک خاص نوعیت رکھتی ہے اس لئے اسکی تھوڑی تشریح ضروری ہے۔

اربابِ فن نے "سرقاتِ شعری" کی کئی قسمیں کی ہیں۔

پہلی قسم وہ ہے جسے اصطلاح میں "نسخ" اور "انتحال" کہتے ہیں اسکے یہ معنی ہیں کہ لفظ و معنی میں کسی قسم کا تغیر کئے بغیر دوسرے کا شعر کوئی اپنے نام سے منسوب کرلے۔ اس قسم کی چوری کا ارتکاب کوئی شاذونادر ہی کرتا ہے۔ البتہ ایسا بارہا ہوا ہے کہ کسی کے شعر میں دو ایک لفظ بدل دیے اور شعر کو اپنا بنا لیا۔

سرقہ کی دوسری قسم "اغارہ" اور "مسخ" کہلاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ کسی شعر کا پورا مضمون اور تمام الفاظ یا بعض الفاظ لیکر نظم کی ترتیب بدلکر اس سے ایک دوسرا شعر تیار کیا جائے۔ مثلاً میر کے اس شعر کو:

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں ۔۔۔ جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں

اسیر نے اس طرح "مسخ" کیا ہے:۔

وہ جو پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں — کہیو قاصد کہ دعا کرتے ہیں

یا مثلاً میر کے اس شعر کو:۔

لے بتو اس قدر جفا ہم پر — عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

شیریں (بیگم صاحبہ بھوپال) نے اس طرح اپنا بنالیا ہے:۔

کرو اتنی ہم پہ جور و جفا — اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ صرف دوسرے شعراء ہی میر صاحب کے کلام سے سرقہ کیا کرتے تھے۔ نہیں۔ بلکہ وہ بزرگوار خود بھی جب موقع ملتا تھا دوسروں کا مال اڑا لیتے تھے۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے:۔

یہ کہتے وہ کہتے ہم، یہ کہتے جو یار آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مگر دراصل یہ امیر خسرو کا مال ہے:۔

بدل گویم کہ اینہا خواہش گفت — چو او پیش نظر آید زباں کو

سرقہ کی تیسری قسم "سلخ" ہے۔ دوسرے کا مضمون لیکر اپنے الفاظ میں ادا کرنا اصطلاحاً "سلخ" کہلاتا ہے۔ اس قسم کی چوری کا ہمارے شعرا کے یہاں عام رواج ہے۔ ناسخ اس "فن" کے اُستاد تھے۔ شیفتہ کا ایک شعر ہے:۔

کھلتے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا

تسیم نے اسی مضمون کو لیکر اپنے الفاظ میں اس طرح باندھا ہے:۔

مقرر بلا آنے والی ہے کوئی — نہیں بے سبب مہربانی تمہاری

سرقہ کی پانچ قسمیں اور بھی ہیں جو "سرقۂ غیر ظاہر" کہلاتی ہیں مگر ہمارا مقصود چونکہ صرف "کھلی ہوئی چوری" یعنی سرقۂ ظاہر سے بحث کرنا ہے اس لئے سرقۂ غیر ظاہر کے اقسام سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ آئیے اب دیکھیں کہ "بادشاہِ متغزلین" اور دورِ حاضر کے دوسرے اساتذہ کے فراق صاحب کے متوازیات" Parallelisms" سے کام لیا ہے یا دوسروں کا گھر لوٹ کر اپنا گھر سجایا ہے۔

مولنا حسرت موہانی نے غالب کے اردو دیوان کی ایک شرح لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ شرح لکھنے کیلئے آپ کو دیوانِ غالب کا بہت اچھی طرح مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ شرح سے طلبا اور عام لوگوں کو جو کچھ فائدہ پہونچا ہو اس سے ہمیں بحث نہیں لیکن کلامِ غالب کے گہرے مطالعہ سے خود مولنا کو جو فائدہ پہونچا وہ البتہ قابلِ ذکر ہے۔ جس طرح بائسکل چرانے والا پکڑے جانے کے ڈر سے بائسکل کی گھنٹی۔ سیڈل۔ مڈگارڈ وغیرہ تبدیل کر دیتا ہے اور سائکل کے فریم پر نیا رنگ کرا لیتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی چرائے ہوئے مضامین کو اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ اُن کی ہیئتِ ظاہری بدل جانے کی وجہ سے عام نگاہیں انہیں پہچان نہیں سکتیں۔ مگر جس طرح پولیس کا تجربہ کار افسر جس کا کام ہی جرائم کی تفتیش کرنا ہے، ظاہری شکل کی تبدیلی کے باوجود چوری کی بائسکل کو پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح اہلِ نظر پر مضامین کی چوری کھل ہی جاتی ہے۔ دیوانِ حسرت میں درجنوں اشعار اس قسم کے موجود ہیں جو درحقیقت غالب کا مال ہیں مگر ناواقف لوگ انہیں حسرت صاحب کا زادۂ طبیعت سمجھتے اور انہیں پڑھ پڑھ کر حسرت صاحب کی معنی آفرینی کی داد دیتے ہیں۔ مثلاً:۔

حسرت:۔ ہیں اب یاں کو دیکھیں اٹھاتا ہے کون — در جاناں پہ دھونی رما بیٹھے
غالب:۔ اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

حسرت:۔ وہ جفاکار اور وفا حسرت — تیرے اب تک نہیں مذاق میں فرق
" :۔ مل چکی ہم کو اُن سے دادِ وفا — جو نہیں جانتے لگی دل کی
غالب:۔ ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حسرت:۔ کافی تھی مجھے دُردِ تہ جام بھی حسرت — کاسہ جو مرا مے سے وہ لبریز نہ کرتے
غالب:۔ کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

حسرت:۔ خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا ہے — تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی
غالب:۔ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

حسرت:۔ مل گیا اچھا سہارا عذرِ مستی کا ہمیں — لے لیا آغوش میں اُس گل کو بیباکانہ آج
غالب:۔ ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

حسرت:۔ چھیڑ ناحق نہ اے نسیمِ بہار — سیرِ گل کا یہاں کسے ہے دماغ
غالب:۔ فراقِ یار میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — کسے دماغ یہاں خندہ ہائے بیجا کا

حسرت:۔ جامہ زیبی نہ پوچھیے اُن کی — جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں
غالب:۔ لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں[1]

---

[1] نواب زادہ محمد یار خاں صاحب (رامپوری) شاگرد قائم و مصحفی، المتخلص بہ امیر کا یہ شعر اب تک رامپور کے لوگوں کی زبان پر ہے:۔

ہائے سُرخی ترے رخسار کی ہنگامِ عتاب — جتنا بگڑے ہے تو اُتنا ہی سنور جاتا ہے

ظنِ غالب ہے کہ میرزا غالب نے رامپور میں امیر کا یہ شعر سنا ہوگا اور یہیں سے یہ مضمون اخذ کیا ہے۔
شہیدی نے بھی یہ مضمون یہیں سے اُڑایا ہے:۔

غصے میں نیا رنگ نکالے ہیں پری رو — جیوں جیوں یہ بگڑتے ہیں سنور جاتے ہیں کیسے

حسرت:- شرحِ بے مہریِ احباب کروں کیا حسرت — رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہونچا تھا
غالب:- کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ — تم کو بے مہریِ ارباب وطن یاد نہیں

حسرت:- جان کر مجھ پہ ستم بھی ہو تو ہے منظورِ شوق — لطف بے پروائی میں کیا قدر کیوں پروا کروں
غالب:- جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

حسرت:- ہے غضب میں شیوۂ حسن کا فتراک، ناز — دل ہے جس میں اک شکارِ نیم جانِ اضطراب
غالب:- تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

حسرت:- مانا کہ یقینی ہے اثر جذبۂ دل کا — کیا ہوگا مگر ہجر میں تائیدِ اثر تک
غالب:- آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

حسرت:- نہ چھپا مجھ سے تو کاہے کو رازِ عاشقی کھلتا — نہیں باتوں سے میں رسوا ہوں ظالم تو بھی رسوا ہے
غالب:- دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

بخوفِ طوالت انہیں چند مثالوں پر اکتفا کی گئی ورنہ چوری کے مضامین سے مولٰنا صاحب کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ قانونِ اخلاق کی رو سے چوری ہر حال میں بری سمجھی جاتی ہے مگر شاعری کی دنیا ہی نرالی ہے۔ اربابِ فن کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شاعر دوسرے کا مضمون لیکر ایسا شعر کہے کہ پہلے شعر سے بڑھ جائے تو یہ "سرقہ" سزاوارِ نکوہش نہیں بلکہ لائقِ تحسین ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اسی خیال کو ایک شعر میں بیان کیا ہے:-

شاہدِ معنی کہ باشد جامۂ لفظش کہن — نکتہ دانے گر برپوشد تازہ پوشاند خوش است

مگر مندرجۂ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ "بادشاہِ متغزلین" کا کوئی ایک شعر بھی اپنے اصل سے بڑھنا تو کیا معنی اسکے برابر بھی نہ ہو سکا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بعض صورتوں میں غالب کے اشعار کو اس بری طرح تباہ کیا گیا ہے کہ مولٰنا کی خوش ذوقی سے بدگمانی ہونے لگتی ہے۔

"بادشاہِ متغزلین" کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے معاصرین جس طرح وہ "بادشاہِ مقلدین" کہلانے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں اسی طرح انہیں "دزدانِ مضامین کا بادشاہ" کہنا بھی عین انصاف ہے۔ موصوف نے صرف ایک دیوانِ غالب ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا بلکہ جس کسی کا جو خوبصورت مضمون آپ کو پسند آیا بے دھڑک اڑا لیا۔ بقول کسے:-

غارتِ بتخانۂ چیں کردہ است — تا صنمے چند گزیں کردہ است

اور پھر چوریاں بھی ایسی کھلی ہوئی کہ اُن سے واقف ہونے کے بعد مولٰنا کے ہر قدرداں بلکہ خود فراقؔ صاحب کو بھی شرم آنے لگے۔

بہت مثالیں ملاحظہ ہوں:

حسرت: ٹھہرا ہے اک نگاہِ کرم پر معاملہ — لے لطفِ یار مفت ہے جنسِ گرانِ دل
قلق: ادھر سے دیکھ رہ جاتا رہے گلہ دل کا — بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

حسرت: پہلے اک ذرۂ ذلیل تھا میں — تیری نسبت سے آفتاب ہوا
لاعلم: گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ — ذرۂ آفتاب تابانیم

حسرت: ہو گیا راہِ عشق میں جو شہید — وہ فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوا
": تجھ پہ مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے — ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد
حافظ: ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حسرت: عذرِ ستم ضرور نہ تھا آپ کے لئے — حسرت کو شرمسارِ ندامت نہ کیجئے
لاعلم: شرمندہ ام کردی مگو عذرِ جفا زیں بیشتر — من از تو ایں مقدار ہم آزردہ خاطر نیستم

حسرت: اس غم طلبی کی کوئی حد بھی ہے کہ حسرت — بیچین ہوئے ہم جو ہوا دردِ جگر بند
": زندگی درد پہ موقوف ہے اے چارہ گرو — یہ مری موت کے سامان ہیں کہ درماں کی صلاح
نواب صفدر علی خاں رامپوری: میرا مدارِ زیست ہی صفدر تڑپ پہ ہے — مرجاؤں ایک دم جو نہ ہو بیقرار دل

حسرت: بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی سرِ راہ — گذرے ادھر سے شاید وہ ذی جاہ
خواجہ غلام غوث بیخبر: بخت کجاست بیخبر تا بر کابِ او دوم — بر سرِ رہ نشستہ ام نیم نگاہم آرزوست

حسرت: کیا ہی شرمندہ چلے ہیں دلِ مہجور سے ہم — آئے تھے ان کی زیارت کو بڑی دور سے ہم
": آئے تھے محفل میں تیری باہزاراں آرزو — یاں چلے ہیں ایک لیکر خاطرِ ناشاد ہم
عرفی: از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم — ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

حسرت: اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار — اک بات ان میں اور بھی ہے کچھ ورائے ناز
حافظ: خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

حسرت:۔ آئی جو ترے روئے منور کے قریں شمع ہم لوگ یہی سمجھے کہ محفل میں نہیں شمع

خواجہ میر درد:۔ رات محفل میں ترے حسن کے شعلہ کے حضور شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

اللہ اللہ کیا "متوازیات" ہیں!

حسرت:۔ دیکھئے شوقِ شہادت میں جھکی ہے گردن آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں

مشتری:۔ ہم جھکائے ہوئے ہیں دیرسے سر آپ خنجر لگائیے تو سہی

حسرت:۔ دور ہم اُن کی بزم سے جیتے رہے تو کیا رہے آہ وہ زندگی جسے غم نے وبال کر دیا

لاادری:۔ چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں خاک ایسی زندگی پر ہم کہیں اور تم کہیں

حسرت:۔ ارادے تھے کہ اُن سے حالِ دل سب ملکے کہدینگے مگر ملنے پہ ہم سے آج ہوتا ہے نہ کل کہنا

میر:۔ یہ کہتے وہ کہتے ہم یہ کہتے جو یار آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

حسرت:۔ میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر یہ دیکھئے مناسب شانِ عطا ہے کیا

خیام:۔ من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

حسرت:۔ مجبور مجھکو جان کے عہد وفا کے بعد بے مہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد

"۔ وہ اب یہ کہتے ہیں دیکھا کرے نہ تو مجھکو سمجھ لیا ہے جو مجبورِ آرزو مجھکو

" "۔ مجبور وفا کر کے محرومِ کرم کرنا بھولیں گی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری

شہیدی:۔ وہ کب خاطر میں لاتا ہے مرے آزردہ ہونے کو یہ سُن رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کم نکلتا ہے

حسرت:۔ ضبطِ رازِ عشق نے رخصت نہ دی فریاد کی آکے لب تک رہ گئے شکوے تری بیداد کے

داغ:۔ کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری لب پہ رہجاتی ہے آآکے شکایت تیری

حسرت:۔ یہ آج ہم سے جو چاہت جتائی جاتی ہے عدو سے ملنے کی خفت مٹائی جاتی ہے

مومن:۔ آج وہ غیر سے ملنے کی قسم کھاتے ہیں خود بخود منفعل جو رہیں شرماتے ہیں

حسرتؔ:- تقاضا کر رہا ہے یہ حسنِ تازہ کار اُن کا ۔۔۔ کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے
داغؔ:- دل لیکے وہ اب جان طلب کرتے ہیں ہم سے ۔۔۔ یہ ایسی دھری ہے کہ اٹھائی نہیں جاتی

حسرتؔ:- قُرب میں ہے نہ بُعدِ یار میں تھا ۔۔۔ جو مزہ اس کے انتظار میں تھا
لا اعلم:- نہ کبھی وصلِ یار میں دیکھا ۔۔۔ جو مزہ انتظار میں دیکھا

حسرتؔ:- اپنی ہستی سے بھی آخر ہو گیا بیگانہ میں ۔۔۔ اُن سے جب جا کر ہوئی حاصل شناسائی مجھے
سلطان ابوسعید ابوالخیر:- ہر کس بتو رہ یافت زخود گم گردید ۔۔۔ آنکس کہ ترا شناخت خود را نشناخت

حسرتؔ:- ہر پھول چمن میں زرِ بکف ہے ۔۔۔ بانٹے ہیں بہار نے خزانے
آتشؔ:- زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف ۔۔۔ قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

حسرتؔ:- ہر صبح جہاں وہ جلوہ گر ہوں ۔۔۔ جاتے ہیں وہاں رواں دواں ہم
لا اعلم:- علی الصباح چو مردم بکار و بار روند ۔۔۔ بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

حسرتؔ:- پھرتی رہتی ہے آدمی کو لئے ۔۔۔ خوار دُنیا میں آدمی کی ہوس
خواجہ میر دردؔ:- حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں سب رنہ یاں ۔۔۔ اپنے اپنے بوریئے پر جو گدا تھا شیر تھا

حسرتؔ:- رواں ہے قافلہ سوئے عدم اربابِ محنت کا ۔۔۔ گیا پہلے ہی دل اب جانِ مخزوں کی ہے تیاری
داغؔ:- ہوش و حواس تاب و تواں داغؔ جا چکے ۔۔۔ اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

حسرتؔ:- ناواقفِ بے ثباتیٔ گُل ۔۔۔ بلبل ہیں کہ محوِ رنگ و بو ہیں
لا اعلم:- غنچۂ گُل میں دھرا کیا ہے بتالے بلبل ۔۔۔ جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے

حسرتؔ:- پیرانہ سر بھی شوق کی ہمت بلند ہے ۔۔۔ خواہانِ کامِ جاں ہیں جو اس نوجواں سے ہم
ظہیر فاریابی:- طفلِ شوخے بُردہ از کف اختیارم اے ظہیر ۔۔۔ در ہوائے عشق او در کہنہ سالی می روم

حسرتؔ: کچھ محبت بھی عجب شے ہے کہ حسرتؔ سا غیور — اور لے آپ نے خود کردہ دشنام کیا

نواب یوسف علیخاں ناظمؔ: اُلفت بھی کیا بلا ہے کہ ناظمؔ سا آدمی — منت کش عدو سر بازار ہوگیا

اس میں داغؔ کا یہ مصرع بھی شامل کر لیجیے: "معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی" تو ماخذ کی حقیقت اور زیادہ واضح ہوجائیگی۔

حسرتؔ: غم سے نہیں ایک دل بھی آزاد — فریاد ز دستِ عشق فریاد

سلطان ابوسعید ابوالخیر: ———— — وافریاد از عشق وافریاد

حسرتؔ: گو ترک آرزو کو زمانہ گذر گیا — لیکن گئیں نہ ہم سے تری سرگرانیاں

داغؔ: ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہیں — جن سے مطلب نہیں رہتا ہے ستاتے بھی نہیں

حسرتؔ: دیکھئے کوئی نیرنگِ محبت کے کرشمے — کرتے ہیں جفا آپ تو دیتا ہوں دُعائیں

حافظؔ: بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

حسرتؔ: آسرا ہم بھی لگائے ہوئے بیٹھے ہیں ترا — اس طرف بھی کوئی ہوجائے عنایت کی نظر

سوداؔ: گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

"بادشاہِ متغزلین" نے اپنے کلام میں "صنعتِ سرقہ" کا استعمال اس کثرت سے کیا ہے کہ اگر سارے "مال مسروقہ" کی مفصل و مکمل فہرست پیش کرنا ہو تو موصوف کے دیوان کو بیشتر حصہ نقل کرنا پڑیگا اس لئے صرف چند مثالوں پر اکتفا کی گئی۔ قارئین خود فیصلہ کریں کہ مولنا صاحب کی یہ "دستبرد" کھلی ہوئی چوری ہے یا فراق صاحب کے "متوازیات" میں اسکا شمار ہے۔

"نشاطِ روح" کے مقدمہ نگار مولنا سہیل کے نزدیک یوں تو اصغرؔ صاحب کا ہر شعر آپ ہی اپنا جواب ہے مگر موصوف نے مخصوص عنوانات کے ماتحت جو اشعار مثال کے طور پر پیش کئے ہیں انکی حیثیت ادبی معجزوں سے کم نہیں عنوان "بت تراشی" کے ماتحت آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اصغرؔ صاحب کی شاعری چونکہ جامع حیثیات ہے لہذا عنوانِ موسیقی کی طرح اس موقع پر بھی جو اشعار نقل کئے جاتے ہیں اُن میں اُس حسنِ مخصوص (بداعت اسلوب) کے علاوہ اور محاسن بھی ہیں مگر ندرتِ بیان کا پہلو زیادہ نمایاں ہے اس لئے یہی سرخی اُن کے لئے زیادہ مناسب ہے۔"

اس تمہید کے بعد تین شعر نقل کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

سہیل صاحب نے اس شعر کی مزید تفسیر اس طرح فرمائی ہے:

"وارفتگیِ شوق کے عالم میں تخیلہ جس صورت کو ہمارے سامنے محبوب بنا کر پیش کرتا ہے وہ حقیقت میں خود ہماری ہی جذبات کی کرشمہ سازی ہوتی ہے۔ ہم اس حقیقت کا احساس اُس وقت کرتے ہیں جب وہ ولولہ باقی نہیں رہتا اور نگاہ و بصیرت کے سامنے سے استیلائے شوق کا حجاب اُٹھ جاتا ہے۔ اس فلسفیانہ نکتہ کے علاوہ تصوّف کا پہلو بھی اس شعر میں موجود ہے۔ اس دقیق فلسفہ کو جس مؤثر پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اصغرؔ صاحب کا حصہ ہے"

ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس شعر میں اصغرؔ صاحب نے نہ کوئی فلسفیانہ نکتہ بیان فرمایا ہے نہ کوئی تصوّف کا مسئلہ حل کیا ہے۔ سہیلؔ صاحب نے جو کچھ کہا وہ خود ان کے اپنے تخیل کی پرواز اور جودتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اصغرؔ صاحب بیچارے پر نہ کبھی یہ کیفیت طاری ہوتی تھی نہ اُنہوں نے اسے بیان کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ سہیلؔ صاحب کی یہ "تشریح" پڑھکر اصغرؔ صاحب خود بھی ہکا بکا رہ گئے ہونگے۔ لیجئے اب راز کی بات ہم آپ کو بتائیں۔

راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس　　کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

حقیقت صرف اتنی ہے کہ اصغرؔ صاحب نے چوری کی ہے اور بہت بے سلیقگی سے کی ہے اس لئے شعر کا مفہوم کچھ سے کچھ ہوگیا۔ کہنے والے نے اس طرح کہا تھا۔

خواب دیدم کہ ترا دست بدامن زدہ ام　　در گریبانِ خودم بود چو بیدار شدم[1]

(میں نے خواب میں دیکھا کہ تیرا دامن میرے ہاتھ میں ہے مگر جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خود اپنا گریبان پکڑے ہوئے ہوں۔)

"خواب دیدم" کا ٹکڑا جو سارے شعر کی بنیاد ہے اصغرؔ صاحب سے چھوٹ گیا۔ اس لئے مضمون الجھ کر رہ گیا اور سہیلؔ صاحب کو ضرورت پیش آئی کہ "وارفتگیِ شوق کے عالم میں تخیلہ" سے کام لیکر "سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا" کو "جذبات کی کرشمہ سازی" قرار دیں اور "جب آنکھ کھلی" تو ولولہ کے باقی نہ رہنے سے تعبیر کریں۔ فارسی شعر کی طرح اگر اصغرؔ صاحب کے یہاں بھی "خواب دیدم" کا ہم معنی کوئی ٹکڑا موجود ہوتا تو "آنکھ کھلی" کا مطلب بیان کرنے کیلئے کسی تاویل کی ضرورت نہ تھی۔

یہ ہے اصغرؔ صاحب کا ادبی معجزہ جسے "بداعتِ اسلوب" کا ایک نادر نمونہ، فلسفہ کا ایک دقیق نکتہ اور تصوّف کا ایک نازک مسئلہ کہا جاتا ہے اور جس پر "نشاطِ روح" کے مقدمہ نگاروں کو ناز ہے۔ کیا اب بھی سہیلؔ صاحب اپنے اس جملہ کو دہرانے کیلئے تیار ہیں کہ یہ "صرف اصغرؔ صاحب کا حصہ ہے"۔ ہمارے نزدیک تو دورِ حاضر کے سبھی اساتذہ اس "صنعت گری" میں برابر کے شریک ہیں۔

اصغرؔ صاحب کا ایک اور "معرکۃ الآرا" شعر ہے۔

تھی ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں　　آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

اگر آپ اس شعر کے محاسن سے پورے طور پر واقف ہونا چاہتے ہیں تو مولنا سہیلؔ اور مولنا احسان احمد سے رجوع کیجئے۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہاں بھی اصغرؔ صاحب نے چوری کے مال سے اپنا گھر سجایا ہے مگر اس بھدّے پن سے کہ مضمون کا سارا حسن خاک میں مل گیا۔ اب ذرا اس کا ماخذ دیکھئے جو ادبی دنیا میں کافی شہرت رکھتا ہے اور اقبالؔ مرحوم نے "رموزِ بیخودی" میں بتصرف اُسے تضمین بھی کیا ہے۔

---

[1] مدت ہوئی آتشکدۂ آذر میں یہ شعر میری نظر سے گذرا تھا۔ مصنف کا نام اس وقت یاد نہیں مگر تلاش سے مل سکتا ہے۔　　(شاہدانی)

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر　　یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

مرزا غالب کے بعض اشعار کو بھی آپ نے "سلخ" کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اصغر:۔ ہے تلوّن سے ترے جلوۂ نیرنگ حیات　　میں تو مر جاؤں جو امید وفا ہو جائے

اب تو غالب کا یہ مشہور شعر آپ کو خود ہی یاد آگیا ہوگا یعنی:۔

ترے وعدہ پر جیا میں تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتا اگر اعتبار ہوتا

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:۔

اصغر:۔ اک شور انا لیلیٰ خلقت نے سنا لیکن　　پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی

شاید غالب کا یہ شعر حضرت اصغر کی نظر سے نہیں گذرا:۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　صحرا مگر بتنگی چشم حسود تھا

"نشاطِ روح" کے مقدمہ نگار کے بقول چونکہ اصغر صاحب بادۂ عرفان کے ذوق شناس تھے اس لئے کبھی کبھی انا الحق کہنے اور ثانی منصور بننے کو آپ کا جی چاہا کرتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں　　خون میں گرمی ہنگامۂ منصور ہے آج

آپ کے دوایح معرفت کا سمجھنا تو ہم جیسے دنیاداروں کے بس کی بات نہیں مگر اتنا ظاہر ہے کہ عالم وجد میں آپ جو اشعار فرماتے تھے، ان میں "صنعت سرقہ" کا استعمال ضرور کرتے تھے۔ چنانچہ یہ شعر بھی آپ نے فارسی کے اس مشہور شعر کو بگاڑ کر بنایا ہے:۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد　　من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

اور آپ کے بیان کئے ہوئے "حکیمانہ نکتے" بھی عموماً مانگے کے زیور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا یہ شعر پڑھکر:۔

ماورائے سخن بھی ہے اک بات　　بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

فارسی اور اردو کے یہ دو مشہور مصرعے یاد آجاتے ہیں:۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

اصغر:۔ یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے　　جمالِ دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی

شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ مضمون خیام کا مال ہے بھلا کہاں حضرت اصغر اور کہاں شب ماہ میں بادۂ عنبی کا دور۔ کوئی پوچھے جناب اس شعر کے کہنے کی زحمت کس لئے گوارا فرمائی۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ محبوب بغل میں ہے۔ شراب کا دور چل رہا ہے۔ بھلا یہ صحبت حضرت جیسے متقشف بزرگوں کے نصیب میں کہاں۔ یہ تو خیام جیسے رندان درد آشام ہی کا حصّہ ہے۔ خیام نے اس مضمون کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ متعدد رباعیوں میں باندھا ہے۔ مثلاً:۔

ساقی عیش است و مہ برافروختہ است　　مے دہ کہ فلک نکتہ آموختہ است

دانی کہ اجل چو برق خرمن سوز است　　تا در نگری خرمن ما سوختہ است

دوران جہاں بی مو وساقی ہیچ است   بی زمزمہ نائے عراقی ہیچ است
ہرچند در احوالِ جہاں مینگرم   حاصل ہمہ عشرت است و باقی ہیچ است

می نوش بنورِ ماہ، اے ماہ کہ ماہ   بسیار بتابد و نیابد ما را

مہتاب بنور دامن شب بشگافت   مے خور کہ دمے خوشتر ازیں نتواں یافت

زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں کیونکہ ہمیں ابھی دوسرے "اساتذہ" کی بھی "تلاشی" لینی ہے لہذا صرف ایک شعر اور سُن لیجئے:-

پھر یہ سب شورش و ہنگامۂ عالم کیا ہے   اسی پردہ میں اگر حسن جنوں ساز نہیں

مرزا غالب نے اس طرح کہا تھا:-

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اصغر صاحب نے جتنے الفاظ بڑھائے اتنا ہی شعر گھٹ گیا۔ کاش فراق صاحب لمحات فرصت میں ٹھنڈے دل سے اس پر غور فرمائیں کہ ان اشعار پر سرقہ کا اطلاق زیادہ صحیح ہے یا متوازیات (Parallelism) کا۔

دورِ حاضر کے دوسرے بلند پایہ "اُستاد" حضرتِ فانی بھی "صنعت سرقہ" کے استعمال میں اپنے معاصرین سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے! اور دیوانِ غالب کی لُوٹ میں سے آپ کو بھی کافی حصہ ملا ہے۔ سُنئے:-

فانی:- قدم نکال کے گھر سے باہر جو دم بھی سینہ سے نکلا   دکھا نہ اب انتظار حد کہ ہے انتظار میرا (اُٹھا)
غالب:- آمد ہے نزع میں چل بے وفا خدا کے لئے   مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

فانی:- دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا   جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا
غالب:- گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

فانی:- آئے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت   احباب سے غمخوار ہوا بھی نہیں جاتا
غالب:- یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

فانی:- جتنے غم چاہے دئے جا مجھے یارب لیکن   ہر نئے غم کیلئے تازہ جگر پیدا کر
غالب:- میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

فانی:- فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود — شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

غالب:- آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

غالبؔ کے علاوہ آپ نے دوسرے اساتذہ کے کلام سے بھی دل کھول کے "استفادہ" کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

فانی:- دنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ — بے اختیار آکے رہا بے خبر گیا

ذوق:- لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

"صنعتِ سرقہ" کی اس سے بہتر مثال ملنی محال ہے۔

فانی:- بیداد کے اس تیور اس حسن کے میں صدقے — ان کو مرے رونے پر آئی تو ہنسی آئی

میر:- مجھکو روتا دیکھ اُسنے ہنس دیا — برق چمکی ابرِ باراں تھم رہا

فانی:- اس نے کیا سینۂ صد چاک سے کھینچا فانی — دل ہی کہتا ہوں وہ کہتا ہے کہ پیکاں نکلا

لا اعلم:- دل بھی سینہ سے کھنچ آیا ترے پیکاں کے ساتھ — صاحبِ خانہ کو لیتا ہوا مہماں نکلا

فانی:- آج روزِ وصال فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

امیر:- مدت سے امیر اس سے ملنے کی تمنا تھی — آج اُس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

فانی:- نہ بن انجان ظالم لاکھ بے تاثیر ہوں نالے — خبر دل کی نہ ہو دل کو کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

لا اعلم:- دل را بدل رہیست دریں گنبدِ سپہر — از سوئے کینہ کینہ و از سوئے مہر مہر

فانی:- فانی کے دل کے ساتھ تقاضا ہے جان کا — ظالم اس ابتدا کی کوئی انتہا بھی ہے

داغ:- دل لیکے وہ اب جان طلب کرتے ہیں ہم سے — یہ ایسی دھری ہے کہ اٹھائی نہیں جاتی

فانی:- تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے — کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

داغ:- یہاں بھی تو وہاں بھی تو زمیں تیری فلک تیرا — کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

فانی:- وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا — نارسائی سی نارسائی ہے

لا اعلم:- اے برتر از خیال و گمان و قیاس و وہم

فانی۔ کفن لے گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے
امیر۔ کسی کے منہ سے نہ نکلا ہمارے دفن کے وقت کہ ان پہ خاک نہ ڈالو یہ ہیں نہائے ہوئے
لاعلم۔ زمین تجھ میں شہیدانِ ناز دفن تو ہیں یہ ہے خیال کہ ان کا نہ ہو کفن میلا

ایک جگہ سے آپ نے کفن چرایا دوسری جگہ سے غسل۔ چلئے کفن دفن کا پورا سامان مہیا ہو گیا۔

حضرت جگر کا دیوان چونکہ اصغر و فانی کے دیوانوں سے کہیں زیادہ بڑا ہے اس لئے آپ کو سرقہ بھی زیادہ کرنا پڑا ہے۔ غالب کا دیوان دورِ حاضر کے چوٹی کے غزلگویوں کی مشترکہ ملکیت ہے اس لئے جگر صاحب کو بھی اس میں سے معتدبہ حصہ ملا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے ۔

جگر۔ تو کہاں یہ غریب خانہ کہاں وہم ہے یا گمان ہے پیارے
غالب۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جگر۔ موت سے ڈر نہیں مگر ہے یہ دھسم عشق بے خانماں نہ ہو جائے
غالب۔ آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

جگر۔ اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے
غالب۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

جگر کے اس شعر میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ سوال تو ہے شخص حاضر سے اور الفاظ ایسے جو غائب کیلئے استعمال ہونے چاہئیں۔ اگر ہم کسی سے اسی کے متعلق دریافت کریں تو اس طرح خطاب کرینگے کہ "اے دیوانے تو کون ہے"۔ ہاں اگر کسی دوسرے شخص کے بارے میں مخاطب سے سوال ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ "یہ دیوانہ کون ہے"۔ الغرض "یہ" شخص غائب کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس محل پر بالکل غلط ہے۔

جگر۔ تصویر امیدوں کی آئینہ ملالوں کا انسان جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا
غالب۔ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال،

جگر۔ سر رکھ ہی دیا سنگِ درِ یار پہ میں نے اب حشر ہی اٹھے تو مجھے کچھ نہ خبر ہو
غالب۔ اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

جگر۔ میں وہاں ہوں نہیں جہاں میں بھی عالم و ماورائے عالم کیا
غالب۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

جگر۔ تو سامنے ہے پھر بھی بتا کہ تو کہاں ہے — کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

غالب۔ نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا

غالب کے علاوہ اور بھی جس کسی کا جو مضمون آپ کو پسند آیا ہے آپ نے ازراہِ قدردانی اپنے کلام میں داخل کر لیا ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے ہمارے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

جگر۔ صبح تک یہ یادگارِ عشق بھی افسانہ تھی — شمع اب ہے دفن جس جا تربتِ پروانہ تھی

سرور جہان آبادی۔ صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا — یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک[1]

جگر۔ لاکھوں میں جگر اس نے پہچان لیا تم کو — چھپتی ہے چھپائے سے کب آنکھ محبت کی

داغ۔ عشق منہ پر مرے لکھا ہو تو کیا اس کا علاج — جان پہچان نہ تھی اور وہ پہچان گئے

جگر۔ محشر میں بات بھی نہ زباں سے نکل سکی — کیا جھک کے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

عالیجاہ فضا لکھنوی۔ محشر میں مسکرا کے گلے سے لگا لیا — کشتوں سے اپنی چال قیامت کی چل گئے

جگر۔ بعد مرنے کے بھی قرار نہیں — مرگِ ناکام اس کو کہتے ہیں

مومن۔ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جگر۔ وہ ہنس رہے ہیں مرے حال پر ہنسا کرتے — یہ بہہ رہے ہیں جو آنسو یونہی بہا کرتے

میر۔ مجھ کو روتا دیکھ کے اس نے ہنس دیا — برق چمکی ابرِ باراں تھم رہا

جگر۔ ایک تجلی ایک تبسم ایک نگاہِ بندہ نواز — اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہیے

غنیمت۔ بگفتا قیمتش گفتم نگاہے — بگفتا کمترک گفتم کہ گاہے

جگر۔ کس ادا پر جان دوں تو ہی بتا اے حسنِ یار — جس ادا کو دیکھتا ہوں حسن کی تصویر ہے

نظیری۔ ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

---

[1] فراق صاحب نے اس شعر کو آسی غازیپوری کی طرف منسوب کیا ہے مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ شعر سرور جہان آبادی کا ہے۔ (شادانی)

جگر:- چُنے ہیں میں نے بھی کچھ پھول تیرے باغِ معنیٰ کے — الٰہی تو اگر حسنِ قبول اُن کو عطا کر دے
امیر:- میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول — پھول کچھ میں نے چُنے ہیں اُن کے دامن کیلئے

جگر:- صبح تک ہجر میں کیا دیکھئے کیا ہوتا ہے — شام ہی سے مرے قابو میں نہیں دل میرا
لاعلم:- نہیں ہے آج تو دل شام ہی سے قابو میں — سحر تک اے مرے پروردگار کیا ہوگا

جگر:- بیٹھے ہی بیٹھے آگیا کیا جانے کیا خیال — پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم
باشناگردِ آتش:- دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئیے کیا یاد آیا

جگر:- نہ چھیڑ اُن کے تصور میں اے بہار مجھے — کہ بوئے گل بھی ہے اس وقت ناگوار مجھے
لاعلم:- ———— — کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

جگر:- ہجومِ یاس میں کوشش نہ کوئی کام آئی — تسلیوں نے کیا اور بیقرار مجھے
داغ:- تسلیاں مجھے دے دے کے بیقرار کیا

جگر:- ہاں چلے دور میں ساقی مے گلفام چلے — دن چلے رات چلے صبح چلے شام چلے
لاعلم:- دَور چلے دَور چلے ساقیا — اور چلے اور چلے ساقیا

جگر:- جب دل پہ نظر کی تری صورت نظر آئی — آغوشِ محبت میں محبت نظر آئی
لاعلم:- دل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار — جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

جگر:- اے فلک اب تجھے تو دکھلا دوں — زورِ بازوئے بیکسی کیا ہے
داغ:- پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں — جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغؔ نام نہیں

جگر:- موسیٰ کی طرح کون سُنے لن ترانیاں — بے عیب ہے جو حسن تو پردہ نہ کیجئے
لاعلم:- خوبرویاں کشادہ رُو باشند — تو کہ روبستہ مگر زشتی

جگر:۔	نگاہوں سے چھپکر کہاں جایئے گا	جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا
لا اعلم:۔	جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں	مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

جگر:۔	ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدۂ و دل کی خاطر	لوگ کہتے ہیں دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
لا اعلم:۔	کونسی کی نہ دوا کونسی مانگی نہ دعا	ہم نے کیا کیا نہ کیا اپنے سنبھلنے کیلئے

جگر:۔	جگر میں نے چھپایا لاکھ اپنا دردِ غم لیکن	بیاں کردیں مری صورت نے سب کیفیتیں دل کی
لا اعلم:۔	حالِ دل آنکھوں سے عیاں ہو گیا	لاکھ چھپایا یہ بیاں ہو گیا

جگر:۔	دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے	جب کوئی آسرا نہیں ہوتا
ذوق:۔	اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس	بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کیلئے

جگر	پی رہا ہوں آنکھوں آنکھوں میں شراب	اب نہ شیشہ ہے نہ کوئی جام ہے
لا اعلم:۔	آنکھوں آنکھوں میں پلادی مرے ساقی نے مجھے	اب نہ شیشہ کی ضرورت ہے نہ پیمانہ کی

"بادشاہِ متغزلین" اور دَورِ حاضر کے چوٹی کے غزل گویوں کی یہ "اخلاقی جرأت" دیکھکر حیرت ہوتی ہی کہ کس طرح انہوں نے بے دھڑک دوسروں کا مال چرا کر اپنا گھر بھر لیا اور اب اُسے اپنے نام سے دُنیا کے سامنے پیش کر کے اپنی "مضمون آفرینی" کی داد چاہتے ہیں۔ مگر ان بزرگوں سے زیادہ تعریف کے مستحق وہ مقدمہ نگار حضرات ہیں جنہوں نے ان "دزدانِ مضامین" کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ "بادشاہِ متغزلین" اور دوسرے "اساتذہ" کے مذکورہ بالا اشعار اور انکے متوازیات کے مطالعہ کے بعد فراق صاحب ضرور اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ سرقہ اور متوازیات تو یقیناً ایک چیز نہیں مگر ہمارے "اساتذہ" نے جس "صنعت" کا بکثرت استعمال کیا ہی اسکا صرف ایک ہی نام ہے یعنی سرقہ۔

جیسا کہ میں ابتدا میں کہہ چکا ہوں، ان چوریوں کی گرفت سے میرا منشا کسی کی تنقیص ہرگز نہیں بلکہ یہ دکھانا مقصود ہی کہ غزلگوئی کا دارومدار جب نقالی پر ہوگا اور آپ بیتی کے بیان سے احتراز کیا جائیگا تو غزل کا میدان جو اپنی وضع کی بنا پر پہلے ہی تنگ ہے اور بھی تنگ ہو جائیگا اور چوری کے بغیر کام نہیں چلے گا۔

بعض اشعار کے ساتھ شاعر کا نام لکھنے کے بجائے میں نے لا اعلم لکھدیا ہی۔ بات یہ ہی کہ یہ سب اشعار قلم برداشتہ صرف حافظہ کی مدد سے نقل کئے گئے ہیں۔ لکھتے وقت جس شاعر کا نام یاد آگیا شعر کے ساتھ لکھدیا باقی کو چھوڑ دیا۔ تاہم یہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جن لوگوں کا کلام پیش کیا گیا ہی ان سب کو حسرت، اصغر، فانی اور جگر پر تقدم زمانی حاصل ہے۔

عندلیب شادانی

مُفت کی چوٹ

مالداروں سے کہتا ہوں، جو ہم بیچارے مصنّفوں کے آذوقے ہیں کہ لکھیں تو روزی ورنہ روزہ، بھاڑ ہی مارا کرتے ہیں، بات یہ ہے کہ
ت تھے سفیہہ صاحب، پورا نام لیجئے تو یوں کہیئے کہ مرزا سفیہہ بیگ صاحب بالقابہ، پیسے والے باپ کے پیسے والے بیٹے، آپ نے ادھیڑ عُمر میں
ں کہ یہی کوئی چالیس پچاس برس کے سِن میں روز روز کا دفتر جانا فضول سمجھا۔ اور لگے فرصت کی زندگی بسر کرنے۔ پھر، پیٹ بھرے
تھے ہی لازماً سوجھی کہ لاؤ بھی کوئی کتاب ہی لکھ ڈالو، کتاب لکھنے پر جب سے اُکسایا وہ صرف ایک خیال تھا، جو ہفتے کی شام کو کلب گھر کے
ہے بچے گھر آرہے تھے کہ اُن پر مسلط ہوگیا خیال کی ذات ہی یہ ہوتی ہے۔ رات حسین تھی، اور خیال اُن پر عرش سے اُترا ہے، معلوم ہوتا
ما۔ خیال یہ تھا کہ یہ جو ہر فن میں، ہر علم میں لوگ طرح طرح کی جدّتیں دکھاتے، بال کی کھال نکالتے، اور دُور کی کوڑی لایا کرتے ہیں، یہ
ہو نہ ہو آب و ہوا کے زور سے ہے۔ خیال اچھوتا تھا، اس سے پہلے نہ خود بدولت کی کھوپڑی میں آیا تھا نہ شاید کسی اور بھلے آدمی کے۔
ں کی سادگی! جیسے گھاس کا تنکا، مگر دماغ میں جتنا گھمایئے اتنے ہی عظیم الشان امکانات۔ رات گئے تک آنکھ نہ لگی، کروٹ کروٹ اسی
ں ادھیڑ بُن، اسی کا ناپ تول کرتے رہے، خیال بھی اپنی وضع کا ایک ہی جنجال تھا۔ پھیلا تو ایسا پھیلا جیسے اگاس بیل، یعنی خدا کی خدائی میں
کچھ تھا، ہے، یا ہوگا، سب اس کی لپیٹ میں آگیا۔ کم سے کم یہ مسئلہ تو ضرور کہ اگر آب و ہوا میں اور دو ایک چیزیں بڑھا دی جائیں مثلاً
سطح سمندر سے بلندی، اور اُس کا قدرتی نتیجہ ہوا کی کمی، تو؟ مگر یہ سب چیزیں شاید آب و ہوا میں مانی ہی جاسکتی ہوں!

آج تک لوگ سمجھتے تھے، یقیناً بے سمجھی سے، کہ قومیں اور تہذیبیں جتنی بھی ہیں اُن کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے، میلان اور ذہنیت
ہوتی ہے، مگر الفاظ کے اس گورکھ دھندے کا مطلب اُن کے نزدیک صرف اسی قدر تھا کہ کوئی نہیں جانتا کہ آخر یہ ہیں کیا۔ یہ جانتے
تھے مرزا سفیہہ بیگ صاحب بالقابہ، جانتے تھے۔ خیال کیا معنی ایک الہام تھا۔

رات کا پچھلا پہر نہایت آرام سے سوئے، اور صبح کو، یہ تھے اور ان کا خیال، کتاب شروع ہوگئی۔ کاروباری آدمی تھے، تقدیر کی
بدمذاقی۔ ایسی زبردست مُہم، اور تمت بالخیر تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، انہی کا ظرف۔ روپے کی ریل پیل، قسمت کی دوسری ستم ظرافت ا
خری صفحے کا انجام بخیر ہونے تک انتظار، امیر کا استقلال۔ گر کی یہ بات گرہ میں ضرور تھی کہ کاروبار میں تہی دستی کا ٹٹو نہیں چلتا، خالی
پھلکوں اڑا اڑ جاتے۔ ناشر کے پاس کچھ لیکر ہی جانا ہوگا۔ کچھ کیا معنی، مسودہ۔ نام کے بارے میں کوئی دبدھا نہ تھی، اس میں خلفشار ہی کیا،
رکھ دینگے "آدمی اور فطرت"۔ خیال کے ساتھ نام بھی القا ہوگیا تھا۔ اور اب کچھ بھی ہو یہ تھا کتاب کا نام، اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی
کائنات کا ایک جزو، ناشر تو پکا پکایا تھا ہی، اب اُس سے مُلاقات کا وقت بھی پکا ہوگیا۔ بڑے تپاک سے آؤ بھگت ہوئی، منیجر نے، سکرٹری نے
یا کسی اور نے نہیں خود ناشر نے کی، بہ نفس نفیس، یہ اور بات ہے کہ شہر کے ساہوکارے میں وہ نقد سے زیادہ اُدھار کھاتے ہیں جمع تھا،
ہاں، تو اس نے وہ برتاؤ کیا، وہ تعریف کے پُل باندھے کہ سفیہہ صاحب پھول گئے، جیتے جی جنت دکھائی دے گئی۔ روپیہ ہوا تو کیا، آدمی
تو مصنف ہو بس۔ ناشر نے ان کی ساری کتھا سُن کے، کلے کی انگلی سے ناک کی نوک کھجا کر تجویز پیش کی کہ سفیہہ صاحب کتاب کی چھپائی کے،
بندھائی کے دام دیں، پھر ناشر اُسے مشتہر کرے، اور بیچے، اور اتنی رقم سفیہہ صاحب کے حوالے کرے، مگر سفیہہ صاحب نے نہ مانی، کاروباری

آدمی تھے کہ دل لگی۔ پتھر کی دیوار ہو کہ آدمی کا دل، آر پار دیکھ سکتے تھے، اب ناشر نے دوسری بات کہی، مشورہ دیا کہ پہلو سے گفتگو کی۔ یقیناً وہ کتاب کی اشاعت پر تُلا ہوا تھا، اتنا تو سفیہہ صاحب بھی ضرور تاڑ گئے۔ بالآخر ناشر نے وہ کہا جسے مرزا صاحب نے بھی مان لیا کہ ہاں اس میں بے شک جوکھم نہیں، یہ ہے باون تولے پاؤ رتی محفوظ، کاروباری تجویز: ناشر معمولی طریقے پر کتاب شائع کر دے، اور پھر وہ اور سفیہہ مل کر حصہ بانٹ لیں، اور برابر کا بانٹ لیں۔ نصیبِ دشمناں ٹوٹا آئے تو دونوں کے ذمے اور نفع ہو تو دونوں ساجھی! سفیہہ صاحب خوش ہوئے کہ اب کہیں جا کر کاروباری سمجھ سے پہلی دفعہ یہ گتھی سلجھی۔ معاملہ طے ہو گیا اور اشاعت کی تاریخ بھی بدگئی، اپریل کی پندرہ۔

"شہر میں کُتب بینی کا زمانہ . . . . . " ناشر نے کہا۔

"اگست کا مہینہ . . . . " سفیہہ صاحب نے کہا۔

"نئی کتاب کیلئے نہایت نحس" قطعی فیصلہ ہوا۔

دوسرے ہی دن سفیہہ صاحب کو مصنف بننے کے مزے آنے لگے۔

ناشر کا ایک خط آیا۔ تقدیر کا لکھا۔ معلوم ہوا کہ "آدمی اور فطرت" نام کی ایک کتاب چھپ چکی ہے، اسی نام سے دوسری نہیں چھپ سکتی، پہلے ناشر نے نالش ٹھونک دی تو؟"

سفیہہ صاحب کا اتنا سا منہ نکل آیا، دل بیٹھ گیا، ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ناشتہ ادھ کھایا چھوڑ، بیٹھ موٹر میں بھاگے شہر کو، ایسے بدحواس، آپ کہیں، قیامت آئی، صور پھک گیا، یا کم از کم —— ریل تو ضرور ہی چھوٹی جاتی ہے۔ پہونچے دفتر۔ آدھ گھنٹے ٹھہرنا پڑا، ناشر صاحب ندارد۔ اور آئے بھی تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ: "کچھ نہیں ہو سکتا، سرکار، ہرگز "آدمی اور فطرت" شائع نہ کرنے دیگی" ناشر نے بہ ایمانِ خود کہا اور ظالم نے اس پر یہ بڑا سا سر اتنی دیر تک ہلایا کہ سفیہہ صاحب کی نبضیں سنسنانے لگیں۔ مگر چارۂ کار؟ — نام بدل دیا گیا "آدمی اور ماحول"۔ یہ ناشر صاحب کے منشی صاحب تھے جنہوں نے نیا نام تجویز ا۔

خیر، خدا خدا کر کے دوپہر کے کھانے تک سفیہہ صاحب گھر آئے، اور اب یاد آیا کہ ایک دوست بھی مدعو ہیں۔ یہ ایک صاحب تھے کرکٹ باز۔ چونکہ سفیہہ صاحب خود بیوقوف بننا نہیں چاہتے تھے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا مہتم بالشان سوال چھیڑا کہ "کیوں بھئی یہ "آدمی اور ماحول" کیسا نام ہے؟ ہمارے ایک مہربان ہیں وہ جاننا چاہتے ہیں"۔ اس پر کرکٹ باز دوست نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔

"ہے تو بہت اچھا، اور بالکل ایسا ہے جیسے —— ابلیس اور لاحول، اور شاید —— سنہ . . . "

پھر تین چار منٹ تک غوطے کھاتے رہے کہ اس کے مصنف کون بزرگوار تھے۔ مگر سنتا کون، سفیہہ صاحب تو بڑے کمرے میں ٹیلیفون پر تھے اور بہت آزردہ، ناشر صاحب کو گھنٹی دی وہ کھانے پر تھے، سفیہہ صاحب نے گالی دی، بُردباری سے، پھر منیجر کو، سکریٹری کو، منشی کو:

"کوئی نہیں؟ دفتر کے کسی گدھے کو بلاؤ" غصہ کے مارے مرزا نے فرمایا۔

بارے منیجر صاحب سُنائی دئے "جی، کیا مرزا سفیہہ بیگ صاحب ہیں؟"

"ہاں میں ہوں سفیہہ، نام کا کیا ہوا؟"

"جی میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ ضرور ٹیلیفون دینگے۔ ناممکن ہے، مرزا صاحب آپ جانتے ہیں کہ یہ نام ہو چکا ہے۔ یونیورسٹی کے

مطبع والے یقینی استغاثہ کر دیں گے۔"

"میں انتظار نہیں کر سکتا" سفیہہ صاحب نے چلّا کر فون سے کہا۔

"کیا نہیں کر سکتے آپ" منیجر نے پوچھا "سنائی نہیں دیتا، اتنا گلا پھاڑتے ہیں آپ"

"میں انتظار نہیں کر سکتا" سفیہہ صاحب نے دبی زبان سے زور دیکر کہا "اور نام پیش کیجئے، مگر جلد"

منیجر صاحب جیسے سوچ میں پڑ گئے، تار پر صاف سنائی دیا، آخر بولے "اچھا کچھ رکھ دیجئے"

سفیہہ صاحب کے منہ سے ایک کریہہ لفظ سنائی دیا اور آلہ کانٹے پر پٹک دیا، اور پلٹ کے آئے کرکٹ باز دوست کے پاس۔ یہ صاحب ایک ذرا سے پیتے تھے، روز پیتے تھے، عادتاً نہیں محض شوقیہ، اس وقت بھی پی رہے تھے۔ کچھ نہیں پورٹ وائن ایک ایک گلاس وسہپہر کی گزک۔

"سنا آپ نے؟ وہی مہربان ٹیلیفون پر تقاضا کر رہے تھے۔

"کس کا؟" کرکٹ باز دوست نے پنیر بھرے منہ سے پوچھا۔

"کتاب کے نام کا" سفیہہ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔

"معاف کرنا میں کرکٹ سمجھا" دوست نے جواب دیا "ادھ بھرے منہ سے۔ ایک خیال آیا پھڑک گئے" کتاب کا مضمون؟"

"فن اور — آب وہوا"

"تو پھر یہی نام بھی رکھ دیا یاروں نے" دوست نے ذرا گھامڑ پن سے کہا۔

"خوب اور بہت خوب" سفیہہ صاحب نے ٹھنڈی کھنچ کر کہا۔ اور ذرا بے تکلفانہ بدتمیزی سے دوست کو بڑھا، بھاگے موٹر میں شہر کو کتاب کی نام رکھائی کیلئے، "فن اور آب وہوا" پہونچے تو اصل ناشر صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی، انہوں نے بڑی ہوں ہاں کے بعد فرمایا کہ "دیکھئے یہ بار بار نام بدلنا رنگ لائیگا اور بہت مہنگا پڑے گا"

"کیا کیجئے بدلنا ہی ہوگا" چنانچہ بدل گیا اور کتاب چھپ گئی۔ ستر جلدیں اخباروں کو بھیجی گئیں جن میں سے تین نے تنقید لکھی۔ ایک نے:۔ "مرزا سفیہہ بیگ صاحب بالقابہ نے فن پر آب وہوا کے اثرات کے متعلق ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے اور ان کیفیتوں کو واضح کیا ہے جن کے تحت فنون میں جدّت پیدا ہوجاتی ہے۔ نقطۂ نگاہ اچھوتا ہے اور سوچنے والوں کیلئے غذائے فکر۔"

سفیہہ صاحب کے نزدیک یہ تبصرہ نہایت مختصر اور بالکل ادھورا تھا۔

دوسرے اخبار نے پورا ایک کالم سیاہ کیا تھا اور یہ کیا تھا کہ شروع سے آخر تک کتاب کے پورے پورے فقرے کاٹ کے جوڑ دئے تھے، طرّہ یہ کہ اصل کتاب کا حوالہ نہ کہیں اوندھے واوٗ۔ تراشے ہوئے فقروں کے بیچ میں کہیں کہیں ایسے جملے ضرور آ گئے تھے۔ "کیا، بہر کیف ہمکو ماننا پڑیگا کہ ——" یا "بعض حضرات کا اس خصوص میں فیصلہ ہوگا کہ ——" باقی سب کتاب کا مضمون دُہرایا تھا۔

تیسری تنقید ٹائمس کی تھی، خط غبار میں، قوسین کے درمیان۔ اس میں البتہ یہ ندرت تھی کہ بابوں کی فہرست دے دی تھی، اور تمہید کا پہلا فقرہ۔ "سفیہہ صاحب نے دس جلدیں فروخت کیں، جو ہتّر مفت بانٹیں اور دو مانگے گئیں، پہلے ہی سن چکے تھے کہ اس قسم کی کتابیں ناولوں کی طرح جلد اور زیادہ تعداد میں نہیں بکا کرتیں، دھیرے دھیرے مسلسل وقفہ کے ساتھ۔ وسط مئی میں ناشر نے یہ بات

گئی تھی، جون میں شکار پور کے ایک پروفیسر صاحب کے وکیل نے اپنے فاضل موکل کی جانب سے، کتابچے ایک جُزو کے خلاف، استغاثہ کی دھمکی دی، اس بنا پر کہ وہ فاضل مصنف کی ایک "جملہ حقوق محفوظ" تصنیف کا ہو بہو چربہ تھا۔ سفیہہ صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے اس توارد کے لئے پروفیسر صاحب کا شکریہ تو ادا کیا مگر نڈھال ہو گئے، ان کے نزدیک فنی دُنیا میں بالکل حلال تھا کہ غیر کی تصنیف اپنالی جائے، ہلکے اعتراف کے ساتھ، بہرحال رفع شر کے لئے ناہمیں سو پچاس یا تین ہزار یا اس کے لگ بھگ کسی خفیف سی رقم پر معاملہ عدالت کے باہر ہی طے ہوگیا اور فضا ساکن ہوگئی۔ بکری ذرا دھیمی چال سے جاری رہی، یعنی گرمیوں گرمیوں چھ کتابیں نکل گئیں، ہاتوں ہات۔ برسات کے آتے ہی ناشر صاحب نے سفیہہ صاحب کو پھر ایک خط لکھا، اور پوچھا کہ "آیا ہم معاہدہ کے فقرہ (۱۵) پر عمل کر سکتے ہیں؟"

سفیہہ صاحب ٹھہرے ضابطہ کے کاروباری آدمی، فوراً معاہدہ نکالا، فقرہ (۱۵) یہ تھا۔

"اگر ناشر کی رائے میں مُناسب مدت گذر جانے تو کتاب اپنی مقررہ قیمت پر قابل فروخت نہ سمجھی جائیگی، قیمت کی کمی بیشی، یا تبدیلی، ناشر، یا مصنف، یا دونوں، یا ہر ایک کے اختیار تمیزی پر یہ پابندی فقرہ (۹) عمل میں آئیگی"۔

فقرہ (۹) الٹ کر دیکھا، "قیمت، اشتہار، بندھوائی، کاغذ، چھپائی وغیرہ کے متعلق جُملہ حقوق مایا داس، ہٹر پ چند صاحبان کو، جو بعد ازیں ناشر سے موسوم ہونگے، حاصل رہیں گے"۔ اس قانونی بُھول بُھلیاں میں پہلے تو سفیہہ صاحب بہت چکرائے، پھر یہ خیال کر کے کہ شاید یہ لوگ ان معاملات کو ہم سے بہتر سمجھتے ہوں تار دیدیا "مناسب ہے"۔

سال نو کی پہلی کو انہیں ایک عجوبہ دستاویز وصول ہوئی، یہ ایک مطبوعہ فرد تھی۔ پہلے صفحہ پر لکھا تھا ذریعہ فروخت دوسو ستر رُپے پھر سُرخی سے ایک آڑا سیدھا سُ ح، وضع کا خط بنا کر اُس کے نیچے تین ہزار چھ سو اٹھائیس روپے، چھ پائی، اور رقم کے سامنے بقایا پھر دونوں رقموں کو جوڑ کر میزان، تین ہزار آٹھ سو اٹھانوے روپے، چھ پائی، اس کے نیچے دو متوازی لکیریں، دوسرے رُخ پر تو مدات کی بھرمار تھی، پلیٹن کی پلیٹن، ایک پر ایک۔ کاغذ، چھپائی، تصحیح، بندھوائی، گودام جاتی، نگرانی، فہرست بنوائی، اشتہار، سفر خرچ، اعلان بٹوائی، اور معاف کیجیے گا، نہ جانے کیا الم غلم، اور ان سب کی مجموعی اور ڈراؤنی میزان، سات ہزار سات سو چھیانوے روپے ایک آنہ۔ اس کے نیچے باریک حروف میں سُرخی سے منہا، حسب شرائط معاہدہ پچاس فی صد، پھر وہی منحوس رقم، تین ہزار آٹھ سو اٹھانوے روپے چھ پائی، اور یہ خوشخط مختصر استدعا کہ براہ کرم سفیہہ صاحب، بقایا تین ہزار چھ سو اٹھائیس روپے چھ پائی فرصت سے ادا کر دیں۔

غصہ سے لال پیلے سفیہہ صاحب نے وہی کیا جو ایک کاروباری کو کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی دو حرفی رقعہ سے ذریعہ ایک حبہ دینے سے انکار، اور باقی کتابوں کی واپسی کا مطالبہ۔ اُدھر مایا داس، ہٹر پ چند صاحبان کی جانب سے فقرہ (۹) و (۱۵) کے حوالے سے ذرا طویل اور کڑا کڑا جواب آیا جس کا خُلاصہ یہ کہ باقی ذخیرہ اگلی جلد کے حساب سے بنگال کا ایک کاغذ ساز کارخانہ خرید لے گیا، مطالبہ فوراً بے باق ہو۔

سفیہہ صاحب نے معاملہ اپنے وکیل کے سُپرد کیا، ان کے محنتانہ کا بل آیا۔ پانسو پچپن روپے کچھ آنے۔ محنتانہ حق بجانب تھا، وکیل صاحب ہی کے سمجھانے بُجھانے پر سفیہہ صاحب کو عدالت نہیں جانا پڑا، نہ آگے چلکر چار ہزار ایک سو تراسی روپے چھ پائی سے زیادہ ایک پیسہ خرچ ہوا۔ ڈاک اور سفر خرچ البتہ شامل ہذا نہیں ہے — یہ تو ہوا مرزا سفیہہ بیگ صاحب بالقابہ اور ان کی کتاب کا حشر۔

بالفرض آپ بھی امیر آدمی ہیں اور میرے محفوظات پر چھاپے مارتے ہیں تو آپ کا —— ؟

"آوارہ"

پُونا اکسپریس

بمبئی کی برسات کے معاملہ میں ارکانِ قضا وقدر بڑی دریا دلی سے کام لیتے ہیں کیونکہ سمندر بھی گھر ہی کا ہے اور بادل بھی گھر ہی کے۔ لیکن پانی کا مسلسل راگ ہمیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس زمانے میں ہم ارضی باشندے اپنی گذشتہ تاریخ دُہرا رہے ہوں اور پانی کی امانت سمندر کو واپس کئے جا رہے ہوں۔ گو طوفانِ نوحؑ سے ہم پیدا ہوئے تھے لیکن طوفانِ نوحؑ کی طرف ہم مراجعت کرنا نہیں چاہتے۔ خصوصیت سے ایسی حالت میں جبکہ ہمارے پاس کشتی نوحؑ بھی نہیں ہے۔ لے دیکر صرف ایک برساتی کوٹ رہجاتا ہے جو پانی سے بھیگ کر بھاری لنگر کی طرح ہماری کشتی جسم کو ڈبونے کیلئے اس طرح آمادہ ہوجاتا ہے کہ اس عمل کیلئے سڑک کے پانی اور ساحل سمندر میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کوئی ایسا مقام تلاش کر رہا تھا جہاں کوکن کی بارش سے پناہ مل سکے۔

مَیں اکثر خیال کیا کرتا تھا کہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر اروپائی اقوام کیوں اس آسانی سے قابض ہوگئیں؟ اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ سب میگھ دوت کی طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوا کرتے تھے اور خشک علاقہ کے مغل ان کے سامنے نمک کی طرح گھل جاتے تھے۔ اس کمزوری کی تمام تر ذمہ داری حضرت سعدی علیہ الرحمتہ کے ایک مصرع پر عائد ہوتی ہے: "اگر خواہی سلامت بر کنار است" ورنہ ناممکن تھا کہ ہندوستان کا ساحل تمام ہندوستان کو اس آسانی سے نگل جاتا۔

میں انہیں پیچیدہ مسائل کو حل کرتا ہوا پونا جا رہا تھا۔ وہی جو سیواجی کی جنم بھومی ہے۔ جہاں شائستہ خاں کی اُنگلیاں کٹی تھیں اور اس کے علاقہ میں افضل خاں شہید ہوئے تھے۔ ہمیں ایک سو بیس میل جانب مشرق جانا تھا اور تقریباً دو ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند ہونا تھا اس کے بعد ہم ایسی جگہ پہونچ جائیں گے جہاں برکھارت کا لطف اُٹھانے کیلئے بہت سے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔

میں پونا اکسپریس میں سفر کر رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ منزل کے شوق میں ذرائع آمد و رفت کی اہمیت محسوس نہ کریں لیکن منزل اور راستہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ دکن میں ایسی دو گاڑیاں ہیں جو ایشیا بھر میں مشہور ہیں۔ ایک "ملکۂ دکن" اور دوسری "اُڑتی رانی" ان کی شہرت کا سبب ان کی تیز رفتاری ہے اور یہ تیز رفتاری ایسی ہے کہ ادھر آنکھ بند کی اور ادھر منزل مقصود آگئی۔ مُسافروں کو کھڑکیوں کے باہر "میل کے پتھر" ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی ایک مسلسل دیوار بن جاتی ہے۔ درخت ایک سبز لکیر میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور پہاڑ چھوٹے چھوٹے نقطے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ سفر کا احساس بالکل ہوتا ہی نہیں۔ یہ حرکت ایسی ہی ہے کہ جس پر سکون کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی گاڑیاں ڈاکٹروں، تاجروں اور سپاہیوں کے کارآمد ہوسکتی ہیں لیکن مسافروں کے لئے نہیں۔ پونا اکسپریس البتہ ایسی گاڑی ہے جو مُسافروں کے لئے بہت موزوں ہے کیونکہ نہ تو اس میں وقت ضائع ہوتا ہے اور نہ دلچسپی قربان۔ خوش قسمتی سے اس گاڑی پر ہمارے دیہاتی بھائی سفر کرنا مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ اس کا کرایہ پسنجر گاڑی سے زیادہ ہے اور اس کا پڑاؤ بھی لدّو اسٹیشنوں پر نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمیں اس کے ڈبوں میں اوسط طبقہ کے لوگ زیادہ ملتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں دکن کی گاڑیاں بہت بہتر ہیں جہانتک کہ صفائی اور امن کا تعلق ہے۔ وہاں تیسرے درجے کے مُسافر کیلئے سب سے بڑی مصیبت "چلم کش" ہیں۔ جو ریل کے تمام ڈبّے میں تمباکو کے گھریلو کارخانے کھول کر دھوئیں کا بیوپار کرتے ہیں۔

یہاں کے مسافر بیڑی پیا کرتے ہیں اور آپ تو جانتے ہیں کہ اس کا دُھواں اور عاشق کی آہ نظر نہیں آتے۔

بمبئی سے پونا تک ساڑھے تین گھنٹے کا سفر ہے لیکن کبھی آنکھ بند کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی نشستیں پلنگ کی طرح لمبی چوڑی نہیں ہوتیں کہ اُن پر بیٹھتے ہی بستر دراز کر دیا جائے اور ایک مُسافر کے زانو پر سر اور دوسرے مسافر کی گود میں ٹانگیں رکھکر دل ہی دل میں "آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا" کہتے رہیں اور گاڑی کے ہچکولوں کو ہنڈولے کے پینگ خیال کر کے سو جائیں۔ اس کی نشستیں ایک ایسے کھرّے صوفے کی طرح ہیں کہ جن پر دو دوست اچھی طرح بیٹھ سکتے ہیں لیکن لیٹ نہیں سکتے۔ اس ترتیب سے ایک فائدہ ا ور ہوا کہ اور وہ نقص امن کی واردتوں میں کمی کا ہونا ہے کیونکہ ریل کے ڈبے میں لڑائی اور جنگ اُسی وقت ہوتی ہے جبکہ ایک ہی شرح ٹکٹ سے ایک آدمی اینڈ اینڈ کر سوتا ہے اور دوسرا اکڑوں بیٹھا ہوا اونگھا کرتا ہے۔ مَیں پونا ایکسپریس کے منتظمین کو داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُنہوں نے مسافروں کی نشستوں کو خود دوکر کے زبردستوں اور زیردستوں میں مساوات قائم کر دی ہے۔ آخر یہی اصول ریل کے دوسرے ڈبوں اور ایوانوں میں کیوں نہیں رائج کیا جاتا؟۔

ادھر کے مُسافر سفر کرنے کے طور طریق سے اچھی طرح واقف ہیں۔ خصوصیت سے پارسی تمام ڈبہ کے لئے دلچسپی کا مرکز ہو جاتا ہے۔ اگر وہ تنہا ہے تو آپ اس سے گفتگو کر کے محظوظ ہو سکتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہے تو اُن کی آپس کی گفتگو آپ دُور سے بھی سُن سکتے ہیں۔ خصوصیت سے عورتیں باتیں کرنے میں بوڑھی عورتوں کے سر دتوں کو مات دیتی ہیں اور ہنسنے اور قہقہے لگانے میں گاڑی کے سُروں سے اُونچی ہو جاتی ہیں۔ میں ابھی تک یہ پتہ نہیں لگا سکا کہ گفتگو کے موضوع اُن کے پاس لگاتار کہاں سے آتے رہتے ہیں۔ ان کے برخلاف دوسرے مُسافر جن میں مرہٹے اور برہمن خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہیں بالکل فیلسوفوں کی طرح گپ چپ بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اگر آپس میں باتیں بھی کرتے ہیں تو بولتا ایک ہے اور سنتے سب ہیں۔ البتہ زندگی کا ثبوت دینے کے لئے وہ اپنی گردن سر اور آنکھیں مختلف زاویوں میں اس طرح گھماتے رہتے ہیں کہ تمام مجمع "گلالیوشتابو" کا تماشہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی عرصے میں اگر کسی کا پاؤں آپ کے جسمِ اطہر سے چُھو جائے تو وہ آپ سے معافی ہرگز نہ مانگے گا کیونکہ آپ کو معاف کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔ ہمارے جسم کے وہ اعضا جو روزِ محشر ہمارے خلاف گواہی دیں گے کس طرح ہماری ملکیت کہے جا سکتے ہیں؟ البتہ وہ معافی مانگتا ہے اُسی حصۂ جسم سے کہ جو اس غیر ارادی بے ادبی کا شکار ہوا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہاتھ بڑھا کر قدم چھو لیجئے اور پھر وہی ہاتھ سینے سے لگا لیجئے۔ جو لوگ اس رسم سے ناواقف ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا ہمنشیں ہمارے پاؤں کو اپنا پاؤں خیال کر کے کھجانا چاہتا تھا لیکن اس کو غلطی کا احساس ہو گیا اس لئے شرما گیا ہے۔

اس گاڑی کی ایک خصوصیت اس کا برقی انجن ہے جو دخانی انجن سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا کہ بیگم اور مس میں فرق ہے۔ بھاپ کا انجن جس وقت کو اجھک جھک۔ کو اجھک جھک کرتا ہوا اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی کی مستِ مئے شباب دُلہن سسرال آئی ہے شرماتی لجاتی ہوئی۔ لیکن برقی انجن فراک پوش لڑکی کی طرح آناً فاناً آتا ہے اور برق رفتاری دکھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ آپ خود ہی خیال کر سکتے ہیں کہ ریل کی پٹری اور زندگی کی شاہراہ پر کون زیادہ کامیاب رہیگا۔ اسی سلسلہ میں دخانی انجن سے ایک شکایت اور ہے۔ اسکی گاڑیوں میں چند گھنٹے سفر کرنیکے بعد انجن ڈرائیور اور مسافر سب ایک ہی رنگ کے ہو جاتے ہیں لیکن برقی گاڑی میں ڈرائیور بھی بالکل تازہ دم مُسافر نظر آتا ہے۔

سید ابو طاہر

مشکلات اور محبت

انسان ایک جذباتی جانور ہے۔ عام جانوروں کا برتاؤ عام طور پر فطری ہے یعنی وہ حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مگر انسان اس نعمت سے محروم نہیں۔ بدصورت عورت کو حسین سمجھنا، دکھ کو راحت سمجھنا یا اپنے حصول مقصد میں خیالی مشکلات قائم کر لینا اسکے لیے چنداں مشکل نہیں۔ پھر انسان کو شعوری جانور کیوں کہا جاتا ہے غالباً اس لئے کہ قدرت میاں نے انسان کو یہ قدرت بخشی ہے کہ جس قدر جی چاہے حماقت کر لے اور جانور حماقت نہیں کر سکتے۔ اگر کریں بھی تو اس کا معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ وہ قدرتی طور پر شعوری برتاؤ کے پابند ہیں۔ انسان اگر شعوری برتاؤ کرے تو وہ عمداً ہوگا غالباً اسی لئے اسے "شعوری جانور" کہا جاتا ہے۔

انسان کفران نعمت کا قائل نہیں۔ اس لئے وہ اس خدا داد نعمت سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا عادی ہو چکا ہے تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہم اس لئے ٹھوکریں نہیں کھاتے کہ چلنا سیکھیں یا ٹھوکریں کھا کھا کر چلنا نہیں سیکھتے بلکہ نئی انوکھی اور دلچسپ ٹھوکریں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے آگے پیچھے چاروں طرف دنیا بکھری پڑی ہے اور اپنی ضروریات اور مطلب کے مطابق ہم اسے سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ بالکل ہماری اپنی خوشی ہے کہ جس طرح جی چاہے اسے سمجھیں۔ یہ سمجھ بیٹھیں کہ ستارے بڑے بڑے صندوق ہیں تاکہ ہماری تقدیریں اُن میں حفاظت سے رکھی جا سکیں اور گھوڑا اس لئے بنا ہے کہ ہم اس پر سواری کریں۔ اور عورت خدا نے اس لئے بنائی ہے کہ ہم اس سے "محبت" کریں یعنی اس کی آرزو میں کھانا پینا حرام کر لیں۔ اُس کے حُسن کی تعریف میں شعر لکھ کر اُسے بیوفائی پر مائل کریں یا اُس سے شادی کر کے اُسے اپنا غلام بنا لیں اور خود اُس کے خُداوند بن بیٹھیں۔ یا اپنی جمع کی ہوئی کمائی لٹانے کا کام اُس کے سپرد کر کے خود آرام سے زندگی بسر کریں۔ بہر صورت یہ سمجھنے کا کام ہمارا ذاتی کام ہے جو جی چاہے سمجھیں یا سمجھنے سے قطعی منکر ہو جائیں، ہماری اپنی خوشی ہے چونکہ سمجھنا ہمارے اپنے بس کی بات ہے اس لئے کوئی ایسی بات سمجھ بیٹھنا یا تسلیم کر لینا یا تصور کرنا جو ہمارے دل کے لئے باعث کلفت یا تکلیف ہو ایسی ہی حماقت ہوگی جیسے کوئی پراٹھے کے ہوتے ہوئے خشک روٹی کھائے۔ یہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان صرف وہی باتیں سمجھتا تسلیم کرتا اور تصور کرتا ہے جو اُسے مسرت بخش یا ایسے خیالی نکات پیدا کرتا ہے یا چیز کا وہی پہلو دیکھتا ہے جو اُسکے لئے پُر لذت ہو۔

غلط فہمی یا غلطی ہمارے فہم کا قصور ہے۔ اور رہا "فہم" یا سمجھنا ہمارے بس کی بات ہوئی۔ اس لئے ہر غلط فہمی کی تہ میں کوئی خوش فہمی ہوتی ہے یعنی کوئی ایسی بات جو اصل میں ہوتی نہیں مگر ہم چاہتے ہیں کہ ہو اور اس لئے سمجھتے ہیں کہ ہے۔ جس بات پر ہمارے جذبات برانگیختہ ہوں یعنی جس بات کا ہماری خواہشات سے تعلق ہو اُس بات میں ہم سب سے زیادہ "خوش فہمیاں" پیدا کرنے کی کوشش کرینگے۔

جس طرح اگر اس عورت کی ناک بھدی ہو جو ہمیں محبوب ہے تو ہم اُس بھدی ناک کو مستون دیکھنا شروع کر دینگے۔ یا اسکی آنکھوں اور ہونٹوں میں مزید حُسن پیدا کر لیں گے تاکہ اس بھدی ناک کے باوجود ہم سچے دل سے اُسے دنیا بھر کی حسین ترین خاتون سمجھ سکیں ایسے ہی ہر وہ موضوع جس کا تعلق ہمارے جذبات سے ہے ہماری ایسی خودساختہ اندھی خوش فہمیوں سے بھر جائیگا۔ مثلاً محبت ایسا موضوع ہے جو ہمارے جذبات اور خواہشات سے تعلق رکھتا ہے اور ہم نے اس موضوع کو اپنی خوش فہمیوں سے بھر رکھا ہے۔

عام جانوروں کی زندگی محض ایک بے کیف سا تسلسل ہے مثلاً پالتو گھوڑے کو ہی لیجئے۔ صبح سویرے اٹھا۔ مختصری ضد اور احتجاج کا مظاہرہ کرکے تانگے میں جتنا منظور کر لیا۔ پھر چلتے چلتے شام ہوگئی اور سو رہا۔ اس زندگی کے بے کیف تسلسل میں وہ بیچارہ صرف اسی قدر دلچسپی پیدا کر سکتا ہے کہ کبھی پورب کی بجائے پچھم کو مڑ جائے۔ یا آگے چلنے کے بجائے پیچھے دھکیل کر گاڑیبان کو پریشان کرے۔ تو عام جانوروں کی زندگی صراطِ مستقیم ہے۔

صراطِ مستقیم سیدھا سہی مگر ایک خشک اور بے کیف سا راستہ ہے یا ایک ایسی روانی ہے جس میں اُتار چڑھاؤ نہیں۔ اگر انسان بھی فطری برتاؤ پہ پابند ہو جائے تو اُس کی زندگی بھی صراطِ مستقیم ہو جائے۔ مگر اس کے برعکس انسان کی زندگی اُتار چڑھاؤ سے بھرپور ہے۔ اگر انسان کو تھوڑی سی قُدرت حاصل ہو تو وہ کیوں اپنی زندگی کو بے کیف تسلسل ہونے دے۔ وہ اپنی زندگی کو دلچسپ بنانے کیلئے اپنے لئے نئی نئی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ چونکہ اس خطۂ زمین پر قدرتی مشکلات اتنی نہیں ہیں کہ زندگی کو انسان کیلئے حسبِ ضرورت دلچسپ بنا سکیں۔ اس چھوٹے سے جذباتی جانور کو دیکھئے صبح و شام اپنے لئے مزید انوکھی اور دلچسپ مشکلات پیدا کرنے میں کیسا سرگرم رہتا ہے۔ پہلے ایک مشکل پیدا کر لی پھر اُسے طے کرنے کی جدوجہد میں لگے رہے پھر اُسے اس سلیقے سے طے کیا کہ اس عمل میں دو مزید مشکلات پیدا ہو جائیں۔ تاکہ باقی وقت ان مشکلات پر رونے میں صرف ہو اور یہ چکر یونہی چلتا رہے۔

غالباً سب سے پہلی مشکل یا ٹھوکر جو انسان نے زندگی کو دلچسپ بنانے کیلئے ایجاد کی۔ گناہ تھا یعنی "احساسِ گناہ"۔ چند ایک ممنوعات قائم کرنے سے زندگی کس قدر دلچسپ ہوگئی۔ حالانکہ اُس زمانے میں لوگ اس بات سے قطعی ناواقف تھے کہ کششِ ثقل نہ ہو تو درخت اُگ نہیں سکتے اور رکاوٹ نہ ہو تو حرکت ممکن ہی نہیں۔

دوسری مشکل جو انسان نے ایجاد کی "محبت" تھی۔ پھر اس دلچسپ مشکل کو اور بھی دلچسپ اور دُشوار بنانے کیلئے اُسے جنسیات اور جسم سے علیحدہ کرکے اُس میں روحانیت کی کلغی ٹانک دی۔

پھر حسبِ ضرورت ان مشکلات میں اضافہ کرنا پڑا تو مشین، بیوی، "ہیر ہٹلر" اور فیشن اختراع کئے گئے۔ ان ہی اختراعات کے باوجود "ممنوعات" اور گناہ سے بہتر مشکل کوئی بھی قائم نہ ہو سکی۔ چونکہ اس چھوٹی سی مشکل نے اپنے آپ سینکڑوں مشکلات اور ٹھوکریں پیدا کر دیں اور ہمیشہ کرتی رہی اور انسان کی زندگی میں ایسے رنگ بھر دئے کہ انسان خود اپنی اس شاہکار ایجاد پر ناز کرتا ہے۔ چونکہ "ممنوعات" کی وجہ سے ہی پردہ پیدا ہوا یعنی ہمارے وہ جذبات جو ہمیں اجتماعی طور پر ناپسند تھے پردے میں ظاہر ہوئے یا یوں کہئے کہ اپنے اظہار کیلئے اُنہوں نے انوکھے پردے ایجاد کئے۔ یعنی جھُوٹ پیدا ہوا۔ پھر عورت نے "جنسی ضروریات" کو ممنوع ہوتے ہوتے دیکھ کر حفظ ماتقدم کے خیال سے جھوٹ اور پردہ اپنی سرشت میں سلب کر لیا۔ پھر مرد نے اپنے لئے خوش فہمی کے پردے میں یہ ستم ظریفی ایجاد کی کہ عورت کو مزید پردے میں ڈال دیا یعنی پردہ اور جھُوٹ اور پھر پردہ۔ اس طرح مرد نے اپنے منتہائے محبت کو ایک ایسا بھنور بنا دیا کہ "محبت" زندگی کی بہترین مشکل یعنی لذّت ہوگئی۔ پھر عورت یعنی اس زندہ جھُوٹ اور پردے سے احساسِ رقابت اور "احساسِ کمتری" اخذ کرکے اپنی محبوبہ سے فراق اور اُس کی بیوفائی پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیا اور جب رو رو کر تھک گئے یا جب یہ احساس ہوا کہ رونے سے رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائیگی تو در پردہ رونا شروع کر دیا اور لوگوں میں یہ پرچار کرنا شروع کر دیا کہ یہ رونا نہیں یہ راگ اور شاعری ہے۔

اگر محبت سے خلشِ رقابت، "احساسِ کمتری" آہ نالہ اور گریۂ شب گیر نفی کر دئے جائیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ گائے بھینسوں کی سی

محبت اور حقیقت میں محبت ہے بھی یہی۔ ایک جنسی کشش جو ایک مختصر سے جنسی ملاپ پر مائل کرے مگر ہم نے اُسے جسمانی دُنیا سے خارج کر کے دماغی اور جذباتی بھنور بنالیا ہے اور اس آسان سی اختراع پیدا کر کے اُسے ایک ہمہ گیر مسئلہ بنا دیا ہے۔

انسان کہتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد صرف اس قدر سیدھا سادا اور بے کیف ہو نہیں اس شاندار اور وسیع دُنیا کا مقصد بلند تر اور پُراسرار ہونا چاہیئے۔ جس قادرِ مطلق نے اس دُنیا کی تخلیق کی ہے اور خاص طور پر جس نے ایسی حسین اور رنگدار اشرف المخلوقات بنائی ہے وہ کیسے اپنی بہترین مخلوق کا مقصدِ حیات گائے بھینسوں کا سا بنا سکتا ہے۔ یہ اُسکے اور اُس کی بہترین مخلوق کے شان شایاں نہیں کہ انسان صرف اسی لئے پیدا کیا گیا ہو کہ کھائے پیئے ملے جُلے اور سو رہے۔

اور جانوروں میں محبت غالباً ایک مفرد جذبہ ہے مگر انسان کیلئے محبت مفرد نہیں بلکہ مرکب جذبہ ہے۔ اگر محبت اُن کے لئے مرکب جذبہ نہ ہو تو محبت کرنے والے کو جذبات کے جھولے میں جھولنا نصیب نہ ہو۔ اور اس جذباتی اضطراب کی لذّت حاصل نہ ہو۔ جبتک کشش کے ساتھ دوسرا جذبہ شامل نہ ہو محبت کا وجود نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں محبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک محبوبہ کے متعلق اپنی کمتری کا احساس نہ ہو۔ یعنی جس سے ہمیں محبت ہو جائے ہم اُسے بلند تر ہستی سمجھنے پر مصر ہوتے ہیں۔ اور ہمارے دل میں یہ احساس واضح ہو جاتا ہے کہ ہم اُس محبوبہ کے قابل نہیں۔ اگر ہم نے اُسے ہاتھ بھی لگا دیا تو وہ میلی ہو جائیگی۔ اگر وہ ہم سے ایک ساعت کیلئے ہنس کر بات بھی کر لے تو اُس کی بندہ نوازی اور کرم پر سورج چاند اور ستارے حیرانی سے انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔ ایسی ہستی سے چاہے وہ محبوب ہی کیوں نہ ہو یا شاید اسی لئے کہ وہ محبوب ہے تھوڑا سا ڈر محسوس ہونا لازمی ہے۔ پھر کوئی چپکے سے ہمارے کان میں کہدیتا ہے "کچھ ہوش کی دوا کرو کہاں وہ "عالمِ پاک" اور کہاں تم "ذرۂ خاک"۔ اُن کی اور تمہاری کیا نسبت۔ حتیٰ کہ یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ہماری ہونا کب گوارہ کریگی۔ یقینی طور پر وہ کسی ایسے کی ہو جائیگی جو اُس کے قابل ہو۔ اس وقت سب سے ناقابل شخص ہم خود ہو جاتے ہیں اور کوئی مرد جس کے شانوں پر ایک سر ہو جس پر کلاہ رکھا جا سکے ہمیں اپنا رقیب نظر آتا ہے۔ پھر ہمارے دل میں ایک دھونی سی سُلگ اُٹھتی ہے اور ایک درد سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جی روٹھنے اور مرنے کو چاہتا ہے۔ یعنی ہمیں محبت ہو جاتی ہے۔ وہ وقت محبوب سے ملنے کی کوشش کرنے کے بجائے تارے گننے کروٹیں بدلنے شعر کہنے اور گانے کیلئے زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اور ہم اپنی خیالی دُنیا میں اپنے رقیبوں کو اپنی محبوبہ سے ملتے ہوئے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ ان کے مقدس کوچے میں اک بھیڑ ہو جاتی ہے۔ اور ہماری گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یا شاید ہم اپنی غیر موجودگی سے اپنے آپ میں اتنیا ز پیدا کر لیتے ہیں۔ اس وقت ہم اپنی محبوبہ کو ظالم اور ستمگر سمجھتے ہیں اور اس کے نقاب میں "اُبھرے ہوئے تار" دیکھکر یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ "کس کی نگاہ" ہوگی۔ پھر اپنی وفا پر پھولے نہیں سماتے جو ان "اُبھرے ہوئے تاروں" اور اُس کوچے میں "گنجائش نقش پا نہیں ہے" کے باوجود قائم رہتی ہے یعنی ہم اس وقت محبوبہ سے زیادہ وفا کے متمنی ہوتے ہیں۔ اور وفا جب ہی ایک بلند تر وصف ہو سکتی ہے جبکہ وفا فلاں فلاں باتوں کے ـــــ باوجود قائم رہے جو بیوفائی پر مائل کر رہی ہوں یعنی غم دے رہی ہوں۔ یعنی وفا غمخوری کی محبت ہے۔ یعنی ہم محبت کرنے کے بجائے غمخوری سے زندگی میں دلچسپیاں پیدا کر رہے ہیں۔ اس وقت اپنی وفاداری اور محبوبہ کی بیوفائی کی وجہ سے ہم وفا کی بلندیوں پر بیٹھکر محبوبہ کو تعریب وفائی میں دیکھتے ہیں اور خود بلند تر محسوس کرتے ہوئے محبوبہ سے چوری چوری نفرت کرتے ہیں۔ یہ کشش ڈر رقابت نفرت کے احساسات ملکر محبت بن جاتے ہیں۔ اور یہ کشش اور نفرت کی آری چلتی ہے جو لہروں کی طرح اپنا اتار چڑھاؤ قائم رکھنے کیلئے کسی بیرونی طاقت کی محتاج نہیں۔ اگر محبت ایک مفرد جذبہ ہوتی تو سعی وصال کو وفا پر یوں قربان نہ کیا جاتا۔ اس میں لہروں کا سا

مددجزر نہ ہوتا بلکہ ہم وقتی کشش محسوس کرتے اور پھر وقتی ملاپ کے بعد وقتی سکون یعنی ہم میں بھی عام جانوروں کی طرح کشش اور نفرت کے وقفے جدا جدا ہوتے۔ انسان نے اس کے برعکس دونوں جذبات یعنی کشش اور نفرت ملاکر گوندکر اپنی محبت میں دوام یعنی وفا پیدا کرلیا ہے۔ اور "ہم کچھ بھی نہیں" "میں بھی کچھ ہوں" کے بتاکر زندگی کے جمود میں حرکت ایجاد کررکھی ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر مرد کی محبت کی تفصیلات یہی ہیں۔ ہر شخص اپنے جذبۂ محبت کی تفصیلات اپنے ذاتی مذاق اور طبیعت کے مطابق اختراع کرتا ہے۔ اس کے متعلق ہم کوئی ایک اصول قائم نہیں کرسکتے۔ یہ ہمارا اپنا مذاق ہے چاہے ہم اپنے محبوب کو فرشتوں کی سی پاکیزگی بخش دیں۔ اور اپنے آپ پر حرام کرلیں۔ یا بیسوا کی سی ذلت عطا کردیں۔ مگر دو متضاد جذبات پیدا کرنے لازمی ہیں ورنہ محبت ممکن نہیں ہوسکتی۔

انسان تو کیا دنیا میں مادی چیزوں کے متعلق ہی کوئی اصول قائم نہیں ہوسکتا۔ دو ذرے بھی پورے ایک دوسرے کے مطابق نہیں۔ ہر مشین میں اپنی ذاتی خصوصیات موجود ہیں جو اسکو دیسی مشینوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ کبھی آٹے کی چکی کی آواز سنئے "چخ پخ چخ چھک چخ پخ چخ چھک پخ چخ پخ چخ پخ چخ ——————" یہ پخ اور چھک کسی اصول کے ماتحت نہیں۔ ہر موٹر اپنے ڈرائیور کی طبیعت کے مطابق ہوجاتی ہے۔ اگر ڈرائیور دلیر ہو تو انجن پہیوں کو دلیری سے دھکیل کرلے جاتا اور اگر وہ خوف سے کانپنا شروع کردے تو انجن بھی ڈر کے مارے شل ہوجاتا ہے یعنی جس طرح لڑائی میں گھوڑے حملے کے وقت سواروں کی نفسی کیفیت کو سلب کرکے ڈرپوک یا دلیر ہوجاتے ہیں اسی طرح ہر موٹر کی طبیعت اور شخصیت پیدا ہوجاتی ہے دنیا میں خالص اصول کوئی نہیں۔ یہ تمام اصول "تقریباً اصول" ہیں اسلئے محبت کے متعلق بھی یہ تقریباً اصول قائم ہوسکتا ہے۔

انسان میں ایک پُراسرار دو عملی پیدا ہوچکی۔ غالباً اس مشکل پسندی اور مشکل سازی کی وجہ سے جو صدیوں سے چلی آتی ہے انسان میں عجیب اور انوکھے عناصر پیدا ہوچکے ہیں جنہیں بیان کرنا یا سمجھنا میرا کام نہیں۔ حتیٰ کہ انسان کی طبیعت فقیر کی گدڑی کی طرح گوناگوں ہوچکی ہے۔ جو کسی اصول یا سسٹم کے ماتحت نہیں۔ ایک لکھپتی لاکھوں روپے دان کردیگا مگر اپنی پرانی قمیص بھنگی کو دینے سے ہچکچائیگا۔ ایک بہادر سورما میدان جنگ میں ہزاروں کا خون کردیگا مگر گھر میں کسی چھوٹی سی بات پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیگا۔

ملکہ وکٹوریہ کسی مشہور پھلوں کے باغ سے گذری تو باغ کے مالک نے میوے کی ایک بڑی ٹوکری بطور نذر پیش کی۔ ملکہ نے گھر پہونچکر زمیندار کو شکریہ کا خط لکھا۔ خط پڑھکر آپ کہنے لگے "یہ شکریہ تو خیر ٹھیک ہے مگر ملکہ نے یہ نہیں لکھا کہ وہ ٹوکری کب واپس کریگی" کیپرن نے تحریر کیا ہے کہ کسی صاحب کو ایک مرتبہ کسی مردے کے کفن کی ڈوری باندھنی پڑی دھاگا بہت چھوٹا تھا۔ آپ غیر شعوری طور پر "لوپ گرہ" دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پھر دفعتاً خیال آیا کہ آخر کفن کو "لوپ گرہ" کی کیا ضرورت تھی۔ وہ گرہ اب کسی کو بھی کھولنی نہ تھی۔ وہ گرہ اب کبھی نہیں کھلے گی۔ اس خیال سے اس کے دل میں موت کا ایسا تصور پیدا ہوا کہ وہ کانپ کانپ اٹھا۔ موت بذات خود اس پر کچھ اثر نہ کرسکی مگر ایک کبھی نہ کھلنے والی گرہ کے خیال سے اس نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے اس کا ذرہ ذرہ موت کے مفہوم سے شناسا ہو۔ جیسے موت کو وہ پہلی مرتبہ اپنے رو برو دیکھ رہا ہو۔ کبھی تو محبت کے زیر اثر ایک مرد اپنی ذات یا نفس کو خارج کرکے ایسی ایسی قربانیاں کر بیٹھتا ہے کہ بعد میں وہ خود ہی اپنے طرز عمل پر حیران ہوتا ہے اور اسے وہ فعل اپنی طبیعت کے لحاظ سے بالکل بیگانہ محسوس ہوتا ہے یا کبھی اپنی ذاتی خوشی کیلئے دنیا بھر کو خس و خاشاک سمجھکر ٹھکرا دینے کیلئے تیار ہوجاتا ہے۔

میرے خیال کے مطابق انسان کا اپنے نفس یا ذات کو خارج کر دینا اپنے نفس یا ذات کو مزید تقویت دینے کا ایک انوکھا طریقہ ہے جو انسان نے ایجاد کر رکھا ہے۔ ہم فقیر پر اس لئے ترس نہیں کھاتے کہ وہ قابل رحم ہے بلکہ اس لئے کہ ہم خود اس قابل ہیں کہ لوگوں پر ترس کھا سکیں۔ یا جب کبھی ہم کسی کوڑھی کو ایک پیسہ خیرات دیتے ہیں تو درحقیقت وہ پیسہ ہم کوڑھ کے مرض کو دیتے ہیں کہ وہ ہم پر نہ یا رکھے یا اللہ میاں کو دیتے ہیں اور چپکے سے جی میں کہتے ہیں "اللہ میاں یہ میری سخاوت کا ثبوت دیکھ لیجیے میں ایسا برا نہیں ہوں کہ کوڑھ کا مستحق ہوں، آپ تو خود سیانے ہیں" ہم اس لئے باہر سیر کیلئے جاتے ہیں کہ جب واپس لوٹیں تو گھر زیادہ دلچسپ نظر آئے۔ روٹھتے ہیں تاکہ جب مان جائیں تو از سر نو ملاپ کا لطف حاصل ہو۔ اسی طرح نفس کا یہ اخراج واپسی کی لذت حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔

مردوں نے اپنی محبوبہ سے کشش اور نفرت (محبت) پیدا کرنے کیلئے کئی ایک دلچسپ عجیب اور لذیذ طریقے ایجاد کر رکھے ہیں جو کسی دن پری جمال عورتوں کی آپ بیتیوں سے اخذ کئے جائیں گے۔ میں نے امرتسر کے ایک حسین نوجوان کو دیکھا ہے جس نے اپنی تمام دولت ایک رقاصہ پر لٹا دی اور پھر فقیر ہو کر اسی کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ ہر چند دنوں کے بعد اپنی محبوبہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے وہ سیڑھیاں چڑھ جاتا مگر رقاصہ کے حواری اُسے زبردستی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیتے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے دھم سے دہلیز پر آ گرتا۔ گویا اُس کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی سیڑھیوں سے لڑھک لڑھک کر دھم سے دہلیز پر جا گرے۔ یہ عدم تعاون۔ عدم تشدد اور بھوک ہڑتال یا ہڑتال کا نظریہ جو آج گاندھی جی پیش کر رہے ہیں کسی عاشق کی ایجاد ہے اور ایسی اپیل ہے جو ظالم کے جذبات پر اثر رکھتی ہے بشرطیکہ وہ ظالم ایسا ظالم ہو جسے مظاہرہ کرنے والے کے جذبات سے کوئی تعلق ہو۔

شاید آپ ایسے برتاؤ کو ذہنی یا دماغی "انحراف" (perversion) سمجھیں۔ مگر حقیقت میں یہ ذہنی انحراف نہیں۔ اور اگر یہ ذہنی انحراف ہے تو دنیا میں انحراف ہی انحراف ہے اور صراط مستقیم انسان تو کیا شاید گائے بھینسوں کو بھی نصیب نہیں۔ اگر انحراف ہی انسان کیلئے خوشی کا باعث ہو تو؟ ہر محبت کرنے والے نے ایسی سیڑھیاں ایجاد کر رکھی ہیں جن سے اُسے لڑھکا دیا جا سکے۔ ہر شخص نے اپنی شخصیت میں ایک چھوٹا سا پرائیویٹ محبت کا نفس پیدا کر رکھا ہے جو اُس کی عام طبیعت سے قطعی مختلف ہے، مگر اس خصوصی برتاؤ کو جو اُس پرائیویٹ نفس کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے لوگ کھلے بندوں ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنی لذت کو قطعی پرائیویٹ رکھتے ہیں۔

"یورپین" محبت بظاہر مختلف نظر آتی ہے۔ شاید اس لئے کہ آب و ہوا اور جغرافی حالات کا اثر طبیعت کے علاوہ انداز محبت پر بھی ہو یا شاید اس لئے کہ وہ "تائبین" کی سی محبت سے اُکتا کر اب آزادانہ محبت کا تجربہ کر رہے ہیں۔ یعنی آئے بیٹھے ملے جلے اور پھر تسکین ہی تسکین۔ یورپین "معاشرت حاضرہ" کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزادانہ محبت کا دور جدید اب ختم ہونے کو ہے۔ انہوں نے اس تجربے کو تسلی بخش نہیں پایا۔ اس جدید انداز محبت کو رائج ہوئے ابھی دیر بھی نہیں ہوئی۔ پھر وہ ابھی سے کیوں اُکتا چکے ہیں۔ پھر وہ "ڈان کو ہیٹے" والا انداز محبت اتنی صدیاں کیونکر رائج رہ سکا۔ ایشیا میں وہی پرانا انداز محبت چل رہا ہے۔ آخر یہ بظاہر احمقانہ طریق محبت کیوں اسقدر پائیدار ثابت ہو رہا ہے۔ زمانہ تاریخ سے پہلے بھی آزادانہ محبت رائج تھا۔ پھر دنیا مہذب ہو گئی تو آزادانہ محبت کو ترک کر دیا گیا۔ ان باتوں سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو سکون راس نہیں اور اُسے بھی پرانا طریق محبت منظور ہے۔ یعنی انسان ایک غم خور جذباتی جانور ہے۔

علما کا خیال ہے کہ ٹریجیڈی، کامیڈی سے زیادہ سچی ہے اور صحیح طور پر زندگی کو پیش کرتی ہے۔ غالباً اسی لئے کہ انسان اپنے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر کے اپنے منتہائے آرزو کو خود ہی پامال یا ناممکن کر کے اپنی غم خوری کی عادت پوری کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ انصاف سے

دیکھئے تو غم خوشی کی نسبت ہمارے جذبات میں زیادہ گہرا ہیجان پیدا کرتا ہے۔ جیسے کسی تالاب میں ایک چھوٹا سا پتھر من بھر پھولوں سے زیادہ گہرا اور دیرپا تحرک پیدا کریگا۔ اسی طرح غم دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہی جذباتی تحرک لذت پیدا کرتا ہے۔ بلکہ اسی تحرک کو لذت کہا جاتا ہے۔ مگر اس تحرک کو پائیدار کرنے کیلئے دو متضاد طاقتوں کا ہونا لازمی ہے جو بیک وقت کھینچا تانی کریں۔

اگر انسان غم خوری کا مشتاق نہ ہوتا تو سرمایہ داری اور ڈکٹیٹر شپ مدت سے ختم ہو چکے ہوتے۔ مگر یہاں صورت احوال یہ ہے کہ سوشلزم اور جمہوریت ایک عرصہ سے اپنا منہ آپ ہی چڑا رہے ہیں۔ اور "لیگ اقوام" اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے اپنے آپ سے کہتی ہے کہ جب تک دنیا میں جنگ کے آثار غالب نہ ہوں صلح کا پرچار بے معنی ہے۔ اگر محبت دائمی وصال کا نام ہوتا تو شادی کی رسم یوں کچہریوں میں ذلیل و رسوا نہ ہوتی۔ اور ہندوستانی مرد جنہوں نے جنس لطیف کو اپنی ملکیت بنا کر قید کر لیا تھا اور خود انکے دیوتا بن بیٹھے تھے ان کی خواہشات اور شاعری میں برچھیاں اور بھالے قاتل ستمگر اور ایسے خوفناک اوزاروں کی آرزو عام نہ ہوتی۔ ایک بچے کی زندگی ہی لیجئے۔ چونکہ اُس کو بچپن میں کوئی گہرا جذباتی تحرک نصیب نہیں ہوتا اس لئے وہ اس صبح و شام کی سطحی اور پھیکی خوشی سے اکتا کر بڑے ہونے کی آرزو کرتا ہے۔

یورپ کے رہنے والوں نے مقابلتاً غم کو اپنی زندگی سے خارج کر کے اپنے گلے مصیبت مول لے لی ہے۔ تمام تفریح گاہیں جلسے پارٹیاں باتھ بال کار نیوال مل ملا کر بھی اتنا جذباتی ہیجان پیدا نہیں کر سکتے جو ایک چینی ایک بھدے سے دلربا پر بھدی سی آواز میں ایک بھدا سا گیت گا کر پیدا کر سکتا ہے۔ یورپ کے رہنے والوں کو تفریح کا بخار کیوں چڑھا ہوا ہے۔ آخر انہیں اس قدر تفریح کی کیوں ضرورت ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُن کا دل مزید تفریح کا متمنی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ تفریح دلچسپ اور گہرا جذباتی ہیجان پیدا نہیں کر سکتی۔ یعنی ناکافی ہے۔ ناقص ہے جس طرح ایک ہرجائی عاشق کو انواع پسندی کی وجہ سے دربدر پھرنے کی آرزو نہیں بلکہ عدم موجودگی کی وجہ سے۔ یعنی اُسے وہ بات میسر نہیں ہوتی اور وہ دیوانہ وار اُس کی تلاش میں اُمید میں پھرتا ہے۔ اسی طرح یورپ کے لوگ دیوانہ وار تفریح کے پیچھے پھرتے ہیں مگر وہ دستیاب نہیں ہوتی۔ چونکہ وہ غم کو اپنی زندگی سے خارج کر چکے ہیں۔

ہمارا جذبۂ محبت ہمیشہ کشش کی صورت میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ کئی یا اکثر مرتبہ ہم نفرت، غصہ، دشمنی اور خوف کے پردے میں محبت کرتے ہیں اور ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم یوں درپردہ محبت کر رہے ہیں یا ہم اپنی چالاکی سے اپنے آپ کو یہ پتہ لگنے ہی نہیں دیتے کہ ہم درپردہ محبت کر رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ہمارا دماغ یہ تسلیم کرنا گوارا نہیں کرتا کہ ہمارا دل ایسی گری ہوئی خواہشات کا متمنی ہے۔ یا شاید اسلئے کہ نفرت ہمارے جذبات میں اس قدر گہرا تموج پیدا کر دیتی ہے کہ ہم اس جذباتی تموج سے بے تاب ہو جاتے اور اسی تموج کے حصول کے شوق میں اُس نفرت خیز ہستی کو جو ہمیں اس قدر لذت بخش ہے۔ محبت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بہرصورت یہ امر تو مسلمہ ہے کہ بڑی نفرت یا بڑے ڈر اور محبت میں چنداں فرق نہیں۔ یہ درپردہ محبت یا امتیاز عداوت کا نکتہ شعرا علمائے نفسیات سے پہلے دریافت کر چکے تھے۔ اس خوددار اور دوربین بڈھے غالب نے "کچھ نہیں تو عداوت ہی سہی" کسی بات پر چاہا تھا۔ خوف نفرت اور غصہ محبت کی طرح ایک جذباتی تعلق ہے۔ اور ہم شاید اسلئے محسوس کرتے ہیں کہ کشش کے خلاف توازن قائم رکھ سکیں یا عالم مادہ کی طرح جذبات پر بھی یہ اصول حاوی ہے کہ ہر حرکت کے پیدا ہوتے ہی اسکی متضاد حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرصورت اسکی کوئی وجہ بھی ہو مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ کشش اور نفرت محبت کے دو ضروری جزو ہیں اور غم خوری کے بغیر جذباتی لذت ممکن نہیں۔

ممتاز مفتی

چند مشاہدات

ایک دن صبح سویرے یہ منحوس خبر ملی کہ ہمارے ایک دوست نے اس دنیا سے اچانک رحلت فرمائی ہمیں اس "مرگ ناگہانی" پر کچھ تعجب نہیں ہوا، اس وجہ سے کہ آج کل پچاس فی صدی رُوحیں مسٹر عزرائیل اسی طرح اُڑائے جاتے ہیں اور "چھدا ہیچا ہے" "دل" پر رہتا ہے کہ اس نے بغیر کسی نوٹس کے "حرکت ہڑتال" کر دی!!

کوئی نو بجے ہونگے کہ ہم مرحوم کے مکان پر پہونچے، گھر خاصہ ماتم کدہ تھا۔ عورتوں کے "بین" جگر کے ٹکڑے کر رہے تھے، بچوں کے شور و شین سے کلیجہ پانی پانی ہو رہا تھا، مرحوم کے دوست اور عزیز جمع ہو رہے تھے کہ آپ کو "منزل" تک پہونچا دیں۔

کچھ دیر بعد سب کے سب اُس کمرے میں داخل ہوئے جہاں مرحوم ایک سفید شال کے نیچے آرام فرما رہے تھے، جگہ جگہ اگر بتیاں جل رہی تھیں، عود و اگر کی خوشبو سے کمرہ طبلۂ عطار ہو رہا تھا اور آپکے سرہانے دو حافظ تلاوت کر رہے تھے۔ کچھ عجب عبرت خیز منظر تھا، جو انسان چند گھنٹے پہلے بھلا چنگا، کھاتا پیتا، چلتا پھرتا تھا کسے خبر تھی کہ اس طرح "رفو چکر" ہو جائیگا۔

مرحوم کی خوبیوں کو یاد کر کے ہم سب نے آٹھ آٹھ آنسو بہائے، مرحوم کے بھائی سے معلوم ہوا کہ آپ کی چھوٹی بہن کو جب خبر ملی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ اُس نے کھڑے قد سے خود کو گرا دیا اور غش کر گئی چنانچہ اب تک کئی گھنٹوں سے بیہوش ہے۔ آپ کی بھانجیوں نے اپنے سروں کو دیوار سے اِس بُری طرح ٹکرایا کہ لہولہان ہو گئیں، ہم نے حتی الامکان حق تعزیت ادا کیا اور دُعا کی کہ خُدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔

جب مرحوم کے بھائی نے شال ہٹا کر ہم سب کو مرحوم کا "دیدار" کرایا تو ہم سب نے مرحوم کی "جوانہ مرگی" پر اظہار افسوس کیا، مرحوم کی بے وقت موت اور آپکے ننھے ننھے معصوم بچوں کے مستقبل پر ہم ابھی غور کر ہی رہے تھے اور مرحوم کی بوڑھی والدہ کے حالِ زار اور جوان بیوہ کی بیکسی پر دل ہی دل میں ہم افسوس کر رہے تھے ہمیں مرحوم کے جسم میں کچھ حرکت معلوم ہوئی اور ہماری حیرت و پریشانی کی کوئی حد و انتہا نہ تھی جب ہم نے دیکھا کہ "مرحوم" کلمہ پڑھتے اُٹھ بیٹھے، "مرحوم" کا زندہ ہونا تھا کہ ایک بھگدڑ پڑ گئی، بچے چیخیں مارتے بھاگ نکلے، دونوں حافظ ایک کونے میں چپک گئے اور بغیر آواز کے "لاحول" اور "برب الناس" پڑھنے لگے، مرحوم کے کئی احباب دریچے میں سے کود کر کچھ عجب بے سروسامانی سے فرار ہو گئے، دو چار "جیوٹ" جو

ترسیدنم پائے رفتن بہ بست!

کے چکر میں تھے وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے۔ ع۔

ایں کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب!!

"مرحوم" کے بھائی ایک طرف کھڑے مسکرا رہے تھے اور "مرحوم" کے چہرے پر بھی ہنسی کی ایک ہلکی سی لہر رقص کر رہی تھی ہم نے ڈرتے ڈرتے آپ کی اس "ڈرامائی" موت کے متعلق جو استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ "کوّا کوّمی" کے "ملاپ" کا نظارہ اس ساری ستم ظریفی کا باعث ہوا، سب کو اس کی جھینپ رہی کہ "کوّا کوّمی" کے کارن اُنہیں "اُلّو" بننا پڑا۔ ہمیں یہ فکر ہوئی کہ ان پرندوں کی "شرارت" کے واقعات میں اگر کچھ تھوڑا سا

اضافہ ہوجاتے۔ کوئی تعجب نہیں جو "موت" بھی ان شرکت کی رسم ہی سماج سے اٹھ جائے۔ جو کچھ بھی ہو ہمیں یہ سُن کر بڑی مسرت ہوئی کہ "مرحوم" کی والدہ ماجدہ بیحد خوش ہیں کہ اب آئندہ سوا سو برس تک "مرحوم" سے مسٹر عزرائیل ملاقات کی جرأت نہیں فرما سکتے۔ بڑی بی صاحبہ کو اس کی بھی خوشی ہے کہ "مرحوم" نے بڑی سعادت مندی سے اس معاملہ میں اُن کے احکام کی لفظ بہ لفظ تعمیل فرمائی، سچ ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست!!

ایک بزرگ کسی سنیما میں ٹکٹ خرید رہے تھے کہ ایک دوست سے ملاقات ہوئی، اُنہوں نے ٹکٹ خریدنے سے پہلے آپ سے پوچھا "آج کے فلم کی آپنے بھی تعریف سنی ہوگی؟"

فرمایا "میں تو اس فلم کو ایک ہفتہ سے مسلسل دیکھ رہا ہوں!"

یہ سنتے ہی دوست نے بھی ٹکٹ خرید لیا اور دونوں سنیما ہال میں بیٹھ گئے۔ دوست نے پھر پوچھا "تو یہ فلم اتنا اچھا ہے کہ آپ ایک ہفتہ سے مسلسل دیکھ رہے ہیں؟"

ارشاد ہوا "فلم تو کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے مگر اس میں ایک سین کو پورا دیکھنے کی خاطر ہر روز آرہا ہوں!"

اتنے میں تماشہ شروع ہوا، تھوڑی دیر کے بعد ایک منظر دکھائی دیا جس میں چند یوروپین لڑکیاں نہانے کے لئے سمندر کے کنارے لباس اتارنا شروع کرتی ہیں کہ ایک ٹرین سامنے سے گزرتی ہے، ٹرین کے گزرتے ہی لڑکیاں غسل کرتی نظر آتی ہیں۔ صرف اُن کے چہرے دکھائی دیتے ہیں، یہ منظر نظر آتے ہی آپنے بڑی مایوسی سے فرمایا "آج بھی ٹرین لیٹ نہیں ہوئی"!!

دوست نے حیرت سے پوچھا "ٹرین لیٹ ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

ارشاد ہوا "میں اس فلم کو ایک ہفتہ سے اس لئے دیکھ رہا ہوں کہ یہ منحوس ٹرین کسی دن تو لیٹ ہوگی اور مغرب کی عریانیت اپنے پورے لباس میں نظر آئے گی، مگر افسوس کہ آج بھی وہی ہوا جو آٹھ روز سے ہو رہا ہے!! خیر جس سین کے دیکھنے کی تمنا ہے وہ نظر آئے یا نہ آئے مگر بھئی ہم تو ولایتی ٹرینوں کی پابندیٔ وقت کے قائل ہوگئے۔ دیکھئے کسی دن ایک سکنڈ کی بھی دیر نہیں ہوتی! ٹھیک اس وقت آتی ہے جبکہ لڑکیاں اپنے فراک اتارتی ہوتی ہیں اگر کوئی ہندوستانی ٹرین ہوتی تو یہ شوخ بے حجاب لڑکیاں اپنے حُسن عریاں کو ایک دن بھی چھپا نہیں سکتیں!!!"

ایک بزرگوار نے اپنی ۱۹۲۰ء کی بڑی سیڈان ٹاج موٹر کار پر "فروخت ہوتی ہے" کا ایک چھوٹا سا بورڈ سامنے کے آئینہ پر لگا دیا اور موٹر کو کمپونڈ کے اندر ایک درخت کے نیچے ممکنہ حفاظت کے ساتھ رکھ چھوڑا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو "سکنڈ ہینڈ" کار کی ضرورت تھی۔ ایک واقفکار کی حیثیت سے ہم ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل کرنے پر مجبور کئے گئے اور چلے موٹر دیکھنے، کوئی تین بجے ہونگے کہ ہم دونوں در دولت پر پہونچے، وہاں ایک مرد معقول سے آمنا سامنا ہوا، بوٹا سا قد، گندمی دھوپ چھاؤں رنگ چمڑا ہڈیوں پر مڑا ہوا گال سے زیادہ کن پٹیاں پچکی ہوئیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ..... کان، چونچ دار ناک، چگی ڈاڑھی، موٹا میلا ہفت پیوند پاجامہ، باریک ململ کا نسبتاً اجلا ڈھیلا ڈھالا کرتہ، اُس پر پرانا چمڑے کا ...

بُوامُبارک

خط

حیدرآباد دکن۔ ۲؍اپریل ۱۹۳۱ء

پیاری ص! میرا خیال ہے کہ تو کچھ طویل اور مزیدار قصہ کا آغاز کر رہی ہے۔ ظالم! تو تو مضمون نگاری میں اوّل آئی ہوگی۔ دیکھو تو خط کو کیا معمہ بنا کر لکھا ہے، تیری چالاکیاں مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتیں—— سمجھی! کیا سمجھی!!!

تیرے خط نے اتنا اشتیاق پیدا کیا کہ ٹکٹ نہ تھا تو اس شریر الف کے بچے سے منت سماجت کر کے ٹکٹ مانگا اور ابھی ابھی بالکل ابھی تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔

روز دعا کرتی ہوں کہ اس نالیاق (دیکھو نالائق نہیں کہہ رہی ہوں یہ اس لئے کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔) ص کی جلدی سے شادی ہو جو ہم لوگوں کو چھٹکارا ملے۔ ہر خط میں ایک شگوفہ کھلاتی ہے—— اور یہ خالہ والہ کیا بکتی ہے۔ جلد لکھو، ورنہ یاد رکھ! ایک بات اور کہتی ہوں اس شرط پر کہ تو ہرگز نہیں جلے گی...... اُن کے مزاج کیسے ہیں؟—— ارے تو کیا خاک جلے گی!—— تیرے تو من میں لڈو پھوٹیں گے!

اچھا بھئی—— اب ہمارا خدا حافظ اور تمہارا—— وہ حافظ!۔

تمہاری بہن ـ س

دہلی۔ ۸؍اپریل ۱۹۳۱ء

او کافرہ س!۔

یہ کیا بکتی ہے۔ "وہ حافظ"—— بالکل کفر بلکہ بدتر از کفر! اچھا اب ذرا شکردان سامنے رکھکر بیٹھ! وہ کڑوی کڑوی سناؤں گی کہ منہ بنانے لگے!! تمہاری پیاجی بن (دیکھو سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔) کی باتیں ہمارے حضور میں پہنچ نہ سکیں مابدولت ان فضولیات پر غور فرمانا فضول خیال فرماتے ہیں۔

خیر تجھے معاف کرتے ہوئے ہم ان باتوں کو سنا ہی ڈالتے ہیں جن کا اشارہ پچھلے عالی نامے میں کیا گیا تھا۔

کچھ دن ہوئے ہم بہنیں انگنائی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ق نے انگڑائی لی اور آنکھیں نیم باز کر کے میری طرف دیکھا۔ میں نے دل میں کہا۔ اوہو! کیا حسین بننے کا شوق ہے اور ستانے کیلئے اُس کے تل پر ایک چٹکی لی۔ تم نے دیکھا ہوگا اُسکے گلے پر ایک تل ہے۔ خیر اُسکے ساتھ یہ شعر بھی پڑھ ڈالا ؎

لے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتی
پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

اس پر جلکر کہنے لگی: "خدا جانے کتنے ادیب اور شاعر مرے ہیں جو تم پیدا ہوئی ہو!" اُدھر سے اماں جان آرہی تھیں اُسے خوب موقع ہاتھ لگا۔ کہنے لگی: "اماں جان سے کہتی ہوں آپا جان یہ شعر پڑھ رہی تھیں۔"

"اونہہ! کہدو میرا کیا کر لیں گی" مگر جب وہ کہنے پر آمادہ ہوگئی اور اماں جان قریب آگئیں تو میں نے چپکے سے اُسکے کان میں کہا: "اچھی بہن ہے نا میری مت کہنا ہاں"

اماں جان ریل کے انجن کی طرح آہیں اور سیٹی دیتی ہوئی چلی گئیں "اری لڑکیو! کیا تمہارا کھانا کھانے کا ارادہ نہیں ہے" یہ اماں جان خواہ مخواہ گھنٹہ بھر پہلے سے ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا اُس دن تم نے کیسا دھڑ کا کھایا تھا۔ اماں جان نے تم سے کھانے کو کہا تم جلدی جلدی آئیں تو وہاں دسترخوان بھی نہ بچھا تھا۔ کیوں استانی کیسی کہی!!۔

خیر اب اماں جان چوکیوں کے فرش پر بیٹھی چلا رہی تھیں "اری گلشن! او گلشن! مردی جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر پڑی پھرتی ہے جا کھانا نکلوا!!"

ہم سب جا کر چوکیوں پر جمع ہو گئے۔ باورچی خانے سے کھانا تیار ہو کر نکلا—— آگے اس شرط پر کہوں گی کہ منہ میں پانی نہ بھر لانا۔ سینیوں میں روٹیوں کی جٹیاں، سالن کی پتیلیاں دالوں کی ہنڈیاں، کباب کی کڑھائیاں اور میٹھے کڑھاؤ لنگری

قریبے سے جمائے گئے۔ بی داروغن (وہی سیاہ کاگا رکوا) کے خاندان سے ہیں۔ آپا رکو انگیر اور جموں سے نکال کر دکھانا اور چکھانا شروع کیا۔ تمہیں تو معلوم ہے کھانا نکلنے کے وقت کچھ باہر کی بڑی بوڑھیاں اور قدیم الخدمت معذورین کوئی رکابی کوئی پیالہ لئے آن موجود ہوتی ہیں۔ اماں جان گو انتظام کے مصائب و حوادث سے پریشان ہیں مگر خوش ہیں کہ بڑھیوں کی دعائیں لے رہی ہیں۔ بڑھیوں کا کہنا بھی خالی از لطف نہیں۔ یہاں آواز دوڑ (گھڑ دوڑ کے وزن پر) ہو رہی ہے۔ یعنی ہر ایک بڑھیا صاحب یہ سعی بلیغ فرما رہی ہیں کہ صرف انہی کی آواز بلا شرکت غیرے بیگم صاحب کو صاف سنائی دے۔ انجام! ادھر حلق چھل رہے ہیں اور ادھر کانوں کے پردے کچھ یونہی سے پھٹے جا رہے ہیں۔ اماں جان کی آواز گونجی "بوا! ذرا دھیرے دھیرے بولو" تب جا کر کچھ مصیبت کم ہوئی۔ اب بی آپا نے کھانوں کو دیکھ بھال کر بیگم صاحب (اماں جان) کی طرف دیکھا اور کہا "بیگم صاحب خدا آپ کو سلامت رکھے! اور یہ کارخانہ قیامت تک یوں ہی چلتا رہے بلکہ خدا کرے دنیا بھر کی خوشیاں آپ ہی کے سائے میں پلیں" یہ سنتے ہی بیگم صاحب چونکی ہوئیں اور پوچھا "بوا کیا ہے کچھ تو کہو؟"

آپا نے قہر کی نگاہوں سے بڑی بوا (روٹی پکانے والی) کی طرف دیکھا اور بولی "پکے آٹھ سیر کی روٹیوں کا حکم داروغن کو دیا گیا تھا۔ اب یہ چھ سیر روٹیاں سامنے آئی ہیں" بڑی بوا بھی بجلی کی طرح تڑپ کر سامنے آئیں اور کہنے لگیں "بی آپا چار دن کی چاندنی پر کچھ اترا رہی ہو، میری ساری عمر اسی سرکار میں گذری ہے، بیٹا بیٹی کی شادی نہیں کی۔ میاں بیگم پر سے نہیں تصدق ہوا۔ اس کے دن وار بھی نہیں کئے اور اب پوتا پوتی تو لے سے تو ای کی خوشیاں بھی نہیں کر رہی ہوں، کبھی رتی کی چیز ادھر سے ادھر نہیں کی۔ بیگم! بوا مبارک اور داروغن سے پوچھ لیجئے بارہ تیرہ برس سے تو یہ بھی دیکھ رہی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تین دن سے آپا مجھ سے جل کھائے ہوئی ہیں۔ پرسوں ان کا ڈھینگر ڈیوڑھی پر آیا تھا، انہوں نے مجھ سے روٹی مانگی، میں نے کہا حساب کی پہلے نہیں دیتی، پھر انہوں نے کہا خیر مڑوڑیوں کی ٹکیاں ہی دیدو۔ میں نے کہا بیوی! وہ میرے بچوں کا حق ہے۔ بیگم! خدا کی قسم چاہو تو بی داروغن سے پوچھ لیجئے!"

داروغن نے بڑی بوا کو اس طرح دیکھا جیسے بزمون جانسن کو گفتگو کرتے وقت دیکھتا۔ اب بی داروغن نے کوزے کو دریا میں بند کرتے ہوئے یوں گلفشانی کی۔

"بیگم آٹا پانی میں بھیگ کر ہلکا ہو جاتا ہے کچھ خشکی میں نکل جاتا ہے، کچھ توے پر جل جاتا ہے اور کچھ مڑوڑیوں میں نکل جاتا ہے" یہ بڑی بوا بھی پرانی پھکیت، زہر کی بجھی، آنکھوں میں سے کاجل چرانے والی، ہمیشہ دس پانچ طرفداروں کو کھلا پلا کر راضی رکھتی ہے اور مبارک تو اس کی خالص و مخلص دوست ہیں۔ خیر بھئی! تقریباً سب نے بڑی بوا کی طرفداری کی اور بیچاری آپا کو الّو بنا دیا۔ بڑی بوا فتحمندی کی نظریں جا بجا ڈالتی ہوئی باورچی خانے میں چل دیں۔ اب ہم "حضر تناول فرمانے بیٹھے۔ دسترخوان کا حال بھی سن لو۔ ارے! نہیں نہیں تو رال ٹپکا ٹپکا کر خط کی سیاہی پھیلا دیگی۔ اچھا پھر کبھی — رخصت۔

تمہاری بہن۔ ص

جھڑپ

دہلی۔ ۱۶ اپریل ۳۸ء

اچھی س۔

تمہارا شرارت نامہ ملا۔ غنیمت تمہیں میری باتیں پسند تو آئیں، لکھتے وقت سمجھ رہی تھی کہ تو پڑھکر ناچنے لگے گی۔ شکر ہے اس خدائے عزوجل کا کہ تو نے معقولیت کا ثبوت دیا ورنہ ڈارون صاحب مدظلہ کی تھیوری صحیح ہو جاتی۔

اچھا اب ذرا کیرٹ نکال لے اس کے بعد خط پڑھ! یہ اس لئے کہ ایک خوفناک نقشہ کھینچ رہی ہوں۔ — اگر تو نے کیرٹ نہ نکالے اور کچھ خطا وطا کا معاملہ ہو گیا تو مجھ بیچاری پر الزام نہیں۔ اناجی کو ہم نے دائی بنایا اور آنکھ مچولی کھیلنے کی ٹھیری۔ بیچ صحن میں ایک کھٹولی بچھی ہوئی ہے۔ سامنے تپائی پر قندیل رکھی ہوئی ہے — کھٹولی پر ایک سایہ متحرک نظر آ رہا ہے۔ بس! دل مضبوط کر لو!! قریب جاؤ — اف! دونوں آنکھوں کے درمیان سے ناک شریف منہ کی طرف درخت کے تنے کی طرح موٹی ہوتی (ارے توبہ پتلی) چلی گئی ہے اور ہونٹوں کو چومنے کیلئے بے اختیار جھکی پڑتی ہے۔ نہایت حسین

آنکھیں جیسے باؤلیاں اور وہ بھی گہرائی میں! اشسنا ہو کلیوپیٹرا! سینرر کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں یعنی نہایت چھوٹی اور گہرائی میں۔ واقعی بڑی بڑی ابلے ہوئے انڈے کی طرح نکلی ہوئی آنکھوں کو کون پسند کرے گا۔ اور دیدے اس طرح چمک رہے ہیں جیسے باؤلی کی تہہ میں پانی!

لب بال سے زیادہ پتلے اور تلوار کی طرح چمک رہے ہیں ——— بعض وقت اتفاق سے ریگستان کی وہ ننھی سی جان یعنی اونٹ انہیں دیکھ لیتا ہے تو کمبخت فخر کرنے لگتا ہے اور گردن کے اشارہ سے کہتا ہے کہ بھئی۔ بکہو تو ہمارے ہونٹ پتلے ہیں کہ انہیں! ——— اب رہا رنگ کا مسئلہ! تو اللہ میاں جس وقت برش ہاتھ میں لئے ان پر رنگ پھیر رہے تھے تو جھینکے سے ذرا جنبلی اور موتیا پر سے کچھ رنگ کھرچ لیا تھا ——— اور اگر خدا نخواستہ آپ کو پھر بھی نسپا پر نظر آئے تو یہ آپ کی نظر کا قصور ہے! اتنی دبلی پتلی ہیں کہ دنیا کا سب کمزور آدمی کا نار شک کرنے لگے۔

یہ نقشہ کس کا تھا ——— بوا مبارک کا! ——— اچھا اب تم کپڑوں کا جائزہ لے لو۔ خیر تو وہ کھٹولی پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی اور ہم آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اب مجھے شرارت سوجھی۔ میں بھاگتی بھاگتی مبارک اور قندیل کے بیچ میں سے گذری جس سے اندھیرا ہو گیا اور اُسے سجھائی نہ دیا۔ اُس نے مجھے گھور کر دیکھا ——— چند لمحے بعد میں پھر اسی طرح گذری تو جذبہ میں آ کر بولی "کیوں ری صَن کی بچی مانتی نہیں" میں چُپ ہو گئی۔ اتنے میں نجمہ نے ایک مصرع پڑھا جس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ (تم سوچ رہی ہو گی کہ ہم موقع سے شعر کیسے پڑھ دیتے۔ بات یہ ہے کہ خاص طور سے اس قسم کے شعر ڈھونڈ کر لگائے جاتے کہ بقول تمہارے وقت ضرورت کام آئیں۔) خیر وہ مصرع سُنو!

میری نظروں میں ہیں تیرے کرتوت

میں جواب میں ہنستی ہوئی بولی!

بینا ہوں اگر آنکھیں ارباب دغل دیکھیں
جبّے میں عمامے میں کردار نہیں چھپتے

اس پر سب لڑکیاں ہنس پڑیں ——— بوا مبارک تو بھری بیٹھی تھیں اب رگِ غضب میں کافی سے زیادہ اُبال آ گیا اور بخارات ڈھکنے کو اُچھال کر یوں نکلے!

"(آہستہ سے) اری مُردار و مونڈی کاٹیو! (زور سے) یہ کیا شور و غل ہے بیٹا! تم لوگ بدتہذیبیاں ... بد ... بدسلیقیاں اور بدشعاریاں (بدشعاریاں) نہ کیا کرو۔ میں یہاں اس لئے بیٹھی ہوں کہ تم میں نہ ... نہ ... نظ ——— وہ کیا بلا ہوتی ہے۔ خیر اب شرارت مت کرو!"

بڑی آپا ہنس کر بولیں "بھئی مضمون نگاری میں اُستانیوں پر رعب گانٹھنے کیلئے اچھے لفظ مل جاتے ہیں" (حقیقت میں وہ مشکل الفاظ یاد کرنے اور بے جوڑ استعمال کرنے میں مہارت تامّہ رکھتی تھیں) مگر میرے دل میں تو "مُردار اور مونڈی کاٹیو" کھٹک رہا تھا۔ میں بڑھ کر بولی "زبان کا ٹانکا بہت ٹوٹ گیا ہے (آہستہ سے) آئندہ سے کچھ بولی تو مُنہ لال کر دوں گی" (بہن اس وقت خیال نہ رہا کہ اُن کے مُنہ پر چنے بھی لگیں تو مُنہ لال نہیں ہو سکتا) مبارک نے بگڑ کر کہا "مجھ سے زیادہ زبان نہ ملاؤ ورنہ ———"

"... ہونہہ! تم میرا کیا بگاڑ لو گی" میں نے جواب دیا۔

"(آہستہ سے) ارے بیوی بنو! تم کون سی ایسی بلخ کی شہزادی ہو کہ میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی"

اماں جان کو آتا دیکھ کر میں خاموش ہو گئی ——— بہن اُس لقو نے دھیتے میلنے شروع کئے۔

"بیگم! خدا کی قسم انہوں نے مجھے گالیاں دیں، کوسنے دیئے اور مارنے کا ڈراوا الگ دکھا رہی تھیں ——— میں نے صرف اتنا کہا کہ دیکھو بیوی شور نہ کرو بس جھاڑ کا کانٹا ہو کر لگ گئیں" مبارک نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے ص" اماں جان بولیں۔ اتنے میں تگا جی (انا کے شوہر) کیا ہے! ارے بھئی کیا ہے!! کہتے ہوئے آئے، قصہ معلوم ہوا تو بولے "یہ نباڑن ہے میری بیٹی نے آج تک کبھی کسی کو کوئی بُری بات نہیں کہی"

اماجان نے کہا "چلو معافی چاہ لو"

"کیوں مانگے صاحب معافی، نہیں مانگتی وہ" یہ کہکر تگا جی میرا ہاتھ پکڑ کر لے چلے

"بھئی میر صاحب! یہ بات اچھی نہیں اسے معافی مانگنے دو" اماں جان بولیں۔

"آپ کا ارادہ کیا ہے" بڑھاپے میں گھر سے نکلوانا چاہتی ہیں" تگا جی نے خفا ہو کر کہا۔ اماں جان خاموش ہو گئیں۔ اور مبارک بڑبڑانے لگی۔

ہم سب لڑکیاں ننھّا جی کے ساتھ اُن کے کمرے میں گئیں۔ کسی نے ان کا حقہ بھرا، کسی نے پنکھا جھلا اور وہ بھی خوش ہیں ایک بجے رات تک کہانیاں سُناتے رہے۔ بچھونے پر لیٹنے کے بعد خیال آیا کہ کل وہ مس تو ضرور پوچھے گی "ص! تمہارا ہوم ورک" تو کیا جواب دونگی۔

آگ لگے اس خط کو ـــــ دوات لڑھک گئی اور ورق پوچھ رہی ہے "آپا کیا ہوا" چلو بس اب ہم نہیں لکھتے! ـــ یہ دو سطریں گری ہوئی سیاہی میں ڈبو کر لکھی ہیں۔

تمہاری بہن ـــــ ص

لیئی

دہلی۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۳۰ء

پیاری س!

سُن تو آج وہ مزیدار واقعہ سُنا رہی ہوں کہ تو بھی ہنستے ہنستے دُہری ہوجائے گی۔ خُدا بچائے بڑی آپا سے وہ سوجھتی ہے کہ بس!

آج بھائی منو آئے تھے اور پورے گھر کی دعوت لے گئے تھے۔ اماں جان اور نانی اماں دس بجے کے قریب چلی گئیں۔ مجھ سے چلنے کو کہا تو میں نے درد سر کا بہانہ کر دیا اور بڑی آپا نے بد ہضمی کا۔ اس طرح ہم سب بہنیں گھر میں رہ گئیں۔ گیارہ بجے بوا مبارک کھانا کھانے بیٹھیں، آنکھیں نیند کے غلبہ سے بند سی ہو رہی ہیں۔ ـــــ کھانا کھاتی جاتی ہیں اور بدقت تمام آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے تہہ خانے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ (جس میں قیلولہ کیا جاتا ہے) ع:-

سرا کو چلے تھکا اونٹ دم بدم دیکھے

زبردست کوشش کی جا رہی ہے کہ کھانا جلد ختم ہو معمولی زبردست نہیں اتنی ہی زبردست جتنی سوراج حاصل کرنے کی کوشش! ـــــ کھانا بھی مُنہ کی طرف اس طرح کھنچتا چلا جارہا ہے جیسے کسی پُرزور مقناطیس کی طرف لوہے کے ریزے!۔ خدا جنت نصیب ـــــ ارے توبہ، خُدا کرے قیامت کے بوریے سمیٹیں آدمی فی الحال ایک ماشاء آدمی اچھی ہیں لیکن رونا یہ ہے کہ کھاتی ہی نہیں ـــــ اچھا تم خود اندازہ کرو۔ جامنیں کھاتی ہیں تو بھی ذرا سی انگنائی کی ستر پوشی ہوجاتی ہے، بھٹے کھائیں گی تو جب برآمدہ کی کھپریل بدلنے کیلئے مزدور بلائے جاتے ہیں تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ کھپریل بھٹے کی گلیوں میں تبدیل ہوگئی ہے اور جب بیچارا اپنی حسین معشوقہ کھپریل کے انتقال سے افسردہ ہوکر پوچھ بیٹھتا ہے تو تمہیں بتاؤ بہن سوائے اس کے کیا کہیں "صبر کرو میاں ـــــ اللہ میاں کریم و رحیم ہے وہ تمہیں جنت میں ان کے عوض حور شمائل کھپریل عنایت فرمائیگا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے صبر کا" کتنے بیوقوف ہوتے ہیں یہ انجمن مزدوراں کے معزز اراکین! ارے بھئی جب ایک سال میں تبدیل ہوگئی تو کون سی حیرت کی بات ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے فلسفۂ تغیر کو بوا مبارک نے اپنی مشہور عالم فلسفیانہ کتاب "کلیات مبارک" میں بھی تحریر فرمایا ہے سنو!

"جب خلیفہ ہارون رشید کی بکری جس کا نام بزاخفش تھا اپنے بچھڑے کے ساتھ ریگستانوں میں چرنے جاتی اور واپس آتی تو اسکا دودھ نچوڑا جاتا جس سے خلیفہ جی کی ساری فوج سیراب ہوتی تھی۔"

خیر بھئی اب تک علمی مسائل پر لکھا جارہا تھا اب کیا جاتا ہے بیان بیچ مسئلہ شرارت کے جس سے اکثر حرارت ہوجایا کرتی ـــــ سنو بہن! سٹو پر لیئی پک رہی ہے اور بڑی آپا ایسی سرگرم ہیں جیسے خدانخواستہ تمہاری شادی ہو رہی ہو۔

"نو بہار!" بڑی آپا کی آواز فضا میں کھسیا کر رہ گئی "آئی بی بی" کے جواب کے ساتھ نو بہار، ہر نو بہار کی طرح جھومتی مُسکراتی آن موجود ہوئیں۔

"ذرا لودھن چماری کو بھیج دے اور تھوڑی دیر پنکھا تو کھینچ"

"جی اچھا!" کہہ کر وہ چلدی۔ اب بی لودھن تشریف لائیں اور خالص ٹکسالی فارسی میں گفتگو شروع کی "ہیں جی بیغم جی کیا بولت ہو"

"اری دیکھ ہم ایک شرارت کرنے والے ہیں ہنسے گی تو نہیں"

بتیسی کی نمائش کرکے رضامندی کا اظہار کیا گیا۔ "بس خاموش پنکھا کھینچتی رہ ـــ اور ہاں کسی سے نہ کہیو" بڑی آپا نے دواتی دیتے ہوئے کہا۔ "ناہیں بولت" کہکر وہ خوش خوش چلی گئی۔ اب ہم سب چوروں کی طرح تہہ خانے کی طرف چلے۔ پنکھے کی چیں چیں کے ساتھ خرخر کی آواز کمرے میں خاص لُطف پیدا کر رہی تھی۔ بعض دلیر بہنوں کے قلب کی دھڑکن تیز ہے اور پیشانی عرق آلود! ـــــ بوا مبارک مُنہ کھولے اس طرح چت پڑی ہیں کہ پہلی نظر میں جو کوئی بھی دیکھیگا اپنے خیالات کو یوں عربی زبان میں ادا کریگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب بڑی آپا نے اپنی کارروائی شروع کی یعنی لیبی کا ایک لگدا آہستہ سے منہ میں رکھ دیا — جسے اس اللہ کی بندی نے غنک سے اتار لیا۔ اس طرح آنکھ کھل جانے کے خوف سے بالاقساط لیبی پہونچائی گئی — مگر توبہ کرو جی! کروٹ تک نہ لی، بھلا آنکھ کیا کھلتی! — شریرتی اور دیتی نے ایک اور کارروائی بھی کی۔

میں نے نوبہار کو تہ خانے میں چھپا کر کھڑا کر دیا تھا کہ جو کچھ کیفیت دیکھے وہ بیان کر دے۔ اب مخبر کی دی ہوئی خبر کو لکھتی ہوں۔ پانچ بجے کے قریب آنکھ کھلی — ایک مستانہ ادا سے انگڑائی لی — مسکرائیں پھر شرما کر شانوں پر دوپٹہ ڈال لیا۔ ہائے میں کیا کہوں کاش میں شاعر ہوتی یا داغ صاحب موجود ہوتے — خیر باہر آئیں تو سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ چہرہ اقدس پر جس کی نظر پڑتی اس کا چہرہ سرخ، منہ میں دوپٹہ ٹھنسا ہوا اور آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے!

اس ہنسی پر آگ بگولہ ہوگئیں اور لاکھوں صلواتیں سنا ڈالیں لیکن جب اپنی خاص دوستوں کو بھی ہنستے اور مسکراتے دیکھا تو کھسیانی ہوکر وجہ پوچھی — تب حقیقت کھلی کہ آدھا منہ سفید ہے اور آدھے پر سیاہی جلوہ فرما ہے! بڑی بھنائیں اور منہ سے مجلس اقوام میں شکایت، حملہ دھاوا، شب خون کے مترادف الفاظ نکل رہے تھے۔ جب دل کے ارمان نکال چکیں تو فیصلہ صادر فرمایا کہ سوائے ص کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ سب نے سمجھایا کہ بوا اس غریب کے سر میں صبح سے درد ہے، بہنیں تیمارداری میں لگی ہوئی ہیں، ہم نے تو کسی کو باہر نکلتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔

خواب اور تعبیر

اب میں نے نوبہار کو سکھا پڑھا کر بھیجا، وہ پہونچ کر بڑی عقیدتمندی سے قریب بیٹھ گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی اور ساتھ ہی اس حادثۂ المیہ پر اظہار افسوس کیا۔ پھر مبارک نے الٹی سیدھی باتیں شروع کیں اور نوبہار ہاں میں ہاں ملاتی رہی — مبارک بہت خوش ہوئیں کہ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ پھر رازدارانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا "دیکھنا! نوبہار ایک خواب دیکھا ہے دوپہر کو میاں کلن سے کہونگی، دیکھو کیا تعبیر نکلتی ہے۔"

"سنائیے! کیا خواب ہے، میں سنوں گی تو شاید کچھ فائدہ ہوگا۔ بات یہ ہے آپ لوگ اللہ والے ہیں، ہم بدنصیبوں کی قسمت میں تو دوزخ ہی لکھی ہے۔" نوبہار بولی۔

"اچھا بوا! تم سے کاہے کا راز!" خوشی سے پھول کر کپا ہوتے ہوئے مبارک نے کہا۔ "بوا نوبہار! خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بزرگ نورانی صورت، لمبی ناف تک داڑھی، سر پر صافہ اور سبز تہمد باندھے ہوئے ہیں، ایک ہاتھ میں تسبیح اور ایک میں بڑا سا پیالہ ہے۔ میرے قریب آکر کہنے لگے۔ "اے نیک عورت! خوش ہے تجھ سے اللہ تیرا اور بنیں گی کہیں جنت تیری — جا دیں آنکھیں ہم نے تجھے کہ دیکھ سکے تو اس خدائے جل شانہٗ کو — لے یہ پیالہ واسطے تیرے بھیجا ہے اس خدائے پاک نے اور کھلاتا ہوں ہاتھ سے میں اپنے تجھے اس کھیر کو کہ ہو جائے حانسل (حاصل) تجھے اس خدا کی مارفت (معرفت)۔ (بوا مبارک کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی، اس جنتی کھیر کا مزا یاد آگیا ہوگا۔) یہ کہکر اور کھیر کھلا کر وہ بزرگ غائب ہوگئے۔ بوا! ایمان سے ایسا مزا تھا جیسے شہد میں مسکا ملا ہوا ہو — خدا کا شکر ہے، اس کی رحمت کے قربان میں تو سوچ رہی ہوں ایک عمدہ سی کوٹھری خالی کرواؤں اور چالیس دن کا چلہ کھینچوں۔"

"بوا ہم نے سنا ہے اگر شیطان بھی چالیس دن کھائے پیئے نہیں اور حاجتیں پوری نہ کرے تو ولی ہو جاتا ہے۔" نوبہار بولی۔

"اس میں شک کیا ہے بیٹا! — اچھا! دیکھو یہ باتیں کسی سے نہ کہنا تمہیں رازدار سمجھ کر کہدی، دیکھو تمہیں اپنے سر کی قسم۔" مبارک نے کہا۔

"بوا! مجھے کوئی پیٹ کی ہلکی سمجھا ہے۔ سر کی قسم دو!" نوبہار نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی میرے سر کی سہی۔" مبارک نے اطمینان سے کہا۔

"خیر اب بات کیا بڑھاؤں یہی سہی۔" نوبہار بولی۔

"تمہارا جو جی چاہے جس موکل سے چاہو گی منگوا دونگی، اللہ کا فضل ہے بیٹی! مبارک بیگم ایسی ویسی تھوڑا ہی ہیں۔" مبارک نے اکڑ کے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہ ہو۔" نوبہار نے جواب دیا۔

"اور دیکھیو کسی پر دل ول آئے تو مجھ سے کہدیجو۔ بس

ایک تعویذ کافی ہوا جیشی بجا کر۔ یوں رام ہو جائیگا۔"

نوبہار شرما کر بولی "کیا کہہ رہی ہو بوا؟"

"اری کہتی کیا ہے تو تو ابھی بچہ ہے ہمارا اس جوانی میں جی چاہتا ہے کہ کوئی ہم سے محبت کرے اور محبت کرنا بری چیز تھوڑا ہی ہے اری دیوانی! فرہاد او مجنوں جیسے ولیوں اور مارفت (معرفت) والے بزرگوں نے کی ہے۔" مبارک نے عالمانہ اور تجربہ کارانہ انداز میں کہا۔

نوبہار تیر کی طرح ہنستی ہوئی آئی اور مندرجہ بالا باتیں سنائیں۔ اب ہمارا کمرہ قہقہستان بنا ہوا تھا۔

ثقیل معرفت

سن! ایک مزیدار بات اور سن! نوبہار میرے نہانے کے لئے پانی سمو کر آ رہی تھی کہ دور سے ...... ماہ محرم کی بو آنی شروع ہوئی۔ آگے بڑھی تو کانوں میں ہنسنے والے کی بھنک پڑی۔ تیز قدم ڈالتی ہوئی پہونچی تو دیکھا کہ بوا مبارک چارپائی پر پڑی ہیں اور سب لوگ انہیں شمع کی طرح گھیرے ہوئے ہیں، کوئی پاؤں دبا رہا ہے کوئی سر دبا رہا ہے اور کوئی خواہ مخواہ پریشان ہوا جا رہا ہے۔ نوبہار نے آہستہ سے داروغن سے پوچھا "کیا ہوا؟"

گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکلا "ڈک ڈک .... ڈاک۔"

"ڈاک کہاں سے آئی ہے" نوبہار نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اب انہیں اپنی پریشان زبان کے اوپن کا خیال ہوا۔

داروغن جھلا کر بولی "اے بی! تمہیں مذاق ہی سوجھتا رہتا ہے۔ اس غریب کی بری حالت ہے، ڈاک لگی ہوئی ہے اور کچھ جلدی چیز نکل رہی ہے۔" جس کی تصدیق راکھ کے متعدد ڈھیروں نے اپنی زبان حال سے کی۔ نوبہار نے فوراً مجھے حمام میں خبر پہونچائی اور جواب کے انتظار میں جھری میں سے دیکھنے لگی۔

"کیوں ری مردار، یہ کیا؟"

نوبہار ہنسنے لگی۔ پھر میں نے جھری کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کچھ کہا۔

اب کے نوبہار جو پہونچی تو "ہائے اللہ مر گئی، ہائے اللہ مر گئی" کے نعرے تیزی سے کانوں کے پردوں سے گزر کر دماغ کی دنیا میں ہلچل ڈال رہے تھے اور میں یہاں ڈر رہی تھی کہ کہیں ان مہربان تیمارداروں کے دماغ رکارڈ نہ بن جائیں۔ آخرکار اماں جان کے پاس قاصد بھیجا گیا مع ایک عدد پیام کے کہ "ہم نے بوا مبارک کی زندگی کو دشمن کے نرغے سے بچائے رکھا ہے، اب آپ جلد تشریف لائیں اگر زندگی کمزور ہے تو موت میں اور اس میں صلح ہو جائے نہیں تو حملہ کی تیاری کی جائے۔"

یہاں یہ گڑبڑ ہو ہی رہی تھی کہ نوبہار نے ایک بہت ہی قابل عزت بات کہی جس کے سننے کے لئے بوا مبارک تا قیامت تیار نہ تھیں۔

"بوا! تمہیں یہ معرفت پچی نہیں ــــ اور پچے بھی کیسے! اس ثقیل معرفت کو پچانے کے لئے برسوں سنگدانے چبانے پڑتے ہیں۔" بہن! یہی بات میں نے نوبہار کو سکھائی تھی۔

بھلا مبارک خاموش ہو جاتیں، ان کے تو مرچیں لگ گئیں، چنانچہ فوراً محویت طاری ہو گئی (طاری کی گئی یا ہو گئی ایک ہی بات ہے) اور زبان سے یوں معرفت و صوفیت و فقیریت میں ڈوبے ہوئے مضامین ارشاد فرمائے گئے "جو کوئی بھی اس نیک بی بی کو کسی قسم کی تکلیف پہونچائے گا اس پر مصیبت نازل ہوگی" یہ سنتے ہی سب کے سب سناٹے میں آ گئے۔ صرف نوبہار کھڑی ہنستی رہی۔

"حضور! آئی ابھی یاد فرمایا ہے ــــ مجھے حضرت صاحب کی درگاہ لے چلو ــــ مجھے بلا رہے ہیں!!"

یہاں یہ صدائیں بلند ہو رہی تھیں کہ اماں جان پہونچیں اور مجھے بلایا۔ میں کپڑے پہن کر پہونچی تو دیکھا کہ سب کے چہرے اترے ہوئے ہیں۔ اماں نے گھبراتے ہوئے کہا "بیٹا! جاؤ ذرا جلدی سے ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کر دو اور بھیا سے کہنا کہ تیار رہیں۔"

میں ٹیلیفون کر کے بھائی کے پاس پہونچی اور بولی "بھیا تیار رہو، مبارک کے دفن کا انتظام کرنا ہے۔"

"ہائیں! سچ مچ یا گپ ہے" بھائی نے پوچھا۔

"سنا ہے خدا جانے گپ ہے یا نہیں مجھے خود بھی اعتبار نہیں آتا اس لئے کہ بعض لوگ مذاق کے طور پر بھی مر جایا کرتے ہیں" میں نے جواب دیا۔ بھائی ہنس پڑے اور مبارک کا حال دیکھنے کیلئے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب آئے ــــ پردہ ہوا اور بھائی جان ڈاکٹر صاحب کو اندر لیکر آئے۔ جب انکو معلوم

ہوا کہ مبارک بیمار ہے تو مسکرا دئے کیونکہ ہمارے خاندانی ڈاکٹر ہیں اور مبارک کی چالاکیوں اور عیاریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نبض دکھانے کو کہا۔ بوا مبارک نے کوئی ہزار بار اس غریب کو کافر کا خطاب عطا کر کے دست نازک پیش کیا۔ ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے بھائی سے انگریزی میں کہا

"مسٹر! دیکھئے ابھی اس عورت کا مزاج، بیہوشی اور بیماری سب کچھ ٹھیک کئے دیتا ہوں"

اماں جان نے بے تاب ہو کر مجھ سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہے ہیں ص؟"

میں نے متین اور سنجیدہ صورت بنا کر کہا "یہ کہہ رہے ہیں کہ ہوپ لیس کیس (HopelessCase) ہے۔ یعنی ان کی زندگی سے ناامید ہو جانا چاہیئے"

اماں جان کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں، مبارک نے محویت کو بالائے طاق رکھ ہچکیوں کے ساز کے ساتھ اچھے سُروں میں نغمہ بھی اگداز یا وحشت افزا شروع کیا — ہائے! موت دانت نکالے اس کے سامنے کھڑی تھی!

"ہائے! مر گئی اللہ — چھوڑ مردے چھوڑ!" مبارک کے کہنے پر میں سمجھی کہ تو بھی فرشتۂ موت نے آ ہی دبوچا — مگر پردے میں سے جھانک کر دیکھا تو کچھ اور ہی منظر تھا۔ بس! بس ظالم ڈاکٹر نے مبارک کے ہاتھ پر جلتے ہوئے سگرٹ سے لگا دیا تھا

"ڈاکٹر صاحب کیا کیا آپ نے؟" اماں جان نے پوچھا۔

"بیگم صاحب بجلی کے تار سے علاج کیا ہے، شاید آرام ہو جائے گا، اگر حالت ایسی ہی رہے یا بیماری کچھ بڑھ جائے تو مجھے بلا لیجئے گا تاکہ پیٹ کو چیر کر زہر نکال لیا جائے" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے گلی سرین کی شیشی عنایت کی اور چلتے بنے۔ اس وقت بوا مبارک کی آہ و زاری سے گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے اور بیماری میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی ہے — اچھا بہن پھر کبھی!

تمہاری — ص۔

پھیکے میٹھے!

دہلی - ۳ مئی ۱۹۴۱ء

عزیز از جان ص!

تمہارا پیارا پیارا خط ملا — تعریف کرنے سے کیا حاصل، کچھ دلواؤ!

پرسوں سلمٰی کے ہاں دعوت تھی۔ چار بجے ہمارا قافلہ ڈولیوں میں سوار ہو کر پہونچا۔ چلتے وقت اماں نے مبارک کو ساتھ لے جانے کو کہا — بھلا میں لے جاتی، انا کو ساتھ لیا۔ ڈیوڑھی میں سلمٰی استقبال کو آئی اور مجھے "اری ص کی بچی" کہہ کر گود میں اٹھا لیا۔

"چھوڑ نہیں تو کاٹ کھاؤں گی گلے پر"

"نہیں چھوڑوں گی!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بڑا ارمان ہے" میں نے اس کے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

سلمٰی جھینپ گئی اور مجھے چھوڑ دیا۔ تم تو جانتی ہو سلمٰی کی اور میری کتنی گہری دوستی ہے بلکہ ایک دفعہ تو مس بوس پوچھ بیٹھیں کہ کیا تم دونوں بہنیں ہو۔ خیر اب ہم سب ہنستے ہوئے دعوت کے کمرے میں جا پہونچے۔

"اجی قبلہ من! یہ دعوت کس سلسلہ میں؟" میں نے سلمٰی سے پوچھا۔

کہنے لگی: "میری ہوائی بل کی تہنیتی ہے"

"لاحول ولا قوۃ تم بھی کیا بچکانی کام کرتی ہو — اوہو! استانی جی سے تو میں نے ٹیلیفون سے پوچھا کہ کس بات کی دعوت ہے تو جواب دیا کہ ایک اہم تقریب ہے تم مع استانی کے ضرور آنا — دیکھو تو کیسی چال چلی ہے، تمہیں معلوم ہو تھا میں ایسی فضولیات میں شریک نہیں ہوتی" میں ہنستی ہوئی بولی اور سلمٰی اپنے فریب کی کامیابی پر پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اب سلمٰی نے شربت کے گلاس پیش کئے، بیچ بیچ میں مختلف قسم کی باتیں اور مذاق ہوتے رہے۔ اس کے بعد سلمٰی لپک کر گئی اور پان کی تھالی لے آئی، سب کو پان دیا اور مجھے ایک بڑی توندوالی گلوری دی، سب لڑکیاں اس موٹی سی گلوری کو بھوکی نظر لگا رہی تھیں۔ میں گلوری ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی اور باتیں کر رہی تھی سلمٰی نے کئی بار کہا "بہن کھاؤ نا" میں نے جواب دیدیا "کھاتی ہوں!" اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ چند لڑکیوں نے منہ بنانا شروع کیا اور باہر بھاگیں — اور سلمٰی ہنسی سے بیتاب!

بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے پانوں میں مرچ، نمک اور خدا جانے کیا کیا بلا بتر ملا دیا تھا۔ میں نے اپنا پان منہ میں رکھنے

کیلئے بڑھایا تو وہ قہقہے مارنے لگی ـــــ بس تب نے جلدی سے وہ پان سلمٰی کے منہ میں رکھ دیا۔ اس طرح کہ سارا نمک مرچ اُس کی زبان پر لگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے پان میں سوائے مرچ اور نمک کے کچھ نہ تھا! اور منظر نگار والیاں خوش تھیں کہ وہ پان انھیں نہ ملا ورنہ طمع کی سزا اچھی طرح ملتی!۔

"بھئی یہ سلمٰی ان کی معشوقہ ہیں ان سے سفارش کرواؤ تو کام چلے" یہ شہر امت المغنی، صفیہ سے کہہ رہی تھی۔

"سلمٰی! کچھ مبارک وغیرہ کے نغمے بہن تم سے سنواؤ نا" صفیہ نے کہا۔

سلمٰی مسکراتی ہوئی بولی "ہاں کچھ سنا دے لطف آجائیگا"

"تسلے بی! پرسوں تم مرزا کلن، مرزا کلن کہہ رہی تھیں، یہ کس پانی کے مینڈک ہیں!" صفیہ نے سلمٰی سے پوچھا۔

"تسلے لو! تم نہیں جانتیں۔ زبردست نامی گرامی شکاری، منطقی، فلسفی، محدث، حافظ، فقیہہ، نفسیات داں اور سارے ال (جیسے اکالدان وغیرہ) ـــــ اور شاعر بھی ـــــ ہر فن میں طاق ـــــ کہدوں! . . . . اور . . . اور صفیہ کے مشتاق" ادھر سلمٰی نے جملہ پورا کیا اور اُدھر صفیہ کی گردن جھک گئی۔ اب جو قہقہے پڑنے شروع ہوئے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔

"دیکھو بھئی صفیہ اس طرح شرما رہی ہے جیسے آرسی مصحف ہو رہا ہو اب تم اس شبھ گھڑی کچھ ان کا تازہ کلام سنا ہی ڈالو" سلمٰی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں سب کو مخاطب کرتی ہوئی بولی "اب ایک تازہ غزل سنیئے جس کی ایران، عربستان، امریکہ، افریقہ وغیرہ وغیرہ سے تعریف آئی ہے۔ نانا کلن (یہ میرے نانا نہیں ہیں بلکہ ان کی سفیدی ایسا پکرواتی ہے) کہہ رہے تھے کہ کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں فارسی میں اس غزل کا نام "شاہنامہ" رکھا گیا ہے یعنی ساری غزلوں کی ملکہ! عربی میں اس کا نام الجنت الادب رکھا گیا۔ یعنی جو بھی اسے پڑھے وہ براہ راست جنت میں جائیگا! انگریزی میں اس کا نام 'ڈوائنا کومیڈیا۔ (Divine Commedy) رکھا گیا ہے یعنی الہامات سے بھری ہوئی کتاب!۔

سنا ہے آج کل اس غزل پر رسالوں میں مضامین نکل رہے ہیں

لو سنو بی صفیہ بہت بیتاب نظر آتی ہو!۔

اس سانولی صورت کا جب سے ہوا ہیں شیدائی
انگریز کا چہرہ بھی کالا نظر آتا ہے

لیلٰی کی نواسی کی دُھن میں ہیں جیئر غٹو
عاشق غم ہجراں میں پھنسا نظر آتا ہے

کھائی جو تھی کل کھچڑی، اب ہضم نہیں ہوتی
چاول کا اک اک دانہ بھالا نظر آتا ہے

شکر نہ چھوائے ہیں پھیکی ہی سویاں ہیں
شبرات کے حلوے میں میدا نظر آتا ہے

مقطع ارشاد فرماتے ہیں!۔

لوگوں کو نہ دے کچھ بھی خود ٹھونس لے اب کلن
اس میں تو مفاد اپنا پیدا نظر آتا ہے"

دسترخوان بچھ چکا تھا، ہم سب پہونچے۔ سلمٰی بولی "واقعی یہ غزل تو اردو شاعری میں اپنی طرز کی نئی ہے"

امت المغنی نے ہنستے ہوئے کہا "سلمٰی! اتنی شیریں غزل سننے کے بعد تو منہ پھر گیا۔ اب میں تمہارے ہاں کا میٹھا نہ کھاؤنگی"

صفیہ خاموش بیٹھی تھی ـــــ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک چمچہ میٹھا کا اٹھا کر چکھا اور بڑی افسردگی سے بولی!۔

"آہ پھیکے میٹھے!"

لڑکیوں نے کمرہ سر پر اٹھا لیا۔

"ان دونوں کی تعلیم کہانتک ہے" امت المغنی نے پوچھا۔

"مبارک نے شاید اردو کی دوسری یا تیسری ہی پر اپنے آپ کو فارغ التحصیل سمجھا اور نانا کلن کا ٹٹو چوتھی یا پانچویں سے آگے نہ بڑھا ـــــ مگر دونوں ہیں بڑے تیز!" میں نے جواب دیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ ہماری پیاری بلی کو بھی دیکھوگی یا نہیں" سلمٰی پوچھنے لگی۔

"لاحول ولاقوۃ پھر وہی بات"

"اچھا تو جیسے جناب ہماری پیاری پیاری بلی کو نہیں دیکھینگی" سلمٰی نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"حضور! میں نے بلیاں بہت دیکھی ہیں مجھے خواہش نہیں" میں ہاتھ جوڑ کر بولی۔

سلمٰی نے سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا "ہائے! کوئی اُمید بر نہیں آتی"

صفیہ کو موقع مل گیا کہنے لگی "گھبراتی کیوں ہو وہ دن بھی

آنے والا ہے کہ اُمیدواروں کے ہجوم میں ہم غریبوں کو بھی بھول جاؤگی!"
یہ کہکر صفیہ ہنسنے لگی اور سب نے اس کا ساتھ دیا۔ اتنے میں خالہ جان سلمیٰ کی والدہ آ گئیں۔

"خالہ جان! بہن سلمیٰ کی شادی کب ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ سلمیٰ یہ سنتے ہی ہوا ہوگئی اور پردہ کے پیچھے کھڑے ہوکر مجھے ٹھینگے دکھلانے لگی۔

"اے ابھی کہاں ہے بیٹی! اس سال میٹرک تو ہو جائے"۔ خالہ جان بولیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم واپس آ گئے ——— چلتے وقت سلمیٰ سے کہہ آئی "دیکھ ری خوب محنت کر پھر دیکھ وہ چاند سا بَر لا کر دوں کہ باچھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں"۔

ارے! اصلی چیز تو لکھنا بھول گئی ——— وہ یہ کہ نانا کلّن صاحب قبلہ مدظلہٗ کی شاعری یا ادب کی نازک گردن پر چھری کب سے شروع ہوئی۔ ایک دن تشریف لائے، میں بیٹھی موتیا کے پھولوں سے کھیل رہی تھی، ایک پھول اُٹھا کر سونگھا پھر کان کے جھمکے پر رکھ لیا۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا اور ہنس پڑی۔ کہنے لگے: "نھنی! کئی دن سے شعر کی فکر میں لگا ہوا تھا ——— بہت سوچ بچار کیا نہ سُوجھا! ـ آخر کل ہاتھ آ ہی گیا۔ سنو ؎

یہ کہتا کون ہے دُنیا میں ہم نکھٹو ہیں
زمینِ شعر پہ جو دوڑے ہم وہ ٹٹو ہیں"

میں مارے ہنسی کے بیتاب ہوگئی اور وہ ہمہ تن بہ مثل بنے ہوئے تھے 'ٹکٹک دیدم دم نہ کشیدم'
"یعنی!" بدقّت تمام ان کے منہ سے نکلا۔
"یعنی..... یعنی یہ شعر بہت اچھا ہے" میں نے جواب دیا۔
"بھئی بعض وقت گھنٹوں سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں ——— تم بتاؤ نھنی! کیا لکھنا چاہیئے"
"مشاہدات لکھا کیجیے" میں نے جواب دیا۔
"یعنی؟" منہ کو سوالیہ بناتے ہوئے بولے۔
"اُف! ——— یعنی یہ کہ جو کچھ نظر آئے، جو کچھ دیدوں سے سُجھائی دے ——— اور سمجھاؤں؟!"
"نہیں! نہیں! بس سمجھ گیا"
دوسرے دن تشریف لائے اور فرمایا "بھئی یہ شعر ہم اپنے دیوان کے سر پر یعنی پہلے صفحے پر لکھوائیں گے"

"کون سا شعر سنایئے!"
"بھئی واللہ سنوگی تو پھڑک جاؤگی"
"کیا شعر ہے سنایئے" میں بولی۔
"یہ شعر وہ ہے کہ لوگ برسوں سوچیں تو ایسا مضمون ہاتھ نہیں لگ سکتا اور بات یہ ہے کہ یہ لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور اس میں سے چرا لیتے ہیں ہمیں اللہ میاں نے خاص طور سے عطا فرمایا ہے"۔
"ایسا شعر ہے تو جلدی سنایئے"
"اور واللہ نھنی! پھڑک جاؤگی تم ——— یہ غالب والب داغ واغ کیا ہیں ——— ایسا اس شعر میں گُر ہے کہ سعدی صاحب سنیں تو گلستاں بوستاں بھول جائیں"
"تو پھر سنایئے تو سہی"
"اچھا! تو بھئی سنو" خوشی کی لہریں مرزا کلّن کے چہرے پر ناچ رہی ہیں۔
"ہوں! سنایئے"
"دیکھو بھئی نہایت عمدہ شعر ہے" (ذرا اکڑ کے اور آسمان کی طرف آنکھیں لگا کر شعر پڑھا۔)

مشاہدات جو لکھتا ہے ہم ہیں وہ انسان
مشاہدات نہ لکھے جو وہ بڑا حیوان

"حیوان ہیں آپ..... نے خوب کہا" میں ہنستی ہوئی بولی۔ اس کے کچھ عرصے بعد میری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے وہ غزل لکھی جو سلمیٰ کے ہاں سنائی تھی۔ بہن س! خط بہت طویل ہوگیا ہے اور مجھے نیند بھی آ رہی ہے ——— خدا حافظ!
تمہاری ——— ص۔

تھرتھریاں اور کپکپیاں

دہلی۔ ۱۱ مئی ۱۹۳۱ء

ڈارلنگ س!

تمہارا محبت نامہ ملا ——— آجکل ہمارے گھر کی فضا بہت پُر لطف ہو گئی ہے اور مجھے خط لکھنے کیلئے کافی مواد ملتا رہتا ہے۔ کل رات کو ایک مزیدار واقعہ گذرا۔ چار پانچ دن سے بوا مبارک چلہ کھینچ رہی ہیں۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف برآمدے سے آگے جو کوٹھریوں کا سلسلہ ہے، اس میں سے ایک کوٹھڑی خالی کروالی ہے جس میں سے چاندنی پر جانے

گیلے زینہ سے تین دن پہلے میں رات کے ٹھیک گیارہ بجے حمام کے دروازے پر سے چڑھ کر چھتوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کوٹھڑی والے زینے پر پہونچی۔ اُن کے وظیفہ وغیرہ پڑھنے کی بھنبھناہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ میں نے دو تین گرج کر "ہوں! ہوں!" کی آوازیں نکالیں۔ ۔بس آعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کی گردان شروع ہوئی۔ پھر میں نے زور سے "ہوں!" کا نعرہ لگایا ۔۔۔ "ہائے اللہ" اُن کے منہ سے نکلا اور مارے خوف کے چیخنا شروع کر دیا۔ لوگ دوڑے ہوئے آئے، میں جلدی سے چھپ گئی۔ پھر بوا مبارک کو باہر نکالا گیا اور میں چھتوں پر سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے میں پہونچ گئی۔ پھر بوا مبارک غصے میں آکر کہنے لگیں "میرا چلّہ غارت کروا دیا ۔۔۔ تم لوگ مجھے کیوں نکال کر لائے، اور چلّہ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے ۔۔۔ میں نے کوئی ڈر کے چیخیں تھوڑا ہی ماری تھیں بلکہ خدا کا جلوہ دیکھ کر مارے خوشی کے چلا اُٹھی تھی، جب حضرت موسیٰ بیہوش ہو گئے تھے تو اگر میں چلا اُٹھی تو کون تعجب کی بات ہے"۔ خیر سارا دن یہی یا اسی قسم کی باتیں بیان فرماتی رہیں۔ اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ نکالنے والوں کو اپنی خطا اور گناہگاری کا خیال ہوا اور ان کے سامنے توبہ کی کہ آئندہ سے اگر ہم آئیں تو جو چور، ڈاکو اور لٹیروں کی سزا وہ ہماری! چاہے آپ چیخ چیخ کر ساری دلّی ہی کو کیوں نہ جمع کر لیں۔

دو دن کا وقفہ دے کر کل رات ہماری پوری ٹولی پہونچی۔ ق کے منہ پر سیاہی مل کر میں نے اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور ایک بڑی سی چادر ق کو اُڑھائی جو میرے پاؤں تک آتی تھی۔ سب کو پیچھے رکھ کر میں دھم دھم کرتی ہوئی زینے پر سے اُترنے لگی مبارک نے قندیل کی روشنی تیز کر دی چادر میں سے ایک لمحہ کو میں بھی دیکھ رہی تھی ۔۔۔ شاید مئی کے مہینے میں مبارک سردی کی وجہ سے کانپ رہی تھیں ۔۔۔ اتنے میں جانماز پر پانی چمکتا دکھائی دیا اور مبارک کے کرتے کا دامن کچھ آب فشاں تھا شاید پسینہ ہو گا! ۔۔۔ ۔پھر میں نے اور ق نے ایک دم سے "ہوں!" کی زوردار آواز نکالی جس کا جواب اس نے ایک چیخ سے دیا۔ پھر سب بہنوں نے کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق ایک ساتھ کُھسر پُھسر شروع کی۔ ایک نے کہا "مار ڈالو اسے"۔ دوسری بولی "بوٹیاں کر ڈالو"۔ تیسری نے کہا "یہ مکاری دھوکہ دیتی ہے"۔

"نہ ۔ ۔ ۔ نہ نہیں کروں گی" مبارک کی کانپتی ہوئی آواز آئی اور وہ سرکش عورت ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہی تھی، اس کے بعد ہم نے زور سے "چُپ!" کہا تو اس نے قل اعوذ برب الناس اور سلامٌ قولاً من رب الرحیم کی گردان تیزی سے جاری کی ۔۔۔

"ہمیں بھگاتی ہے" کہہ کر میں ایک سیڑھی اوپر اتری۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں، اور گردن آگے کو جھک گئی ۔۔۔ پھر وہ جانماز پر گر گئی۔

اب ہم واپس ہوئے، ان لڑکیوں پر راز فاش ہونے کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ باوجود منع کرنے کے بھاگ رہی تھیں، چھت پر دھپا دھپ کی آواز سُنکر اماں جان کی جان آدھی ہو گئی، انہوں نے بھائی کو باہر نکل کر دیکھنے کو کہا۔ بھائی نے ہمیں دیکھا اور ہنستے چلے گئے اور اماں جان سے کہدیا "کچھ نہیں آپ کا وہم ہے شاید بلیاں ہوں گی"۔

آج صبح یہ خبر گشت لگا رہی تھی کہ بوا مبارک اب چلّہ نہیں کھینچیں گی اور یہ بھی سُنا ہے کہ کل رات کو مبارک نے پانچ پانچ جنوں کو تابع کیا ہے، وہ بھاگے جا رہے تھے مگر یہ پکڑ لائیں اور بھاگنے کی آوازوں کی سب نے تصدیق کی سوائے بھائی کے! نوبہار نے پوچھا "بوا غسل کیوں کر رہی ہو؟" تو جواب ملا "جنوں نے جیسے ہی مجھے دیکھا اُن کا مارے خوف کے پیشاب خطا ہو گیا، کچھ چھینٹیں میرے کپڑوں پر بھی پڑ گئیں"۔

لو بی س! اب رخصت، پھر کبھی لکھوں گی۔ ہاں! الف کو دُعا کہدینا۔ تمہاری بہن ۔ ص۔

دہلی۔ ۲۰ رمئی ۱۹۳۱ء

میری ملکہ س! تمہارا مزیدار خط ملا ۔۔۔ اتنا مزیدار کہ دیر تک ہونٹ چاٹتی رہی۔ جمعہ کو ہمارے ہاں قوالی تھی یا گانا تھا ۔۔۔ بڑے ہال میں باقاعدہ فرش فروش ہوا۔ بھائی کے دوست احباب اور ہمارے کئی بھائی جمع تھے، گانے والا حضرت مولانا روم کے اشعار گا رہا تھا۔ مرزا کلن صاحب بھی تشریف فرما تھے ۔۔۔ جب گانے والا اس شعر پر آیا ۔۔۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو یہ مشہور شعر اُس سے بار بار گوایا گیا ۔۔۔ "اللہ ہو!" کا نعرہ

سنتے ہی میں پردے میں سے جھانکی۔ دیکھا کہ مرزا کلن صاحب دو زانو بیٹھے ہوئے ہیں، ایک ہاتھ اوپر اٹھا ہوا ہے، آنکھیں بند ہیں اور گردن جھکی ہوئی ہے اور منہ سے باقاعدہ "اللہ ہو اللہ ہو" کی سامعہ خراشی نواز صدائیں نکل رہی ہیں ــــ مجھے کچھ ہلکے ہلکے قہقہے سنائی دئے اس کے بعد بھائی اندر آئے اور کہنے لگے "حق! ذرا سیفٹی پن دینا" میں نے دیدی۔ اور پھر پردے میں سے جھانکنے لگی۔ وہ شعر برابر گایا جا رہا تھا اور نانا کلن "اللہ ہو!" کے نعروں کے ساتھ فرش پر لوٹ رہے تھے، حاضرین کو بلا تکلف لاتیں رسید کرتے ہوئے بھائی کے قریب پہونچے ــــ "آہ!!" فوراً آنکھیں کھل گئیں، بھائی کو گھورنے لگے، پھر فوراً کھڑے ہو، ٹوپی لے تیز تیز قدم ڈالتے ہوئے زنانخانہ کی طرف چلے اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا ــــ!

"دیکھو بی، تمہارے لڑکے نے میری ران میں پن چبھوئی ہے" نانا کلن ہانپتے ہوئے اماں جان سے بولے۔

"نالائق ہے معاف کر دیجے ــــ میں ڈانٹوں گی" اماں جان نے جواب دیا۔

"بھئی واللہ یعنی کہ یہ بھی خوب، کل کلاں کو اس نے ٹینٹوے پر چھری پھیر دی تو بھی تم یہی کہو گی نالائق ہے معاف کر دیجے"

"اچھا تو اب آپ کیا چاہتے ہیں اس کا سر کاٹ کے آپکے قدموں میں ڈالدوں"۔

"کیا چاہتے ہیں!" کہہ کر بجلی کی طرح غائب ہو گئے۔ مجھے اس سنجیدہ بات پر ذرا بھی ہنسی نہ آئی صرف ذرا سا پیٹ میں درد ہو گیا۔ دوسرے دن میں نے پوچھا "نانا کلن وہ قوال کیا گا رہا تھا جو آپ کو حال آ گیا"

سوچنے لگے اور اس کے بعد کہا "ہاں ہاں یاد آ گیا دیکھو وہ گا رہا تھا آہا ہا کیا شعر ہے، اتنا غم بھرا ہوا ہے کہ خوب رونے کو جی چاہتا ہے ہاں تو وہ گا رہا تھا ؎

رو یا گئے ہم ایک صدی پھر بھی ملی نہ بد منی
سر پھوڑنے ہم کو ملا پتھر نہ روڑا، ٹھیکری"

"شاید یہ شعر نہ تھا نانا"

"نہیں! اگر یہ شعر نہ ہوتا تو مجھے حال ہی کیوں آتا"

لو بی سن لیا! سن رہی ہو انہیں اپنی بیہوشی کا بھی علم ہے، ٹھیک ہے بیہوشی کی دو قسمیں بھی تو ہیں ایک خود اختیاری اور دوسری بے اختیاری!

ہمارے نانا کلن کی بہادری کے قصے تو مشہور ہیں، وہ خود اپنے کارنامے سنایا کرتے ہیں ــــ سنا ہے جنگ عظیم میں بڑی بہادری سے لڑے اور کمال ہے بلکہ آفریں باد برین ہمت مردانہ نانا کلن کہ زندہ سلامت واپس آگئے ــــ ہاں! کہہ رہے تھے کہ ایک دفعہ گولیوں کی بارش میں واٹر پروف پہن کر چلے گئے اور جاکر مشین گن چلانے والے کی گردن پر سوار ہو گئے، وہ بے چارا مجبور ہو گیا اور یہ مشین گن چھین کر اسی میں بیٹھ گئے اور چلاتے ہوئے اپنی فوج میں آ گئے۔ میں نے نانا سے پوچھا "نانا مشین گن کیسی ہوتی ہے؟" کہنے لگے "موٹر جیسی ہوتی ہے" اور ایک قصہ سنایا کہ ایک دفعہ فوج کے افسر نے فائرنگ کا حکم دیا اور ان سے بھی کہا "مرزا صاحب آپ بھی بندوق چلائیے" نانا نے جواب دیا "لوگوں کا خون بہانا انسانیت کے خلاف ہے" افسر نے کہا "مرزا صاحب قبلہ آپ بزدل ہیں" نانا نے افسر کا کان پکڑ کر کہا "ابے بزدل ہوگا تو اور تیرا خاندان، لے سیدھا کھڑا ہو جا اور ہم تجھے تیرا خون بہا کر بتاتے ہیں" تب اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضرت مرزا صاحب قبلہ یعنی کہ واللہ آپ تو خفا ہی ہو گئے" پھر افسر نے حکم دیا "آج فائرنگ نہ کرو بندگانِ خدا کا خون ہوتا ہے" ایسے قصے اکثر نانا سناتے ہیں۔ اب حال کا دلچسپ واقعہ سن لو۔

"رات کے نو یا ساڑھے نو بجے تھے۔ مرزا کلن صاحب کچھ چیز لینے بڑے ہال میں گئے، بڑے ہال سے ملا ہوا ایک ہشت پہل کمرہ ہے جہاں صندوق وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ خیر تو جب یہ ہونچے تو کوئی کمرے کے اندر سے کواڑ پیٹ رہا تھا اور باہر سے کمرے کو قفل لگا ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا ــــ چیختے چلاتے بڑے ہال سے ملحقہ کمرے کی طرف بھاگے، میز سے ٹکرائے، ہاتھ کا گلدان پاش پاش ہو گیا۔ مگر یہ تیر کی طرح چلے جا رہے تھے۔ بدنصیبی سے اس کمرے کا دروازہ بند تھا ــــ انہیں اپنی بیکسی کا علم اسوقت ہوا جب کہ ناک دروازے سے ہم بغل ہو چکی! جب یقین ہو گیا کہ ادھر سے فرار نہیں ہو سکتے تو پھر چیختے چلاتے بڑے ہال میں واپس آئے اور دروازے سے نکل کر ترارے بھرنے لگے۔ جدھر سے گذرتے سوال ہوتا "ارے بھئی کیا ہے" مگر وہ خاموش اس نمائشی اور فانی دنیا سے منہ موڑے ہوئے بھاگے جا رہے تھے

یہاں تک کہ مکان کی آخری دیوار نے انہیں روکا۔ بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ ہشت پہل کمرے میں ایک بہت دبنگ اور گستاخ چور موجود ہے۔ اب کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بڑے ہال کے قریب بھی جائے۔

مرزا کلن کی کیفیت سنو ـــــ ہانپ رہے ہیں اور نئی سے نئی ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ کی بات کہہ رہے ہیں: "اس کم بخت کو ابھی دھڑ دھڑ کرنی تھی ـــــ میرے جانے کے بعد چاہے دروازہ ہی کیوں نہ توڑ ڈالتا"۔

"نانا آپ کو جنگِ عظیم میں ڈر نہ لگا اور اب آپ چھٹانک بھر کے چور سے تھر تھرائے جا رہے ہیں" میں بولی۔

"بیٹا جنگِ عظیم کی بات اور ہے چور کی بات اور ہے، چور جتنا خوفناک ہوتا ہے اتنی جنگ نہیں ہوتی" جواب ملا۔

خیر، بھائی اسی وقت باہر سے آتے تھے، چور کا قصہ معلوم ہوا تو بندوق ہاتھ میں لیکر نگاچی کے ساتھ اندر گئے۔ نگاچی سے قفل کھولنے کو کہا اور خود بندوق لیکر مستعد ہو گئے۔ قفل کھلا ـــــ پھر دروازہ کھلا! بھائی بندوق بغل میں دبا کر تیار ہو گئے ـــــ ایک سفید سی چیز ٹانگوں میں سے نکل کر بھاگی ـــ!

"ارے بلی!" بھائی کے فلک شگاف قہقہے سُنکر سب اندر پہونچے۔

دراصل یہ بلی روشندان میں سے اندر کودی اور پیچھے سے دروازے کو ہلا رہی تھی۔

تمہاری ـــــ ص۔

عرشِ تیموری

شوقِ شکستہ حال!

دُشوار تر ہے اب دلِ صد چاک پر رفو!
حاصل ہی کیا ہے چھیڑ سے اے جانِ آرزو!

گو ایک عمر آہ و فغاں میں گذر چلی — کچھ پا سکے کبھی مگر آہ و فغاں سے ہم!؟
یہ کشمکش بساطِ فنا ہی الٹ نہ دے — جنگ آزما ہیں شاطرِ روحِ جہاں سے ہم
شوقِ شکستہ حال کی گم کردہ راہیاں — دامن میں خار بھر کے چلے گلستاں سے ہم
دُنیا میں قحطِ نبض شناسی ہے جا بجا — لے درد لائیں ڈھونڈ کے درماں کہاں سے ہم
کیا چیز پھر علائقِ ہستی کی دل لُبھائے — خود اپنے ہی وجود سے ہیں سرگراں سے ہم
کوشش تری فریبِ مسرت فضول ہے — مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم
اُن کا گلہ ہے اور نہ شکایت کسی کی ہے — نالاں مگر ہیں ضابطۂ "کن فکاں" سے ہم
تپتا ہوا دماغ، جگر خون، رُوح زار — کس درجہ فیضیاب ہیں اس جسم و جاں سے ہم

اُس دل کو جو فشارِ حوادث سے مٹ چکا
بیگانہ اب بھی پاتے ہیں سود و زیاں سے ہم

زنگار

زندہ اور فطری زبان

چوتھی کسوٹی — رسمی (سرکاری یا دفتری) زبان (آفیشل لینگویج)

ہندوستانی زبان کی صورت ارتقاء، نشو و نما، بول چال، شہری (دیہات کی زبان) پر بحث کرتے ہوئے ہندی کے پرچارکوں نے طرح طرح کی تاویلیں اور دور از کار باتیں پیش کی ہیں مگر اس کا یہ حصہ جسے ہم رسمی یا سرکاری زبان کہتے ہیں ہر قسم کی تاویلات سے پاک ہے۔ اس زبان کو ناگری رسم الخط میں بھی کچھ دنوں سے لکھا جانا حامیانِ ہندی کے اصرار پر تسلیم کر لیا گیا ہے مگر زبان میں سرِ مو فرق نہیں ہوتا۔ اس کے نمونے اس قدر کثرت سے موجود ہیں کہ یہاں اس کا نمونہ پیش کرنا "آئینہ کو آرسی" کے عین مصداق ہے۔ یہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ اپنے کاروبار قطع نظر انگریزی کے اسی زبان میں چلاتا ہے۔ ہر قسم کے نقشے اور رجسٹروں کی پیشانی کی سرخیاں اسی زبان میں ہیں۔ سررشتوں نے مختلف موضوعات کے لئے تمام تر اصطلاحات، درجے اور کاموں کی تقسیم ظاہر کرنے والے الفاظ اسی زبان کے اجزا ہیں۔ ہمیں اس موقع پر تفصیلاً نہیں بلکہ اجمالی طور سے رسمی زبان کی شکل مختلف سرکاری اداروں کے کاغذات اور تحریروں کے ذریعے سمجھنا چاہیے۔

محکمہ تعلیم۔ سب سے اول میں محکمہ تعلیم کو لیتا ہوں۔ وہ جگہ جہاں دیہات اور شہر کے لڑکے دیسی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے ہیں مدرسہ کہلاتی ہے البتہ تھوڑے دنوں سے اس کیلئے "اسکول" اور اس کے بعد "پاٹھ شالہ" کہنا شروع کیا گیا اور شاید اب اسکا نام "ودیا مندر" ہونیوالا ہے۔ مگر ان تمام ناموں کا اگر مقابلہ کیا جائے تو "مدرسہ" سے زیادہ کوئی کھٹائی نہیں۔ پاٹھ شالہ ایک حد تک مدرسہ کے معنی پر اشارہ کرتا ہے مگر وہ ہماری توجہ کو سنسکرت کے پاٹھ شالوں کی طرف لے جاتا ہے۔

مدرسہ کے ہر ہر پہلو پر اس رسمی زبان کے الفاظ چھائے ہوتے ہیں قلم، دوات، کتاب، کاغذ، بستہ، دفتہ[۱] (وہ جگہ جہاں پر لڑکا بیٹھتا ہے) درجہ، جماعت، جماعت بندی، تعطیل فہرست، معائنہ، افسر معائنہ، امتحان ترقی، پاس، قطعی پاس، قبل، نتیجہ سزا، جرمانہ، فیس، فیس داخلہ، فیس بار داخلہ، فیس بقایا، فیس ماہ حال، حاضری، غیر حاضری، اوسط، فیصدی۔ غرض اسی قسم کے بے شمار الفاظ ہیں جو نہ صرف اردو رسم الخط میں بولے جاتے ہیں بلکہ ہندی ناگری حرفوں میں بھی بجنسہٖ نقل کئے جاتے ہیں۔ مدرسہ کا ہر رکن ان الفاظ کو بلا کسی قسم کے ترجمے یا تبدیلی کے تحریر و تقریر میں اپنے زبان و قلم سے ادا کرتا ہے عام اس سے کہ وہ ہندی خواں ہو یا اردو خواں، ہندی ٹیچر ہو یا اردو ٹیچر۔

اب اسکول کے مختصر سے دفتر کو بھی دیکھ لیجئے۔ یہ رجسٹر حاضری ہے جس پر سب سے اوپر لکھا ہوا ہے:-

رجسٹر حاضری بابت... لغایت.. تاریخ و سنہ فلاں۔

رجسٹر کے چند خانوں پر اردو، ہندی دونوں رسم الخط میں لکھے ہوئے شناختی بھی پڑھ لیجئے:-

خانہ نمبر ۱۔ رجسٹر نمبر داخل خارج۔ خانہ نمبر ۲ نمبر سلسلہ وار۔ خانہ نمبر ۳ نام طالب علم۔ خانہ نمبر ۴ تا ۳۵ تاریخیں۔ خانہ نمبر ۳۶ تعداد ایام حاضری۔ اور اسی طرح تمام خانے ضرورت کے مطابق عام فہم مقررہ آفیشل لفظوں سے پر ہیں۔ ضرورت کے عین مناسب تمام الفاظ و سرخیاں ہیں۔ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں ہے کہ یہ لفظ فارس سے آیا ہے اس لئے خارج اور یہ انگلینڈ سے آیا ہے اس لئے داخل۔

دوسرے رجسٹروں کا بھی یہی حال ہے۔ ذرا آگے ہاتھ بڑھا کر سررشتہ سے آئے ہوئے چند احکامات پر بھی اچٹتی ہوئی نظر ڈال لیجئے۔ یہ ایک کارڈ ہے یہ مدرسہ مڈل تک ہے اور اپنے آس پاس کے تمام اسکولوں کا مرکز۔ اس پر لکھا ہوا ہے:-

بحکم جناب ڈپٹی انسپکٹر صاحب پرائمری مدارس ضلع...

بنام افسر مدرس مڈل اسکول...

ماتحت مدرسین کو فوراً اطلاع دی جائے کہ ٹورنامنٹ بہ سبب عارضہ طاعون ملتوی کر دیا گیا۔ دوسری تاریخ کی اطلاع آئندہ دی جائیگی۔

---

[۱] ہندی پڑھنے والے طلبہ بھی میری طرح اپنے تعلیمی زمانہ میں منشی جی سے نالش کرتے تھے کہ فلاں لڑکا میرے دفتہ پر بیٹھ گیا ہے۔

سالانہ اور ماہانہ نقشے بھی اسی زبان کا نمونہ پیش کرتے ہیں جس میں کارروائی اور خط و کتابت ہوتی ہے ایک ماہانہ اور ایک سالانہ نقشہ کا نمونہ ذیل میں دینا مناسب سمجھتا ہوں

(خط ہندی اور اُردو)

نقشہ اوسط حاضری و فیس بابت ماہ فلاں مدرسہ فلاں تحصیل فلاں ضلع فلاں۔

تعداد طلبا مندرجہ رجسٹر۔ اوسط حاضری روزانہ۔ تعداد معاف شدگاں۔ تعداد اُن طلبا کی جو آدھی فیس ادا کرتے ہیں۔ تعداد خارج شدگاں۔ فیس واجب الادا۔ رقم وصول شدہ۔ وغیرہ۔

نقشہ لیاقت مدرسین

(یہ نقشہ بھی دونوں رسم الخط میں الگ الگ چھپتا ہے۔)

نمبر شمار۔ نام مدرسین۔ تاریخ تعیناتی۔ تاریخ تقرری مدرسہ ہذا۔ تفصیل اسناد قابلیت مع ڈویژن سنہ کامیابی۔ جماعت زیر تعلیم۔ کیفیت۔

دفتری زبان کی یکرنگی اس بات پر اشارہ کرتی ہے کہ پہلے مضامین مختلف کے اظہار مطالب و اصطلاحات کے لئے ایک ہی طرح کے الفاظ آتے تھے اور ہندی طلبا بھی وہی لفظ استعمال کرتے تھے جو اردو خواں طلبا۔ مثلاً سوالِ اس کو تین صحیح تین بٹے چار تمام لڑکے پڑھتے ہیں۔ لفظ "صحیح" ہندی خواں اور اردو خواں ہر دو قسم کے طلبا کے لئے عام ہے۔ اسی طرح املا اور خوشخطی کی اصطلاحیں بھی مشترک حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب کچھ ذہنیتیں بدل چکی ہیں اب حامیانِ ہندی اپنے پہلے اعلان پر قانع نہیں کہ اردو ہندی میں صرف رسم خط کا فرق ہے[1] "املا" کے بدلے "آلیکھ" خوشخطی کے بدلے "سولیکھ" صحیح کے بدلے "پورناک" کیا جا رہا ہے۔ اسلئے اندیشہ ہے کہ یہ مرض کہیں متعدی شکل اختیار کرکے رسمی زبان میں بھی نفاق کی آگ نہ سلگائے۔

محکمہ پولیس:۔ پولیس کی تمام کارروائی جس زبان میں لکھی جاتی ہے وہ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ چوکیدار، سپاہی، محرر (خواندہ کانسٹبل۔) دیوان (ہیڈ کانسٹبل) داروغہ (سب انسپکٹر) ہی اس زبان کی اتباع نہیں کرتے بلکہ ان الفاظ اور تحریروں کے بیشتر حصہ سے عوام بھی واقف ہیں۔ چوکیدار جو تقریباً ان پڑھ اور جاہل ہوتا ہے وہ سب انسپکٹر صاحب کی دفتری کارروائی اگر اسے سنائی جائے تو بخوبی سمجھ لیگا۔ نقب زنی، آتشزدگی، زنا بالجبر، تحقیقات موقع، مقام وقوعہ، موقع واردات، بلوہ، فوجداری، اشتعالک، جرم، سنگین جرم، حراست، حوالات، تفتیش، مداخلت، اور اسی قسم کے بے اندازہ الفاظ جو نہ صرف محکمہ پولیس کی تحریروں اور رپورٹوں میں مستعمل ہیں بلکہ دیہات اور عدالت سے گوناگوں تعلقات کی بنا پر عام ہو چکے ہیں۔ چوکیدار کا رجسٹر موت اور پیدائش دیہات ہی کو مدنظر رکھکر مرتب کیا گیا ہے جس کی پیشانی کے خانے حسب ذیل ہیں:۔

(ولادت:۔) نمبر شمار۔ تاریخ پیدائش۔ باپ یا گھرانے کا نام۔ لڑکا یا لڑکی۔ زندہ یا مُردہ۔ تاریخ مع دستخط محرر تھانہ۔

(موت:۔) نمبر شمار۔ تاریخ وفات، نام متوفی۔ عمر۔ بیماری۔ وارث۔ تاریخ دستخط محرر تھانہ۔

یہ رجسٹر ہندی اُردو دونوں رسم خط میں ہوتا ہے۔ الفاظ مقررہ میں رسم خط کے سوائے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اب خانے کے اس کاغذ کو ملاحظہ فرمائیے جس پر عوام کی جانب سے کی گئی اطلاعات درج کی جاتی ہیں جس کا نام عرف عام میں رپٹ یا رپورٹ ہے۔

نمونہ زبان رپورٹ فرد بھی اطلاع اوّل

تاریخ اور وقت وقوعہ، تاریخ اور وقت مرجوعہ۔ نام اطلاع کنندہ۔ نام ملزم مع سکونت۔ جرم و دفعہ۔ گواہان۔ خلاصہ بیان۔ دستخط رپورٹ تحریر کنندہ۔ دستخط اطلاع کنندہ۔

یہ فارم اُردو رسم خط میں ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی وہی باتیں درج ہوتی ہیں۔

یہی حال پولیس کے تمام رجسٹروں اور نقشوں کا ہے۔ صرف چند ہی کاغذ ایسے ہیں جو صرف انگریزی میں بھرے جاتے ہیں اور جنکی پیشانیاں بھی انگریزی میں ہیں۔

الفاظ کی متذکرہ بالا مثالوں سے زبان کی صورت سامنے آچکی ہے مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب انسپکٹر کی تحقیقاتی رپورٹ کا نمونہ بھی پیش کیا جائے۔ اس قسم کی رپورٹیں اکثر پولیس کے دفتری مقدمات مال یا فوجداری کی مثلوں میں داخل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ رپورٹ ایک مقدمہ میں مثل کے معائنہ کے وقت میری نظر سے گذری یادداشت کے سہارے اس عبارت کو میں نیچے لکھتا ہوں۔

[1] ہندی ساہتیہ سمیلن نے ۲۳ء میں مضامین حاصل کرنے کیلئے انعامی اعلان شائع کیا تھا۔ مگر اب تو وہ رات گئی وہ بات گئی۔

آج بتاریخ ۔ مئی ۱۹۳۲ء مسماۃ مصرن بی بی و رابعہ بی بی کی درخواست کی بنا پر جو جناب کلکٹر صاحب بہادر ضلع گورکھپور کی خدمت میں بھیجی گئی تھی میں نے حسب ذیل گواہان کے روبرو معاملے کی تحقیق کی مسمی فضل حسین جو مسماۃ رابعہ بی بی کے شوہر ہیں اور اب طلاق دیکر عرصہ ۱۰ سال سے علیحدہ رہے واپس آئے ہوئے ہیں۔ اس عرصہ میں مسماۃ رابعہ بی بی تمام اراضیات پر قابض و دخیل رہیں جن کے ایک ثلث کے مالک مسمی فضل حسین ہیں مسماۃ رابعہ بی بی اپنی ماں مصرن بی بی کے شریک کار رہیں اور ماں بیٹی ایک ہی مکان میں رہتی ہیں فضل حسین ایک دوسرے مکان میں رہتے ہیں جو حال ہی میں پرانی دیواروں پر چھپر رکھکر بنایا گیا ہے۔ جو مسماۃ رابعہ بی بی و مصرن بی بی کے مکان سے شمال کی جانب ہے۔ مسماۃ بیان کرتی ہیں کہ فضل حسین نے اس سے پیشتر مقدمات فوجداری دیوانی میں عرصہ تک ہم لوگوں کو پریشان کیا۔ زمینداری جو اپنے نام سے کرالیا تھا بیچ ڈالی دیوالیہ بھی بن گیا۔ کاشتکاری موضع منگل پور اپنا حصہ بیع مہر دین میں لکھ چکا ہے۔ جس پر میں عرصہ سے قابض و دخیل ہوں اب ہمیں پردہ نشین عورت اور کمزور سمجھ کر اپنے ہمراہ چند بد معاشوں کو لیکر ہماری فصل کٹوانا چاہتا ہے جس کو نہ اس نے بوایا ہے اور نہ آراضیات کا اب حقدار ہے۔ فضل حسین نے بیان کیا کہ میں شیخ کریم بخش متوفی کا بھتیجا ہوں اور میرے باپ رحیم بخش کو یہ جائداد ایک ثلث حصہ ترکے میں ملی۔ میں نے مہر دین کے عوض جو ہبہ نامہ لکھا وہ کالعدم ہو چکا۔ میں نے ۲۰ بکڑ ۱۴ ڈکلی بورڈ کے کھیت واقع موضع منگل پور چلوا نال میں بٹھلا لیا ہے جس کا کاٹنا میرا جائز حق ہے۔ مسماۃ کے لڑکے محمد حسین نے اس کی فوراً تردید پیش کی اور اس کے بیان کی تائید موقع پر موجود مجمع نے بھی کی۔

میری رائے میں کاشت بورد کی کٹائی میں نقص امن ہونا یقینی معلوم ہوتا ہے اس لئے حسب دفعہ ۱۰۷ میں فریقین سے ضمانت مچلکہ لینے کو ضروری خیال کرتا ہوں۔

دستخط سب انسپکٹر پولیس۔

محکمہ مال:۔ اب مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر محکمۂ مال کی وہ تحریریں بھی دیکھ لیجئے جن کا تعلق ہندوستانی زبان سے ہے اس محکمہ کی ابتدا پٹواری سے ہوتی ہے پھر حلقہ قانون گو، نائب تحصیلدار، ریکارڈ افسر، رجسٹرار قانون گو، تحصیلدار حاکم پرگنہ کلکٹر، کمشنر، اور پھر بورڈ آف ریونیو پر ختم ہوتا ہے۔ پٹواری کے رجسٹر بعض جگہ اُردو رسم خط میں بعض جگہ ہندی رسم خط میں ہیں مگر جیسا کہ محکمہ تعلیم اور محکمہ پولیس کے رجسٹروں میں زبان کا کوئی فرق نظر نہیں آتا یہاں بھی وہی ہے روزنامچہ، کھتونی، خسرہ، جمعبندی، ہر ایک کی پیشانیاں زبان حال سے نہیں بلکہ اپنے تحریری نشانات، پٹواری کے قلم سے اُردو کا مالا جپ رہی ہیں۔ کہیں پر "نام کاشتکار مع ولدیت وسکونت" کا لفظ درج ہے کہیں "نوعیت کاشت" کہیں موروثی، کہیں شکمی، کہیں ضمن ۲ یا کہیں ضمن ۷۔

کاغذات کے نام بھی زبان کا حُلیہ بتاتے ہیں۔ انتخاب، نقشہ، جلد بندوبست، پٹہ، قبولیت، رہن نامہ، بیع نامہ، یہ الفاظ ہندی کے جدید تراشیدہ الفاظ کی طرح نہیں ہیں جن کو دیہات کے لوگ نہ جانتے ہوں۔ ہر کاشتکار "رقبہ" سمجھتا ہے مگر اس کا بدل ہندی چھیتر پھل وہ قطعی نہیں سمجھتا۔ اسی طرح وارث، موروثی، شکمی، دخیلکاری، زمینداری، مالگزاری اور اسی قسم کے ہزاروں الفاظ ہیں جو محکمۂ مال کے رسمی زبان کی بہت بڑی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

عدالت مال و عدالت دیوانی۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں کچہریوں کی زبان اُردو ہے یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ پبلک کی سہولت کا سوال اُٹھا کر یہاں بھی زبان کا جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش ہو چکی تھی مگر خیریت یہ ہوئی کہ یہ مسئلہ ایک حد تک رسم خط تک آ کر رک گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ باقاعدہ عدالتوں کا قیام اسلامی عہد کی یادگار ہے اس لئے جو چیز نئی ہوگی اپنا نام خواہ مخواہ اپنے ساتھ بنا لائیگی۔ اسلئے کچہری کی ضرورت کے مطابق اسی طرح تمام تر فارسی کے مروج ہندوستانی لفظ رکھے گئے جیسے آج ریلوے میں ہم انگریزی کے تمام لفظوں کو دیکھ رہے ہیں جس طرح ریل، اسٹیشن، ٹکٹ، سگنل، پوسٹ مین کے استعمال کو ہم جائز سمجھتے ہیں اور نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ اُن کے بدلے دیسی الفاظ کے چلانے کو حماقت پر محمول کریں گے بالکل یہی حال عدالتوں کے قیام پر فارسی اسما و اصطلاحات وطریقات کا ہوا یہی سبب ہے کہ مدعی، مدعا علیہ، گواہ، ثبوت، وکیل، مختار، عرضی دعویٰ، تنقیح، بحث، فیصلہ، حق، حق وراثت، ثبوت، نظیر، اور اسی قسم کے بے حد و بے اندازہ الفاظ ہندوستانی کے جز ہیں۔ یہ الفاظ اپنے موقع پر آتے ہیں اور چونکہ معنی مقررہ کے لئے وہ مخصوص ہیں اس لئے کوئی اُسے نکال کر دوسرا لفظ وہاں جڑنا ہندوستانی زبان کو بے مایہ کرنا ہے۔ دُنیا کی تمام زبانوں میں الفاظ کا لین دین ضرورت کی بنا پر ہوتا ہے اور پھر مروج ہونے کے بعد وہ لفظ اُس زبان کا ہو جاتا ہے نہ کہ استعمال (تحریر و تقریر) میں صدیوں تک آتے رہنے کے بعد سودیشی اور بدیشی

کافارمولا نکالا اور کہہ دیا کہ زبان کے سرمائے سے فلاں فلاں وفلاں اور فلاں نقطۂ خارج۔ زبان نہ اس طرح بنانے سے بنتی ہے اور مٹانے سے مٹتی ہے۔ اور نہ اپنے الفاظ نکال لینے سے نکلتے ہیں۔ ہمیں زبان کے اس مسلمہ صداقت کو کبھی بھی پس پشت نہ ڈالنا چاہیئے کہ:۔

"زبانیں اس طرح ارادہ کرنے سے نہیں بنائی جاتیں
زندگی کی ضروریات سے انکی ساخت میں تبدیلی پیدا
ہوتی ہے، سیاسی فتوحات، تجارتی تعلقات، ادبی
اور علمی ضرورت سے زبان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور
اس میں الفاظ داخل ہوتے ہیں"

زبان کے بارے میں ذاتی تعصب اور خارجی اثر سے جو لوگ پاک ہیں وہ تقریر اور تحریر میں ہندوستانی کی مہذب ترین شکل اُردو کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مسٹر بارول ناظم تعلیمات اور نگارساں ڈی ٹاسی کی متفقہ رائے ہے کہ "بحیثیت دفتری زبان کے اور بحیثیت معاشرتی ضروریات کے اُردو کو ہندی پر فضیلت ہے" بڑے بڑے درباروں میں جہاں دور و نزدیک کے لوگ شریک ہوتے ہیں فی مدانہ حیثیت سے جب کوئی اعلیٰ افسر یا منتظم تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ سرکاری زبان کا سہارا لیتے ہوئے اُردو کی ہمہ گیری کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک نہیں ہزاروں اسناد موجود ہیں کہ فلاں جگہ دربار ہوا اور فلاں راجہ یا مہاراجہ یا کسی بڑے انگریز افسر نے ہندوستانی میں تقریر کی یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ رسمی یا سرکاری زبان کی حیثیت ہندوستان میں صرف اُردو رکھتی ہے۔ کوئی ہندوستانی جب ہندوستان سے باہر جاتا ہے اور ممالک غیر کے ایسے باشندوں سے ملتا ہے جو ہندوستان میں کسی واسطے سے رہ چکے ہیں تو انہیں خالص اُردو میں گفتگو کرتے ہوئے پاتا ہے اور وہ خود جواب میں اُردو زبان استعمال کرتا ہے۔

چنانچہ ٹائمس انڈیا اپنی ۱۴، جنوری [illegible]ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ مسٹر لوتھین نے جو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہونیوالے ہیں انگلستان میں ایسٹ انڈیا کے مقیم سینکڑوں سکھوں، ہندو اور مسلمانوں کے سامنے مشرق اور مغرب کے فرق پر سیدھی سادی تقریر اُردو زبان میں کی۔

چراغ علی

درسِ خاموش

ہو کا عالم، شب کا سناٹا ہے جنگل ہیں خموش　　ابر ساکت، برق محوِ خواب، بادل ہیں خموش
ذرہ ذرہ عالمِ ایجاد کا خاموش ہے　　بے زبانی میں زبانِ راز کا سا جوش ہے
آسماں خاموش ہے، ساری زمیں خاموش ہے　　ہر مکاں خاموش ہے، ہر اک مکیں خاموش ہے
گفتگو کے سارے پہلو سب اشارے ہیں خموش　　آسماں کے دیکھنے والے ستارے ہیں خموش
نغمۂ ہستی کی فرحت ساری تانیں ہیں خموش　　سچ تو یہ ہے بولنے والی زبانیں ہیں خموش
ذرہ ذرہ شہرِ خاموشاں کا یوں خاموش ہے　　جیسے دریائے خموشی میں غضب کا جوش ہے
ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں میں کیسی شانیں ہیں نہاں　　بے زبانی میں بھی کتنی داستانیں ہیں نہاں
ایک اک خشتِ کہن سال ایک صحرائے خموش　　ایک اک قبرِ شکستہ، ایک دنیائے خموش

دیکھ لی دنیا میں دنیا کی تباہی دیکھ لی
یعنی فرحتؔ نیستی کی بے پناہی دیکھ لی

فرحت کانپوری

ایک مقرر کی تقریر

خواتین وحضرات،

آج کا دن ہمارے لئے باعث صد افتخار و مسرت ہے کہ حضرت مولانا صاحب جیسا ہزاروں میں لاجواب اور چھوٹا ہوا فرد ہمارے ہاں جلوہ فرما ہے۔

آپ کی ذات ستودہ صفات ہر قسم کی تعریف وتعارف سے بے نیاز ہے، اور آپکی شخصیت بقدر واضح ہے کہ یہ معلوم کرنا دشوار ہی کہ آپ کو کوئی جانتا بھی ہے یا نہیں۔

آپ کا کام ہمیشہ سے خدمت خلق اللہ رہا ہے اس سلئے آپ کبھی ایک جگہ نہیں ٹکتے۔ اور جہاں اور جس کے پاس جاتے ہیں ایسی خوش اخلاقی اور سعادتمندی سے رہتے ہیں کہ ہر شخص آپکو اپنا سمجھنے لگتا ہے، اس لئے یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ آپ دراصل کس کے ہیں اور کہاں کے ہیں۔

آپ کی ہر دلعزیزی مثل مادر وطن کے ہے، لیکن چونکہ وقت بہت کم ہے اور مجھے کچھ کہنا نہیں ہی اس لئے میں اب آپسے درخواست کرتا ہوں کہ حسب وعدہ ہماری جامعہ سے خطاب فرمائیں اور اپنے عالمانہ خیالات سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیں۔

معزز جامعہ، حضرات اور خواتین،

معاف فرمائیں، میں ایک سیدھے اور سچّے اصول کا آدمی ہوں اس لئے میں نے خواتین وحضرات کہنا کبھی پسند نہیں کیا۔ میں ایک مشرقی آدمی ہوں اور ہمیشہ ان ہی اصول کو پیش نظر رکھنا میرا خاصہ رہا ہے۔ جو لوگ مغربیوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مشرق ومغرب میں بالکل تضاد ہے۔ اس لئے ہم چاند کو مذکر کہتے ہیں اور وہ مونث، ہمیں عبادت کے وقت ٹوپی کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں جوتوں کی۔ ہمارے ہاں عورتوں کو بائیں طرف رکھتے ہیں اور ان کے ہاں سیدھی طرف، یہاں مردوں کو برتری دیجاتی ہے اور وہاں عورتوں کو۔ غرض ایسی ہی کئی باتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں عقل نہیں ہے، اس لئے اگر وہ خواتین وحضرات کہتے ہیں تو لازم ہوا کہ ہم حضرات وخواتین کہیں، چنانچہ حضرت والد مرحوم بھی یہی فرمایا کرتے تھے

نیز، تو حضرات وخواتین کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب میں نے دنیا کے مختلف مکامات مقدسہ وغیر مقدسہ کی سیر کرکے حیدرآباد کا خیال کیا تو ڈر تھا کہ مجھ جیسا شخص وہاں جاکر کیا کرے گا، مگر خوشی کی بات ہے کہ یہاں کے کئی علما اور امرا نے خاکسار کو بہت مکدّر کی نگاہ سے دیکھا اور بہت جلد یہاں میرا الو سیدھا ہوگیا۔ یعنی ان حضرات کی حوصلہ افزائی سے میری ہمت اور بندھی، اور میں نے کوشش شروع کردی کہ یہاں کے ہم وطن بھائیوں کو بھی پھر راہ راست پر لاؤں۔ چنانچہ ایک دن کا عرصہ ہوا جب آپکے پرو وائس چانسلر صاحب میرے ہاں حاضر ہوتے تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ ضرور کوئی نہ کوئی غرض لیکر آئے ہیں، اور ہوا بھی یہی۔ آپنے مجھسے درخواست کی کہ تشریف لاکر اپنی معلومات سے آپ کو کچھ مستفید کروں۔ میں نے فوراً دعوت قبول کرلی۔ چنانچہ آج حاضر ہوا ہوں اور اگر آپ اجازت دیں تو کچھ دیر سمع خراشی بھی کرونگا۔ اُمید ہی کہ اسکے بعد اٹ ہوم بھی ہوگا۔

حضرات، آج کا میرا عنوان نہایت اسم بامسمیٰ یعنی "نوجوانوں سے خطاب" ہے۔ یہ ایک اچھا عنوان ہے، اور آج کل کی معاشی پستی اور ملکی زوال کو دیکھکر جی یہی چاہتا ہے کہ بار بار اسی پر کہے جاؤں اور نوجوانوں کی رگِ حمیت کو وہ نشتر چبھوؤں کہ ان کا خون مثل بندر کے اُچھلنے لگے۔ ارادہ تھا کہ آج بھی گھنٹوں بولوں، مگر افسوس کہ حیدرآباد خط استوا پر ہے اور بعض ناگزیر اسباب کے سبب میں بالکل تیاری نہیں کرسکا۔ اس کے علاوہ گھر میں سودا وغیرہ بھی نہیں لایا، اس لئے پہلے کچھ سنیما اور پتنگ بازی پر بولوں گا، اس کے بعد نوجوانوں کو لوں گا۔ لیکن کچھ کہنے سے پیشتر سامعین سے گزارش ہے کہ براہ کرم دوران تقریر میں کوئی صاحب گفتگو یا شور نہ کریں، اس سے دوسرے لوگوں کا حرج ہوتا ہے، اور نہ بیڑی سگریٹ وغیرہ جلاکر اسٹیج کی طرف پھینکیں، ورنہ آگ لگ کر کپڑے وغیرہ جل جانے کا اندیشہ ہے۔

نوجوان طالب علمو! میرا آج کا مضمون جیسا کہ میں نے کہدیا ہے،

بہت اہم ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ میں کیا ہوں، اور میری معلومات کیا آپ لوگوں کے سامنے گویا میری حیثیت بالکل ایک گدھے کی سی ہے، پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ آپ کے سامنے کچھ اپنا بے سرا راگ الاپوں، تاکہ آپ لوگوں کے جذبات میں ایک طوفانِ عظیم بپا ہو، آپ خوابِ غفلت سے جاگ اٹھیں اور اپنی پوری مردمی کو کام میں لا کر کچھ نہ کچھ کر دکھائیں۔

حضرات، آج کل ملک میں جو پستی طاری ہے اس سے بچہ بچہ واقف ہے، پھر میں کیا عرض کروں۔ سالہا سال سے بارش نہیں ہو رہی ہے، اس لئے ہندو مسلمانوں کا فساد دن بدن زور پکڑتا جا رہا ہے، کیونکہ ان کی اخلاقی حالت اس قدر گر گئی ہے کہ پانی نہ ہونے کے سبب یہ مینڈکوں کی طرح شور کرنے لگے ہیں اور دعویٰ اس بات کا ہے کہ انسانِ کامل بن گئے اور بہت کچھ ترقی حاصل کر لی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جب میں نے الہ آباد گیا تھا تو جو ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑا، اس سے کون واقف نہیں۔ وہ تو خدا کی خوبی تھی کہ فوراً موقعۂ واردات پر آتش فرو انجن لا کر ہنگامہ کو فرو کر دیا گیا، ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔

اس کے علاوہ ملک میں تعلیم اتنی عام ہو گئی ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب عالموں کو گننا پڑتا تھا، اور اب جاہلوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ماشاءاللہ ملک کے لئے یہ ایک اچھا شگون ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کے سبب سے افلاس بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ اس قدر نازک مزاج ہو گئے ہیں کہ سخت کام وہ کر نہیں سکتے، اور نازک ملازمتیں انہیں ملتی نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سینما کو آج کل جو عروج حاصل ہو رہا ہے وہ دنیا میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ سینما بینی ایک مفید شے ہے مگر تنگیِ معاش کے سبب جب یہاں کھانے کو نہیں ملتا تو سینما دیکھنا انتہا درجے کا اسراف اور رذالت ہو گی، پھر اس میں جو مخربِ اخلاق باتیں مثلاً بوسہ و بغلگیری وغیرہ بتائی جاتی ہیں اس سے جامعہ کے لڑکوں کے خیالات پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ اور یہی مخربِ اخلاق کا باعث بنتے ہیں۔

سینما کے دکھاوے پر پیسہ بھی بہت اٹھتا ہے۔ لاکھوں روپیہ میں تو تماشہ تیار کیا جاتا، اور گھر کو خوشنما بنانے کے لئے بھی بہت سا رنگ وغیرہ لگانا، اور پردہ اسکرین کو بنانا، کچھ کم صرفہ کا کام نہیں، اسکے علاوہ "سوڈا، لیمن، چار گرم" کی تواضع پر جو خرچ ہوتا ہے اس کا تو حساب ہی نہیں، اس لئے یا تو ان کو مقروض ہونا پڑتا ہے یا چوری کرنا۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ، بہرحال، سینما بہت مفید ہے۔

بعض دفعہ اس میں پتنگ بازی کے سین بھی دکھلائے جاتے ہیں۔ پتنگ کاغذ سے بنتا ہے، بعض پتنگ گول ہوتے ہیں، بعض تکونی، اور عموماً چوکور، شش پہلو، اور ہشت پہلو پتنگ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اب سرکاری ممانعت کے سبب اس کا رواج کم ہو گیا ہے۔ بعض پتنگ اڑتے وقت تاگہ بہت ڈھیلا ہو جاتا ہے، اس کو پیٹھا کہتے ہیں۔ نوجوانوں کو اس میں کبھی نہ پھنسنا چاہیے۔

سینما بینی سے آنکھوں کو جو نقصان پہونچتا ہے، وہ پتنگ کو اڑتے دیکھنے سے فائدہ میں بدل جاتا ہے۔ اس لئے کمپنیوں کو اس امر کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ ہر فلم میں پتنگ اڑانے کا سین بھی رکھیں، اس سے آنکھوں کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے، اگر ایک آنکھ سے پتنگ دیکھیں اور دوسری آنکھ سے فلم۔

لوگوں کا خیال ہے کہ سینما دیکھنے سے طالب علموں کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ اس سے ان کو بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں فلموں کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جن لڑکوں کو رات میں پڑھتے وقت نیند آنے لگتی ہے انہیں تو ضرور سینما دیکھنا چاہیے تاکہ جاگنے کی عادت ہو جائے۔ یہ بہت مفید نسخہ ہے اگر ایک شو دیکھنے سے یہ مقصد پورا نہ ہو تو روزانہ دو شو دیکھا کریں۔ لازماً کامیابی ہو جائے گی۔ جب سینما سے گھر آئیں تو منہ ہاتھ دھو کر پڑھنے بیٹھ جائیں۔ منہ دھونے کے لئے "گوری گوری" صابن کا استعمال بہت مفید ہے۔ اس سے جلد ملائم ہوتی ہے، اور رنگ بھی گورا ہو کر صورت میں ایک طرح کی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔

اور جو لڑکے بدشوق ہیں ان کے شوق کو ایک نقطہ پر لانے کے لئے بھی سینما ازبس ضروری ہے۔ بدشوقی کا عین سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان کا خیال ایک جگہ اطمینان نہیں پاتا، اس لئے ان کی قوتِ ارادی بھی محکم نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک قوتِ ارادی محکم نہ ہو شوق پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب لڑکے مختلف ستاروں اور بلبلوں وغیرہ کو سینما میں دیکھیں گے تو ان کے اندر ایک مرکزِ خیال پیدا ہو گا، مثلاً بلبلِ پنجاب مس مختار بیگم (یہاں مس ان کا پیشہ ہے اور بیگم ان کا عرفِ عام) ملکۂ ترنم مس نبو۔ ستارۂ ہند مس مدھوری، اسرو بردھیندان مس کجن، ملکۂ ختن اندو بالا

عطر عنبر حِنّا۔ آن بانی۔ نشتر فصاد مس خاتون وغیرہ۔

ایسے نظاروں سے لڑکوں کی نظروں میں حُسن کو جانچنے کا ایک صحیح معیار بھی پیدا ہو جائے گا اور مضبوط ارادے کے سبب شوقِ تعلیمی میں بھی اضافہ۔

الحاصل یہ کہ سینما بینی، جسمانی و دماغی دونوں لحاظ سے بہت مفید ہے اور ہر موسم میں اس کا استعمال ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اس پر ابھی کافی توجہ نہیں دی جاتی، ورنہ اگر اس کا استعمال مسلسل کیا جائے تو نسلیں بہت تنومند و عروج یافتہ ہو جائیں گی۔

سینما کی وجہ سے عورتوں کو بہت آزادی حاصل ہو گئی ہے اور آئے دن میں سنتا رہتا ہوں کہ اکثر مسلمان گھرانے کی عورتیں، خواہ لڑکیاں، بھی سینما دیکھنے اور ایکٹرس بننے میں دلچسپی لیتی بلکہ فخر سمجھتی ہیں یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ آج کل ہندوستان میں عورتوں پر کوئی روک ٹوک نہیں، اور انہیں آزادی کی شاہراہ پر بالکل چلنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ اسلامی پردہ ایک ہنسی، دل لگی کی چیز بن گیا ہے، اور کئی نوجوان فیشن کے غلام بن کر اپنی عورتوں کو برہنہ، لیکر نکلنے لگے ہیں۔ یہ نہایت افسوس کی جگہ ہے۔ اس سے ملک کی حالت جیسی خراب ہو گئی اور قوم جس گڑھے میں گر گئی ہے، اُس کو دیکھکر رات دن رونا آتا بلکہ ناک، منہ سے خون بہنے لگتا ہے۔ میں اس کا سخت مخالف ہوں یہ نہ سمجھے کہ مجھے آپ کی بربادی کا غم نہیں۔ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل جھوٹ بلکہ لغزش ہے۔ اگر میں غم نہ جتاتا تو آپ کا لیڈر ہی کیونکر بن سکتا تھا۔ لیکن غم کے معنے رونے دھونے کے نہیں۔ رونے دھونے سے کیا فائدہ۔ سر میں چکر، آنکھوں میں درد اور طبیعت ہلکان ہو جاتی ہے اس لئے میں رونا پسند نہیں کرتا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ میں ہر روتا نہیں روتے کے یہ معنے نہیں کہ مجھے غم نہیں۔ غم تو وہ ہے جو دل پر ہو۔ اور دل کا ملولکا، کس پر ظاہر ہو سکتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ عورتیں نہایت کمزور ہوتی ہیں۔ ان سے تو ایسے کام لینے چاہئیں جو اُن سے مخصوص ہیں، ورنہ وہ چاہیں، جتنی ترقی کریں مردوں کے دوش بدوش کبھی نہیں چل سکتیں، اس لئے کہ عام طور پر مردوں کا قد ساڑھے پانچ فٹ ہوتا ہے اور عورتوں کا پانچ فٹ سے بھی کم، پھر وہ دوش بدوش چلنے کا خواب کس طرح دیکھ سکتی ہیں۔ لہٰذا ان کو ہمیشہ مردوں کے کاندھوں پر سر رکھکر چلنا چاہیئے۔ اس طرح ان کی نزاکت و محبت بھی ظاہر ہو گی، اور انہیں سہارا بھی مل جائے گا، اور مردوں کے دلوں کو بھی فرحت و بہجت حاصل ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں دُلہنوں کو کاندھا یا ہاتھ دے کر چلایا جاتا ہے۔

یہ بھی ایک اصلیت ہے کہ عورت اور مرد دونوں مل کر انسانیت کامل کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم دونوں کو ملا کر ایک جہاز تسلیم کر لیں تو معلوم ہونا چاہیئے کہ جہاز کا چھوٹا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، اور بڑا حصہ اُوپر۔ یہیں سے کھلتا ہے کہ عورتوں کو پردہ نشیں ہونا اور اندرونی کام کرانا چاہیئے اور مردوں کو بیرونی کام۔

اور آج کل تو سُنا جا رہا ہے کہ مخلوط تعلیم کو رواج دیا جائیگا۔ اگر ایسا ہو گیا تو خدا ہی خیر کرے۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ لیلیٰ مجنوں بھی ایک ہی مکتب میں پڑھتے تھے، جس کے سبب مخلوط تعلیم غلط ثابت ہو گئی۔ مجنوں پر دو کا قلم چھیل رہا تھا، لیکن نظریں لیلیٰ پر تھیں۔ اس لئے اسکی انگلی کٹ گئی۔ یہ ہے مخلوط تعلیم کا نتیجہ۔ اگرچہ آج کل فونٹن پن نکلنے کے سبب برد کا قلم چھیلنے کی نوبت باقی نہیں رہی، پھر بھی گلاب اور نسیم کی خیر اسی میں ہے کہ دونوں اپنی اپنی حدود میں رہیں۔ جب نسیم لطیف زیادہ زور پکڑے گی تو صرصر بن جائے گی، اور ایک طرف گلاب کو فنا کر دے گی تو دوسری طرف خود بھی خوشبو سے خالی ہو جائے گی، اور جو نسیم خوشبو سے خالی اُس کا پوچھنے والا کون؟ اسی طرح مردوں اور عورتوں کی خیر، خوبی ان کے باہمی توازن اور حدود میں ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کل جتنے عطریات بنتے ہیں وہ سب خوشبو سے بنتے ہیں، چنانچہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا بھی یہی خیال ہے

میں نہیں کہتا کہ یہی ایک وجہ مُلک کی خرابی کی ہے اور دوسری بھی بہت سی ہو سکتی ہیں، مگر وہ سب نیچے کی ہیں۔ اُوپر کی یا سب سے بڑی خرابی یہی ہے جس سے ملک بے جا عیش اور غفلت میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے، اور وہ دن بہت نزدیک ہے جب آپ لوگوں کو ان باتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس لئے آپ حضرات سے درخواست ہے کہ تعیش بے جا اور غفلت کے سب سامان چھوڑ دیں۔ ورنہ آپ دیکھیں گے کہ بہت جلد۔

خزاں نے آکے چمن کو اُجاڑ دینا ہے
مری کھلی ہوئی کلیوں کو چھین لینا ہے

اُس وقت آپ پر حقیقت کھلے گی کہ اوہ۔

کس نے جہاں میں سُکھ دیکھا ہے کسے جیون میں غم نے جلایا نہیں

اسی لئے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

آیا وہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

بلکہ میں تو کہتا ہوں "کل کی خبر" کیا "پل کی خبر" نہیں۔ شاعر کو یہی لکھنا چاہیے تھا اس نے بھول کر مصرعہ ثانی "میں بالکل غلط کر دیا ہے۔

چونکہ میں نے مسلمانوں کی حالت پر عمر بھر غور کیا اور خوش نصیبی سے کئی تجہیز و تکفین کے جلسوں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے میں مردہ کوموں کی نبض اچھی طرح پہچانتے لگا ہوں، اس لئے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک ملک کے نوجوان حرکت کی کوشش نہ کریں گے اور ایک مستقل ارادے سے قدم نہ بڑھائیں گے، تب تک یقین ہے کہ منزلِ مقصود پر پہونچنے کی توقع بالکل غیر حقیقی رہے گی۔

اس لئے میرے عزیز نوجوانو، اگر بڑھنے کا سچا جذبہ ہے تو دانت کھول دو، حرص کو کاٹو، پاؤں کھینچ لو اور ہاتھ پھیلانا شروع کر دو، اور جہاں تک ہو سکے کمر ہلاتے رہو ورنہ کسی خاطر خواہ نتیجہ کی امید نہیں کی جا سکتی۔ بس اب میں کیا عرض کروں آپ خود سمجھدار ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا بہت وکت لے لیا۔ اب میں اپنے اصل مضمون کی پیشانی پر آتا ہوں یعنی "نوجوانوں سے خطاب" — نوجوانوں سے خطاب ایک نہایت اچھی چیز ہے، اور ہر شخص کو اس پر سختی سے کاربند ہونا چاہیے۔ واجب تھا عرض کیا، باقی آئندہ۔

سید علی شاکر۔ ایم۔ اے

ایک خط کا جواب

دل تو سمجھا ہے یہ مفہوم اس انگڑائی کا
شوقِ سائل کو اشارہ ہے پذیرائی کا
ہوگئی حسن سے دنیائے تصور معمور
شکر کیونکر ہو ادا آپ کی رعنائی کا
پھونک دی روحِ تمنا دلِ افسردہ میں
معترف ہوں میں اس اندازِ مسیحائی کا
زندگی ہوگئی مسرور، کوئی غم نہ رہا
بھول سکتا ہوں؟ یہ احسان دل آرائی کا
مست و سرشار ہے، فردوس بآغوش ہے دل
اللہ اللہ خیال آپ کی زیبائی کا
یہ توجہ، یہ تلطف، یہ نوازش، یہ کرم
کر دیا ختم ہر انداز ستم زائی کا
التفات، اور یہ بیگانگی و نازِ حجاب
مرحبا، خوب کیا پاس تمنائی کا
کھل کے ملنے یہ تامل یہ تکلف کیسا
کوئی موقع بھی ہو اندیشۂ رسوائی کا
نیم بسمل جو کیا ہے تو رہے یہ بھی خیال
دل ہے محتاج ابھی حوصلہ افزائی کا

کوکب شاہجہانپوری

ساقی کے چند خاص نمبر

رعایتی قیمت پر

سالنامہ ۳۴ء	قیمت ۸؍
〃 ۳۵ء	〃 ۱۰؍
〃 ۳۶ء (جاپان نمبر)	〃 ۱۰؍
ظرایف نمبر ۳۳ء	〃 ۵؍
〃 〃 ۳۴ء	〃 ۵؍
〃 〃 ۳۵ء	〃 ۵؍
〃 〃 ۳۶ء	〃 ۵؍
افسانہ نمبر ۳۱ء	〃 ۶؍
〃 〃 ۳۳ء	〃 ۶؍
〃 〃 ۳۵ء	〃 ۶؍
〃 〃 ۳۶ء	〃 ۶؍
〃 〃 ۳۷ء	〃 ۶؍
سالنامہ ۳۷ء	〃 ۱۰؍
سالنامہ ۳۸ء	〃 ۱۲؍
چغتائی نمبر	〃 ۸؍
دانتے کا جہنم	〃 ۶؍
مکمل فائل ۳۵ء	〃 ۳ روپے
〃 〃 ۳۷ء	〃 للعہ

محصول ڈاک بذمہ خریدار

آرٹ اور اخلاق

شاعری کی روشنی میں

(گذشتہ سے پیوستہ)

مدت ہوئی بیکن نے کہا تھا: اگر سائنس دماغ کو اشیاء کا محکوم بناتی ہے تو آرٹ اشیاء کو دماغ کا محکوم بناتا ہے۔" اور انسان بیکن سے بھی بہت پہلے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کو قبول کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن یہ وہ ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہے کہ وہ کچھ ایسی شرائط کی اطاعت کر رہا ہے جنہیں اچھی طرح سمجھتا بھی نہیں، اور کچھ ایسے قوانین کے سامنے جھک جاتا ہے جو کسی حکومت کی منظوری کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی غیبی طاقت کے زور سے مانے جاتے ہیں۔ جتنا کہ دورِ حاضر میں جس قدر انسانی زندگی میں مادیت اور افادیت کا استیلا ہے اسی قدر وہ مادیت اور افادیت سے بیزار ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کیمیا، طبیعیات جن کا موضوع محض مادیات ہے، مادہ سے اگر قطع نظر نہیں کر رہے ہیں تو کم از کم یہ کوشش ضرور کی جا رہی ہے کہ مادہ کو زیادہ سے زیادہ لطیف بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں انسان نے سائنس کی دنیا میں عظیم الشان انکشافات کئے ہیں لیکن پھر بھی "اپنے درد و غم کے شہر میں، اپنے خانۂ حیات میں اور اپنے اُمید و بیم کے کمرے میں وہ ہمیشہ درد و اضطراب سے کراہتا رہا ہے۔" اس کی زندگی کا، اس کی ہر جد و جہد کا مقصد ایک ہی رہا ہے یعنی آسودگی اور اطمینانِ قلب حاصل کرنا۔ اسی کی تلاش میں تمدن کی تمام منزلیں طے ہو گئیں۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے کو خرافات سے مطمئن کرنا چاہا، اس کے بعد مذہب کا دور آیا۔ پھر فلسفہ کا۔ پھر فلسفہ اور مذہب مل گئے اور اشراقیت نے تصوف کی بنا ڈالی۔ اس سے دُنیا تنگ ہو گئی تو مادیت و افادیت کی طرف مائل ہوئی اور مادی، اقتصادی اور سیاسی فلاح کو عین آسودگی سے تعبیر کرنا چاہا۔ مگر یہ فریب تا کجے؟ سراب کا یہ دھوکا تا کجا؟ انسان بہر حال سکون و آسودگی سے اسی طرح محروم رہا۔ آخر یہ غیر واضح بےچینی آئی کہاں سے اور اس کا راز کیا ہے؟ شوپنہار جیسے فلسفیوں نے اس کا وہی جواب دیا جو مولانا رومؒ نے دیا ہے کہ:-

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

لیکن وہ اب تک کسی طریقے سے وصل و اتصال حاصل نہ کر سکا، اس کو سکون و اطمینان میسر نہ آ سکا۔ آخر اس نے دماغ پر زور دیا اور اُسے ایک بھولی ہوئی حقیقت یاد آ گئی، اپنا بھولا ہوا راستہ یاد آ گیا۔ وہی راستہ، محکومی کا نہیں بلکہ حکومت کا، بندگی کا نہیں بلکہ خواجگی کا، ہاں وہ تخییلی آرٹ کا راستہ جو فنا سے بقا کی طرف جاتا ہے۔ اور اسی سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ انسان "تجدید تخلیق" سے تسلی اور مسرت حاصل کرنا، دُنیا کی غیر منظم اور رنجیدہ اشیاء کو اپنے دل کی خواہش کے مطابق بنانا اور ترتیب دینا نہیں بھولا ہے۔

اور میرے خیال میں یہی وہ چیز ہے جو مشترکہ طور پر ہم سب کیلئے شاعری پیش کرتی ہے۔ نہ محض شعراء کے لئے بلکہ ہر انسان کیلئے اور یہی ارفع و اعلیٰ شاعری کا معیار ہے کہ وہ ایک آزاد و مکمل دُنیا کی عام خواہش کا اظہار کرتی ہے، ایک ایسی دُنیا جہاں آلام و مصائب کا نام نہیں۔ جہاں آزادی ہے، حسن و محبت ہے، عیش و عشرت ہے، سرمستی و مدہوشی ہے۔ جس وقت دُنیا کا دل آلام و مصائب کے بوجھ سے دبا ہوا کراہتا ہوتا ہے جب زندگی آزادی کیلئے پر پھڑپھڑاتی ہوتی ہے۔ اور جب انسان اس اندوہ و غم سے لبریز دُنیا میں مسرت و اطمینان کی تلاش میں بھٹکتا ہوتا ہے۔ شاعر بھی خود روح کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور اس پر مصائب دُنیا کو مسرت و انبساط سے بھر دینے کیلئے اپنے خدام کو حکم دیتا ہے۔

بیا باغباں خرمی ساز کن | گل آمد در باغ را باز کن
زجعد بنفشہ برانگیز تاب | سر نرگس مست برکش زخواب

سحن سہ درابال برکنس فراخ بہ مرغی خبر دہ کہ سبز است شاخ
بگے مژدہ بر سوئے بلبل براز کہ بند گل آمد بہ بستاں فراز
بہ مرغ زباں بستہ آواز دہ کہ پروانہ پاریبہ را ساز دہ
دراں بزم خسروانی خرام در انجمن مئے خسروانی بجام

اب یہ نتیجہ بالکل صاف ہے کہ جو کام تصوف سے نہ ہوسکا وہ دراصل آرٹ کا کام تھا اشاعری کا کام تھا۔ اور ہم اگر اپنی اصل سے پھر ہم آغوش ہوسکتے ہیں، ہمیں اگر کسی طرح سکون و آرام مل سکتا ہے تو فنون لطیفہ کی وساطت سے کیونکہ تصوف ہم کو یہی سبق دیتا رہا کہ دنیا دارالمحن ہے اور اس کی مصیبتوں اور کلفتوں سے نجات حاصل کرنے کی صرف یہی تدبیر ہے کہ دنیا کو حرف غلط سمجھکر اس سے منہ موڑلو۔ اگرچہ اسلام نے صاف صاف کہا "لارہبانیت فی الاسلام" اور "ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" لیکن تصوف نے اس پر روغن مل کر ایک نیا حکم دیا کہ اگر حقیقت سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو تو دنیا سے منہ موڑ کر حقیقت کی طرف آؤ جو مجاز سے اتنی ہی باہر ہے جتنی کوئی چیز اپنے سایہ سے۔ لیکن آرٹ اور شاعری اسکے برعکس جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے:-

آنچہ حق است اقرب از حبل الورید
تو فگندی تیر فکرت را بعید۔

وہ حقیقت کو مجاز سے باہر نہیں لے جاتی کیونکہ اسکے عقیدے میں حقیقت اگر کہیں مل سکتی ہے تو مجاز میں جاری و ساری ملے گی۔ صوفیوں نے غریب دنیا والوں کے ساتھ بڑی رعایت کی تو "مجاز کو حقیقت کی سیڑھی" کہدیا۔ مگر شاعر مجاز کو عین حقیقت جانتا ہے۔

ہاں میکدۂ جہاں کا ذرّہ ذرّہ
سرشار مجاز ہو حقیقت کیا ہے

شاعر یہ نہیں چاہتا اور نہ اُس کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ انسان کو انسانیت سے محروم کرکے خدا سے ملائے۔ وہ مجاز کا مجازی مرکز اپنی جگہ پر قائم رہنے دیتا ہے اور اس میں حقیقت کو پاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا ہی میں انسان نے حقیقت کو کھویا ہے اور دنیا ہی میں پائیگا۔

ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہگذر ہے

ہاں [illegible] کے انکشافات سے ہم اس حقیقت

کو آسانی سے نہیں پاسکتے۔ وہ ملے گی تو عالم روح اور وجدان ہی میں تلاش کرنے سے ملے گی۔ اور بقول کروچے "وجدان اور صناعی دو چیزیں نہیں۔ وجدان صناعی ہے اور صناعی وجدان۔ شاعری میں مواد ضروری تو ہے اس لئے کہ اگر مواد نہ ہوگا تو شاعری صورت کس چیز کو دے گی۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ اس مواد میں کوئی جمالی نوعیت ہونا چاہیئے۔ یہ نوعیت دراصل صورت میں ہوتی ہے جو اس وقت صورت پذیر ہوتی ہے جب صناع مواد کو صورت دے چکتا ہے۔ صناع کہیں سے اور کسی قسم کا مواد لیکر صورت دے سکتا ہے اور اگر وہ اپنی صورت گری میں کامیاب ہوجائے تو اسکو فنون لطیفہ کے ماتحت لے آنا چاہیئے۔"

الغرض لامحدود نیلا آسمان، وہ ناپیدا کنار سمندر جس میں ہم اپنے اس ویران و سنسان جزیرے سے واپس کودیں گے، وہ عام اور دوامی زندگی جس کی آزادی میں نیکی ہی نیکی ہے، مسرت ہی مسرت ہے یہ سب کچھ ہمیں آرٹ ہی سے حاصل ہوتا ہے اور شاعری آرٹ کی آواز ہے، جذبۂ زندگی ہے لیکن قابل سماع ــــ!

یہاں تک ہم نے صرف اس سے بحث کی ہے کہ اخلاق، آرٹ اور شاعری دراصل کیا ہیں۔ اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ آرٹ اور اخلاق کا شاعری سے کیا تعلق ہے اور کہاں تک ان دونوں چیزوں کا شاعری میں اظہار کیا گیا ہے اور کہاں تک کیا جانا چاہیئے۔

آرٹ اور شاعری

آرٹ اور شاعری کے تعلق کا اندازہ آپ نے اُن کی تعریفوں ہی سے کرلیا ہوگا لیکن ہمیں اور صاف کر دینے کے لئے کہہ دینا چاہیئے کہ وجدان کے اظہار کا نام آرٹ ہے اور اس [illegible] الفاظ کے جامے میں ملبوس کردینا شاعری ہے اس طرح [illegible] شاعری ہے اور شاعری آرٹ۔ اب یہ کہانتک صحیح ہے چند [illegible] سے ہم اس کا اچھی طرح اندازہ کرلیں گے۔

آرٹ کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقت [illegible] سے باہر نہ تلاش کرنا چاہتا ہے اور نہ اپنے عقیدے کے مطابق [illegible] ہے لہذا شاعر حقیقت کے وجدان کا ہمیشہ مجاز کی اصطلاحوں [illegible] [illegible]

موجود ہے۔ اور اس کی وجہ ہے۔ حقیقت عریاں تک ہمارا فہم و ادراک پہونچ ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ اسے مجازیت کے لباس میں ہمارے سامنے نہ لایا جائے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

شاعری نے آرٹ کی اس سب سے اہم خصوصیت کو کہیں بھی نظر نہیں کیا۔ اور جہاں کیا وہاں ایک خشک اور بے کیف وعظ کی سی غیر دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس چیز کو آرٹ یا شاعری سے کوئی واسطہ نہیں۔

آرٹ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کو جس پیرایہ میں پیش کر رہا ہے وہ اس قدر دلچسپ ہو کہ انسان کی جمالیاتی تشنگی دور ہو جائے۔ یعنی جس چیز کو وہ پیش کرے وہ چیز اپنی اصل سے زیادہ محبوب، پسندیدہ اور پُرکیف ہو۔ اجنبی جوان مرد و عورت اکثر اتفاق سے ایک جگہ مل جاتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان میں "محبت بہ اولیں نظر" بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی زبانیں خاموش ہوتی ہیں لیکن نظریں سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔ نظروں کے خاموش پیغام، اگر دماغ پر زور دیں تو سُن تو شاید آپ بھی لیں لیکن انہیں بیان ایک شاعر کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، اس طرح کہ اس منظر کا مکمل اظہار بھی ہو جائے اور اس کی جمالیاتی نوعیت میں بجائے کسی کمی کے اور چار چاند لگ جائیں۔ مگر اسی چیز کو مولانا غنیمت جس انداز سے پیش کرتے ہیں وہ آرٹ کا معجزہ ہے۔ شاہزادہ اور ایک گاؤں کی لڑکی اتفاقاً ایک کنوئیں پر مل جاتے ہیں، نظریں چار ہوتی ہیں۔ دونوں کے دل زخمی لیکن دونوں شرم و حجاب کی وجہ سے خاموش۔ ملاحظہ ہو۔

تپش سحر لیس دلہا کرد پُرجوش ٭ حجاب انگشت برلب زد کہ خاموش
حدیثے را کہ دل از لب نہفتے ٭ زبان شوخیٔ دنبالہ گفتے
سوالش آنکہ در دل عشق زد جوش ٭ جوابش آنکہ فہمیدم خاموش

اب اگر ایسے موقع پر دشمنوں کا بھی ڈر ہو تو ایک عاشق کا دیدہ ہوتا ہے وہ سعدی کے اس شعر میں ملاحظہ ہو۔

دل و جانم بتو مشغول و نگہ بر چپ و راست
تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

اصل چیز کے حسن میں اضافہ اس وقت ایک شاعر معجزانہ حد تک کر دیتا ہے جب وہ مختلف چیزوں کے درمیان جو فطری تعلق اور ازلی ربط ہے اس کو کام میں لائے۔ روزانہ صبح ہوتی ہے، میں اور آپ ہر روز دیکھتے ہیں لیکن شاید ہماری صبح اتنی حسین اور پُرکیف نہیں ہوتی جتنے جامی کے یہ دو شعر۔

چو روز دگر مرغ بکشاد بال ٭ تہی شد دماغ سپہر از خیال
چو صبح از رخ روز برقعہ کشاد ٭ خلق بر جلبش داغ جزیہ نہاد

یا ہم نے سینکڑوں حسین چہرے اور سیاہ تاب زلفیں دیکھی ہیں اور مغربی تہذیب کی کارفرمائی اگر ہمارے دماغوں کو بدستور مسحور کرتی رہی تو اور بھی حسن دشباب کے مجسمے ہماری نظروں کے سامنے آئیں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ باوجود حسین بننے کے تمام ممکن کوششوں کے کوئی مجسمہ ہمیں اتنا حسین نظر نہ آسکے گا جتنا جامی نے اپنے قلم کی ایک ادنیٰ جنبش سے پیش کیا ہے۔

کمند زلفش از عنبر مشک ناب
رسن کردہ در گردن آفتاب

یا اگرچہ لباس حریر پر کوئی لعل ٹکا ہوا ہم نے نہیں دیکھا ہے اور موجودہ قارونیت کی حکومت میں دیکھنے کی بظاہر امید ہے لیکن فرض کر لیا جائے کہ اگر قسمت سے ہمیں ایسا کوئی موقع مل جائے تو اس وقت ہمارے منہ سے صرف ایک سرد آہ نکلے گی مگر نور جہاں کا یہ شعر پڑھ کر ہم واہ وا کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ترا نہ تکمۂ لعل است بر لباس حریر
شدہ است قطرۂ خون منت گریباں گیر

آرٹ فطرت کی محاکات ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب شاعر مظاہر قدرت (اس میں انسان بھی مع اپنے احساسات و خیالات کے شامل ہیں) کی تصویر کشی کرتا ہے تو بجنسہ اس کا عکس رکھ دیتا ہے۔ نہیں۔ وہ اسے اپنی شخصیت کی نیرنگیوں سے معمور کر کے اس کے اندر ایک نئی شان اور ایک نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے پاس رنگ و خطوط نہیں ہوتے وہ صرف الفاظ سے تصویر کھینچتا ہے لیکن وہ اتنی مکمل ہونی چاہئے کہ شعر پڑھتے ہی ہماری نظروں کے سامنے اصل چیز مع اپنی تمام رنگینیوں اور اثر آفرینیوں کے آجائے۔ مثلاً مولانا غنیمت ایک بوڑھی ہستی کی تصویر کھینچتے ہیں۔

رسید اوّل بہ دختر شاد و خنداں
چہ خنداں بے نصیب از نام دنداں

فوراً ہنسی سے پھیلا ہوا ایک پوپلا منہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

یا ایک مُفلس گدا کی تصویر کھینچی جاتی ہے لیکن نہ محض ظاہری اجسام کی بلکہ دلی کیفیات و محسوسات کی بھی۔ ایک مصور عمر بھر اس میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ مگر شاعر نے اس خوبصورتی سے چند الفاظ میں پورا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ لسے پڑھکر ایک وہ امیر بھی جو غریبوں کا خون چوس کر اپنی توند کو بڑھتا ہوا محسوس کر کے خوش ہوتا ہے شاید یکایک دم سا گھٹتا ہوا محسوس کریگا:-

کھیلنے میں طفلکِ گلفام تھا ڈوبا ہوا
آئی اتنے میں گلی سے آم والے کی صدا
کانپتی آئی صدا، ہلنے لگا بچے کا دل،
سانس لی یوں جیسے رکھی ہو کوئی چھاتی پہ سِل
ہوئی اگلی ضدوں کی یاد سے دنیا سیاہ
ماں کے چہرے کی طرف ڈالی جھجکتی سی نگاہ
ماں کی نظریں اٹھ گئیں، ٹھہریں، پھر آیا پھر کے پھیر
"ہائے میرے لال میرے پاس تو کچھ بھی نہیں"
دیکھکر ماں کی اداسی، ہوگئی پامال یاس
انکھڑیوں میں آم کی سُرخی، تخیل میں مٹھاس
چھا گیا چہرے پہ سناٹا، دلِ ناکام کا
اشک بنکر آنکھ سے ٹپکا تصور آم کا
نیم جاں ماں باپ کی نظروں کے خط ملنے لگے
باپ کا سر اور دکھیا ماں کے لب ہلنے لگے

یہ تمام تصورات و وجدانات سادہ و معمولی ہیں لیکن شاعر نے اپنے آرٹ سے ان میں ایسی روح پھونکدی ہے کہ یہ کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ یہ وہی دنیا ہے جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں لیکن شاعر نے اسی کو ہمارے لئے دوبارہ تخلیق کر دی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں "تجدید تخلیق" اور یہی چیز ہی جو آرٹ کی روح رواں ہی۔

بعض اوقات شاعر یہی چیز تشبیہ و استعارے سے پیدا کر دیتا ہی مثلاً انوری اپنے محبوب کے قد و رُخ کا نقشہ کھینچتا ہی:-

رُوئے چوں ماہ آسماں داری
قدّ چوں سرو بوستاں داری

لیکن جب سعدی اسی چیز کو اسی تشبیہ کے ساتھ پیش کرتا ہی تو انوری کا محبوب سعدی کے محبوب کے سامنے بیجان معلوم ہونے لگتا ہی:-

سرو را مانی ولیکن سرو را رفتار نیست
ماہ را مانی ولیکن ماہ را گفتار نیست

آرٹ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک چیز اس طرح پیش کی جائے کہ اس میں ایک خاص کیفیت اور شعریت پیدا ہو جائے۔ اور جو چیز اُسے پیش کرنا ہے وہ خواہ کتنی ہی معمولی اور سادہ ہو لیکن اس کا پیرایۂ بیان ایسا ہو کہ وہ چیز ہمیں بالکل غیر معمولی اور نئی معلوم ہونے لگے۔

سعدی دوست پر طنز کرتے ہیں لیکن پیرایۂ بیان ایسا معصوم ہے کہ دوست شاید اس طنز کو سمجھ بھی نہ سکے۔ کہتے ہیں:-

بود ہمیشہ پیش ازیں رسم تو بے گنہ کشی
از چہ مرا نمی کشی من چہ گناہ کردہ ام

یا شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ عاشق و معشوق کا اتصال اس دنیا کے خونخوار درندوں کی نظروں میں کانٹا سا کھٹکتا ہے۔ لہذا چھپکر اس آبادی سے دور چلا جانا چاہیئے۔ مگر اس چیز کو کس خوش اسلوبی سے پیش کرتا ہے:-

اے گُل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں
گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے، باغباں مجھے

یا سعدی ایک طرف تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کا محبوب حسین ترین ہستی ہے۔ دوسرے اُن کی محبت، خواہ دنیا والے کتنے ہی حجت کریں ختم نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایک ہی شعر میں ان دونوں باتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ:-

دوستاں عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

لفظ "چنیں" نے اس شعر کی بلاغت کو آسمان پر پہونچا دیا ہی۔ ہمارے ہاں اردو میں غالب اور مومن کے یہاں اس قسم کی سینکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ یہاں پیش کرنا میرے خیال میں طوالت کا باعث ہو گا۔

آرٹ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ چیزوں کی ہیئت ماہیت کو بدل دیتا ہے اور یہ تبدیل شدہ ماہیت اصل سے زیادہ حسین ہونے کے ساتھ ہی بعض اوقات بالکل اس کے برعکس بھی ہوتی ہے۔ مثلاً پریشان حالی کا رونا کون نہیں روتا مگر شاعر اسکی ماہیت ہی بدل دیتا ہی جب کہتا ہی:-

از پریشان حالی آخر کارِ من صورت گرفت
بسکہ مو آمد بہ کِلکِ خامہ تصویر شُد

یا جفا و بلا سے کون شخص پناہ نہیں مانگتا لیکن سعدی اُک

نذرِ اقبال

قطعۂ تاریخ وفات

علامہ اقبال مرحوم

لطفِ مجلس کیا رہا جب میرِ مجلس اٹھ گیا ‖ وائے ناکامی کہ بزمِ اہلِ دل برہم ہو آج
کل جہاں تھا نغمۂ مستانہ کا جوش و خروش ‖ واں ہر اک لب پر صدائے نالۂ پیہم ہو آج
سینۂ مسلم کہ تھا گنجینۂ شوق و امید ‖ ہے وفورِ یاس اس میں اور ہجومِ غم ہے آج
فکر کی جب سالِ رحلت کی تو دل نے دی صدا ‖ ملتِ اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج

۱۳۵۷ھ

(ڈاکٹر) عابد حسین

حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ

کی دردانگیز یاد میں

بندۂ حقگدازِ مولا ہی خادمِ خواستگارِ مولا ہی عاشقِ جاں نثارِ مولا ہی
مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

درد کا اِک جہان ہو جس میں سراپا [?] بے نیازی کی شان ہو جس میں فقر کی آن بان ہو جس میں
مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

جسکو رازِ حیات ہو معلوم وسعتِ ممکنات ہو معلوم مقصدِ کائنات ہو معلوم
مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

نور افشاں ہو زندگی جس کی مہرِ تاباں ہو زندگی جس کی فخرِ انساں ہو زندگی جس کی
مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

ذات سے جس کی ہو ظہورِ خودی جس نے پی ہو مئے طہورِ خودی بیدھڑک پھونکے جو صورِ خودی
مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

جسنے مولا سے لَو لگائی ہو اپنے مالک کا جو فدائی ہو جس کی محبوب تک رسائی ہو
مردِ غازی ہے مردِ مومن ہے

مردِ مومن تھے حضرتِ اقبال
اس کا شاہد ہے انکا حال و قال

مئے باقی کا جام تھے اقبال. زندگی کا پیام تھے اقبال. مومنوں کے امام تھے اقبال
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!!

قلزمِ علم کے شناور تھے حکمتِ نادرہ کا دفتر تھے، جوہر اُن کے عجیب جوہر تھے
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!!

ہند میں ایک ہی مسلماں تھے. اہلِ مشرق کے مہرِ تاباں تھے یعنی دانائے رازِ انساں تھے
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!!

ہمدمِ حق حریفِ باطل تھے، قوم کا درد قوم کا دل تھے "پیرِ ہندی" تھے مردِ کامل تھے
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!!

قوم کیوں آج بیقرار نہ ہو؟ قوم کیوں آج اشکبار نہ ہو؟ قوم کیوں آج سوگوار نہ ہو؟
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!!

"پیرِ ہندی" ہا ترا نیاز آگیں. تیرا شیدا ترا امینِ حزیں نوحہ گر کیوں نہ ہو بصدق و یقیں
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے!!

نعمتِ ذوالجلال تھے اقبال
آپ اپنی مثال تھے اقبال

امینِ حزیں سیالکوٹی

اقبال

(یہ تقریر علامہ اقبال کے یوم وفات (۲۱ اپریل) کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوئی)

انگلستان کے مشہور شاعر لارڈ ٹینیسن نے اپنے اُن تاثرات کا ذکر کیا ہے جو اُنکے دل میں ایک ان سے بھی زیادہ مشہور شاعر لارڈ بائرن کے انتقال کی خبر کو سنکر پیدا ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ خبر وحشت اثر سنی تو مجھ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ خود فراموشی کے عالم میں گھر سے نکلکر جنگل کی راہ لی اور وہاں جاکر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اور اس سے میں نے زمین پر کچھ لکھنا شروع کیا لیکن مجھ کو مطلق ہوش نہ تھا کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ جب حواس ٹھکانے ہوئے تو دیکھا کہ صرف ایک ہی فقرہ تھا جسکو میں بار بار لکھ رہا تھا۔ اور وہ یہ فقرہ تھا کہ "بائرن مرگیا" "بائرن مرگیا" اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اسوقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ بائرن کیا مرگیا گویا ساری دنیا مرگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولنا حالی مرحوم پر بھی کچھ ایسا ہی جذبہ طاری ہوگا جب انہوں نے غالب کی موت پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے یہ شعر لکھا کہ:

اس کے مرنے سے مرگئی دہلی — مرزا نوشہ تھا اور شہر برات

حقیقت میں بڑے شعرا دنیا کی رنگینی اور دلفریبی اور زندگی کی دلچسپی میں اتنا اضافہ کردیتے ہیں کہ ان کے مرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بے لطف اور دنیا سونی ہوگئی۔ یہی کیفیت آج اقبال کے مداحوں اور نیازمندوں کے دلوں کی ہے جنکے ادنیٰ ترین طبقہ میں میں بھی اپنے کو شمار کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ ان حالات میں آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں سردست آپکے سامنے اقبال کی زندگی کا کوئی مسلسل تذکرہ یا اُنکے گوناگوں علمی، ادبی، سیاسی اور ملّی کارناموں پر کوئی مفید و مربوط تبصرہ پیش کرسکتا ہوں۔ اس خدمت کو انجام دینے کیلئے پُرسکون دماغ اور مطمئن دل چاہیئے اور یہ مجھے اس وقت میسر نہیں۔ اسوقت صرف یہ ممکن ہے کہ مرحوم سے اپنے دیرینہ ذاتی تعلقات اور انکی تصانیف کے معتقدانہ مطالعہ کی بنا پر چند بے ربط واقعات اور خیالات آپ سے عرض کردوں۔

سر محمد اقبال سے گذشتہ چالیس سال کے دوران میں دنیا کئی حیثیتوں سے روشناس رہی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ایک ایسے قادر الکلام شاعر کی ہے جسکے کلام کا شہرہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں اور اس سے باہر دور دور تک پہونچا ہے۔ اس قسم کی شہرت اس زمانہ میں سوائے اقبال اور ٹیگور کے کسی اور ہندوستانی بلکہ ایشیائی شاعر یا ادیب کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں اپنے اوائل عمر کے حافظہ کی بنا پر یہ بتانے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ اس شہرت کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ تھا اور اس تقریب پر علما اور شعرا دور دور سے جمع ہوگئے تھے۔ جن میں مولنا نذیر احمد اور مرزا ارشد دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اقبال اس وقت حال ہی میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کا امتحان پاس کرکے نکلے تھے۔ ان کی شاعرانہ استعداد سے اس وقت تک بہت کم لوگ واقف تھے۔ اگرچہ انہوں نے طالب علمی ہی کے زمانہ میں شعر کی مشق شروع کردی تھی اور اردو شاعری کی ایک قدیم رسم کے مطابق اس فن کا ایک استاد بھی تلاش کرلیا تھا۔ یہ استاد دہلی کے آخری شاعر نواب مرزا خاں داغ دہلوی تھے۔ داغ اور اقبال کی طبیعت اور اسلوب میں اتنا فرق ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ادبی رابطہ قائم کرنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اقبال نے اپنی بعض ابتدائی غزلیات بنظر اصلاح داغ کو بھیجی تھیں اور جب داغ کا انتقال ہوا تو انہوں نے ایک بہت مؤثر نظم میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت تک اقبال کے شاعرانہ کمال کا بہت

کا اظہار ہوتا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا ایک بڑا مقصد یتیم بچوں کی پرورش تھا۔ اقبال نے ایک نظم "نالۂ یتیم" کے عنوان سے لکھی اور خود ہی جلسہ میں پڑھی۔ وہ اپنا کلام اکثر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اور چونکہ انکی آواز میں ایک خاص درد تھا اور موسیقی سے بھی واقفیت تھی۔ جو سنتا تھا وجد کرتا تھا۔ ایک تو نظم اچھی دوسرے پڑھنے کا یہ دلفریب انداز تمام جلسہ پر محویت کا عالم طاری ہوگیا۔ میری عمر اس وقت بہت کم تھی اور اسکول کی کسی جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھ کو اس زمانہ میں شعر فہمی کا مطلق شعور نہ تھا لیکن اُس اجتماعی اثر نے جو تمام سامعین محسوس کر رہے تھے میرے دل پر جو نقش چھوڑا وہ ابتک باقی ہے۔ نظم کے خاتمہ پر بہت سے لوگوں نے جی کھول کر داد دی اور مولوی نذیر احمد صاحب نے تو یہانتک کہدیا کہ میں نے میر انیس اور مرزا دبیر کو بھی مرثئے پڑھتے سنا ہے لیکن اُن کی مرثیہ خوانی سے بھی وہ کیفیت کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی جو اس وقت اس نوجوان شاعر کی اس دردانگیز نظم سے پیدا ہوئی ہے۔ "نالۂ یتیم" نے اقبال کی شاعری کا ہزاروں آدمیوں کو شائق اور گرویدہ بنادیا اور اس کے بعد سے یہ معمول ہوگیا کہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے ہر سالانہ جلسہ پر ایک نظم پڑھتے تھے جس کا انکے شائقین کو سال بھر انتظار رہتا تھا۔ یہ معمول کئی سال تک قائم رہا اور اقبال کی بہترین طویل نظمیں مثلاً تصویر درد۔ شکوہ اور جواب شکوہ۔ شمع و شاعر۔ خطر راہ وغیرہ اسی تقریب سے لکھی گئی تھیں۔

ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اقبال کا ارادہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان میں شرکت کا ہوا۔ لیکن میڈیکل بورڈ نے غالباً ضعف بصارت کی بناپر اُن کو اس قسم کی ملازمت کے ناقابل قرار دیدیا اور وہ مقابلہ کے امتحان میں شریک نہ ہوسکے۔ اگرچہ اسوقت خود اقبال اور اُن کے دوستوں کو اس واقعہ سے ایک گونہ مایوسی ضرور ہوئی ہوگی لیکن دراصل قضا و قدر کا یہ انتہائی حسن سلوک تھا کیونکہ اگر وہ اس قسم کی سرکاری ملازمت کی پابندیوں میں گرفتار ہوجاتے تو مُلک و قوم انکی بے نظیر ادبی اور سیاسی خدمات سے محروم ہوجاتی۔ چونکہ طالب علمی کے زمانہ میں اپنے سب اُستاد خصوصاً فلسفہ کے اُستاد پروفیسر آرنلڈ (جو بعد میں سرطامس آرنلڈ اور لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ہو گئے) انکی قابلیت اور ذہانت کے معترف تھے ان کو گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفہ کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کردیا گیا۔ فلسفہ سے انکو فطری ذوق و مناسبت تھی جس کا اندازہ انکی شاعری سے بھی ہوسکتا ہے۔ چونکہ مجھے اس مضمون میں ان کی شاگردی کا فخر حاصل رہا ہے اس لئے میں نہایت وثوق کے ساتھ اس امر کی شہادت دے سکتا ہوں کہ وہ نہ صرف خود فلسفہ کی گہرائیوں سے بخوبی واقف تھے بلکہ اپنے طلبا میں اس مشکل مضمون کا ذوق اور ذاتی تفکر کی عادت پیدا کرسکتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ مخزن لاہور سے جاری ہوا اور اقبال کی نظم اس کے تقریباً ہر پرچے کی زینت بننے لگی۔ چونکہ سب بڑے شعرا کی مانند اقبال بھی بعض چھوٹی باتوں مثلاً محاورہ زبان اور قواعد عروض سے کبھی کبھی اغماض برت جاتے تھے۔ لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کے بعض تنگ خیال ادیبوں نے مخزن کے حریف رسالوں پر ان نظموں پر تعریض اور نکتہ چینی شروع کی۔ اقبال ہمیشہ ایسے اعتراضات کو بہت صبر و سکون سے دیکھتے تھے اور اپنی کسی لغزش کے قائل ہوجاتے تھے تو اُسکو ہنسی خوشی مان لیتے تھے۔ اس لئے ان ادیبوں کی معترضانہ روش کا ان پر بھی کوئی ناگوار اثر نہیں ہوا اور جہانتک عوام کا تعلق ہے ان کی شہرت میں اور اضافہ ہوگیا۔

اقبال کی رنگین طبیعت سے یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ معلمی کی خشک زندگی اور ملازمت کی پابندی کو دیر تک برداشت کرسکیں گے۔ اُنہوں نے دو چار برس کے بعد یہ تہیہ کرلیا کہ انگلستان جاکر فلسفہ کی مزید تعلیم حاصل کریں اور کسب معاش کے لئے بیرسٹری کی سند بھی لے آئیں۔ اس ارادے کی تکمیل کے لئے اُنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی، اے کی ریسرچ ڈگری اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے

ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی اور ساتھ ہی بیرسٹر بھی ہوگئے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے انہوں نے ایرانی مابعد الطبیعات یعنی Persian Metaphysics پر ایک بہت بیش قیمت علمی مقالہ لکھا جس میں ایرانی فلسفہ اور تصوف پر نہایت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اقبال کو تصوف سے دلی لگاؤ تھا اور اگرچہ اُن کی فارسی مثنویات اسرار خودی اور رموز بیخودی کے بعض اشعار کیوجہ سے انکو تصوف کا مخالف سمجھ لیا ہے لیکن اگر ان کے کلام کو بنظر غائر مطالعہ کیا جائے اور ساتھ ہی ان انگریزی مضامین کو بھی پڑھا جائے جو انہوں نے Reconstruction of Religious thought in Islam یعنی اسلام میں مذہبی تفکر کی تجدید کے عنوان سے لکھے ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان کو تصوف سے کوئی مخالفت نہ تھا بلکہ اس کے بعض مظاہرات سے بیزاری تھی جو ملت اسلامی کے دور انحطاط میں رونما ہوگئے تھے۔ ان کے والد ایک صوفی منش آدمی تھے اور گو وہ خود کبھی کسی کے مُرید نہیں ہوئے لیکن بعض اپنے زمانہ کے مشہور صوفی بزرگوں خصوصًا حاجی وارث علی شاہ صاحب سے جن کا مزار قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں ہے، غائبانہ عقیدت رکھتے تھے۔

یورپ کے قیام نے اقبال کی شاعری کے میدان کو نئی وسعت دیدی اور اُن کے خیالات میں ایک نئی لطافت اور نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ اُن کی بہترین اُردو نظمیں غالبًا وہی ہیں جو انہوں نے یورپ سے مراجعت کے بعد یعنی ۰۸ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان لکھی ہیں۔ اس دور کی چند ابتدائی نظموں میں وطنیت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کی نظم "ہندوستاں ہمارا" ایک زمانہ میں شمالی ہند کے وطن پرست حلقوں میں بہت مقبول ہوگئی تھی۔ لیکن اقبال نے بہت جلد اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ مسلمانوں میں جب تک احساس ملّی پیدا نہ ہو وہ اپنے وطن کو قومی بنانے میں کوئی حصّہ نہیں لے سکتے۔ نیز وہ ان خرابیوں سے بھی آگاہ تھے جو یورپ میں قوم اور وطن کی بیجا پاسداری کی وجہ سے روز بروز زیادہ نمایاں ہوتی جارہی ہیں اور مسلمانوں کو ایسی تنگ نظری سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اُردو زبان کو جو ایک محدود الاثر زبان ہے ایک حد تک ترک کر کے فارسی کو اختیار کیا جو مشرق قریب اور وسط ایشیا میں کم و بیش رائج ہے۔ اس لئے وہ فلسفہ اور شعر و سخن کے خلوت خانہ سے باہر نکلے اور سیاست کے میدان میں گامزن ہوئے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور ایک نہایت بصیرت افروز خطبہ صدارت پڑھا جو مسلمانانِ ہند کی سیاسی تمناؤں کا بہترین عکس ہے۔ جب پنجاب کے مسلمانوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو اقبال کو اسکا صدر بنایا اور مرنے سے چند روز قبل تک صوبہ پنجاب کی مسلم لیگ کی عنان قیادت انکے ہاتھ میں تھی افسوس ہے کہ صحت کی خرابی اور بعض دوسرے اسباب نے ان کو کسی مستقل سیاسی خدمت کی مہلت نہیں دی۔ لیکن بحیثیت مجموعی میرا خیال ہے کہ سر سید احمد خاں کے بعد سے کسی مسلمان نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کیلئے اتنا کام نہیں کیا جتنا سر محمد اقبال نے کیا ہے۔

اقبال مرحوم کی ذاتی عادات اور اخلاق سادگی اور خلوص کا نمونہ تھے۔ دنیوی ثروت و وجاہت نصیب ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے رہنے سہنے کا طریقہ ہمیشہ بہت سیدھا سادہ رکھا۔ پرانے تعلقات کا بہت پاس کرتے تھے اور انکے حلقۂ احباب میں ہر ایک طبقہ اور مشرب کے لوگ شامل تھے۔ ان کا ایک ملازم علی بخش نامی تھا جو اُن کے طالب علمی کے زمانہ سے ان کی خدمت میں تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے آخر وقت تک اُن کے ساتھ رہا۔ اس زمانہ میں آقا اور ملازم کی ایسی دیرپا وابستگی کی مثالیں غالبًا بہت شاذ ہیں۔ ان کے اوقات فرصت کا پسندیدہ مشغلہ کتب بینی تھا۔ لیکن اگر کوئی صاحب ذوق شخص باتیں کرنے کو مل جائے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو ہمیشہ جدّت خیال اور وسعت معلومات سے متصف ہوتی تھی۔ لیکن اس میں ظرافت اور مزاح کا عنصر بھی شامل تھا جس سے سُننے والے کی طبیعت شگفتہ رہتی تھی۔ وہ کبھی کسی شخص کے متعلق معاندانہ خیالات کا اظہار نہیں کرتے تھے اور اپنے معاصرین کی توصیف میں ہمیشہ فراخدلی سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح

اپنے پیشرو شعرا کی داد دینے میں بھی کوئی کمی نہیں کرتے تھے اور ان میں سے بعض کے کلام سے استفادہ کرنیکا مخلصانہ پیرائے میں اقرار کرتے تھے۔ اُردو شعرا میں غالب، انیس اور داغ کے خصوصیت سے مدّاح تھے۔ فارسی شعرا میں جلال الدین رومی۔ عرفی اور عبدالقادر بیدل سے زیادہ عقیدت تھی۔ انکے خیال اور شاعری پر جرمن فلاسفہ خصوصاً ابتدا میں ہیگل اور آخر میں نیٹشے کا بہت پرتو پڑا تھا لیکن وہ تقلید کی بندشوں سے بالکل آزاد تھے اور جو کچھ دوسروں سے لیتے تھے اُس کو بالکل اپنا بنا لیتے تھے۔ اگر ان کو شاعری کے کمال سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو انکے معاصرین میں کوئی اُن جیسے دل و دماغ کا آدمی نہیں دکھائی دیتا۔

مرزا محمد سعید

غم کا ترانہ

خاموش ہے لحد میں جادو بیاں ہمارا — ہم کاش اُس سے سنتے "ہندوستاں ہمارا"
ہر درد لب پہ نالے، سینے میں حیند چھالے — اقبال تیرے غم میں دل ہے تپاں ہمارا
کیوں روٹھ کر گیا ہے او کس جگہ گیا ہے — بیچین کر رہا ہے دردِ نہاں ہمارا
او سونے والے اُٹھکر اکبار پھر یہ کہدے — "خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا"
پُرجوش ایک نغمہ پھر لحن سے سنا دے — منزل پہ جا رہا ہے اب کارواں ہمارا
اب تک فضا میں تیری آواز گونجتی ہے — "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا"
ہم تجھکو بھول جائیں، کس طرح بھول جائیں — نعروں سے تُو نے توڑا خوابِ گراں ہمارا
ہم سُن رہے ہیں بیشک تو ہم سے کہہ رہا ہے — اشعار سے رہے گا نام و نشاں ہمارا
پیغام جو ہے اُس کو اشعار کہہ رہے ہیں — ظاہر میں چھپ گیا ہے جادو بیاں ہمارا
اُسکی زباں کے قصّے سُن لیں گے دوسرے دن — خاموش ہو گیا ہے افسانہ خواں ہمارا

بس اے رسا کہاں تک اشعار اب لکھوگے
باہر نہ ضبط سے ہو دردِ نہاں ہمارا

قطعہ تاریخ انتقال سر اقبال در صنعت تعمیہ

سر اقبال دُنیا سے آج اُٹھ گئے — حواس اب کہاں ہیں کہاں ہوش ہے
سرِ اشک حسرت سے میں نے رسا — یہ لکھا "سر اقبال خاموش ہے"
ا — ۱۳ ۵۶

محمد اقبال

شخص اور شاعر!

ڈاکٹر اقبال ابدی راحت کے آغوش میں پہونچ گئے۔ اس دنیوی زندگی کے دوران میں ان کی حیات ابدیت کے نور سے درخشاں و تابندہ تھی۔ اس لئے یہ انتقالِ جسم وجاں اُن کے لئے کسی طرح نقصان و زیاں کا باعث نہیں ہوا مگر ہم لوگ کس طرح اپنے دل کو تسلی دیں جو اقبال کو اپنے درمیان نہ پاکر کچھ نہیں، بہت کچھ کھو بیٹھے ہیں۔

زمین نے اپنے آغوش میں اس زمزمہ سنج شاعر کو ہمیشہ کے لئے چھپالیا جسکے نغموں میں ہم زندگی کی تڑپ، اُمیدوں اور آرزوؤں کی تابناک تجلیاں پاتے تھے جس کے شعری کمالات میں طوفان وحوادث روزگار اور اسرار کائنات کا حل پایا جاتا تھا، وہ شاعر جو ساری عمر ہمیں نغمے سناتا اور آلام وحوادث روزگار سے بہادرانہ نبرد آزمائی کرتے ختم ہوگیا۔ ہم اسے کیونکر بھول جائیں، کیونکر فراموش کریں کہ وہ کیا تھا ــــــ ایک جری رُوح جو موت کو ریاکاری پر ترجیح دیتی تھی، ایک روح جو ہمیشہ اپنے ساتھ صادق رہی جو دباؤ سے دب نہ سکتی تھی کیونکہ وہ ایک ایمان پختہ اور اساس محکم کی مالک تھی اور جو کچھ دُنیا کو پیغام دیتی تھی، جرأت، اخلاص مندی اور ایمان کامل کے ساتھ دیتی تھی۔ ایک ایمان محکم اس کی شاعری کا جوہر تھا، اس کی شاعری جو دُنیا کے لئے سرمایہ لذت جیتی تھی، اس کا دماغ اسرار وعلوم کی گہرائیوں تک پہونچنے والا تھا، اسکی نظر، جمالیات کا بیدار حس لیکر آئی تھی اور دُنیا کے سامنے ایک سلاست و رعنائی کے ساتھ ان احساسات کو سلکِ جواہر کی طرح پیش کرتی رہتی تھی۔ لاریب وہ ہستی اب ہم کہاں سے لائیں، وہ دماغ اب کہاں پیدا، وہ رُوح اب کہاں ہویدا جو ہماری زندگیوں کی روشنی تھی۔ وہ گفتار وتکلم کہاں سے لائیں جو اس بھیانک خاموشی کو جو اقبال کی موت نے پیدا کردی ہے توڑ سکے ــــــ!

اقبال کی طبع موزوں! طباع اور ذہین روحیں قدرت سے ہمہ گیری وہمہ دانی کی دولت لیکر آتی ہیں، جیسے شباب قوت کی گرفت ہمہ گیر ہوتی ہے اور دلوں کو گرماتی ہے اسی طرح طبع موزوں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی طبع موزوں ان قدرتی جواہر سے مالامال تھی۔ ان کی ذہانتِ بلیغ ازحد اخلاص مند بجذبہ پرجوش اور متین ومحکم تھی۔ یہ جوہر کمال کھلاڑی کے ہنر اور کرتب کی طرح دلوں کو محظوظ کرنے کا باعث و ذریعہ نہ تھا اور نہ کسی عجیب تحفہ کو دیکھکر ہمیں حیران وششدر کردینے والی کوئی سطحی دلبستگی اس میں پائی جاتی تھی بلکہ جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے اقبال میں ایک متین ومحکم علو جذبات اور پُرشکوہ وقار تصور تھا۔ آپ کو زبان پر کامل عبور حاصل تھا مگر ردیف وقافیہ کی مہمل بندشوں اور اظہار جذبات میں حائل ہونے والی لسانی قیود کو وہ درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ جمالیات کے صحیح تصوّر نے ان کو کبھی تنہا نہیں چھوڑا لیکن ان کے تصوّر میں حُسن کی نزاکتیں صرف تیتری کی رنگینیوں کا نام نہ تھیں۔ آپکے عقیدے میں علم وعرفان، حیات کی تکمیل کے لئے ضروری اسباب تھے مگر دبستانی (academic) اور تدریسی نظام جدید نے کبھی آپ پر رعب طاری نہیں کیا کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ علم وعرفان بغیر ایمانِ محکم کے بیکار محض ہیں، اسلئے

آپ صحیح علم اور بیدار احساس کے ہمیشہ قائل رہے۔ آپ کو عرفانِ نفس پر بھروسہ تھا اور یہ دراصل ان کے مذہب کا ایک دوسرا پہلو تھا۔ وہ مذہب جو خدا، رسول، قانون، اور سوسائٹی کا مذہب و مسلک عمل تھا۔ اقبال اپنے عہد کا زبردست شاعر تھا مگر دوسرے شعرا اس سے یوں خائف تھے کہ وہ ان کے مقابلہ پر بہت علم رکھتا تھا۔ بہت زیادہ جانتا تھا اور بہت بڑا احساس اشیا لیکر آیا تھا جو کم انسانوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اقبال ایک جید عالم بھی تھا مگر علم ایمان سے ذرا کترا کر نکلنا چاہتا ہے مگر اقبال نے علم کو ایمان کی حصار بندی سے متجاوز نہ ہونے دیا۔ اقبال میں جوش مذہبی اور احساس دینی بہت شدت کے ساتھ پایا جاتا تھا لیکن نام نہاد علمائے مذہب کی نظروں میں وہ ہمیشہ اپنی اخلاص مندی اور صدق گفتاری کے باعث معتوب رہے کیونکہ وہ لوگ تو مذہبی موشگافیوں میں رہے اور مذہب کی روح کو سمجھنے ہی نہ پائے اور اقبال نے منزل کو پالیا۔ جو اس سے اکتساب عرفاں کر سکتے تھے انہوں نے کیا اور ان کی بڑائی کو تسلیم کیا۔ بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیائے اسلام میں جمال الدین افغانی کے بعد جس نے اسلام میں جدید بیداری اور اپنی ہستی کے احساس کی بنیاد رکھی تھی، آج تک کوئی دوسرا دماغ سوائے اقبال کے پیدا نہیں ہوا —!

دوسرے معیار! ڈاکٹر اقبال جیسی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں بنائی نہیں جا سکتیں۔ آپ کے والدین، خاندانی حالات اور ابتدائی زندگی کے واقعات اس قدر عام گفتگو کی چیزیں ہیں کہ یہاں انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ڈاکٹر اقبال کشمیری پنڈتوں کے ایک خاندان یعنی سپرو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو آج سے کوئی دوسو برس پہلے مسلمان ہوا تھا۔ خاندان اور مراسم و روابط حیات نے آپ کو علم و بصیرت کے اکتساب میں بہت مدد دی اور ایک نومسلم کے دل و دماغ پر جو مذہبی جوش طاری ہوتا ہے وہ اور بھی ابھر گیا۔ نسلوں کے امتداد نے اسے کند نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ اقبال کا شاعرانہ جوہر ابتدائے حیات ہی میں چمکنے لگا تھا مگر ایک قوی دل و دماغ حساس تصور اور اپنی ہستی کو برتر دیکھنے اور کام میں لانے کی جستجو نے انہیں رسم و رواج اور قیود و روایات سے یکسر آزاد بلکہ باغی بنا دیا۔

آپ نے اپنے معیار تراشنے اور ان کو منوانے کی سعی کی نیت کے خلوص بات کی سچائی حکمت عرفان کی فراوانی اور بصیرت تصور نے انہیں ہر جگہ اپنے لئے ایک جگہ بنانے میں مدد دی۔ ادب اور شعر سے ماورا انہوں نے سوچنے اور فکر بلیغ سے آسودہ کرنے کی کوشش کی۔ جادہ عام اور مذاق عمومی کو نظر انداز کر کے اکتساب اور احساسات زندگی سے امنگ پیدا کی اور اس امنگ سے فکر و کمال کے ایسے ایسے نادر بت تراشے کہ دنیا حیرت میں رہ گئی۔ وہ کمالات واسرار جو نہ صرف کلچر کی بنیاد ہیں بلکہ ساری انسانیت کی تہذیب و آرائش جن پر منحصر و موقوف ہے۔

اسلام کی زمزمہ سنجی! یہ وہ معیار تھے جو شاعر کو جس قدر صاف اور واضح ہوتے گئے اس کی زندگی کا جزو اور زاویہ نگاہ کا موضوع بنتے چلے گئے۔ کچھ لوگ ہیں جنہیں اس کا ملال ہے کہ اقبال "وطنیت" سے "فرقہ پرستی" کی طرف جھک گیا تھا۔ یہ تبدیلی ایسے شاعر میں ممکن ہو جو شعر کسی خاص جذبہ کے ماتحت کہتا ہو لیکن ایک ملہم حقیقی اور فکر آفریں نکتہ رس شاعر کے ہاں ممکن نہیں، مذہبی کردار کی طرح شاعر ہستی کو بھی "عرفان و بصیرت" کی جستجو ہوتی ہے۔ اس کی آرزو بھی یہ ہوتی ہے کہ "اسرار خودی" معلوم کرے۔ اس لئے نقاد یہ نہیں کہہ سکتا کہ شاعر اپنے آپ کو کہاں پہونچکر پائیگا۔ اس کی منزل عرفان و بصیرت کس جادہ پر پائی جائیگی یہ چیز اس قدر نازک ہے کہ خود شاعر ہی اس کا بہترین عارف و شارح ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر اقبال کے ہاں جو تحت

شعوری انقلاب ہم دیکھتے ہیں وہ ان کے قیام یورپ کی یادگار ہے اور ہندوستان کے حالات و حوادث نے ان کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ کیونکہ جس وقت علامہ مغفور یورپ سے واپس آرہے تھے سسلی کے اسلامی کھنڈرات نے آپ کے قلب پر ایک خاص اثر چھوڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور ان کی زمزمہ سنجی اسلامی ہوگئی۔ ہاں، بیشک ہوگئی مگر کس قدر محکم کس قدر بلند آہنگ۔ پُرخلوص، پرجوش اور تعمیری و تخلیقی۔ ڈاکٹر اقبال تکمیل اور تہذیب و کمال کے طلبگار تھے، اور یہ سارے عالم کی آرائش و فلاح کا سوال تھا۔ یہ چیز کسی قوم یا خاص ملت کے وقتی سیاسی مسلک سے بہت زیادہ نفع بخش اور کرم آفریں کام ہوتا ہے۔ نقاد اس معاملہ میں غلطی پر ہے جب وہ یہ حکم لگائے کہ شاعر کی موجودہ قدر و قیمت کا اندازہ اس کے آخری نتیجہ خیز اور نفع بخش کمال سے لگایا جائے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شاعر کی زمزمہ سرائی کس کی حالت کب بدل دے اور اس کی قدر کا معیار نتیجہ آفرینی سے کیونکر متفرق ہو جائے گو شاعر مشرق کا عمومی تصور بین الاقوامی اور عام انسانی فلاح سے ہٹ کر کبھی نہیں ہوا۔

ڈاکٹر اقبال کی اُردو فارسی شاعری مشرق کی عمومی بیداری کا نشان ہے، عُنوان ہے اس ہمہ گیر انقلاب و احساس کا جو عمومی طور پر مشرق میں پیدا ہوا ہے جس کی بُنیاد قدامت کی روایات جمیلہ کے احترام اور اپنے تمدن سے وابستگی پر رکھی گئی ہے اور جو ساری سیاسی اور سماجی پُختت و ریخت کا سبب بن رہی ہے۔

آج کے نزاعات اور مسائل سے ہماری نگاہیں کل کی پوری جھلک دیکھنے سے خیرہ نہیں ہو جانی چاہئیں۔ جو لوگ کل انسانیت کی بھلائی کا نغمہ گاتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ پختہ اور پائیدار تصورات اور نصب العین کے سامنے سر عبودیت جھکائیں۔ بہ نسبت موجودہ لمحہ کیلئے پیدا ہونے والی چیزوں کے جو دوام سے وابستہ نہیں اور عمومی فلاح کے رنگ سے تھوڑی ہوئی ہیں مگر پیوستہ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا کلام صدیوں تک آنے والے صدہا زمانوں تک ہمارے لئے مشعل ہدایت رہیگا گو آج کے جھگڑے آج ختم ہو جائیں گے، وقتی تنازعات ماضی کے قبرستان میں دفن ہو جائیں گے مگر اقبال کے زمزمے ہر وقت دلوں میں لہریں پیدا کرتے رہیں گے۔ آج ہم اقبال کے لئے ماتم کناں ہیں۔ اس اندوہگیں واقعہ سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ اصل اور غیر اصل میں تمیز پیدا ہو جانی چاہئے۔ انسانیت سے اور ان دینوں اور عقیدوں سے جنہوں نے مل کر نوع انسان کی تعمیر کی ہے ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اس مفکر روشن دماغ کی حکمت سے اپنے لئے اکتساب نور کریں گے اور تکمیل ذات کی جستجو کریں گے۔ پختگی کار، جرأت خیال و عمل اور پیکار حیات کے مردانہ دار محاربہ اور مجادلہ ہی وہ چیزیں ہیں جو ایمان کو پیدا کرتی ہیں اور یہی دراصل اقبال کے نغموں کا آہنگ خاص ہیں۔ لاریب تمام زمانوں اور وطنوں کے لئے یہی آہنگ و نغمہ وہ بانگ درا ہے جو کاروان نوع انسانی کو منزل فلاح و عمل کی طرف بُلا رہا ہے۔

ادبی نقطۂ نظر سے شاعرانہ نزاکت تصور کے لحاظ سے کلام کی ڈرامی کیفیت اور لفظوں کے شکوہ کے خیال سے اقبال کے مقابلہ پر کسی اور کو اس وقت سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ اس کے فلسفیانہ پیغام اور حکمت آفریں تصور و گفتار نے اپنے لئے جو جگہ پیدا کر لی تھی اس کے لئے صدیوں تک کوئی قائم مقام نہیں مل سکیگا۔

اقبال کے فلسفہ کا پورا سمجھنا سمجھانا تو ایک عہد کا طلبگار اور یہاں یہ عالم کہ "فرصت کار بار شوق کہاں" لیکن پھر بھی اگر مختصراً کہا جائے تو اس کے فلسفہ کے یہ پہلو نمایاں نظر آتے ہیں:-

اوّل:- اپنی ہستی کا عرفان یعنی خودی کے اسرار کی پوری پوری تفہیم۔ اپنی مشکلات، اپنی جہد، اپنی تکمیل، اور قدرت کی فراواں تقسیم کے

اکتساب کرنے کا سلیقہ اور تعمیر خودی میں ولولہ عمل کا دخل

دوم۔ بین الاقوامی تصورِ حیات جو لازمی طور پر مظلوم اور مفتوح و کمزور افرادِ انسانی کے لئے ہمارے سینوں میں گداز اور بازوؤں میں قوت و حرکت پیدا کر دیتا ہے اور ایک ایسا جذبۂ حب الوطنی بیدار کرتا ہے جو ظالم و جابر کو اسکے حربہ سے روکنے اور نوعِ انسانی کے تحفظ کے لئے بلالحاظ نسل و ملت ہمیں اپنا سارا وجود نثار کر دینے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا آغاز اُردو سے ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی کے لگائے ہوئے پودے کو اقبال نے پروان چڑھایا۔ اور یہ رنگ نظم و شعر اس قدر مقبول انام ہوا کہ ہر جگہ اس کا تتبع ہونے لگا۔ اس کی شاعری کے نقاد اور نکتہ چیں سب سے زیادہ پنجاب میں ہی پیدا ہوئے کیونکہ وہ اس کا وطن تھا اور اپنے وطن میں بقول یسوع کسی پیغمبر کی توقیر نہیں ہوتی۔ اس باب میں جراح صاحب امرتسری نے اپنے بیجا حملوں اور کئی کتابوں کی تصنیف سے خاصی شہرت حاصل کی۔ اپنے پیغام کو تمام دنیا میں فارسی کے ذریعے سنانے کا فیصلہ کیا تو اُردو کچھ عرصے تک بے توجہی کا شکار رہی مگر یکایک پھر اُردو نے شاعر کی توجہ اپنی طرف کھینچی اور دو مجموعے پھر اُردو میں شائع ہوئے۔ اُردو شاعری پر اقبال کے خاص احسانات ہیں کیونکہ انہوں نے ایک ایسا راستہ موضوعات کا پیدا کر دیا ہے کہ پہلے اُردو اس سے عاری تھی۔ غالباً اقبال ہی پہلا شاعر ہے جس نے مزدور، سرمایہ داری اور وطنیت کو شعر کا موضوع بنایا۔ اس کے بعد ان موضوعات کی عام تقلید ہونے لگی۔ مگر اب پنجاب اقبال کی ڈالی ہوئی طرح ادب سے ہٹتا جا رہا ہے۔ بے معنی گیتوں اور "رومان" وغیرہ کے تقلیدی موضوع وہاں کے شعرا کا عام موضوع ہو گئے ہیں۔ مگر جو بات اقبال کے "ترانہ" "نغمۂ شاعر" اور "شکوہ" کو حاصل ہے مدت العمر کسی صنفِ ادب کو ہماری زبان میں حاصل نہیں ہو سکے گی۔ زبان تو اس جلیل القدر محسن سے محروم ہو ہی گئی۔ ہندوستان بلکہ دنیا عصرِ دراز تک ایسا مفکر و صاحبِ نظر اپنے درمیان نہیں پائیگی۔ کیونکہ خود بھی تو یہی کہہ گیا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی میں پڑھا گیا۔)

ظفر قریشی۔ بی۔ اے دہلوی

اقبال اور اسکا فلسفہ

پروفیسر مجیب نے اقبال کے اس جہان فانی سے اٹھ جانے پر کیا سچی بات کہی ہے کہ "ایسے شخص کے لئے جس نے اس آب وگل کی دنیا میں اپنی زندگی کے اکثر لمحات میں ابدیت کی جھلکیاں دیکھی ہوں یہ موت کوئی نقصان نہیں"۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلامی فلسفہ کے مطابق جس کو سمجھنے اور سمجھانے میں اقبال زمانۂ حاضرہ کا سب سے بڑا عالم ہے، جسم کی یہ موت نہ صرف یہ کہ موت نہیں بلکہ یہ ایک ایسی زندگی کا باب ہے جو اس حیاتِ ناپائدار سے کہیں وسیع تر ہے اور اپنے اندر تکمیل شخصیت کے لئے وہ تمام امکانات رکھتی ہے جن کی ایک روح بالیدہ کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ قومیں کیسے مرتی ہیں تو میں کہونگا کہ ان میں سے سوچنے والے دماغوں، محسوس کرنے والے دلوں اور عمل کی دعوت دینے والے باہمتوں کو نکالو۔ وہ قومیں خود بخود مر جائیں گی۔ اقبال نہیں مرا۔ اور اقبال مر بھی کیسے سکتا ہے! جبتک اس کی زندہ جاوید تصانیف موجود ہیں، جبتک اس کا پیغام دلوں کو گرمانے کیلئے باقی ہے اور جب تک اس کا فلسفہ بھٹکتے ہوؤں کیلئے مشعل راہ ہے۔ موت تو اس قوم کی ہے جس میں سے یہ جوہر قابل اٹھ گیا۔ کیا زمانہ ایک صدی میں بھی اقبال پیدا کر سکے گا؟ بدنصیب ہے وہ قوم جس میں قحط الرجال ہو۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی!

مایوس ہونا گناہ ہے، اور جوانمردی کے خلاف بھی۔ لیکن جب ہم حقائق اور واقعات کی روشنی میں اپنی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بھی شاعرِ مشرق کے ساتھ مایوسی کے لہجہ میں کہنا پڑتا ہے۔ دیکھیئے " دگر دانائے راز آید کہ ناید"۔

اقبال زمانۂ حاضرہ کے عظیم ترین فلسفیوں میں سے تھا۔ اس کی شاعری محض شاعری نہ تھی۔ یہ تفریح و تفننِ طبع کی شاعری نہ تھی۔ یہ شاعری کسی فرضی محبوب یا ترک مغبچوں کی زلفیں سنوارنے والی مشاطہ نہ تھی۔ یہ شاعری ان لوگوں کی شاعری نہ تھی جن کے متعلق خود اقبال فرماتے ہیں۔

"عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار"

اقبال نے شاعری سے وہ کام لیا جو شاعری کا صحیح نصب العین ہے۔ اس کی جاندار اور زندہ شاعری نے مسلمانوں کی مردہ قوم میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اسی "نازنین" کے ذریعہ جو انہیں اب تک اپنی مشکیں زلفوں کی خواب آور بو سے تھپک تھپک کر سلاتی رہی تھی وہ مقاماتِ بلند دکھائے جو کبھی ان کے تصرف میں رہ چکے تھے۔ اور اب غیروں کی ملک ہیں۔ جنہیں یہ دور سے مرعوب اور حیرت زدہ ہوکر دیکھتے ہیں اور اکثر اوقات اپنے احساسِ ابتری کو چھپانے کی غرض سے سلف کے کارنامے یاد کرکے اور دوسروں کو یاد دلا کر فخر کر لیا کرتے ہیں۔ اسی شعر کے ذریعے جو کبھی مجنوؤں اور فرہادوں کے لئے افیون کا کام کیا کرتا تھا۔ اقبال نے حیاتِ ابدی کا پیغام دیا۔ نغمۂ جبریل سنایا اور بانگِ سرافیل دی۔

جو لوگ اقبال کی شاعری کی قدر کا اندازہ محض اس کی نوک پلک، خد و خال یا نقش و نگار دیکھکر کرنا چاہتے ہیں غلطی پر ہیں۔ جبتک ہم

پہ یہ حقیقت واضح نہ ہوجائیگی کہ اقبال کی شاعری محض ایک آلہ ہے۔ اس کے فلسفہ کی ترجمانی کا ہماری رسائی اس کی روح اسکی گہرائیوں اور بلندیوں اور اُس کے حسنِ مستور تک ہو ہی نہیں سکتی۔ غدر سے پہلے کی تمام اُردو شاعری کا پس منظر تھا رنگا رنگ بزم آرائیاں، محفل ہائے عیش ونشاط تن آسانیاں، اور تن پروریاں۔ چنانچہ جیسا خارجی ماحول تھا ویسا ہی ادبی سرمایہ رہا۔ غدر نے مسلمانوں کا خارجی ماحول بدلا۔ مگر اب مسلمان فاتحوں کی نظروں میں مغضوب تھے۔ انہیں نظرانداز کیا گیا اور ان سے بے نیازی برتی گئی۔ دوسروں پر نگاہِ کرم ہوئی اور انہیں سہارا دیا گیا۔ کچھ عرصہ اسی طرح گذر گیا۔ اب انگریزی تعلیم کا زمانہ آتا ہے۔ علما اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مسلمان جھجکتے ہیں اور اسے شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مگر سرسید، مولانا حالی اور ڈاکٹر نذیر احمد جیسے بزرگوں کی مساعی جمیلہ آخر مسلمانوں کی اس شکستہ کشتی کو اس بھنور سے نکال کر ترقی کے دھارے پر ڈال ہی دیتی ہیں۔ اسکول بن گئے، یونیورسٹیاں کھل گئیں اور ساٹھ سال کے اندر اندر پھلے پھولے، بنے بنائے، صاف ستھرے اور تمام لباسِ ظاہری سے آراستہ نوجوانوں کی ایک بڑی کھیپ بازار میں آگئی۔ اس زمانہ میں اس جنس کی مانگ بھی کافی تھی چنانچہ کھپت بھی خوب ہوئی۔ مگر قوم کو اس پیداوار سے کیا فائدہ پہونچا۔ کچھ بھی نہیں۔ پہونچتا بھی کیسے! کیا تعلیم کی بنیاد قوم کے ماضی، اس کی روایات یا تہذیب وتمدن پر رکھی گئی تھی! ہرگز نہیں۔ نتیجہ: بیکاری وعریانی ومیخواری وافلاس۔ قوم کو کیسے نوجوانوں کی ضرورت تھی۔ اقبال کی زبان سے سنیئے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے! بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

مگر یہاں ایسی عقابی روح رکھنے والے نوجوان کہاں تھے؟ یہاں موت کا سا سکون تھا۔ قطبین جیسا جمود تھا۔ فتادگی تھی۔ گرانی تھی۔ ہمتیں پست تھیں ارادے سست تھے۔ ماضی سے، بے نیازی کی حد تک پہونچی ہوئی لاعلمی تھی۔ قومی روایات اور اپنی تہذیب وتمدن نشانۂ ملامت "یہ کارگہِ شیشہ گراں" یعنی تہذیبِ قومی، ابھی ادھوری سروں پر سوار۔ یہ تھا وہ پس منظر اور یہ تھا وہ ماحول جس میں اقبال نے آنکھیں کھولیں۔ اس ماحول اور پس منظر کو سامنے رکھکر اقبال کو سمجھئے۔ اس کا فلسفہ، اس کا پیغام اور اس کی شاعری کے مردانہ تیور سب کچھ سمجھ میں آجائیں گے۔

اقبال کے کل فلسفیانہ نظام کا احاطہ کرنا تو اس مختصر سے مقالہ کے بس کا کام نہیں۔ ہمارا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ اقبال کے فلسفہ پر ایک سرسری مگر سلجھی ہوئی نظر ڈال کر اس کے پیغام اور شاعری کے اس اچھوتے ڈھب کو سمجھ لیں جو اس نے دوسرے لوگوں سے الگ ہٹ کر اختیار کیا تھا۔ ڈاکٹر نکلسن فرماتے ہیں "اقبال کے لئے خود شعوری اور انفرادیت ہی اصل اُصول ہے۔ وہ ہمیشہ علمِ ذات، اثباتِ خودی اور ارتقاء نفس کا سبق دیتا ہے۔ اس کا مقصدِ حیات عمل ہے جس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہو"۔

ایک جگہ اقبال فرماتے ہیں "جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی"۔ مگر یہ خودی یا خود شعوری ہے کیا؟ انسان ایک مختصر کائنات ہے۔ اور اپنے اندر ترقی کے لامحدود امکانات رکھتا ہے۔ اس کی ذہنیت یا شخصیت کے تین پہلو ہیں۔ تعقلی، وجدانی اور عملی۔ تعقلی پہلو اپنی ترقی کیلئے سائنس، فلسفہ، منطق اور دیگر علوم چاہتا ہے۔ وجدان کی نشو ونما کیلئے احساسِ صحیح کی روشنی میں خود روحانی اور اخلاقی قوت حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو اس کے حصول میں مدد کرتا ہے۔ انسانی شخصیت کے یہ تینوں پہلو کوئی الگ الگ اکائیاں نہیں۔ بلکہ ایک ہی اکائی کے تین رُخ ہیں۔ اس لئے ایک کی تربیت دوسرے پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اور ایک کی تشکیل دوسرے کی تشکیل کا باعث۔ اپنی اہلیتوں اور گہرائیوں کو سمجھنا اور پھر شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں کے متوازی ارتقاء کے لئے جدوجہد کرنا خودی یا خود شعوری ہے۔

اقبال کی تصنیفات میں جگہ جگہ مختلف طریقوں سے شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔ اور افراط و تفریط کے خلاف تنبیہ کی گئی ہے۔ موجودہ دور علم و سائنس کا دور ہے۔ مغربی فلسفہ و سائنس میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ مگر انجام روحانی اور اخلاقی قوت نہیں بلکہ برعکس اسکے ایک انتشار ہے، بدامنی ہے، کمزوروں کی متاعِ حیات کی لوٹا کھسوٹی ہے اور بین الاقوامی کش مکش ہے کیوں؟ اس لئے کہ مغرب کی ترقی یک رُخی ہے۔ اس کے وجدان کی تربیت صحیح خطوط پر نہیں ہوئی۔ جہاں تک وجدان یا قلب و نظر کا تعلق ہے مغرب اپنے آپ کو بربریت کی سطح سے بلند نہ کر سکا۔ اس کا دل رنگ و نسل کی آلودگیوں سے ملوث ہے۔ مغرب کا علم روشنی نہیں تاریکی ہے۔ اس کا علم اسکے لئے مارِ آستین ثابت ہوا اور ہو رہا ہے۔ ایک جگہ ڈاکٹر اقبال اپنے پیر و مرشد مولا روم سے سوال کرتے ہیں:۔

"چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!"

مولانا روم جواب دیتے ہیں:۔

"علم را برتن زنی مارے بود! علم را بر دل زنی یارے بود!"

سامنے یورپ اور اب اُس کی دیکھا دیکھی جاپان نے علم کا کیا استعمال کیا! کیا اُس نے اسے "تن پہ مارا" یا "من پر" ملک گیری یا جوعِ ارض "علم را برتن زدن" ہی کی تفسیر ہے نہ کہ تربیتِ قلب و نظر کی اسپینوزا کے خیال کے مطابق مرد دانشمند حیات پر نظر رکھتا ہے۔ فلاطون کا خیال ہے کہ عقلمند کی نظر صرف موت پر ہونی چاہیئے۔ مگر اقبال فرماتے ہیں:۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ زمانۂ حاضر کا انسان۔ ع "عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا"!

کیا یہ ترقیٔ علم و ہنر بغیر وجدانِ صحیح کے مسائلِ حاضرہ کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے! لینن خدا کے حضور میں کھڑا ہے اور عرض کرتا ہے "الٰہی! جب تک میں خیمۂ افلاک کے نیچے جیا میرے دل میں ایک بات کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی اگر اجازت ہو تو پوچھوں" کہتا ہے:۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

جب تک علم و عمل سے صحیح وجدان اور پاکیزہ ذوق کا سنجوگ نہ ہوگا، جب تک ہیئے کی نہ کھلیں گی جب تک عقل و علم دل و نظر کے تابع نہ ہونگے اسوقت تک امن و امان، صلح و آشتی معلوم۔ اقبال فرماتے ہیں:۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام

مگر اس تمام بحث سے یہ سمجھ لینا کہ اقبال علم کی ترقی کے خلاف ہے غلطی ہے۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

یوں تو فلاسفۂ یورپ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں علم اپنی رسائی کے اعتبار سے خود محدود و مجبور ہے عقل knowing in itself یعنی اصل شے تک ہماری رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اور ہم حقیقت مجرد یا عقلِ کل کا ادراک نہیں کر سکتے۔ جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ نے اپنی Critique of Pure Reason "تنقیدِ عقل" لکھکر مغربی فلسفیوں کی آنکھیں کھولدیں اور اس نظریہ کی بیخ کنی کر دی کہ عقل اپنی رسائی کے اعتبار سے ہمہ گیر واقع ہوئی ہے اور اُس کی تیز نظریں اشیاء کی سطح سے گذر کر ان کی کنہ و حقیقت تک پہونچ سکتی ہیں۔ مگر اقبال اس سے

آگے بڑھکر کہتا ہے کہ حقیقت یا خدا کا ادراک ہم کر سکتے ہیں مگر عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ قلب و نظر کے ذریعہ۔ بلکہ اقبال کے فلسفہ کی صحیح ترجمانی تو اسی وقت ہوگی جب ہم یہ کہیں کہ خدا کا ادراک ہم اس وقت کر سکتے ہیں جب ہماری خودی کے تینوں پہلو معراجِ کمال تک پہونچ چکے ہوں،

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل　　　اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

اس شعر میں عشق سے مطلب وہی قلب و نظر ہے۔

کشاکشِ پیہم کا دوسرا نام زندگی ہے۔ جینا اور حرکت ایک ہی عمل کے دو مختلف نام ہیں۔ جمود اور موت، سکون اور نیند ایک ہی تصور کے لئے دو مختلف اصطلاحیں ہیں۔ اگر زندگی جئے جانے کے لائق ہے تو زندوں کی طرح زندہ رہنا چاہیئے۔ جب تک علم و وجدان دونوں کو عمل کے ذریعے متشکل اور متجسم نہ کیا جائے دونوں مُردہ ہیں۔ رہبانیت یا ترکِ دنیا خودکشی اور بزدلی ہے۔ اپنے ایک مضمون "فلسفہ سخت کوشی" میں جو ایک خط کی صورت میں ڈاکٹر نکلسن کو لکھا تھا، فرماتے ہیں: "میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاعِ گرانمایہ ہے جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی مختلف صور و اشکال کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوّف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو مردود قرار دیا ہے۔"

علمی مشاغل اور متصوفانہ ریاضتوں کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انسان مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض عالم یا حکیم جنہیں زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ اپنے حجروں میں بیٹھے جنّتِ ارضی بنانے کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ ایسے [illegible] صفحۂ کاغذ پر تو بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ہوتے ہیں وہ ہوائی قلعہ جن کی بنیادیں واقعات کی ٹھوس چٹانوں پر نہیں ہوتیں بلکہ ان فلسفیوں کے مفروضہ نظریوں پر ہوتی ہیں۔ وجہ یہ کہ فلسفی نے عملاً تو کبھی اپنے ان نظریوں کو اس عملی دنیا کی سخت حقیقتوں سے ٹکرا کے دیکھا ہی نہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب　　　ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملّت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی　　　ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

راز ہے راز ہے، تقدیرِ جہانِ تگ و تاز　　　جوشِ کردار سے کھُل جاتے ہیں تقدیر کے راز

"جوشِ کردار" جسے "تقدیرِ جہانِ تگ و تاز" کی کلید بنایا ہے۔ وہی خودی کا عملی پہلو ہے۔

ایک نظم میں جس میں روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، انسان کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　　جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

ایک اور شعر میں اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے:-

ہو شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام　　　سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

بے عمل ہندوستانی طالبِ علم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو — کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

یوں تو اقبالؔ کا فلسفہ اور پیغام کسی قوم، ملک، نسل یا مذہب کے لئے مخصوص نہیں مگر اس نظام فلسفہ کے بعض حصص ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لئے لکھے گئے ہیں اگرچہ ان کا اطلاق یکساں طور پر دنیا کے ہر حصہ پر ہوتا ہے۔ فلسفۂ عمل ہندوستانیوں کے مرض کا واحد علاج ہے۔

اقبالؔ کے فلسفۂ عمل کا ایک نہایت اہم جز تصادم ہے۔ وہ پیکار کو بُرا نہیں سمجھتے بشرطیکہ اس تصادم سے بنی نوع انسان کی نشوونما متصوّر ہو۔ فلسفۂ سخت کوشی" میں فرماتے ہیں۔ "میرے عقیدہ میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصوّر کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے کل کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی اور ارتباط کی صورت میں رونما ہوگا۔ دراصل بقائے شخص اور زندگی کے علو و ارتقا کے لئے تصادم نہایت ضروری ہے"

مگر اس تصادم کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کمزور کو طاقتور کچل ڈالے، غریب کو دولتمند کھا جائے یا مزدور کا لہو سرمایہ دار پی جائے۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے فرماتے ہیں "میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہے"

اقبالؔ کے نزدیک کمزور ہونا خود ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ کمزور رہنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم طاقتور کو ظلم کا موقع دے رہے ہیں۔ حقیقت میں مظلوم ہونا ظالم بننے سے زیادہ قابل نفرت چیز ہے۔ فرماتے ہیں :-

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ایک بھُنے ہوئے تیتر کو دیکھ کر ابو العلا مصری کی زبان سے کہلواتے ہیں :-

اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو — تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو — دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!

اقبالؔ کے نزدیک عمل کی بُنیاد اعتماد نفس یا راسخ عقیدے پر ہے۔ اس کا منتہا عشق یعنی نوع انسان سے محبت ہے۔ اثباتِ خودی عمل کا جزو لاینفک ہے۔ راسخ عقیدے کے بغیر عامل ایک ایسے راہرو کی طرح ہے جس نے اپنی راہ گم کر دی ہو اور ادھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہو۔ ایسے شخص کی کوئی متعین راہ نہیں۔ وہ چند قدم ہر راہرو کے ساتھ دوڑتا ہے اور پھر ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اس کے لئے زندگی کی مختلف راہیں بھُول بھلیاں سے کم نہیں۔ راسخ عقیدہ اور اعتماد نفس عمل اور زندگی کی محکم اور استوار بنیادیں ہیں۔ یہ نہیں تو اساسِ زندگی متزلزل ہے۔ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں :-

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی — یقیں اللہ مستی خود گزینی
سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار — غلامی سے بتر ہے بے یقینی

قوموں کی ترقی، اُن کی نشوونما اور اُن کی نجات اسی وقت ممکن ہے جب عمل کی عمارت یقینِ کامل، اعتماد راسخ اور اعتماد نفس پر

کھڑی کی جائے۔ فرماتے ہیں:۔

منے یقین سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز　　نصیب مدرسہ یارب یہ آبِ آتش ناک

راسخ الاعتقادی اور اعتمادِ نفس کا لازمی نتیجہ اثباتِ خودی (self-assertion) ہے۔ جرات و ہمت مردانگی کے جوہر ہیں۔ اثباتِ خودی کے معاملے میں اقبالؔ اس قدر جری واقع ہوا ہے کہ خُدا کے مقابلہ میں ابلیس کی جُرات کی داد دئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ جبرئیل و ابلیس کے مکالمہ کے چند شعر ہیں:

جبرئیل:۔　کھودئے انکار سے تونے مقاماتِ بلند　　چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس:۔　ہے مری جُرات سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو　　میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کے تار و پو!

دیکھتا ہے تُو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر　　کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تُو

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے　　قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہُو؟

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح　　تُو فقط اللہ ہُو۔ اللہ ہُو۔ اللہ ہُو

اس تمام جد و جہد اور کاوش و کوشش کا ماحصل عشق ہے۔ عشق زندگی کا جوہر ہے۔ عشق کائنات کی رُوح ہے۔ عشق ہی آفرینشِ کائنات کا سبب تھا۔ اور عشق ہی مقصدِ کائنات ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کھول کے کیا بیاں کروں سِرِّ مقامِ مرگ و عشق　　عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی　　کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عشق کی ہمہ گیری ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں:۔

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا　　اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰے　　عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گُل تابناک　　عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

ڈاکٹر نکلسن کی مساعی سے مغرب مشرق کے اس فلسفی شاعر سے روشناس ہو چکا ہے۔ آج مغرب بین الاقوامی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہے۔ رنگ و نسل کے امتیازات، ملک گیری اور کشور کشائی کی بھوک اور قوت کے نشہ نے انسانوں کو بھیڑیوں میں بدل دیا ہے۔ سائنٹفک آلاتِ حرب نے ان انسان نما درندوں کے خوں آشام چنگلوں کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے۔ بعض ایک دوسرے کے گلوں پر جھپٹنے کے لئے موقع کی تلاش میں تیار بیٹھے ہیں اور بعض حملہ آور ہو چکے ہیں۔ بعض ان "کفن کھسوٹوں" میں تقسیم تیور کر کے عارضی صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن قلب و نظر کی کم ذوقی بلکہ کور ذوقی، بین الاقوامی امن و امان میں سنگِ راہ ثابت ہو رہی ہے۔ اقبالؔ کا پیغام مغرب کے لئے امن و آشتی کا پیغام ہے۔ اور اس کا فلسفہ اس امن و آشتی کی بنیاد۔ مشرق کیلئے اقبالؔ کا پیغام خود شعوری، اثباتِ خودی، عمل، آزادی اور حریت کا پیغام ہے۔

(ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی میں پڑھا گیا)　　ممتاز حسین۔ بی۔ اے، بی۔ ٹی

آہ اقبال!

یہ بھی منظور تھا فطرت کو کہ اک دن اقبال
صبحدم عالمِ فانی سے گذر جائے گا

اپنے نغموں سے دلوں کو تو کرے گا زندہ
اور خود، موت جب آئیگی تو مر جائے گا

رفعتِ زیست پہ پہونچے گا، پہنچ کر آخر
اس طرح موت کی پستی میں اتر جائے گا

آئے گا عشرتِ جاوید کا لیکر پیغام
جامِ عالم وہ مئے درد سے بھر جائے گا

دہر کی بے سروسامانی پہ ہوگا مغموم
دہر کو بے سروساماں بھی وہ کر جائے گا

چھپ گیا مہرِ درخشانِ ادب، صد افسوس
ماتمی سب ہیں محبانِ ادب، صد افسوس

کیا ہوا آج جو اقبال نہیں محفل میں
بے نمودی میں بھی اُس کی ہے عجب شانِ نمود

اُڑ گیا طائرِ ناشاد قفس آخرِ کار
کس طرح بندۂ آزاد ہو پابندِ قیود

وہ نہیں، یاد تو باقی ہے دلوں میں اُس کی
چشمِ حق بیں کیلئے تو ہے یہی حسنِ وجود

"بالِ جبریل" کا سایہ ہے کہیں "ضربِ کلیم"
رہنمائی کے لئے "بانگِ درا" ہے موجود

آج یہ ہو ہی گیا اہلِ فلک پر ثابت
اُس کا پیغام نہیں اہلِ زمیں تک محدود

مر گیا زندۂ جاوید ہوا اب اقبال
لے حوالے تری رحمت کے ہے یارب اقبال

نیّر فتح آبادی

نوحۂ اقبال

سوگ میں ڈوبی ہوئی ہے آج پھر دنیائے ہند | بن گیا ہے ہند اک ماتم کدہ اے وائے ہند
سرنگوں علم و ادب کا پرچمِ اقبال ہے | ہر لبِ پیر و جواں پر ماتمِ اقبال ہے
تھا جو آگاہِ رموزِ شعر و حکمت چل بسا | جس کو کہتا تھا جہاں نباضِ فطرت چل بسا
لیلیٰ مشرق سے کہدو زلف کو برہم کرے | شاعری ہو چاک داماں، فلسفہ ماتم کرے

می چکد سیلابِ خوں از دیدۂ گریانِ ما
ایں چہ قہر آورد بیداد فلک برجانِ ما

جانشینِ غالبِ رنگیں نوا کس کو کہیں! | اُٹھ گیا اقبال! فخرِ ایشیا کس کو کہیں؟
زندگی کے رازِ سربستہ کو سمجھائیگا کون؟ | عالمِ تاریک میں شمعِ خودی لائے گا کون؟
کس کی فکرِ نکتہ رس دیگی پیامِ انقلاب؟ | کس کے ہاتھوں آئیگا گردش میں جامِ انقلاب؟
کون طبعِ سادۂ مزدور کا غم کھائے گا؟ | کون مکرِ خواجگی پر طعنہ اب فرمائے گا؟
کون اُٹھے گا جہاں کی کارسازی کیلئے؟ | کس کے لب وا ہونگے درسِ شاہبازی کیلئے؟
کس کی درویشی کریگی سطوتِ سلطاں سے جنگ؟ | معرکہ آرا رہے گا کون بے تیغ و تفنگ؟
سعی فرما کون ہوگا، شادکامی کیلئے؟ | کون مرہم لائیگا زخمِ غلامی کے لئے؟
کس کو خوں رلوائیگا عہدِ زوالِ اسلام کا؟ | آخری دم تک کسے ہوگا خیال اسلام کا؟
ایک مدت سے رہینِ خواب ہے تقدیرِ شرق | ہوگی کس کے جذبۂ بیدار سے تعمیرِ شرق
کون اب ہم سے کہیگا وارداتِ عشق کو؟ | کون اب پلوائیگا آبِ حیاتِ عشق کو؟
کس کے ذہن و فکر ہونگے کاشفِ ایمائے عشق | کون سمجھا جائے گا پیغمبرِ دنیائے عشق

سرخوشِ پیمانۂ رومی کہو اب کون ہے | وارثِ خمخانۂ رومی کہو اب کون ہے

کس کو اب جا نہیں، کسے اب ہم کہیں غمناکِ ہند
کس لئے خاموش ہے کچھ بول بھی اے خاکِ ہند

رحمتِ حق تیری رُوحِ پاک پر ہو بے شمار
اے حکیمِ وقت اے مُلکِ سخن کے تاجدار

اک جہاں کو زندگی کا رازداں تُو نے کیا
زندگی کی آگ کو شعلہ فشاں تُو نے کیا

جس میں پنہاں اک جہانِ تازہ کی تشکیل تھی
تیری صوتِ نغمہ تھی یا صورِ اسرافیل تھی

خوابِ غفلت سے جگاتا تھا تن آسانوں کو تُو
ہوش کی گویا پلا دیتا تھا دیوانوں کو تُو

یورشِ غم تو نے سمجھی باعثِ شانِ حیات
کھیل تھا تیری نگاہوں میں یہ طوفانِ حیات

تھی نہ دُنیائے سکوں میں دلکشی تیرے لئے
عزمِ سیرِ بحر و بر تھا زندگی تیرے لئے

گرمِ نظارہ کبھی تُو ماہپاروں میں رہا
ماہپاروں سے نکل کر چاند تاروں میں رہا

زندگی تیری نظر میں عرصۂ پیکار تھی!
نغمۂ دلکش تجھے تلوار کی جھنکار تھی

تھا ترا پیغام، انساں فاتحِ دوراں بنے
قطرہ کیوں بنتا ہے، یہ دریا بنے طوفاں بنے

تیری جوئے زندگی کس شان سے بہتی رہی
موت کو تیری زبان حرفِ غلط کہتی رہی

تیز تھا کس درجہ تیرے دل میں احساسِ خودی
پاسِ ایماں کی طرح تجھکو رہا پاسِ خودی

نغمۂ بلبل سے صحنِ باغ خالی ہوگیا
تُو ہوا رخصت کہ رخصت آج حالی ہوگیا

گرچہ اپنے فن میں ہو اُستادِ صیّادِ اجل
ہستیٔ شاعر مگر پھر بھی ہے آزادِ اجل

ضامنِ عمرِ ابد، فکرِ فلک پیمائے تُست
بر بساطِ شعر و حکمت تا قیامت جائے تُست

نہالؔ سیوہاروی

علامہ اقبالؒ کے مختصر حالاتِ زندگی

شاعرِ مشرق علامہ سر اقبال ۱۸۷۳ء کو بمقام سیالکوٹ پنجاب پیدا ہوئے۔ آپ کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تھے۔ دو سو برس ہوتے جب آپکے خاندان نے اسلام قبول کیا تھا۔ آپنے ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں پائی۔ پھر انگریزی اسکول میں داخل ہوئے اور انٹرنس کا امتحان پاس کر کے سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے۔ ایف۔ اے کا امتحان وہاں سے پاس کیا۔ پھر بی۔ اے اور ایم۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج سے پاس کر کے اورینٹیل کالج لاہور میں فلسفہ کے لکچرار مقرر ہو گئے۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور آ کر فلسفہ پڑھانے لگے۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی اور بعد کی دوستی نے اقبال پر اپنا گہرا اثر ڈالا اور فلسفیانہ رنگ میں رنگ دیا۔

اُسی زمانہ میں آپ نے ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی پھر گورنمنٹ کالج سے ۱۹۰۵ء میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر آپ یورپ تشریف لے گئے۔ تین سال وہاں رہ کر کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر براؤن نکلسن، سارلی جیسے اساتذۂ فن سے استفادہ کیا۔ پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مشہور نظم اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کیا اور اس کا دیباچہ اور حواشی لکھکر یورپ و امریکہ کے لوگوں سے روشناس کرایا۔ پھر جرمنی کا سفر کیا۔ وہاں پہونچکر میونک یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ جرمنی میں آپنے ایک محققانہ کتاب لکھی جس پر انہیں ڈاکٹری کی ڈگری ملی۔ پھر لندن یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت ہند نے سر کا خطاب دیا۔

انگلستان کے زمانۂ قیام میں آپنے پبلک جلسوں میں "اسلام" کے عنوان سے چھ لکچر دئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں یورپ سے لوٹ کر ہندوستان آ گئے۔ ۱۹۳۲ء تک لاہور میں وکالت کی۔

آپ کو شاعری کا شوق لڑکپن ہی سے تھا لیکن اصل شاعری اور اس کی دھوم ۱۸۹۹ء سے ہوئی جبکہ آپنے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسہ میں "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک پُر درد نظم پڑھی جس کا اہلِ جلسہ کے دلوں پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے بعد سے شیخ عبد القادر صاحب کے رسالہ مخزن میں اکثر آپ کی نظمیں شائع ہوتی رہیں، جن میں "ہندوستان ہمارا"، "ہمالیہ" اور "نیا شوالہ" بہت مشہور اور مقبولِ عام ہیں۔ اسی وقت سے آپنے خود کو شعر و سخن اور علمی مشاغل کیلئے مخصوص کر دیا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں اقبال کو مدراس میں مدعو کیا گیا جہاں سے لکچروں کے بعد حیدر آباد تشریف لے گئے اور حکومت سرکارِ عالی حیدر آباد دکن کے مہمان رہے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء کو اعلیٰ حضرت حضور نظام سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ فرمانروائے افغانستان نے مدعو کیا۔ ۱۹۳۴ء میں علیگڈھ یونیورسٹی نے اور ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹری کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

اُردو زبان میں آپ کی پہلی کتاب "علم الاقتصاد" ہے دوسری "فلسفۂ ایران"۔ ان کے بعد ۱۹۲۵ء میں "بانگِ درا" کے نام سے آپنے اُردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں اُردو مجموعۂ کلام "بالِ جبریل" کے نام سے اور دوسرا مجموعۂ کلام اُردو جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا وہ "ضربِ کلیم" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بعد فارسی کی دو مثنویاں "مسافر" "پس چہ باید کرد"۔ یہ سب کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔

آپ کی اکثر فارسی تصنیفات اور کلام جرمن، فرنچ اور انگلش زبان میں ترجمہ ہو کر دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکا ہے۔

اقبال اپنے ملک اور اپنی قوم کا درد رکھتے تھے۔ ہندوستان کے عاشق اور مسلمانوں کے فدائی تھے۔ حجاز اُن کی ایک خیالی جنت تھی جس میں اُن کا طائرِ خیال آسودگی کی تلاش میں بار بار پرواز کرتا ہے۔ مسلمانوں کو اُسی سرزمینِ حجاز کا نغمۂ شیریں سُناتے ہیں۔ مگر یہ نغمہ سُلانے والا نہیں بلکہ جگانے والا ہوتا ہے جسے سُنکر ہم نیند سے چونک پڑتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

علامہ اقبال مسلمانوں کے ایڈوکیٹ تھے۔ وہ ایک سچے مسلمان اور سچے رہنما تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی بہت کچھ اقبال کی

رہینِ منت ہے۔ افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کا پیغام، اُن کی رُوح اور اُن کی دُعائیں ہمارے ساتھ ہیں جو زندگی کی تاریک راہوں میں مشعلِ ہدایت کا کام دیں گی اور ہماری ہمیشہ رہنمائی کرتی رہیں گی۔

کرم الٰہی (ادیبِ عالم)

نوحۂ اقبال

جو سرودِ بزمِ حیات تھا، وہ رباب آج خموش ہے
مری بزمِ عیش و نشاط میں نہ وہ جوش ہے نہ خروش ہے

وہ جو کل پیامِ کمال تھا وہی آج صرفِ زوال ہے
کہ تماشہ گاہِ حیات کا یہی ایک سادہ مآل ہے

یہ ندائے مرگِ حبیب تھی جو دلوں میں درد اُٹھا گئی
جو جگر میں تیر چبھا گئی جو نفس میں آگ لگا گئی

مری بزمِ لیل و نہار بھی کسی غمکدے سے بدل گئی
مرے جسمِ ہوش و خیال سے نئی جان تھی جو نکل گئی

نہ حیات تھی نہ ممات تھی وہی ایک موجِ سراب تھی
یم آرزوئے فروغ میں سرِ دیدِ چشمِ حباب تھی

یہ فضائے منزلِ شام میں جو ہنوز شمع فروز تھا
کسی دل جلے کا پیام تھا کسی جاں گداز کا سوز تھا

کوئی رازدارِ حجاز تھا کہ حرم بھی نالہ بکار ہے
کسی غمکدے کا چراغ تھا کہ جہان تیرہ و تار ہے

کوئی رندِ جام بدست تھا کہ نوائے سازِ الست تھا
کوئی مست بادہ پرست تھا کہ خروشِ نغمۂ ہست تھا

وہ روانِ آبِ مقام تھا کہ ہنوز تشنۂ کام تھا
ابھی بے نیازِ سلام تھا کہ سرِ رکوع و قیام تھا

دمِ آبروئے حیات تھا کہ چراغِ زیست جلا گیا
رمِ نازنینِ ممات تھا کہ رہ روی میں چلا گیا

مری فکر و ہوش کی بستیوں میں یہ آگ ہی جو لگی ہوئی
نظر آ رہی ہے ہر ایک طرف مجھے کائنات جلی ہوئی

حبیب نجیب آبادی

اقبال رح

خون نہ ہو سکا جگر، آہ جگر فگار حیف!! قطرۂ اشک دل نہیں، دیدۂ اشکبار حیف!!
ریزش زخمِ دل سے کیوں سر دہوئے نہ مہر و ماہ!! خاک نہ ہو سکا فلک، نالۂ شعلہ بار حیف!!
درد کی کروٹیں ہیں درپئے انقلابِ دہر! بزمِ جہاں ہے مطمئن لے دلِ بیقرار حیف!!
بزمِ فلک نہ ہو سکی آہ شریکِ رنج و غم! اخترِ شب ہیں پُرضیا سینۂ داغدار حیف!!
درد کی تمنیاں ہیں کیوں دل کیلئے دوائے درد! عشرتِ غم ہوئی قبول! اے غمِ ناگوار حیف!!
گردشِ چرخ منقلب کر نہ سکی زمانہ کو! حشر بپا نہ ہو سکا فتنۂ روزگار حیف!!
اہلِ الم سے کیا غرض گردشِ روزگار کو؟ بزمِ جہاں مرے سوا کیوں نہیں سوگوار حیف!!
موت، حیات ہو تو ہو، زندگی، زندگی نہیں!! کھائے فریب بارہا عقلِ فسوں شعار حیف!!

باغ خزاں رسیدہ ہے، باغِ خزاں رسیدہ میں
گُل کی فسردگی کے بعد آمدِ ہر بہار حیف!!

بزمِ جہاں! وہ شاعرِ خلد جبیں گذر گیا!! مژدۂ گوش اب کہاں، جلوۂ ہر نظر گیا!!
کون نفس نفس کو دے دعوتِ "ضربِ صد کلیم" شعلۂ طور ہی نہیں، سوزِ دل و جگر گیا!!
غیب کے راز منکشف کون کرے گا دہر پر؟ شہپرِ "بالِ جبرئیل"!! اب ترا ہم اثر گیا!!
"بانگِ درا" نہیں نفس، منزلِ عمر جاوداں!! قافلۂ حیات اب از سرِ رہگذر، گیا!!
دہر پہ فاش کر دیئے رازِ حیات و موت کے بزمِ جہاں میں بے خبر آیا تھا باخبر گیا!!
پست و بلند راہ سے کون کریگا آشنا، طے ہو رہِ حیات کیا؟ ہاتھ سے راہبر گیا!!

کون سکھائے گا طریق آہ نیاز و ناز کے — سجدۂ شوق کیا کریں؟ ذوقِ جبین و در گیا!!
پیرِ مغاں کے اٹھتے ہی جام و سبو بھی اٹھ گئے — ہوشِ نشاطِ شب نہیں، خوابِ دمِ سحر گیا!!
کون کرشمہ ساز ہو محفلِ حسن و عشق میں — دل ہدفِ نظر نہیں، معرکۂ نظر گیا!!
ساقیٔ روزگار تھا دورِ طرب سے ترش رُو — بزمِ طرب اجڑ گئی، نشۂ مے اتر گیا!!

شکر ہے اہلِ بزم میں کوئی بھی سردِ دل نہیں
نالۂ شعلہ زا ترا بزم میں کام کر گیا

حق کے پیامبر ہمیں تازہ کوئی پیام دے!! — خدمتِ حق کے واسطے ہمکو صلائے عام دے!
رفعتِ مہر و مہ ملے عرصۂ ہر قدم کے بعد — ملتِ تیرہ بخت کو گردشِ صبح و شام دے!!
تنگ ہیں سر دہریٔ ارض و سما سے بادہ کش — بھر کے مئے دو آتشہ ساقیٔ شعلہ جام دے!!
تیز روی کا حکم ہو اب بھی امیرِ کارواں! — نقشِ قدم کو وسعتِ چین و عراق و شام دے
نور کا پھر ظہور ہو، ذرۂ خاک طور ہو — "ضربِ کلیم" کیلئے حوصلۂ کلام دے!!
خلد میں تُو تو ہو گیا صدر نشینِ بزمِ خلد — بزمِ جہاں میں ہمکو بھی اعلیٰ کوئی مقام دے
دل میں بجائے خوں رہے آبِ حیات موجزن — ہر نفسِ حیات کو زندگیِ دوام دے!!
عرصۂ دہر میں ہمیں اذنِ قیام کر عطا — ابلقِ روزگار کے منہ کو ذرا لگام دے!!
مصر و حجاز و ہند ہوں فیض کے تیرے خوشہ چیں — دہر میں اہلِ دہر کو دعوتِ فیضِ عام دے!!

حق ہے پیمبری• ترا، حق کا پیامبر ہے تو
ملتِ بدنصیب کو خلد سے بھی پیام دے!!

تابش دہلوی

• شاعری جزویست از پیغمبری۔

ماتمِ اقبال

مُدت سے مُلکِ ہند میں قحط الرجال ہے　　چھایا ہر ایک قلب پہ حُزن و ملال ہے
ازبسکہ گلستانِ وطن پائمال ہے　　جس پہ نگاہ ڈالئے آشفتہ حال ہے
کس کو سکوں ہے آہ! تہِ آسماں نصیب
درمانِ دردِ دل ہو بھلا یہ کہاں نصیب

جس وقت شش جہات بنے آفتوں کا گھر　　آئے نہ خواب میں بھی کوئی چارہ گر نظر
ماحول کا یہ رنگ ہو پھر کیا کرے بشر　　یکجا ہوں کس طرح سے خیالات مُنتشر
جی ڈھونڈتا ہے کوئی دل آرا ملے کہیں
ڈھارس بندھے جو کچھ بھی سہارا ملے کہیں

وہ قوم کس قدر ہے زمانہ میں دل فگار　　جس کو نصیب ہو نہ سکے کوئی غمگسار
جن ہستیوں پہ اُس کی اُمیدوں کا ہو مدار　　معدوم وہ ہے ہوں وہی صورت قرار
افسوس پھر نہ اُس کا کوئی سر دھرا رہے
تا دیر مُبتلائے غمِ لا دوا رہے

ٹوٹے جو ہم پہ قہر کریں کس طرح رقم　　اک لحہ کیلئے نہیں راحت ہوئی بہم
ان ناگہانیوں سے بڑا ناک میں ہے دَم　　جب سے سنبھالا ہوش یہی دیکھتے ہیں ہم
روشن سیاہ خانہ میں سینے کے داغ ہیں
غم دیدہ پُتلیاں گُھر شب چراغ ہیں

لے دیکے رہ گیا تھا جو اک مردِ باوقار　　نازاں تھے جس کی ذات پہ ابنائے روزگار
مانے ہوئے تھی قوم جسے اپنا غمگسار　　وہ شخص ہم کو چھوڑ گیا ہائے بے قرار
چارہ رہا نہ اس دلِ بے حال کیلئے
ماتم زدہ ہیں حضرتِ اقبال کیلئے

نسیم چغتائی

میں لطف و مسرّت بنا دیتے ہیں۔

ضرورت است بلا دیدن و جفا بردن
نہ دوست آنکہ ندارد تحمّل ہمتا ئے

کسی کے سر پر پتھر پڑیں اور اُسے تکلیف نہ ہو یہ خیال بظاہر بے معنی ہے۔ پتھر کا خیال آتے ہی تکلیف کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن غالب کا یہ شعر پڑھکر۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذّتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

یہی دل چاہتا ہے کہ کوئی حسینہ مل جائے تو اس کے خانۂ سکونتی میں دخل بیجا کی کوشش میں ذرا ہم بھی تو چکھیں کہ "لذتِ سنگ" کس قسم کی ہوتی ہے۔ یا کون نہیں جانتا کہ شراب حرام ہے اور پانی حلال۔ لیکن سعدی جس وقت اس کے حلال و حرام کے متعلق فرماتے ہیں تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ہم اب تک سخت غلطی پر تھے۔ آپ بھی دیکھئے ایک شاعر، ایک صنّاع کس طرح چیزوں کو برعکس کر دیتا ہے ا۔

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم
شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام

الغرض اسی طرح آرٹ کی مختلف خصوصیات کے تحت مختلف شعراء کے دواوین میں سے ہزاروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور پھر فن شاعری کی مخصوص مثالیں علیٰحدہ ہوں گی۔ لیکن ہماری بحث کے لئے اتنی ہی کافی ہیں ورنہ اگر کوئی شخص آپکو خودکشی پر مجبور کرنے کے ارادے سے مثالوں پر اُتر آتے تو شاید حضرت خضر بھی کوتاہیِ عمر کا عُذر کرنے لگیں۔ بہرحال ہم نے آرٹ کو علیٰحدہ بھی دیکھ لیا اور شاعری کی روشنی میں بھی۔

اخلاق اور شاعری

اب ہم اُس بحث پر آتے ہیں جس پر اگر ذرا جراَتِ رندانہ سے کام لیا جائے تو مدعیانِ اخلاق کے ہاتھوں اپنا خُون ہو جانیکا اندیشہ ہے اور اگر دوسرے پہلو پر زور دیا جائے تو آرٹ کا خُون ہو جانے کا خوف ہے۔ مگر جب اس بحث میں اُلجھ ہی گئے تو محض اپنے یا آرٹ کے خُون کے اندیشے سے اُسے "دیکھا جائے گا" کہکر ٹال دینا بھی کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ لہٰذا آیئے یہ بھی دیکھ ہی لیں کہ اخلاق کا شاعری سے کیا تعلق ہے۔ اور کہاں تک دونوں ایک دوسرے کے لئے لازمی ہیں۔ اس کے متعلق ہمیشہ سے دو نظرئیے چلے آرہے ہیں۔ اوّل ہمیں ان دونوں نظریوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ دیکھ لینا چاہیئے پھر اُن کی صحت یا عدم صحت پر آسانی سے بحث ہوسکے گی۔

(۱) سب سے اوّل اخلاق کے مدّعی کہتے ہیں کہ جب ایک شاعر اپنی شاعری کو عوام کے سامنے پیش کرتا ہے اُس وقت اُس قوم کا جس میں وہ رہتا ہے حق ہوتا ہے کہ وہ اس اثر کو دیکھیں جو اُسکے اشعار نے عوام پر کیا ہے اور اس اثر کو ہمیشہ اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اسی حق کا استعمال کرتے ہوئے بعض اوقات وہ کسی کتاب کے متعلق فیصلہ دیدیتے ہیں کہ یہ مخربِ اخلاق ہے کیونکہ اس میں مروجہ اخلاق کے خلاف مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ بعض اوقات وہ کہتے ہیں کہ یہ کتاب بہت زیادہ عُریاں اور فحش ہے کیونکہ اس میں شاعر نے انتہائی بے شرمی اور بیحیائی سے کام لیا ہے۔

(۲) اس نظریہ کے جواب میں جو لوگ صرف آرٹ کے دلدادہ ہیں اُنہوں نے ایک اور نظریہ بنا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ آرٹ خود صنّاع کے الہامات کا اظہار ہے اس لئے صرف وہی اس کی بھلائی یا بُرائی، کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرسکتا ہے۔ اُس آرٹ کا موضوع اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی، مسرورکُن ہو یا مغموم کن اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ صنّاع ایک خلاّق کی حیثیت رکھتا ہے اور باقی تمام انسانوں کو اس کی تخلیق اس طرح قبول کر لینا چاہیئے جس طرح وہ غروبِ آفتاب یا باد و باراں کے طوفان کو قبول کرتے ہیں۔ آرٹ اخلاق سے بے نیاز ہے۔ عوام پر خواہ اُس کا کوئی اثر ہو لیکن خود صنّاع اس کی وجہ سے با اخلاق یا بد اخلاق نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اُس کا واحد مقصد خود کا اظہار کر دینا تھا نہ کہ دوسروں کو متاثر کرنا۔

آرٹ کے حُسن کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ناظرین کے پاس صرف ایک ہی جائز طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جب وہ کسی آرٹ کا مشاہدہ کریں اُس وقت اُنہیں اپنے فطری احساسات کو نہیں ٹٹولنا چاہیئے کیونکہ یہ مسرّت کی جستجو ہوگی نہ کہ حُسن کی، بلکہ اُنہیں اپنے نقطۂ نظر کو بالائے طاق رکھکر صنّاع کے نقطۂ نظر میں جذب ہو جانا چاہیئے۔

یہ دونوں نظرئیے ہمارے سامنے ہیں لیکن یہ کہاں تک صحیح ہیں اس کا ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ آرٹ پر تنقید کرنے کا حق سوائے صنّاع کے کسی کو نہیں کیونکہ شاعر اپنے وجدانات کا

اظہار کرتا ہے صرف اپنی تسکین و مسرت کیلئے ٹھیک نہیں۔ جب وہ اشعار یا اشعار لکھتا ہے، تصانیف پر تصانیف شائع کرتا ہے تو اس سے اس کا کیا مقصد ہوتا ہے؟ اگر اسے صرف اپنی ہی تسکین و مسرت سے غرض ہے تو وہ اپنے تنہا کمرے میں بیٹھکر محض زبان سے اپنے وجدانات کا اظہار کرسکتا ہے۔ لیکن جب وہ قلم اُٹھاتا ہے اور اس اظہار کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ میں مقید کرنے لگتا ہے تو اس سے اس کا کیا منشا ہوتا ہے؟ پھر وہ اپنے ان اوراق کو عوام کے سامنے پیش کر دیتا ہے اس میں اُس کی کیا غرض وابستہ ہوتی ہے؟ کیا اس سے وہ عوام پر بھی اپنے اُن اظہارات کا اثر نہیں ڈالنا چاہتا؟ اور جب ایسا ہے تو پبلک کو حق ہے کہ اس اثر پر غور کریں، اس کی اچھائی بُرائی کو پرکھیں اور پر تنقید کریں۔ اس کے جواب میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں اس سے اس کا مقصد اثر ڈالنا نہیں بلکہ شہرت نام اور بقائے دوام حاصل کرنا ہوتا ہے۔ گویا یہ چیز وہ اپنے آرٹ کے معاوضے میں پبلک سے حاصل کرنا چاہتا ہے لہذا پبلک بغیر اس چیز کو ہر پہلو سے دیکھے ہوئے کس طرح اس کا اس قدر گراں معاوضہ دے سکتی ہے۔ یہ کہنے کا آپ کو کوئی حق نہیں کہ عوام آنکھیں بند کرکے صناع کا منہ مانگا معاوضہ پیش کر دیں۔ آرٹ عین فطرت ہے اور صناع اس قسم کی خلافِ فطرت بات چاہے؟ یہ صناع اور آرٹ دونوں کی توہین ہے۔ لہذا پبلک کا حق ہے کہ وہ اس پر تنقید کریں لیکن کس طرح اور کس نقطۂ نظر سے کریں یہ ہم آئندہ بتائیں گے۔

دوسرا اہم اعتراض جو آرٹ کے دلدادہ پیش کرتے ہیں وہ کروچے کے الفاظ میں یہ ہے کہ "فنون لطیفہ کیلئے خیر، لذت یا منفعت غیر مانوس اصطلاحیں ہیں۔ فنون لطیفہ میں کوئی غایت یا مقصد تلاش کرنا مضحکہ انگیز سی بات ہے۔ فنون لطیفہ کو اخلاق یا اعمال سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ وجدانات کو ترتیب دے کر اور معرض اظہار میں لاکر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اور اظہار تابع ہے الہام کا جس پر ایراد و تنقید کا خود صناع کو بھی اختیار نہیں۔ وہ تو اپنے الہامات کو ظاہر کرنے پر مجبور ہے اسے اس بحث نہیں کہ دنیا اس کو اخلاق آموز سمجھتی ہے یا مخرب اخلاق، اسکو کارآمد مانتی ہے یا بیکار۔" اس طرح کروچے نے اپنے جوش میں فنونِ لطیفہ کو سنائی کے عشق سے جا ملایا ہے کہ:۔

عشق وابستۂ خرد نہ بود
علتِ عشق نیک و بد نہ بود

اب اعتراض کی معقولیت کو چھوڑکر اس کی "مضحکہ انگیزی" پر بھی غور کیجئے۔ جب "فنون لطیفہ کیلئے خیر، لذت یا منفعت غیر مانوس اصطلاحیں ہیں" تو آخر فنونِ لطیفہ ہیں کس مرض کی دوا؟ جب ہم فنون لطیفہ سے نہ مادی یا روحانی خیر کی، نہ مادی یا روحانی لذت کی اور نہ کسی قسم کی منفعت کی توقع رکھیں تو ایسے فنون لطیفہ اُس خشک پتے سے بھی زیادہ بیکار ہیں جو کسی غریب کے کھانے پکانے کے کام تو آسکتا ہے۔ اور اُس بے حقیقت ذرّے سے بھی زیادہ حقیر ہیں جو تھوڑی دیر کے لئے کھڑکی میں سے آنے والی کرن کی روشنی سے جگمگا اُٹھتا ہے۔

ایک مرتبہ بچپن میں جب مکھیوں کو ہمارے ہی پیالے میں گرنے کی ضد سی ہوگئی تھی ہم نے والدہ صاحبہ سے بہت چین بجبیں ہوکر کہا تھا کہ "کیوں امی، اللہ میاں نے ہمیں تو بنایا ہی تھا لیکن ہمیں دق کرنے کیلئے اِن مکھیوں کو کیوں بنا دیا؟" اس پر والدہ صاحبہ نے بڑی توبہ استغفار کے بعد مکھیوں کی افادیت پر ایک بادشاہ کا قصہ سُناکر کہ کس طرح وہ مکھیوں کی بدولت دشمن سے بچا تھا ہمیں ایک مختصر وعظ دے ڈالا جس کے مقطع کا بند تھا کہ "بیٹا اللہ میاں نے اس دُنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں بنائی ہے" تو اس وقت سے آجتک ہمیں برابر اس پر یقین چلا آرہا ہے کہ نظامِ عالم میں کوئی حقیر سے حقیر اور معمولی سے معمولی چیز بیکار اور بلا کسی خاص مقصد کے نہیں ہے۔ پھر جب ہم بقول آپکے "پڑھے لکھے آدمی" ہوگئے اُس وقت یہ بھی اعتقاد ہوگیا کہ انسان کوئی کام بغیر کسی فائدے کو مدِ نظر رکھے نہیں کرتا۔ وہ اتنا خود غرض ہے کہ اکثر اپنی روحانی لذت و منفعت کو بھی محض کسی موہوم مادی فائدہ اور جسمانی لذت پر قربان کر دیتا ہے لیکن آج کروچے صاحب کے نظریہ سے معلوم ہوا کہ ہم اب تک سخت غلطی پر تھے اور دُنیا میں کس قدر مغالطہ دہ اور دغاباز لوگ پڑے ہوئے ہیں کہ ہم جیسے مرنجاں مرنج شخص کو بھی ایک بالکل غلط بات کا یقین دلا دیا۔

اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ فنونِ لطیفہ اس خاموش اور سنسان زمانہ کی ایجاد ہے جب آدم وحوا نے پہلی مرتبہ اس وسیع دُنیا میں قدم رکھا تھا اور انہیں کھانے پینے اور ایک دوسرے کی محبت میں مست رہنے کی لذت اور فائدہ کے سوا نہ کسی اور فائدے اور لذت کا علم تھا اور نہ کوئی کام تو اُس وقت مجبور ہوکر انہوں نے یہ فن بیکاری "ایجاد کیا تھا کہ کسی طرح یہ ہزاروں برس کی عُمر کٹے تو۔

لیکن با وجود یہ فرض کر لینے کے یہ پھر بھی نہیں کہا جا سکتا کہ "فنونِ لطیفہ میں کوئی غایت یا مقصد تلاش کرنا مضحکہ انگیز سی بات ہے" کیونکہ یہ آدم و حوا جیسا وقت کبھی کبھی ہم پر بھی پڑ جاتا ہے جب ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں ہوتی، ملازم آگ دبانا بھول کر بازار چلا جاتا ہے اور ہم حقہ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ دیکھ کر رہ جاتے ہیں اُس وقت دن کاٹنا ہمارے لئے جس قدر مصیبت ہوتا ہے کسی بے صبر سے بے صبر عاشق کیلئے بھی شب فرقت اتنی مصیبت نہ ہوتی ہوگی۔ اُس وقت ہم بھی کوئی مشغلۂ بیکاری لیکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے دوست حقہ کی فکر میں ہمارے کمرے میں آتے ہیں اور ہمیں اِس دیوانگی میں مصروف دیکھکر نہایت ہمدردی سے کہتے ہیں "ارے بھائی حقہ پیا ہوتا۔ اس فضولیات سے کیا فائدہ؟"

"فائدہ ہی کیا۔ صرف وقت گذاری کا مقصد ہے" یہ ہم انہیں جواب دیتے ہیں۔ گویا ہم وہ بیکار سے بیکار کام بھی جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بغیر کسی مقصد کے نہیں کرتے بلکہ نہیں کر سکتے۔ تو یہ کس طرح مان لیا جائے کہ فنونِ لطیفہ کا کوئی مقصد نہ ہو۔

دوسرے یہ مانا کہ "اظہار تابع ہے الہام کا جس پر ایرا د و تنقید کا خود صناع کو بھی اختیار نہیں"۔ لیکن اگر وہ الہام بیہودہ ہے۔ مبتذل اور پست ہے تو اسے یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ اس کا اظہار کر کے عوام کے سامنے پیش بھی کر دے۔ اگر وہ اظہار پر مجبور ہی ہے تو صرف اپنی آنکھوں یا اپنے کانوں کے سامنے اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس پر اگر اس سے کوئی ایک لفظ بھی کہے تو ہم موجود ہیں، قانون موجود ہے، عدالتیں موجود ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی بیہودگیوں کو عوام کے سامنے پیش کرنے پر بضد ہے تو ہمیں اس کا نام نوٹ کر کے پیراکٹر صاحب کو مطلع کر دینا چاہیئے اور ان حضرت کو بھی پیراکٹوریل مانیٹر کے الفاظ میں متنبہ کر دینا چاہیئے کہ "قبلہ آپ سگرٹ اپنے کمرے میں پی سکتے ہیں یا جب سنیما شروع ہونے پر اندھیرا ہو جائے تب پی سکتے ہیں مگر اس طرح بر سرِ عام اور وقفہ کے وقت اس روشنی میں نہیں پی سکتے"۔

دراصل کروچے صاحب اعتراض کرتے وقت یہ بالکل بھول گئے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے حقوق استعمال کرنے کا حق ضرور ہے لیکن صرف اس حد تک کہ دوسرے کے حقوق محفوظ رہیں۔ ورنہ اگر آپ اپنے آرٹ کے بہانہ سے سر بازار برہنہ پائے جائیں گے تو اسکے نتیجہ میں یا تو جیلخانہ ہے ورنہ پاگل خانہ کی مہمان نوازیاں اور قدردانیاں تو کہیں گئی ہی نہیں ہیں۔

اس کے جواب میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آرٹ کا خاص تعلق حُسن و حقیقت سے ہے جس کے بغیر آرٹ آرٹ نہیں رہ سکتا۔ آرٹ اخلاق کا نام نہیں ہے وہ بغیر اخلاق کے بھی آرٹ رہے گا۔ جیسا کہ برگساں کہتا ہے "شاعری کا کام تصوّرات و وجدانات جیسی غیر محسوس چیزوں کو محسوس بنا دیتا ہے۔ بھدّی اور کریہہ چیزیں بھی فنونِ لطیفہ کا موضوع بن سکتی ہیں اس لئے کہ فنونِ لطیفہ کا کام محض حسین چیزوں کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ چیزوں کو حسین پیرائے میں پیش کرنا ہے۔ شاعر کسی بھدّی صورت، کسی غمناک واقعہ یا کسی مخرب اخلاق بات کو حسین اور دلنشیں پیرایہ میں بیان کر سکتا ہے اور یہاں وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے"۔ اس کی تائید کرتے ہوئے سوئنبرن کہتا ہے کہ "ادب کو صرف ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ کسی ادبی تصنیف پر اخلاقی اصول کے ماتحت تنقید کرنا سخت غلطی ہے۔ ادیب کا اصل مقصد مسرّت و انبساط کو حُسن کے ذریعہ پیدا کرنا ہے نہ کہ اخلاقی خوبیوں کی وساطت سے"۔

یہ سب کچھ تسلیم۔ ہمیں واقعی ادب کو ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے اور یہ بھی صحیح ہے کہ آرٹ کا کام محض حسین چیزوں کا پیش کرنا نہیں ہے بلکہ چیزوں کو حسین پیرائے میں پیش کرنا ہے۔ اگر اُن دونوں نظریوں کو ملا دیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آرٹ نام ہے حُسن کے ذریعہ سے مسرّت و انبساط پیدا کرنے کا۔ لہذا آرٹ کو آرٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں اسکو ہمیشہ حُسن کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے یعنی اس سے ہماری تشنگیٔ حُسن دور ہو جانی چاہیئے۔

اب اگر آپ ایک برہنہ عورت کو دیکھیں تو کیا اس سے ہماری تشنگیٔ حُسن دُور ہو جائے گی؟ بڑے بڑے ماہر نفسیات اور ہر قسم کے اطبا اور ڈاکٹروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ منظر (بشرطیکہ آپ کی حالت از دست رفتہ نہیں ہوئی ہے) کسی قسم کی تشنگی دُور کرنے کی بجائے نفسانی تشنگی پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ اور اس تشنگی کے پیدا ہونے کے بعد بس ایک تاریک لمحہ کی ضرورت ہے کہ آپ گناہ کے سمندر میں غوطے کھاتے نظر آئیں گے اور آپ کی رُوح گناہ کی ظلمت میں سر تا سر ملفوف ہوگی۔ کیا یہی ہے آرٹ جو گناہ کے اسفل السافلین کی طرف رہنمائی کرے؟ اس صاف و فطری نتیجہ کو

ٹھہرا کر شاید آپ یہ کہیں کہ نہیں ایک برہنہ تصویر دیکھکر نفسانی تشنگی پیدا نہیں ہوگی بلکہ تشنگیٔ حسن دور ہو جائے گی تو میں پوچھونگا کہ آیا رُوحانی تشنگی یا جسمانی! ایک برہنہ جسم سے رُوحانی تشنگی کو یقیناً کوئی واسطہ نہیں اگر کوئی تشنگی دور ہوگی تو وہ آپ کی نفسانی یا جسمانی تشنگی ہی ہوگی۔ اور ہم آرٹ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اچھی طرح دیکھ چکے ہیں کہ آرٹ صرف رُوحانی غذا مہیا کرتا ہے۔ اُسے نفسانی یا جسمانی احتیاجات و توقعات سے کوئی سروکار نہیں۔ اور جو آرٹ اپنے اس واحد مقصد کو مدنظر نہیں رکھتا وہ آرٹ نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ نتیجہ صاف ہے کہ ایک برہنہ جسم کی تصویر جس میں صناع نے خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کی ہو اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ خود آرٹ کے نقطۂ نظر سے آرٹ نہیں مجسم نفسانیت یا مشتعل گناہ ہو تو ہو۔

دوسرے جب آرٹ کا معیار صرف حُسن ہے اور جس آرٹ سے ہمارے لطیف جذبات کو ٹھیس لگے، ہماری معصوم فطرت کو صدمہ پہونچے، ہماری طبیعت منغض ہو وہ حُسن ہی کب ہوا۔ آرٹ کا مقصد تو مسرت و انبساط پیدا کرنا ہے نہ کہ الم و انقباض۔ اس کے جواب میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر فطرت شناس ہوتا ہے اور فطرت میں ہر اچھائی کے ساتھ بُرائی، روشنی کے ساتھ تاریکی، حُسن کے ساتھ بدنمائی بھی شامل ہے جیسا آگسٹین کہتا ہے کہ "حُسن نام ہے تنوع اور تلون کا۔ زندگی میں جتنی بُرائیاں، جتنی مصیبتیں، جتنی بدنمائیاں ہیں وہ سب حسن کائنات کے عناصر ترکیبی ہیں۔ حُسن ایک آہنگ ہے جو متضاد سروں سے مرکب ہے۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی حُسن تنوع اور تلون کا نام ہے اور بغیر تاریکی کے ہم روشنی سے مسرور نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ صناع متضاد رنگ استعمال نہ کرے اس کی تصویر حسین نہیں بن سکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتے پلاتے محض تنوع کی خاطر ایک روز زہر پلا دے۔ جو حُسن آرٹ کا موضوع ہے وہ صرف رُوحانی غذا کے طور پر ہے۔ ہمیں صرف وہی حُسن چاہیئے جو رُوح کی غذا بنکر اُسے تقویت پہونچائے۔ لہذا آرٹ کا کام صرف اتنا ہے کہ تنوع قائم رکھنے کیلئے روزانہ ایک ہی قسم کی غذا نہ مہیا کرے بلکہ مختلف قسم کی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ۔ لیکن ادنیٰ اور معمولی غذا کو انتہائی مزیدار اور مقوی بنا کر دسترخوان پر لانا، یہ ہے آرٹ کا فرض۔ اور اگر وہ زہر کی سمیت کو دُور کر کے اُسے بھی ایک مزیدار اور مقوی غذا بنا سکتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن جب ایک اندھی ماں کی طرح (جو یہ کہکر کہ "روز کھیر کھاتے کھاتے میرے بچہ کی قوت ذائقہ مُردہ نہ ہو جائے" بجائے شکر کے، نیم کے پتوں کا عرق نہیں بلکہ کھیر میں زہر ملا دیتی ہے) صناع بھی تنوع کی خاطر ایک مخرب اخلاق منظر پیش کرے گا تو آپ ہی بتایئے کیا اسکی خرابیٔ دماغ میں کوئی انسان شُبہ کر سکتا ہے! آپ کہیں گے کہ جو ماں محبت میں اندھی ہو کر اپنے بچہ کا صرف ذائقہ بدلنے کی خاطر اُسے زہر دیدیتی ہے اُسکی نیت میں تو کوئی خرابی نہیں۔

یہ ٹھیک ہے۔ واقعی وہ جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر یہ سب کچھ کرتی ہے اور غریب کو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ زہر اُس کے عزیز بچہ کو دُنیا کے ہر ذائقہ کی طرف سے غیر حساس بنا دیگا۔ لیکن اس سے تو یہ لازم نہیں آتا کہ اگر اُس نے محبت سے مجبور ہو کر وہ زہر کھیر میں ملایا ہے تو ہم اُس کھیر کے زہریلی ہونے ہی سے قطع نظر کر لیں۔ ہاں کی نیت بخیر ہے یہ تسلیم۔ لیکن اس کھیر کی ہلاکت آفرینی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ماں کا مقصد ہی قاتلانہ تھا۔ ہمیں اس کے مقصد سے کوئی غرض نہیں۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ کھیر زہریلی ہے خُدا کیلئے اُسے دسترخوان پر مت رکھو۔ اگر آپ نباتاتی انکشافات و تجربات کی غرض سے کچھ ایسے درخت اپنے باغ میں لگاتے ہیں جن کے پھل زہریلے ہیں تو ہم آپ کو اُن درختوں کے لگانے سے منع نہیں کرتے صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ للہ اپنے باغ کے چاروں طرف کانٹوں کی باڑ کر دو تاکہ کم سمجھ بچے اس پر جا کر اُن پھلوں کو نہ کھا لیں۔

درحقیقت "تنوع و تلون" کو آرٹ کی سپر بنانا آرٹ کی حقیقت سے لاعلمی کے باعث ہے۔ حقیقی اور بلند شاعری وہ ہے جس میں ہمارے "شعور دنیا" کا اظہار ہو لیکن اسی کے ساتھ انسان کی اس عالمگیر آرزو ———— مکمل اور پاکیزہ تر دُنیا کی آرزو ———— کی بھی جھلک ہو۔ اب جس شاعری میں فحش اور مبتذل جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ غیر مکمل اور غلیظ تر دُنیا کی آرزو ہوگی نہ کہ مکمل اور پاکیزہ تر دُنیا کی۔ لہذا ادب کے نقطۂ نظر سے وہ شاعری اصلی ادب کے بالکل منافی ہوگی۔ دوسرے آرٹ یا شاعری کا اصل مقصد اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کی تلاش میں ابتدائے آفرینش سے ہماری رُوح سرگرداں ہے جس کی جستجو میں انسان تمدن کی سینکڑوں منزلیں طے کرتا ہوا چلا آرہا ہے۔

اور اخلاق ہی صرف وہ چیز ہے جس کی بدولت ہماری رُوح نے ایک حیوان سے انسان تک ترقی کی ہے۔ یہی چیز ہے جو آج بھی انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہے۔ اخلاق انسانی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ اسی لئے جب کبھی بدقسمتی سے ہمیں کسی انتہائی بداخلاق شخص سے سابقہ پڑجاتا ہے تو ہم نہایت جرأت اور فراخ حوصلگی کے ساتھ فیصلہ دیدیتے ہیں کہ وہ تو اچھا خاصہ حیوان ہے۔ اور اگر کہیں ان حضرت کی صورت بھی جناب ہنومان سے ملتی جلتی ہوئی تو ہم ایکدم ڈاروِن کے اُستاد بن جاتے ہیں اور اس کے نظریۂ ارتقا کی "گمشدہ کڑی" کو نہایت آسانی سے معلوم کرلیتے ہیں۔

لہٰذا جو آرٹ یا شاعری مخرب اخلاق ہوگی وہ بجائے رُوح کو ترقی دینے کے اُسے اور حیوانیت کی طرف لے جائیگی۔ اور اگر وہ فحش و عریاں ہوگی تو ہم نہایت آسانی سے اس پر فتویٰ صادر کرسکتے ہیں کہ یہ حیوانیت سے زیادہ قریب ہے۔ شرم و عفت انسانی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، اور جس شاعر نے ان چیزوں کو بالائے طاق رکھدیا تو وہ انسان نہیں حیوان مطلق کی نسل کا ایک فرد ہے۔ جو آرٹ یا شاعری انسانی زندگی کے اہم اجزا کو نظرانداز کردے وہ زندگی کے منافی ہوگی۔ اور جو چیز زندگی کے منافی ہے وہ (جیسا کہ ہم آرٹ کی بحث میں دیکھ چکے ہیں) اور خواہ کچھ ہو لیکن آرٹ نہیں ہوسکتی۔

یہاں پر شاید آپ یہ کہنے کی جُرأت فرما بیٹھیں کہ اخلاق اور شرم و عفت کے متعلق مشرق و مغرب کے نظریات مختلف ہیں۔ کیونکہ:-

ناپاک جسے کہتی ہے مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک

لیکن دونوں نظریوں میں صحیح کون سا ہے اس کا فیصلہ وقت اور واقعات کردیں گے ہمیں ابھی اس پر بھی لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اسقدر ضرور ہے کہ مغرب کے بڑے بڑے صنّاعوں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ آرٹ، وہ سب کچھ جو دل میں آئے کہدینے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ معلوم کرنے کا کہ کیا کہنا چاہئیے اور کیا نہ کہنا چاہیئے۔ انگریزی کا ایک مشہور جملہ ہے کہ

اور تقریباً مغرب کے ہر بڑے صنّاع نے اس کی تائید کی ہے۔ جب ایک شاعر ایک حسینہ کا سراپا بیان کرتا ہوتا ہے تو جو شاعر حقیقی صنّاع ہے وہ سر سے کمر تک پہونچنے کے بعد صرف یہ کہدیتا ہے کہ:-

ندادہ در حریم آں حرم، آگاہ
حصارِ عصمتش اندیشہ را راہ

لیکن جو حقیقی صنّاع نہیں وہ آتش کی طرح یہ کہکر کہ "کچھ نہ کہہ زیرِ ناف کیا ہے" جو فحش نگاری شروع کرتا ہے تو بیس اشعار کے بعد جاکر ذرا اس کی نفسانیت کی سیری ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ خاموش اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اُس کے دماغ کی تمام گندگی اور غلاظت ختم ہوچکی ہے بلکہ صرف اس ڈر سے کہ:-

پھر بھی ملنا ہے تجھ سے میرے تئیں
مُنہ دکھانا ہے مجھکو تیرے تئیں
صاف کہنا پڑے گا پھر آ گئے
سن کے مجھ سے لڑے گا پھر آ گئے

گویا سراپا کیا بیان کرتا ہے کسی "پوشیدہ امراض" پھیلانیوالی طوائف کا ڈاکٹری معائنہ شروع کردیتا ہے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ اسے شاعری اور صنّاعی سمجھتا ہے۔ زنانہ شفاخانہ کی ڈاکٹرنی کی تحقیقی رپورٹ کو شاعری اور صنّاعی سے کیا واسطہ؟ پھر اس پر مولانا عبدالحق صاحب جیسے ثقہ شخص کی تعریف و توصیف اور زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں بعض ستم ظریف کہتے ہیں کہ جب ایک شاعر ایک واقعہ بیان کررہا ہے یا کسی چیز کی کوئی تصویر کھینچ رہا ہے تو ہر تفصیل کا اظہار ضروری ہے۔ کیونکہ حُسن نام ہے کسی چیز کے مکمل، مجموعی اور کلّی حیثیت سے معرضِ اظہار میں آجانے کا۔ مگر میں کہونگا یہ تصویرکشی نہیں ہوگی بلکہ فوٹوگرافی ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہے اور بلا استثنا، ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ آرٹ کو فوٹوگرافی سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ فوٹوگرافی مظاہرِ قدرت کی بجنسہٖ تصویر ہے اور آرٹ فطرت اور صنّاع کی شخصیت کی سحرآفرینیوں اور رنگینیوں کا مجموعہ۔ ایک صنّاع کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر تفصیل کو کبھی پیش نہ کرے لیکن اپنی تصویر میں ایسا جادو بھردے جو اصل اور مکمل تصویر سے زیادہ دلکش اور پُراثر ہو۔ ہمیشہ ایک واقعہ کا بالتفصیل بیان کردینا آرٹ نہیں ورنہ "دندان توجملہ در دہانند" کو بھی آرٹ ماننا پڑیگا بلکہ آرٹ کا کمال یہ ہے کہ ایک واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کردے کہ وہ واقعہ فوراً ہمارے دماغ کے سامنے آجائے۔ مثلاً جب غالبؔ کہتا ہے:-

قفس میں مجھسے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر سے کئی صفحات کی ایک داستان مرتب ہو سکتی ہے لیکن ایک اصل صناع نے صرف چند الفاظ کہے اور داستان کے باقی اجزا قارئین کیلئے چھوڑ دئے۔ اب اگر وہ پوری داستان لیکر بیٹھ جاتا تو ظاہر ہے کہ وہ شعر نہ ہوتا بلکہ ایک افسانہ ہوتا اور وہ بھی نثر میں۔ اگر ایک شاعر علم الاجسام بننے کا دعویٰ کرے گا تو وہ شاعر کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

جذبات ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ایک حسینہ کو دیکھکر ہر جوان مرد کا قلب و دماغ احساسات و جذبات کا محشر کدہ بنجاتا ہے لیکن اگر وہ اخلاق کو بلائے رکھدے تو اُسے عین سڑک پر ایک ذلیل کتا بنجانے سے کون روک سکتا ہے۔ یہ صرف اخلاق ہے جو اُس وقت آگے آتا ہے اور اُن سفلی جذبات کو جنہیں کسی عملی صورت میں ظاہر نہیں ہونا چاہیئے سینہ ہی میں دفن کر دیتا ہے۔ اخلاق کی غیبی آواز اسے بتاتی ہے کہ یہ تاثرات و جذبات قابل اظہار ہیں اور یہ ناقابل اظہار۔ لیکن جو صناع اخلاق کی اس آواز کو نہیں سُنتا وہ یا تو ایک حیوان ہے یا اس کی دماغی طاقتیں فالج زدہ۔

آرٹ کے دلدادہ کہیں گے کہ اس طرح تو اخلاق گریز و اجتناب اور نفرت و عداوت کا مجموعہ ہوگیا۔ ہاں اگر اخلاق کانٹوں سے گریز و اجتناب اور زہر سے نفرت و عداوت کرنے کو کہتا ہے تو بیشک وہ گریز و اجتناب اور عداوت و نفرت کا مجموعہ ہے اور ان چیزوں سے گریز و اجتناب اور نفرت و عداوت انسان کی فطرت ہے بلکہ خود قدرت کی تعلیم ہے۔ اور اگر آرٹ اس گریز و اجتناب کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے تو وہ آرٹ خلاف فطرت ہے۔ اور آرٹ کا خلاف فطرت ہونا اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ خود آرٹ کے نقطۂ نظر سے آرٹ کے منافی ہے۔

آرٹ کا مقصد اولیٰ ہماری تشنہ رُوح کو اس سکون و اطمینان سے لبریز کرنا ہے جس کی تلاش میں وہ جمادات، نباتات اور مختلف کیڑوں اور جانوروں میں سے گذرتی ہوئی آج انسان تک آئی ہے۔ اگر آرٹ اُسے انسانیت کی سطح سے نیچے پھر حیوانیت کی طرف لے جاکر حیوانی جذبات و احساسات سے سکون و اطمینان دینا چاہتا ہے تو ہماری رُوح اُس کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ جس منزل سے آگے بڑھ چکی ہے، جہاں اس کی جستجو ناکام رہ چکی ہے آپ اُسے کھینچ کر پھر اُسی غار میں دھکیل دینا چاہتے ہیں، اگر یہی آرٹ ہے تو ہر انسان اس سے نفرت و عداوت کرنا اپنا فرض سمجھے گا۔ رُوح کا رُخ فطرتاً بلندی کی طرف ہے اور جو چیز اُسے پستی کی طرف بلائے اس سے گریز و اجتناب اس کی فطرت ہے اور اگر یہ گریز و اجتناب اُسے اخلاق سکھاتا ہے تو اس سے اخلاق کی تحقیر نہیں ہوتی بلکہ اسکی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

آرٹ کے دلدادہ یہاں پر بھی خاموش نہیں ہوتے اب وہ آرٹ کیلئے ایک اور نئی سپر بنا کر لاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جب مدعیان اخلاق چلاتے ہیں کہ یہ منظر، یہ خیال رکیک، مبتذل اور فحش ہے تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب کسی خیال میں شاعر کا منور وجدان رُوح پھونک دیتا ہے اس وقت وہ سب کچھ جو دراصل فحش و مبتذل ہے نامعلوم طور پر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ شاعر یا صناع اپنی طاقت سے ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے پھر آپ کو وہاں لیجاتا ہے۔ اب وہاں آپ جو کچھ سُنتے یا دیکھتے ہیں وہ ہو سکتا ہے کہ تکلیف دہ ہو یا مسرور کن۔ لیکن نقصان دہ نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف ایک رُوحانی تجربہ ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ شاعر اپنی طاقت سے ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے لیکن اگر وہ اِس دُنیا کے رکیک و مبتذل مواد سے اپنی اُس دُنیا کی تخلیق کرتا ہے تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مواد جس قسم کا تھا اس کی دُنیا اس سے مختلف کس طرح ہو جائے گی۔ ایک گدھا شیر کی کھال پہنکر بھی گدھا ہی رہیگا۔ شاعر کے منور وجدان یا شیر کی کھال کو اس میں کیا دخل؟

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ برند

چوں بیاید ہنوز خر باشد

اب آپ کہیں کہ اس گدھے کے گلے ملو، اس کی تعظیم کرو۔ کیونکہ اب یہ گدھا نہیں بلکہ محترم و معظم حاجی صاحب ہیں تو آپ کی اس عاقلانہ فرمائش کا جواب ایک عقل و ہوش والا انسان ایک بلند قہقہہ کے سوا اور کس طرح دے سکتا ہے۔ دوسرے اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ شاعر کی دُنیا میں جانا صرف ایک رُوحانی تجربہ ہوگا مگر اس کا کیا علاج ہے کہ ہر نیا تجربہ اپنے ساتھ کچھ نئے لالچ بھی لاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حکومت اپنی رعایا کے ہر نئے تجربہ سے ڈرتی ہے کہ مبادا تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس کا جواب آپ یہ دے سکتے ہیں کہ فی الحقیقت لالچ آدمی کو بُرا نہیں بناتا بلکہ اُس سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کے کردار میں

خامیاں کتنی ہیں۔

یہ درست ہے۔ لیکن لاپچ بجائے خود بُری چیز ہے۔ انسان کے کردار کی خامیاں تو ظاہر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان ابھی تمام حیوانی صفات کو خود سے دور نہیں کر سکا ہے۔ اگر اس کے راستہ میں ذرا سا لالچ اور معمولی سی ٹھوکر بھی ہوگی تو اُسے بہت بڑا نقصان پہونچ جانے کا اندیشہ ہے۔ وہ ایک اُس شخص کی طرح ہے جو ابھی بیماری سے اُٹھا ہے اور جسم میں اچھی طرح قوت نہیں آئی ہے۔ بیچارہ عصائے اخلاق کے سہارے زینہ پر چڑھ رہا ہے کہ اچانک لالچ کا دورہ اُس کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتا ہے۔ حیوانیت اس کے ہاتھ سے وہ عصا چھین لیتی ہے۔ تو اب بتائیے اس غریب کے پاس سوا نیچے گر پڑنے کے اور کیا چارہ ہے۔ مگر آپ اس کے اس گر جانے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عمداً گرا ہے۔ ایک کمزور کے پاؤں کانپتے ہوں اور آپ اُس کے ہاتھ سے عصا بھی چھین لیں اُس وقت اس سے پوچھئے کہ وہ سنبھلنے کے لئے اپنی تمام قوت کس طرح صرف کر دیتا ہے۔ لیکن جو چیز اس کے اختیار ہی میں نہیں اس کا ذمہ دار وہ نہیں ہے اور نہ ہم اُسے کسی طرح مجرم کہہ سکتے ہیں۔ لہذا ہماری کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ کسی طرح اس کے پاؤں میں لغزش نہ پیدا ہونے دیں۔ اور اگر صرف عصا سے اس کا کام نہ چلتا ہو تو خود سہارا دیکر اُسے زینے پر لیجائیں۔ یہ فرض ہے ایک اصلی صناع کا، ایک حقیقی شاعر کا، اور جو اپنے فرض سے غافل ہے وہ صناع نہیں شاعر نہیں۔

لیکن چونکہ جیسا ہم نے ابھی کہا کہ انسان کی غیر مستقل طبیعت اخلاقی بلندی سے نہایت آسانی سے پستی کی طرف مائل ہوجاتی ہے اور اکثر ایک آرام طلب اور کمزور فطرت انسان اخلاق کی اہمیت کو نہ سمجھکر اُسے پس پشت ڈالدیتا ہے اس لئے اُسے اس پر مجبور کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو قانون۔ دوسرے تحریص و ترغیب۔ قانون ایک چیز کو زبردستی منواتا ہے۔ اور ترغیب و تلقین انسان کے دل میں اس چیز کی عزت و محبت پیدا کر دیتی ہے۔ اور جیسا علامہ اقبال 'پیام مشرق' کے دیباچے میں فرماتے ہیں:۔

"زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسان کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون، جس کو قرآن نے "ان اللہ لایغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

اس طرح قانون تو صرف خارجی دُنیا کی تنظیم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ترغیب انسان کے ضمیر اور اُس کی اندرونی گہرائیوں میں نیکی پیدا کرنے کی سعی کرتی ہے۔ اس لئے ترغیب قانون سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ قانون تو کام ہے ارا کین حکومت کا اور ترغیب آرٹ اور شاعری کا۔

یہی وجہ ہے کہ اخلاق ابتدا ہی سے آرٹ اور شاعری کا جزو غالب بنا رہا ہے۔ مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں شاعری نے اخلاق کی ترغیب دی ہے۔ اخلاق کی تبلیغ کی ہے بالکل اسی طرح جس طرح مبلغین مذہب نے مذہب کی۔ فارسی شاعری اس سے بھری ہوئی ہے اور اس سے کچھ کم ہماری اُردو شاعری بھی۔ مولانا روم کی مثنوی اور سعدی کی گلستاں بوستاں شروع سے آخیر تک اخلاقی صحیفے ہیں۔ وہ عام اخلاقی موضوعات جن پر ان معلمین اخلاق نے زور دیا ہے اُن میں سے کچھ یہ ہیں۔ آزادی۔ اتحاد کل۔ عدم امتیاز ملک و ملت۔ پرہیز۔ احسان۔ اخلاص بے غرض خلوص خدمت۔ حسن اخلاق۔ ادب۔ تعظیم۔ حرمت۔ استقامت۔ ایمان۔ بذل و ایثار۔ جود و سخا۔ تسلیم و رضا۔ کم خوری۔ حزم و احتیاط۔ نقصانِ حسد۔ حلم۔ رحم و شفقت۔ ترکِ سخنِ لایعنی۔ خوش گفتاری۔ زہد و تقویٰ۔ صبر و تحمل۔ صحبت نیک۔ صدق و راستی۔ طاعت و عبادت۔ حق پرستی۔ عدل و انصاف۔ مکافات ظلم۔ عقل و خرد۔ توکل و قناعت۔ تطابق قول و فعل۔ ترک کبر و نخوت۔ کشتن نفس وغیرہ وغیرہ۔

اب غور کیجئے ان باتوں میں سے کتنی ہیں جو قانون مکمل طریقے سے منوا سکتا تھا۔ یہ کام قانون و حکومت کے بس کا نہ تھا۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ بادشاہ ان میں سے کچھ باتوں پر عوام کو مجبور کر سکتا ہے لیکن اگر خود بادشاہ اُن کے خلاف جاتا ہے تو اس کا کیا علاج ہے؟ یہی علاج ہماری شاعری لیکر آئی اور اپنی مسیحا نفسی سے معجزہ سا کر دکھایا۔

لیکن آرٹ کے دلدادہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ مثلاً

شلر کہتا ہے: "جہاں فنونِ لطیفہ نے اخلاقی درس و تدریس کو اپنا موضوع بنایا وہیں اُن میں بدنمائی اور بھدا پن آجاتا ہے اور پھر اُن میں کوئی جمالیاتی خصوصیت باقی نہیں رہتی"۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اخلاق کی خرابی نہیں بلکہ خود صناع کا نقص ہے جیسا وکٹر ہیوگو کہتا ہے کہ "شاعری کیلئے کوئی مضمون اچھا یا بُرا نہیں ہوتا بلکہ شاعر اچھے یا بُرے ہوتے ہیں"۔ یہ ضرور ہے کہ چونکہ اخلاق انسان کی تعیش پسند طبیعت کے لئے ایک خشک و بے کیف موضوع ہے اور اس میں حُسن و شباب کی رنگینی نہیں پائی جاتی لیکن صناع کا کمال تو اسی وقت معلوم ہوگا جب وہ خشک موضوعات کو بھی رنگین بنا کر اور تلخی کو شیرینی میں تبدیل کر کے پیش کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکا تو ہم یہ کہہ کر کہ موضوع ہی بے کیف تھا اُسے معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم اُسے خالص اس کی خامی سے تعبیر کریں گے

فارسی شعراء کا تو کیا کہنا اُنہوں نے شاعری ہی نہیں پیغمبری کی ہے۔ مگر ہماری اُردو جیسی کم مایہ زبان میں بھی ایسے بیش بہا گوہر موجود ہیں جو اس اعتراض کے جواب میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن مثالوں سے طوالت کا اندیشہ ہے۔ مسلم الثبوت اُستادوں کا تو کیا ذکر ہمارے یہاں جن غریب نظر کو کوئی پوچھتا نہیں جس کے متعلق مدعیانِ اخلاق نے فتویٰ دیدیا کہ اس کی شاعری اخلاق سے گری ہوئی ہے، نقادوں نے فیصلہ کر دیا کہ اُس کے اشعار آرٹ کی خصوصیات سے بیگانہ اور شعریت سے یکسر معرا ہیں اس کی نظمیں (خدا کا نام لیا کر۔ دہی دے دہی دلائے۔ امیر فقیر اچھے بُرے، آدمی ہی ہیں۔ دُنیا بھی کیا تماشا ہے۔ دُنیا مکر و فریب کی جگہ ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ بُڑھاپے میں موت کو یاد کرو۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ ہر حال میں خوش۔ خود کو پہچان۔ مطلوب حقیقی کی جستجو۔ وغیرہ) پڑھیئے اور دیکھئے کہ ہمارا وہ شاعر بھی جس کی قدر نہیں کی گئی اخلاق کا درس دیتا ہے اور آرٹ میں بدنمائی نہیں آنے دیتا۔

آخیر میں ہمیں مدعیانِ اخلاق سے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ آرٹ یا شاعری کا مقصد اخلاق اور صرف اخلاق ہونا چاہیئے ٹھیک نہیں۔ ہاں شاعری کے مختلف مقاصد میں سے ایک مقصد اخلاق بھی ہے۔ کیونکہ عالمِ انسانیت کیلئے جس طرح حُسن ضروری ہے اسی طرح اخلاق بھی ہے۔ ارسطو نے کس قدر منصفانہ رائے دی ہے کہ "کیا تم شاعری کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کرتے جب اس کو صرف معلم اخلاق کی حیثیت میں دیکھنا چاہتے ہو"

لہذا جب کوئی مظہر فن یا تصنیف ہمارے سامنے ہو اور اس کے مخرب اخلاق ہونے کا ہمیں شُبہ ہو تو اُس وقت ہمیں صرف یہی دریافت نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ کتاب یا نظم کس چیز کی وکالت یا حمایت کرتی ہے! کس چیز پر حملہ کرتی ہے؟ اس میں کس مخرب اخلاق واقعہ کا بیان ہے؟ اس میں کس قسم کے رکیک مبتذل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں؟ بلکہ ہمیں یہ بھی سوال کرنا چاہیئے کہ اس مصنف کی شخصیت کیا ہے؟ آیا وہ غیر جانبدار ہے یا خود غرض! اس کی شخصیت ارفع و اعلیٰ ہے یا پست و مبتذل۔ کیونکہ اصل چیز جو تخریب اخلاق کا باعث ہے یا ہو سکتی ہے وہ ایک بداخلاق شخصیت کے ساتھ اختلاط پیدا ہونا ہے جس دُنیا میں شاعر آپ کو لیجاتا ہے اُس دُنیا کی عام فضا، وہ تخیلی ماحول جس میں آپ سانس لیتے ہیں اور ایک تخلیقی رُوح کا ہر جگہ چھایا ہونا، یہ چیزیں ہیں جن کی طرف خاص توجہ کرنا چاہیئے اور کسی کتاب کے متعلق فیصلہ کرنے کیلئے یہ طریقہ کچھ مناسب نہیں کہ کچھ الفاظ یا جملے اکٹھا کر کے ہم اُن کی اپنی دنیا سے اس غیر دُنیا میں کھینچ لائیں۔ وہ یہاں کے ماحول اور یہاں کی فضا میں بالکل ناموزوں اور اجنبی ہوں گے۔ جس طرح تاریخ کے بہت سے واقعات اور اشخاص موجودہ زمانے میں غیر موزوں اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ہم انکے متعلق یہ تقاضہ نہیں کرتے کہ انہیں صفحۂ تاریخ سے بالکل اُڑا دیا جائے۔ فی الحقیقت اِس تصنیف کے اخلاقی اثر کا صحیح اندازہ ہم صرف اسی صورت سے کر سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر اس کتاب کو اور اس شخصیت کو جو اس کے پس پردہ ہے ایک ساتھ لیں اور نہ محض اس کی تفصیلات پر غور کریں بلکہ اس رُوح کا بغور مطالعہ کریں جو انہیں زندگی بخشتی ہے، جو انہیں ایک رشتہ میں منسلک کرتی ہے۔

* * *

حفیظ نعیمی پیلی بھیتی